
شگوفہ
حیدرآباد
عالمی خبریں
دہشت
تشدد
فسادات
خون خرابہ
جرائم
اغوا

ماہنامہ
شگوفہ
حیدرآباد

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

سالنامہ
جنوری ۱۹۹۰ء

جلد ۲۳ — شمارہ ۱

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال



مجلسِ مشاورت
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
یوسف ناظم
مجتبیٰ حسین

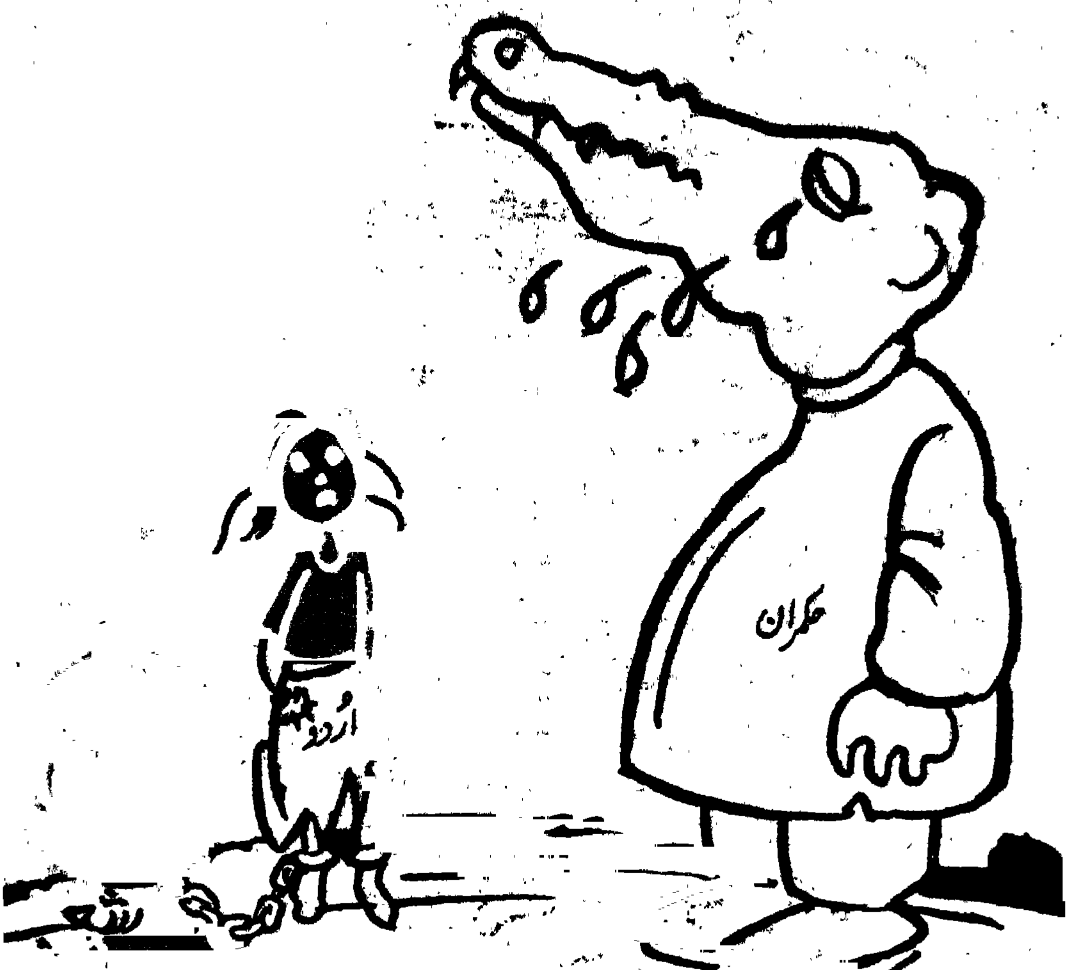
سرورق اور کارٹون: شعیب

خصوصی نمائندے: بمبئی فیاض احمد فیضی
ریاض عابد معز
دوبئی غلام نجم الدین
آسٹریلیا ایس ایم حسینی

مجلسِ ادارت
محمد حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم
طالب خوندمیری

کتابت: محمد غالب ـ محمود سلیم ـ محمد مجاہد
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس ـ چارکمان حیدرآباد

فی پرچہ: ۸ روپے — زرسالانہ: ۵۵ روپیہ عرب ممالک سے: ۱۴۰ ...
خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ ۳۱ چیمبرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد فون: 557716 مکان 21064


حکمران
اردو

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مالِ مفت (انشائیے)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

بال کی کھال (تبصرہ)

چوزے (منظومات)



کشمیری قوام



مجتبیٰ حسین

چار مینار اور چار سو برس



پچھلے دنوں میں حیدرآباد گیا تو میرے ساتھ ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔
رات کا پچھلا پہر تھا اور میں چار مینار کے پاس سے گزر رہا تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا
اور خاموشی تھی۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ چار مینار کے اطراف سناٹا ہو مگر
اس رات تھا۔ میں دبے پاؤں چل رہا تھا کہ اچانک میری نظر چار مینار
پر پڑی اور میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ چار مینار کا
ایک مینار اکڑوں بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے آنکھیں مل کر چار مینار کے دوسرے مینار
کو دیکھا۔ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ یہ مینار تو باقاعدہ آلتی پالتی مارے بیٹھا
ہوا تھا اور اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھ رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے تیسرے مینار کی
طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر یہ نظر نہیں آیا۔ میں نے تاڑ لیا کہ یہ ضرور لیٹا ہوا ہوگا
یوں بھی دور سے ایسے خراٹے سنائی دے رہے تھے جو انسان کے خراٹوں سے مختلف
ہوتے ہیں۔ زندگی میں پہلی بار مینار کے خراٹے سنے جو ہماری کلاسیکی موسیقی سے مشابہ تھے
میں نے گھبراہٹ میں جلتا ہوا چار مینار سگریٹ ہتھیلی پر رکھا تھا کہ یہ اطمینان کر لوں
کہ میں جاگ رہا ہوں یا خواب دیکھ رہا ہوں
میں سچ مچ جاگ رہا تھا۔ میں نے چار مینار سگریٹ کی ڈبیا پر نظر ڈالی وہاں چار مینار کے چاروں
مینار صحیح و سالم کھڑے تھے۔ یوں بھی ان دنوں صرف کاغذ پر ہی ہر چیز محفوظ نظر آتی ہے
چاہے وہ عمارت ہو یا ہمارا کردار، فلسفہ ہو یا ہماری تہذیب۔

میں ایک کونے میں دبک گیا تاکہ میناروں کی حرکات و سکنات میں مخل نہ ہوں۔ اب
کی بار آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے مینار نے انگڑائی لے کر کہا۔ باپ رے کئی برس بعد سناٹا
ہوتا ہے۔ جب دیکھو کوئی دکان نیچے سے گر رہا ہوتا ہے۔ چار سو برس بیت گئے یہاں کھڑے کھڑے
ٹانگیں دکھنے لگیں، کوئی نہیں پوچھتا کہ میاں یہاں کیوں کھڑے ہو کب تک کھڑے رہو گے۔

اس پر بیٹھے ہوئے مینار نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کیا بیوقوفوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ ہمیں تو کھڑے رہنے کے لیے ہی یہاں کھڑا کیا گیا ہے۔ کھڑے رہنا ہی ہماری زندگی کا نصب العین ہے۔"

پہلے مینار نے کہا، "نصب العین! گویا نصب العین اب ہمارے پاس ہی رہ گیا ہے۔ یہ لوگ جو ہمارے زیر سایہ رہتے ہیں اور حیدرآبادی کہلاتے ہیں ان کا بھی تو کوئی نصب العین ہونا چاہیے۔"

دوسرے مینار نے کہا "بھیا! انسانوں کے نصب العین بدلتے رہتے ہیں عمارتوں کے نہیں۔ تمہیں یاد ہے چار سو برس پہلے جب سلطان قلی قطب شاہ نے ہمیں یہاں کھڑا کیا تھا تو کتنا اعلیٰ نصب العین تھے اُس زمانے کے لوگوں کے۔"

اچانک ایک آواز آئی۔ "اس زمانہ کے لوگوں کے نصب العین اس لیے اعلیٰ تھے کہ انھیں دودھ کے پیکٹ کے لیے لائن کی مصیبت جھیلنی نہیں پڑتی تھی۔ راشن کی دوکان پر دھکے نہیں کھانے پڑتے تھے۔ تمہارے سلطان قلی قطب شاہ کو اگر ایک بار آج کی بسوں میں سفر کرنے کا موقع ملتا تو پہلے ہی دھکے میں ان کا نصب العین نیچے آجاتا۔ بس کے ڈنڈے سے لٹک کر سفر کرنے والے آدمی کا کوئی نصب العین نہیں ہوتا۔ وہ دن لد گئے جب معزز آدمی کے آنے سے پہلے اعلان کیا جاتا تھا۔ "باادب با ملاحظہ ہوشیار"۔

دونوں میناروں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ یہ تیسرے مینار کی آواز تھی جو لیٹا ہوا تھا۔ پہلے مینار نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا "نافرمابردار۔ ناہنجار! تم ہمیشہ ایسی ہی باتیں کرتے ہو۔ جب سے تم اس عمارت میں جڑے ہو تب سے تمہاری یہی حالت ہے۔ تمہاری باتوں سے شرارت اور بغاوت کی بو آتی ہے۔ ذرا اپنی حالت تو دیکھو باضابطہ لیٹے ہوئے ہو۔ خراٹے تک لے رہے ہو۔ کیا یہی آداب ہیں۔ یہی سلیقہ ہے کسی عمارت سے جڑے ہوئے رہنے کا ــــ"۔

تیسرے مینار نے کروٹ بدلتے ہوئے بلکہ جماہی تک لیتے ہوئے کہا۔ "میاں! آداب، سلیقہ تہذیب اور تمدن کی بات اپنے پاس ہی رکھو۔ چار صدیوں میں، میں نے یہاں [illegible] کئی تہذیبوں کو بنتے بگڑتے اور اجڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ تم کون سی تہذیب کی بات کرتے ہو۔"

دوسرے مینار نے کہا۔ "حیدرآبادی تہذیب کی بات کرتے ہیں اور کیا۔ ہم نے تو کوئی تہذیب دیکھی ہی نہیں۔ یہی تہذیب دیکھی ہے۔"

تیسرے مینار نے کہا۔ "اور تمہیں یاد ہے اسی تہذیب نے تو اورنگ زیب کی فوجوں کے لیے گولکنڈہ کے قلعہ کا دروازہ دھوکے سے کھلوا دیا تھا۔"

پہلے مینار نے کہا "اور تمہیں یاد ہے اسی تہذیب نے گولکنڈہ کے قلعہ کے دروازہ پر ایک عبدالرزاق لاری کو بھی کھڑا کر دیا تھا جو آخر وقت تک دشمنوں سے لڑتا رہا۔ وہ آخر کس تہذیب کا پروردہ تھا۔" تیسرے مینار نے کہا "بہت خوب! اس تہذیب نے ایک جان نثار پیدا کیا تھا اور اس جان نثار کو اسی تہذیب کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا۔ اب کون جانتا ہے عبدالرزاق لاری کو۔ انھیں کی قربانی کو آج کے طالب علم تو اسے مذاق

یں عبدالرزاق شرف اور عبدالرزاق پٹھان بکنے لگے ہیں"

پہلے مینار نے تیسرے مینار کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "یار! اب خدا کے لیے مذاق بند کرو۔ ہر بات کو مذاق میں ٹال دیتے ہو یا الٹی سیدھی سنا دیتے ہو۔ یہ عادت تم نے کہاں سے اپنایا؟"

تیسرے مینار نے کہا "زندہ دلان حیدرآباد سے اور کیا؟ جو پچھلے تیس پینتیس برس سے یہی کام کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ہر تہذیب پر ایک ایسا وقت آتا ہے جب ہر سانحہ کے جواب میں قہقہہ لگانا ضروری ہو جاتا ہے۔ چوٹ جتنی گہری ہو قہقہہ بھی اتنا ہی بلند بانگ ہونا چاہیئے۔"

دوسرے مینار نے کہا "یار ذرا سوچو تو کیسے کیسے دور ہم نے دیکھے۔ کیسے کیسے انسانوں کے دیدار کئے۔ یاد ہے وہ دن جب سلطان قلی قطب شاہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے آیا تھا۔"

پہلے مینار نے کہا۔ "وہ گھوڑے، وہ ہاتھی، وہ پالکیاں، وہ امراء اور شرفا نہ جانے کہاں گئے وہ لوگ"

تیسرے مینار نے کہا "یوں لگتا ہے جیسے یہ سب وقت کے فیشن شو میں حصہ لینے آئے تھے اور چلے گئے۔ اب وہ لباس بھی کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ ابھی چالیس پچاس برس پہلے تک یہاں کے لوگوں کے سروں پر لمبی لمبی ٹوپیاں دکھائی دیتی تھیں جنہیں ترکی ٹوپی کہتے تھے۔ بڑی کارآمد وہ ٹوپی تھی۔ سر کو محفوظ رکھنے کے علاوہ آدمی اس میں ناجائز کمائی بھی محفوظ کر لیتا تھا۔ اس ٹوپی کی کرامات کے باعث لوگ سودا سلف تک اپنے سروں پر رکھ کر لے جاتے تھے۔" پہلے مینار نے کہا "مگر اس ٹوپی نے ہم میناروں کی انفرادیت مجروح کر دی تھی۔ لگتا تھا ہر آدمی اپنے سر پر مینار اٹھائے گھوم رہا ہے۔"

دوسرے مینار نے کہا۔ "وہ دن ہی ایسے تھے جب آدمی کپڑے کی ساری دکان پہن لیتا تھا۔ کئی کئی گز کے چغے اور انگرکھے بنتے تھے۔ پچھلے لوگوں کے ایک رومال میں جتنا کپڑا ہوتا تھا اُس میں تو آج سارے خاندان کے کپڑے بن جاتے ہیں بلکہ کچھ کپڑا تو بچ بھی جاتا ہوگا۔ عورتوں کے بدن کے ہر عضو کے لیے اتنے سارے زیور ہوتے تھے کہ اگر کوئی عورت پوری ایمانداری اور فراخ دلی کے ساتھ یہ زیورات پہن لیتی تو پھر اس کے بعد اُس کے لباس پہننے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی تھی۔ اب عورتیں تولے اور ماشے کے حساب سے زیور پہنتی ہیں۔ پہلے منوں اور ٹنوں کے حساب سے پہنتی تھیں۔ ٹھگ عورتوں کو زیورات اٹھانے سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ اسی لیے تو اغوا کے واقعات کم ہوتے تھے۔ اب ٹھگ بڑی محنت سے کسی عورت کا اغوا کرتے ہیں تو بڑی مشکل سے دو تین تولے سونا ہاتھ لگتا ہے اور اکثر صورتوں میں تو یہ بھی خالص نہیں ہوتا۔"

پہلے مینار نے کہا "تم عورتوں کی بات کرتے ہو۔ لوگ تو اپنے گھوڑوں کو تک زیور پہناتے تھے۔ یاد ہے سلطان محمد قلی قطب شاہ کا گھوڑا کتنے زیورات سے آراستہ ہوتا تھا۔ بھاگ متی سے ملنے کے لیے جب قلی قطب شاہ نے چڑھتی ہوئی موسی ندی میں گھوڑا ڈال دیا تھا تو اس کی وجہ سے ندی کا پانی چڑھ گیا تھا۔"

تیسرے مینار نے پوچھا "گھوڑے کے وزن سے یا زیورات کے وزن سے؟"

پہلے مینار نے کہا "مذاق بند کرو۔ ندی کا پانی تو قلی قطب شاہ کے دل میں محبت کے ٹھاٹھیں مارتے

ہوئے سمندر کی وجہ سے چڑھ آیا تھا۔ آج کوئی ایسی محبت کرکے دکھادے۔

تیسرے مینار نے مداخلت کرتے ہوئے کہا: "سارا کارنامہ تو گھوڑے کا تھا۔ لگتا ہے گھوڑا قلی قطب شاہ سے کہیں زیادہ بھاگ متی کا وفادار تھا اور اُسے بھاگ متی کے پاس جانے کی جلدی تھی۔"

دوسرے مینار نے کہا: "بدتمیز اپنے منہ میں لگام دو۔ تم بہت گستاخ ہوتے جارہے ہو۔"

پہلے مینار نے کہا: "تم اس کی باتوں پر دھیان نہ دو۔ یہ تو ہے ہی زبان دراز۔ کوئی دوسری بات کرو۔ آج نہ جانے اس شہر کے لوگوں کو کیا ہوگیا ہے۔ گھنٹہ بھر سے کسی آدم کا اِدھر سے گزر نہیں ہوا۔"

دوسرے مینار نے کہا: "آج تو ایسا سناٹا ہے کہ جی چاہتا ہے ہم اوپر سے نیچے اتر جائیں اور اس شہر کی سڑکوں پر چہل قدمی کریں۔"

تیسرے مینار نے کہا: "بھیا! یہ غلطی کبھی نہ کرنا کیونکہ اس شہر کی سڑکیں اب چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہیں۔ پہلے ہی قدم پر تمہیں ٹھوکر لگ جائے گی اور تم کسی کھڈ میں گر پڑو گے۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ یہاں کے لوگ ان سڑکوں پر کس طرح چل پھر لیتے ہیں۔ اپنی محبوبہ سے ملنے کے لیے گھوڑے پر بیٹھ کر طغیانی پر آئی ہوئی موسیٰ ندی کو عبور کرنا پہلے بھی آسان تھا اور آج بھی آسان ہے لیکن اس سڑک میں بنے ہوئے گڈھوں کو عبور کرنا مشکل ترین کام ہے۔ یہاں کی سڑکوں پر چلنے کے لیے اس شہر کے باسی ایسے ایسے کرتب دکھاتے ہیں کہ لگتا ہے کہ سارا شہر سرکس میں کام کر رہا ہے۔"

پہلے مینار نے کہا: "یاد ہے جب یہ شہر آباد ہوا تھا تو یہ سڑکیں کیسی پختہ اور شاندار تھیں۔"

تیسرے مینار نے کہا: "اس لیے کہ اُس زمانے میں اس شہر میں کوئی بلدیہ نہیں تھی۔ آدمی سڑک پر چلتا تھا تو اُسے اپنی ملکیت تصور کرتا تھا۔ آج یہ سڑکیں کسی کی ملکیت نہیں ہیں۔ یہی وہ لاوارث سڑکیں ہیں جن پر حیدرآبادی تہذیب ٹھوکریں کھا کھا کر لہولہان ہو رہی ہے۔ جس کسی کا جی کچھ کھودنا چاہے تو وہ یہاں کی سڑکوں پر طبع آزمائی کرتا ہے۔ پھر سرکار نے تو سڑکوں کو کھودنے کے لیے کئی محکمے بنا رکھے ہیں۔ ٹیلی فون والے کسی سڑک کو کھود کر چلے جاتے ہیں تو ان کے پیچھے بجلی والے آجاتے ہیں۔ بجلی والے چلے جاتے ہیں تو بچی کچی سڑک کو ڈرینج والے کھود کر چلے جاتے ہیں۔"

دوسرے مینار نے کہا: "تم ٹھیک کہتے ہو۔ کیا شہر تھا یہ اور اب کیا ہوگیا ہے۔ وہ تہذیب بھی اب نہ جانے کہاں چلی گئی۔"

تیسرے نے کہا: "اب حیدرآبادی تہذیب صرف پکوان میں اٹک کر رہ گئی ہے۔ جس تہذیب کا رشتہ پیٹ سے زیادہ اور دل و دماغ سے کم ہوجائے تو اس کا یہی حشر ہوتا ہے۔ پہلے حیدرآبادی تہذیب آدمی کے کردار سے جھلکتی تھی اب ڈکار سے جھلکتی ہے۔ حیدرآبادیوں کے کردار اب خالی برتن کی طرح ہوگئے ہیں۔ وہ تو اچھا ہے کہ ہم اس شہر کے اوپر ایک عمارت میں الگ تھلگ کھڑے ہیں۔ اگر ہمیں اس شہر کی زندگی میں شامل ہونا پڑتا تو ہمارا کیا حشر ہوتا۔ ہم تو صرف خاموش تماشائی ہیں۔"

پہلے مینار نے کہا: "مگر کب تک ہم خاموش تماشائی بنے رہیں۔ اب تو جی چاہتا ہے کہ اس شہر کو چھوڑ کر کہیں چلے جائیں۔"

دوسرے مینار نے پوچھا "مگر جاؤ گے کہاں؟"

تیسرا مینار بولا "دبئی چلے جاؤ۔ بڑی اچھی جگہ ہے اور واپسی میں اپنے گلے میں بہت سے اسمگل شدہ سامان لٹکا کر آ جاؤ۔ میں تو ہر روز ایسے حیدرآبادی نوجوانوں کو دیکھتا رہتا ہوں۔ اب زیادہ تر حیدرآبادی خلیجی ممالک کو ہی بھاگنے لگے ہیں۔ تم بھی بھاگ جاؤ۔"

یہ کہہ کر تیسرے مینار نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اس پر اچانک ایک چیخ کی آواز سنائی دی۔ یہ چار مینار کے چوتھے مینار کی چیخ تھی جو شاید اتنی دیر سے گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔

چوتھے مینار نے چیخ کر کہا "یہ کیا تم لوگوں نے بکواس لگا رکھی ہے۔ کئی دنوں بعد تو سونے کا موقع ملا تھا۔ یہ ضرور تیسرے مینار کی شرارت ہے۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا۔" یہ کہہ کر چوتھا مینار خالص حیدرآبادی گالیاں دیتا ہوا تیسرے مینار پر جھپٹ پڑا اور اپنے کلس کو تیسرے مینار کے پیٹ میں چبھونے کی کوشش کرنے لگا۔ چاروں میناروں میں اچانک حرکت اور ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ بالآخر پہلے مینار نے بیچ بچاؤ کر کے ان میناروں کو لڑنے سے روکا۔

پھر اس نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور کہا "دوستو! اب ہمیں بھی یہاں سے چلے جانا چاہیئے۔ اس شہر کے موجودہ رہنے والوں کے کردار کا اثر اب ہم پر بھی پڑنے لگا ہے اور ہم بھی آپس میں لڑنے لگے ہیں۔ کیا سلطان قلی قطب شاہ نے اسی دن کے لیے ہمیں اس عمارت کا حصہ بنایا تھا۔ کیا اب ہم اس عمارت سے جڑے نہیں رہ سکتے۔ اس شہر کو جس تہذیب نے آباد کیا تھا ہم اس کے امین ہیں۔ ہم میں اور اس شہر کے باشندوں میں کچھ تو فرق ہونا چاہیئے۔ ہم نے یہاں کھڑے کھڑے کیسے کیسے باکردار، مہذب اور جلیل القدر انسان دیکھے تھے۔ آدمی کا حافظہ کمزور ہو سکتا ہے لیکن پتھر کا نہیں۔ اتنی آسان سی بات تم لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔"

اسی اثنا میں دور سے ایک موٹر کار آتی ہوئی دکھائی دی تو پہلے مینار نے کہا "خبردار! آپ سب ٹھیک سے کھڑے ہو جاؤ۔" سارے مینار اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو کے [illegible]۔ تیسرے مینار نے دوسرے مینار کو پیچھے ڈھکیلتے ہوئے کہا "تم آج سے میری جگہ کھڑے ہو جاؤ۔ میرا رخ صدیوں سے پرانے شہر کی طرف ہے اور پچھلے کچھ برسوں سے اس علاقہ میں غربت اور افلاس کا ایک ہی منظر دیکھتے دیکھتے میں تنگ آ گیا ہوں۔ ذرا دیکھو تو سہی کہ نئے شہر اور بنجارہ ہلز کے امیروں کے کیا ٹھاٹ باٹ ہیں۔"

پہلے مینار نے کہا "نہیں بھیا! اپنی جگہ نہ بدلو ورنہ مینار اور آج کے سیاسی لیڈر میں کوئی فرق باقی نہ رہ جائے گا۔ یوں بھی یہ منظر ہمارے مقدر کا حصہ بن چکے ہیں۔"

اس پر تیسرا مینار اپنی پرانی جگہ پر جا کھڑا ہو گیا۔ جب سارے مینار اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک سے کھڑے ہو گئے تو میں بھی اس جگہ سے باہر نکل آیا جہاں چھپا بیٹھا تھا۔ موٹر کار جا چکی تو پھر سناٹا چھا گیا۔

میں چار مینار کے سامنے جا کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا "چار مینار کے میناروں! مجھ سے کچھ نہ چھپا۔ میں نے تمہاری ساری باتیں سن لی ہیں۔ میں بھی تمہارے اختلاف سے اتفاق کرتا ہوں۔ تمہیں کہیں جب ہر طرف چھپا بیٹھا [illegible] اس شہر کے چار سو برسوں میں سے [illegible]

کرتے جاؤ۔ باقی کے ساڑھے تین سو برس بھلے ہی اپنے پاس رکھ لینا۔ میں بھی اس شہر سے اپنے پچاس برس لے کر کہیں چلا جانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ آنے والے برسوں میں میرے ان پچاس برسوں کے محفوظ رہنے کے کوئی آثار نہیں دکھائی دیتے۔

میری باتوں کے جواب میں چار مینار سکے۔ چاروں مینار چپ چاپ کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ کسی میں کوئی ہلکی سی جنبش بھی نہیں ہوئی۔ البتہ اوپر سے ایک آنسو میرے دامن میں ضرور آگرا۔ پتہ نہیں کون سے مینار کا تھا۔ ضرور تیسرے مینار کا ہوگا جو ابھی کچھ دن پہلے تک قہقہہ لگا رہا تھا جو بہت زیادہ ہنستا ہے اس کی آنکھوں میں آنسو بھی تو جلدی آجاتے ہیں۔

یوسف ناظم
بمبئی

چلو آسٹریلیا چلیں

جب ہم نے ایک نجی صحبت میں چلو آسٹریلیا کی تجویز پیش کی تو ہمارے سارے احباب عموماً اور برادران یوسف خصوصاً بری طرح چونک پڑے۔ ان کا چونک پڑنا فطری اور اضطراری عمل تھا کیوں کہ بڑے بڑے ملکوں کا سفر کرنے کی تحریک تو عام ہے بلکہ بعض موقعوں پر اندرون ملک بھی بیٹھے بٹھائے چلو دلی چلیں کی تحریک بھی لوگوں کو بہت پسند آتی ہے۔ کیوں کہ پسند آتے بلا ٹکٹ سفر کرنے کا موقع ملتا ہے دیگر آسائشیں بھی مہیا ہوتی ہیں لیکن اچانک کسی ایسی جگہ کا نام پیش کر دیا جائے جہاں آج تک کسی شریف آدمی نے یا کسی ملک کے نیم تہذیبی، نیم ادبی وفد نے جانے کے بارے میں سوچا تک نہ ہو تو ظاہر ہے سننے والے چونکیں گے نہیں تو کیا اچھلیں گے ـــــ لیکن ہماری رائے ہے کہ سیر و سیاحت کے تعلق سے اب ہمارا رویہ چاہے کچھ ہو، یہ ضرور بدلنا چاہیے ـ ہر شعبۂ حیات میں آج کل یہی طریقہ رائج ہے۔ نظریہ ایک رویہ ایک۔ بڑے ملکوں کا سفر بہت ہو چکا اور ان ملکوں کے بارے میں لوگوں کو اتنی معلومات ہو چکی ہیں کہ خود اپنے ملک کے بارے میں انھیں نہیں معلوم ہے اس کے علاوہ اب تو بڑے ملکوں کے حالات بھی وقتاً فوقتاً دگرگوں ہونے لگے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ہمارا ایک نیم تہذیبی، نیم ادبی وفد ایک بڑے ملک میں خیرسگالی کے مقصد کی غرض سے بھیجا گیا تھا لیکن وہ الٹے پاؤں واپس آگیا۔ وہاں شاید کسی اندرونی انقلاب کی آمد آمد تھی یا شاید کوئی بغاوت تھی جسے غدر کہا جاتا ہے۔ انقلاب اور بغاوت میں فرق ہی کیا ہوتا ہے لیکن اتنا کہ بغاوت میں غالباً عوام اور ان کی بیویاں ماری جاتی ہیں اور انقلاب میں خواص اور ان کے خاندان ـــــ ملک کے حالات البتہ جوں کے توں رہتے ہیں۔ جب کسی ملک میں ایسا کوئی واقعہ ہو رہا ہو تو کسی غیر ملک کے وفد کا وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہوتا خواہ وہ وفد خود اپنے ملک میں کسی مصرف کا ہو یا نہ ہو۔ وہاں کی خبریں [illegible] ہیں [illegible] اس وقت پریشان ہونا غیر فطری ہوتا ہے





پریشانی تو اہلِ وفد کی واپسی کے بعد شروع ہوتی ہے اور صرف اہل و عیال ہی کی پریشانی کیوں؟

شخصی طور پر ہم بہت پہلے آسٹریلیا جانا چاہتے تھے اور اس وقت تو شاید ہماری مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ مسیں بھیگنے سے پہلے کسی غیر ملک کی سیاحت پر جانا یوں بھی بے فائدہ ہوتا ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہم نے "سینڈریلا" نظم پڑھی تھی تو ہمیں اس نظم کی مندرجہ بالا لڑکی پر شبہ ہوا تھا کہ ہو نہ ہو یہ آسٹریلیا کی لڑکی ہوگی۔ بس اس کے بعد آسٹریلیا ہمارے خواب میں اکثر آتا جاتا رہا اور ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے خواب میں آسٹریلیا کی آمد و رفت اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک وہاں جا کر ہمارے دل کو قرار نہیں آجاتا۔ خانگی طور پر ہم نے تو کچھ آسٹریلین ڈالر بھی جمع کر رکھے ہیں۔ یہ بازار میں مل جاتے ہیں۔ آج کل بازار میں سوائے اجناس کے ہر چیز مل جاتی ہے اور فارن کرنسی تو اتنی چلتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہیں چھپ رہی ہے نثری نظموں کی طرح۔ اگر ہم کسی وجہ سے آسٹریلیا نہیں جا سکے تو اس کرنسی کی بجائے کوئی دوسری شکل کرنسی مثلاً چلغوزے، پیو یا پورلیبد وغیرہ خرید لیں گے۔

ہمارے دل و دماغ پر اس ملک کے بُری طرح چھا جانے کی کئی وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ رقبے کے حساب سے یہ بڑی مشکل سے ملک کیا شہر بھی نہیں ہے لیکن ہے برّاعظم۔ اور برّاعظم چاہے چھوٹا ہو یا بڑا جغرافیہ میں برّاعظم ہی ہوتا ہے ہمیں یاد آرہا ہے کہ کسی شاعر نے پست ہمتی اور پست قامتی کے تعلق سے اپنے شعر میں بڑا اچھا نکتہ پیدا کیا تھا ——— لیکن بہرحال شاعری تھی۔ حساب کا معاملہ الگ ہوتا ہے اس لیے جہاں تک برّاعظموں کی تشکیل کا تعلق ہے ہم ہمیشہ سے اس بات کے قائل رہے ہیں کہ ہماری اس زمین کو جس شخص نے بھی چھ برّاعظموں میں تقسیم کیا اسے جامٹری نہیں آتی تھی۔ ایک تو اس پر خطِ استوا کی کیا ضرورت تھی جب کہ یہ خط کسی کو نظر ہی نہیں آتا۔ زمین کی تقسیم کا کام اصل میں اقلیدس کو کرنا چاہیے تھا جو جامٹری شناس ہونے کے علاوہ فطرتاً شریف آدمی تھا۔ یقیناً انصاف سے کام لیتا اور اقلیدس کے زمانے میں تو انصاف کوئی معیوب چیز بھی نہیں تھی۔ آج کی بات اور ہے۔ بعض وقت تو ہمیں شبہ ہوتا ہے کہ زمین کی تقسیم میں کہیں ڈارون کے مشورے کا تو دخل نہیں تھا۔ لیکن ہمیں اس وقت صرف آسٹریلیا کے موضوع پر بات کرنی چاہیے۔ یہ چھوٹا سا برّاعظم "آسٹریلیا" ہمارے ہندوستان کی طرح تین طرف پانی سے گھرا ہوا ہے۔ اچھا خاصا آبدیدہ ملک ہے۔ آبادی کم ہے بلکہ اتنی کم کہ آسٹریلیا سے پوچھنا چاہیے کہ یہ بھی کوئی آبادی ہے۔ انھیں معلوم ہی نہیں کہ آبادی کہتے کسے ہیں۔ خانہ آبادی کے پے درپے واقعات سے بھی وہاں کی آبادی کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا ——— لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ملک کی آبادی کم ہو تو باہر سے آنے والے سیاحوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ وہ مصنوعی مناظر کے علاوہ مناظرِ قدرت بھی بآسانی دیکھ سکتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ مناظرِ قدرت دیکھنے سے آدمی خود بخود ورڈز ورتھ بن جاتا ہے۔ مناظرِ قدرت دیکھتے رہنے کی وجہ سے ورڈز ورتھ نے عمر بھی بہت لمبی پائی۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ آسٹریلیا میں چند مہینے گزار لیے جائیں تو آدمی عمرِ طبعی کو پہنچ سکتا ہے۔

آسٹریلیا کی زمین کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ بہت زرخیز ہے۔ زرخیز سے پہلے تو یہ ہمارا کا یہ مراد ہے کہ یہ بے حد کرکٹر خیز ہے۔ کرکٹر خیز ہونا بھی مردم خیز ہونے کی ایک قسم ہے۔ آسٹریلوی خاک کے پردے سے کسی دانشور کے نکلنے کی اطلاع تو ہمیں نہیں ملی لیکن اس زمین نے کرکٹ کھلاڑی خوب پیدا کیے ہیں اور یہ بات تو اب سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس عہد لہو و لعب میں دانشوروں کے مقابلے میں کرکٹر زیادہ اہم سمجھے جاتے ہیں اور سپریم کورٹ جیسی عدالتیں بھی ان کھلاڑیوں کے حق

میں چند جملے ضرور کہتا ہیں ۔خواہ ان کے کھیل کا معیار کچھ ہی کیوں نہ ہو اور وہ کیسی ہی مصروفیتوں میں کیوں نہ مشغول ہوں۔ ان باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے ان کا بنیادی طور پر کرکٹر ہونا کافی ہے اور آسٹریلیا تو آج ۱۹۸۹ء میں بھی ایسے کھلاڑی پیدا کر رہا ہے جو انگلستان کی ٹیم کا بھرکس نکال کر رکھ دینے پر قادر ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ انگلینڈ کی ٹیم کا بھرکس کوئی اور نکالے اور ہم خوش ہوں یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے لیکن جب بھی ہمیں ایک شاعر کی نظم 'انتقام' یاد آتی ہے ہم ہمیشہ اس قسم کے احساس میں مبتلا ہو جاتے ہیں ۔آدمی کو شاعری سے اتنا لگاؤ نہیں رکھنا چاہیے ——— عمر اور اخلاق پہ اثر پڑتا ہے ۔

جب ہم کھیلوں کے معاملے میں غور کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آسٹریلیا میں تعلیم نہیں ہوتی صرف کھیل ہوتے ہیں ۔ وہاں کے ٹینس کے کھلاڑی بھی معرکے کے ہوتے ہیں ۔ اگر ہمارا گمان صحیح ہے اور آسٹریلیا میں تعلیم نہیں ہوتی ہے تو کوئی حرج نہیں کیوں کہ چند ملکوں سے قطع نظر جہاں جہاں بھی تعلیم پر زور دیا جا رہا ہے ۔ وہاں صرف امتحانات ہوتے ہیں تعلیم نہیں ہوتی ۔امتحانات کے علاوہ اگر کچھ ہوتا ہے تو انتخابات ہوتے ہیں جن میں کھڑے ہونے والے امیدوار کے قتل کے امکانات ہوتے ہیں ۔مکتب اور مقتل میں کم ہی فرق رہ گیا ہے ۔ اکبر الہ آبادی نے آج سے ۵۰ سال پہلے کالجوں کے بارے میں فرعون کے حوالے سے جو کچھ کہا تھا اب سچ ثابت ہو رہا ہے ۔ اور ہمیں بعض وقت قائل ہونا پڑتا ہے کہ شاعری جزویست از پیغمبری اس لیے ہم اپنا وہ نظریہ واپس لیتے ہیں جس میں ہم نے بتایا تھا کہ شاعری سے لگاؤ رکھنے کی وجہ سے عمر اور اخلاق پر اثر پڑتا ہے ۔ شاعری کا عمر اور اخلاق سے بھلا کیا تعلق ہو سکتا ہے ۔

آسٹریلیا کے کھلاڑی تو خیر معیاری ہوتے ہیں وہاں کے سامعین اور ناظرین بھی بے حد زندہ دل ہوتے ہیں۔ جب بھی کرکٹ میچ دیکھتے ہیں اسٹیڈیم میں کپڑے اتار کر پھینکتے ہیں ۔ تھوڑے تھوڑے پہنے بھی رہتے ہیں ۔ رنگین ٹی وی پر منظر دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورا اسٹیڈیم گرین روم ہے۔ کرکٹ میچ کے نتائج کے لیے آسٹریلیا اور انگلستان کی حکومتیں بے حد پریشان رہتی ہیں ۔ وزرائے اعظم بحث و مباحثہ کرتے ہیں ۔ ڈان بریڈمن جب کرکٹ کھیلا کرتے تھے تو دونوں ملکوں کی حکومتیں گیند اندازی کے مسئلے پر لبنی ایڈی کا بینہ کے غیر معمولی اجلاس منعقد کرتی تھیں ۔کرکٹ کے میدان میں گیند اندازی کے موضوع پر وزیر بحث کریں کمال ہے ۔ بعض ملکوں میں تو گولہ اندازی کے مسئلے پر بھی غور نہیں کیا جاتا ۔ جیسی تو جو [illegible]

آسٹریلیا کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ ملک شہرت پسند نہیں ہے ۔ شہرت پسندی بجائے خود ملوکیت کی ایک شاخ ہے ۔ خواہ مخواہ اخباروں میں چھپتے رہنا اس ملک کا شعار نہیں ہے ۔ اخباروں میں اس کا تذکرہ بس کبھی ہی ہوتا ہے ۔ فنون لطیفہ سے بھی اس ملک نے اپنے آپ کو قدرے فاصلے پر ہی رکھا ہے ہوا اور باقی البتہ وہاں سب کو مرغوب ہے ۔ ہمارا خیال ہے کہ کئی سال پہلے ہم نے آسٹریلیا کے ایک وزیر اعظم کی تصویر دیکھی تھی جس میں انھیں تیراکی فرماتے دکھایا گیا تھا ۔ خوش قسمت ملک ہے کہ وہاں کے وزیر اعظم کو جسے عموماً مصروف ترین شخص ہونا چاہیے تیراکی کے لیے وقت مل جاتا ہے ۔ کچھ ملکوں کے وزیر اعظم تو اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ انھیں دو منٹ نہانے کا وقت بھی مشکل ہی سے ملتا ہے ۔ بعض وقت تو وہ اتنی عجلت میں ہوتے ہیں کہ غسل کرنے کے بجائے ڈرائی کلیننگ پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے

کے بے حد معروف رہنے والے وزراجب کوئی مسئلہ سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں تو دو نئے مسئلے ضرور پیدا کر دیتے ہیں ادب میں اِس عمل کو تخلیقیت کا نام دیا گیا ہے کچھ لوگ اسے ساختیات بھی کہتے ہیں۔

ہم نے سنا ہے کہ آسٹریلیا میں ڈیڑھ سو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ کی آبادی والے براعظم کے لیے اتنی زبانیں کافی ہیں۔ ویسے وہاں کی حکومت چاہے تو ایک دو زبانیں اور بھی رائج کر سکتی ہے یا کسی قدیم زبان کے احیا کے لیے اپنے سالانہ موازنے میں گنجائش نکال سکتی ہے۔ ملک میں ایک لسانی فارمولا تو ہونا ہی چاہیئے لیکن آسٹریلیا شاید پسماندہ علاقہ ہے جس علاقے میں اکثریت اور اقلیت نہ ہو وہ پسماندہ ہی تو کہلائے گا۔

آسٹریلیا کو پسند کرنے کی ایک وجہ وہاں کے عمدہ عمدہ جانور بھی ہیں۔ کنگرو وہاں کا سب سے عمدہ اور نفیس النفس جانور ہے۔ یہ جانور اپنے بچوں کو اتنا عزیز رکھتا ہے کہ انھیں پیدل نہیں چلنے دیتا۔ اپنی جیب میں لیے گھومتا ہے۔ اس کی جیب جو قدرت کا بہترین عطیہ ہے بچوں کا بستہ بھی ہے۔ اور گل دستہ بھی۔ بچے اس میں اِس طرح سما جاتے ہیں جس طرح اسکول کے بستوں میں کتابیں اور گلدان میں پھول۔ بعض حاسد قسم کے لوگ البتہ یہ کہتے ہیں کہ یہ بچے ہیں یا پچے۔ اچھا ہوا ایسا جانور ہمارے یہاں نہیں ہے ورنہ ہم لوگ تو اس کی جیب بھی کاٹ لیتے ——— کنگرو کو ہم نے اچھلتے تو نہیں دیکھا لیکن جغرافیہ کی کتابوں میں آیا ہے کہ جانور پندرہ فٹ کی اونچائی تک اچھل سکتا ہے۔ حد ہوگئی۔ اسے تو پول جمپ میں حصہ لینا چاہیئے اسے بانس کی ضرورت ہی نہیں۔ اتنا بلند خیال اور بلند عمل چوپایہ شاید ہی کسی دوسرے براعظم میں ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ آسٹریلیا کو براعظم کا رتبہ دینے کی ایک وجہ یہ چوپایہ بھی ہو۔

اس کے علاوہ آسٹریلیا کی بھیڑیں بھی قابل دید ہوتی ہیں۔ یہ اپنے کثیر المقدار دودھ کے علاوہ اپنے اون کے لیے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ اتنی اونی اور سرما شکن بھیڑیں کسی اور ملک میں نہیں پیدا ہوتیں۔ اِن بھیڑوں کے اون سے تیار کیے ہوئے کوٹ، انگلستان اور امریکہ کی خواتین میں اتنے مقبول ہیں کہ ایسی خاص شادی شدہ خاتون فرکے ایک لبادے کی خاطر خاوند بدلنے کے لیے ہمیشہ کمر بستہ رہتی ہے۔ کمر بستہ اس لیے کہ ان کے واقعی کمر ہوتی ہے۔ ہندوستانی خواتین کا معاملہ الگ ہے۔ اگر ان کے کمر ہوتی بھی ہے تو کم سے کم کسی شاعر کو نظر نہیں آتی یا وہ اسے مصلحتاً نظر انداز کر دیتا ہے۔ تصور کی نظر البتہ تیز ہوتی ہے یوں بھی تصور کے لیے باریک بین ہونا ضروری ہے۔ یوروپی ملکوں میں جتنی بھی طلاقیں ہوتی ہیں اُن میں سے بیشتر طلاقوں کے لیے آسٹریلوی بھیڑوں کو ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ ان کی نرم و نفیس اون کی قربان گاہ پر کتنے ہی شوہر بھینٹ چڑھ گئے۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے چند شوہروں نے خدا کا شکر بھی ادا کیا کہ ان کی مشکل آسان ہوگئی۔

آسٹریلیائی بھیڑیں نہایت شائستہ بھی ہوتی ہیں۔ سفید چمکیلے اون میں پوری طرح ملبوس یہ بھیڑیں کسی میدان یا مرغزار میں اپنا خاموش مورچہ لے کر نکلتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دودھ کی نہر بہہ رہی ہے اور جب یہ بھیڑیں کہیں پابستہ کھڑی ہو جاتی ہیں کہ آگے بڑھیں گی دم لے کر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر دودھ بھرے بادلوں کا کوئی سمندر ہو رہا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ آسٹریلیائی دودھ ہم نے بھی کبھی نہ کبھی ضرور پیا ہوگا جب ہی تو ہم آسٹریلیا آسٹریلیا کرتے رہتے ہیں۔ یہ دودھ ہم نے اُس وقت پیا ہوگا جب یہ یہاں مفت فراہم ہوتا تھا۔ اب یہاں کوئی چیز مفت نہیں ملتی۔ فقیر بھی

گالی دیتا ہے تو کچھ پیسے لے کر ہی دیتا ہے ۔ دعا درکار ہو تو کسی حقیر رقم کے بدلے یہ حاصل نہیں ہوتی ۔ ایک خطیر رقم پیش کرنی ہوتی ہے جو گرہ میں نہیں ہوتی ۔ یوں دیکھا جائے تو ہمارے یہاں بہتوں کے پاس گرہ ہوتی ہی نہیں ہے جو ہوتی ہے وہ صرف کسی طرح مصرع پر لگانے کے کام آتی ہے اور بعض وقت یہ بھی ضائع ہو جاتی ہے ۔ کسی غریب فرہاد کی لگائی ہوئی گرہ ایک پرویز کی گرہ کے مقابلے میں ماند پڑ جاتی ہے ۔

آسٹریلیا میں فضا ہی فضا ہے ۔ ملک میں صرف چند شہر ہیں وہ بھی ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر کہ کسی دوسرے ملک کے شہر معلوم ہوتے ہیں ۔ ہم وہاں جانا بھی اسی لیے چاہتے ہیں کہ فاصلے دیکھیں ۔ شہر دیکھنے کی ہوس کسے ہے ۔ شہر تو خود ہمارے یہاں بیسیوں پڑے ہیں شہریت البتہ معدوم ہے ۔ اس لیے ہمارے یہاں جو بھی سیاح آتے ہیں آثار قدیمہ دیکھ کر واپس ہو جاتے ہیں ۔ یہاں سے واپس جاتے وقت ان سیاحوں کے پاس صرف تصویریں ہوتی ہیں ۔ آثار قدیمہ کی تصویریں یا عوام الناس کی تصویریں جو صورت سے آثار قدیمہ دکھائی دیں ۔ آسٹریلیا میں شاید آثار قدیمہ نہیں ہیں ۔ ہم اگر وہاں گئے تو ہم ہی سب سے قدیم چیز ہوں گے ۔

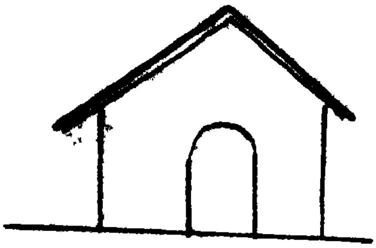
جہاں تک زمین کے پُرخیز ہونے کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ یہ اتنی پُرخیز ہے کہ بیگن کے بیج ڈالو تو شفتالو پیدا ہو جائیں ۔ ویسے کوشش تو ہم بھی کرتے ہیں جو بو کر گندم اگانا چاہتے ہیں لیکن یہ مٹی ہماری مدد نہیں کرتی ۔ وہاں کے باشندے کبھی پورا پھل نہیں کھاتے وہاں اس قسم کی باتیں مشہور بھی نہیں ہیں کہ امرود کھاؤ تو پورا کھاؤ ۔ اس میں ایک بیج ہوتا ہے جو بہت مفید ہوتا ہے ۔ آسٹریلیا کے باشندے ہمیشہ آدھا پھل کھا کر آدھا یوں ہی چھوڑ دیتے ہیں ۔ ان ہی آدھے آدھے پھلوں کے جام ، جیلی اور مربّے ڈبوں میں بند کر کے ان ملکوں کو بھیجے جاتے ہیں جہاں غریبی ہٹاؤ کی مساعی جمیلہ اخباروں میں ہوا کرتی ہیں ۔ جو شخص بھی یہ مربا کھاتا ہے سمجھتا ہے وہ تجمل حسین خاں ہو گیا ۔ مہینے دو مہینے میں اس قسم کا عیش بھی بہت ہوتا ہے ۔

آسٹریلیا کے کچھ درختوں کی تصویریں دیکھ کر تو ہم عش عش کر بیٹھے ہیں ۔ ہم سے کھڑا نہیں ہوا جاتا ۔ ان میں سے ایک درخت کا نام ہی باٹل ٹری BOTTLE TREE ہے شجر مینائی ۔ یعنی ہے شجر میں شراب کی تاثیر جو لوگ بھی آسٹریلیا ہو آئے ہیں ان کا بیان ہے کہ جب بھی ہوا چلتی ہے اس درخت سے وہی آواز آتی ہے جسے قلقل مینا کہا جاتا ہے ۔ ان لوگوں کا یہ بیان بھی ہمیں آسٹریلیا جانے پر اُکساتا ہے ۔

آسٹریلیا میں صحرا بھی بہت ہیں صرف مجنونوں کا قحط ہے ہم اگر وہاں گئے تو صحرا کی اداسی بھی دور ہو جائے گی ۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے یہاں سے جانے کی وجہ سے یہاں کے قحط الرجال میں مزید اضافہ ہو جائے گا لیکن ہم ہمیشہ کے لیے تھوڑے ہی جانا چاہتے ہیں ۔ کچھ دن بعد واپس آ جائیں گے اور اپنا سفرنامہ لکھیں گے

●● ..

رضا نقوی واہی
(پٹنہ)



گھر کی رونق

ہم اپنے اہلِ سیاست کے دل سے قائل ہیں
کہ حق میں قوم کے وہ مادرِ مسائل ہیں

قدم قدم پہ نئے گُل کھلاتے رہتے ہیں
طرح طرح کے مسائل اُگلتے رہتے ہیں

کبھی یہ دُھن ہے کہ صوبوں کی پھر سے ہو تشکیل
کبھی یہ ضد ہے کہ حد بندیاں نہ ہوں تبدیل

کبھی یہ شور، کرو ختم چور بازاری
منافع خوروں کی لیکن نہ ہو گرفتاری

کبھی یہ غل ہے کہ ہم بھی بنائیں ایٹم بم
اگرچہ بھُس ہو زیادہ، یورینیم ہو کم

برائے بحث کھڑا ہے کبھی یہ ہنگامہ
لباس قوم کا دھوتی ہو یا کہ پاجامہ

ہر ایک بحث میں کچھ کشت و خوں ضروری ہے
نہیں تو جو بھی ہے تحریک وہ ادھوری ہے

ہر ایک فتنہ و شورش کا آخری جلوہ
مظاہرات و جلوس و تصادم و بلوہ

یونہی اُٹھائی گئی بحث جب زباں کے لیے
"سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لیے"

وہ مسئلہ کہ جو دانش کدوں میں حل ہوتا
بلا سے آج اگر طے نہ ہوتا، کل ہوتا

اُسے بھی اہلِ سیاست نے کر لیا اغوا
اور اس کے بعد وہ سب کچھ ہوا جو ہونا تھا

نفاق و بغض و تعصّب کے آ گئے ریلے
زباں کی آڑ میں اہلِ فساد کھُل کھیلے

مخاصمت میں ہوئی جا بہ جا صف آرائی
جلوس لے کے چلے اک طرف سے بلوائی

لبوں پہ نعرۂ "انقلاب زندہ باد"
مگر دِلوں میں دبائے ہوئے شرارِ فساد

دکانیں لُوٹی گئیں، راہ گیر مارے گئے
گھروں میں آگ لگی، طفل و پیر مارے گئے

وہ پہلا شخص جو کھا کر چھُرے کا زخم گرا
مزے کی بات تو یہ ہے، غریب گونگا تھا

مزید یہ کہ اُسے جاں سے مارنے والے
کسی زبان سے واقف نہ تھے، خود اَن پڑھ تھے

★

تماشائی

دلیپ سنگھ
(دہلی)

دو سال پہلے کی بات ہے مجھے امریکہ جانے کا اتفاق ہوا۔

یہ حادثہ کیسے ہوا یہ بھی سننے کی بات ہے۔ ایک دن میں گھر سے انڈیا گیٹ کے لان پر لگا ہوا ایک میلہ دیکھنے نکلا۔ سو روپے کا ٹکٹ لے کر جب میں میلے میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ میلے میں جانے کا ٹکٹ دراصل لاٹری کا ٹکٹ ہے اور جس کے نام لاٹری اٹھے اس خوش قسمت کو امریکہ تک جانے کا ایک ٹکٹ مفت دیا جائے گا۔ یہ اعلان سننے کے بعد میری دل چسپی میلے میں گھٹ گئی اور امریکہ میں بڑھ گئی۔ لوگ جب کباب خرید کر کھا رہے تھے اور جھولوں پر جھول رہے تھے میں ایک کونے میں بیٹھا دعا مانگ رہا تھا کہ میری لاٹری اٹھ جائے۔ شام کو جب لاٹری کھلی تو میرے ہاتھ میں امریکہ کا ایک ٹکٹ تھما دیا گیا۔

جب ٹکٹ مل گیا تو امریکہ جانا ہی تھا۔ ہمارے ہاں تو لوگ بغیر ٹکٹ سارا ہندوستان گھوم آتے ہیں میرے پاس تو باقاعدہ ٹکٹ تھا۔

بہت کوشش کے بعد پتہ چلا کہ ہمارا ایک بہت ہی دور کا رشتہ دار امریکہ میں رہتا ہے۔ اردو میں محبت بھرے خط لکھ کر اس دور کے رشتے کو قریبی رشتے میں تبدیل کیا گیا اور ہم نیویارک جا پہنچے۔

اس قریبی رشتہ دار نے ہمیں نیویارک کی خوب سیر کرائی۔ جب ہمارے قیام کی مدت ختم ہونے کو آئی تو اس نے یاد دلایا کہ ہم نے وہ تیس منزلہ سٹور تو دیکھا ہی نہیں جس کی شہرت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس نے کہا: یہ سٹور دنیا کا سب سے بڑا سٹور ہے۔ یہ تمھیں ضرور دیکھنا چاہیے۔ اس سٹور کی خوبی یہ ہے کہ اس میں سوئی سے لے کر ہاتھی تک بیک وقت خریدا جا سکتا ہے۔

میں نے بہترا اُسے سمجھایا کہ مجھے نہ تو سوئی کی ضرورت ہے نہ ہاتھی کی۔ لیکن وہ نہیں مانا کہنے لگا اس سٹور کے اندر گھوم لینا ہی زندگی کا ایک تجربہ ہے جسے تمھیں ضرور حاصل کرنا چاہیے۔ چنانچہ ایک دن وہ مجھے سٹور کے اندر دھکیل کر خود چلا گیا۔

اندر جاکر میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ پہلے ہی سیکشن میں جو گیا تو دیکھا کہ صرف سینٹ کی شیشیاں

رکھی ہیں اتنی شیشیاں کہ اگر انھیں لنڈھا دیا جائے تو خوشبو کی لہریں پورے ہندوستان کی فضا کو معطر کردیں۔ حالاں کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ پریشانی صرف یہ تھی کہ میری جیب میں کل چار ڈالر تھے اور چار ڈالروں میں خوشبو کی شیشیوں کو لنڈھانا تو درکنار ہاتھ لگانا بھی ممنوع تھا۔

سٹور میں میری حالت ایک ایسے خریدار کی تھی جو صرف خواہشات کے زور پر دنیا کی نعمتیں خریدنا چاہتا ہے۔ پھر خیال آیا کہ اپنے ملک میں گھی اور چاولوں کے بغیر پلاؤ پکایا جاسکتا ہے جسے لوگ خیالی پلاؤ کہتے ہیں۔ وہی نسخہ امریکہ میں کیوں استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

چناں چہ جیب میں اپنی غریبی کو مضبوطی سے تھامے اور اپنے دل و دماغ پر امیری سوار کیے ہوئے خوشبو کی شیشیوں کا معائنہ کرنے لگا۔ اچانک سٹور کے اس پاس سیکشن کا انچارج میرے سامنے آکھڑا ہوا اور کہنے لگا:

"کہیے حضور میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔"

اب آپ ہی بتائیے جس شخص کی جیب میں کل چار ڈالر ہوں اور دنیا بھر کے سامان پر اس کی نظر ہو۔ اس کی کوئی کیا خدمت کرسکتا ہے۔ چناں چہ میں نے جواب دیا۔

"میں بس دیکھ رہا ہوں۔" اس نے تعظیم سے جھک کر کہا۔ "خوشی سے دیکھیے۔"

یہی سلوک میرے ساتھ کپڑوں والے سیکشن میں ہوا۔ بالکل یہی سلوک میرے ساتھ برتنوں والے سیکشن میں ہوا اور بالکل ایسا ہی سلوک میرے ساتھ جوتوں والے سیکشن میں ہوا۔ مجھے لگا کہ انچارج لوگ میری راہ میں روڑہ اٹکا رہے ہیں۔ میں اس بڑے سٹور کو صرف دیکھنا چاہتا ہوں لیکن یہ لوگ مجھے اپنا سب کچھ بیچنا چاہتے ہیں۔ اس وقت میرے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا وہ تھا باہر جانے کا راستہ۔ چپ چاپ سٹور سے باہر نکل جاؤں اور پھر ہندوستان جاکر اپنے تخیل کا سہارا لے کر قصے سناتا رہوں کہ میں نے اس بڑے سٹور کی تیس منزلوں میں کیا کیا دیکھا۔ جب ہمارے دوست لندن میں چار دن گزار کر تین تین سو صفحوں کا سفر نامہ لکھ سکتے ہیں جس میں چالیس عورتوں سے ان کے عشق کا ذکر ہوتا ہے جو ریاضی کے مطابق دس عورتیں ایک یوم کے حساب سے پڑتی ہیں تو میں آدھ گھنٹہ ایک اسٹور میں رہ کر اس کی تیرہ منزلوں کا حال کیوں نہیں سنا سکتا۔؟

میں دروازے کی طرف مڑا ہی تھا کہ کسی شخص نے میرا راستہ روک لیا اور میرے خالی ہاتھوں کی طرف دیکھ کہنے لگا: "کیا حضور کو ہمارے سٹور میں کچھ بھی پسند نہیں آیا۔" اس کا لہجہ کچھ اتنا ہمدردانہ تھا کہ میں نے اسے اپنی پڑکتھا سنا دی۔ میں نے کہا "میں ایک سیاح ہوں اور عام سیاحوں کی طرح کچھ خریدنے کا اہل نہیں ہوں۔ فی الحال میں صرف آپ کا سٹور دیکھنے آیا ہوں۔ لیکن یہاں کے ملازم مجھے سٹور دیکھنے نہیں دے رہے ہیں۔ اگر آپ مجھے اس اسٹور کو بلا روک ٹوک دیکھنے میں میری مدد کریں گے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے یار دوستوں اور رشتہ داروں کو سودا خریدنے کے لیے یہیں بھیجوں گا۔

وہ ہنسا اور کہنے لگا۔ آپ بے شک گاہک بھیجنے کی تکلیف نہ کریں کیوں کہ روٹی تو ہمیں اللہ کے فضل سے مل ہی رہی ہے لیکن سٹور دیکھنے کا بندوبست میں کر دیتا ہوں۔ آیئے میرے ساتھ۔
بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس سٹور کا مالک ہے۔ وہ مجھے اپنے دفتر میں لے گیا اور بصد خلوص اس نے میرے کوٹ کے کالر پر ایک تمغہ لگا دیا یوں جیسے مجھے پدم شری کا خطاب دے رہا ہو۔ تمغہ لگا کر کہنے لگا: "اب آپ کہیں بھی جائیے۔ سٹور میں آپ کو کوئی نہیں روکے گا۔"

میں نے جلدی سے آکر ایک آئینے میں دیکھا۔ تمغے پر لکھا تھا۔ "صرف دیکھ رہا ہے۔" اس کے بعد میں کہیں بھی گیا سٹور کے ملازم میرے پاس آتے تھے اور تمغے کی عبارت پڑھ کر مسکراتے ہوئے چلے جاتے تھے

ہندوستان لوٹنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ مجھے چاہیے تھا کہ کہیں سے ادھار مانگ کر ایسے کئی تمغے خرید لاتا کیوں کہ ایسے تمغوں کی یہاں ضرورت ہے۔
دہلی میں میرے گھر کے سامنے کوئی سڑک کھود گیا ہے۔ یہ کوئی ایک سال کی بات ہے۔ برسات ہوئی تو اس کھودے ہوئے حصے میں پانی بھر گیا۔ یہ پانی مٹی کے ساتھ مل کر کیچڑ کی شکل اختیار کر گیا۔ میرا گھر سے نکلنا دوبھر ہو گیا۔ میں نے متعلقہ محکموں میں کئی درخواستیں دیں کہ اس سڑک میں سے جو خزانہ آپ نکالنا چاہتے تھے وہ اگر نکال چکے ہوں تو اب سڑک کے گڑھے کو بند کر دیجیے۔ ہر بار جواب یہ آتا تھا کہ ہم آپ کی شکایت کو دیکھ رہے ہیں۔ اگر میں امریکہ سے بہت سے تمغے لایا ہوتا تو ان میں سے کم از کم ایک تمغہ تو اس محکمے کے افسر کی چھاتی پر آسانی سے لگایا جا سکتا تھا۔
ایک ایڈیٹر کو میں نے ایک مضمون بھیجا بغرضِ اشاعت۔ اس واقعے کو نو مہینے گزر گئے۔ وہ نہ تو اسے شائع کرتا ہے اور نہ ہی اسے لوٹاتا ہے۔ ہر بار جب یاد دہانی کراتا ہوں تو جواب دیتا ہے کہ آپ کے مضمون کو ہم دیکھ رہے ہیں۔ اس ایڈیٹر پر کیا اس تمغے کا حق نہیں ہے؟
کوئی چھ مہینے پہلے میرے ہاں ایک صاحب تشریف لائے تھے۔ کہا یہ تھا کہ وہ اپنی دختر نیک اختر کی شادی کے سلسلے میں مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ پہلی بار آئے تو میری عمر پوچھ کر اور قد و قامت دیکھ کر چلے گئے۔ پھر آئے تو ملازمت اور تنخواہ کے بارے میں سوال کرتے رہے۔ تیسری بار آئے تو میرے خاندان کا شجرۂ نسب بنا کر ساتھ لے گئے۔ پھر آئے تو مجھے چلا پھرا کر اور بلا جلا کر دیکھتے رہے۔ اس طرح میری امید بندھتی رہی۔ لیکن جب دیکھا کہ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر رہے تو میں نے اپنے عزیزوں کی معرفت یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ بیٹی کی شادی کا ارادہ ہے یا وقت گزاری کر رہے ہیں۔ میرے عزیزوں نے جب ان سے پوچھا تو انھوں نے جواب دیا "میں لڑکے کو دیکھ رہا ہوں" پتہ نہیں میری شادی یہاں ہوگی یا نہیں اور اگر شادی ہو گئی تو لڑکی میرے حق میں نعمت ثابت ہو گی یا مصیبت۔ لیکن اس وقت میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ امریکہ کے ایک تمغے پر ان بزرگ کا حق ضرور ہے۔
اس تمغے پر ان افسروں اور کلرکوں کا بھی حق ہے جو فائلیں دیکھ رہے ہیں اور بس دیکھ رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی فرم یہاں ایسے تمغے بنانا شروع کرے تو بکری لاکھوں میں ہو سکتی ہے۔ لیکن میں جب بھی کسی کارخانے دا

سے اس سلسلے میں بات کرتا ہوں تو وہ یہی جواب دیتا ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ایک حکمران نے اس تمغے پر لکھی عبارت کا خوب فائدہ اٹھایا۔ پتہ نہیں اسے اس تمغے کا پتہ کہاں چلا امریکہ کے اس سٹور سے معلوم ہوا یا یہ اس کے کسی مشیر کا مشورہ تھا کہ یہ تمغہ بڑا کارآمد ہے، اسے استعمال میں لایئے۔ حکمران کو یہ مشورہ اتنا پسند آیا کہ اس نے اسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ تمغے کی عبارت تو یہی تھی لیکن حکمران صاحب نے اس میں دو بڑی تبدیلیاں کیں۔ پہلے یہ کہ اس نے یہ عبارت اپنے کوٹ کے کالر پر لکھنے کی بجائے اپنی زبان پر لکھ لی اور دوسرے یہ کہ اس نے اس عبارت کی کئی شکلیں بنا لیں۔ اس کی زبان پر کبھی تو یہ عبارت ہوتی تھی۔ "ہم دیکھ رہے ہیں" کبھی یہ کہ "ہمیں دیکھنا ہے" اور کبھی یہ کہ ہم دیکھیں گے۔"

میں ان کی قابلیت کی داد دیتا ہوں کہ انھوں نے اس تمغے کی عبارت کو اپنی یا اپنے مشیروں کی تخلیقی قوت سے وسعت بخشی۔ لیکن اس کا ایک نقصان بھی ہوا۔ یہ نعرہ (تمغے کی عبارت کو نعرہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جو شے زبان تک پہنچ گئی وہ سمجھ لیجیے نعرہ بن گئی) رعایا کو بہت پسند آگیا۔ حکمران نے جب بار بار رعایا سے کہا کہ "ہم دیکھیں گے" تو رعایا بھی کہنے لگی کہ ہم بھی تجھے دیکھیں گے۔ نتیجہ اس کا حکمران کے لیے بہت خطرناک نکلا۔ وہ بے چارہ تو صرف کہتا ہی رہا کہ ہم دیکھیں گے لیکن رعایا نے تو سچ کر دکھایا کہ ہم "تجھے دیکھ لیں گے"۔ ●●

ایک نظم

طالب خوندمیری
(حیدرآباد)

کسی خاتون نے اپنی پڑوسن سے کہا اک دن
سُنا ہے
تم پرائی عورتوں سے اپنے شوہر کی شکایت کرتی پھرتی ہو
یہ بات اچھی نہیں آپا
نہایت نامناسب ہے
مجھے دیکھو
مرا شوہر گدھا ہے، ایڈیٹ ہے وہ، لفنگا ہے
نرا اُلّو کا پٹھا ہے
مگر تم ہی کہو
مَیں نے کسی سے آج تک اس کی شکایت کی ؟؟

قطعات

وہ مجھ سے کل اکتیس ڈسمبر کی رات کو
کچھ کہنا چاہتا تھا کہ بھونچال آگیا
ہکلا رہا تھا اتنا وہ دورانِ گفتگو
دو لفظ کہہ سکا کہ نیا سال آگیا

ایک محفل میں سُنایا میں نے جب اپنا کلام
ایک اِک مصرعہ سخن کی آبرو بننے لگا
میرے چہرے پہ ٹماٹر کیک پیک آنے لگے
دیکھتے ہی دیکھتے میں سرخرو ہونے لگا

قطعات

راغب مرادآبادی
(کراچی)

ناخن جو کترنے کی تھی شوہر کو وہ عادت
بیگم نے فقط حُسنِ تدبّر سے چھُڑا دی
نمّی نے پڑوسن سے جو پوچھا، کہ وہ کیسے
اِٹھلا کے کہا میں نے بتیسی ہی چھپا دی

کہا مجھ سے یہ کل اک نوجواں نے
ضرورت اب نہیں باقی خُدا کی!
سبب پوچھا، تو فرمایا بصد فخر
کہ میں سیّد ہوں، لیکن اِشتراکی

سرِ راہ، کل ایک نوعمر شاعر
غزل دُھن میں بہزاد کی گا رہا تھا
مجھے اُس کی آواز کے زیر و بم پر
خیال اختری بائی کا آ رہا تھا

کیا دلانا داخلہ بیٹی کو، لے آیا میں گھر
جب قدم رکھتے ہی دیکھا میں نے علمیّت کا زور
لکھ رہی تھیں بورڈ پر اسکول کی ٹیچر جواب
گورخر تھے، والدِ مرحوم تھے، بہرام گور

گزر رہے تھے گلی سے جنابِ شیخ اس طرح
کہ جیسے کوئی کرم کا اُمیدوار چلے
نظر ملی تو کہا نائکہ نے کوٹھے سے
"چلے[1] بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے"

اک شخص کہہ رہا تھا کہ صرف اشتراکیت
انسانیت کی چارہ گر و دردمند ہے
یہ سُن کے اِک گنوار نے، بے ساختہ کہا
اِنساں نہیں، یہ کوئی ترقی پسند ہے

[1] یہ مصرع فیض احمد فیض کا ہے۔

مسیح انجم
(حیدرآباد)

"مجسمے بولتے ہیں!"



مہاتما گاندھی جی کا یہ قول خونِ دل سے لکھنے کے
قابل ہے کہ غلط طریقوں سے صحیح نتائج کے برآمد ہونے کی توقع رکھنا
حماقت ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ہمارے ملک کے پیشہ ور سیاست داں ہیں
گاندھی جی کے اس قول کو پچھلے چالیس سال سے غلط ثابت کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے
ہیں۔ اور وہ ان کوششوں میں غلطیوں پر غلطیاں کرتے ' غلطیوں کی سنچریاں بناتے جا رہے ہیں' اور
آوٹ نہیں ہو رہے ہیں۔ آپ نے غالباً دیکھا ہوگا کہ چند برس پہلے حسین ساگر پر چند مجسمے کھڑے کئے گئے تھے جن کا
مقصد شاید حسین ساگر کی خوبصورتی بڑھانا تھا۔ لیکن یہ مجسمے فضائی آلودگی اور بسوں اور گاڑیوں سے خارج ہونے والے
دھوئیں کی وجہ سے دن بدن کالے ہوتے جا رہے ہیں بلکہ بعض مجسمے تو کھانسنے بھی لگے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی کھانسی
کسی کو سنائی نہیں دیتی۔ اگر بے حسی کا یہی حال رہا تو اندیشہ ہے کہ کسی دن یہ مجسمے اپنے چبوترے چھوڑ کر اچانک سڑک پر
آجائیں گے۔ اور لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ اور اگر ایسا نہیں ہوا تو کیا عجب کہ انتخابات کے بعد شکست خوردہ لیڈر
خود مجسموں کے بیچ میں ہاتھوں میں وزیٹنگ کارڈ تھامے، رات کے وقت حسین ساگر پر چمتکار دکھانے لگ جائیں
اور فریک ساتھ غائب ہو جائیں۔ ہمارے دل میں کچھ اسی قسم کے وسوسے پرورش پا رہے تھے کہ ایک دن پتہ نہیں کس نے
یہ بات اڑائی کہ حسین ساگر پر مجسمے بولنے لگے ہیں! اس ایک سطری سنگل کالم کی خبر نے وہ غضب ڈھایا کہ شہر میں افواہوں
کا بازار گرم ہو گیا اور ہونٹوں کا کاروبار چمک اٹھا۔

من گھڑت بات بھی کیا جذب و اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے (واہی)

ہونٹوں سے نکلی ہوئی بات ہونٹوں میں ہوٹلوں، شراب خانوں اور قہوہ خانوں سے ہوتی ہوئی
دیوان خانوں اور زنان خانوں تک پہنچ گئی۔ حتیٰ کہ ہمارا زنان خانہ جو
دیوان خانہ، تخت خانہ، مرغی خانہ اور خانہ خانہ سب کچھ ہے
اس کی زد میں آگیا۔

وہ گھر جہاں روزانہ ہمارے غیاب میں اڑوس پڑوس کی ساس بہو کے قصے اور مسائل زیر بحث آتے تھے، اچانک افواہوں کی ایجنسی میں تبدیل ہو گیا۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ "بغواس براڈکاسٹنگ کارپوریشن" میں تبدیل ہو گیا۔ چنانچہ اُس دن گھر میں قدم رکھتے ہی بیگم نے پوچھا "کیا خبر لائے ہو؟ کیا یہ سچ ہے کہ حسین ساگر پر مجسمے بولنے لگے ہیں؟ اور اگر بولتے ہیں تو کیا بولتے ہیں؟ اور کیسے بولتے ہیں؟"

ہم نے اتنے سارے سوالوں کے جوابات دینے کی بجائے بیگم کو چپ کروانے کے لیے کہا "کیسے کیا! منہ سے بولتے ہیں، اور کیسے بولتے ہیں"؟

بیگم بھی کب چپ رہنے والی تھیں۔ بولیں "اتنا تو میں بھی جانتی ہوں کہ منہ سے بولتے ہیں! لیکن یہ بتائیے کہ کس زبان میں بولتے ہیں؟"

ہم نے کہا "بیگم ذرا آہستہ بولو! اور زبان کا مسئلہ مت چھیڑو! کسی نے سن لیا تو فساد کا آغاز یہیں [illegible] گا اور ہمارے گھر کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔ اب رہی مجسموں والی بات تو میرا یہ خیال ہے (جس سے [illegible] متفق ہونا کوئی ضروری نہیں) کہ مجسمے بول نہیں رہے ہوں بلکہ دھول اور دھوئیں کی وجہ سے کھانسنے لگے ہوں"!

بیگم نے پوچھا "کیا کسی نے ان کی کھانسی سنی ہے؟ کورس کی شکل میں کھانستے ہیں یا الگ الگ؟"

ہم نے سمجھایا "جان کو کھانستے کسی نے نہیں سنا! ہو سکتا ہے مجسمے کھانسنے میں بھی احتیاط برت رہے ہوں تاکہ لوگ ان کی کھانسی کو سیاسی اور مذہبی رنگ دے کر تلگو کھانسی، اردو کھانسی، ہندی کھانسی، مراٹھی کھانسی، کنڑا کھانسی کا الزام نہ لگائیں اور پھر انھیں زندہ جان کر توڑ پھوڑ شروع نہ کر دیں۔ آخر مجسموں کو بھی تو اپنا احترام عزیز ہے"!

بیگم بولیں "میں تو صرف ایک ہی کھانسی جانتی تھی ـــــ کالی کھانسی، جو بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ آپ نے تو اتنی ساری کھانسیاں گنوا دیں۔ جب اردو کھانسی کی بات آ ہی گئی ہے تو لگے ہاتھ ذرا اردو کھانسی کھانس کر دکھائیے آپ تو اردو کے ادیب ہیں نا!

ہم نے کہا "بیگم اب مجھے زیادہ طیش مت دلاؤ! اگر میں اردو کھانسی کھانسنے لگ جاؤں تو اندیشہ ہے کہ کھانسی کے ساتھ ساتھ خون بھی آ جائے!

○

پھر یوں ہوا کہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے اندر باہر اس افواہ نے سارے شہر کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ [illegible] عوام دھام چھوڑ کر تبصروں میں مصروف ہو گئے۔ کوئی اسے قرب قیامت کے آثار بتانے لگا، تو کوئی اسے [illegible] کی [illegible] کا نتیجہ۔ شاعروں کو موضوع سخن ہاتھ آیا۔ [illegible] اور سیلیبریٹ کے لیے مواد اکٹھا کرنے لگے اور جن لوگوں کو اس کی ہوا نہیں لگی وہ راہگیروں سے پوچھ پوچھ کر [illegible] سننے لگے۔ چنانچہ اسی تجسس میں ایک رکشا والے نے حسین ساگر کی طرف سے آنے والے ایک [illegible] سے پوچھا "اُستاد! اُدھر سب خیریت تو ہے نا! سنا ہے کہ حسین ساگر پہ مجسمے بولنے لگے ہیں اور [illegible]

زبان عوام میں؟ یا انٹرنیشنل زبان میں؟ یا پبلک کی زبان میں؟"

وہ رکشا والا جو سامی قوم کے بل بوتے پر دورانِ گفتگو ایک آدھ انگریزی لفظ ناقابلِ معافی تلفظ میں بولنے کا عادی تھا، بولا "حیدرآباد میں استاد! جیل اگری تو بھینس اڑی! یہ سب پروب بنڈہے؟" لفظ بنڈ سن کر پہلا رکشا والا جو بہت سمجھدار معلوم ہوتا تھا، ہنسا اور پھر بولا "یہ نیا بنڈہ کہاں سے پیدا ہوا استاد؟ باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو چکر دینے کے لیے شاہی بنڈہ، پسل بنڈہ، آقا بنڈہ، بورہ بنڈہ، ابلا بنڈہ جیسے ہمارے نام ہی بہت ہیں۔ اب مزید "بنڈے" برداشت نہیں کیے جاسکتے! تو جو کہنا چاہ رہا ہے وہ لفظ "پروب بنڈ" نہیں، پروپیگنڈہ ہے!"

اس اصلاح کو اپنی توہین سمجھ کر دوسرا رکشا والا ذاتیات کی سطح پر اتر آیا:

"ابے او دکنی انگریز! تو زیادہ قابلیت مت جھاڑ! میں ابھی تیری "ہسٹری" کھول دوں گا!"

پہلے رکشا والے نے پھر تصحیح فرمائی۔

"ابے وہ لفظ "ہسٹری" نہیں، ہسٹری ہے ہسٹری!" اس سے پہلے کہ بات بڑھے وہ وہاں سے رفوچکر ہوگیا۔

اس افواہ کو بہانہ بنا کر جب ایک سڑک چھاپ فرہاد نے کالج کی ایک تیز و طرار طالبہ کا راستہ روک کر پوچھا۔ "سنا ہے، ڈارلنگ کہ حسین ساگر پر مخدوم صاحب بھی کچھ بولنے لگے ہیں اور آٹوگراف دینے لگے ہیں، یہ کہاں تک سچ ہے؟" تو کالج کی طالبہ نے آٹوگراف کے طور پر ایک زوردار تھپڑ رسید کردیا۔ جس کے ساتھ ہی اس نوجوان کو خدا یاد آگیا اور وہ بے ساختہ چیخ پڑا۔ "ربنا"!

طالبہ نے کہا "آمین"! پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی!

فٹ پاتھ پر چلنے والے دوسرے نوجوانوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ وہ سڑک چھاپ فرہاد سڑک پر بیٹھا اپنے دائیں گال پر دیئے گئے اِس سرخی مائل آٹوگراف کو بری طرح سہلا رہا تھا۔

جب یہ افواہ پیشہ ور عاملوں کے پاس پہنچی تو ایک مسلمان عامل نے ہندو عامل سے پوچھا:

"مہاراج! سنا ہے کہ حسین ساگر پر مجسمے بولنے لگے ہیں! کیا یہ ممکن ہے کہ مجسمے بول سکیں؟" ہندو عامل نے کہا "حضور! یہ کون سا مشکل کام ہے، بس چھ کروڑ ناریل کا بندوبست کروادو، میں ابھی چل کر مجسموں کو ڈائیلاگ بولنے لگواؤں گا۔"

اس پر مسلمان عامل نے فرمایا "اچھا یہ بات ہے! تو پھر میں بھی مجسموں کو وجد میں لاسکتا ہوں۔ ہے کوئی مائی کا لال جو چھ کنٹل عود، چھ کنٹل لوبان، پچیس کنٹل پیور (PURE) گھی کا بندوبست کردے!"

چھ چھ پچیس کا پہاڑہ پڑھتی ہوئی فہرست کو جانچ کر ہندو عامل نے کہا۔ "قبلہ! یہ فہرست تو بہت وزنی ہے!" مسلمان عامل نے فرمایا "چھ کروڑ ناریل بھی بہت ہیں۔ تم اُدھر ناریل کی تعداد کم کردو تو میں اِدھر اپنے میٹیریل کا وزن بھی کم کردوں گا!" ہندو عامل نے کہا۔ "قبلہ! یہ پروفیشنل جیلسی (PROFESSIONAL JEALOUSY) کچھ اچھی نہیں۔ ہم کو تو اتحاد و ایک جہتی سے کام کرنا چاہیئے! ورنہ دھندا بیٹھ جائے گا!"

اس بحث کو دیکھ کر ایک عقیدت مند وہیں بے ہوش ہوگیا۔

جب یہی بات ایک غافل نے دوسرے غافل سے پوچھی کہ میاں کیا یہ سچ ہے کہ حسین ساگر پر مجسمے بولنے لگے ہیں ؟ تو دوسرے غافل نے پہلے غافل سے الٹا ہی سوال کر ڈالا :

" کیا حسین ساگر پر مجسمے بھی ہیں ؟ "

یہی سوال جب ایک بے روزگار نوجوان سے پوچھا گیا تو وہ بولا " مجھے تو شہر میں کہیں بھی کوئی مجسمہ نظر نہیں آتا ! مجھے تو ہر طرف نو ویکنسی (NO VACANCY) کے بورڈ نظر آتے ہیں - اگر کہیں کوئی ویکنسی (VACANCY) کا بورڈ نظر آئے اور مجھے ملازمت مل جائے تو شائد مجسموں کو دیکھ سکوں اور آرٹ کی قدر کرنا سیکھوں ، سچ تو یہ ہے کہ پیٹ کی آگ آرٹ کے جذبہ کو بھسم کر کے رکھ دیتی ہے "

جب یہی سوال ایک مجسمے سے کیا گیا کہ کیا مجسمے بول سکتے ہیں ؟ تو وہ مجسمہ بولا " کیا ہماری شامت آئی جو بات کریں ! ؟ اگر ہم بولنے لگ جائیں تو لوگ ہمیں زندہ سمجھ کر جان سے مار ڈالیں گے ! نا بابا نا ! ہمیں تو اپنا مجسمہ عزیز ہے ! "

یہ افواہ گلیوں میں گردش کرتی ، سڑکوں پر گھومتی ، ٹریفک کو جام کرتی عوام کے نیتا شری ترشول کا پتہ پوچھتی ان کے محل نما جھونپڑے میں پہنچی ، جہاں وہ اپنی ریوالونگ چیئر پر ٹانگیں پسارے براجمان تھے - ان کی نیم باز آنکھوں میں میر کے شعر کی اس مستی کے علاوہ پر تکلف ہیوی لنچ کی سستی تھی - انھوں نے غنودگی کے عالم میں اپنے سکریٹری کو بلا کر بادشاہی ٹھاٹ میں پوچھا " کیا یہ خبر سچ ہے کہ حسین ساگر پر مجسمے بولنے لگے ہیں ؟ ہمارا یہ خیال ہے کہ اس کے پیچھے ہمارے دشمنوں کا ہاتھ ہے اور یہ افواہ اپوزیشن والوں نے اڑائی ہے ! "

سکریٹری نے کہا " حضور ! جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں ! شائد آپ بھول گئے ہیں کہ آپ ہی نے ارشاد فرمایا تھا کہ ہمارے عوام کو کوئی کام نہیں ہے - بے کار بیٹھے بیٹھے بیانات جاری کرتے رہتے ہیں اور حکومت پر نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں - لہذا ان کی توجہ کو ہٹانے اور مصروف رکھنے کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا کر دینا چاہیئے - سو ہم نے مجسموں کا مسئلہ کھڑا کر دیا - سچ تو یہ ہے کہ اس افواہ کے پیچھے کسی اور کا نہیں ہمارا ہی ہاتھ ہے "

نیتا نے فرمایا " ٹھیک ہے - عاملہ اور انتظامیہ کو معروف رکھنے کے لیے سیاست میں اتنی ملاوٹ تو ہونا ہی چاہیئے - ورنہ ایک ہی نوعیت کے کام سے بور ہو کر ملازمین ہماری ٹوہ میں لگے رہیں گے - اچھا تو یہ بتاؤ کہ اب اس افواہ کا حل کیا ہے ؟ "

سکریٹری نے جواب دیا " جب آپ نے ایک غلطی کی ہے تو پھر ایک اور غلطی بھی کیجئے - افواہ کا سارا الزام اقلیتوں کے سر تھوپ دیجئے - پھر دیکھئے کہ ہمارے عوام اکثریت اور اقلیت کے مسئلہ پر کس بری طرح الجھ جاتے ہیں اور آپ کس خوش اسلوبی سے سرخ رو ہوتے ہیں ! "

سکریٹری کی یہ نامعقول تجویز نیتا کو بڑی معقول لگی - چنانچہ نیتا نے فوراً اکثریتی اور اقلیتی نمائندوں کا ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا - جب سارے نمائندے جمع ہو چکے تو نیتا نے بھرے اجلاس میں یہ فرمایا کہ " سرکار بخوبی جانتی ہے کہ مجسموں کا شوشہ کس نے کھڑا ہے ؟ سرکار کو جو خفیہ رپورٹ ملی ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ساری شرارت اقلیتوں کی ہے اور مجسموں کے بولنے کی افواہ ان ہی کی اڑائی ہوئی ہے " ! آخر ہم بھی تو کل اپنی تیز رفتار گاڑی میں مجسموں کے پاس سے گزرے تھے ہم نے کسی مجسمے کی آواز نہیں سنی - یہ سن کر اقلیتوں کے نمائندے شمشیر چوہان نے کہا " مسٹر ترشول ! تم نے کس آسانی سے افواہ کا الزام اقلیتوں کے سر تھوپ دیا -

یہ سراسر بہتان ہے، دشنام ہے۔ ویسے اقلیت کا صدود الزام ٹھہرانا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ سلسلہ تو مہابھارت سے چلا آیا ہے۔ تم نے مہابھارت تو پڑھی ہوگی اور تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ کورو اکثریت میں تھے اور پانچ پانڈو اقلیت میں۔ یوں لگتا ہے کہ مہابھارت اب اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔"

ترشول نے چونک کر کہا "آخر تم نے بھی تو مہابھارت پڑھی ہے۔ یہ اکثریت اور اقلیت کہاں لکھا ہوا ہے؟" شمشیر جوبی نے کہا "پڑھنے کو تو طوطا مینا بھی پڑھ لیتے ہیں۔ لیکن آج کل انکے ذہن کی کھڑکیاں تھوڑے ہی کھلتی ہیں! اس کے لیے تو بڑی گہرائی میں جانا پڑے گا۔ اچھا تو خیر یہ بتاؤ کہ تم نے کس کی لکھی ہوئی مہابھارت پڑھ رکھی ہے؟"

یہ سنتے ہی نیتا بغلیں جھانکنے لگ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دیں، کیونکہ جب سے وہ اقتدار کی کرسی پر بیٹھے تھے، پڑھنے پڑھانے کا سارا کام سکریٹری کے حوالے کر دیا تھا۔ انھیں یہ تک یاد نہیں رہا تھا کہ کون سے شاعر نے مہابھارت لکھی تھی۔ چنانچہ ان سے کچھ بن نہ پڑا تو بات کو ٹالنے کے لیے ایک غلط شاعر کا نام لیا۔

"ہم نے ویمنا کی لکھی ہوئی مہابھارت پڑھ رکھی ہے!"

شمشیر جوبی نے کہا "ویمنا نے کوئی مہابھارت ہی نہیں لکھی!"

ترشول نے ذہن پر زور دے کر فرمایا "ارے ہاں، ہم نے غلط کہا۔ شاید رامنا کی لکھی ہوئی مہابھارت!"

شمشیر جوبی نے کہا "یہ بھی غلط!"

اس پر ترشول نے جھنجھلا کر کہا "شاید اننتا کی لکھی ہوئی.....!"

شمشیر جوبی نے ہنس کر کہا "یہ اننتا کون ہے میرے آقا؟ خیر آقا اب جانے بھی دیجئے۔ یہ بحث اب یہیں رکھتے ہیں۔ جب آپ افراد کا الزام اقلیتوں پر لگا ہی چکے ہیں تو چل کر مجسموں سے ہی پوچھ لیتے ہیں کہ خطا کس کی ہے؟ اور اس بلوہ کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے، کیوں کہ اب ہمارے نیتا انصاف کرنے سے تو رہے۔"

ترشول نے حیرت سے کہا "کیا اس بات کی گواہی مجسمے دیں گے، کیا مجسمے بھی بول سکتے ہیں؟"

شمشیر جوبی نے کہا "جب نیتا اور اس کی سرکار سے انصاف کی توقع اٹھ جاتی ہے تو مجسموں کو بولنے کے لیے مجبور ہونا ہی پڑتا ہے۔ مجسمے تو خیر پھر بھی مجسمے ہیں۔ جب بولنے پر آئیں تو عمارتیں بولتی ہیں۔ کھنڈرات بولتے ہیں۔ دیواریں بولتی ہیں۔ سناٹے بولتے ہیں۔ اور تو اور سننے کا اگر حوصلہ ہو تو پتھر بھی بولتے ہیں۔ اس پر بھی اگر بات سمجھ میں نہ آئے تو اجنتا اور ایلورہ کے غاروں کے درشن ٹی اے (T-A) اور ڈی۔ اے (D-A) کلیم (CLAIM) کے بغیر اپنے ذاتی خرچ پر جا کر کیجئے تو معلوم ہوگا کہ آرٹ کس طرح بولتا ہے اور سچائی کس طرح بولتی ہے!؟"

چونکہ اب بات اقتدار کی نہیں بلکہ نیتا کے شخصی وقار کا مسئلہ بن گئی تھی، وہ مجسموں کے درشن کے لیے راضی ہو گئے یوں بھی اجلاس والے بحث و مباحثہ کے بعد ان کا تھوڑا سا برین واش (BRAIN WASH) بھی ہو چکا تھا۔ چنانچہ انھوں نے نمائندوں کا اجلاس برخاست کیا۔ وہاں سے وہ سیدھا باتھ روم کی طرف چلے۔ سیاست کا لبادہ اتار پھینکا اور نیتا سے جوگی کا روپ دھارنے کے لیے ٹب میں غوطے پر غوطہ اتنے غوطے لگائے کہ نہ نہانے کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس کے بعد وہ ٹب سے برآمد ہوئے۔ میک اپ [illegible] تو پہچانے [illegible]۔ بائیں کان میں [illegible] مرد کی بالی پہنی۔

نعتی باف کا ایک لنگا پہننے کا ارادہ کرہی رہے تھے کہ میک اپ مین نے ٹوکا:

"حضور یہ آپ کیا کر رہے ہیں! لنگا تو صرف جوگنیں پہنتی ہیں!"

نیتا نے میک اپ مین کو ڈانٹ کر کہا "کیا تو ہمارے دھرم پتنی ہے جو ڈائرکشن دے رہا ہے۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں آرٹ میں فلمی ہٹ دھرمی" کی بنیاد پر کر رہے ہیں۔"

سن کر میک اپ مین خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد نیتا نے میک اپ مین سے نظریں بچا کر لنگے کو الگ کیا۔ گیروے کپڑے زیب تن کیے۔ سر پہ جٹاؤں والی وگ لگائی۔ آنکھوں میں اس قدر سرمہ بھرا کہ لگتا تھا کہ نیتا جی نہیں، سُرمہ کا کنڈا کھڑا ہے۔ سر سے فرصت ملی تو گلے میں مالائیں پہنیں۔ ہاتھ میں ایک زنّار سنبھالی۔ پاؤں میں کھڑاویں پہنے۔ لیکن پراکٹس نہ ہونے کی وجہ سے بُری طرح لڑکھڑا گئے اور لنگڑی چال چلنے لگے۔ پھر اس کے بعد قدِ آدم آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر چلنے اور ڈائلاگ بولنے کی ریہرسل کی۔ جب وہ پوری طرح سے بن سنور کر اور ہر طرح سے مطمئن ہو کر باہر نکلے تو شمشیر چوبی نے مبارک باد دیتے ہوئے کہا "حضور اب آپ کا اصلی روپ بالکل سامنے آگیا ہے اور یہ روپ کتنا حقیقی لگتا ہے ـــــــ جی چاہتا ہے کہ چٹا چٹ دو چار بوسے لے لوں!"

نیتا نے شمشیر چوبی کے مُنہ سے تعریف سنی تو کہا "یہ آپ کیا فرماتے ہیں! خواہ مخواہ شرمندہ کرتے ہیں!"

شمشیر چوبی نے کہا "معاف کرنا پربھو! ابھی شرمندگی کا مقام کہاں آیا ہے! شرمندگی کے مقامات تو آگے آئیں گے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟"

نیتا سے جوگی بن کر شری ترشول نے حسین ساگر کی راہ لی۔ تھوڑی دور تک چلنے کے بعد شمشیر چوبی نے چھوٹی ضرورت کا بہانا بنایا اور ترشول سے اجازت لے کر بلدیہ کے یوریل کی طرف چل پڑا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اتنے میں اچانک بجلی فیل ہو گئی۔ شاید بنیا کو آتا دیکھ کر وہ بھی روٹھ گئی تھی۔ ہر طرف پُر ہول سناٹا تھا۔ یکایک نیتا کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر واقعی مجسمے بولنے لگ جائیں تو سارا پول کھول کر رکھ دیں گے۔ اس خوف نے ان کی اترآتما کو بیدار کیا۔ چنانچہ ان کی آنکھوں سے تنگ نظری کا پردہ ہٹ گیا۔ سب سے پہلے ترشول "تلگو تلّی[1]" کے مجسمے کے پاس پہنچے اور بڑے احترام سے تلگو تلّی کو پرنام کیے۔ وہاں سے تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے جب ترشول نے مخدوم صاحب کے مجسمے کو پار کیا تو آواز آئی:

"ہیلو مسٹر ترشول! ہاؤ ڈو یو ڈو!؟"

اس طرزِ تخاطب پر ترشول نے حیران ہو کر پوچھا "آپ کون ہیں؟ اور یہ کیا فرما رہے ہیں؟"

آواز آئی "نہیں پہچانا! میں مخدوم بول رہا ہوں! ارے بھئی میں مخدوم ہوں مخدوم ـــــــ "سرخ سویرا" کا خالق! کیا وزیٹنگ کارڈ پیش کرنا پڑے گا؟ مجھے حیرت ہے کہ تم نے صرف "تلگو تلّی" کو یاد رکھا اور "اردو تلّی[2]" کو بھول گئے جو دل سے سارے دیش کی تلّی تسلیم کی جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض مفاد پرست زبان سے اس کا اقرار نہیں کرتے!"

ترشول نے کہا "اب میں کس کس تلّیوں کو یاد رکھوں؟ ہمارے دیش میں کئی زبانیں اور بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ زبان اور بولیوں کی کثرت میں ہم کس تلّی کا خیال رکھیں اور کس تلّی کو شاد کریں۔

---

[1] تلگو ماں   [2] اردو ماں

مخدوم بولے "یہی تو ہمارے ملک کی خوبی ہے۔ بولیوں اور بھاشاؤں کی کثرت میں وحدت کو تلاش کرنا ہوگا۔ اور بھانت بھانت کے پھولوں سے ایک ایسی مالا بنانا پڑے گا جس سے ملک کی شوبھا بڑھے۔ جمہوریت میں یہی تو کرنا پڑتا ہے۔"

ترشول نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے! لیکن میں کثرت میں وحدت کی تلاش میں لگ جاؤں تو پھر میری اولاد کی کثرت کا کیا ہوگا اور ان کے مستقبل کا کیا بنے گا۔ اب رہا دیش کی اچھائی کا معاملہ، تو اس موقع پر مجھے تمہارا ایک شعر یاد آرہا ہے سنو:

ع سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

مخدوم نے ہنس کر کہا "کس کا کلام کسے سنا رہے ہو؟ یہ تو اقبال کا کلام ہے۔ اور ابھی تم نے جو پڑھا ہے وہ شعر نہیں مصرعہ ہے۔"

ترشول نے جھینپ کر کہا "ارے ہوگا بھی مصرعہ! اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

مخدوم نے اصرار کے ساتھ کہا "ہوگا نہیں، ہے! پہلے تم اپنی اصلاح کرلو! یہ کوئی الیکشن کی تقریر یا انتخابی منشور نہیں کہ جو جی میں آیا پڑھ ڈالا اور پھر مکر گئے کہ کب کہا تھا۔ یہ شاعری ہے میاں شاعری! یہاں غلط تاویلات پر سند چھین لی جاتی ہے۔ یونیورسٹی کی عطا کردہ ڈگری کو واپس کرنا پڑتا ہے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ جب تم یہاں تک آہی گئے ہو تو ذرا آگے بڑھ کر سری کرشن دیو رائے سے بھی مل آؤ۔ میں اس وقت تک مشاعرے کا انتظام کرتا ہوں۔ دلی میں ایک بار "چاندنی چوک کا کھڑا مشاعرہ" برپا کیا تھا۔ لیکن آج حسین ساگر کا کھڑا مشاعرہ" برپا کرنا چاہتا ہوں جو ہمہ لسانی ہوگا!"

مخدوم کے پاس سے نکل کر مسٹر ترشول سری کرشن دیو رائے کے مجسمے کے پاس پہنچے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ اتنے میں آواز آئی "بتاؤ اب تمہارے ساتھ کس طرح کا سلوک کیا جائے؟" ترشول نے کہا "وہی جو ایک راجہ دوسرے راجہ کے ساتھ کرتا ہے!"

کرشن دیو رائے نے پوچھا "یہ ڈائیلاگ کس فلم کے ہیں اور ڈائیلاگ رائٹر کون ہے؟"

ترشول نے کہا "میں خود اب ایک فلم ڈائرکٹ کر رہا ہوں۔ میں کلاکار بھی ہوں اور کلا پریمی بھی! او رفائن آرٹس کی قدر کرنا بھی جانتا ہوں!"

کرشن دیو رائے بولے "اگر تم سچے کلاکار اور کلا پریمی ہوتے اور فنون لطیفہ کی قدر کرنا جانتے تو پھر اپنی سرکار سے "آستھانہ کوی" کا عہدہ برخاست نہ کرتے اور "ملک الشعراء" کا خطاب چھین نہ لیتے۔ آخر ہم نے بھی کبھی حکومت کی تھی۔ ہم بھی کلاکار اور کلا پریمی تھے۔ ہمارے دربار سے شاعر، ادیب اور فن کار وابستہ تھے۔ ہم راجہ راجہ مہاراجہ ہونے کے باوجود بھی اپنے دربار کے شاعر آلا سانی پدنا کے پیر میں اپنے مبارک ہاتھوں سے ایک یادگار اعزازی کڑا پہنایا۔ یہی نہیں پدنا کو پالکی میں بٹھا کر بہ نفس نفیس پالکی کو تھاما اور شہر میں پورے اعزاز کے ساتھ گشت کروایا اور دنیا کو دکھا دیا کہ کلا اور کلاکار کی کس طرح عزت کی جاتی ہے۔ ایک تم ہو کہ شاعر کو پالکی میں گشت کروانا تو کجا، پیدل تک گشت نہیں کرواتے، چاہے ڈبل سواری [illegible] کے لیے آنا ہے تو تم یہ توقع رکھے

ہوکر وہ تمہارے قدم چومے ۔ جمہوریت میں آخر یہ چوما چاٹی کب تک ؟ — کیا سیاست میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

ترشول نے سری کرشن دیوارائے سے یہ کھری کھری سنی تو ان کا سیاسی خمار کچھ اتر گیا۔ لیکن انھیں ابھی بہت سارے مجسّموں سے ملاقات کرنی تھی۔ چنانچہ وہ وہاں سے دیمنا کوی کی طرف چل پڑے ۔ ابھی وہ مجسمے کے قریب پہنچ بھی نہیں پائے تھے کہ ایک برہمی کی آواز سنائی دی :

" اور آگے مت بڑھو! میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا ۔ مجھے یہاں جس انداز میں اور جس پوزیشن اور پوز میں بٹھا دیا گیا ہے، وہ مجھے قطعی ناپسند نہیں ہے ۔ میں تمھیں شراپ دوں گا !"

ترشول نے گھبرا کر کہا " کوی جی! ہم سے غلطی ہوئی ہے ۔ شما کیجیے اور عوام کے لیے کوئی پیام دیجیے !"

دیمنا نے خفگی سے کہا " میں پیام ویام کچھ نہیں دینا چاہتا ۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ حسین ساگر میں کیکڑے بہت زیادہ ہوگئے ہیں اور مچھلیوں کو کُتر کُتر کر کھا رہے ہیں ۔"

ترشول کو یہ جملہ ایک علامتی کہانی کا سا لگا ۔ وہ ابھی اس کے مفہوم پر غور کر ہی رہے تھے کہ گشت کو نکلا ہوا ایک پولیس والا اُدھر آنکلا ۔ اس نے نیتا کو جوگی کے روپ میں دیکھ کر پوچھا:

" تم کون ہو؟ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

ترشول نے گمبھیر لہجے میں کہا " نہیں پہچانا! میں شہر یار ہوں !"

پولس والے نے پوچھا " تمھارا نمبر کون سا ہے ؟ میں اب تک تین شہر یاروں سے مل چکا ہوں !"

ترشول نے گرجدار آواز میں کہا " نالائق اتنا بھی نہیں جانتا کہ میں اس شہر کا حاکم ہوں ۔ اور شہر کے حالات جاننے کے لیے بھیس بدل کر نکلا ہوں ۔ کیا تو نے ناکہ میں میری تصویر نہیں دیکھی ؟"

پولیس والا بولا " ناکہ میں جیب کتروں کی تصویریں بھی تو ہوتی ہیں !"

یہ سن کر ترشول نے اپنا میک اپ اُتارا ۔ جوں ہی پولیس والے کی نظر ترشول کے اصلی چہرے پر پڑی تو اس نے اٹینشن ہوکر جھٹ سے سیلوٹ کیا ۔

پولیس والے کا سیلوٹ لے کر نیتا اپنے محل نما جھونپڑے کی طرف روانہ ہوئے ۔ مجسّموں سے بھینٹ کے بعد ان کی آتما کسی قدر جاگ چکی تھی ۔ راستے میں وہ سوچنے لگے کہ راج نیتی بھی کتنی فالتو چیز ہے اور اس میں کیسی کیسی حماقتیں کرنی پڑتی ہیں ۔ لہٰذا سنیاس لے لینا چاہیے ۔ جھونپڑے کو پہنچنے کے بعد ان کو بڑی دیر تک نیند نہیں آئی ۔ شمشیر جنگ کا پُراسرار طور پر غائب ہو جانا ان کے لیے ایک معمّہ بنا ہوا تھا ۔

دوسرے روز جب پریس رپورٹرز ان سے ملاقات کے لیے پہنچے اور مجسّموں کے حوالے سے حقیقت دریافت کرنا چاہی تو نیتا نے اس واقعے سے صاف انکار کر دیا اور انتہائی بے رخی و برہمی کے لہجے میں فرمایا کہ " ہمارا پریس نہایت ہی غیر ذمہ دار ہے ۔ اور وہ غیر غلط خبروں کو جلی حروف میں چھاپ کر نیتا اور اس کی سرکار کو بدنام کرتا رہتا ہے !" ●●

قلمی معاونین سے درخواست ہے کہ اپنی تخلیقات پر پورا پتہ ضرور لکھیں

سرپٹ حیدرآبادی

اس سال

حیدرآباد کے بزرگ مزاحیہ شاعر سرپٹ حیدرآبادی نے
انتقال سے دو چار دن قبل 'شگوفہ' کے سالنامہ کے لیے
اپنا یہ تازہ کلام عنایت کیا تھا ——— (ادارہ)

کس سے اچھائی کی رکھے کوئی اُمید اس سال
حال ہر اک کو بُرائی کی ہے تائید اس سال

اب کے میں دیدہ و دانستہ بنوں گا غنڈہ
مجھ سے نیکی کی نہ رکھے کوئی اُمید اس سال

اپنے سر باندھوں گا تخریبِ جہاں کا سہرا
سب مٹادوں گا میں آثارِ صنادید اس سال

جھونپڑی ہی میں نظر آئے گا محلوں کا سکوں
بوریہ ہوگا میرا مسندِ جمشید اس سال

چاک کرنا ہی پڑے گا مجھے دامن اپنا
جذبۂ شوق کی کچھ ادھ ہے تاکید اس سال

ذرّہ ذرّہ ہے میرے پیشِ نظر کیف بہ کف
جام سے ہوگا برآمد میرے خورشید اس سال

کامران ہوکے رہوں گا میں الکشن میں ضرور
شہر کے غنڈے کریں گے میری تائید اس سال

فسٹ اِن فسٹ رہے گی میری آوارہ روی
جس کا جی چاہے کرے وہ میری تقلید اس سال

نکتہ چینی کا کوئی مجھ پہ ارادہ نہ کرے
غیر ممکن ہے کسی سے میری تردید اس سال

نئے ڈھب کی ہے روانی میرے افسانے میں
لکھ رہا ہوں میں نئے رنگ کی تمہید اس سال

مشورہ ساقی کا رندوں کو یہی ہے سرپٹ
کرے بیعت کی کوئی رند نہ تجدید اس سال

اعجاز وارثی
(سنبھل)

قطعات

الیکشن کے بعد

ایک میمبر نے ہاتھ اٹھا کر سوئے فلک
کی عرض، یارب اور دُعا اک قبول ہو
اس فتح کو ذریعہ بنا دے معاش کا
جو قرض لے کے خرچ کیا ہے، وصول ہو

خوشامد

کل اک خُرانٹ درباری سخنور نے کہا مجھ سے
میاں! شاعر کی فطرت میں خوشامد بھی ضروری ہے
اساسِ شعر قائم ہے سلام و داد و تحسیں پر
عزیزم! راہ خودداری میں اک حد بھی ضروری ہے

بالائی آمدنی

خدایا! شکر تیرا تو نے یہ آسودگی بخشی
ملازم بیٹے کو کچھ یافت بالائی میسّر ہے
مجھے بھی ملتی ہے بالائی اس بالائی انکم سے
ضعیفی میں مرے مولا، توانائی میسّر ہے

تبدیلیاں

کچھ اس انداز سے تبدیلیاں آئی ہیں دُنیا میں
کہ واعظ کے بغیر اب شغل جام و مُل نہیں ہوتا
ادھر جب عرس ہوتا ہے کسی درویش کامل کا
کلکٹر رونق محفل نہ ہوں تو قُل نہیں ہوتا

ترقی

ترقی کا یہی عالم رہا تو آپ دیکھیں گے!
بتاشوں کی بجائے فاتحہ میں ٹافیاں ہوں گی
فراغت پا کے نس بندی سے کوئی گھر جب آئے گا
اعزّہ کی زبانوں پر مُبارکبادیاں ہوں گی

علامت

کہا جب ایک قحبہ خانے کے ناظم سے کل میں نے
میاں، کچھ سوچئے، اجداد کیا تھے آپ کیسے ہیں
تو فرمایا کہ ان کے دور میں کردار افضل تھا
اور اب توقیر و عزّت کی علامت چار پیسے ہیں

پرویز یداللہ مہدی
(بمبئی)

اس کو کہتے ہیں کرکٹ آرائی

ب
ی "غریب
انے ملکی کشتی
رکی کا صحیح مسلم
یشہ غریب کی آس اور
یک کی طرح ٹوٹا یا تو خطرہ سا
ظر آتا ہے تو ہم سمجھ جاتے ہیں کرکٹ
موسم آگیا۔ اگلے وقتوں میں شاہی
حکامات اور ضروری اعلانات ڈھنکے کی
ٹ پر عوام الناس کے گوش گزار کئے جاتے
ے جبکہ نئی زمانہ چونکہ جمہوریت کا دور ہے اس لیے اب
م خبریں ڈھنکے کی جگہ دروازوں اور کھڑکیوں کی چوٹ
گوش گزار کی جاتی ہیں چنانچہ غریب خانے کی غریب کھڑکی
شیشہ توڑ کر ہم جیسے غافلوں کو آمدِ فصلِ کرکٹ کا مژدہ سنایا جاتا ہے
ہ سنو اے غافلانِ خطہ ......
اس کو کہتے ہیں کرکٹ آرائی

کٹ آرائی کا یہ غلغلہ عموماً اس وقت بلند ہوتا ہے جب کوئی مہمان کرکٹ ٹیم اپنے
ل قدم رنجہ فرماتی ہے یا اپنی کرکٹ ٹیم غیر ملکی دورے پر تشریف لے جاتی ہے
غلغلہ سن کر کرکٹ گزیدہ اصحاب کہف، یوں ہڑبڑا کر خواب غفلت سے بیدار ہوتے ہیں
یسے حضرت اسرافیل نے صور پھونکنے کے بجائے ایک زبردست جھٹکا دیا ہو اور پھر اس
فتاحی اسٹروک کے ساتھ ہی ایسی افراتفری، وہ ہڑبونگ مچتی ہے کہ عوام الناس اپنے تمام
روری و غیر ضروری کام طاق پر رکھ کر کچھ عرصہ کے لیے کرکٹ کے عارضہ میں خوشی خوشی مبتلا ہو جاتے
یں، جسے دیکھیے کرکٹ کھیلتا، دیکھتا، سنتا یا کرکٹ پر بولتا ہوا نظر آتا ہے چنانچہ کرکٹ کے سیزن میں آپ
اچانک یہ عقدہ کھلتا ہے کہ ہر دوسرا شخص یا تو بہترین بلے باز ہے یا گیند باز اور جو شخص نہ تو بولر ہوتا ہے اور نہ
باتسمین وہ کرکٹ کا مستند مبصر ثابت ہوتا ہے کسی کو جوڑوں کی بیماری سے زیادہ سری کانت کی سنچری کی فکر لاحق ہوتی
ہے تو کوئی بیٹنے کے حساب سے بے نیاز عمران خان کے وکٹوں کے اعداد و شمار میں غلطاں نظر آتا ہے، اس سیزن کے دوران
ہر دفتر، کارخانے، گلیاں کوچے، فٹ پاتھ، پارک سبھی دیکھتے ہی دیکھتے کرکٹ کے میدان میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور چہار
یاروں طرف کرکٹ کی اس قدر بہتات ہوتی ہے کہ بالآخر کرکٹ بھی کوڑا کرکٹ کی طرح بے وقعت ہو جاتا ہے۔ تاہم کرکٹ

کی اس قدر ارزانی کے باوجود ایک روزہ انٹرنیشنل یعنی ONEDAY INTERNATIONAL اپنی جگہ بہرحال اہمیت رکھتے ہیں بلکہ دیگر کھیلوں میں انھیں وہی رتبہ حاصل ہے جو مقابلہ حسن میں حصہ لینے والی حسیناؤں کی صف میں یعنی کوئین صرف ملکہ حسن کو حاصل ہوتا ہے (یعنی کوئین کی پہچان بڑی آسان ہے، اس کے سر پہ تاج ہوتا ہے بقیہ مطلع بلکہ مقطع بھی ایک دم صاف ہوتا ہے) کرکٹ کے تعلق سے ہمارے ایک دیرینہ کرم فرما ڈاکٹر م۔ ن سنگساری کی تحقیق عمیق کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ موصوف بہ وقت تحقیق کا لنگوٹ باندھے ہر بات کی تہہ تک اترنے کے لیے تیار رہتے ہیں موصوف کی تحقیق کی رو سے کرکٹ کی اصل' دراصل گلی ڈنڈا ہے (جس مقالے پر ڈاکٹر صاحب کو ڈاکٹریٹ کی سند سے نوازا گیا ہے۔ اس کا عنوان ہے گلی ڈنڈا (ماضی، حال اور مستقبل) کرکٹ کی مقبولیت کی وجہ سے چونکہ ان کے پسندیدہ موضوع کا مستقبل تاریک ہو گیا ہے۔ اس لیے کرکٹ دشمنی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اکثر جارج برنارڈ شا کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ کرکٹ ایک ایسا نامعقول کھیل ہے جسے گیارہ بے وقوف کھیلتے اور گیارہ ہزار بے وقوف دیکھتے ہیں ——— جبکہ اس سلسلے میں ہماری رائے قدرے مختلف ہے، برنارڈ شا کے زمانے میں اس کھیل کی مقبولیت ہو سکتا ہے کہ صرف گیارہ ہزار افراد تک محدود رہی ہو لیکن فی زمانہ اس میں خاطر خواہ اضافہ ہو چکا ہے چنانچہ برنارڈ شا اگر آج کے دور میں ہوتے تو اپنی بات میں ترمیم کرکے یوں کہتے کہ کرکٹ وہ واحد کھیل ہے جسے گیارہ بے وقوف کھیلتے گیارہ ہزار بے وقوف اسٹیڈیم میں بیٹھ کر دیکھتے، گیارہ لاکھ بے وقوف بذریعہ کامنٹری ریڈیو سے سنتے اور گیارہ کروڑ بے وقوف ٹی وی پر دیکھتے ہیں، البتہ یہ بات آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آسکی کہ ان لاتعداد بے وقوفوں کا ذکر کرتے ہوئے لوگ ان ماہرین فن کو صریحاً نظر انداز کر جاتے ہیں جو گیارہ بے وقوفوں کو کرکٹ کھلاتے ہیں اور جنھیں عام میں امپائر کہتے ہیں۔ یہ تعداد کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ بھی دو ہی ہوتے ہیں۔ دو اس لیے ہوتے ہیں کہ ایک کا کام غلط فیصلہ سنانا ہوتا ہے اور دوسرے کا کام اس کی تائید کرنا حالانکہ غلط فیصلہ کسی تائید کا محتاج نہیں ہوتا۔

افرا تفری کے معاملے میں کرکٹ کو اگر کسی متعدی مرض سے تشبیہ دی جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ کرکٹ ٹسٹ چاہے اپنے ملکی حدود میں کھیلا جا رہا ہو یا سات سمندر پار اس کی بازگشت ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ ہر گھر میں مسلسل اور دکھائی دیتی ہے بلکہ کبھی کبھی تو کرکٹ میچ کے دوران پل پل بدلتے ہوئے کسی ٹیم کے ناگفتہ بہ حالات آپ کے گھریلو حالات پر اس بری طرح اثر انداز ہوتے ہیں کہ جملہ افرادِ خاندان کے حالاتِ حاضرہ و غیر حاضرہ دونوں راست اس کی زد میں آجاتے ہیں، یہاں ہم اپنے ایک شناسا کی مثال پیش کرتے ہیں، پچھلے کچھ عرصے سے موصوف کی صحت روز بروز گرتی چلی جا رہی تھی، بہتیرا علاج کروایا، لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا بالآخر ایک ماہر نفسیات سے رجوع کیا گیا۔ اس نے موصوف کو چیک کرکے چند سوالات پوچھے ——— آپ جو اس طرح اندر ہی اندر گھلتے چلے جا رہے ہیں اس کی وجہ کہیں بیوی کی بے رخی تو نہیں !

بولے۔ جی نہیں !

پوچھا۔ بچوں کی نافرمانی !

بولے۔ بالکل نہیں ——— !

اگلا سوال کیا۔ دفتر میں افسرِ اعلیٰ کا خوف تو نہیں۔!

بولے: "ہرگز نہیں"!

پینترا بدل کر کہا۔ "تو پھر ضرور آپ کو کسی سے عشق ہو گیا ہے"!

جھنجھلا کر بولے۔ "کیا آپ مجھے پاگل سمجھتے ہیں جو ایک مرتبہ آنکھوں دیکھی مکھی نگل لینے کے بعد دوبارہ پھر وہی حماقت کروں ــــ!"

اس بار ڈاکٹر نے جھنجھلا کر پوچھا۔ "تو پھر وہ کون ہے جو اس بری طرح آپ کے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے!"

شرما کر بولے۔ "اظہر الدین ــــ!"

ڈاکٹر نے چونک کر پوچھا ــــ "کون اظہر الدین"؟

طنزیہ لہجے میں بولے ــــ آپ ڈاکٹر ہیں یا عطائی حکیم، کرکٹ کی دنیا کے ہونہار کھلاڑی اظہر الدین کو نہیں جانتے، جس نے کرکٹ کے میدان میں قدم رکھتے ہی مسلسل تین سنچریاں بنا کر عالمی ریکارڈ قایم کر دیا۔ پتہ نہیں اس ہونہار کھلاڑی کو کس کی نظر لگ گئی۔ پچھلے کچھ عرصہ سے اس کی بیٹنگ فارم پر نہیں ہے وہ کوئی خاص اسکور نہیں کر سکا ہے اور یہی فکر مجھے کھائے جا رہی ہے"! صحیح راز اگلوانے کے بعد ماہر نفسیات نے موصوف کے متعلقین سے کہا کہ اب ان کا علاج کسی ڈاکٹر کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اظہر الدین کے ہاتھ میں ہے چنانچہ پچھلے دنوں پاکستان کے دورے میں اظہر الدین نے جیسے ہی سنچری بنا کر فارم میں واپس آنے کا ثبوت فراہم کیا، موصوف کی صحت بھی خود بخود فارم میں واپس آ گئی ـــــ!

یہ سچ ہے کہ ہر کھیل کی طرح کرکٹ کا ایک مخصوص سیزن ہوتا ہے لیکن بعض باذوق حضرات کے ہاں کرکٹ کی رت برس کے بارہ مہینے جاری وساری رہتی ہے اس کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔ ہمارے ایک قریب ترین پڑوسی جو اپنی کرکٹ فہمی کے باعث محلے بھر میں مسٹر ایل بی ڈبلیو کے نام سے مشہور ہیں اتفاق سے موصوف کی یہ عرفیت' ان کے اصلی نام کا انگریزی حروف تہجی کے اعتبار سے مخفف (شارٹ فارم) بھی ہے۔ یعنی ایل سے لیاقت حسین' بی سے بشارت حسین اور ڈبلیو سے وارثی یعنی لیاقت حسین بشارت حسین وارثی عرف ایل۔ بی۔ ڈبلیو ـــــ.

کرکٹ کی ٹیم چونکہ گیارہ کھلاڑیوں پر مشتمل ہوتی ہے اس لیے گیارہ کا ہندسہ مسٹر ایل بی ڈبلیو کو بے حد مرغوب ہے۔ چنانچہ ہر نیک کام کی شروعات گیارہ تاریخ کو کرتے ہیں۔ ریس میں صرف گیارہ نمبر کے گھوڑے پر رقم لگاتے ہیں ہر مہینے گیارہویں کی نیاز کا اہتمام محض اس لیے کرتے ہیں کہ یہ گیارہ تاریخ کو پڑتی ہے۔ رمضان میں صرف گیارہ روزے رکھتے ہیں البتہ گیارہ کے ہندسے کو خود پر اس قدر طاری کر لینے کے باوجود حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ بیوی کے معاملے میں صرف ایک ہی پر قناعت کیے بیٹھے ہیں۔ اس سلسلے میں جب ہم نے اپنی بیگم کے توسط سے تحقیق کروائی تو پتہ چلا کہ جس طرح بعض بڑی شخصیتیں اپنی ذات میں انجمن ہوتی ہیں اسی طرح مسٹر ایل بی ڈبلیو کی ایک اکیلی بیگم میں کل گیارہ عدد بیویوں کے اوصاف حمیدہ وغیر حمیدہ بیک وقت پائے جاتے ہیں چنانچہ اپنی ایک عدد بیوی کے تعاون سے نہایت ہی قلیل مدت میں کل گیارہ عدد بچے پیدا کر کے موصوف اپنی کرکٹ شناسی کا معقول عملی ثبوت پیش کر چکے ہیں اپنی اولاد کو چونکہ "کرکٹ ٹیم" سے تعبیر کرتے ہیں اس لیے خود کو باپ کے بجائے منیجر کہلا کر خوش ہوا کرتے ہیں۔

چند معتبر راویوں کا بیان ہے کہ کچھ عرصہ قبل تمام تر احتیاط کے باوجود غلطی سے ان کے ہاں بارہواں کھلاڑی پیدا ہو گیا تھا جس کی پیدائش پر سنا ہے مسٹر ایل بی ڈبلیو خاصے پشیمان بھی ہوئے اور پریشان بھی، پشیمان اس لیے کہ ناداستگی میں کرکٹ کے اصولوں کی خلاف ورزی سرزد ہو گئی تھی اور پریشان یوں ہوئے کہ بارہویں کھلاڑی کا مستقبل عموماً تاریک ہوتا ہے۔

چنانچہ مسٹر ایل بی ڈبلیو کے ہاں زبردستی قدم رنجہ فرمانے والا بارہواں کھلاڑی جب ایک دن کے بخار میں چت پٹ ہو کر بیک ٹو دی پویلین ہو گیا تو موصوف نے اطمینان کا سانس لیا کہ ان کی پرائیویٹ لمیٹڈ کرکٹ ٹیم کا بیلنس بگڑنے سے بال بال بچ گیا۔

مسٹر ایل بی ڈبلیو اس وقت عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں دیگر اعضائے جسمانی کا سارا زور کھنچ کر زبان میں آ جاتا ہے لہذا منہ زبانی کرکٹ خوب کھیلتے ہیں کرکٹ کی مخصوص اصطلاحات کا روزمرّہ میں اس خوبی سے استعمال کرتے ہیں کہ ان کی عام گفتگو پر بھی اچھی خاصی رننگ کمنٹری کا گمان ہوتا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے کی بات ہے، ہم علامہ بچوڑ ہمدانی کے ساتھ بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے کہ مسٹر ایل بی ڈبلیو تشریف لائے اور آتے ہی علامہ کو مخاطب کر کے اپنی کمنٹری شروع کر دی ——— بہت خوب! آپ یہاں پویلین میں بیٹھے اپنے مہرے کو بچا رہے ہیں اور ادھر فیلڈ میں آپ کی صاحبزادی خاندان کی عزت کے چوکے چھکے اڑا رہی ہیں ———

کیا بکتے ہو ——— علامہ غرائے ——— مسٹر ایل بی ڈبلیو نے لیگ بریک گیند ڈالی فرمایا۔ بک نہیں رہا ہوں عرض کر رہا ہوں۔ آپ کی صاحبزادی صاحبہ ڈاکٹر ملک سامی کے صاحبزادے کے ساتھ چھپ چھپ کر......"

علامہ جھنجھلا کر بولے۔ ناممکن! اتنی بڑی بات ہو جائے اور مجھے اس کا علم نہ ہو ——— ! مسٹر ایل بی ڈبلیو زبان کھٹاسپن کرتے ہوئے بولے ——— علم ہو گا کیسے جناب۔

خدانخواستہ اگر کسی اوور (OVER) میں ایک آدھ رن بن گیا تو پھر آپ کی اپنی بنی بنائی ساکھ کا فالو آن (FOLLOW-ON) یقینی ہے" لہذا بہتری اسی میں ہے کہ فوراً دو بول پڑھوا کے عزت کے ساتھ اننگ ڈکلیر INNING DECLARE کر دیجئے۔

ہمیں دراصل مسٹر ایل بی ڈبلیو کی کمنٹری والی خصوصیت ہی پسند ہے، یوں بھی ہم کرکٹ میچ سے زیادہ اس کی کمنٹری بڑے شوق سے سنتے ہیں، اس پر بیچ بیچ میں ایکسپرٹ کی رائے یوں ہی مزا دیتی ہے جیسا کہ دال پر زیرے اور گھی کا کڑکڑاتا بگھار ——— یہی وجہ ہے کہ بنا کمنٹری کا کرکٹ میچ ہماری نظر میں ماتمی مارچ پاسٹ کی طرح ہے جس میں سپاہیوں کی بندوقیں اور چہرے دونوں لٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ مسٹر ایل بی ڈبلیو چونکہ ہماری اس کمزوری سے اچھی طرح واقف ہیں اس لیے آئے دن وقت بے وقت ہمارے ہاں آ دھمکتے ہیں اور اس وقفہ ملاقات کا نام ٹی انٹرول رکھ چھوڑا ہے ——— ایک روز کا ذکر ہے موصوف ہمارے ہاں ٹی انٹرول منا رہے تھے کہ اچانک اوپر کی منزل سے کراکری کے ٹوٹنے بیلوں کے لڑنے اور کتوں کے غرانے کا ملا جلا آرکسٹرا شروع ہو گیا، ہم سمجھ گئے کہ مسٹر اینڈ مسز مہتا کے مابین ایک اور فری اسٹائل باکسنگ کا فائنل راؤنڈ شروع ہو گیا ——— ہم نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ "عجیب میاں بیوی ہیں کمبخت صبح سویرے اٹھتے ہی ..."

"ہم سٹونگ کر لڑنا شروع کرتے ہیں تو شام تک لڑتے رہتے ہیں"!

سٹریلیا کی ٹیم بیٹنگ کرنے — شاید انہیں فقرہ اچھالنے کا آپ نے اس لیے پہلے جھگڑے نہیں سنے، جب وہ ٹیسٹ کرتے
ونوں کی دو دو ٹیمیں ان اسٹاپ پانچ پانچ دن رہتے تھے وہ تو ایک دن میں نمٹ ہی انہیں منظور ہوا کہ اس طرح پانچ روزہ ٹسٹ
یچ کی بنیاد پہ جھگڑنا پھر تو، اب پانچ دن کے ٹسٹ میاں بیوی کی مقبولیت کم ہو گئی ہے اور اب ان کی جگہ لیفٹننا روزہ کی بنیاد
پر دن ڈے سا فرقے بہت مقبول ہو رہے ہیں۔ اسی لیے اب ہم میاں بیوی بھی ون ڈے پہ کھیل کر پچاس پچاس اوور
یں اپنے ازدواجی جھگڑوں کا فیصلہ کر لیا کرو۔

کرکٹ سے متوالے بی ڈبلیو کے ہاتھ لگا دکا ایک اور ثبوت ہے ان کا نیا مکان جو ابھی تکمیل پذیر ہے۔
ہے یعنی بات ابھی کاغذی نقشے سے آگے نہیں بڑھی ہے تاہم موصوف نے کرکٹ کی ساری تکنیکی و فنی اصطلاحات،
نقشے پر بھی انڈیل دی ہیں۔ ایک مبارک دن ہمیں بھی اپنے مکان کے نقشے کا دیدار کروایا۔ پھر تفصیل سے روشنی ڈالنی شروع
کی۔ یہ جو بارہ بائی بارہ والی خوب صورت جگہ دیکھ رہے ہیں یہ بیڈ روم ہے جہاں میاں بیوی کو کچھ دیر کے لیے مکمل تنہائی
میسر آتی ہے جس کا فائدہ اٹھا کر بے چارا شوہر اپنے دل کی بات زبان پہ لانے کی ہمت کرتا ہے لیکن جواب میں بیوی
منہ بنا کر عموماً یہی کہتی ہے۔ ڈونٹ بی سلی (DONT BE SILLY) اس لیے بیڈ روم کا موزوں ترین نام
ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ ہے سلی پوائنٹ SILLY POINT اور یہ نقشے کے بیچ بڑا سا ہال نظر
آ رہا ہے، وہ مہمانوں کے لیے مختص ہو گا چنانچہ اس کا نام میں نے تجویز کیا ہے EXTRA COVER اور یہ جو مختصر سی
جگہ آپ کو نظر آ رہی ہے جانتے ہیں کیا ہے —؟ ہم نے اس چھوٹی سی جگہ کا بغور جائزہ لیا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا لہٰذا
ان سے گزارش کی — "تھوڑا سا اتا پتہ بتائیے ابھی پہچان لوں گا۔"
بولے — "اس جگہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آدمی یہاں بالکل اکیلا جاتا ہے۔ بڑے سے بڑا چمچہ بھی اس کے
ساتھ وہاں چلنے کی ضد نہیں کرتا —!
ہم نے خوفزدہ لہجے میں کہا — آدمی اکیلا تو صرف ایک ہی جگہ جاتا ہے اور وہ ہے قبر — کیا آپ نے گھر کے اندر ہی
ڈرائنگ میں قبر بنا لی —!"
جھنجلا کر بولے — لاحول ولا قوۃ۔ یہ میرے گھر کا نقشہ ہے جناب کسی قبرستان کا بلیو پرنٹ نہیں۔ خیر آپ کی سہولت کے
لیے ایک اور اشارہ دیتا ہوں، سارے گھر میں صرف اسی ایک گوشے کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آدمی وہاں جتنی دیر چاہے
بیٹھ سکتا ہے، جس پوزیشن میں چاہے بیٹھ سکتا ہے وہاں اسے کوئی روکنے والا ہوتا ہے نہ ٹوکنے والا —!
ہم چونکہ بات کی تہہ تک پہنچ چکے تھے اس لیے چٹاک سے بولے — "میں سمجھ گیا، آپ کا اشارہ یقیناً بیت الخلا
کی طرف ٹوائلٹ کی طرف ہے —!
مسکرا کر بولے — "بالکل صحیح، اب یہ پوچھئے کہ کرکٹ کی اصطلاح میں اس کا نام کیا سوچا ہے میں نے؟"
ہم نے ذہن پہ زور دیتے ہوئے کہا۔ — MID-ON
بولے — نہیں —!
ہم نے ایک اور کوڑی پھینکی — LONG-ON —

فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولے —— یہ بھی نہیں جناب، جو نام میں نے سوچا ہے وہاں تک کسی کا قیاس نہیں پہنچ سکتا۔ خیر آپ سے کیا چھپانا۔ اپنے نئے گھر کے بیت الخلا عرف ٹوائلٹ کا نام میں نے سوچا ہے COMMENTATOR'S BOX۔

قصہ مختصر یہ کہ موصوف نے اپنے نئے گھر کا صرف نقشہ دیکھا کر ہی ہمیں کلین بولڈ کر دیا۔ مسٹر ایل بی ڈبلیو کے تعلق سے اتنا اور عرض کر دیں کہ ان کی کرکٹ نوازی صرف یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ شعر و ادب کو بھی کرکٹ کے میدان میں کھینچ لائے ہیں چنانچہ رباعی اور قطعہ کو باؤنڈری کہتے ہیں۔ آزاد نظم آپ کی نظر میں سکسر ہے اور ایسے تمام اشعار جو نامعلوم شعرا کے کھاتے میں لکھے جاتے ہیں، ان کا شمار BYES اینڈ LEG BYES میں کرتے ہیں۔ اب رہے جدید علامتی اشعار تو ان کے لیے جو اصطلاح استعمال کرتے ہیں وہ خود ہی دل تھام کر سنیے۔ ایک مرتبہ باتوں باتوں میں ہم نے ندا فاضلی کا یہ شعر سنا دیا ؎

سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دئیے رات ہو گئی

پھر موصوف سے پوچھا —— کہیے جناب کیسا شعر ہے۔؟

طنزیہ لہجے میں بولے۔ آپ اسے شعر کہتے ہیں، برادر یہ تو سو فی صدی نو بال (NO BALL) ہے نو بال ——!

آخر میں کرکٹ کے حوالے سے ایک سخن گسترانہ، بات پیش ہے کھیل چاہے کرکٹ کا ہو، ہاکی کا یا فٹ بال کا ہر کھیل میں ریاضت اور مہارت کے ساتھ کھلاڑیوں میں اسپورٹس مین اسپرٹ کا وافر مقدار میں پایا جانا ضروری ہے اور اس معاملے میں ہم بھارت واسی بد قسمتی سے اول الذکر خصوصیات کی طرف کم سے کم اور آخر الذکر خصوصیات کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ سوائے کھیل کے میدان کے ہر جگہ کھیل کی اسپرٹ کا مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہماری تاریخ بھی اس بات کی شاہد ہے، کھیل کی ہار جیت کا فیصلہ سو فی صدی میدان میں ہوتا ہے لیکن اس کا خطرناک رد عمل عموماً عوام الناس کے بیچ، مار پیٹ، خون خرابے اور فسادات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جس میں گیند اور بلے کی جگہ بم بھالے تلوار، لاٹھی اور چاقوؤں کا آزادانہ استعمال کر کے انسانی سروں، سینوں اور دیگر اعضاء کو نشانہ بنا کر اسپورٹس مین اسپرٹ کا زبردست مظاہرہ کیا جاتا ہے بلکہ اب تو فرقہ پرست عناصر کی مہربانیوں نے فسادات کو بھی اسپورٹس کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ دیگر کھیلوں کی طرح اگر فسادات کے بھی ایشیائی اور عالمی مقابلے منعقد کئے جائیں تو بلا شبہ گولڈ میڈل ہم ہندوستانیوں کے حصے میں آئے گا۔ ●●

احمد جمال پاشا (مرحوم)

بور

BORE

[احمد جمال پاشا شگوفہ کے مستقل قلمی معاونین میں شامل تھے۔ اس رسالے کے اجرا پر قلمی تعاون کا جو وعدہ کیا تھا اسے آخر دم تک نبھاتے رہے۔ ان کا یہ غیر مطبوعہ مضمون احمد جمال پاشا کے شاگرد عزیزی ظفر کمالی نے سالنامے کے لیے بھجوایا ہے جس کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں۔
ادارہ]

سماج جس میں ہم جینے کے لیے مرتے ہیں، اس میں اکثریت تو ضرورت سے زیادہ عقل مند حضرات ہی کی ہے جس کے خوش گوار نتائج سے جیسے زیادہ آپ دوچار ہوں گے اسی لیے اگر کوئی بھلا آدمی آپ سے ٹکرا جائے اور آپ کم بدر نہ کرے تو اس مہنگائی اور بے مروّتی کے دور میں آپ بہت سستے چھوٹے۔ اس کو غنیمت جانیے کہ آدمی نہ ملا، آپ کی قسمت کی لاٹری کھل گئی ورنہ یقین جانیے صبح سے شام تک ہم سے ایک سے ایک بلنڈر بور ٹکراتا رہتا ہے۔ جسے دیکھیے صبح صبح آنکھیں ملتا، عذر کے بستے بغل میں دبائے، عذاب قبر کی طرح نازل ہونے لگتا ہے۔

دور کیوں جائیے۔ آج ہی کی بات ہے ہم کو مونگ پھلی ٹونگتے دیکھ کر ایک صاحب پہلے تو اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس امکان پر غور کرتے رہے کہ آدمی بھی جگالی کرتے رہنے کی صلاحیت پیدا کر سکتا ہے؟ پھر بولے،

"ارے واہ صاحب! واہ واہ! واہ! آپ اور مونگ پھلی؟ آپ کے دادا جان قبلہ عرش آشیانی تو جیبوں میں بادام بھرے رکھتے تھے۔ بادام۔!"

دوسرے عمر رسیدہ بزرگ نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے فرمایا۔

"میاں پچھلے زمانے تو کب کے ہوا ہو گئے! اب وہ اگلی سی بات کہاں؟ میرے نانا مرحوم کو تو کبھی پتہ ہی نہ چل سکا کہ ان کے محل کے باہر بھی کچھ ہے۔ ہماری دنیا تو چوپال تھی آخر وقت تک اُن کو نہ بتا سکے کہ ایک روپے میں پیسے کتنے ہوتے ہیں۔"

دونوں بزرگ گھنٹوں ہمیں ماضی کی کہانیاں سناتے اور کنویں جھنکاتے رہے۔ ہماری بوریت وحشت میں تبدیل ہو چکی تھی جس سے دل میں یہ کھٹکے لگے ہوئے تھے کہ اگر اب بھی یہ رفع دفع نہ ہوئے تو علامہ اقبال سیمینار کا کیا ہوگا جس کے ہم کنوینر ہیں۔ کہیں بلا دولہا کی بارات والا معاملہ نہ ہو جائے!

ہماری موجودگی کو نظرانداز کرتے ہوئے ایک صاحب مزے لے لے کر دوسرے صاحب کو پرانے لکھنؤ کی سیر کرانے میں مصروف تھے۔

ایک دفعہ احاطہ مرزا علی خاں کے اوپر سے تلنگوں کا ہوائی جہاز محلے کی چھتوں کے اوپر سے گزر گیا، تو بادشاہ نواب نے بڑے لاٹ صاحب کے پاس جاکر دہائی دی "سرکار بہادر ہم لٹ گئے محلے بھر کی بہو بیٹیوں کی بے پردگی ہوگئی!"

بٹلر صاحب کا زمانہ تھا۔ انھوں نے کہا۔

"ویل نواب تم اطمینان رکھو۔ اگر اب اُس نے اُدھر کا رخ بھی کیا تو ہم اسے پھانسی پر چڑھا دیں گے!"

"تب صاحب بڑے لاٹ بہادر کے سمجھانے بجھانے پر ہمتو تعمبو ہوا۔ ورنہ جل گئے تھے گئے"!

میں سب سے زیادہ بور اُن لوگوں سے ہوتا ہوں جو میرا وقت برباد کرنے کے لیے کبھی ٹائم ٹیبل کے ہیر پھیر کرتے رہتے ہیں۔ ان میں ایک صاحب بڑے ہی دبلے پتلے لمبے سینک سلائی، سفید شیروانی کے اندر گردش کرتا ہوا سفید خون، سفید ٹوپی، سفید مفلر، سفید پاجامہ، سفید موزہ، سفید ناگرہ، سرتاپا سفید پوش، محلے کے لونڈوں نے اُن پر کیا خوب "نہرِ فرات کا بگلا" کی پھبتی کسی مگر شہرت انھوں نے "علامہ بال کمانی" کے نام سے پائی۔ وہ گھڑی کی دوکان کھول کر شاعری کرتے۔ شعر سناتے اور مشاعرے اکھاڑنے کے لیے پابندی سے دوکان بند کرتے جو کسی اگلے سے اگلے مشاعرے یا شعری نشست تک بند رہتی۔ مخاطب سے دوران خود کلامی اپنے دستی تکیہ کلام "ہاں آں! ہاں آں!" کو حرکت میں لانے کے لیے بجلی کے پنکھے کے پروں کی طرح دوران گفتگو دونوں ہاتھوں کو گردش میں لاکر مخاطب کو خاموش رکھنے کے لیے اس کے حلق میں بہ دست خود داخل ہونے کی مسلسل کوشش کرتے۔ صرف اپنی بات کرتے، صرف اپنے بارے میں گفتگو برداشت کرتے۔ اپنا قصیدہ سناتے۔ مخاطب کو اپنی مسلسل تعریف پر مجبور کرتے مخاطب بلکہ حریف کو منہ کھولنے کا موقع دینے سے پہلے اپنی تعریف میں اس کی برملا تذلیل کا ہنگامہ گرم رکھتے۔ اُن کی مختصر تقریر در مدحِ خود گھنٹوں میں بھی بلا کاما، فل اسٹاپ کے ادھوری رہ جاتی۔ عموماً صحیح لفظ کے غلط معنی پہ اصرار اور ایجادِ بندہ پر فخر کے دوران بطورِ شہادت بابائے اُردو کی لغت درمیان میں لاتے۔ خلافِ قیاس معنی پہ دھتڑ مار کر (جو عموماً مخاطب کے پڑتا) اظہارِ افسوس کرتے۔

"ہت تیرے کی! یہاں بابا بھی چوک گئے، ہاں آں! ہاں آں ہاں!"

علامہ بال کمانی کی لبالب علمی گفتگو ہمیشہ پُر از

ایک صاحب کُتّے کی زنجیر تھامے ریلوے کے ٹکٹ کاؤنٹر پر پہنچے اور کھڑکی کے اندر جھانک کر پوچھا:

"کیا مجھے کُتّے کا ٹکٹ لینا پڑے گا؟"

کاؤنٹر کلرک نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "نہیں جناب! ایسی بھی کیا بات ہے۔ آپ انسانوں کے ٹکٹ پر ہی سفر کرسکتے ہیں!"

★

غیر علمی بلکہ لاعلمی ہوا کرتی۔ اُن کے طرف داروں کا خیال تھا کہ یہاں نہ صرف جہالت بلکہ جہالت میں گہرائی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ لاہور کے ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اور علی گڑھ کے شیخ محمد عبداللہ (بابائے تعلیم نسواں) کے سلسلے میں نہ صرف کج بحثی بلکہ غلط بیانی سے بھی کام لیتے ہیں۔ جب ایک زمانہ ان کے پیڈم کا معترف ان کے زبانی ہاتھوں سے پناہ کا طالب ہوا تو ماہرین بلکہ مفسدین سے رجوع کیا، پانی پی پی کراُن کی غیبت کے بعد علامہ کے قبضے سے نجات کا واسطہ دیا تو چند مصلحین نے آزارِ وقت علامہ بال کمانی سے ایک تحریری معاہدہ کیا۔ جس پر ہم بھی دستخط کے گناہ گار ہیں۔ انھوں نے باتوں کی جھونک میں بلا آگا پیچھا دیکھے اور سوچے بغیر اس طرح دستخط کردئیے جیسے انگریزوں کے ساتھ شاہ عالم نے معاہدے پر دستخط کر دیئے تھے اور شہنشاہ ہندوستان عالم تا پالم ہوکر بادشاہت سے خلاص ہوگیا تھا۔ اسی طرح یہ دوستوں کی قلمرو سے جدا ہوگئے۔ جس کی رو سے:

"کسی سے بھی ان کی ملاقات صرف اسی وقت تک جاری رہ سکتی ہے جب تک کہ مخاطب اور متکلم میں سے کوئی بھی فریق اپنے منہ سے اپنی تعریف کی سنگین غلطی کا مرتکب نہ ہوگا۔ اگر ہوگا تو فوراً سختی سے ٹوک دیا جائے گا۔ علامہ یا کوئی دوسرا ہرگز ہرگز اپنے بارے میں کوئی ایسی بات نہ کرے گا جس سے کسی کونے سے بھی اس کی تعریف یا دوسرے کی مذمت کا کوئی بھی پہلو نکلتا ہوا اور نہ فریقِ اوّل فریقِ دوم کو اپنی تعریف کرانے پر مجبور کرے گا۔"

اگلی ملاقات بلکہ زیادہ صحیح یہ کہنا ہوگا کہ آخری ملاقات کے دوران اِدھر انھوں نے قصیدہ خود بزبانِ خود کی تمہید باندھنے کے لیے اپنے منہ سے "میں" نکالا اور میں نے ٹوک کر اس شدنی معاہدے کی یاد دلائی جس کی روشنائی تک ابھی خشک نہ ہو سکی تھی۔ غرض تیس چالیس طویل مختصر "میں" کے وقفے کے بعد وہ آستین چڑھا کر ہم پر گرجتے، برستے شجرہ خوانی کرتے، حیوانات سے ہمارا سلسلۂ نسب ملاتے، بور کا سرٹیفکیٹ عطا کرتے، دیرینہ باہمی تعلقات کو عاق کرتے ہوا اونٹ کی طرح بلبلاتے رخصت ہوگئے۔

اسی قسم کے میرے کم سِن اور اُمّین احباب پابندی سے اپنی باتوں اور موضوعات کی یکسانیت اور تکرار سے بور کرتے ہیں۔ وہ بھی اس شان پابندی اور وضعداری کے ساتھ کہ اگر پہلی ملاقات میں انھوں نے اپنے بچپن میں پہلی بار گولر کے پھول کھانے، پودینے کے لٹو اور مٹی کے چاقو چلنے کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا تھا تو ہزار ملاقاتوں کے بعد بھی اسی داستان کو اسی وضاحت کے ساتھ ہمارے



ریل کے سفر کے دوران ٹکٹ چیکر نے ایک صاحب سے ٹکٹ مانگا تو وہ بولے۔ "ارے بھائی! ٹکٹ کیسا؟ اب تو ملک آزاد ہے، گاڑی بھی اپنی ہے محکمہ ریل بھی اپنا ہے، پھر ٹکٹ خریدنے کا مقصد؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" ٹکٹ چیکر نے کہا "یہ ملک بھی اپنا، گاڑی بھی اپنی اور ملک کی جیلیں بھی اپنی، آئیے ذرا تشریف لائیے۔"

★

حافظہ پر گراتے بلکہ یادداشت پر تکرار کی جونک لگاتے رہتے ہیں ۔

ان میں وہ آدم خوار احباب بھی شامل ہیں جو نہ صرف وضعداری نبھانے کے لیے خود ہی چلے آتے تو خیال کی رفتار سے بور ہو جانے کا نام تک نہ لیتے۔ ہمیں ایسے ہی دو تین از کار رفتہ ریٹائرڈ احباب کا داغِ جدائی سہنا پڑا جن کا قصہ اتنا طویل اور زندگی اتنی مختصر تھی کہ قبل اس کے کہ اس کا قصہ ختم ہوتا ان کی زندگی ختم ہو گئی۔ بقیہ زندہ بزرگ اب تک اپنی یادوں کو ہم سے کاندھا دلوا رہے ہیں۔

جو لطیفے پروگرام بنا کر بور کرنے آتے ہیں اور مجھے شیشے میں اتارنے کے لیے اپنی زبانوں سے گڑھے مُردے اکھیڑا کرتے ہیں۔ آخر میں ان پر کیوں ان سب کا بخار اتاروں؟ جو عہدے، حیثیت، منافقت اور سیاست میں مجھ سے بھی بڑے ہیں، وہ تو ان بے چاروں سے کہیں زیادہ بور ہیں جن کی ہر تازہ بوریت نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ نہ صرف قبول کرنی ہوتی ہے بلکہ باس کو خوش کرنے کے لیے اس سے اس کے پسندیدہ لطیفے کی فرمائش کی جاتی ہے۔ باس کمانی دار جاپانی بورے کی طرح جھوم جھوم کر شروع ہو جاتا ہے۔ بھئی میں تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ بور کرنے کے بہانے کم از کم دو چار آدمی میرے آگے پیچھے گھومتے، مصاحبت کرتے، دل ہاتھ میں لینے کے لیے کم از کم کام نکلنے، الّو سیدھا ہونے سے اڑنچھو ہونے تک ہماری ہاں میں ہاں ملاتے رہتے ہیں۔

بور سے ملاقات سے زیادہ مشکل اسے برداشت کرنا ہوتا ہے۔ وہ تو بس اپنی بے تکی ہانک رہا ہے۔ اُڑا رہا ہے۔ ایران ”توران کی۔ ادھر وحشت الجھن اور پھر غنودگی میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ بے اختیار دل چاہتا ہے کہ جس طرح گاما پہلوان نے زبسکو کو اٹھا کر اکھاڑے کے باہر پھینک دیا تھا۔ اسی طرح میں بھی اس ہاتھ آئے بور کو باہر سڑک پر پھینک دوں مگر اس بوریت کے دور میں کسی بھی بور کو برداشت کرنا عین کامیابی ہے۔ کم از کم اسی بہانے بور پروف ہو جاؤں گا۔

اگر بور نہ ہو تو بھلا افواہیں کون پھیلائے؟ گرماگرم خبریں کہاں سے لا کریں؟ تیرے میرے فتنے کیسے بیدار ہوں؟ لہو کو گرم رکھنے کے بہانے کیسے ہاتھ آئیں۔

ہمارے زمانے میں تو صاحب سبھی ایک دوسرے کو بور کرتے ہیں۔ بس اسی کے لیے دم ہونا چاہیے۔ پڑھے لکھے سے جاہل تک، دانشور سے لیڈر تک، امیدوار سے کنوینر تک سبھی بور کرتے ہیں۔

میرے خیال میں بور کرنا بھی ایک فن ہے جو بور کرتا ہے فی زمانہ وہ سب سے بڑا فنکار ہے ۔ ●

سفرنامۂ امریکہ
قسط ۵

نریندر لوتھر
(حیدرآباد)

دل کا ہوٹل

اگلے دن صبح

ہم نے تیار ہوکر اپنی پسند کا ناشتہ کیا۔ اس کے بعد گپ شپ ہوئی اور پھر ہمارے میزبان کی فیملی اور بیگم ہمیں ہسپتال لے گئے۔ جاتے وقت فیضؔ کا مصرع ہماری زبان پر تھا — ؎

"جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا وہ شان سلامت رہتی ہے"

ہم بھی اس آن بان سے ہسپتال گئے گویا ہمیں آپریشن نہیں کروانا بلکہ ہسپتال کی انسپکشن کرنا ہے۔ ہسپتال بہت شاندار تھا، ہمیں ہندوستانی ہسپتالوں کا تجربہ تھا۔ ہجوم، افراتفری، بچوں کی چیخ و پکار، بیماروں کی آہ و زاری۔ عملہ کی بے پروائی یعنی جو چہل پہل اور رونق ہندوستانی ہسپتالوں میں دیکھنے کو ملتی ہے وہ یہاں مکمل طور پر غائب تھی۔ جائے علاج کی تمام علامتیں ندارد۔ صاف ستھرا ہال۔ انتظار میں بیٹھنے کے لیے صوفہ، پڑھنے کو رسالے۔ پینے کے لیے کافی اور جوس کی مشینیں۔ داخل ہوتے ہی لگا کہ ہم کسی ہوٹل میں آگئے ہیں۔ ناموں اور سائنوں کے بورڈ پڑھے تو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ حرف وہی تھے جو ہم نے انگریزی میں پڑھ رکھے تھے لیکن ان سے لفظ نہیں بنتے تھے۔ ہمیں شک ہوا کہ ہم شاید بیماری کی وجہ سے انگریزی پڑھنا بھی بھول گئے۔ اس خیال سے دماغ چکرا گیا۔ اپنے میزبان راجو کے کندھے کا سہارا لے کر پوچھا آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ وہ مسکرایا اور گویا ہوا کہ یہ ہسپانوی زبان ہے، چونکہ ملک کے اس حصے میں قابلِ لحاظ ہسپانوی آبادی ہے اس لیے ہدایات اور نوٹس ہسپانوی زبان میں بھی لکھے گئے ہیں۔ اس تشفی بخش جواب پر ہماری خاطر جمع ہوئی جو منغض ہو رہی تھی، کہ ہماری صحت میں مزید کوئی بگاڑ نہیں ہوا — راجو نے وہاں دفتر میں بیٹھی ہوئی ایک نوجوان خاتون کو ہمارے بارے میں بتایا، اس نے کہا ہاں ہم آپ کے منتظر تھے۔ براہِ مہربانی پیسے جمع کروادیجئے تاکہ کارروائی شروع کی جائے۔

ہم نے کہا ہندوستان کے سفارت خانے سے آپ کو خط ملا ہوگا۔ پیسے کا حساب کتاب وہ راست کریں گے ہم تو صرف علاج کروائیں گے

اس عورت نے اپنے سامنے پڑے ہوئے کاغذات کو اُتھل پتھل کیا اور پھر جواب دیا

"سوری، ہمیں کوئی ہدایت نہیں ملی"

اب ہمارے صبر اور انتظار کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

ہم نے اسے سفارت خانے کے ٹیلیکس کی کاپی دکھائی۔ تب اس نے چند کاغذ ہمیں دیئے جن پر ہمیں اور بیگم کو دستخط کرنے تھے۔ اس کارروائی کے بعد اس نے ہماری کلائی پہ ایک پٹہ باندھ دیا جس پہ ہمارا نام اور نمبر تھا، اس کے بعد ایک بھاری بھرکم حبشن آئی۔ اُس نے ہمیں پہیوں والی کرسی پر بٹھایا اور ــــ ہمارا کارواں اس عمارت کی چالیسویں منزل کی طرف چل پڑا۔ وہ عورت اتنی تنومند تھی کہ وہ آسانی سے ہمیں گود میں اٹھا کر اوپر لے جا سکتی تھی۔ اُس نے یہ خدمت آخر بھی کی لیکن ہمیں ڈر تھا کہ اگر اس نے راستہ میں ہمیں کہیں زیادہ زور سے بھینچ لیا تو ہم دم توڑ دیں گے۔ لفٹ جب اوپر اٹھنے لگی تو اُس نے ہمارا نام پوچھا۔ ہم نے بتایا تو اُس کی سمجھ میں نہ آیا، ایسی صورت میں عام طور پر ہجوں کے ذریعہ سمجھایا جاتا ہے۔ ہم نے ہجوں یوں کہا: 'نریندرا'

اُس نے پوچھا ــــ نریندرا! واٹ؟

ہم نے سمجھایا۔ این فار نریندرا ۔ اے فار اریندرا

آر فار ریندرا ۔ ای فار ایندرا . . . .

ہم یہاں تک ہی پہنچے تھے کہ وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی اور باقی کے ہجوں کو اُس نے ہماری آواز میں آواز ملاتے ہوئے تشریح کے نعرے مارنا شروع کر دیئے۔ اس پر سب لوگ اس زور سے ہنسنے لگے کہ جب لفٹ رُکی تو ہسپتال کے کئی لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے، یہ دیکھنے کے لیے کہ لفٹ میں کیا ہنگامہ ہو رہا ہے۔

کمرے میں پہنچے تو ہمیں یقین ہوگیا کہ ہم ہسپتال کے بجائے کسی ہوٹل میں آگئے ہیں۔ فون، ٹی وی، آرام کرسی، صوفہ، بے شمار بٹن بستر جس کے مختلف حصّوں کو اوپر نیچے کیا جا سکتا تھا ــــ مختصر یہ کہ یہاں بھی ہسپتال والی کوئی بات نہ دکھائی دی۔ ایک بہت بڑی کھڑکی جس سے شہر کا ایک خوبصورت حصّہ دکھائی دیتا تھا۔ ہماری فرمائش پر ہمیں ایسا کمرہ دیا گیا تھا جہاں سے ہریا دل بھی دکھائی دیتی تھی ــــ وہ حبشن ہمیں کمرے میں چھوڑ کر "ہیر یُو آر" کہہ کر غائب ہوگئی۔ ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا تو واقعی ہم وہیں تھے، اُس نے ٹھیک ہی کہا تھا "HERE YOU ARE" ہم کافی دیر تک ہیر یُو آر کے سکتے کے عالم میں رہے۔ اس کے بعد ہمارے ساتھ وہی ہوا جو بچپن کی سُنی اور پڑھی ہوئی دیومالا کی کہانیوں میں ہیرو کے ساتھ ہوتا تھا جب وہ جادوئی انگوٹھی پہن لیتا تھا یعنی وہ سب دیکھ سکتا تھا۔ عین ویسے ہی ہماری آنکھوں کے سامنے ایک ڈرامہ شروع ہوگیا۔

دروازہ کھلا۔ ایک ہسپانوی نرس آئی اُس کے ہاتھ میں ایک ہلکا سا چوغا تھا، اُس نے ہمیں کپڑے اُتارنے کو کہا۔ اس فرمائش پہ ہماری بوکھلاہٹ دیکھ کر کچھ مسکرائی اور بولی "اب آپ، ہمارے مہمان ہیں اپنے کپڑے اُتار کر اس الماری میں رکھ دیجئے اور یہ چوغا پہن لیجئے۔" یہ کہہ کر اور چوغا ہمارے ہاتھ میں تھما کر وہ غائب ہوگئی۔

ہم نے اپنا لباس بدلا۔ نئے بھیس میں اپنے آپ کو شیشے میں دیکھا۔ ہوٹل کا کمرہ جیل کی کوٹھری میں بدل گیا، ہم قیدی نمبر ۱۵ بن گئے۔ دروازہ پھر کھلا، اس بار ایک حبشن نرس آئی، اُس کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی جس میں پانچ چھ گولیاں رکھی ہوئی تھیں، تھرماس کھولا ــــ ایک گلاس پانی بھرا اور ہمیں گولیاں نگل جانے کو کہا۔

ہم نے پوچھا "یہ کس خوشی میں؟"

اُس نے جواب دیا "آپ ہمارے مہمان ہیں، گولیوں کی بوچھاڑ سے مہمان نوازی دیکھ کر ہمیں تشویش ہوئی کہ آگے [illegible]

اور کبھی کبھی ہمیں پہچان [illegible]

دروازہ پھر کھلا، ایک دوسری نرس اندر آئی اُس نے ہمیں تھرما میٹر لگایا پھر دوائیں لائی اور تھرما میٹر [illegible] [illegible] اپنے تھرما میٹر کی طرف دیکھ کر اُسے کچھ کہنا چاہا تو اس نے فرمایا " ڈونٹ موو، [illegible] ایک بار امریکیوں کا مشغلہ خرچ کا پیدا ہونا تھا۔

دروازہ پھر کھلا۔ ایک اور نرس آئی، اُس نے ہمارا بلڈ پریشر لیا اور ہم سے کچھ بات کئے بنا ہی چلی گئی۔

دروازہ پھر کھلا۔ اس بار ایک نرس نے ہمیں ٹیکہ اور اس کے بعد پھر کی پوری سوئی اور سرنج بتّی کی ٹوکری [illegible] پھینک دی۔ ہماری رقم کی ٹوکری تو امریکہ کا خزانہ بنتی جا رہی تھی۔ ہم نے بیگم سے کہا " اس بار تمہیں روئی بیچنے سے خوب آمدنی ہوگی۔

پھر ایک اور نرس ..... ایسا لگتا تھا کہ ہسپتال کی تمام نرسیں صرف ہماری خدمت پر مامور تھیں۔ ہمیں تشویش [illegible] باقی مریضوں کا کیا ہوگا۔ پھر یہ فکر ہوئی کہ سارے کام نرسیں ہی کر رہی ہیں کہیں وہ آپریشن بھی نہ کر بیٹھیں۔

ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ دروازہ پھر کھلا۔ اس بار نرس کے پیچھے پیچھے ادھیڑ عمر کا ایک خوب صورت سا ڈاکٹر [illegible] نام سے ہندوستانی لگتا تھا۔ اس نے کہا میں آپ کا ڈاکٹر ہوں۔ کل آپ کا ٹیسٹ ہوگا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ آپ کو آپریشن کی ضرورت ہے کہ نہیں۔ ہم نے اس سے بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ اُس کا حسب نسب اور وجہ تسمیہ دریافت کرنے کی خواہش کی لیکن وہ [illegible] بات اَن سنی کر کے چلا گیا۔ ظاہر ہے اُس کے لیے وقت پیسہ تھا اور وہ اپنا قیمتی پیسہ ایک غریب الوطن ہندوستانی پر ضائع [illegible] کرنا چاہتا تھا۔

ہم نے سوچا اب دروازے کو اور ہمیں بھی ذرا آرام ملے گا لیکن جادو کی انگوٹھی ابھی پہنی ہوئی تھی طلسم ہوشربا [illegible] جاری تھا۔

دروازہ پھر کھلا۔ ایک بہت ہی صحت مند نرس ہاتھ میں ایک لمبی سی سوئی لے کر داخل ہوئی اس کے ساتھ ایک اور [illegible] آئی اور ایک نے ہمیں دبا کر رکھا، دوسری نے ہمارے بازو میں سوئی چبھوئی اور خون کی ایک بوتل پوری بھر لی۔ پھر ایک شیشے [illegible] میں بھی کر ہمیں دیکھا آپ کے اندر ابھی کتنا خون ہے؟

ہم نے سوچا، اب یہ خون بوتل پی جائے گی اور اس کے بعد ہمیں کچا چبا چبا کر کھا جائے گی۔ لیکن ہم بچ گئے۔ دوسری نے ہمارے خون کی بوتل کو سونگھا۔ پہلی نرس کے ساتھ کچھ کھسر پھسر کی اور پھر دونوں باہر چلی گئیں۔ شاید ہمارا خون اُن کے پینے کے قابل نہ تھا ہم ایک بار پھر بچ گئے۔

[illegible]

[illegible]

والی نرسیں بار بار آتیں اور اسی بہانے سے ہمارا بازو پکڑ کر ہماری طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھتی رہتیں۔ ہم نے سوچا آغاز تو اچھا ہے!

رات کا کھانا ۶ بجے شام ہی آگیا، ہم نے کہا بھئی یہ تو ہمارا چائے کا وقت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اچھے بچے شام کو جلد ہی کھانا کھا کر سو جاتے ہیں اور اس ہسپتال میں صرف اچھے بچوں کو ہی رکھا جاتا ہے۔ ہم نے منہ بسور کر کھانا ایک طرف رکھ دیا۔ ایک گھنٹے کے بعد ایک باوردی شخص آیا اور کھانا دیکھ کر بولا۔

"آپ نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔ کیا آپ کو پسند نہیں آیا؟"

ہم نے کہا۔ "ابھی تو کھانے کے لیے بہت جلدی نہیں، کچھ انتظار کیجیے۔ وہ ہمیں قدرے ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھ کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک فون آیا۔ ایک نسوانی آواز سنائی دی "جناب! ڈاکٹر کا حکم ہے کہ آپ کھانا جلدی کھا لیں کیوں کہ اس کے بعد آپ کو جلاب دینا ہے۔ ہم نے کہا، یہ متضاد باتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر کھانے کے بعد جلاب دینے کا پلان ہے تو بہتر ہے ہمیں کھانا ہی نہ دیا جائے، خواہ مخواہ کی فضول خرچی۔ آواز نے کہا "میں آپ کو ڈاکٹر کا حکم سنا رہی ہوں" غیبی آواز کے خلاف اپیل کیا ہو سکتی تھی، ناچار ہم نے حکم کی تعمیل کی اور چائے پینے کی بجائے کھانا کھا لیا۔

کچھ دیر بعد پلیٹ میں چار پانچ گولیاں پھر پیش کی گئیں اور اس کے بعد ہمارے لیے ستاروں میں روشنی نہ رہی۔ آنکھ کھلی تو ہسپانوی نرس ہماری کلائی اپنے نازک ہاتھوں میں تھامے ہوئے ہماری نبض کی رفتار دیکھ رہی تھی۔ ہم نے کہا نبض دیکھنے کے لیے تمھاری جیسی حسینہ کو نہیں بھیجنا چاہیے۔ رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ وہ مسکرائی اور بولی کہ یہ ہمیں معلوم ہے، اس لیے رفتار میں سے ہم کچھ پائنٹ منہا کر لیتے ہیں۔ خیر! ایسی نرس کے دیدار سے دن شروع ہوا تھا تو امید تھی کہ اچھا ہی گزرے گا۔

دوپہر کے بارہ بجے کے قریب ہمیں ٹسٹ کے لیے آپریشن روم میں لے جایا گیا۔ ہمارا خیال ہے کہ جو دوائیاں ہمیں پچھلی شام سے دی جا رہی تھیں ان میں بے ہوشی کی دوا بھی شامل تھی کیوں کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ ہمارا ٹسٹ کب لیا گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ٹسٹ یہ تھا کہ ہماری داہنی ٹانگ کے ذریعہ جسم میں ایک ایسی رنگ دار دوا جو خون کی گردش میں رکاوٹ کی نشاندہی کر سکتی ہے، داخل کی گئی تھی۔ اس کے بعد ڈاکٹروں نے تصویریں لیں جن سے پتہ چلا کہ خون کی گردش میں کہاں کہاں رکاوٹ حائل ہے۔ سہ پہر کو جب ہم اپنے کمرے میں تھے تو ہمیں خبر دی گئی کہ ٹسٹ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ آپریشن ہونا چاہیئے لیکن قطعی فیصلہ ہمارا سرجن ٹسٹ کے نتیجے دیکھنے کے بعد کرے گا۔

شام کو ڈاکٹر کولی کمرے میں آیا اس کے پیچھے ڈاکٹروں، نرسوں اور دوسرے عملہ کا ایک لشکر تھا۔ اس نے کہا "میں کل آپ کا آپریشن کروں گا۔" اس نے آپریشن کے بارے میں کچھ اور تفصیلات بھی بتائیں جن کو سنتے ہی ہمارا دل بیٹھنا شروع ہو گیا۔ پھر اس نے کہا ہمیں آپریشن کے بعد خون بھی چڑھایا جائے گا۔ ہم نے کہا اب ہماری رگوں میں امریکی خون بھی دوڑنے لگے گا تو امید ہے کہ ہمارا ملک اور ترقی کرے گا۔ آخر میں اس نے پوچھا کہ آپ کو مجھ سے کچھ پوچھنا تو نہیں۔ ہم نے کہا۔ ہماری یہ گزارش ہے کہ خون چڑھاتے وقت اس بات کا خیال رکھیئے کہ اس میں کہیں ایڈس (AIDS) نہ ہو۔ یہ سن کر وہ کچھ مسکرایا ہمارا کندھا تھپکتے ہوئے بولا: "فکر کی کوئی ضرورت نہیں۔"

وہ ڈاکٹر کوئی ۴۵ برس کا ہوگا۔ فرشتہ صورت انسان ہے اور بہت دھیمے انداز میں بات کرتا ہے۔ اس کے چہرے پر دائمی مسکراہٹ رہتی ہے۔ اس کی روز کی آمدنی لاکھوں میں ہے اور یہ مانا جاتا ہے کہ 'دل کے معاملے میں دنیا کا بہترین سرجن ہے'۔ اُسے دیکھ کر راحت ملتی ہے اور مریض کو دیکھ کر اس کو راحت ملتی ہے کہ اس کی امیری ہم جیسے لوگوں کی بیماری کی وجہ سے ہے۔

آپریشن کے فیصلے کے بعد ہمارے کمرے میں ہسپتال کے عملے کا ٹریفک اچانک بڑھ گیا۔

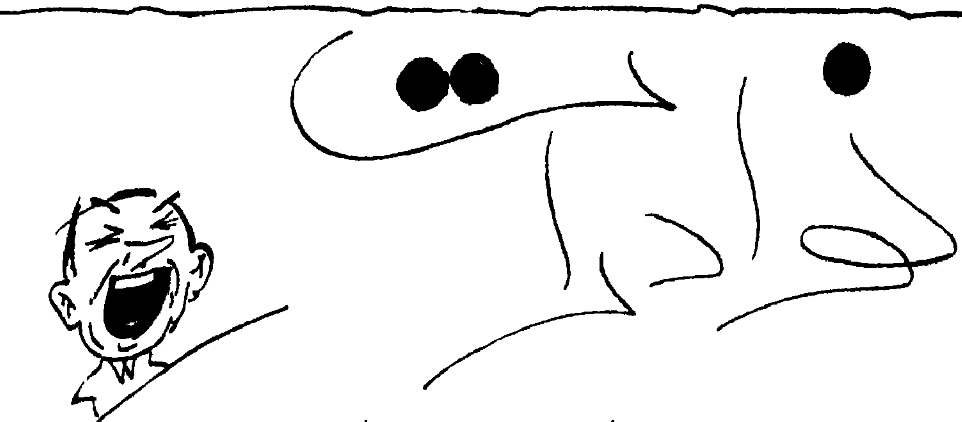
ایک ڈاکٹر آیا، بولا میں آپ کو بے ہوش کروں گا تاکہ آپ کو پتہ ہی نہ چلے کہ آپ کا آپریشن ہوا ہے۔ ہم نے پوچھا ہمیں ہوش میں لانے کا ذمہ دار کون ہوگا؟ وہ بولا آپ فکر نہ کیجیے وہ کام بھی میں ہی کروں گا۔ ہم نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں ابھی سپیلائزیشن (SPECIALIZATION) پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچی ورنہ ایک سپیشلسٹ بے ہوش کرنے کے لیے اور دوسرا ہوش میں لانے کے لیے ہونا چاہیے۔ اس نے کہا آپ نے ٹھیک کہا، ابھی مجھے ایک امتحان اور پاس کرنا ہے۔ اس کے بعد میں صرف 'بے ہوش کر' بن جاؤں گا۔ ہوش کی دوا کوئی اور کرے گا۔ ہم نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ آدمی اعتبار لگتا تھا۔ وہ بھی روز ہزاروں کماتا تھا۔ آج ہم صرف لکھ پتیوں سے ہی مل رہے تھے۔ اس کے بعد کئی اور ڈاکٹر آئے۔ کوئی کولی کا نائب تھا تو کوئی اس نائب کا مددگار۔ ہر ایک نے اپنے کام کے بارے میں اور ہمارے ساتھ اس کے تعلق کے بارے میں جانکاری دلائی۔ یہاں تک کہ ہمیں ایسا لگنے لگا جیسے ہم ہسپتال کے نئے سپرنٹنڈنٹ مقرر کیے گئے اور ہسپتال کا تمام اسٹاف ہماری قدم بوسی کے لیے حاضر ہو رہا ہے۔ ایک اور شخص آیا۔ کانا پھوسی کے انداز میں گویا ہوا: "میں 'نائب بے ہوش کر' ہوں، بے ہوشی کا کام بڑی عمدگی اور آہستگی سے آج شام سے ہی شروع ہو جائے گا اور صبح ساڑھے پانچ بجے آپ کو آپریشن تھیٹر لے جایا جائے گا۔ یہ کہتے کہتے اس پر غنودگی طاری ہونا شروع ہو گئی اور بہ مشکل تمام وہ کمرے سے باہر نکل پایا۔ پھر ایک شخص ایک لمبا سفید چوغا پہنے آیا۔ چوغے پر لال کمربند تھا۔ اس نے ہمارا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ میں یہاں کا پادری ہوں آپ کی صحت یابی کے لیے دُعا کروں گا۔ ہم نے کہا ہمیں اس میں کوئی اعتراض نہیں پھر اُس نے اپنا مُنہ ہمارے کان کے پاس لاکر سرگوشی کے انداز میں پوچھا کہ آپ کو کوئی اقبالِ گناہ کرنا ہے تو کرسکتے ہیں۔ اس سارے ڈرامے میں اب پہلی بار ہم پر یہ واضح ہوا کہ یہ آپریشن واقعی سیریس ہے۔ نہیں تو پادری کے آنے کی کیا ضرورت تھی اور اگر وہ آ گیا تھا تو اُسے ہمارے گناہ اور اقبالِ گناہ کے بارے میں پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ پادری اور دوسرے مذہبوں کے اس پیشہ لوگ پیدائش، شادی اور موت جیسے خطرناک موقعوں پر ہی آتے ہیں۔ ہماری پیدائش اور شادی تو ہو چکی تھی۔ پادری کے آنے کا جواز صرف ہماری امکانی موت ہی ہو سکتا تھا۔ خیر پادری کا سوال سُن کر ہم نے اپنی بیتی ہوئی زندگی پر طائرانہ نظر ڈالی بلکہ اڑائی (کیوں کہ طائر اُڑتا ہے، دوڑتا نہیں۔ ظاہر ہے اس کے ساتھ اس کی نظر بھی اُڑ ہی سکتی ہے، دوڑ نہیں سکتی۔ اگر کبھی دوڑنے کی کوشش کرتا ہے تو صرف پھُدک ہی پاتا ہے، پھُدکتی ہوئی نظر کوئی نظارہ ٹھیک طرح دیکھ نہیں سکتی۔ اس کا مشاہدہ غیر ہموار سا ہوتا ہے)

ہم نے اپنی حرکتوں، کرتوتوں، کارستانیوں، کارناموں، حسرتوں اور ناکامیوں کی ایک زبانی فہرست جلدی سے مرتب کی۔ انھیں دو زمروں، کردہ اور ناکردہ گناہوں میں تقسیم کیا۔ شدید حسرت کا احساس ہوا کہ ناکردہ گناہوں کا پلڑا بھاری تھا۔ اب پچھتائے کیا ہووت جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت۔ وہ کھیت چڑیوں کے بجائے ہم چُگ سکتے تھے۔ خیر اب چالیس بر

سے اور اس حالت میں اور اتنے کم وقت میں کھیت تو کیا کسی کیاری چگنا بھی ناممکن تھا۔ اپنی وصیت کے بارے میں سوچا جس کو تیار کرنے کے ارادے کو ہم ابھی تک عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ اپنی امکانی بیوہ اور یتیم بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچا۔ تابناک نظر آیا، مزید افسوس ہوا۔

ہمیں یاد رکھنے کے لیے ان کے پاس کچھ نہیں ہوگا بلکہ سب کچھ ہوگا۔ اس لیے ہمیں یاد کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اپنے عزیزوں کا خیال آیا۔ انھیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ دوستوں اور خیرخواہوں کی طرف دھیان گیا، وہ مناسب ریزولیشن پاس کر کے اپنے ناقابل تلافی نقصان کے بارے میں گھسے پٹے الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کر کے سرخرو ہو جائیں گے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ گھڑی دیکھ کر ایک منٹ کی خاموشی بھی اختیار کر لیں گے۔ اپنے ملک کے بارے میں تشویش ہوئی۔ ہمارے بعد اس کا کیا ہوگا کہ اس کے حالات پہلے ہی سے اچھے نہیں۔ ہمارے جیسے فرض شناس، محرک اور فعال خادم قوم کے چلے جانے سے جو خلا پیدا ہوگا وہ کیسے پُر ہوگا۔ ایک غیبی آواز آئی کہ یہ خلا قوم کی بہتری کے لیے ہی ہوگا۔ فکر نہ کر، تیرے ملک کی فضا ایسے خلاؤں سے بھری پڑی ہے۔ ایک اور خلا سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ادھر بھی مایوسی ہوئی، اپنی خستہ حالت کو دیکھا۔ یقین ہوا کہ ہمارے بغیر کوئی کام بند نہیں ہوگا۔ مسلک شام وسحر میں، کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ نظام گردش سیارگاں میں کوئی انقلاب نہیں آئے گا۔ اپنی خاکساری کا تیکھا احساس ہوا۔ اپنی بیوہ فی الحال بیوی کی طرف دیکھا جو پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی، ان کی آنکھوں میں نمی کے کوئی آثار نہیں تھے، وہ ہمہ تن گوش ہمارا اقبالی بیان سننے کے لیے بے تاب تھیں، انھیں ہمیشہ کہانیاں سننے کا شوق رہا ہے۔ ہم نے ایک آہ بھری۔ غالباً وہ ٹھنڈی تھی۔ پھر پادری کی طرف دیکھ کر بیگم کی طرف اشارہ کیا، اس نے بیگم کو چند منٹوں میں کمرے کے باہر جانے کی درخواست کی۔ بیگم چارو ناچار اُٹھ کر باہر چلی گئیں۔ اب پادری نے ہماری طرف پُرامید نظروں سے دیکھا اور بولا "میرے بیٹے اب تم تنہا ہو، اب بولو!" ہم نے اس کی طرف مسکرا کے دیکھا اور کہا "فادر مجھے افسوس ہے۔ مجھے کوئی اقبال نہیں کرنا۔ میں نے ابھی زندگی میں کیا ہی کیا ہے! یہ سن کر یقیناً پادری کو غصہ آیا ہوگا۔ لیکن پادریوں کو اپنے جذبات پر قابو رکھنے کی خاص ٹریننگ دی جاتی ہے۔ وہ غصہ میں بھی مسکراتے ہیں۔ صلیب کا نشان بناتے ہوئے وہ مسکرایا اور اس نے کہا: خوش قسمت ہو تم، خدا کی رحمت ہو تم پر۔ میں تمھارے لیے دعا کروں گا۔

ہم نے پادری کا شکریہ ادا کیا ــــ وہ چلا گیا۔ چند منٹوں کے بعد بیگم اندر آئیں۔ انھوں نے کہا ــــ "پادری نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ ایسے وقت تو کچھ اقبال کر لیا ہوتا۔ ہم نے کہا ابھی نہیں "وقت آنے پر" ابھی ہمیں اور جینا ہے اور تمھیں انتظار کرنا ہے۔ وہ بے چاری اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔



حیدرآباد ہی پسند آیا
اے زلیخا! ترے جمال کے بعد

آج بھی یادگار ہے یہ زمیں
بادشاہوں کے انتقال کے بعد

حیدرآباد میں بہ مثلِ حج
شاعر آتے ہیں ایک سال کے بعد

ذائقے اس قدر ہیں کھانوں میں
گوشت جچتا نہیں ہے دال کے بعد

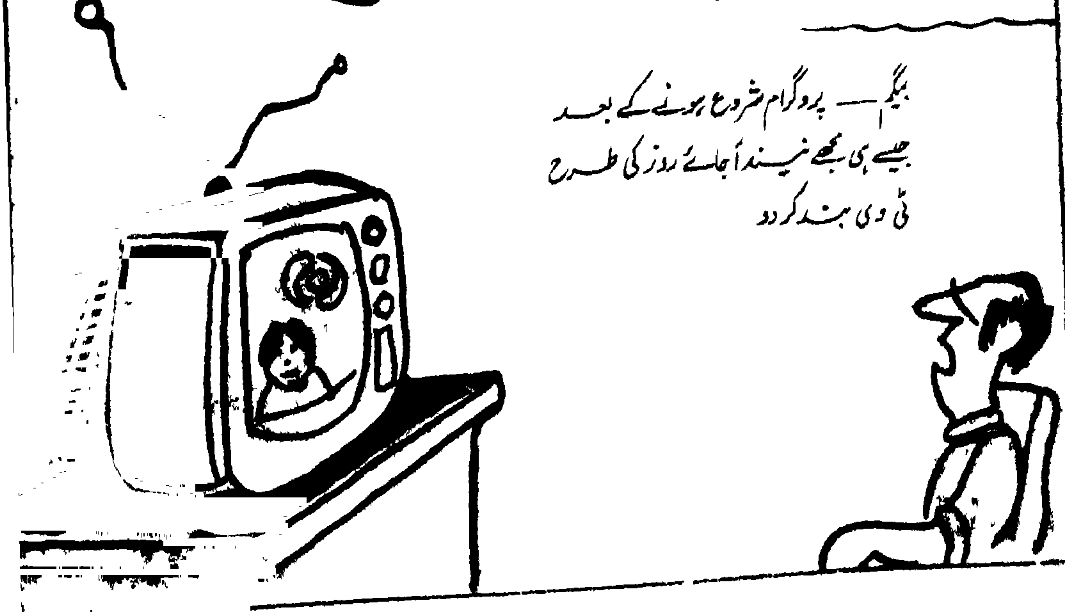
چارمینار ، میوزیم ، قلعہ
قابلِ دید ہیں زوال کے بعد

خوب ہیں یہ نوادرات — مگر
ڈاکٹر مصطفےٰ کمال کے بعد

خالد عرفان
(پاکستان)

(دورۂ حیدرآباد کے موقع پر کہی گئی)


CAUTION
آگے صاف سیدھی تقریباً
ایک سو میٹر بہترین روڈ!


بیگم — پروگرام شروع ہونے کے بعد
جیسے ہی مجھے نیند آجائے روز کی طرح
ٹی وی بند کر دو

یہ ایک تبسم

فیاض احمد فیضی (بمبئی)

ایک قدیم چینی کہاوت ہے کہ جس شخص کے پاس مسکراتا ہوا چہرہ نہیں ہے اسے دکان نہیں کھولنی چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دکانداری جیسا معمولی کام سنجیدہ لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ سنجیدہ لوگ دنیا میں بڑے بڑے کام کرنے کے لیے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس مسکراتا ہوا چہرہ ہے ان کی قسمت میں ٹیلی ویژن پر خبریں پڑھنے کا کام، ہوٹل ریسپشن کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر متواتر دانتوں کی نمائش کی ڈیوٹی یا ایئر ہوسٹس کی ملازمت ہی لکھی ہوتی ہے۔ انھیں مسکرانے کی اجرت ملتی ہے اور یہ ڈیوٹی ختم ہوتے ہی چہرے سے مسکراہٹ اور میک اپ اتار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس پولیس والوں کو نہیں مسکرانے کی تنخواہ دی جاتی ہے اسی لیے پولیس اسٹیشن میں جب کسی ملزم عورت کو لایا جاتا ہے تو وہ مسکرانے لگتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اب ان کی ڈیوٹی ختم ہو گئی ہے۔

رونا آدمی کی فطرت میں شامل ہے۔ قدرت نے اسے آنسوؤں کے غدود بھی فراہم کیے ہیں جب کہ مسکرانے اور ہنسنے کے لیے کوئی غدود نہیں ہوتے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خود قدرت کے نزدیک ہنسنے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ انسان پیدا ہوتے ہی جو کام سب سے پہلے کرتا ہے وہ گریہ وزاری ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں یہ سوچ کر آتا ہے کہ وہ سب سے پہلے آنکھ کھول کر زمین، فلک اور فضا دیکھے گا اور اگر خوش قسمتی سے علی الصبح پیدا ہوا تو مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو بھی دیکھ سکے گا مگر جب وہ آنکھ کھولتا ہے تو اسے پریشان حال لیڈی ڈاکٹر اور نرسوں کے چہرے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس بے چارے کو پتہ نہیں ہوتا کہ ہنسی کس چڑیا کا نام ہے۔ وہ تو بعد میں والدین اور ملاقاتیوں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا ہے کہ یہ لوگ اسے دیکھتے ہی کیوں اپنا چہرہ بگاڑ لیتے ہیں؟ آخر خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑ لیتا ہے۔ اور اسے بھی خواہ مخواہ ہنسنے کی مشق ہو جاتی ہے۔

مسکراہٹ کیا بری شئے ہے اور پریشان لب اپنے اندر کتنی دل پذیری رکھتی ہے۔ سنجیدگی کتنی بڑی نعمت ہے، کوئی کتنی پریشان کن ہوتی ہے اور اس کا کھلا ثبوت تو یہی ہے کہ ہم جب دوسروں کو ہنستے مسکراتے دیکھتے ہیں تو رنجیدہ ہو جاتے ہیں اور جب کسی کو دکھی پاتے ہیں تو ہمیں اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے [illegible] پریشانی تو وہ متاعِ بے بہا ہے جو صرف ان خوش نصیبوں

کو میسر آتی ہیں جن کی رسائی محبوب کی بزم تک ہو جاتی ہے اس لیے کہ اس بزم سے جو نکلتا ہے، پریشان نکلتا ہے خود ہمیں سنجیدہ اور روتے بسورتے چہرے اس لیے پسند ہیں کہ یہ تو ممکن ہے کہ آپ عمر بھر سنجیدہ رہیں اور کبھی بھولے سے نہ مسکرائیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ آپ ہمیشہ ہنستے مسکراتے رہیں اور کبھی رنجیدہ نہ ہوں۔ ہم تو ٹیلی ویژن پر نیوز ریڈر کی مسکراہٹ کو بھی صرف اس لیے نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ دو سکنڈ بعد ہمیں اپنے کسی قومی لیڈر کا سنجیدہ اور پُر وقار چہرہ دیکھنے کو ملے گا اور سننے ملے گا کہ ملک نے اب تک کتنی ترقی کی ہے۔

دنیا کی کامیاب ترین قومیں بہت کم مسکراتی ہیں۔ انھیں اس بات کا خوف رہتا ہے کہ اگر وہ ہنسنے ہنسانے میں وقت ضایع کرنے لگیں تو ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گی۔ اسی لیے جاپانی لوگ تصویریں کھنچواتے وقت تو ذرا سا مسکرا دیتے ہیں مگر عملی زندگی میں محنت و مشقت ہی سے لطف حاصل کرتے ہیں۔ کچھ بہت بڑی قومیں نہ صرف خود ہنسنے سے پرہیز کرتی ہیں بلکہ دوسروں کو بھی ہنستے نہیں دیکھنا چاہتیں۔ اور مختلف حربوں سے دوسرے ممالک کے تعلقات اتنے خوشگوار بنا دیتی ہیں کہ وہ بھی آستینوں میں خنجر چھپائے ایک دوسرے کی سرحدوں پر ٹکٹکی لگائے دیکھتے رہتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے ہنسنا ہنسانا بھول جاتے ہیں۔

ہنسی اور تنزلی کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ آدمی جیسے جیسے اوپر سے نیچے کی طرف آتا ہے، ڈھٹائی کے ساتھ مسکراتا رہتا ہے اگر وہ مسلمان ہے تو اپنے اسلاف کے کارناموں پر بغلیں بجاتا ہے اور صدیوں بجاتا ہی رہتا ہے۔ اس کے برعکس اچھے اچھے خوش مزاج لوگ اور قومیں جیسے جیسے ترقی کے زینے طے کرتے جاتے ہیں ان کی گردنیں اکڑتی جاتی ہیں اور لبوں سے مسکراہٹ غائب ہونے لگتی ہے۔ سچ پوچھیے تو ترقی اور کامیابی کے لیے نااہلی اور سنجیدگی دونوں لازم ہیں۔ آپ نے خود دیکھا ہوگا کہ مسخرے جب اپنے دل میں قوم کا درد پیدا کر لیتے ہیں تو حماقت اور ہنسی دونوں ان کے چہروں سے معدوم ہو جاتی ہیں اور تھوڑے عرصہ میں مقبولیت اور دولت ان کے قدم چومنے لگتی ہے۔ ہم تو جب بھی کسی شخص کو دیکھتے ہیں کہ وہ عجز و انکسار کا پتلا بنا ہوا ہے، ہمیشہ مسکراتا رہتا ہے، چھوٹے بڑے ہر آدمی سے ہنس کر ملتا ہے، بات کرتے ہوئے اکثر جھک بھی جاتا ہے تو ہم سمجھ جاتے ہیں کہ وہ اندر سے بہت دکھی اور رنجیدہ ہے، اپنی موجودہ حالت سے مطمئن نہیں ہے اور کامیابی حاصل کرنے کی اسے بہت جلدی ہے۔ صابن اور انشورنس بیچنے والے سیلز مین، سڑک کے کنارے دوا بیچنے والے حکیم، گلی کوچوں کے سوشیل ورکرز، الیکشن کے امیدوار، شیر بازار کے دلال، سرکس کے جوکر اور سہرا باندھے ہوئے دولھے اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ دلہنیں البتہ شادی کے منڈپ میں اور اسٹیج پر مہمانوں سے مبارکبادیں وصول کرتی ہوئی سنجیدگی اور متانت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ اس کے پیچھے ان کی ذہانت اور کامیابی کا غرور کارفرما ہوتا ہے۔ بعض دلہنیں اپنی صلاحیتوں اور قابلیت سے کم معیار کا دولھا ملنے پر شرمسار بھی نظر آتی ہیں۔ رخصتی کے وقت بھی دلہنوں کی آنکھیں فرطِ مسرت سے چھلک جاتی ہیں اور دولھا افسردہ اور مایوس ہونے کے باوجود زبردستی مسکراتا رہتا ہے۔

آسکر وائلڈ کہتا ہے کہ آدمی کی پہچان یہ ہے کہ وہ کن باتوں پر ہنستا ہے۔ ہمیں ذاتی طور پر آسکر وائلڈ سے اتفاق نہیں ہے اس لیے کہ آدمی رات کو جن باتوں پر ہنستا ہے، دن میں انھیں باتوں پر کفِ افسوس ملتا ہے۔ دوپہر میں حسنِ عمل کی تعریف ہنس ہنس کر کرتا ہے۔ شام کو اسی عمل پر ہزار لعنت بھیجتا ہے۔ کچھ مرد تو تغیر میں اتنے تیز رفتار

ہوتے ہیں کہ جس سے فایدہ کا امکان ہو اس کی رُلانے والی باتوں کو سن کر مسکرا کر داد دیتے ہیں اور اس کے پیٹھ پھیرتے ہی چہرہ بگاڑ کر پیشانی پر ہاتھ مار کر کہتے ہیں "کیسا خبیث اور احمق شخص تھا۔ مسلسل ایک گھنٹے سے بکواس کر رہا تھا، اگر مجھے اس سے منافع کی امید نہ ہوتی تو میں اسے ایک منٹ کے لیے بھی اپنے سامنے بیٹھنے نہ دیتا۔"

ویسے ہمارا خیال ہے کہ آسکر وائلڈ کے مذکورہ قول میں کہیں کتابت کی غلطی ہے۔ اس نے دراصل یہ لکھا ہوگا کہ عورت کی پہچان یہ ہے کہ وہ کن باتوں پر ہنستی ہے۔ اس ترمیم کے ساتھ یہ مقولہ ہمیں اس لیے درست معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے اکثر عورتوں کو بلا وجہ اور بے معنی باتوں پر ہنستے دیکھا ہے۔

انتہائی مسرت کا مقام ہے کہ جہاں ایک طرف آدمی نے مصنوعی انسان اور مصنوعی سیارے ایجاد کر لیے ہیں وہیں اس نے مصنوعی جذبات اور مصنوعی مسکراہٹیں بھی پیدا کر لیے ہیں۔ آج کل نوزائیدہ بچے بھی اپنی مسکراہٹ کو صرف خوش شکل یا مفید والدین کے لیے ریزرو رکھتے ہیں اور اجنبیوں اور خطرناک شکل وصورت والے رشتہ داروں کو دیکھتے ہی ایک چیخ مار کر رونا شروع کر دیتے ہیں۔ سیاست دان اور وزیر اجنبیوں کو ہاتھ جوڑ کر اور مسکرا کر سلام اور نمسکار کرتے ہیں لیکن اگر اپنے آبائی وطن سے دیہاتی رشتہ دار ان کے پاس چلے آئیں تو انھیں دیکھتے ہی ان کی تیوریاں چڑھ جاتی ہیں۔ دنیا کی سب سے مہنگی مسکراہٹ مونالیزا کی مسکراہٹ مانی جاتی ہے اس کی وجہ بھی غالباً یہی ہے کہ یہ مسکراہٹ مصنوعی ہے اور اسے دو منٹ تک غور سے دیکھتے رہیئے تو سر چکرانے لگتا ہے۔ یوں تو دنیا میں ایسی بیسیوں مونالیزائیں ہیں جن کی نقلی مسکراہٹوں پر نہ جانے کتنے لوگ اپنے خزانے لٹا چکے ہیں۔

سچ پوچھیے تو اب دل کی گہرائیوں سے ہنسی شاذ و نادر ہی نکلتی ہے ورنہ زیادہ تر مسکراہٹ اور ہنسی مجبوری، مصلحت یا مکاری کی بنا پر ہی ہمارے ہونٹوں پر آتی ہے۔ البتہ کچھ لوگ محض اس لیے ہنستے ہیں کہ انھوں نے فن کاریگی کو دل لگا کر سیکھا ہے۔ کچھ لوگ انگریزی فلم دیکھتے ہوئے احتیاطاً اس لیے ہنستے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی ہنس رہے ہیں۔ کچھ رنگین مواقع کی بات تو چھوڑیے، جب مختصر وقفے کے لیے آدمی مجسم مسکراہٹ بن جاتا ہے۔ مشکل تو اس وقت آن پڑتی ہے جب کوئی لطیفے سنا رہا ہو۔ دنیا میں یوں بھی قلب کو گرما دینے والی اور روح کو تڑپا دینے والی بے شمار حکایتیں ہیں مگر بے ساختہ قہقہہ لگانے پر مجبور کر دینے والے لطیفے بہت کم ہیں۔ پھر بھی ہم کبھی کبھی اچھے برے لطیفوں پر پیٹ پکڑ کر اور دہرے ہو کر ہنستے ہیں خصوصاً اس وقت جب لطیفہ سنانے والا کوئی وزیر اعلیٰ افسر یا کوئی خوب صورت دوشیزہ ہو۔ اگر آپ بھی اپنے دشمنوں کو پہچاننا چاہتے ہوں تو اس کا آسان نسخہ یہ ہے کہ دوستوں کی محفل میں کوئی گھسا پٹا پرانا لطیفہ سنا دیجیے۔ جو ہنسنے لگیں سمجھ لیجیے وہ آپ کے دشمن ہیں آپ کو برباد کرنا چاہتے ہیں جو خاموشی اختیار کر لیں، اگر وہ مرد ہیں تو انھیں بڑھ کر گلے لگا لیجیے۔ وہی آپ کے سچے دوست ہیں۔ دراصل یہی وہ طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا ہے جسے دیکھ کر غالب کا دل جل گیا تھا اور انھیں افسردگی کی آرزو رہنے لگی تھی!

ہمارے آفس کے ڈپٹی منیجر ورما جی جب بھی فون پر گفتگو فرماتے ہیں، ان کی باچھیں یوں کھلی رہتی ہیں جیسے کوئی مخرب اخلاق رسالہ دیکھ رہے ہوں۔ ہم نے ایک دن ان سے اس کا سبب پوچھا تو کہنے لگے "بھئی خواتین کے ساتھ گفتگو کرتے وقت مسکانا تو ہماری تہذیب میں شامل ہے۔"

"مگر ورما جی، آپ کبھی کبھی ٹیلی فون پر قہقہے بھی لگاتے ہیں۔"

"دیکھیے بات یہ ہے کہ رانگ نمبر پر خواتین سے باتیں کرتے وقت قہقہے نکل ہی جاتے ہیں۔"

"اچھا اور حاجی! جب کبھی منیجر یا جنرل منیجر کا فون آتا ہے تب آپ کیا کرتے ہیں؟"

"کچھ نہیں، زیرِ لب مسکراتا رہتا ہوں، بس ذرا احتیاطاً ادب سے ہاتھ باندھ لیتا ہوں۔"

ہمیں ان کا جواب سن کر حیرت نہیں ہوئی۔ ہمارے سابقہ برانچ منیجر کی تو عادت تھی کہ جب بھی جنرل منیجر کا فون آتا تھا، وہ فوراً یس سر، یس سر کہتے ہوئے کھڑے ہو جاتے تھے اور اسی طرح اٹینشن کھڑے ہو کر فون پر گفتگو کرتے تھے جس کا ۹۵ حصہ یس سر، یس سر کی گردان پر مشتمل ہوتا تھا۔ خود ہمارے جنرل منیجر کی یہ عادت تھی کہ جب وہ چیئرمین کے کیبن سے ڈانٹ پھٹکار کھا کر نکلتے تھے، ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجی رہتی تھی بلکہ اندر جتنی زبردست لتاڑ پڑتی تھی، باہر نکلتے وقت ان کی مسکراہٹ اتنی ہی گہری ہو جاتی تھی۔

خیر، ٹیلی فون پر مسکرانے، شرمانے اور دنیا والوں سے چھپ چھپ کر گفتگو کرنے کے دن تمام ہوئے۔ اب بہت جلد ٹیلی فون کے ساتھ منسلک ٹیلی ویژن کا زمانہ آ رہا ہے۔ اب وہ لوگ جنھیں باتھ روم میں نہانے کے ٹب میں لیٹ کر، دور دراز شہروں میں اپنے ہونے والے رشتہ داروں سے ٹیلی فون پر گفتگو کرنے کی عادت ہے، یا وہ لوگ جن کے بیڈ روم میں ٹیلی فون لگا ہوا ہے اور جن کے گھر رات گئے رانگ نمبر کے کال اکثر آتے ہیں، یا پھر وہ لوگ جو بزنس ٹور پر اپنی خوب صورت سکریٹری کے ساتھ تشریف لے جاتے ہیں اور جو سکریٹری کی قربت میں ہوٹل کے کمرے سے اپنی بدصورت بیوی کی خیریت ٹرنک کال کے ذریعے روزانہ معلوم کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، ان تمام لوگوں کو ہمدردی اور مشورے کی ضرورت ہے اس لیے کہ ٹیلی فون کے ساتھ ٹیلی ویژن چسپاں ہو جانے کے بعد ان تمام کھلاڑیوں کی سرگرمیاں سرد ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

ہماری یہ دلی خواہش تھی کہ اپنے اس مضمون میں مسکراہٹ کی قسمیں نہ بتائیں مگر اب چوں کہ طنزیہ و مزاحیہ مضامین میں قسمیں گنانا لازمی قرار دیا جا چکا ہے، ہم مختصراً کچھ اقسام کی مسکراہٹوں پر روشنی ڈال رہے ہیں۔

مرد کی مسکراہٹ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ:

چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

عورت جب مسکراتی ہے تو کسی نہ کسی مرد کو مرنا پڑتا ہے۔ غنچہ اپنے تبسم کو عمر بھر سنبھال کر رکھتا ہے اور جب اسے یہ اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ اپنے ساتھیوں کی طرح اسے بن کھلے نہ مرجھانا پڑے تو ایک تبسم کے لیے کھل جاتا ہے۔

اسی طرح کبھی نہ مسکرانے والے، دنیا کے سنجیدہ ترین لوگ تنہائی میں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دیر تک مسکراتے ہیں تو کبھی بچوں کے کھلونوں سے کھیلنے لگتے ہیں، کبھی فلمی گانوں کی دھنیں بجاتے ہیں تو کبھی رقص کرنے لگتے ہیں۔ بے غیرت شخص آندھی اور طوفان میں بھی کھڑا مسکراتا رہتا ہے، بہادر شخص چوری کرتا ہوا پکڑا جائے تو انتہائی بردباری اور متانت کے ساتھ پولیس کا مقابلہ اپنی دولت سے کرتا ہے اور بے گناہ ثابت ہوتا ہے۔ گناہ گار شخص ہمیشہ متبسم رہتا ہے، نیک اور پاک باز آدمی شاذ ہی مسکراتا ہے۔ بیوی اور شوہر دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کی بے وقوفی پر مسکراتے ہیں۔ نااہل شخص اہلِ علم لوگوں کو اپنے سامنے ہاتھ جوڑے، سر جھکائے دیکھ کر ہنستا ہے۔ آنسوؤں کے درمیان

مسکرانے کا فن صرف فلمی اداکاروں کا حصہ ہے۔ زوردار جھگڑے کے درمیان گھر میں اچانک دوست آجائے تو اسے دیکھ کر مسکرانا کوئی مشکل کام نہیں بشرطیکہ دوست کے ہمراہ اس کی خوب صورت بیوی بھی ہو۔ فوٹو گرافر کے اشارے پر مسکرانا سب سے مشکل اور خطرناک کام ہے کیوں کہ اس سے تصویر بگڑ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ بے خیالی میں مسکرانے والے لوگوں میں شعرا، خواتین اور مسلمانوں کی کثرت ہے، یہ لوگ ہمیشہ منزل مقصود نہ ملنے کی خوشی میں مسکراتے رہتے ہیں۔

شدید غصّے کی حالت میں مسکرانے والے لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں، ان کا کاٹا کبھی پانی نہیں مانگتا۔ اپنی مفلسی پر مسکرانے والا شخص فقیر کہلاتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے پھٹے پرانے کپڑوں کا تقابل اپنے خفیہ بینک اکاونٹ کی دولت سے کرتا رہتا ہے۔ مفلس اور فقیر ممالک کے چند محتاط لوگ اپنے سوئس بینک کے کھاتے نمبر کو یاد کرکے مسکراتے رہتے ہیں۔ بے وقوف کی مسکراہٹ میں اس کا ذاتی غم پوشیدہ ہوتا ہے جبکہ پاگل کی مسکراہٹ میں ساری کائنات کا دکھ سمٹ آتا ہے۔

مسکراہٹ کے بارے میں ایک عام اور غلط نظریہ یہ ہے کہ یہ نہ خریدی جاسکتی ہے نہ خیرات میں مانگی جاسکتی ہے، نہ چرائی جاسکتی ہے اور نہ قرض لی جاسکتی ہے۔ اگر یہ نظریہ صحیح ہے اور مسکراہٹ خریدی نہیں جاسکتی تو آپ ہی بتائیے تنخواہ کے دن جب ہم گھر میں داخل ہوتے ہیں تو بیوی کی مسکراہٹ دل نشین کیوں ہو جاتی ہے بچے کیوں دوڑ کر ہم سے لپٹ جاتے ہیں؟ سرکاری دفتروں میں جھنجھلائے ہوئے کلرک کرنسی نوٹ کی جھلک دیکھ کر اپنے پیلے پیلے دانت کیوں باہر نکالنے لگتے ہیں؟ نشے میں لڑکھڑاتے فقیروں پر جب عرب سیاح چلتی کار سے نوٹوں کی بارش کرتے ہیں تو فقیر مارے خوشی کے دیوانے کیوں ہونے لگتے ہیں؟ اور اگر مسکراہٹ خیرات میں نہیں مانگی جاتی تو دولھا والے سسرال سے مانگے گئے جہیز کو فخریہ مسکرا مسکرا کر اپنے پڑوسیوں اور مہمانوں کو کیوں دکھلاتے ہیں؟ اگر مسکراہٹ قرض نہیں لی جاسکتی تو عورتیں اپنی سہیلیوں سے مانگے ہوئے قیمتی لباس اور زیور پہن کر پارٹیوں میں کیوں اٹھلاتی، مٹکاتی نظر آتی ہیں؟ اور اگر مسکراہٹ چرائی نہیں جاسکتی تو ہمارے سیاست داں فسادات کی آگ بھڑکا کر غریبوں کے ہونٹوں سے مسکراہٹ چھین کر اپنے لبوں پر کیسے سجا لیتے ہیں؟ اور فسادات کے دوران بند گھروں سسکتی بہو بیٹیوں کی ہنسی چرا کر ہنستے کھیلتے باہر نکلتے کیوں دکھائی دیتے ہیں؟

●●

اسمٰعیل ظریفؔ
(حیدرآباد)

پچھلے برس

اپنے ہی لوگوں نے کیا کیا نہ کیا پچھلے برس
ہاتھ آپس ہی میں اپنوں کو دیا پچھلے برس

جس نے جی بھر کے پیا خوب پیا پچھلے برس
موت سے پہلے ہی پی پی کے مرا پچھلے برس

جس کو راس آگئی باہر کی ہوا پچھلے برس
اُس کو چھت پھاڑ کے مالک نے دیا پچھلے برس

سرخرو ہو کے جو بیٹھا تھا یہاں مسند پر
دوستو اُس کا بھی مُنہ کالا ہوا پچھلے برس

اثر اولاد پہ کچھ نہیں ہوگا جب کر
اماں باوا نے کلب جا کے پیا پچھلے برس

کئی لوگوں کی گرانی نے حجامت کردی
سر پہ اک بال بھی باقی نہ رہا پچھلے برس

رزق ہر حیلے سے انسان کو مل جاتا ہے
مُرغِ ہمسائے کا ہاتھ لینے لگا پچھلے برس

کام کرنے کو جو تیار تھا جوکر بن کر
کام سرکس میں بھی اُس کو نہ ملا پچھلے برس

کام بننے کی جہاں کوئی توقع نہ رہی
ہم نے چمچوں سے وہاں کام لیا پچھلے برس

کالے دھندوں سے جسے مل گئی دولت یارو
خوب دل کھول کے عیش اُس نے کیا پچھلے برس

قرض دے بیٹھے سمجھ کر جسے مخلص اپنا
اُسی مخلص نے دیا ہم کو دغا پچھلے برس

رونے والے کی تو ہر حال میں روتے گزری
ہنسنے والے نے ہنسا خوب ہنسا پچھلے برس

پچھلے دروازے سے میخانے میں جاکر اکثر
اچھے اچھوں نے پیا خوب پیا پچھلے برس

بھائی کا کہنا ہے ہم کچھ نہیں کہتے لیکن
کچھ نہ کہتے ہوئے کیا کیا نہ کہا پچھلے برس

ویسے ملنے کو پچاسوں ملے مخلص لیکن
ایک ہمدرد بھی ہم کو نہ ملا پچھلے برس

کام موٹے ہی وہ کرتے رہے اب تک لیکن
کام مولانا نے باریک کیا پچھلے برس

یہ سُنا ہم نے کہ بازارِ ظرافت میں ظریفؔ
اپنا دھندا بھی بہت جم کے چلا پچھلے برس

عاتق شاہ

بچھو



بچھو ـــــ ارے وہ گورے بچھو ــــ اِدھر آ ــــ اِدھر آ۔ ــــ

جب کوئی عورت کسی خوب صورت ننھے سے بچے کو اس طرح اپنی طرف بلاتی ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنا سارا پیار اور اپنی ساری ممتا اس پر لٹا دینا چاہتی ہے !

ننھا نہیں جانتا کہ اُس عورت نے اُس کے بارے میں کیا ریمارک پاس کیا ہے۔ لیکن عورت جانتی ہے کہ اس نے کیا کہا اور اسے یقین ہے کہ ایک دن وہ بڑا ہو کر ــــ

ہوا میں اچھال کر عورت گول مول سے ننھے کو چٹاخ چٹاخ پیار کرتی ہے۔ اور کہتی ہے بچھو ــ میرے گورے بچھو دوسرے الفاظ میں ننھے کے مستقبل کے تعلق سے وہ پیشن گوئی کرتی ہے کہ وہ جوان ہو کر بچھو کی طرح ڈنک مارتا پھرے گا

بچھوؤں میں صرف دو رنگ ہوتے ہیں۔ ایک کالا حبشی کی طرح۔ دوسرا ہلکا سا بھورا، نہیں بادامی رنگ کا۔ لال لال۔ گورا یعنی سفید رنگ کا بچھو اس خطۂ ارض پر کہیں نہیں ہوتا۔ لیکن بوڑھوں کا کہنا ہے کہ خود ہمارے ملک میں سفید بچھو ہوتے ہیں۔ یا ہوتے تھے۔ لیکن اب کہیں نظر نہیں آتے۔ جانے کہاں چلے گئے۔ یا بھاگ گئے۔ لیکن ان کی اولاد ابھی باقی ہے !

اس خصوص میں نہ الوہی کا اسکالر خاموش ہے !

اُلو کی طرح بچھو بھی بڑا تنہائی پسند ہوتا ہے۔ لیکن اُس کی یہ تنہائی اسے آبادیوں سے دور ویرانوں میں نہیں لے جاتی۔ حالانکہ بچھو ویران مقامات پر بھی رہتا ہے۔ اور آبادیوں میں بھی انسانوں سے اُسے نفرت اور نہ لٹی ہوئی اور جلی ہوئی بستیوں سے اسے محبت ہے۔ اصل میں اس کا مسئلہ جگہ کا مسئلہ ہے۔ وہ ایک ایسی محفوظ رہنا پسند کرتا ہے جہاں ہلکی سی نمی ہو۔ اور اُس کی تنہائی میں کوئی جگہ مخل نہ ہو۔ خواہ وہ گھر ہو یا کوئی کھنڈر اُس کے فرق نہیں پڑتا۔ گھروں میں عام طور پر وہ اس کمرے کو ترجیح دیتا ہے جہاں بے کار اور فضول سا سامان پڑا رہتا ہے ٹوٹی کرسیاں، میز، بوسیدہ کپڑے، تانبے کے برتن اور ٹین کے خالی ڈبوں کے نیچے وہ ان کو شھل کو تلاش کرتا ہے جہاں اپنا سر چھپا سکے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ وہاں کی زمین کچھ گیلی گیلی ہو۔ چھتوں کی کھپریل تو اُس کی پسندیدہ جگہوں میں سے ایک ہے۔ ویران مقامات میں گرتی ہوئی دیواروں، بیٹھی ہوئی قبروں اور پتھروں کی بڑی بڑی سلوں کے نیچے خالی پڑے ہوئے چھوٹے سے حصے میں اطمینان کے ساتھ وہ رہتے

لگتا ہے۔

دن میں بچھو آرام کرتا ہے اور شام ہوتے ہی اپنا پیٹ بھرنے کے لیے باہر نکلتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے کیڑے اور جھینگا اس کی مرغوب غذا ہیں۔ ویسے جو بھی مل جائے وہ اُسے کھا لیتا ہے۔ خواہ وہ کوئی معمولی سا حقیر کیڑا ہی کیوں نہ ہو۔ اپنی مرغوب غذا پر وہ کبھی اصرار نہیں کرتا۔ جیسے ہی وہ شکار کی تلاش میں اپنے گھر سے باہر نکلتا ہے تو دوسروں کو پتہ چل جاتا ہے کہ بچھو آ رہا ہے۔ اس لیے ہوشیار ــــــ ہوشیار !!

بچھو کے آٹھ پاؤں ہوتے ہیں۔ دائیں طرف چار۔ اور بائیں طرف چار۔ اس طرح آٹھ پاؤں جب ایک ساتھ حرکت کرتے ہیں تو ایک خاص اور عجیب قسم کی آواز زمین کی سطح پر ایک لہر کی طرح یوں آگے بڑھتی ہے جیسے برقی رو۔ اور کانوں سے یہ لہر یا رو اس طرح ٹکراتی ہے کہ سننے والا آنے والے خطرے سے مقابلے کے لیے خود کو تیار کر لیتا ہے۔

آٹھ پاؤں والے اس جانور کی آنکھیں بھی آٹھ ہوتی ہیں۔ منہ پر دو نمایاں سیاہ نقطے وہ دو آنکھیں ہیں جن سے وہ سامنے کی طرف دیکھتا ہے۔ دائیں بائیں وہ دیکھ نہیں سکتا۔ اس لیے کہ اُس کی آنکھوں میں پتلی نہیں ہوتی جو گھوم پھر کے دیکھنے میں مدد دیتی ہے۔ لہٰذا نیچر نے اُس کی اپنی مدافعت کے لیے دائیں اور بائیں تین تین آنکھیں رکھی ہیں جو بہت ہی چھوٹے چھوٹے نقطوں جیسی ہوتی ہیں۔ ان سے وہ اپنے دشمن کو دیکھ لیتا ہے اور اپنے بچاؤ کی تدبیر سوچتا ہے۔ اس طرح آٹھ آنکھوں اور آٹھ پاؤں کے ساتھ وہ اپنی زندگی کا سفر جاری رکھتا ہے۔

ذات کا کرب بچھو میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُسے دوسرے جانوروں پر فوقیت حاصل ہے۔ اپنے تشخص اور شناخت کی خاطر وہ ہمیشہ ڈنک مارتا رہتا ہے اور ڈنک مار کر دوسروں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ یہ میں ہوں ــــــ میں !

جانوروں میں بچھو ایک ایسا جانور ہے جو اپنے محسن کو بھی نہیں بخشتا۔ احسان فراموش کا وہ مشہور قصہ آپ نے ضرور سنا ہوگا جو ایک کچھوے سے متعلق ہے۔ اگر نہیں تو اب سن لیجیے ــــــ۔

اس قصے میں ہوتا یوں ہے کہ ایک دن کچھوے نے بچھو کو پریشان دیکھ کر پوچھا۔ بھئی کیا بات ہے۔ بڑے اُداس لگتے ہو۔ بچھو نے جواب دیا، بھائی کچھوے! میں نے اپنے ایک دوست کو وقت دیا ہے کہ ندی کے اُس پار ملوں گا۔ اور اب وقت ہو رہا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اس کنارے کیسے پہنچوں گا ــــــ

کچھوے نے کہا، یہ کون سی بڑی بات ہے۔ تم فکر مت کرو۔ میں منٹوں میں تمہیں ندی پار کروا دوں گا۔ تم میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ ــــــ۔

بچھو خوشی خوشی کچھوے کی پتھر جیسی سخت پیٹھ پر بیٹھ گیا۔ لیکن کچھ دیر چلنے کے بعد وہ ڈنک مارنے لگا۔ ٹِک ٹِک کی آواز سن کر کچھوے نے بچھو سے پوچھا، بچھو صاحب! یہ آپ کی کیا حرکت ہے۔ میں آپ کی مدد کر رہا ہوں اور آپ مجھے ڈنک مار رہے ہیں۔

بچھو نے ذرا توقف کے بعد کہا، میں کیا کروں۔ اپنی عادت سے مجبور ہوں۔ بچھو کا جواب سن کر کچھوے نے کہا، جناب والا! مجھ میں بھی ایک بری عادت ہے جس سے آپ واقف نہیں۔ اور وہ یہ کہ بیچ ندی میں پہنچ۔

کے بعد میں ہمیشہ ڈبکی لگاتا ہوں !

بچھو پریشان ہو گیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر کہنے لگا، میرے باپ ! خدا کے لیے ایسا مت کر۔ اب میں ڈنک نہیں ماروں گا۔ لو میں اپنے کان پکڑتا ہوں !

کچھوا خاموش رہا۔ لیکن بیچ ندی میں پہنچنے کے بعد اُس نے ایک زوردار ڈبکی لگائی۔ اس کے بعد کوئی اندازہ کر سکتا ہے کہ بچھو کا کیا حشر ہوا ہوگا !

بچھو میں ذرا سی بھی غیرت نہیں ہوتی۔ ابھی وہ کپڑوں کے اسٹانڈ کے پاس سے ورانڈے میں جاتا ہوا نظر آیا۔ ادھر گھر کے ایک دو نہیں کئی افراد چپل یا جوتا ہاتھ میں لے کر اس کے پیچھے دوڑ پڑے لیکن وہ ورانڈے میں سے گزر کر کچن کی دہلیز پر غائب ہو گیا جو وہاں نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد یا رات کو وہ کسی دیگچے یا کسی گھڑے کے نیچے سے یوں برآمد ہوگا جیسے یہ سارا علاقہ اُس کی چہل قدمی کے لیے وقف کر دیا گیا ہے۔ پھر وہ صاحب خانہ کے جوتے یا بیوی کی سینڈل سے ٹیک پڑے گا جس کے بارے میں کسی نے سوچا نہیں تھا کہ وہ وہاں ہوگا۔ بے غیرتی کے ساتھ غیروں کے گھروں میں یوں گھومنا پھرنا اُس کی فطرت ہے !

اگر کسی کے ہاتھ لگ گیا تو وہ وہیں کچل دیا جاتا ہے، جہاں نظر آیا۔ ورنہ چارپائی کا کوئی نہ کوئی کونا یا کتابوں کی الماری اُس کی آخری پناہ گاہ ہوتی ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ وہاں سے کب باہر آئے گا۔

بچھو اپنی ساری زندگی زہر تقسیم کرنے کا کام انجام دیتا ہے۔ کسی نے اُسے محبت کرتے نہیں دیکھا۔ اگر وہ کسی کو چاہتا ہے تو اپنی مادہ کو۔ لیکن اُس کی یہ چاہت اور محبت بھی بڑی عجیب و غریب و حیران کن شے ہے۔ نہ وہ اپنی مادہ کو سینہ سے لگاتا ہے اور نہ اُس کا بوسہ لیتا ہے۔ صرف اپنے دونوں ہاتھ اُس کی کمر میں ڈال دیتا ہے۔ پھر سامنے اور پیچھے کی طرف جھولتا رہتا ہے۔ بچھو کا یہ رقص کوئی آٹھ دس گھنٹے تک جاری رہتا ہے۔ سنا ہے کہ "راک اینڈ رول" ڈانس بچھو کے رقص کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ اس ہیجانی رقص کے فوری بعد بچھو اپنی مادہ کو پیچھے کی طرف دھکیل کر خود کو اُس کی باہوں کی گرفت سے آزاد کرا لیتا ہے اور اپنی زندگی کو بچا لیتا ہے۔ ورنہ مادہ اتنی بھوکی ہو جاتی ہے کہ اپنے نر کو چبا ڈالے۔

بچھو کے کوئی چھ سات بچے ہوتے ہیں جسے اُس کی مادہ اُن کے بڑے ہونے تک اپنی پیٹھ پر رکھ کر پرورش کرتی ہے۔ بچھو کی اوسط عمر کوئی دس بارہ سال کی ہوتی ہے لیکن اس عرصہ میں بچھو وہ۔ وہ دھوم مچاتا ہے کہ کچھ نہ پوچھئے۔

دنیا جہاں کی تمام زولوجیکل لیباریٹریوں میں بچھو پر ریسرچ ہو رہا ہے۔ اگر اس کی ڈنک نکال دی جائے تو یہ بے ضرر ہو جاتا ہے۔ لیکن انسانوں میں چھپے ہوئے بچھوؤں پر اب تک کوئی ریسرچ نہیں ہوا ہے۔ پتہ نہیں اُن پر کبھی ریسرچ ہوگا بھی یا نہیں !۔

انسانوں میں گورے چٹے، کالے کلوٹے اور قسم قسم کی بولیاں بولنے والے بچھو موجود ہیں۔ لیکن انھیں اُس وقت تک پہچانا نہیں جا سکتا جب تک یہ ڈنک نہ ماریں۔ ڈنک مار مار کر ساری انسانی برادری میں نفرت کا زہر پھیلا رہے ہیں۔ ڈنک مارنا ان کی ہابی نہیں ہے بلکہ یہ اپنے تشخص اور شناخت کی خاطر ڈنک مارتے ہیں۔ دیکھئے —— دیکھئے ! بچھوؤں کا وہ جلوس آ رہا ہے۔ ہوشیار —— ہوشیار۔

سُشیل کمار ترنگ عنایت پوری
سیوان (بہار)

وفادار بندر

گاندھی جی ایک رات مجھے خواب میں ملے　　چلتے رہے سوال، جوابوں کے سلسلے
کہنے لگے کہ ترنگ کہو خیریت تو ہے　　اپنے وطن میں امن داماں عافیت تو ہے
میں نے کہا حضور دعائیں ہیں آپ کی　　میں جائداد بیچ کے کھاتا ہوں باپ کی
پڑھ لکھ کے لختِ دل مرا بے روزگار ہے　　اُس پر بھی بھوت شعر و سخن کا سوار ہے
جو خوب چل رہا تھا وہ ہے مند کاروبار　　بنیوں کی مہربانی ہے کھاتا ہوں میں اُدھار
وہ کاروبار کیا ہے جو آج آیا کل گیا　　اس تسکری پہ مجھ کو بھروسہ نہیں رہا
داروغہ جی کو ٹیکس تو ہر ماہ دیجئے　　رشوت کی شکل میں اُنھیں تنخواہ دیجئے
وہ تو خدائے پاک کا احسان ہے جناب　　تیزی پہ شاعری کی یہ دوکان ہے جناب
کہنے لگے کہ دیش کا کچھ حال تو کہو　　کیا تین بندروں کے ہیں اعمال تو کہو!
میں نے کہا کہ آپ کے بندر مزے میں ہیں　　سرکار کے اُصول کے اندر مزے میں ہیں
جو بہرہ تھا وہ رہتا ہے لیڈر کے ساتھ ساتھ　　جو اندھا تھا وہ چلتا ہے افسر کے ساتھ ساتھ
جو گونگا تھا وہ دورِ سیاست میں ہے مہان　　مقبول ہو گیا ہے وہ جنتا کے درمیان

یہ بندر آج کل تو سیاست کی جان ہیں
اکیسویں صدی کے یہ تینوں مہان ہیں

قمرالزماں قمرؔ

غزل

(حضرت غالبؔ کی روح سے معذرت کے ساتھ)

راز میرے عشق کا کیوں کر کھُلا　　شاید اس کے گھر کا ننھا چھپر کھُلا
ساری تعریفیں اُسی کے نام ہیں　　میرے نام، رسوائی کا دفتر کھُلا
دوش پر تھا سر بہت بارِ گراں　　مرتبہ اس کا سرِ خنجر کھُلا
بند بوتل میں نظر آتا نہیں　　بعد پینے کے کہیں شاعر کھُلا
گھر مرا سیلاب میں جس دن بہا　　آسماں اُس دن سے ہے سر پر کھُلا

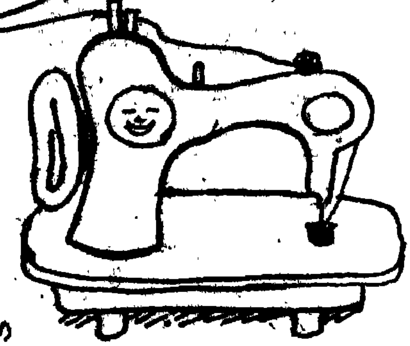
کہتے ہیں عاشق نکما ہے قمرؔ
اس سے اردو لکچرر بہتر کھُلا

عابد معز
(ریاض)

درزی نامہ



درزیوں
کا نعرہ (GOD
MADE YOU MAN
AND WE MAKE YOU
GENTLLEMAN) "خدا نے آپ کو
آدمی بنایا اور ہم آپ کو انسان بناتے ہیں"



آپ اس نعرے سے اتفاق کریں یا نہ کریں' یہ بات مسلمہ ہے کہ انسان کی قدر و قیمت اس کے کپڑوں سے ہوتی ہے۔ پولیس کو جب تک مخصوص لباس میں نہ دیکھیں ڈر پیدا نہیں ہوتا۔ کسی کو سوٹ بوٹ پہنے دیکھتے ہیں تو قیاس ہوتا ہے کہ یہ شخص فر فر انگریزی بولے گا۔ شیروانی دیکھیں تو اُردو یاد آتی ہے۔ لنگی اور شرٹ ہمارے خیال کو جنوب کی طرف لے جائے گا تو کُرتہ، پیجامہ دیکھ کر شمال کی طرف توجہ مبذول ہو جاتی ہے۔ کھدر کا لباس اور ٹوپی پہنے ہوئے دیکھیں تو جی چاہتا ہے کہ ووٹ دیں۔ کم یا پھٹے پرانے کپڑے ہوں تو خیرات کے لیے ہاتھ جیب کی طرف جاتا ہے۔ آج بھی کوئی چاہے تو کپڑوں سے بے نیاز رہ کر پتھر کی تہذیب کی یاد دلا سکتا ہے اور اگر کپڑوں کی تہذیب میں ممتاز مقام حاصل کرنا ہے تو درزیوں کے ناز نخرے اٹھانے ہی پڑتے ہیں۔ ناز نخرے ان کے جو جیب کاٹ کر گریباں چاک کر کے جیب و گریباں سیتے اور جامہ زیبی عطا کرتے ہیں۔

ہمارے بچپن میں نئے کپڑے عید اور شادی بیاہ کے موقعوں پر بنا کرتے تھے۔ درزی گھر بلائے جاتے تھے۔ وہ مشین اٹھائے ایک دو لڑکوں کے ساتھ گھر آ کر ہر کس و ناکس کے کپڑے سیتے تھے۔ پرانے کپڑوں کی مرمت بھی کر دیتے تھے۔ تکیہ، غلاف، میز پوش وغیرہ بھی بنوا لیے جاتے

بازار میں درزی کی دکانیں بھی ہوتی تھیں۔ دکان کے بیچ میں ایک تختہ بچھا ہوتا جس پر درزی

نئے کپڑے کاٹنے اور سینے کے بعد استری پھیرتے تھے۔ ایک کونے میں مشین ہوتی تھی اور کپڑے سی کر کھونٹیوں پر لٹکائے جاتے تھے۔ بٹن ٹانکنے رفو کرنے اور ایسے ہی چھوٹے موٹے کام کے لیے درزی اپنی گھر والیوں کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ آج یہ پیشہ اتنی ہی ترقی کر چکا ہے جتنی کہ انسان نے پتّوں سے تن ڈھانکنے سے کپڑے پہننے تک کی ہے۔ انگلینڈ اور امریکہ جاکر درزی تجربہ اور ڈگریاں لے آتے ہیں۔ اب درزی سلائی مشین اٹھائے گھر نہیں آتے بلکہ ہمیں اپنا کپڑا اٹھائے درزی کی دکان جانا پڑتا ہے۔ شہر کے پُر رونق بازار میں بہترین سجی سجائی دکان ہوتی ہے۔ سلائی مشین نظر آتی ہیں اور نہ سلائی کرنے والے دکھائی دیتے ہیں۔ بعض درزیوں سے ملنے کے اوقات مقرر ہیں تو بعض سے اپائنٹمنٹ لے کر ملنا پڑتا ہے۔ دکان میں بہترین فرنیچر لگا رہتا ہے۔ اطراف شوکیس میں سلے ہوئے ہمہ اقسام اور ہمہ رنگ کے کپڑے لٹکے ہوتے ہیں۔ دو چار مجسمے بھی نصب ہوتے ہیں جنھیں گاہکوں کے نئے کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ دیواروں پر تصویریں ٹنگی ہوتی ہیں۔ تصویروں میں خوب صورت اشخاص بہترین کپڑے پہنے مختلف انداز سے آنے والوں پر مسکراتے ہیں میز پر جامہ زیبی سے متعلق رسالے اور نت نئے فیشن کے البم بکھرے ہوتے ہیں۔ ایک کونے میں پیشۂ خیاطی پر کتابیں سجی رہتی ہیں۔ یہ نقشہ صرف انتظار گاہ کا ہے۔ درزی کی دکان میں مزید دو اہم کمرے ہوتے ہیں۔ ناپ لینے کا کمرہ جس میں مکمل رازداری کی طمانیت رہتی ہے دوسرا ٹرائل کا کمرہ۔ اس کمرے میں چاروں طرف آئینے لگے ہوتے ہیں۔ درزی کے فن کے کمال کو اپنے جسم پر سجائے مختلف زاویوں سے آئینہ میں دیکھیے۔

پیشہ کی ترقی کے ساتھ ماہر درزیوں کے الگ الگ شعبے بن گئے ہیں۔ لیڈیز اور جینٹس ٹیلر مختلف ہوگئے ہیں بچوں کے کپڑے تیار کرنے کے ماہر الگ ہوتے ہیں۔ یہ درزی نسبتاً گمنام زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کا فن دکان پر ریڈی میڈ کپڑوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ مہارت لیڈیز، جینٹس اور چلڈرن میں تقسیم ہو کر اب ذیلی شاخوں میں بٹنے لگی ہے۔ کوئی کوٹ سینے کا اسپیشلسٹ ہے تو کوئی شیروانی تیار کرنے کا ماہر ہے۔ کوئی شرٹ تو کوئی پتلون بناتے ہیں۔ کوئی شلوار قمیص پر ہاتھ صاف کرتے ہیں تو کوئی کھڑا ڈوپٹہ کے ماہر ہیں۔ لباس میں جتنے قسم کے کپڑے ہوتے ہیں اب اتنے ہی قسم کے ماہر درزی پائے جاتے ہیں اور آدمی کو انسان بنانے میں ان سب کا دخل ہوتا ہے۔ اب آپ سے کیا چھپائیں ہم نے اپنی شادی میں سالے اور سالیوں سے زیادہ درزیوں کے ناز نخرے برداشت کئے ہیں۔ شادی سے چند دن قبل بلکہ بعد بھی ہم درزی یاترا پر نکلتے تھے۔ پہلے شیروانی سینے والے کے پاس جاتے، وہاں سے چوڑی دار پاجامہ والے درزی سے ملاقات کرتے، پھر شرٹ سینے کے ماہر کو سلام کرتے۔ ان سے فرصت پاکر پتلون پہنانے والے درزی کا چہرہ دیکھتے اور پھر کوٹ والے درزی کی خوشامد کرنے جاتے تھے۔

کپڑے تیار کرنے کے لیے درزی ناپ لیتے ہیں۔ ہاتھ اور پیر کی لمبائی، کلائی اور پنڈلی کی موٹائی پیٹ اور پیٹھ کی گہرائی اور گردن ناپتے ہیں۔ متعدد سوالات بھی کئے جاتے ہیں۔ آپ پتلون کہاں باندھتے ہیں۔ بلٹ استعمال کرتے ہیں یا بغیر بلٹ گھومتے پھرتے ہیں۔ جیب میں کیا رکھتے ہیں۔ سگریٹ کی ڈبیا ساتھ رکھتے ہیں یا کھلے سگریٹ جیب میں رکھ کر شوق پورا کرتے ہیں۔ دستی سے ناک صاف کرتے ہیں یا آستین سے کام چلا لیتے ہیں۔ ایک وقت میں کتنے پیسے آپ کے ساتھ ہوتے ہیں۔ کیا آپ انھیں جیب کتروں سے بچانا چاہتے ہیں۔ گلے کے کتنے بٹن بند رکھتے ہیں۔ سر پر تیل ڈالتے ہیں یا بال روکھے رکھتے ہیں۔ اگر تیل ڈالتے ہیں تو چکنائی سے کالر خراب ہوگا جس کی ذمہ داری [illegible]

رعاً بندھ بھی گلے میں ٹائی باندھتے ہیں یا رومال رکھتے ہیں۔ جوتے کون سے پہنتے ہیں۔ ایڑی کتنی اونچی ہوتی ہے۔
ے کپڑوں کا استعمال کیسے کریں گے۔ انھیں پہن کر کہاں کہاں جائیں گے۔ حلقۂ احباب کیسا ہے۔ درزی چال چلن پر سوالات
رنے کے علاوہ گاہک کو ٹہلا کر چلنے کا انداز دیکھتے ہیں، کرسی اور فرش پر بٹھا کر بیٹھنے کا انداز معلوم کرتے ہیں۔ ہاتھوں
و آگے پیچھے اوپر نیچے کرواتے ہیں۔ کہتے ہیں چال چلن کو ذہن میں رکھ کر کپڑے کاٹنے اور سینے سے پہننے والے کو
وزمرہ کے معاملات میں سہولت رہتی ہے ورنہ اندازہ کیجئے کوئی ہاتھ ملانا چاہتا ہے لیکن شرٹ کی آستین اس کی اجازت
ہیں دیتی۔ محفل میں فرش پر بیٹھنا چاہتا ہے لیکن پتلون کی سلائی محفل سے بے آبرو کرکے اٹھوا دیتی ہے۔

درزی ناپ لیتے وقت جسمانی کمزوریوں سے واقفیت حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ بات ہمارے کسی دوست کو نہیں
علوم کہ ہمارا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ سے ایک انچ چھوٹا ہے۔ ہمارا یہ نقص ہمارے درزی کو معلوم ہے اور وہ ناپ لیتے وقت
سکراتے ہیں۔ شرٹ سیتے ہیں تو بھی بائیں ہاتھ کی آستین ایک انچ چھوٹی کر دیتے ہیں بیلنس کرنے کی کوشش میں فل شرٹ
ف شرٹ بن جاتا ہے۔ ہمارے ایک دوست درزی کے آگے شرمندہ ہونے سے بچنے کے لیے ہمیشہ ریڈی میڈ کپڑے پہنتے
ں۔ درزی دور اندیش بھی ہوتے ہیں۔ ناپ لیتے وقت کبھی دور کی کوڑی بھی اٹھا لاتے ہیں۔ ہم نے ایک درزی کو گاہک
سے کہتے سنا "محسوس ہوتا ہے آپ شادی سے خوش نہیں ہیں۔ شادی کے بعد لوگوں کا وزن بڑھتا ہے جب کہ آپ کا وزن کم
ہا ہے"۔ درزیوں کو گاہک کے جسمانی وزن کا خود گاہک سے زیادہ اندازہ رہتا ہے۔ کہیں گے "جناب آپ کی توند دو
نچ آگے نکل آئی ہے۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں موٹاپا ایک مرض ہے۔ ہر دن دو میل دوڑا کیجئے اور چکنائی سے
رہیز کیجئے گا"۔ بعض مرتبہ ناپ لینے کے دوران درزی طبی تشخیص بھی کرتے ہیں۔ آپ کا وزن کافی کم ہوا ہے۔ کھانسی رہتی
ں چہرہ زرد بھی دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر سے رجوع ہو کر معاینہ کروایئے کہیں تپ دق تو نہیں ہے۔ گویا کپڑے سلوانا بلا
ہمان بنتا ہے تو درزیوں کی ڈاکٹری کو بھی برداشت کرنا پڑے گا!۔

درزیوں کو گاہک کے لائے ہوئے کپڑے پسند نہیں آتے۔ ہزار نقص نکالتے ہیں کپڑا مہنگا ہے۔ رنگ اڑ جاتے
ا۔ عمر بڑھ رہی ہے اب آپ کو ایسے بھڑکیلے کپڑے نہیں پہننے چاہئیں۔ کپڑے پر کریز نہیں بیٹھے گی۔ گاہک کا لایا ہوا کپڑا ہمیشہ
رزی کے حساب سے کم ہوتا ہے۔ ہر مرتبہ کپڑا زیادہ منگوایا جاتا ہے۔ نئے فیشن کے لباس سینے کے لیے زیادہ کپڑا چاہیے
شیار درزی اپنی دکان میں بہترین کپڑا بھی رکھتے ہیں۔ کپڑا پسند کیجئے بلکہ خود درزی ہمارے لیے کپڑا پسند کر دیں گے۔ ناپ
یجئے اور منہ مانگی قیمت ادا کیجئے تو درزی ہمیں انسان بنا دیں گے۔ ان درزیوں پر یہ کہاوت صادق آتی ہے۔ "آم کے آم
ر گٹھلیوں کے دام" درزی حضرات کپڑے پر اپنی پسند کے اظہار پر اکتفا نہیں کرتے، وہ ہمارے لباس
بھی رائے دیتے ہیں۔ "تنگ سوٹ آپ کو مناسب نہیں رہے گا۔ میری رائے میں ڈھیلا ڈھالا شرٹ اور تنگ پتلون
ب رہے گا"۔ "آپ اتنے تنگ کپڑے کیسے پہن سکتے ہیں جنھیں پہننے کے لیے ہمیں دقت ہوتی ہے"۔ "بڑا کالر رکھئے
ے آپ کا سر چھوٹا نظر آئے گا"۔ "پھولدار شرٹ پہننے سے آپ کی گردن مزید لمبی دکھائی دے گی"۔ وغیرہ۔ اب آپ سے
یا چھپائیں ہمارے لباس کے انتخاب میں ہماری بیوی سے زیادہ ہمارے درزی کا دخل رہتا ہے۔

انتہائی احتیاط سے ناپ اور انٹرویو لینے کے بعد درزی جو کپڑے سیتے ہیں وہ کبھی ہمارے جسم کے برابر نہیں ہوتے

کبھی تنگ تو کبھی ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔ کہیں جھول پڑ جاتا ہے تو کہیں سلائی میں کپڑا اندر کھینچ جاتا ہے۔ کبھی سلائی ٹیڑھی ہو جاتی ہے تو کبھی سلائی میں وقفے رہ جاتے ہیں الٹے پاؤں درزی کے پاس پہنچ کر شکایت کرتے ہیں۔ درزی اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتے الٹا گاہک کے جسمانی نقص نکالتے ہیں "آپ کے شانے سامنے کی طرف جھکے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے پیچھے جھول آنا ضروری ہے"۔ "آپ کے چلنے کا انداز عجیب ہے ٹانگوں کے درمیان خواہ مخواہ سلوٹیں لگ جاتی ہیں۔ اگر آپ اپنی چال بدلیں تو آپ کو سلائی سے شکایت نہیں رہے گی"۔ درزی نے ہمدردی کی تو گاہک کے بجائے کپڑے کو ذمہ دار ٹھہرائیں گے۔ کپڑا خراب ہے اس پر سلائی ہی نہیں بیٹھتی۔ آئندہ آپ اس قسم کا کپڑا نہ خریدیں۔ اس کپڑے پر استری نہیں رہتی۔ اچھی سلائی بھی ہو تو جسم پر کپڑا ٹھیک نہیں لگتا۔ گاہک کی قسمت اچھی رہی تو اسے سلائی پسند آئی اور اس نے نئے کپڑے پہنے ورنہ نئے کپڑوں کو الماری میں جھینگروں کی غذا بننے کیلئے کونے میں ڈال رکھتے ہیں۔

یوں تو درزی سال کے بارہ مہینے مصروف رہتے ہیں لیکن ان کی مصروفیت عید اور تہوار اور شادی بیاہ کے موسم میں چار گنا ہو جاتی ہے۔ اجرت بھی چار گنا بڑھ جاتی ہے اور اسی حساب سے اس دوران سلنے والے کپڑے چار گنا خراب سلتے ہیں۔ عید اور تہوار سے کئی دن قبل درزی کپڑے لینا تو کجا سیدھے منہ بات نہیں کرتے، ہاتھ میں قینچی یا سوئی تنی رہتی ہے تو منہ اور دانتوں میں دھاگے پھنسے رہتے ہیں۔ عید سے دو چار دن قبل اپنی دکان بظاہر بند کر کے چور دروازے سے گاہک کے کپڑوں کی ڈیلیوری کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ ہم نے عید سے قبل منت سماجت کر کے درزی کو سوٹ سینے دیا۔ درزی نے صرف کچی سلائی کر کے دینے کا وعدہ کیا۔ عید کے بعد وہ پکی سلائی کر دیں گے۔ عید کے دن ہم سوٹ پہن کر دوست احباب سے ملنے گئے۔ ہم سے ایک قریبی دوست کچھ بے تکلفی سے گلے ملے۔ سوٹ کا کچھ حصہ ہمارے یہاں رہا اور کچھ حصہ ان کے پاس بطور سوغات چلا گیا۔ مصروفیت کے موسم میں وقت کی پابندی کسی حال میں نہیں کرتے لیکن عام دنوں میں بھی درزی وقت کی پابندی کے مخالف نظر آتے ہیں۔ مقررہ دن کپڑے وصول کرنے جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ بٹن ٹانکنا باقی ہے۔ استری پھیرنی ہے۔ گاہک خوش ہوتے ہیں کہ کچھ ہی دیر میں کپڑے تیار ہو جائیں گے لیکن پتہ چلتا ہے کہ کپڑے سلنے کے بعد بٹن ٹانکے جائیں گے اور پھر استری پھیری جائے گی تو کوفت لیے واپس ہوتے ہیں۔ دوسری یا پھر تیسری چکر میں کپڑے مل جائیں تو ٹھیک ہے ورنہ ہم نے نئے کپڑے حاصل کرنے کے لیے بعض لوگوں کو پرانے کپڑوں کی قربانی دیتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔

ہمارے خیال میں کم سے کم کپڑے پہننے کا نام فیشن ہے لیکن درزیوں کا کہنا ہے کہ زیادہ کپڑے سلیقہ اور جدت سے پہننے کا نام فیشن ہے۔ درزی دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ وہ نت نیا فیشن ایجاد کرتے ہیں۔ ہم درزیوں کے اس دعوے سے اتفاق کرتے ہیں کہ درزی فیشن بناتے ہیں۔ درزی اپنی غلطیوں کو فیشن کا نام دیتے ہیں۔ بڑا کالر کاٹنے میں درزی نے غلطی کی تو چھوٹے کالر کا فیشن چل پڑا۔ گردن کو صراحی دار شکل نہ دے سکے تو بغیر کالر شرٹس کے فیشن کا بول بالا ہوا۔ درزی گاہک کی فیشن نامی کمزوری سے خوب واقف ہیں۔ جہاں کہیں درزی سے غلطی سرزد ہوئی اسے ٹھیک کرنے کے لیے نیا فیشن وجود میں آیا۔ دو دن قبل کی بات ہے کہ ہمارے درزی نے ہماری پتلون کو بہت تنگ کاٹ دیا اور

اسے پہننے کے قابل بنانے کے لیے دو مالی لگائی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اب تک دو مالی والے پستوں کا فیشن چل پڑا ہوگا۔ ہمیں درزیوں کی غلطیوں پر اعتراض نہیں ہے۔ غلطی ہر ایک سے ہوتی ہے۔ درزیوں کو چاہیے کہ اپنی غلطیوں کو نبھائیں یعنی فیشن کا نام دے کم از کم چند ہفتوں کے لیے قائم رکھیں۔ درزی فیشن اس تیزی سے بدلتے ہیں کہ فیشن کا ساتھ دینا ناممکن ہو جاتا ہے۔ بعض مرتبہ کپڑا خرید کر پہننے تک فیشن بدل جاتا ہے۔ پرانے درزی اپنی غلطیوں پر نادم رہتے تھے اور اپنا یا اپنی دکان کا لیبل کپڑوں کے اندر کسی کونے میں ٹانکتے تھے لیکن آج درزی اپنی غلطیوں کو فیشن کا نام دے کر اپنے نام اور فن کا لیبل کپڑوں کے اوپر چسپاں کرتے ہیں۔ گاہک ان کی تشہیر کا ذریعہ بنتا ہے جیسے گاہک نہ ہو، ان کا اپنا پراڈکٹ ہے۔

ایک مرتبہ کپڑا سلنے اور درزی کی دکان سے باہر آنے کے بعد کسی صورت واپس درزی کے پاس نہیں جا سکتا۔ درزیوں کو نئے کپڑوں سے فرصت نہیں ملتی کہ وہ پرانے کپڑوں کو ٹھیک کریں چاہے انھیں خود اسی درزی نے بنایا تھا۔ درزی وہ غیرت مند ہوتا ہے جو مردار جانوروں اور دوسروں کے شکار کی طرف نظر نہیں اٹھاتا۔ پرانے کپڑوں کی مرمت کے لیے گھر والی یا پھر دھوبی کی خدمات حاصل کرنی ہوتی ہیں۔ دھوبی کپڑے دھونے کے بعد حسب ضرورت ان کی مرمت بھی کر دیتے ہیں لیکن لگتا ہے ہمیں کپڑے سلنے سے پریشان کرنے کے لیے درزیوں اور دھوبیوں میں خفیہ معاہدہ ہوا ہے۔ پہلی مرتبہ کپڑے دھلنے جاتے ہیں تو چند بٹن غائب ہو جاتے ہیں۔ شکایت کرنے پر دھوبی درزی کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں، "درزی بٹن ٹانکتے نہیں چپکا دیتے ہیں۔" درزی سے سنا دیتے تو درزی کو کپڑے دھونے کے طریقوں پر اعتراض ہوتا ہے۔ "پتھر پر پٹک کر کپڑے دھوئے جاتے ہیں تو بٹن ٹوٹ جاتے ہیں۔ آپ دھوبی تبدیل کیجیے گا۔" درزی اور دھوبی کی متفقہ کوششوں سے جلد ہی تیسرے یا چوتھے دھوپ میں کپڑے پھٹنے لگتے ہیں۔ درزی اور دھوبی کپڑا خراب ہونے کی شکایت کرتے ہیں، "کپڑا اچھا نہیں تھا، جلد پھٹ گیا۔" ہم سر تھامے مسئلہ کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ کیا ہم درزیوں کے ناز نخرے اٹھائے بغیر انسان نہیں بن سکتے؟ انسان تو بن سکتے ہیں لیکن زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس لیے کہ صرف آخری سفر کے لیے بغیر سلا کپڑا پہنایا جاتا ہے!

مالنامہ جنوری ۱۹۹۰ء

۷۰

Phone: 264048
269340
Resi.: 4952453

Tlx: 011-6815 YALE IN
ATTN-SAGAR INT'L

with Best Compliments of:

SAGAR INTERNATIONAL EXPORTS

EXPORTERS & IMPORTERS

14, Fifth Floor, Mohatta Market,
Bombay
400001.
(INDIA)

قطعات

سگار لکھنوی
(جدہ P.B. 7624)

تلاش کرتے ہیں شام و سحر نہیں ملتا
ہزار کوششیں کرتے ہیں پہ نہیں ملتا
تڑا کے بھاگا ہے رسّی کو جب سے اُن کا گدھا
جناب شیخ کو اب ہمسفر نہیں ملتا

سمجھے تھے مشکلیں سبھی آسان کر گئی
بعدِ وصال اور پریشان کر گئی
تصویر اپنی چھوڑ کے میری کتاب میں
بیوی کے ہاتھوں پٹنے کا سامان کر گئی

اُس سمت تو خلاؤں ستاروں کے ہیں سفر
ہم اس طرف ہیں محوِ تماشائے بام و در
دُنیا و ما فیہا کی نہیں کچھ خبر ہمیں
رکھتے ہیں صرف اپنی پڑوسن کی ہم خبر

انسان ہیں کہ حیوان ہیں رشدی صاحب
دانا ہیں کہ نادان ہیں رشدی صاحب
ابلیس انھیں دیکھ کے کہتا ہے یہی
میرے بھی چچا جان ہیں رشدی صاحب

گنگناتے تھے شبِ ہجر وہ غالب کی غزل
'دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک"
ہم نے اک موم کی بتی انھیں دِکھلا کے کہا
'شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک"

کیا مرتدانِ دین سے پیمان ہو گیا
کیا جیب گرم کرنے کا سامان ہو گیا
یا کاٹ کھایا "بور ہے" کتّے نے تم کو پھر
کچھ تو بتاؤ کیا تمھیں سلمان ہو گیا

کہہ دے کوئی یہ بیوی سے رُشدی کی لے سگار
تو کیوں گلے لگائے ہے غم روزگار کے
ڈیکلیئر جو ہوا ہے وہ انعام جھاڑ دے
موقع یہ بہترین ہے شوہر کو مار کے

DECLARE



"بے شک شہر اور سڑکوں کی حالت تو چار سو سال پُرانی ہی لگتی ہے"

خواجہ پرست

ابراہیم یوسف (بھوپال)

جس وقت صبح صبح ہم عزیز محترم کے درِ دولت پر حاضر ہوئے تو ان میں اور ان کی بیگم میں کسی بات پر ٹھنی ہوئی تھی سامنے میز پر ناشتہ رکھا ٹھنڈا ہو رہا تھا بیگم صاحبہ بے حد جوش کے ساتھ فرما رہی تھیں۔ "ہاں ہاں میں افلاطون کی خالہ ہی سہی مگر مجھے یہ ہر دم سہنا بسورنا پسند نہیں۔"

"تمہیں پسند نہیں تو اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہنسی ہنسی ہی کو زندگی سمجھ لیا جائے"،

عزیز محترم بولے۔

"بالکل سمجھنا پڑے گا" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"کیسے سمجھنا پڑے گا، اچھا کل میں نے تمہیں نئی ساڑی کیوں دلائی تھی۔" عزیز محترم نے سوال کیا۔

"اس لیے کہ مجھے ضرورت تھی" بیگم صاحبہ نے جواب دیا۔

"نہیں بلکہ اس لیے کہ تم رونے لگی تھیں" عزیز محترم بولے۔ "کبھی قہقہے لگا کر ساڑی کا مطالبہ کرو پھر دیکھو نئی ساڑی کیسے ملتی ہے"۔

ہم موقع غنیمت جان کر ناشتہ پر پل پڑے۔ عزیز محترم، ہماری طرف دیکھ کر بولے "یہ عورت ہمیشہ غلط باتوں کی حمایت کرتی ہے"

"اپنا فیصلہ خود کرو، ہمیں ناشتہ کرنے دو" ہم نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"بیٹھو نہیں کا" عزیز محترم غصے سے بولے۔ پھر ایک دم کچھ یاد آجانے پر فرمایا "تمہیں ناشتہ کرنے کے لیے کس نے مدعو کیا تھا جو یوں بے تکلفی سے شروع ہو گئے"

"ناشتہ میز پر لگا ہو تو مدعو کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی" ہم نے جواب دیا پھر بیگم صاحبہ کی طرف دیکھ کر انہیں گرمانے کے لیے کہا "یہ کہہ رہے تھے آپ غلط باتوں کی حمایت کرتی ہیں"

بیگم صاحبہ تنک کر بولیں "قہقہے لگانا غلط بات ہے"

"ہاں بالکل ہے" عزیز محترم نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

"کیسے" بیگم صاحبہ نے سوال کیا۔

"اس لیے تم سوتی ہوئی پیدا ہوئی تھیں، میں روتا ہوا پیدا ہوا تھا۔" پھر ہماری طرف اشارہ کرکے کہا: "یہ رو تا ہوا پیدا ہوا تھا۔"

"قسم قرآن کی ہمیں بالکل علم نہیں۔" ہم نے کہا۔

"ہمیں علم ہے۔" عزیز محترم بولے۔ "دنیا میں کسی ایک بچہ کی مثال دے دو جو قہقہے لگاتا پیدا ہوا ہو۔ قہقہے لگانا اکتسابی عمل ہے اور رونا فطری۔"

بیگم صاحبہ نے سجدہ ہو کر فرمایا: "اے پروردگار اپنے اس بندے کو تھوڑی سی تو عقل عطا فرما دے۔" "ضرور عطا فرمادے۔"

"عزیز محترم بولے: "مگر تمہاری عقل کی طرح نہیں۔"

"میری عقل میں کون سے کیڑے پڑ گئے ہیں۔" بیگم صاحبہ نے غصہ سے کہا۔

"تمہاری عقل میں کون سے کیڑے نہیں ہیں" عزیز محترم بولے۔ "سب سے بڑا کیڑا تو قہقہے لگانے کا ہے۔"

ہم نے محسوس کیا کہ بیگم صاحبہ دلائل میں کچھ کمزور پڑ رہی ہیں اس لیے کہا: "مگر قہقہے کو اکتسابی کہنا بالکل نئی تھیسس ہے۔"

"قطعی نئی تھیسس نہیں ہے۔" عزیز محترم یکایک ہماری طرف پلٹ پڑے۔ "کبھی کتے بلیوں کو قہقہے لگاتے سنا ہے مگر روتے ضرور سنا ہوگا۔ بچہ میں جب تھوڑی بہت عقل آجاتی ہے اور وہ دوسروں کو ہی ہی کرتے دیکھتا ہے تو ان کی نقل میں ہی ہی کرنے لگتا ہے۔

"اور یہ بچہ جو گہوارے ہی میں مسکرانے لگتا ہے یہ بھی اکتسابی ہے؟" بیگم صاحبہ بولیں۔ "اللہ جنت نصیب کرے دادی اماں کو فرمایا کرتی تھیں کہ فرشتے بچے کو سوتے میں پھول دکھلا کر مسکراتے ہیں۔" عزیز محترم بولے۔ "بچہ ان کی نقل کرتے ہوئے مسکراتا ہے اور جب وہ پھول چھپا لیتے ہیں تو بچہ بیدار ہو کر رونے لگتا ہے۔ مسکرانا رولانے کا ایک بہانہ ہوتا ہے۔"

"ہاں اب فرشتوں پر بھی دھوکے اور فریب کا الزام لگا دو۔" بیگم صاحبہ نے اعتراض کیا۔

"ہم فریب وریب نہیں جانتے۔" عزیز محترم نے کہا۔ "لیکن دادی اماں کی بات جھوٹ نہیں ہو سکتی۔ اسی سال کی عمر میں بھی پورے بتیس دانت موجود تھے۔"

"اور تمہاری اس عمر میں بھی عقل داڑھ نہیں نکلی۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"دیکھیے بیگم میں ذاتی حملہ برداشت نہیں کر سکتا۔" عزیز محترم نے غصہ سے کہا۔ "جیسے آپ کے تو آٹھ دس عقل داڑھ ہوں"

"میں تو ذاتی حملے نہ کروں مگر تم کرتے رہے۔" بیگم صاحبہ بگڑ کر بولیں۔

"میں جیسے کو تیسا جواب دیتا ہوں۔" عزیز محترم غرا کر بولے چند سکنڈ خاموش رہے پھر فرمایا۔

"رونا ہماری تہذیبی روایت ہے۔"

"تہذیبی روایت!" ہم نے اُبکا ہوا انڈا منہ کے سپرد کرتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"ہماری تہذیب میں روایتی طور پر نوحہ گروں کے تو آثار ملتے ہیں۔" عزیز محترم ہماری طرف دیکھ کر بولے۔

اگر تمہارے قتل کے آثار ملتے ہوں تو بتلاؤ!"

• "حیدرآباد کے نند دلال اختر مقامی کمیٹی کے صدر اور بین الاقوامی قہقہہ گروں کی محفلیں سجاتے رہتے ہیں۔" ہم نے کہا۔ "اور اب یہ روایت آہستہ آہستہ دوسرے شہروں میں بھی منتقل ہو رہی ہے۔"

"میرے خیال میں سب سے زیادہ دکھی لوگ ہیں۔" عزیز محترم بولے۔ "سالانہ یہ محفلیں سجا کر رونے کا پرانا اکاؤنٹ کلوز کرتے ہیں اور فریش اکاؤنٹ کھولتے ہیں اور رونا تو خدا کو بھی مرغوب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خوب رو رو کر گڑگڑا کر دعا مانگو قبول ہوگی کیا یہ کہا جاتا ہے خوب قہقہے لگا کر دعا مانگو قبول ہوگی۔"

"رونے اور گڑگڑانے کا مقصد عاجزی اور انکساری ہے نہ کہ پھوٹ پھوٹ کر کے رونا۔" بیگم صاحبہ نے کہا "ہاں اب آپ رونے کے نئے معنی بھی نکال لو۔" عزیز محترم بولے۔ "رونا ایک آفاقی عمل ہے۔ پیغمبر تک روتے تھے۔ حضرت یعقوبؑ نے تو رونے کا ریکارڈ قائم کیا تھا اور رو رو کر اپنی بصارت تک کھو دی تھی۔" ہم کچھ کہنے ہی والے تھے کہ وہ بولے۔ "منیر شامی حاتم طائی کو جنگل میں روتا ہوا ملا تھا اور رو رو کر حاتم طائی سے حسن بانو کے سات سوال حل کرا لیے تھے اگر وہ قہقہے لگاتا ہوا ملتا تو کیا حاتم طائی حسن بانو کے سوالات حل کرتا۔"

"یہ سب قصے کہانیوں کی باتیں ہیں۔" بیگم صاحبہ نے جواب دیا۔

"قصے کہانیوں کی باتیں ہیں۔" عزیز محترم نے بیگم صاحبہ کو دیکھ کر کہا۔ "اور جو یہ اردو کے شاعر رونے کے بہانے تلاش کرتے ہیں اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گی۔ امام گریہ گراں میر صاحب کا تو یہ عالم تھا کہ "رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا" اور کبھی کبھی تک روتے روتے سو جایا کرتے تھے اور ہدایت کر دیتے تھے کہ۔

"سرہانے میر کے آہستہ بولو" مگر چونکہ آدمی شریف النفس تھے اس لیے یہ احساس ضرور رہتا تھا۔

جو اس شور سے میر روتا رہے گا تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

اس احساس کے باوجود روتے رہتے تھے اور میر درد محرم جاتی رے یا ذکر کے روتے تھے۔ "روتا ہے محرم جو تری رے یاد کر کے درد" مرزا غالب بے کسی عشق پر رویا کرتے تھے۔ "آئے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالب" اور پھر فنا ہو جانے کی حد تک پہنچ جاتے تھے۔ "روتے روتے غم فرقت میں فنا ہو جانا" اور مومن خاں مومن تو پورے سال روتے رہتے تھے جیٹھ اور بیساکھ کو بھی ساون بنا دیتے تھے۔

بسکہ میں سارے برس روتا رہا غم میں ترے جیٹھ اور بیساکھ کا بھی ماہ ساون ہو گیا

نظیر اکبر آبادی افلاس کے بڑھ جانے سے روتے تھے۔

"افلاس میں جو پھر ہو گئی مفلس کی چڑھائی تو پھر تو ہی سنا دیں قل خور دہائی"

اصغر اکبر آبادی زمانہ بدلنے پر روتے تھے۔

"میں جو روتا ہوں کہ افسوس زمانہ بدلا"

اقبال ہندوستان کا نظارہ دیکھ کر روتے تھے۔ "رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو۔"

اور بعض شاعر تو وہ رو کر دریا بہا دیتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اگر وہ رونے پر آجائیں تو صحرا کو دریا کر دیں افسوس اس وقت کسی نے ان کی طرف دھیان نہیں دیا ورنہ آج دنیا کے بڑے بڑے ریگستان لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل ہو چکے ہوتے انسانیت کی کتنی عظیم خدمت ہوتی۔ اب بتلایئے کیا کسی شاعر نے قہقہے لگانے کے بعد بہانے ڈھونڈے اور ایسے دعوے کیے ہیں اب یہ اتنے بڑے بڑے شاعر کچھ بے وقوف تو تھے نہیں کہ یوں بلا وجہ رویا کرتے ——— اور قہقہے لگانا ویسے بھی تہذیب کے منافی ہے۔" عزیز محترم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"تہذیب کے منافی ہے وہ کیوں کر؟" بیگم صاحبہ نے چیں بجبیں ہو کر سوال کیا۔

"اگر کوئی شخص مہذب محفل میں بیٹھ کر زور زور سے قہقہے لگائے تو مہذب لوگ اسے غیر مہذب ہونے کا سرٹیفکٹ دے دیتے ہیں کہ اسے محفل میں بیٹھنے تک کا تمیز نہیں ——— اچھا آپ کے نزدیک قہقہے کی کتنی قسمیں ہوں گی؟" عزیز محترم نے سوال کیا۔

"قہقہہ بس قہقہہ ہے اس کی کیا قسمیں ہوں گی؟" بیگم صاحبہ نے جواب دیا۔

"آپ زیادہ سے زیادہ تین قسمیں بتلا سکتی ہیں:" عزیز محترم نے کہا "ایک ہاہاہا دوسری ہی ہی ہی اور تیسری ہو ہو ہو بس اللہ اللہ خیر سلا۔ اور رونے کی سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں قسمیں ہیں۔ ہر انسان کا اپنا رونے کا اسٹائل ہوتا ہے عبدالکریم صاحب یوں دھاڑیں مار مار کر خوفزدہ انداز میں روتے ہیں جیسے انھیں فرشتۂ اجل نظر آرہا ہو، مریم بی یوں سوں سوں کرکے روتی ہیں جیسے زکام ہو گیا ہو۔ عظیم بھائی یوں ہٹپ ہٹپ کرتے ہیں جیسے رونے کو نگل رہے ہوں اور منیر میاں یوں بھق بھق کی آوازیں نکالتے ہیں جیسے رونے کو اگل رہے ہوں اور نصیبن آپا کا اپنا الگ اسٹائل ہے بس ٹھس ٹھس کی آواز نکلتی ہے اس آواز کو کوئی معنی نہیں پہنائے جا سکتے اور غفور صاحب تو بیک وقت کئی آوازیں نکالتے ہیں اور بدن کو یوں مروڑیاں دیتے ہیں جیسے پیٹ میں درد ہو رہا ہو۔ ان کی حالتِ زار دیکھ کر ہمیں ان کے شریک کار ہونے کی تمنا ہونے لگتی ہے اور بعض عورتیں تو باقاعدہ راگ راگنیوں میں رو کر اور سُر سے سُر ملا کر سماں باندھ دیتی ہیں کوئی سر کو پیٹتی ہے تو کوئی سینہ پر دو ہتڑ جماتی جاتی ہے اور بیچ بیچ میں کوئی جملہ یوں کہتی جاتی ہے جیسے کسی گانے کا ٹکڑا ہو کیا ایسا منظر قہقہے لگانے سے پیدا ہو سکتا ہے بخدا رونا وہ عطیۂ قدرت ہے جس سے دنیا کی رونق قائم ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ؟" ہم نے منہ چلاتے ہوئے کہا۔

"کیا لاحول ولا قوۃ؟" عزیز محترم اس طرح غرائے جیسے ہتھے سے اکھڑ گئے ہوں۔ کچھ دیر ہمیں خونخوار نظروں سے گھورتے رہے پھر گویا ہوئے۔ "قہقہے کی نامعقولیت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ یہ ہمیشہ غیر معقول اور اوٹ پٹانگ باتوں پر لگایا جاتا ہے جس کی کوئی معقول وجہ بھی نہیں ہوتی۔ سیدھے سادھے معصوم لوگوں کی معصومیت پہ قہقہے لگائے جاتے ہیں اور ان کی معصومیت کو بے وقوفی کا نام دینا ان قہقہہ گروں کا خاص شوق ہے۔ کچھ فرقوں اور گروہوں کے ساتھ کچھ قصے منسوب کر رکھے ہیں انھیں سن کر اور سنا کر قہقہے لگائے جاتے ہیں۔ کوئی سڑک پر پھسل کے گر پڑا قہقہے لگانے لگے، دوستوں کی غیبت کی اور قہقہے لگانے لگے، کسی کے جسم میں کوئی قدرتی نقص دیکھا قہقہے

نکالنے لگے۔ اب لاحول ولا قوۃ۔ اور پھر قہقہے لگانے کے لیے تو تمہید باندھی جاتی ہے اور نہ کوئی اہتمام کیا جاتا ہے بس ایک دم سے شروع ہو جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے رونا ایک انتہائی شریفانہ عمل ہے رونے سے پہلے باقاعدہ اس کی تمہید بھی باندھی جاتی ہے۔ رونے کا موڈ طاری کیا جاتا ہے رونے کی کوئی معقول وجہ پیدا کی جاتی ہے۔ بعض حضرات تو پہلے ریہرسل بھی کر لیتے ہیں تب کہیں جا کر رونے کا پروگرام شروع کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ رونے سے متعلق بہت سے محاورے بھی ہیں مثلاً ــــــ"

بیگم صاحبہ بوٹی ہو کباب کاٹتے ہوئے بولیں "اے خواجہ گریہ پرست اب رونا دھونا بند کرو اور ناشتہ کرو۔ ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔" پھر پلٹ کر میز کی طرف دیکھا اور سر پیٹ کر ہم سے بولیں۔ "ہائے اللہ دو آدمیوں کا ناشتہ اکیلے چٹ کر گئے۔ پھر دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"اب پھر جا کر چولہے سے سر پھوڑوں اور اپنی جان کو روؤں"۔

عزیز محترم قہقہہ لگا کر بولے۔ "آگئیں نا رونے دھونے پر"۔

ہم عزیز محترم کے قہقہے پر مسکرا دیئے۔ انھوں نے ہمارے مسکرانے کو دیکھ لیا اور ہماری مسکراہٹ کا مطلب بھی سمجھ گئے مگر کچھ بولے نہیں اب کبھی کبھی ہم انھیں خواجہ گریہ پرست کہہ دیتے ہیں تو وہ صرف مسکرا کر رہ جاتے ہیں اور برا نہیں مانتے۔

●●

غزل

محبوب مانجھومی
بلاسپور (ایم پی)

ہمیشہ کھا کے بیگم مجھ کو دیتی ہیں کباب آدھا
مرا حصّہ مجھے ملتا تو ہے، لیکن جناب آدھا

کبھی چھٹی، کبھی ہڑتال میں رہتے ہیں بند اکثر
پڑھایا جا رہا ہے کالجوں میں اب نصاب آدھا

جو دن بھر گھر میں رہتا ہوں تو شب باہر گزرتی ہے
اسی باعث مجھے کہتے ہیں سب خانہ خراب آدھا

کبھی چولھا جلاتا ہوں، کبھی بچّے کھلاتا ہوں
خوشی سے کر دیا کرتا ہوں میں بیگم کا جاب آدھا

شکایت کی تو جھلّا کر کہا مجھ سے گوالے نے
خدا کا شکر کیجئے دودھ میں ہوتا ہے آب آدھا

ادا یہ دعوتِ نظّارہ کی بھی خوب ہے صاحب
ہمیشہ اُن کے چہرے پہ جو رہتا ہے نقاب آدھا

نہ جانے کیوں اُنھیں ہر وقت ہکلانے کی عادت ہے
سوالوں کا مرے اکثر وہ دیتے ہیں جواب آدھا

اُنھیں بچپن کے پیٹھے میں بھی میک اپ کی بری لت ہے
بڑھاپا گویا آدھا ہے تو باقی ہے شباب آدھا

یہ کس کمبخت نے محبوبؔ سوتے سے جگا ڈالا
ابھی ہونے بھی ہم پائے نہیں تھے محوِ خواب آدھا

○

بوڑھے میاں کا سہرا

رؤف رحیم
حیدر آباد

ہر طرف گونجتی اب دوستو شہنائی ہے
ایسا لگتا ہے کہ بوڑھے کی قضا آئی ہے

سارے معجون مقوّی رہیں جیبوں میں جناب
"آج کی رات کئی راتوں کے بعد آئی ہے"

سب ہی بارات میں شامل ہیں اعانت کے لیے
جن حکیموں سے سُنا اُن کی شناسائی ہے

حور کے پہلو میں لنگور' خدا کی قدرت
دیکھنے کے لیے ہر شخص تمنّائی ہے

اب ضعیفی میں بھلا کون رہے گا ساتھی
فوجِ پوتوں کی' نواسوں کی تماشائی ہے

کچھ بھی ہو آپ ولیمہ کا ڈنر رکھ دینا
ورنہ یہ بات سُنو باعثِ رسوائی ہے

فرق نوشہ میں دلہن میں ہے فقط اتنا سا
اعضا شکنی ہے اُدھر اور اِدھر انگڑائی ہے

شیخ جی عقد کے قابل تو نہیں تھے لیکن
یہ پڑوسی کی سُنا حوصلہ افزائی ہے

پھول مرجھائے ہوئے چہرے سے یہ کہتے ہیں رحیم
بدنصیبی ہے جو ہم پہ یہ بہار آئی ہے

○

گل کاریاں کاتبوں کی

علیمہ فردوس
(بنگلور)

جب بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں

کتابت، طباعت، اشاعت یہ تینوں مراحل ادیب کے لیے بڑے خطرناک ثابت ہوتے ہیں اس کے باوجود آج کل بیشتر حضرات صاحب کتاب کہلانا پسند کرتے ہیں۔ مسودہ تو بآسانی تیار ہو جاتا ہے مگر اس کی کتابت کا سلسلہ اس قدر دراز سے دراز تر ہو جاتا ہے کہ وہ مصنف کی دسترس میں نہیں آتا۔ کیوں کہ کاتب ہی کیا جو وعدہ وفا کرے۔ کاتب کے گھر پھیروں میں آدھا درجن جوتوں کی قربانی تو دینی ہی پڑتی ہے۔ اب رہا قیمتی وقت تو اسے تو کتاب کے شائع ہونے تک یوں ضائع ہونا ہی تھا۔ کاتب کے پیچھے سائے کی طرح لگے رہیے پھر بھی وہ ہاتھ نہیں آتا۔ تاخیر اس کی سرشت بہانے بازی اس کی عادت ہے۔ تبھی تو مصنف تھک ہار کر یہ اقرار کرلیتا ہے کہ :

اے کاش جانتا نہ تری رہگزر کو میں

یہ وہ رہ گزر ہے جس کے بارے میں مصنف جان کر بھی انجان نہیں بن سکتا۔ جب تک اس کی تخلیقات رسالوں کی زینت بنتی ہیں وہ اس نازمودہ مرحلے سے محفوظ رہتا ہے۔ کتاب کی اشاعت کا خیال آتے ہی اسے دوڑے دوڑے کاتب کے گھر جانا پڑتا ہے۔ پہلے تو اس کا ملنا محال ملے بھی تو کام کے لیے رضا مند ہونا مشکل۔ تخلیق کی اشاعت کے لیے مالی اعانت تو سعی و سفارش سے حاصل کی جا سکتی ہے لیکن ایمان دار کاتبوں پر اس کا جادو بھی کارگر نہیں ہوتا۔ بہتر یہی ہے کہ پہلے کاتب سے دوستی پکی کرلیں پھر کتاب کی اشاعت کے بارے میں سوچیں۔ یہ بھی دھیان میں رکھنا چاہیے کہ کاتب فطرتاً نازک مزاج ہوتا ہے۔ آپ کی عجلت پسندی یا برہمی اس کی دشمنی کا سبب بن سکتی ہے۔ پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کیسا۔ وہ روٹھ جائے تو منانا مصنف کے ذمے ہے۔ وہ مل جائے تو اس کی آؤ بھگت کرنا مصنف کا فرض ہے۔ تبھی تو

[illegible] میں کچھ کے کچھ اشعار [illegible]

کاتبوں نے میرے دیوان میں بہت تحریف کی

[illegible] لکھنے میں اپنا دماغ صرف کرتے ہیں تو کاتب [illegible] سے اس کا [illegible]
[illegible] کا شاہکار اسی لیے تو نامور مصنف بھی مدیث سے کتابت پر توجہ کی موٴدبانہ [illegible]
[illegible] درخواست جو کتاب نما کے ماہ نومبر کے شمارے میں شائع ہوئی ہے ملاحظہ ہو [illegible]

[illegible] شعر جو اس طرح ہے:

اداس آنکھوں سے ہوں زندگی کی برساتیں — تم اپنے لہجے میں ایسا بھی اک [illegible]

کتابت کی غلطی نے شعر کو یوں کر دیا کہ "تم اپنے بھیجے میں ایسا بھی اک ہنر رکھنا۔ بجاہ کرم [illegible]
[illegible] ہوگی۔" ایسی تحریفیں تو آج کل شب و روز پڑھنے کو ملتی ہیں۔ کاتبوں کی مہربانیوں سے میر، غالب [illegible]
[illegible] نئے رنگ و روغن کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں:

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں زنگ
اسکی سانس سے ہے زندگی کا سوز دروں

یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو روح کو تڑپا دے جو قلب کو گرما دے

میں اور بزم مے میں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی تو بہ ساقی کو کیا ہوا تھا

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ بد دعا کیا ہے

تصنیفات ہوں کہ اخبارات یا رسائل ہر جگہ یہ گلکاریاں نظر آتی ہیں۔ [illegible]
[illegible] ان کے بغیر تحریریں بے لطف نظر آتی ہیں۔ صبح [illegible]
[illegible] جاتا ہے۔ خدا کالو آنکھوں سے پڑھی ہوئی خبر [illegible]
[illegible] نے اخبار کے کسی کونے میں یہ خبر پڑھی تھی کہ "دو [illegible]

اب ڈا[illegible] نے چاندی کے زیورات کی ضرورت نہیں رہی مگر ان کا دواخانے میں ہڑتال کرنا ہماری [illegible] میں نہ آیا پھر دوبارہ اس خبر کو پڑھنے کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ کاتب صاحب نے ڈاکٹروں کو ڈاکو بنا دیا ہے۔ آپ اس پر برہم مت ہو جائیے اس میں اُن کا کیا قصور۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ دماغ ایک مشین ہے اگر یہ کام میں نہ لائی جائے تو زنگ آلود ہو سکتی ہے گویا کاتب کی غلطیاں آپ کے دماغی مشین کو زنگ لگنے سے بچانے کی زبردست تحریک ہے۔ یہ ایک چھیڑ ہے اور ساتھ ہی قاری کا امتحان بھی آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہر غلطی کے پیچھے کاتب کا ہاتھ ہی نہیں ہوتا۔ کاتب وہ برگزیدہ ہستی ہے جس پر کبھی آنچ نہیں آنی چاہیے۔ فن کار کے قلم کو زنگ لگ سکتا ہے لیکن کاتب کے قلم کو نہیں۔ کبھی ایسا ہو بھی جائے تو فن کار اپنی تخلیقات دریا برد کرنی پڑیں گی۔ سنا ہے کہ کاتب حضرات دو چار غلطیاں عمداً کر جاتے ہیں تا کہ ان کا قلم رزین رقم نظر بد سے بچا رہے۔ اگر کسی کتاب میں غلطیاں راہ پا گئی ہیں تو یہ سمجھ کر نظر انداز کیجیے کہ کاتب بھی خطا و نسیان کا پتلا ہے۔ کھانا چاہے بیوی بنائے یا ماما دونوں بھی یہ احتیاط برتتے ہیں کہ چاول میں کنکر چھوٹنے نہ پائے جس سے صاحب کا مزاج بگڑ نہ جائے۔ کاتب تو کاتب ہوتا ہے بیوی یا ماما نہیں۔

دراصل فنِ خطاطی کے لیے بڑی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ خوش نویس اپنی گلکاریوں کے وہ نمونے پیش کرتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ خوش نویسی ایک فن ہے کتابت ذریعۂ آمدنی۔ خوش نویسی کے لیے خونِ جگر کی ضرورت ہوتی ہے۔ خوش نویس جب ریاضت کی بجائے کسالت برتنے لگتا ہے تو وہ کاتب کے درجے پر پہنچ جاتا ہے اور یوں یہ فن کھیل بن جاتا ہے۔ کتابت میں سلیقہ شعاری کے بغیر بات ہی نہیں بنتی۔ ذرا ذرا سی بات پر جس کے پسینے چھوٹنے لگتے ہیں وہ ہرگز کاتب نہیں بن سکتا۔ کتابت کے لیے ذہنی و جسمانی ورزش بھی ضروری ہے۔ اکڑوں بیٹھنا اس کی اولین شرط ہے۔ ان نوجوانوں کے لیے یہ شرط بڑی جان لیوا ثابت ہوتی ہے جو بھلا بیٹھنا نہیں جانتے۔ کلرکی نہ ملنے پر بیشتر نوجوانوں نے کتابت کو ذریعہ معاشں بنایا اس سے ان کی روزی روٹی کا مسئلہ تو حل ہو گیا پر جان اردو جوکھم میں پڑ گئی۔

دراصل غلطیوں کے ارتکاب میں اہلِ قلم، کاتب، پروف ریڈر اور چھپائی کی مشینیں بھی برابر کی شریک ہیں۔ ورنہ ایڈیٹر حضرات کو بار بار درخواست شائع کرنے کی ضرورت نہ پیش آتی کہ "اہلِ قلم سے درخواست ہے کہ براہ کرم اپنے مضمون کی فوٹو اسٹیٹ کاپی ہرگز نہ بھجوائیں۔ اس میں اکثر حروف اُڑ جاتے ہیں۔ پروف ریڈر اور کاتب حضرات کو بڑی پریشانی ہوتی ہے۔"

دراصل پہلے نہ یہ زیراکس مشینیں تھیں اور نہ غلطیوں کی گنجائش۔ اب قصور ہے تو ان شریر لفظوں اور حروف کا جو رنگین تتلیوں کی طرح ہاتھ نہیں آتے۔

غزلیں

اقبال ہاشمی حیدرآباد

آنکھیں چُرا کے بھاگ نہ ٹھینگا دکھا کے بھاگ
گر ہو سکے تو سیٹھ کا بٹوہ اُڑا کے بھاگ

چپل تری کسی نے چُرالی تو کیا ہوا
مسجد سے اپنے ناپ کا جوتا چُرا کے بھاگ

اس شہر میں سواری کا ملنا محال ہے
کاندھوں پہ اپنی لاش کو خود ہی اُٹھا کے بھاگ

اس شخص پہ سوار ہے دانشوری کا بھوت
اُس پر تو اپنے جہل کا سکہ جما کے بھاگ

دل کھول کر لگانے لگا ہر شخص قہقہے
تو بھی مشاعرے میں لطیفے سُنا کے بھاگ

ناشاعروں کے غول سے بچنے کو ہاشمی
میری یہ التجا ہے کہ پہلے سُنا کے بھاگ

★

یوسف یکتاؔ سکندرآباد

دوش کیوں دے رہے ہو غیروں کو
اپنا لونڈا خراب ہے باشا

کام اپنا ہے سارا چندوں پر
کیا حساب و کتاب ہے باشا

لوگ پیتے ہیں، جشن کرتے ہیں
کام کیا یہ خراب ہے باشا

ساس سسرے بھی ہو گئے انجان
اب تو جینا عذاب ہے باشا

نام جس کا ہے یوسف یکتاؔ
وہ پرانا نواب ہے باشا

سید عباس متقی
حیدرآباد

لیڈر کی لوری

انسان بنے گا نہ تو حیوان بنے گا
لیڈر کی تو اولاد ہے شیطان بنے گا

مالک نے ہر انسان کو انسان بنایا
ہم نے اسے انسان سے شیطان بنایا
خدمت کے لیے پائی تھی ہم نے تو یہ کرسی
خدمت تو نہ کی ہم نے مگر خون بہایا
جو پھونک دے ہر دیپ وہ طوفان بنے گا
لیڈر کی تو اولاد ہے شیطان بنے گا

ایمان ہے ترا نہ دھرم تیرے لیے ہے
یہ جان لے دولت کا بھرم تیرے لیے ہے
مسجد کوئی تیری ہے نہ مندر کوئی تیرا
مل جائے جو سونے کا صنم تیرے لیے ہے
مجھ سے بھی تونگر تو مری جان بنے گا
لیڈر کی تو اولاد ہے شیطان بنے گا

جو لوگ وطن دوست ہیں دشمن ہیں ہمارے
اب قابلِ گردن زدنی ہیں یہ بے چارے
جو نام لے اُردو کا عدو ہے وہ ہمارا
یک جہتی کے بڑھتے ہیں اسی سے تو شرارے
اُردو کے لیے موت کا سامان بنے گا
لیڈر کی تو اولاد ہے شیطان بنے گا

○

سندباد کی شادی



الف لیلیٰ عرب کہانیوں کی کتاب ہے۔ اس میں ایک کہانی سندباد جہازی کے سفرناموں پر مبنی ہے جو ایک تاجر ملاح تھا۔ وہ سامانِ تجارت لے کر بہت سے ملکوں کو جاتا۔ سمندر کا سفر تھا منحوس ایسا کہ ہر سفر میں نہ صرف اس کا جہاز تباہ ہو جاتا اور ساتھی غارت ہو جاتے بلکہ وہ خود محض چلّڑی اور بنیان سے کسی جزیرے پر جا پہنچتا۔ لیکن واپسی پر خوب دولت لے کر بغداد لوٹتا۔ . . . . . یہ کیسے ہوتا تھا الف لیلیٰ میں کسی نے نہیں پوچھا۔ وہ اچھا زمانہ تھا لوگ کیوں اور کیسے کے سوالات پوچھے بغیر کہنے والے کو سکون سے کہانی کہنے دیتے تھے . . . . . . یعنی ابھی تنقید نگاری کا بیج نہیں بویا گیا تھا۔ کچھ زمانہ بعد لوگ کہانی سنتے ہوئے بولنے والے کو اس قدر ٹوکنے لگے کہ مجبور ہو کر آرٹ فلموں کی تیاری شروع کی گئی جن میں صرف کیوں اور کیسے کے جوابات دیئے جاتے ہیں اور کہانی نہیں ہوتی۔



سندباد جہازی نے سات سفر کیے جانے کہاں کہاں جاتا تھا کہ کسی جگہ کا نام نہیں بتایا البتہ ایک سفر میں اس نے ایک پرندے کا انڈہ دیکھا تھا جو گنبد کے برابر تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوستان کے کسی حصے میں ضرور گیا تھا جہاں کسی نے یہ بات اڑائی تھی اس نے سن لی اور کہہ دیا۔ لیکن اس کی خوش قسمتی سے انسانوں نے کئی چرندا اور پرند کی نسلوں کا صفایا کر دیا اور ہم سندباد جہازی کے اس پرندے کو بھی "نا پید" پرندوں میں شریک کرنے پر مجبور ہیں۔

عجیب اتفاق کی بات ہے کہ ادب عالم سندباد جہازی کے سفر نامے کے لیے ایک مفلوک الحال اور نادار شخص ہندباد جہازی کا ممنونِ احسان ہے۔ ورنہ اس کے دسترخوان کے احباب نے خود کو مرغ و ماہی تک محدود رکھا۔

تو حضرات! میں آپ کے اور الف لیلیٰ کے بیچ زیادہ دیر نہیں کھڑا ہونا چاہتا چونکہ میں انتظار کی اذیت سے واقف ہوں۔ ایک صاحب نے مقرر کا تعارف کرانے میں پورا ڈیڑھ گھنٹہ صرف کر دیا تھا پھر کہا تھا۔ "حضرات! میں آپ کے اور فاضل مقرر کے درمیان زیادہ دیر نہیں کھڑا رہنا چاہتا" تو کسی نے سامعین میں سے کہا تھا " ہاں بیٹھ جائیے ورنہ آپ گر جائیں گے۔" تو میں بھی تھک گیا ہوں۔

محمد برہان حسین
(حیدرآباد)

عنفوان کا زمانہ تھا یا صرف سندباد تھا نام عجیب اور عجیب لگتا تھا
ہوتا تھا۔ یا بدمست ہر روز ایک نئی لڑکی پر فدا ہوتے تھے کبھی

ان کے گال کے خال پر تو کبھی ان کی مستانہ چال پر حد یہ کہ ایک صاحب ایک لڑکی کے منگلے پن پر فدا ہو گئے تھے یہ لوگ جان بوجھ کر لڑکیوں پر فدا ہوتے تھے اور اپنے دل کو الزام دیتے "دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے" پھر دل کو پکڑ کر بیٹھ جاتے اور ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیتے۔ عجیب دور تھا کہ لوگ جھوٹ موٹ دل میں درد ہے کہتے اور رشتہ دار، احباب سب حیران ہو جاتے کیا کریں، مطلب یہ ہے کہ کیسے انھیں جھوٹا ثابت کریں، مشکل یہ تھی کہ الکٹرو کارڈیو گرام ایجاد نہیں ہوا تھا اس سے عاشق لوگ فائدہ اٹھاتے تھے اور لطف یہ کہ دل کو پکڑ کر لین صدی بال بچوں میں گزار دیتے تھے۔ ہماری ایک ممانی تھیں انھیں اپنی ساس کو دیکھتے ہی دل کا دورہ پڑ جاتا تھا وہ بے ہوش ہو جاتیں ماموں جان ان پر اس قدر فدا تھے کہ کسی کو سوئی چبھو کر چیک نہیں کرنے دیتے تھے۔ آج کل کے ڈاکٹر یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ممانی کو چالیس سال تک ہر دوسرے روز ہارٹ اٹیک ہوتا تھا لیکن وہ زندہ رہیں یہاں تک کہ الکٹرو کارڈیو گرام ایجاد ہوا۔ یہ معلوم ہوتے ہی ان کا دل کا درد سر میں چلا گیا۔

سند باد نے کہا کہ وہ اگلے سفر پر جانے سے پہلے شادی کرنا چاہتا تھا۔ ہند باد نے اخبار میں ضرورتِ رشتہ کے اشتہارات دیکھنے کی صلاح دی۔ ایک اشتہار یوں تھا۔

" ضرورت ہے ایک طویل القد اور طویل العمر، دولت مند، بہادر، ذہین، تعلیم یافتہ سنیاسی شوہر کی جس کو ہوائی اور سمندری سفر کا تجربہ ہو"

سند باد نے پوچھا "میں طویل القد، طویل، تعلیم وغیرہ وغیرہ سبھی کچھ ہوں، لیکن یہ کیسے معلوم ہو کہ میں طویل العمر بھی ہوں"

ہند باد نے کہا " آپ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے والد کی آپ کو دعا ہے۔ لیکن آپ نے سنیاسی شوہر کا مطلب سمجھا ہے؟ مطلب ہے آپ کا کوئی اہلِ خاندان زندہ نہ ہو"

سند باد نے کہا " چلو یہ بھی ٹھیک ہے لیکن انھیں ہوائی اور سمندری سفر کا تجربہ کیوں چاہیے۔

ہند باد۔ " مطلب آپ فارن آتے جاتے ہوں یعنی غیر مقیم ہندوستانی ہوں" لیکن آپ کی تعلیم بھی کم ہے"

سند باد نے کہا " میری تعلیم کم ہے لیکن پختہ ہے میں ہر کلاس میں کئی کئی سال پڑھتا رہا ہوں، خیر لڑکی کے بارے میں کیا لکھا ہے"

ہند باد نے اشتہار پھر پڑھا " لڑکی گوری لمبی، تعلیم یافتہ اور اچھے گھرانے کی ہے۔ باپ ایکزیکیٹیو انجینئر ہیں جو چار بار رشوت لیتے پکڑے گئے تھے"

سند باد حیرت سے اچھل پڑا۔ " ارے یہ کیوں لکھا ہے"

ہند باد نے کہا " اس کا مطلب یہ ہے کہ خوب روپیہ کمایا ہوا ہے یعنی دولت مند ہیں"

سند باد نے کہا " واہ، یار یہ ہندوستانی کس قدر ذہین ہوتے ہیں کیا عیب کو ہنر کے طور پر ظاہر کیا ہے"

ہند باد نے کہا " جی ہاں اس صدی کے ختم پر جب ہم اکیسویں صدی میں داخل ہوں گے تو ہم دنیا کی واحد ترقی یافتہ قوم ہوں گے جس میں برائی بالکل ختم ہو جائے گی"

وہ کیسے "؟

ہندباد نے پہلو بدلتے ہوئے کہا "ایسے کہ ہر برائی اچھی سمجھی جائے گی مثلاً کسی قومی لیڈر کی زندگی کا خاکہ یوں لکھا جائے گا......

"موصوف بچپن میں گھر سے بھاگ گئے تھے۔ اسکول میں اجتماعی نقل نویسی کی ابتدا آپ نے ہی کی تھی۔ آپ کالج میں یونین کے صدر تھے کالج سے نکلنے کے بعد آپ انجمن ناکام طلبہ کے فاؤنڈر صدر رہے۔ آپ نے دفعہ دفعہ سے تین سال جیل میں گزارے۔ قحط اور فسادات کے زمانے میں آپ نے چوربازاری میں دولت سمیٹی۔ چیف منسٹر قتل کیس میں آپ مجرم نہیں ٹھیرائے گئے کیوں کہ آپ نے ہی چشم دید گواہ کو قتل کر کے ثبوت ختم کر دیا تھا

سندباد چیخا "توبہ کرو بھائی۔ اب اس لڑکی کے پاس چلو"۔

لڑکی کے چچا نے بتایا کہ لڑکی کا باپ زندہ نہیں ہے "۔ سندباد نے پوچھا۔

"کیا پولیس کی گولی سے مرے تھے"؟

چچا نے کہا "آہ! کاش ایسا ہوتا تو ہم ان کے نام کے ساتھ 'شہید' کا اضافہ کر کے فخر سے کام لیتے۔ انھوں نے کئی فرقہ وارانہ فسادات میں حصہ لیا مگر بدقسمت رہے کہ اس میں بھی زندہ رہے ورنہ ان کی بیوہ کو کم از کم کوئی سیاسی پارٹی الکشن میں ٹکٹ دے دیتی۔

اچھا ایک بات بتا دوں۔ لڑکی خود اپنا دولہا پسند کرے گی۔ گڈلک اپنی قسمت آزماؤ۔ چونکہ اشتہار کی اشاعت سے اب تک وہ ایک درجن سے زاید لڑکوں کو رد کر چکی ہے۔ سندباد نے ہندباد سے کہا "تو قصہ مختصر یہ کہ اس لڑکی نے مجھے پسند کر لیا تھا اور اب وہ خیر سے مجھے چھوڑ بھی چکی ہے"۔

ہندباد نے زوردار قہقہہ لگایا۔ سندباد نے وجہ پوچھی تو وہ بولا "جب آپ سلکٹڈ امیدوار کا یہ حال ہے تو سالے جو رد ہوئے تھے وہ کیا نمونے ہوں گے کاش میں دیکھ سکتا۔

سندباد نے کہا "ارے کم بخت ایسا کیوں سوچتا ہے۔ اس وقت میں خوب صورت تھا

ہندباد نے پوچھا "وہ کیسے۔ کیا کسی اور کا چہرہ لگا لیا تھا۔

سندباد نے کہا اب تو میرا ہمدم اور رازداں بن گیا ہے بلکہ ہم نوالہ اور ہم پیالہ ہو چکا ہے۔ تجھ سے کچھ چھپانا مناسب نہیں بلکہ جی چاہتا ہے تجھے اپنا دل چیر کر دکھا دوں لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ 'لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں'..... ڈرتا ہوں کیوں کہ میری ایک محبوبہ خورشید نام کی بھی تھی کہیں اس کا لہو ٹپکا تو بیگم کے آگے ثبوت کے ساتھ دھر لیا جاؤں گا۔ خیر تو اس لڑکی نے مجھ سے چند سوال کے جواب بھی مانگے تھے۔ پہلا سوال تھا "بادشاہ پیاسا کیوں، گدھا اداس کیوں"، میں نے جواب دیا تھا، بادشاہ روزہ تھا اور گدھا ہمیشہ اداس ہی رہتا ہے۔ دوسرا سوال تھا، سمندر کا پانی کھارا کیوں ہوتا ہے، میں نے کہا تھا، اگر کھارا نہ ہوتا تو لوگ اُسے پی جاتے اور جہازوں کو مشکلات پیش آتیں۔

اس کی سہیلیوں نے سفارش کی کہ مجھ سے بہتر شوہر نہیں مل سکتا۔ اس طرح عائل کا خرچہ بھی بچ جائے گا

چوں کہ نادان دوست سے نادان شوہر بہتر ہوتا ہے۔"

"شادی کے بعد میں نے اس سے کہا تھا کہ بادشاہ اور گدھے والی پہیلی امیر خسرو کی ہے اور سمندر کا پانی سوڈیم اور پوٹاشیم کے نمک کی وجہ سے کھارا ہوتا ہے تو وہ بے ہوش ہو گئی۔ . . . . . . یہ دراصل نیچ ٹکنک تھی۔ میرے سسر نے لڑکیوں کو گھر گرہستی سنبھالنے کی اچھی تربیت دی تھی اور دو باتوں پہ وہ بہت زور دیتے تھے اول یہ کہ لڑکی کو یعنی بیوی کو چاہیے کہ اپنی کسی غلطی کو تسلیم نہ کرے دوسرے یہ کہ کبھی کبھار بے ہوش ہوا کرے۔

ہندباد نے کہا "تو آپ نے ڈاکٹر کو دکھایا ہوتا۔"

سندباد نے کہا، دکھایا تھا اس کم بخت نے مجھ سے کہا کہ میں سفرنامہ نہ سنایا کروں بس یہی ایک پرہیز کافی ہے۔ وہ دور میرے سفرناموں سے بیزاری کا دور تھا۔ . . . ."

سسر صاحب اپنی بیٹی کو سا تھ لے گئے۔ ایک مولوی نے انھیں مجھ پر عمل عملیات کا مشورہ دیا۔ سسر صاحب نے انکار کیا تو کم بخت نے انھیں قائل کرنے کے لیے کہہ دیا کہ علامہ اقبال خود عملیات کے قائل تھے اسی لیے تو کہا ہے کہ:

"عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی"

سسر صاحب قائل ہو گئے اور ہنس کر پوچھا۔ "پھر مجھ پر عملیات کیوں نہیں کیے گئے؟"

ماموں سسر نے کہا "تم پر مولوی صاحب نے عمل پڑھ کر کہا تھا۔ یہ تو پیدائشی زن مرید ہے۔"

تو میں سسرال ۔۔ کی طرف کھنچتا ہی چلا گیا سسرال کے دروازہ پر مجھے یہ لکھا نظر آتا "اگر زمین پر کہیں جنت ہے تو وہ یہی ہے یہی ہے یہی ہے۔ جی چاہتا میں کتے کی طرح دروازہ پہ پڑا رہوں۔"

میری بیوی جو خاصی کالی کلوٹی اور فربہ تھی (موٹی ناک) تھی مجھے حسین نظر آنے لگی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اچھی خاصی خوب صورت عورتوں پر تنقید کرنے لگا اور لوگ مجھ پر ہنسنے لگے۔ یہی نہیں مجھے اپنی ساس سے بھی بے حد عقیدت ہو گئی یعنی جب "امی" کہہ کر پکارتا تو میرے جذبات امڈ آتے مجھے حیرت بھی ہوتی کہ کبھی اپنی ماں پر مجھے اتنی محبت کیوں نہیں آتی تھی۔ عورتیں میری سالی کو پسند کرنے آتیں اور انکار کر دیتیں تو مجھے حیرت ہوتی کہ اب اس سے زیادہ اور حسین وہ کہاں پائیں گی۔ مجھے اپنے بہن بھائی نہایت خود غرض اور کمینے نظر آتے حالاں کہ سب سے بڑے بھائی ہونے کے ناطے میں نے ان پر کوئی احسان نہیں کیا تھا لیکن میری ساس کا خیال تھا کہ میں ان سے ضرورت سے زیادہ ہی محبت کرتا ہوں لیکن میرے بھائی بہنوں کو میری کوئی پرواہ نہیں تھی اور مجھے ساس کا خیال ہی درست معلوم ہوتا تھا۔

لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مجھے ایسا خیال آتا کہ میرے بھائی بہنوں اور والدہ سے بھی مجھے محبت کرنی چاہیے مگر یہ کیفیت زیادہ دن نہیں رہ سکتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا مجھے وقفہ وقفہ سے عملیات کی تازہ خوراک دی جاتی تھی اور میں پھر اصلی حالت پر لوٹ آتا تھا۔ چھوٹے سالے پر میں نے شعر کہا تھا:

سالا بڑا پیارا، آنکھ کا دلارا،
بہنوی کا سہارا، باوا کو گمارا

میرے سسر کا انتقال ہوا تو میرے لیے دنیا اندھیری ہوگئی میں روتے روتے پاگل ہوگیا۔ چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ قبر میں دفن ہوجاؤں لیکن مولوی صاحب نے منع کیا اور کہا:

"ان پر قبر میں عذاب ہونے والا ہے چونکہ یہ مجھ سے عملیات کرواتے تھے"

ہندباد نے جمائی لی اور ٹوکا "بھائی سندباد! براہ کرم آپ اپنے بیان کو سفرنامہ تک محدود رکھیں۔ خانگی معاملات میں مجھے نہ گھسیٹیں بلکہ ازدواجی زندگی کا ذکر نہ کریں"۔

سندباد نے کہا: عجیب داستاں ہے یہ کہاں شروع کہاں ختم . . . . . . لیکن میں اسے یہیں ختم کرتا ہوں۔ اور اب رات بھیگ چکی ہے تو اپنی راہ لے۔

ہندباد نے کہا "خوب، آپ اتنی گرم وحشت ناک رات کو بھیگی کہتے ہیں"

سندباد نے کہا "ارے بھائی یہ اردو زبان کا محاورہ ہے، رات بھیگنے سے مطلب رات زیادہ بیت چکی ہے"

ہندباد نے پان منہ میں رکھا، ایک سگریٹ جلایا، ایک جیب میں رکھا اور روانہ ہوگیا۔ ۸۷

انیس سلطانہ
(بھوپال)

اردو رزمیہ کی تلاش

رزمیہ شاعری کو دنیا کی بہترین شاعری کہا گیا ہے۔ مرزا فوجدار
بیگ خاں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ باپ دادا رہے ہوں گے اصل ترکستانی، وہ خود تو ہندستانی
اور ان کی مادری زبان ہے۔ فارسی گو کہ پدری زبان تھی لیکن زبانوں کو پدری ہونے پر بھی فخر ہو سکا اس لیے
دو شاعری کو دنیا کی بہترین شاعری کے مقابلہ پر لا کھڑا کر دینا ان کا فرض ہے۔

اخبار تو مرزا موصوف مدتوں سے نکال رہے تھے جیسے ادیبوں، اور شاعروں کو مفت اور رشتہ داروں کو دوگنی قیمت پر بھیجتے تھے
اشتہاروں کے نام پر خود ان کی شایع کردہ کتابوں کے نام جلی حروف میں لکھے جاتے تھے۔ اس پرچہ میں جدت یہ رہی
ایک اعلان نامہ بھی جاری کر دیا گیا کہ محبانِ اردو اپنی مادری زبان کی خدمت کے لیے آگے آئیں اور اسے دنیا کی
ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلہ پر لانے کی کوشش کریں (اور خود ایک گوشہ میں کھڑے ہو جائیں)۔

آسان الفاظ میں بات کی وضاحت ضروری تھی۔ اس لیے مرزا نے صاف لکھ دیا کہ اردو کی رزمیہ شاعری کو یکجا کرنا ضروری
ہے۔ مبادا کوئی مراثی انیس و دبیر جیسی چیز اٹھا لائے اس لیے اس کی صراحت بھی ضروری تھی کہ مرثیوں کے علاوہ اردو کی
رزمیہ شاعری کا غائر مطالعہ کر کے اسے منظر عام پر لایا جائے۔

حاجی اچھے اس ہفت روزہ اخبار کے کاتب تھے۔ اور اچھے اچھے ادیبوں سے کہیں زیادہ ان کا مطالعہ تھا۔
حافظہ (یاد) داشت بھی بہت اچھی تھی۔ انھیں برسوں کی کھدی کھدائی کتابیں بھی یاد تھیں کہ کون سی کتاب کس گوشہ کو آباد کیے ہوئے
ہے۔ البتہ کچھ کتابیں ابھی ان کے مطالعہ سے بچ رہی تھیں۔ ایسی ہی کتابوں میں "علی نامہ" بھی کہیں مل گیا۔ بڑے ہی
طراق سے نکال کر لائے ہیں۔ مگر پتہ چلا کہ وہ تو علی بھائی لشکری کا سفرنامہ تھا۔ اب کیا کریں۔ مثنویاں کھنگالیں جہاں
کہیں رزم نظر آیا نہ رزم گاہ۔ مگر تھے دھن کے بڑے پورے کچھ اور کتابیں نکالیں خستہ اور بوسیدہ شاہکاروں کے
انبار لگے تھے۔ صفحے پلٹتے پلٹتے ایک جگہ نظر پڑی ہے

رزمنجہ اسکے نکالو تلوار ان سے　　یہ بازو مہوست آزماتے ہوتے ہیں۔
حاجی صاحب بھڑک ہی تو اٹھے　　بغور اس بوسیدہ کتاب کا مطالعہ

تھا۔ انھیں یقین تھا کہ کام کی باتیں پرانی کتابوں میں ہی ملتی ہیں۔ کتابیں تو بس خوب صورت کاغذ اور حسن جلد کی بنا پر ہی اچھی لگتی ہیں۔ اندر دیکھو تو کچھ نہیں۔ ایک ہی بات کو بار بار دہرائیں گے اور ہر دو ماہ بعد ہزار دو ہزار صفحات کی ضخیم کتاب وجود میں آ جائے گی۔ مزہ یہ کہ کہیں تعارف کروانا پڑ جائے تو آپ نام چاہے نہ بتائیں کیونکہ اہل قلم تو قلمی نام سے کام چلاتے ہیں مگر اُن کی کتابوں کی گنتی ضرور بتائیں، ورنہ برا مان جاتے ہیں اور ان کتابوں میں ہوتا ہی کیا ہے، "تم نے میری تعریف کی، میں نے تمھاری ...." یہ الگ بات ہے کہ وہ خود حاجی کہلاتے تھے، مگر کسی کو حاجی نہ کہتے تھے۔ ان کی والدہ نے ہی ان کا نام حاجی رکھ دیا تھا۔ روز حج کی پیدائش تھی۔ گویا پیدائشی حاجی تھے اور انھیں بہرحال یہ پتہ تھا کہ لوگ انھیں حاجی اچھے ہی کہیں گے۔ حالانکہ ؎

ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔

مگر انھیں یقین تھا کہ وہ نہایت ہر دل عزیز ہیں۔ اور ان کی باوقار شخصیت دوسروں کو متاثر بھی کرتی ہے اور موٹے شیشہ کی عینک ان کی علمیت کی دلیل بھی ہے۔

اب یہ جو رزمیہ شاعری کی تلاش کا بیڑا انھوں نے اٹھایا سو اس میں کچھ تو اخبار کے مالک فوجدار خاں کو مایوس نہ کرنا چاہیئے تھا اور کچھ یہ بھی کہ ایسی خدمت کر کے وہ اپنے کو سرفراز سمجھتے کہ یہ ادبی خدمت تھی۔ بے ادبی انھیں کسی صورت گوارا نہ تھی۔

"کیوں بھتی کوئے جاناں میں خنجر چل جائیں۔ محبوب ہمیشہ شمشیر بکف نظر آئے۔ نینوں کے بان، ابرو کی کٹار، ترچھی نظر کے تیر، کتنا کچھ سامان ہے، پھر بھی غزل ہے کہ غزل ہی رہی۔ رزمیہ نہ بن سکی۔ حاجی صاحب کوشش میں تھے کہ کچھ تو ایسی صورت نظر آئے کہ مرنجان مرنج والی شاعری کے بجائے بر بنجان، برنج یعنی شاعری میں مرنے مارنے کے تیور نظر آئیں۔ مگر فی الحال کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ حاجی اچھے پریشان ہو چکے تھے اور اردو کے مستقبل کی طرف سے مایوس بھی۔ آج کل حال سے زیادہ لوگوں کو اردو کے مستقبل کی فکر ہے۔ کیونکہ حال پر تو بس نہیں اور مستقبل سے آس لگانے کا حق تو بہرحال ہے) اور کف افسوس بھی مل رہے تھے کہ اُردو کو اُردوئے معلّٰی بنانے کے لیے آخر کیا راہ عمل اختیار کی جائے۔ نپولین نے کہا تھا کہ دنیا میں کوئی بات بھی ناممکن نہیں ہے۔ لوگوں کو نپولین تو یاد رہتا ہے آخر مومن خاں مومن کیوں یاد نہیں رہتے؟ جو فرما گئے:

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

بس اسی طرح نفسِ مضمون ان سے بھاگا جا رہا تھا۔ اور وہ اس کے پیچھے بھاگے جا رہے تھے۔ مگر وہ تھا کہ ہاتھ نہ آتا تھا۔ آخر جب اسے راہ فرار اور انھیں خود پر اختیار نہ رہا تو چند ٹھنڈی سانسیں اور ان گنت گرم سانسیں بھر کر خاموش ہو رہے (ٹھنڈی محاورہ والی اور گرم چائے نوش کے بعد) اچانک اُن کی اگلی پچھلی ساری ذہانت عود کر آئی اور وہ سب کچھ یاد آنے لگا جو انھوں نے کبھی سپرد قلم کیا تھا۔ انھیں یاد آیا جب وہ تاریخ اردو کی کتابت کر رہے تھے اس وقت ان کی نظر سے گزرا تھا کہ اُردو کے لغوی معنی لشکر کے ہیں۔ گویا یہ بات اس گوہرِ ہستی کی تلاش میں نیک شگون

کے طرح لی جاسکتی تھی۔ یقیناً اب معاملے کے روشن پہلو سامنے آیا چاہتے ہیں۔ جس لشکر کے پاس زیادہ سامان تو لڑائی کا ہی ہوگا نا۔

یہاں معاملہ ہی نرالا ہے۔ قلم تلوار کا دھنی ہے۔ کبھی بہار کی تلوار کفر کی جڑیں اکھاڑتی ہے۔ کبھی خزاں کی شمشیر پورا باغ ہی جڑ سے اکھاڑ دیتی ہے۔ غرضکہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس اور آج کل تو ہر دانشور ایک دوسرے کی جڑیں اکھاڑتا ہے۔ عاشقی میں عاشق کا حال زار پہلے سے بھی خستہ اور تباہ ہو جاتا ہے۔ مگر حسن و عشق میں ٹھنی رہتی ہے۔ سب رس بظاہر تو تصوف کا کارنامہ ہے لیکن تمثیلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مہابھارت بھی گو بظاہر مہاکاویہ ہے۔ مگر وہ بھی تمثیلی ہے۔ کورو، نابینا ہے، گویا لالچ ساری برائیوں کی جڑ ہے اور انسان کو اندھا بنا دیتی ہے۔ سب رس بھی ایک اعتبار سے اردو کی رزمیہ ہے۔ کیونکہ اس میں حسن و عشق کی زبردست جنگ ہے۔ مگر پھر انھوں نے اپنے ذہن کو لگام دی۔ بات ہو رہی تھی رزمیہ شاعری کی۔ اب وہ اس کا کیا کریں کہ آج کل کی شاعری کے مقابلہ میں سب رس کی مقفیٰ نثر کہیں زیادہ طرحدار ہے۔ یوں انھوں نے دوبارہ اپنے کو بہک جانے دیا کہ یہ تو تخلیقی کام ہے۔ کسی کے مضمون یا کتاب کی کتابت تھوڑا ہی کر رہے ہیں حسن و عشق میں کیا زوردار جنگ ہو رہی ہے۔ انھیں میر کا شعر یاد آگیا۔

ہلی ٹک کہ دل میں جبھی کبھی ۔ جھکی کچھ کہ جی میں کھبی کبھی

یعنی جو ذرا تو ہلی کہ اس کی نظر میں جو تیر برسانے والی اور کٹار کی طرح تیز ہیں۔ تیر سے جگر کے پار ہو جائیں گی۔ یقین نہ آئے تو اگلا مصرعہ ملاحظہ فرمائیے۔

وہ جو لاگ پلکوں میں اس کی ہے نہ چھری میں ہے نہ کٹار میں

جنگ میں فریقین کا گھمسان کا یدھ ہونا لازمی ہے۔ اگر صلح ہو جائے تو بات دوسری ہے۔ عاشق اسی خیال سے ساری رات جاگتا ہے کہ اسے شب فراق کے شب خون کا ڈر رہتا ہے۔ اور اسی لیے زور زور سے روتا بھی ہے۔ یہاں تک کہ پورا محلہ جاگتا ہے۔ رونا اس کی عبادت اور جاگنا عادت ہے۔ حیرت اس پر کہ کسی شاعر کے پڑوسی نے کبھی زور زور سے رونے کی شکایت نہیں کی۔ ویسے تو فلمی ہیرو بھی نہایت سُر میں الاپتے ہیں۔ لوگ تو بے سروں کی شکایت نہیں کرتے تو پڑوس میں رات بھر ویڈیو کی ہنگامہ آرائیوں کی شکایت کیا کریں گے۔ ہاں علی الصبح اکثر اس بات پر گھمسان کا رن پڑتا ہے کہ دفتر جانے میں دیر ہو گئی۔ اور وہاں افسر کی ڈانٹ کھانا پڑے گی اور نتیجتہً

غصہ اتارتے ہیں وہ عضو ضعیف پر

باہر کا غصہ اترے ہے جنس لطیف پر

اس شکایت پر یاد آیا کہ دوستقا الکشن کا۔ گلی کوچوں میں گہما گہمی تھی۔ حاجی اچھے کی اہلیہ تھیں پکی کانگریسی اور بی اماں کے زمانے کی چرخا کاتنے والی۔ مگر جب سے پنجہ نے چرخہ کی جگہ لی وہ نہایت خلوص سے پنجہ کے ساتھ ہو گئیں۔ پڑوس میں ڈیرہ ڈالے کچھ حضرات بیٹھے تھے اور برابر الکشن بائیکاٹ کے نعرے لگا رہے تھے۔ برسر اقتدار پارٹی کو سب و شتم سے نواز رہے تھے۔ اہلیہ صاحبہ کانوں میں انگلیاں دیئے اور منہ میں گلوری دبائے برابر بڑبڑا رہی تھیں کہ زور زور سے مائک پر نعروں کی گونج سنائی دی۔ کیونکہ اس شامیانے والے حضرات تین دن سے مسلسل بھوک ہڑتال پر تھے۔

بھوک ہڑتال بعض حالات میں اپنی بات منوانے کا مجرب نسخہ ہے۔ مگر یہاں تو خود اقتدار کی دال گلتی ہی نظر نہ آتی تھی، کسی پہ ان کی ہڑتال اور دشنام طرازیوں کا کوئی اثر نہ تھا۔ مرزا موصوف کے رحل پہ اپنے حصہ کا کھانا لے کر بیٹھ گئے کہ پڑوس میں کسی کو بھوکا نہ دیکھ سکتے تھے۔ مگر وہ شکریہ کے ساتھ واپس آگیا۔

اندھے کے آنکھیں مانگنے پر تو انھیں آج بھی یقین تھا، مگر بھوکے کے کھانا واپس کر دینے سے انھیں روٹی کی ثانوی اہمیت کا پتہ چلا کہ ایک چیز اور بھی ہے جسے اردو میں وقار اور انگلش میں اسٹیٹس کہتے ہیں۔ اور فی زمانہ دوسرا لفظ ہی رائج ہے۔ لکھنا پڑھنا ادبیات ہے۔ حاجی اچھے دنیاداری بالکل نہ جانتے تھے۔ بعد میں انھیں پتہ چلا کہ ہڑتالیوں کا میڈیکل چیک اپ بھی کیا جاتا ہے اور جو ہڑتالی زندگی سے دور ہونے لگتا ہے اس کی رگوں میں غذائیت پہنچانے کا کام سرکار کا ہے۔ یا پھر صلح ہی ہو جاتی ہے جس میں فریقین کی رضامندی ضروری ہے۔

سیاست کی اس جنگ میں دوسری جماعت اپنے نعرے لگاتی اور رجز پڑھتی تھکتی تو انھیں تعجب نہ ہوتا۔ مگر وہ تو اپوزیشن پر طنز کرتی ہوئی بڑھتی چلی گئی۔ اردو دشمنی کے اس دور میں انقلاب اور زندہ باد کے نعرے تو سبھی لگاتے ہیں مگر جیسے مغل شہنشاہ اکبر سب سے زیادہ ہر دل عزیز تھا، ایسے ہی اسداللہ غالب بھی اپنی اہمیت منوانے لگے ہیں۔

ہو جائیں نہ یوں شہر میں رسوا غالبؔ\
کرتے ہیں ابھی شہر میں چرچا غالبؔ\
ہاں اہل شہر کو ذرا دیکھو تو پوچھا\
سویا ہے کوئی شہر میں بھوکا غالبؔ

اس رباعی پر حاجی اچھے بھڑک ہی تو اٹھے۔ آج تک یہ رباعی ان کی نظروں میں نہ آئی تھی۔ رات کے بارہ بجے تک مائک برابر چالو رہتا اور چوراہے پر مکان ہونے کے تاوان میں دن رات ان ہنگاموں سے فیض یاب ہوئے۔ الکشن میں امیدواری کو یوں بھی الکشن لڑنا کہتے ہیں اور لڑائی میں رجز تو پڑھے ہی جاتے ہیں۔ شامیانے میں بیٹھے ہوئے حضرات نے بھوک ہڑتال ضرور کی تھی، مگر سردی سے بچنے کا پورا انتظام کر رکھا تھا لیکن اسی شاہراہ کے دوسری طرف جب حریف جماعت نے اپنا خیمہ بپا کیا اور سردی میں ٹھٹھرتے رہے نیز آدھی رات تک ہنگامہ آرائیوں کے بعد سر سراتی ہوا نے جب ان کی آوازیں جمانے کے بجائے انھیں کو جمانا شروع کر دیا تو ہڑتالیوں میں سے کسی منچلے نے باآواز بلند دوسری رباعی سے سرفراز فرمایا۔

اس شخص کو لگتا نہیں جاڑا غالبؔ\
کھاتا ہے ہر ایک روز وہ بھجیا غالبؔ\
بچپن میں ملا کرتا تھا انڈا اس کو\
ہے بس کہ منسٹر کا بھتیجا غالبؔ

مرزا غالب کو یوں تو الکشن میں کھڑا ہوتے دیکھ کر حاجی اچھے کے حواس غائب ہو گئے۔ کہاں تو وہ اس بائیکاٹ

کی شکایت کرنا چاہ رہے تھے اور کہاں قلم کاغذ اٹھا کر اپنے رزمیہ کو سنوارنے لگے۔ گویا اپنی عاقبت سنوارنے لگے۔

پھر انھیں یاد آیا کہ مرزا فوج دار خاں کے اخبار 'پگڑی اچھال' کے تنقیدی کالموں پر بھی نظر ڈال لی جائے کہنے کو تنقیدی مضامین ہفتہ میں ایک بار ہی شائع ہوتے تھے۔ لیکن غور کرنے پر ایک دن کا مواد عمر بھر کے لیے کافی ہوتا تھا۔ بچپن میں تو انھوں نے ایک پیراگراف رٹ لیا تھا جس سے ہر شاعر کے کلام میں سادگی 'معنی آفرینی' اور بیک وقت بلندی و گہرائی کا پتہ چلتا تھا اور جو پاس ہونے کا مجرب نسخہ تھا۔ بعض ناقدین کو بھی یہ گُر آتا ہے۔ ایک ٹوپی سلوا رکھی ہے، یہی ہر ایک کے سر پر فٹ ہو جاتی ہے اور جسے اسٹینڈرڈ کہا جاتا ہے کہ جس کے سر سے اتاری جاتی اسے بہتر کاٹ چھانٹ والی ٹوپی کی اُس داد دی جاتی ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگلے پچھلے تمام ادبی مردے اکھاڑے جاتے اور بعض ہونہار ناقد اپنے قد کو گھٹتے دیکھ کر چراغ پا ہو جاتے۔ ہوشیاری سے سیف قلم اٹھا کر وار کر دیتے کہ یاران نکتہ داں کو بچنا مشکل ہو جاتا۔ رجز پڑھتے جاتے اور سامنے والے کچھ ہراساں کچھ ششدر رہ جاتے۔ جدھر نکلتی، کسی کو بسمل اور کسی کو نیم جان کر کے لوٹ آتی۔

حاجی اچھے تنقید سے ہمیشہ گھبراتے تھے اور ہر اچھے آدمی کی طرح ہلکی پھلکی شعر و شاعری کو غنیمت جانتے تھے۔ مگر تنقید کی یہ قسم انھیں یقین دلانے کو کافی تھی کہ اردو میں رزمیہ کا وجود ابھی باقی ہے اور یہ کہ آزاد شاعری ہے۔ اگر معرکہ چکبست و شرر اردو کی پہلی رزمیہ قرار پائے تو راوی کی گردن پر گناہوں کا بھار رکھنے کے بعد آب حیات میں بیان کی گئی بہت سی روایتیں بھی رزمیہ کی اچھی مثالیں ہیں۔ جنھیں پرانے زمانے کے لوگوں نے "معاصرانہ چشمک" کا نام دیا تھا۔ ہم تو انھیں سیدھے سادے الفاظ میں رزمیہ کہتے ہیں۔ البتہ یہ آزاد شاعری ہے۔

اکثر اس زور و شور سے رجز پڑھے جاتے ہیں اور اکثر اسے عوامی تائید نیز بیشتر تائید غیبی حاصل ہو جاتی ہے۔ جتنا جسے غیب سے زر کثیر حاصل ہوتا ہے، اتنا ہی گویا تائید غیبی کا حق دار قرار پاتا ہے۔ کبھی انجمن جہاں پناہ نے انجمن بے پناہ کو پچھاڑ دیا تو کبھی انجمن بے پناہ سے سب پناہ مانگنے لگتے ہیں اور مال غنیمت کے طور پر صفحے کے صفحے سیاہ ہوتے رہتے ہیں۔ اور ان کے کارناموں پر خون کے آنسو روتے ہیں۔ خون کے آنسو بہانے والی بات انھوں نے یوں ہی نہیں لکھ دی تھی بلکہ یہ شعر جب ان کی نظر سے گزرا ہے

حادثے دو قبیل پہ عالم میں اہم گزرے ہیں

اور اگلا مصرع اچھے صاحب کی سمجھ میں ہی نہ آسکا۔ بڑے پریشان ہوتے۔ تنقیدی مضامین میں انھیں یہ بات بڑی اچھی لگتی تھی کہ بار بار اشعار پڑھنے کو مل جاتے تھے اور شاعری ان کی روحانی غذا تھی۔ صفحے پلٹتے پلٹتے ایک جگہ اور یہ شعر ان کی نظر سے گزرا۔ مصرع ثانی کچھ اس طرح تھا

تیرا مرنا مری زلفوں کا پریشان ہونا

انھوں نے زور زور سے آنکھیں ملیں۔ لکھا تو یہی تھا۔ اب اس کا وہ کیا کریں کہ اس کتاب کا کاتب نیا تھا۔

ہی ستم ظریف تھا۔ ان کے حافظہ نے بالکل اچانک کہیں سے نمودار ہوکر دوسرا مصرعہ بالکل صحیح ان کے سامنے موجود کر دیا۔

میرا مرنا تیری زلفوں کا پریشاں ہونا

یوں بات میں کوئی خاص فرق نہیں۔ بس تیرے مرنے سے شعر نوحہ لگتا ہے اور میرے مرنے سے عاشق کی مرگِ ناگہانی سامنے آتی ہے۔

دورِ جدید میں معرکہ آرائیوں کا اندازہ بالکل مختلف ہے گویا وہ جو کہا گیا ہے ؎

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

وہ اسی بات کو ذہن میں رکھ کر کہا گیا ہے۔ کہاں کا خنجر اور کیسی تلوار۔ ایک ننھے سے ایٹم بم سے پورا شہر تباہ کر دیا غالبؔ نے تو کسی زیر و بم کا ذکر بھی کیا ہے۔ ایک اور جگہ انھیں نظر آیا ؎

مجھ سے بھی خفا ہو مری آنکھوں سے بھی ناخوش

تم بھی ہو عجب چیز کہ لڑتے ہوا سے

ابھی تک اچھے صاحب ہوا سے لڑنے کو محاورہ سمجھتے تھے۔ مگر اب زہریلی گیس کے اخراج نے جسے اہل بھوپال گیس المیہ کہہ کہہ کر غم زدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ ہوا سے لڑنے کو دورِ جدید کی سب سے اہم لڑائی قرار دیا تھا (اور اس کا ثبوت اسرائیل کی طرف سے فلسطین کے خلاف استعمال کی گئی زہریلی ہوا ہے)۔

کہاں تو عیش و نشاط کا وہ عالم کہ

؎ بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی

اور کہاں جبرِ ہوا کی یہ کیفیت کہ ہوا و ہوس اور نائے و نوش کا ذکر کیا کیجیے، زہر نوشی ہے بادہ پیمائی۔

یہ الگ بات ہے کہ یہ لڑائی عدالتوں میں لڑی گئی۔ لڑتے کیا، لڑنے کی سکت ہی نہیں رہ گئی۔ ہندوستانی جانوں کا فیصلہ ہندوستانی عدالتوں میں کیا گیا۔ ہم نے جو کچھ اپنی جانوں کی قیمت لگائی سو پائی۔ دلاسے، درمے قدمے سخنے مدد بھی کی گئی اور اسے خوں بہا کہا گیا اور یہ کہ اس رزم کا سب سے عجیب پہلو یہ ہے کہ ہم سب اپنے آپ سے لڑ رہے ہیں۔ اپنی اکھڑتی ہوئی سانسوں اور بکھرے ہوئے حواسوں سے۔ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتے ہوئے ہم ...... بکھر بکھر کر ٹوٹتے ہوئے ہم ....

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

اور اچھے صاحب کی سمجھ میں آج یہ بات اچھی طرح آگئی کہ ہندوستان نے بغیر خون بہائے دو چیزیں حاصل کیں۔ ایک آزادی اور دوسرے خون بہا۔ اور اسی لیے آج انسانی جانوں کی قیمت ارزاں ہوگئی ہے)۔ جان دینے کے لیے خون بہانا لازمی نہیں ہے۔ ہندوستان کا رزم نامہ آنے والا زمانہ ترتیب دے گا۔ جب ہماری بکھرتی، ٹوٹتی سانسیں ایثار جذبۂ حق کا رزار میں اتریں گی۔ جب شعر گوئی ذریعۂ عزت بن سکے گی۔ اور اگلی سو پشتوں کو فنونِ سپہ گری سیکھے بغیر، سپہ گری کا فن آجائے گا۔ جب قوم کا ہر بچہ ایک سپاہی ہوگا۔ دہشت گردی کے ہاتھوں مرنا نہیں پڑے گا۔ اپنا دفاع کرنا آجائے گا اور فریقِ ثانی سے نبٹنا بھی۔

سال ۱۹۸۹ء یکم اکتوبر سے ۷ اکتوبر تک

ہفتہ یکم اکتوبر :- آج ہمارے شہر کے پرانے قلعے کے قریب ہفت روزہ بازار لگتا ہے ۔ ویسے شہر کے ہر گلی کوچے اور بازار میں ہر روز بازار ہی لگا رہتا ہے ۔ مگر آج کے دن قلعے کے قریب لگنے والے بازار میں مرغیوں کی خرید و فروخت خاص طور پر ہوتی ہے ۔ میں اس دن اپنی بیمار مرغیاں فروخت کر کے تندرست مرغیاں خرید لاتا ہوں ۔ آج میں نے اپنی دس بیمار مرغیوں کو اس چالاکی سے فروخت کر دیا جس چالاکی سے لوگ جعلی نوٹ چلاتے ہیں ۔ ان دس بیمار مرغیوں سے حاصل ہونے والی رقم سے تیرہ تندرست مرغیاں خرید لایا ۔

اتوار ۲ اکتوبر :- اس دن ہمارے شہر میں ایک ادبی اجلاس ضرور ہوتا ہے کیونکہ ہمارے شہر میں اردو انجمنوں کی تعداد کرانے کی دوکانوں سے بھی زیادہ ہے ۔ لوگ رامائن اور مہابھارت جیسے ٹی وی سیریل سے فارغ ہونے کے بعد اپنے بچے ہوئے وقت کو ٹھکانے لگانے کے لیے پورے ٹھاٹ باٹ کے ساتھ ان ادبی اجلاسوں میں شریک ہوتے ہیں نتیجتاً دس بجے شروع ہونے والا ادبی اجلاس ایک بجے شروع ہوتا ہے میں ابھی آج ایک ادبی اجلاس میں شریک ہوا اس ادبی اجلاس میں چند ابھرتے افسانہ نگاروں نے بھڑکتے ہوئے افسانے سنائے ۔ ابھرتی ہوئی گلوکاراؤں کی مترنم آواز میں مقامی شعراء کا کلام ساز پر سنایا گیا ۔ اجلاس کے اختتام کے بعد میں سب کچھ نظر انداز کر کے اس اجلاس کے مہمان خصوصی کی تقریر کی دل کھول کر جو داد دی تو اس مہمان خصوصی نے مجھے گلے سے لگا لیا امید ہے آئندہ اس مہمانِ خصوصی کی ہر خصوصی دعوت مجھے پابندی سے ملتی رہے گی ۔

علامہ پاگل پاکھنڈی کی ڈائری

منظور وقار

(گلبرگہ)

آج شام شہر کے چوراہے پر بلیک چور سیٹھوں اور جعلی نوٹوں کا دھندا کرنے والے دھونتوں کی جانب سے "یوم مہاتما گاندھی" کے سلسلے میں ایک زبر دست جلسہ رکھا گیا میں شام جب جلسہ گاہ میں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اسٹیج پر موجود تمام سیٹھ ساہوکار اور رشوت خور اعلیٰ عہدہ دار ملک سے رشوت، چور بازار کٹنگ، بلیک مارکیٹنگ اور دھوکہ دہی کو ختم کرنے کی قسم کھا رہے تھے گاندھی جی کے آدرشوں پر چلنے کا وعدہ کر رہے تھے۔

پیر ۳-اکتوبر:۔ آج کا دن میرے لیے بڑا منحوس ہوا میری ہڈی پسلیاں ریزہ ریزہ ہوتی ہوتی رہ گئیں کیونکہ آج صبح صبح مالک مکان تین سال سے مجھ پر لدے ہوئے مکان کے کرائے کی وصولی کے لیے ٹپک پڑا میں حسب عادت مکان کے اندر ہی سے اپنے لڑکے کی زبانی کہلوا بھیجا کہ "ابا گھر پر نہیں ہیں" مالک مکان اس مخصوص مکالمے کو سنتے ہی آگ بگولہ ہو کر بھوکے شیر کی طرح میرے مکان میں گھس پڑا۔ وہ مجھے کچا چبانا ہی چاہتا تھا کہ میری وفادار دقدرے خوب صورت) ملازمہ بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھ کر مالک مکان کے آگے سینہ تان کر کھڑی ہو گئی۔ ملازمہ کے بھرے بھرے سینے پر نظر پڑتے ہی مالک مکان بھیگے ہوئے پاپڑ کی طرح نرم پڑ گیا اور اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے چپ چاپ باہر نکل گیا۔

منگل ۴/اکتوبر:۔ آج کا دن میرے لیے انتہائی مسرت کا دن ہے۔ میرے خریدے ہوئے پچاس روپیوں کے لاٹری ٹکٹوں میں سے ایک ٹکٹ کے آخری دو نمبر DRAW LIST میں موجود نمبروں سے مل گئے۔ یوں مجھے تیس روپے کی چھوٹی سی لاٹری مل گئی۔ لاٹری میں ملے ہوئے ان تیس روپیوں کو دیکھ کر مجھے جو مسرت ہوئی اس کا اندازہ ہر ماہ لاٹری ٹکٹ میں رقم لگا کر اپنی لنگوٹی ڈھیلی کرنے والے گاہکوں کا دل ہی جانتا ہے۔ اور پھر تیس روپے لاٹری ٹکٹ میں حاصل ہونے کے بعد مایوسی کے گھور اندھیرے میں مجھے امید کی ایک ہلکی سی کرن نظر آئی کہ آج تیس روپے مل گئے ہیں تو کل تیس لاکھ بھی مل سکتے ہیں۔

چہارشنبہ ۵-اکتوبر:۔ آج کا دن بھی میرے لیے انتہائی مسرت کا دن ہے کیونکہ مجھے آج ایک دعوت نامہ ملا ہے۔ میری صدارت میں ۷-اکتوبر کی رات فالتو نگر میں "انجمن ادب بے روزگاران" فالتو نگر کی جانب سے ایک کل ہند مشاعرہ رکھا گیا ہے۔ مجھے قیام و طعام اور سفر خرچ کے علاوہ صدارت کی فیس بھی ملنے والی ہے۔

جمعرات ۶-اکتوبر:۔ فجر کی نماز کے بعد میں آج بھولے شاہ کی درگاہ شریف پر پھول اور ناریل لیے پہنچا۔ بعد فاتحہ پنشن سے ملنے والی ماہانہ تنخواہ میں برکت اور کل منعقد ہونے والے کل ہند مشاعرے میں شرکت کے لیے خاص دعا مانگی۔ گھر آکر مشاعرے کی تیاری میں لگ گیا۔ شیروانی کی استری اور سر اور داڑھی کے سفید بالوں کی رنگائی میں مصروف تھا کہ میری بوڑھی کھوسٹ بیوی نے آکر بتایا کہ میرا سب سے چھوٹا پوتا مسلسل قے کر رہا ہے میں فوراً اسے لے کر ڈاکٹر داود علی دلال کے دواخانے پر پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب نے جانچ کے بعد بتایا کہ لڑکا پوری طرح سے تندرست ہے صرف ضرورت سے زیادہ کھانا کھانے کی وجہ سے قے ہو رہی ہے۔ بیوی سے استفسار کے بعد معلوم ہوا لڑکا صبح صبح پڑوس میں ہو رہی برسی کی دعوت میں شریک ہوا تھا۔

جمعہ ۷-اکتوبر:۔ بعد نماز جمعہ فالتو نگر پہنچنے کے لیے بس اسٹینڈ پر پہنچا۔ تمام بسیں اپنی اپنی منزل کی جانب

کوچ کر گئی تھیں۔ بس اسٹینڈ ایران عراق کے جنگی میدانوں کی طرح بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے کے بعد ایک فالتو قسم کی ٹیکسی کھڑی ہوئی نظر آئی دوڑ کر وہاں پہنچا ٹیکسی ڈرائیور اپنا فالتو وقت اپنی ٹیکسی (موٹر کار) میں سو کر گزارنے میں مشغول تھا میرے جگانے پر میری حالت پر نظر ڈال کر "پہلے کاری" میں فالتو گاہک ہی سہی" کا نعرہ لگا کر فالتو نگر چلنے کے لیے تیار ہوا۔ رات آٹھ بجے ٹیکسی فالتو نگر پہنچی۔ مشاعرے کا وقت رات دس بجے کا تھا مشاعرے میں مدعو تمام شعرا کے فالتو نگر پہنچتے پہنچتے رات کے بارہ بج گئے۔ سوا بارہ بجے مشاعرے کا آغاز ہونے ہی والا تھا کہ سامعین اور منتظمین مشاعرہ کی صفوں میں جیسے بھگدڑ سی مچ گئی۔ ملک کے ممتاز و مقبول شاعر علامہ امیر احمد اونچا مشاعرے میں شرکت کے لیے خراماں خراماں تشریف لا رہے تھے۔ منتظمین اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کرنے لگے سامعین ہاتھوں میں آٹو گراف بک لے کر علامہ کے قریب پہنچے۔ اسٹیج پر موجود دیگر شعرا، علامہ کے احترام میں ادب سے کھڑے ہو گئے۔ علامہ امیر احمد اونچا اس مشاعرے میں شرکت کریں گے۔ اس کی اُمید ـــــ منتظمین مشاعرہ کو نہیں تھی۔ لہٰذا علامہ کی آمد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میرا نام مشاعرے کی صدارت سے کاٹ کر علامہ امیر احمد اونچا کو کرسی صدارت پر بٹھایا گیا۔ میں اچانک اپنے عہدے سے معزول شدہ منسٹر کی طرح حیران پریشان کبھی منتظمین مشاعرہ کے چہروں کو ـــــ تو کبھی اپنے آپ کو دیکھتا رہ گیا۔

مشاعرہ کامیاب رہا مگر میری غزل کامیاب نہ ہو سکی۔ اس لیے کہ اچانک صدارت کے بدل جانے سے میں اس قدر بد دل ہو گیا تھا کہ میری غزل سرائی پرسہ سرائی میں بدل گئی۔ مشاعرے کے اختتام کے بعد مجھے بھی دیگر غیر اہم شعرا کی طرح تھرڈ کلاس ریلوے کرایہ (وہ بھی ایک طرفہ) ملا۔ آج ہی میں نے اپنی ہتک کا انتقام منتظمین مشاعرہ سے لینے اور علامہ امیر احمد اونچا کی ساکھ کو ختم کرنے کے لیے ایک پانچ سالہ پروگرام بنایا ہے۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ امیر احمد اونچا کی شہرت سے حسد رکھنے والے تمام شعرا میرے اس اہم کام میں ضرور حصہ لیں گے۔ ●●

● ایک صاحب مسلسل داد دیے جا رہے تھے جب کہ شاعر صاحب حیرت سے انھیں تک رہے تھے۔

آخر کار انھوں نے شاعر سے جھلا کر کہا یار تو شعر تو سنا میں داد دیے جا رہا ہوں "

● ایک آدمی ریلوے پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا اس نے ایک ڈبّے میں بہت ہی موٹے آدمی کو اکیلے دیکھ کر ازراہ تمسخر پوچھا۔" کیا یہ بوگی صرف ہاتھی کے لیے ہی مخصوص ہے۔

"جی نہیں۔ گدھے کتے اور دیگر جانور سب ہی آ سکتے ہیں۔

تشریف لائیں ـ

ظفر کمالی (پٹنہ)

مغرب کی ہو رہی ہے اذاں وقتِ شام ہے
ٹی وی کے گرد یاروں کا کیا اژدہام ہے

دربار جس کا سجدہ گہِ خاص و عام ہے
ہاں اس کا نام نقد علیہ السلام ہے

اب تو معاشرے کا یہی بن گیا مزاج
خنجر بغل میں لب پہ وہی رام نام ہے

مارے گئے بچاس سے چلے گھر بھی سیکڑوں
قابو میں آ سکتی ہے؟ یہ تکیہ کلام ہے

اشراق ہیں ذلیل کرشمہ تو دیکھیے
کھل کھیلتا ہے جو وہی عالی مقام ہے

بے غرض چاپلوسی ہو، پرست جس سے دن کا کام
آداب عرض اس کو اسی کو سلام ہے

ہی گئی ہیں تیسرے جب اپنی اہمیت
پھر گھر میں والدین کا کیا میرے کام ہے

ہم کون آپ کیا ہیں یہ ہیں جانتے نہیں
بول آپ کی بزرگی میں کس کو کلام ہے

کھول آنکھیں ہوشیار ہو اے طائرِ خرد
وعدوں کے دانے اور الکشن کا دام ہے

ڈھونڈا بہت ملا نہ مگر کوئی مقتدی
ہر شخص اپنے آپ کو کہتا امام ہے

کیا پوچھتے ہو حال غریبوں کا اے ظفر
ان کو تو ہر مہینہ ہی ماہِ صیام ہے

انصاری رفیع احمد (مالیگاؤں)

بیوی ہو تو ایسی

فلک پر چاند ستارے جو بیوی ہو تو ایسی ہو
قلوپطرہ بھی غش کھائے جو بیوی ہو تو ایسی ہو

ملے جہیز میں پلنگ تو نا آئے شادی کے موقع پہ
وہ رنگین ٹی وی بھی لائے جو بیوی ہو تو ایسی ہو

پلنگ پہ بیٹھ کر کھائے مزے سے زردہ بریانی
میاں سے چولھا جھنکوائے جو بیوی ہو تو ایسی ہو

وہ پکچر شوق سے دیکھے جتندر اور ریکھا کی
میاں بچوں کو ٹہلائے جو بیوی ہو تو ایسی ہو

گدھے کو گھوڑا وہ کہہ دے تو شوہر بھی کہے جی ہاں
وہ کلمہ اپنا پڑھوائے جو بیوی ہو تو ایسی ہو

لگائے تن میں تیرہ کرے وہ نو کو اٹھارہ
قسم ہر بات میں کھائے جو بیوی ہو تو ایسی ہو

پڑوسن ہو محلے میں کوئی آفت کا پرکالہ
یہ اس کی خالہ کہلائے جو بیوی ہو تو ایسی ہو

وہ پل بھر میں بنائے گھر کو ہی میدانِ پانی پت
وہیں پنچوں کو بلوائے جو بیوی ہو تو ایسی ہو

پٹی جاتا ہے گی میاں بیٹھے کھڑے تم دیکھتے رہیو
یہی گانا سنائے جو بیوی ہو تو ایسی ہو

خامہ بگوش
کراچی

تحقیق کا کام وہی لوگ کرتے ہیں جو زندگی سے بیزار ہوتے ہیں

تحقیق ایک خشک اور بے مزا کام ہے۔ ہم سے تو کسی تحقیقی مقالے کے دو صفحے بھی پڑھے نہیں جا سکتے، حیرت ہوتی ہے کہ محقق حضرات پانچ پانچ سو صفحے کی کتابیں کیسے لکھ دیتے ہیں۔ کسی پرانے شاعر کے دیوان کو پڑھیے، تو اس میں دو چار شعر کام کے ضرور مل جائیں گے، لیکن اسی شاعر کے بارے میں کوئی تحقیقی مقالہ پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شاعر نے کام کے دو چار شعر کہہ کر اپنا وقت ضائع کیا تھا، کیونکہ وہ تو دنیا میں آیا ہی اس لئے تھا کہ کسی محقق سے اپنا سال وفات متعین کرا سکے۔ یہ شاعر بھی عجیب لوگ ہوتے ہیں۔ شعروں میں ہر بات بیان کر دیتے ہیں، لیکن اپنا سالِ وفات نہیں بتاتے۔ اتنی ذرا سی بات کے چھپانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محققوں کو دوسروں کے سال ہائے وفات معلوم کرنے میں اپنی عمریں ضائع کرنی پڑتی ہے۔

کسی شاعر کا سالِ وفات معلوم کرنا بظاہر سادہ سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن اس سادہ سی بات کی تہ تک پہنچنا بہت مشکل کام ہے۔ سب سے پہلے تو محقق کو یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ شاعر کا کوئی سال پیدائش بھی ہے، کیونکہ کسی کا سال پیدائش معلوم نہ ہو تو، اس کی پیدائش مشکوک ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے، جو شخص پیدا نہیں ہوگا، اس کا مرنا ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا محققین پہلے کسی شاعر کے پیدا ہونے کے شواہد پیش کرتے ہیں اور پھر اسے کیفر کردار تک پہنچاتے ہیں، یعنی اس کی وفات حسرت آیات کا ذکر کرتے ہیں۔ پیدائش اور وفات کے درمیان بھی بہت سے واقعات تحقیق طلب ہوتے ہیں۔ مثلاً شاعر نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی یا تلمیذ الرحمٰن ہونے پر قناعت کی۔ دہلی سے لکھنؤ تک کا سفر پیادہ کیا یا بیل گاڑی سے؟ بیل گاڑی میں اس کے ساتھ بیلوں کے علاوہ اور کون کون تھا؟ اس کے اپنے کلام پر کس سے اصلاح لی؟ کردار کے سلسلے میں اصلاح کی ضرورت کیوں محسوس نہ کی؟ الغرض اس قسم کے بے شمار مسائل زیر بحث آتے ہیں، تب کہیں جا کر متعلقہ شاعر کی شخصیت کے خد و خال نمایاں ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ بسیط سنجیدہ، بے مزا، اور خشک اسلوب میں ہوتا ہے کہ شاعر کی تاریخ وفات کے ساتھ ساتھ قاری کے انتقال پُر ملال کا زمانہ بھی متعین ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تحقیق صرف وہی لوگ پڑھتے ہیں۔ جو زندگی سے بیزار ہوتے ہیں یا جنھیں مزید تحقیق کرنی ہوتی ہے۔

"مزید تحقیق" سے مراد یہ ہے کہ جب ایک محقق کسی شاعر کی وفات کا سنہ دریافت کرتا ہے تو دوسرا مہینہ بتاتا ہے، تیسرا اس کا کھوج لگاتا ہے کہ اس مہینے کی کس تاریخ کو یہ سانحہ گزرا تھا، چوتھا محقق یہ راز فاش کرتا ہے کہ شاعر کا انتقال کتنے بج کر کتنے منٹ پر ہوا تھا پانچواں محقق پہلے چار محققوں کی تحقیق کو غلط ثابت کرکے از سرِ نو تحقیق کا اہتمام کرتا ہے۔ گویا تحقیق ایک ایسا کام ہے، جو ایک مرتبہ شروع ہو جائے تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تحقیق کا کام وہی لوگ کرتے ہیں جو کوئی معقول کام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ممکن ہے آج سے دس پندرہ برس پہلے یہ خیال درست ہو، لیکن جب سے ڈاکٹر سعید اختر درانی نے ادبی تحقیق سے دلچسپی لینی شروع کی ہے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ باصلاحیت لوگ بھی یہ کام کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر درانی ہمارے ملک کے ممتاز اور بین الاقوامی شہرت رکھنے والے سائنسدان ہیں۔ سائنس کے میدان میں ان کے تحقیقی کاموں کو ساری دنیا میں سراہا گیا ہے۔ خصوصاً اس تحقیق کا بڑا چرچا ہے جو ڈاکٹر صاحب نے "مہتابی مواد" پر کی ہے۔ یہ مواد وہ ہے، جو روسی اور امریکی ماہ نورد چاند سے لائے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کئی بین الاقوامی سائنسی اداروں کے تحقیقی منصوبوں سے منسلک ہیں، اس سے ان کی مصروفیات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اتنی مصروفیات کے باوجود بھی وہ ادبی کاموں کے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔

۱۹۷۷ء میں اقبال صدی کے موقع پر ڈاکٹر صاحب ادبی تحقیق کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے یورپ کے بعض اداروں میں اور افراد کے پاس علامہ اقبال سے متعلق غیر مطبوعہ مواد کا سراغ لگایا اور متعدد مضامین لکھ کر اقبال کی زندگی کے بہت سے مخفی پہلوؤں سے نقاب اٹھایا۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "اقبال یورپ میں" ۱۹۸۵ء میں شائع ہو چکا ہے، جسے اقبالیات میں اہم اضافہ سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی سب سے اہم دریافت وہ خطوط ہیں، جو علامہ اقبال نے ۱۹۰۷ء اور ۱۹۳۳ء کے درمیان ایک جرمن خاتون مس ایما ویگیناسٹ کے نام لکھے تھے۔ یہ دریافت تو ایک نومسلم جرمن دانشور ڈاکٹر ہربرٹ امان اللہ ہوبوہم کی تھی، لیکن اردو والوں کو اس کا علم ڈاکٹر درانی کے ذریعہ ہوا۔ ڈاکٹر امان اللہ کے پاس علامہ اقبال کے خطوں کے عکس تھے، وہ انہوں نے ڈاکٹر درانی کو دیئے کہ ان کا اردو ترجمہ شائع کرادیں۔ اصل خطوں کو ڈاکٹر امان اللہ خود مرتب کرکے شائع کرنا چاہتے تھے، لیکن ڈاکٹر درانی نے ان کا متن بھی ڈاکٹر امان اللہ کی اجازت کے بغیر اپنی کتاب میں شامل کرلیا۔ ممکن ہے ڈاکٹر امان اللہ کو اس بات سے رنج ہوا ہو، لیکن ہمارا خیال ہے کہ عشق اور تحقیق میں سب جائز ہے۔ ڈاکٹر درانی، علامہ اقبال کے عاشق بھی ہیں اور محقق بھی، ان کو اظہارِ عشق و تحقیق کے لئے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔

"اقبال یورپ میں" کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر درانی نے اپنی تحقیق کے دائرے کو وسیع کیا اور ایما ویگیناسٹ کو اپنا موضوع بنا کر رسالہ "افکار" میں ایک طویل سلسلۂ مضامین لکھا۔ ان مضامین سے اردو تحقیق میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔

علامہ اقبال سے ایما ویگیناسٹ کا تعلق یہ تھا کہ وہ علامہ کے جرمنی میں قیام کے دوران انہیں جرمن زبان پڑھایا کرتی

تھیں۔ کوئی اور محقق ہوتا تو وہ ایما کے مختصر حالات لکھنے پر اکتفا کرتا، لیکن ڈاکٹر درانی نے ان محترمہ کی سات پشتوں پر تحقیق کر ڈالی۔ ایما کے اہل خاندان، ان کی رہائش گاہوں اور قبروں کے بارے میں وہ تمام تفصیلات پیش کر دیں، جو اب تک پردۂ راز میں تھیں۔ یہی نہیں دوران تحقیق خود ڈاکٹر صاحب پر جو گذری، اس کی تفصیلات بھی انہوں نے اس طرح قلم بند کی ہیں جیسے یہ سب باتیں بھی علامہ اقبالؔ یا ایما ویگیناسٹ کی زندگی کا حصہ ہوں۔ مثلاً اسپین میں ڈاکٹر صاحب کا بریف کیس چوری ہو گیا۔ اس واقعے کو ڈاکٹر صاحب نے نہایت ڈرامائی انداز میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے اس بریف کیس کی تلاش کے لیے ہر ممکن کوشش کی، پندرہ سو روپے خرچ کر کے اخبار میں اشتہار دیا، بریف کیس کی کھوج لگانے والے کے لیے چار ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا۔ مگر افسوس اس متاعِ گم گشتہ کا سراغ نہ ملا۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ پوچھیں کہ اس بریف کیس کا علامہ اقبالؔ یا ایما ویگیناسٹ سے کیا تعلق ہے؟ عرض ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا طریق کار یہ ہے کہ وہ دوران تحقیق پیش آنے والے ہر واقعے کو تحقیق ہی کا حصہ سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی تحقیق میں افسانوی انداز پیدا ہو جاتا ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ روکھی پھیکی تحقیق قاری کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی۔

دلچسپ واقعات کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق میں منظر نگاری بھی بہت عمدہ ملتی ہے۔ مثلاً جب وہ ایما ویگیناسٹ کے چچازاد بھائی کی بیٹی پروفیسر کرشن ہوف سے ملنے ہائیڈل برگ جا رہے تھے تو بس کے ذریعے سفر کرتے ہوئے انہوں نے جو کچھ دیکھا، اسے یوں بیان کیا ہے۔ ”بس دریائے نیکر کے کنارے کنارے خراماں خراماں رواں دواں تھی۔ کنارہ دریا پر بوقلموں درخت، خوش رنگ گل بوٹے اور سبزۂ بیگانہ بہار دکھا رہے تھے۔ سورج کی نقرئی کرنیں درختوں سے چھن چھن کر آ رہی تھیں۔ دریا پر وقفہ وقفہ سے قدیم پل بنے تھے۔ فرازِ کوہ پر قلعے کے پُرشکوہ کھنڈر جلوہ آرا تھے اور دریا کے اس پار حسین حویلیاں اور پرانے برج اور گرجے آپس میں گڈمڈ تھے، جبکہ اس پار درختوں اور جھاڑیوں میں گھرے ہوئے قدیم مکان ایستادہ تھے۔“

ڈاکٹر درانی کو فوٹو گرافی سے بھی دلچسپی ہے۔ دوران تحقیق جو اہم عمارت یا فرد نظر آتا وہ اس کی تصویر اتار لیتے۔ یہاں تک کہ انہوں نے پروفیسر کرشن ہوف کے نواسوں کی بھی تصویریں اتاریں کیونکہ اس کا امکان ہے کہ آئندہ چل کر علامہ اقبالؔ کی استانی کے چچازاد بھائی کی بیٹی کے نواسوں پر بھی تحقیق کی ضرورت پڑ جائے۔

ڈاکٹر صاحب کی تحقیق میں گہرائی کا اس سے اندازہ کیجیے کہ علامہ اقبال نے ہائیڈل برگ کے جس مکان میں قیام کیا تھا، اس کے موجودہ مالک سے بھی انہوں نے ملاقات کی اور اس کے مفصل حالات زندگی قلم بند کئے اور یہ بھی بتایا کہ اس مکان کی تینوں منزلوں میں اب کون کون رہتا ہے اور ۱۹۰۷ء سے لے کر اب تک اس مکان میں کس قسم کی تعمیراتی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ مفید اطلاع بھی فراہم کی ہے کہ مالک مکان کے نواسے کی عمر چار برس اور نواسی کی عمر سات برس ہے۔

ایما ویگیناسٹ پر تحقیق کرنے کے لئے ضروری تھا کہ اس کا آبائی قصبہ ہائلی برون بھی دیکھا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس قصبے کی طرف روانہ ہونے سے پہلے کے واقعات یوں بیان فرمائے ہیں۔ ”ہم نے سوچا کیوں نہ جلدی سے دوپہر کا کھانا کھا لیا جائے ورنہ پھر موقع نہ ملے گا چنانچہ ہم ایک اطالوی ریستوران میں پہنچے اور ایک PIZZA (اطالوی خمیری روٹی

جس پر مچھلی کے قتلے، ٹماٹر، پنیر، بڑی سبز مرچیں وغیرہ پک کر اور پگھل کر چپکا ہوتی ہیں) کا آرڈر لیا۔ کیونکہ یہ عموماً غذائے سریع سمجھی جاتی ہے .....۔ ڈاکٹر صاحب نے PIZZA کی جو تشریح کی ہے، اسے پڑھ کر منہ میں پانی بھر آتا ہے اردو میں اتنی لذیذ تحقیق کسی دوسری جگہ نظر نہیں آئی۔

ڈاکٹر صاحب نے ایما ویگیناسٹ کی قبر کی بھی زیارت کی۔ پہلے یہ بتایا کہ قبر پر کس کس رنگ کے پھول کھلے تھے اور پھر یہ لکھا ہے ... "قبر دیکھ کر میرے دل پر عجیب تاثر پیدا ہوا۔ میں اس قبر کے سامنے آنکھیں بند کر کے تا دیر ان کے لئے دعائے مغفرت کرتا رہا اور پرانے دنوں کی یادیں دل میں تازہ کرتا رہا، جب ایما اور اقبال ایک ساتھ تھے اور ایک دوسرے کے بے حد قریب تھے ... مجھے یوں محسوس ہوا گویا اقبال خود اس گھڑی میرے اور ایما کے ساتھ اس گوشۂ خاک پر موجود ہیں اور خوش ہیں کہ سالہا سال کے بعد ان کا ایک قاصد اور ہمراز ان کا پیام شوق لے کر وہاں آیا ہے۔"

یہ بہت اچھی بات ہے کہ علامہ اقبال پر تحقیق کرتے کرتے ڈاکٹر درانی نہ صرف ان کے قاصد بلکہ ہمراز بھی بن گئے۔ افسوس کہ اس موقع پر کوئی فوٹوگرافر موجود نہیں تھا، جو اقبال، ایما اور ڈاکٹر درانی تینوں کی اکٹھی تصویر کھینچ لیتا۔

ڈاکٹر صاحب ایما ویگیناسٹ کا آبائی مکان بھی دیکھنے گئے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اصل مکان کی جگہ ایک نو تعمیر مکان موجود ہے، جس کا ایما سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اس سے نو تعمیر مکان کی اہمیت کم نہیں ہوتی، کیونکہ اس کی بنیادیں اسی زمین میں تھیں، جہاں کبھی ایما کا آبائی مکان تھا۔ اس مکان کے دریچے پر ایک فربہ اندام شخص بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مکان کے ساتھ اس کی تصویر بھی کھینچ لی۔ افسوس کہ ڈاکٹر صاحب نے اس شخص کے حالات نہیں لکھے، کم از کم نام ہی معلوم کر کے لکھ دیتے تو ماہرین اقبالیات کو اس پر تحقیق کرنے میں آسانی ہوتی۔

ایما کے مکان ہی کا نہیں، پورے محلے کا نقشہ بدل چکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے سوچا کہ کوئی ایسی چیز تلاش کی جائے جو ایما کی ہم عصر ہو۔ مذکورہ مکان کے قریب انہیں ایک مین ہول کور (MAN HOLE COVER) نظر آیا۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ پرانے زمانے کی یادگار ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً اس کی تصویر کھینچ لی۔ فرماتے ہیں۔ "میں نے سوچا چلیے اس مدور ڈھکنے ہی کی تصویر لے لی جائے تاکہ کم از کم ایما کے اس مکان میں سکونت کی کسی تو ہم عصر شے کا عکس محفوظ ہو سکے۔"

آخر میں ڈاکٹر صاحب سے گزارش ہے کہ ایک ہمارا بھی مسئلہ حل کر دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب "اقبال یورپ میں" کے دیباچے میں علامہ اقبال کا ایک نادر خط شائع کیا ہے جو انہوں نے اپنے استاد سر طامس آرنلڈ کی بیٹی نینسی کے نام ۱۱ر جنوری ۱۹۱۱ء کو لکھا تھا۔ اس میں علامہ لکھتے ہیں ... "پچھلے کرسمس پر میرے سائیس کی بیوی نے [illegible] رہی ہے۔ وہ ایک عذاب جان ہے، لیکن مجھے اس کی برداشت [illegible] ہے۔"

ہم علامہ کے اس وفادار خادم (سائیس) اور اس کی ننھی سیاہ فام [illegible] کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ [illegible] کے بھی حالات ہوں گے، جس کی خدمت پر مذکورہ سائیس مامور تھا۔ اگر ڈاکٹر صاحب ان تینوں کے بارے میں [illegible] فراہم کر سکیں، تو بے حد کرم ہوگا۔ گھوڑے کا شجرۂ نسب تو ہم مشہور نقاد اور شاعر قمر جلیل سے حاصل کر لیں گے کیونکہ انہوں نے گھوڑوں پر بے شمار نظمیں لکھی ہیں، سائیس کا شجرۂ نسب البتہ ڈاکٹر صاحب ہی کو فراہم کرنا ہوگا۔

—

ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی

ہم نے چھپکلی ماری



ادیبہ کے پیا اُٹھیے، جلدی اُٹھیے، وہ پھر آگئی ہے۔ دروازے سے اندر جھانک رہی ہے اٹھیے نا!! ہم نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ بیگم کی نظریں دروازے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ ہماری طرف دیکھے بغیر ہمارے ہاتھ کو مسلسل جھنجھوڑے جارہی تھیں۔ انھیں یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ ہم نہ صرف بیدار ہوگئے ہیں بلکہ بستر پر اُٹھ بیٹھے ہیں۔ دروازے پر نظریں دوڑانے کے بعد بھی معاملہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا تو ہم بستر سے اچھل کر زمین پر آگئے۔ کیا بات ہے بیگم، آپ اتنی بوکھلائی ہوئی کیوں ہیں؟ بیگم جو مسلسل دروازے کی طرف دیکھے جارہی تھیں۔ بولیں۔

"وہی نگوڑی پھر آگئی ہے۔ دروازے سے اندر جھانک رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کمرے میں داخل ہو اور ہمارا کھانا پینا حرام کردے، خدارا کچھ کیجئے!!" بیگم تھیں کہ لحظہ بہ لحظہ نڈھال ہوتی جارہی تھیں اور ہماری مصیبت یہ تھی کہ معاملے کی ابتدائی "میم" بھی ہماری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ بیگم پھر بڑبڑائیں۔ "دیکھیے دیکھیے اس بے غیرت کو، کس بے نیازی سے آگے بڑھی جارہی ہے۔ اسے روکیے، کہیں اندر نہ گھس آئے ستیاناسی" ہم آنکھیں مل مل کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے مگر نتیجہ وہی "سوالیہ نشان"۔ دروازے کے آس پاس ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ ہم کبھی بیگم کے چہرے پر اچٹتی سی نظر ڈال لیتے، کبھی دروازے پر نظریں جمالیتے۔ بیگم کی حالت غیر ہوتی جارہی تھی، رخساروں پر بکھرے بال، پھٹی پھٹی دہشت زدہ آنکھیں، لرزتی آواز، بوکھلایا ہوا لب و لہجہ۔ ہم نے سوچا خدا نخواستہ بیگم کسی آسیب کی زد میں تو نہیں آگئی ہیں۔ انھوں نے ہمیں پھر جھنجھوڑا۔ "ہونق بنے کیا دیکھ رہے ہیں آپ آگے بڑھ کر اس نگوڑی کی خبر کیوں نہیں لیتے کیا آپ بھی اس چڑیل سے ڈرتے ہیں"۔ بیگم کی باتیں سن کر ہمیں تاؤ آگیا۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، دروازے کے بالکل

قریب پہنچ گئے اور نقادی نظر سے دروازہ اور اس کے آس پاس کی جگہ کا جائزہ لینے لگے - ایک مقام پر جا کر ہماری نظر رک گئی۔ یہ وہی کالی کلوٹی موٹی اور بھدی چھپکلی تھی جو کئی دنوں سے ہماری فیملی کو تنگ کئے ہوئے تھی۔ جب یہ چھت پر ہوتی تو اکثر رسّی کے اس ٹکڑے کو جھولا بنا کر جھولتی جسے ماضی میں منّی کا جھولا بنانے کے لیے لٹکایا گیا تھا۔ ہم اور بیگم پریشان ہو جاتے کہ کم بخت فرش پر سوتے ہوئے بچوں پر نہ گر پڑے - ایسے میں ہماری نیند اڑ جاتی اور ہم ٹکٹکی لگائے اس کے روسی کرتب دیکھا کرتے۔ زیادہ ترنگ میں ہوتی تو سیلنگ فین کے کسی بلیڈ پر براجمان ہو کر "میری گو راونڈ" (MERRY - GO - ROUND) کا حظ اٹھاتی۔ ہر آن یہ اندیشہ رہتا تھا کہ اگر وہ خدانخواستہ اُبلتے ہوئے دودھ یا چائے میں ٹپک پڑی اور یہ چیزیں استعمال میں آگئیں تو "ہم جو ڈوبے ہیں صنم، تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔" والی مثل صادق آجائے گی - کبھی کبھی تو یہ رات میں بے وقت کا راگ الاپنے لگتی - سانپ کی طرح لمبی زبان نکال نکال کر جب نغمہ زن ہوتی تو اس کی آواز سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور سارے بدن میں ہلکی سی کپکپی کا احساس جاگ پڑتا اور ایک عجیب سی بے چینی طبیعت کو مکدّر کرنے لگتی۔ ہم تو خیر کسی طرح برداشت کر لیا کرتے لیکن ایسے موقعوں پر اگر بیگم جاگ رہی ہوں تو ان کا بلڈ پریشر بڑھ جانے کا امکان ہوتا۔

چھپکلی سے بیگم کی آنکھ مچولی کا یہ تیسرا ہفتہ تھا اور بیگم کی برداشت کا پیمانہ چھلکا ہی چاہتا تھا کہ آج سرِشام ہی چھپکلی کمرے کے دروازے کے پاس نظر آگئی اور بیگم نے ہمیں سوتے سے جگا دیا۔ ہم نے بھی یہ سوچ کر کہ چھپکلی بیگم کے حواس پر ایک آسیب کی طرح چھا گئی ہے اسے ختم کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا - ہمارے ایک بزرگ اکثر کہتے رہتے ہیں کہ انسان کو ہر کام طریقے اور منصوبہ بندی کے ساتھ کرنا چاہیئے ۔ ان بزرگ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے ہم نے احتیاط کے طور پر لنگی اور بنیان کی جگہ پوری آستین اور بند گلے کا قمیض اور چست پاجامہ زیب تن کیا ۔ اور جھاڑو لے کر چھپکلی پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ چھپکلی جیسے ہمارا ارادہ بھانپ گئی تھی۔ تیزی سے رینگتی ہوئی دیوار میں لگے آئینے کے پیچھے جا چھپی۔ ہم نے بیگم سے کہا " اپنے آپ کو سنبھالیے اور ہماری مدد کیجئے۔ انشاالله آج اس چھپکلی کی زندگی کا آخری دن ہوگا ۔" ہم نے بیگم کو ہدایت کی ۔

" آپ آئینے کے دائیں طرف ہُش ہُش کیجئے۔ جیسے ہی چھپکلی بائیں طرف نکلے گی ہم جھاڑو کی ایک نپی تلی زوردار ضرب سے چھپکلی کا کام تمام کر دیں گے ۔"

" آپ کو کیسے یقین ہے کہ وہ ہماری ہُش ہُش سن کر باہر نکل آئے گی ؟" بیگم نے حسبِ عادت جرح کی ۔

" آخر آپ کی دُور کی رشتے دار جو ٹھہریں " - ہم نے بیگم کو چھیڑا - لیکن خلاف توقع بیگم نے ہماری بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا - ان کے ذہن پر تو بس چھپکلی سوار تھی اور وہ جلد از جلد اس کا خاتمہ چاہتی تھیں - انھوں نے کہا " جب اس کی آخری رسومات ادا کرنے کا وقت آئے گا تو فیصلہ کر لیں گے کہ وہ کس کی رشتے دار ہے - آپ جھاڑو سنبھالیے۔ میں اِدھر سے ہُش ہُش کرتی ہوں ۔" بیگم کی ہُش ہُش سن کر چھپکلی تیزی سے رینگتی ہوئی آئینے کی بائیں طرف نکلی ادھر ہم نے جھاڑو چھپکلی پر دے ماری - ہمارا وار ذرا سا چوک گیا اس لیے آئینہ چھپاک کی آواز کے ساتھ ٹکڑے

ٹکڑے ہوکر زمین پر آرہا۔ بیگم نے ہمیں قہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔ اور ہم خفت مٹانے کے لیے زمین پر بیٹھے آئینے کے ٹکڑے اور اپنے حواس بٹورنے لگے۔ بیگم برس پڑیں "ہائے اللہ میرے جہیز کا کتنا پیارا آئینہ شہید کردیا۔ دو فٹ کے فاصلے پر کی چھپکلی نہ مار سکے۔ قربان جاؤں آپ کے نشانے پر۔ ہم کو بھی تاؤ آگیا۔ عرض کیا ویسے ہمارا نشانہ اتنا خراب نہیں ہے جتنا آپ سمجھ رہی ہیں۔ ذرا سا چوک گیا، وہ بھی اس لیے کہ بہت دنوں سے نشانہ لگانے کی مشق نہیں رہی ورنہ چھپکلی آپ کے قدموں میں اپنی آخری سانسیں گن رہی ہوتی۔"

"جی ہاں، بس ذرا سا خطا ہوا ہے آپ کا نشانہ۔ صرف ایک فٹ کا فرق پڑ گیا تھا۔ بیگم نے ہاتھ نچاتے ہوئے ہمارا مذاق اڑایا۔ بیگم کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ لڑائی پر کمربستہ ہیں۔ ہم نے بھی مورچہ سنبھال لیا۔" بات دراصل یہ ہے، بیگم۔ کہ ہمارا قریب کا نشانہ ذرا ٹھیک نہیں ہے۔"

"آپ کے منہ سے لفظ "ذرا" سن کر تو میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ آپ کا نشانہ خطا ہوا، آئینے کا ستیاناس ہو گیا۔ آپ نے کہہ دیا "بس ذرا سا چوک گیا نشانہ"

اگر زحمت نہ ہو تو براہ کرم یہ بھی بتا دیجئے کہ آپ کا دور کا نشانہ کتنا اچھا ہے۔ اب تک کتنے شیر چیتے مارے ہیں آپ نے۔"

"سامنے آتے تو مارتے۔ کبھی ہمارے سامنے　　　آنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی ان کی۔"

"جی ہاں، سارے جنگل پر آپ کی دھاک جو جمی ہوئی تھی۔"

"ہم نے ایسا کب کہا؟"

بیگم نے طنز کیا "جی ہاں آپ نے کچھ کہا ہی نہیں تھا۔ یہ تو میں ہی سرپھری ہوں جو خواہ مخواہ آپ سے الجھ رہی ہوں۔"

"بیگم آپ نے تو بات کا بتنگڑ بنا دیا۔"

"اچھا اچھا۔ خدا کے لیے اب بات آگے مت بڑھائیے اور تلاش کیجئے اس نگوڑی چھپکلی کو جو پتہ نہیں کہاں چھپی بیٹھی، آپ کی نشانے بازی پر قہقہے لگا رہی ہے۔

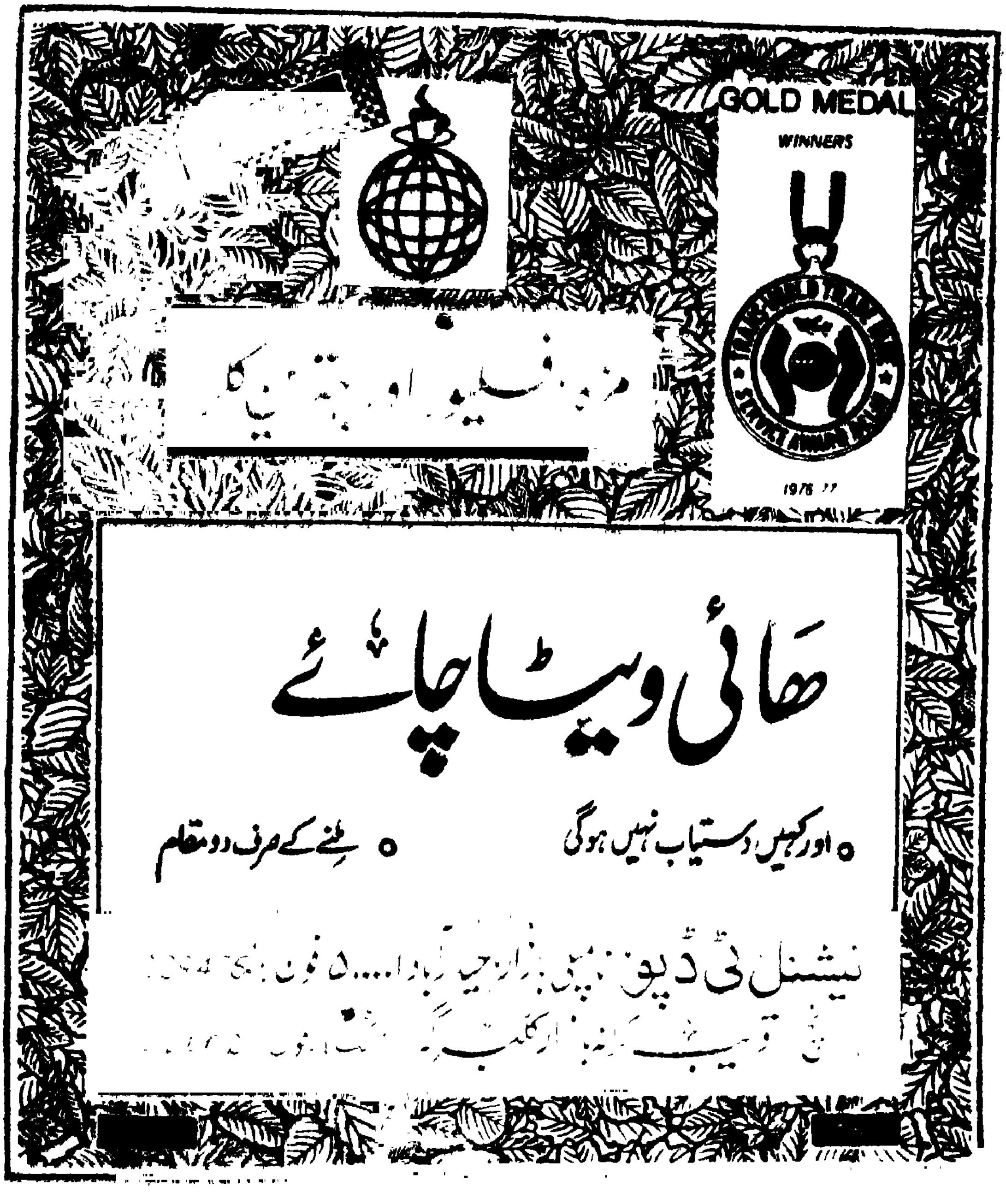
چھپکلی کی تلاش شروع ہوئی۔ گلدان کے اندر۔ الماری کی اوپری منڈیر کے اوپر۔ بجلی کے سوئچ بورڈ کے پیچھے۔ صوفے کے نیچے۔ کمرے کا چپہ چپہ چھان مارا۔ لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دی۔ تھک ہار کر بیگم اور ہم پلنگ پر بیٹھ گئے اور چھپکلی کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگے۔ جھاڑو اب بھی ہمارے ہاتھ میں تھی۔ کمرے کی مشرقی کھڑکی کے پٹ اور فریم کے درمیانی خلا سے دھوپ کی ایک پتلی سی لکیر کمرے کے فرش پر پڑ رہی تھی۔ ہماری نظر اس پر پڑی تو لگا اس لکیر میں ایک مخصوص مقام پر کسی چیز کا چھوٹا سا گول سایہ پڑ رہا ہے۔ غور سے دیکھا تو سمجھ میں آیا کہ وہ چھپکلی کا سر ہے۔ جو کھڑکی کے فریم کے باہری حصے میں چھپی بیٹھی ہے۔ ہم نے بیگم کو فرش پر دیکھنے کا اشارہ کیا۔ بیگم کو جیسے ہی روشنی کی لکیر میں چھپکلی کے سر کا سایہ حرکت کرتا دکھائی دیا وہ اچھل پڑیں۔ ہم نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی "بیگم کھڑکی کے باہر سے باریک تاروں والی جالی لگی ہوئی ہے۔ آپ کمرے کے

باہر جاکر جالی پہ ہاتھ مارنے۔ جالی میں ارتعاش ہونے پر چھپکلی جیسے ہی فریم کے اوپری حصے سے گزر کر اوپر کی طرف رینگنے کی کوشش کرے گی ۔ ہم عین اس وقت جب چھپکلی کا نصف جسم فریم کے اندر اور نصف فریم کی لکڑی کے اوپری حصے پر ہوگا ۔ کھڑکی کا پٹ زور سے بند کر دیں گے تو وہ کھڑکی کی زد میں آجائے گی اور اس کا خاتمہ ہو جائے گا" بیگم نے ہماری ہدایت پر من و عن عمل کیا اور چھپکلی جیسے ہی مطلوبہ پوزیشن میں آئی ہم نے پوری پھرتی اور طاقت سے کھڑکی کا پٹ بند کر دیا ۔ ایک چھپاک کی آواز......... اور کھڑکی کے شیشے کے چھوٹے بڑے ٹکڑے فرش پر آرہے اور چھپکلی؛ وہ تیزی سے رینگتی ہوئی دائیں طرف کی دیوار کے بیچوں بیچ جا پہنچی۔ اس حملے کی ناکامی پر ہم آپے سے باہر ہوگئے اور کھڑکی سے ٹوٹے ہوئے شیشے کی قطعی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہم نے پوری طاقت سے جھاڑو کا ایک زوردار وار چھپکلی پر کیا ۔ نتیجتاً چکرا کر گر گئے اور گرتے گرتے بیگم کو بھی لے گرے ۔ زمین پر گرنے کے بعد ہم دونوں کے سر ٹکرا گئے اور بیگم نے " ہائے اللہ مری" کہہ کر سر پکڑ لیا۔ ہمیں بھی چکر سا آگیا تھا ۔ حواس درست ہوئے تو معاملہ سمجھ میں آگیا۔ جس وقت ہم نے جھاڑو کا زوردار وار چھپکلی پر کیا تھا اس وقت سیلنگ فین چل رہا تھا ۔ ہمارا جھاڑو پنکھے کی بلیڈوں کی زد میں آگیا اور ہم ایک جھٹکے کے ساتھ چکرا کر نیچے گر پڑے ۔ بیگم بھی ہماری زد میں آگئیں اور وہ بھی فرش پر آرہیں۔ وہ تو خیر ہوئی کہ بیگم ہمارے اوپر نہیں آپڑیں ورنہ ہمارے لینے کے دینے پڑ جاتے کیونکہ صحت کے معاملے میں بیگم ٹن ٹن سے کسی طرح کم نہیں ۔ ہم دونوں کراہتے ہوئے اٹھ بیٹھے تو بیگم نے ہماری طرف دیکھا اور بے اختیار ہنس پڑیں ۔ بیگم کے اس طرح ہنسنے کی وجہ ہم سمجھ نہیں پائے تھے اس لیے ہونق بنے انھیں دیکھنے لگے ۔ ہنستے ہنستے بیگم نے ہمارے جھاڑو والے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا اور ہم بھی بے اختیار ہنسنے لگے ۔ پنکھے کے بلیڈ کی ضرب لگنے پر جھاڑو کا بالائی حصہ کٹ کر کمرے کے ایک کونے میں جا پڑا تھا اور نصف حصہ یعنی جھاڑو کا مٹھا ہمارے ہاتھ میں رہ گیا تھا ۔

ہم نے اپنی بیٹی ادیبہ کو آواز دے کر دوسرا جھاڑو منگایا ۔ اس دوران چھپکلی اپنی جگہ پر جمی رہی ۔ ہم نے دوسری جھاڑو سے ایک زوردار وار چھپکلی پر کیا وار چھپکلی پر پڑا بھی لیکن یہ دیکھ کر ہم حیرت زدہ رہ گئے کہ چھپکلی نہ تو فرش پر گری تھی اور نہ دیوار پر کہیں نظر آرہی تھی ۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ یکایک کہاں غائب ہوگئی؛ اسے دیوار کھا گئی تھی یا چھت نگل گئی تھی ۔ ہم نے غصے سے جھاڑو کو کمرے کے کونے میں پھینک دیا ۔
چھپکلی کی تلاش دوبارہ شروع ہوئی ۔ کمرے کا کونہ کونہ دیکھ لیا گیا لیکن چھپکلی ندارد ۔ تھک ہار کر ہم فرش پہ بیٹھ گئے اور بیگم سے پانی مانگا ۔ پانی پی چکے تو بیگم بولیں ۔
" ایک معمولی سی چھپکلی نے شیخ صاحب کو پانی پلا دیا" ہم نے بیگم کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھ کر کہا ۔
"بے شک ایک چھپکلی ہی نے ہمیں پانی پلایا ہے"
" کیا کہا آپ نے ؟ بیگم بات آگے بڑھانا چاہتی تھیں کہ ہم نے لپک کر ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ۔ وہ کسمسانے لگیں تو ہم نے فرش پر پڑے ہوئے جھاڑو کی طرف اشارہ کیا ان کی آنکھیں یہ دیکھ کر حیرت سے پھیل گئیں کہ مطلوبہ چھپکلی کونے میں پڑی ہوئی جھاڑو کی تیلیوں کے بیچ براجمان ہے ۔ اس کے بعد ہم نے بیگم کے منہ سے ہاتھ

ہٹا دیا اور اپنا بھاری بھرکم جوتا بہت تاک کر چھپکلی پر دے مارا۔ اس مرتبہ چھپکلی اپنا بچاؤ نہ کر سکی اور ایک لوٹ پوٹ کر ساکت ہو گئی۔ بیگم نے اطمینان کی سانس لے کر کہا "چلئے آخرکار چھپکلی بیچاری کو آپ کی بہادری پر ترس آ ہی گیا" اور قہقہہ [illegible] لگیں۔ بیگم کے اس فقرے پر ہم بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

بیگم نے کمرے میں جھاڑو لگائی اور کچرے سمیت چھپکلی کو بھی جھاڑ دیا۔ ادیبہ جب کچرا اور چھپکلی کچرا دان میں ڈالنے کے لئے چلی تو ہم بھی اس کے ساتھ ہو لئے کہ کہیں چھپکلی سے ڈر نہ جائے۔ وہاں سے ہم باتھ روم میں گئے تو ادیبہ [illegible] اپنی والدہ کے پاس جا پہنچی اور کہنے لگی "ممی ممی وہ چھپکلی تو زندہ تھی۔ جیسے ہی میں کچرا کوڑے دان میں پھینکا وہ [illegible]" اس کے [illegible] وہ کچھ نہ کہہ سکی کیونکہ اس نے ہمیں باتھ روم سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا


GOLD MEDAL
WINNERS
ھائی ویٹا چائے
○ اور کہیں دستیاب نہیں ہوگی
○ ملنے کے صرف دو مقام
نیشنل ٹی ڈپو

تبصرہ ——— مبصر : رشید الدین

مزاحیہ تقاریر و مضامینِ مرزا شکور بیگ

مرزا شکور بیگ اردو کے سینیر ترین مزاحیہ شاعر ہیں۔ وہ مخدوم محی الدین، مرزا ظفر الحسن، میر حسن، اشفاق حسین اور سکندر علی وجد کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب حیدرآباد میں اردو کا ہر مشاعرہ ان کے بغیر نامکمل سمجھا جاتا تھا لیکن ادھر ایک عرصے سے انھوں نے مشاعرے پڑھنا چھوڑ دیا ہے اس لیے شاید اردو کی نئی نسل ان کے نام سے بھی واقف نہ ہو لیکن جو انھیں جانتے ہیں ان کی صلاحیتوں سے خوب واقف ہیں۔

مرزا شکور بیگ بہت باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں۔ اپنے زمانے میں وہ اپنے دوستوں میں بے حد مقبول تھے اور ان کے لطیفے اور چٹکلے زبان زدِ خاص و عام تھے۔ مرزا ظفر الحسن مرحوم نے اپنی تصنیف "ذکرِ یار چلے" میں ان کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ویسے وہ زندہ دل آج بھی ہیں۔ لیکن اب ان کا رنگ ادبی سے زیادہ مذہبی ہو گیا ہے۔ عمر کے ۸۲ ویں سال میں ہیں۔ صوم و صلوٰۃ کے سخت پابند ہو گئے ہیں اور کئی حج کر چکے ہیں اور کئی بار زیارتِ نبوی سے سرفراز ہو چکے ہیں۔

شخصی طور پر میں مرزا شکور بیگ صاحب کو نہیں جانتا۔ ان کی ذات سے میری نسبت صرف اتنی ہے کہ ان کے بڑے فرزند مرزا مظفر بیگ (جو مستقلاً لندن میں مقیم ہو چکے ہیں) برسوں میرے ساتھ محکمۂ ترجمہ میں کام کرتے رہے۔ ویسے بطور شاعر اور بطور سیاسی لیڈر میں ان سے خوب واقف ہوں۔ یہ بات میں بتانا ہی بھول گیا کہ مرزا شکور بیگ کسی زمانہ میں سرگرم سیاسی قائد رہ چکے ہیں اور دو بار ورنگل سے کانگریس کے ٹکٹ اسمبلی بھی رہ چکے ہیں۔ ان کا تعلق حیدرآباد کے ایک معزز خاندان سے ہے۔ نسلاً وہ مغل ہیں۔

مرزا شکور بیگ کی مزاحیہ شاعری کے اب تک دو مجموعے چھپ چکے ہیں "ترانے" ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے کئی سال بعد انھوں نے اپنا دوسرا مجموعہ "سدا بہار" کے نام سے شائع کیا بلکہ مرزا صاحب کے الفاظ میں "دوستوں نے چھپوا دیا" شاعری میں یہی دو چیزیں ان کی یادگار ہیں۔ اب تو ایک عرصے سے شعر کہنا چھوڑ رکھا ہے۔ خود ہی فرماتے ہیں کہ:

وہ بھی کیا زمانہ تھا ہر لحاظ سے فٹ تھے
آج کل یہ حالت ہے چول چول ڈھیلی ہے

مرزا صاحب کی شاعری کا اپنا ایک مخصوص رنگ ہے۔ ان کے اشعار سیدھے سادے اور مزاح سے بھرپور ہوتے ہیں۔ سہل ممتنع میں ہوتے ہیں اس لیے سننے والے کو فوری یاد ہو جاتے ہیں۔ ایک اچھے شعر کی یہی تعریف کی گئی ہے کہ وہ فوراً یاد ہو جائے۔ چند شعر مثالاً دیکھیے :

ممکن نہ ہو تو وصل کا وعدہ نہ کیجیے
ہم ناپتے رہیں کہیں ایسا نہ کیجیے

دل لگایا تھا چیلنج کی خاطر
دل لگی دل لگی میں دم نکلا

بے سبب انسلٹ کر کے یار نے ساری کہا
اپنی تھوڑی سی جو عزت تھی گئی ساری کے ساتھ

ان کے چوتے بہت مشہور ہیں ۔ چند ایک سے آپ بھی لطف اٹھائیے :

وہ اپنے ڈاگ کو بے حد عزیز رکھتے ہیں
تھپکتے ہیں کبھی گودی میں اس کو لیتے ہیں
وہ بھونکنے کی بھی زحمت اٹھا نہ چاہے اگر
تو اس کو روک کر یہ خود ہی بھونک لیتے ہیں

عشق میں سختیاں بھی جھیلی ہیں ۔ کچھ نہ کچھ ہم نے نیکیاں کی ہیں
گالیاں کھا کے اس لیے خوش ہیں اس نے اردو میں گالیاں دی ہیں

غریبوں کا دکھ اور غلامی کا غم ہے ۔ جبھی تو تقاضائے مئے دم بدم ہے
پلا ساقیا ! انقلاب آ رہا ہے ۔ سحر ہونے والی ہے اور وقت کم ہے

یہ تو تھا بطورِ شاعر مرزا شکور بیگ کا تذکرہ ۔ لیکن خوشی کی بات ہے کہ ۱۹۸۹ء کے جاتے جاتے انھوں نے اپنا شمار مزاحیہ نثر نگاروں میں بھی کرا لیا ہے ۔ پچھلے نومبر میں ان کی نثری تصنیف " مزاحیہ تقاریر و مضامین مرزا شکور بیگ " شائع ہوئی ہے ۔ یہ ڈیمائی سائز کے ۱۴۳ صفحات پر مشتمل ہے ۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں کچھ مزاحیہ تقریریں شائع ہوئی ہیں جو آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہو چکی ہیں ۔ نثری تقاریر کی تعداد چھ ہے جب کہ مضامین نو ہیں ۔ اس طرح جملہ چودہ چیزیں آپ کو پڑھنے کو ملتی ہیں ۔ اگر ان کے دیباچے " بے تکی باتیں " کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ تعداد (۱۵) ہو جاتی ہے ۔ " بے تکی باتیں " بھی خاصے کی چیز ہے ۔ دیکھیے کیا شان دار ابتدا ہے :

" آنکھیں دیکھتے دیکھتے تھک گئی ہیں ۔ آرام چاہتی ہیں ۔ کان سننے سے انکار کر رہے ہیں ۔ حافظہ کا یہ حال ہے کہ پڑھنے کی عینک ڈھونڈ رہے ہیں اور وہ آنکھوں پر لگی ہے ۔ تحریر میں یہ

ندرت ہو گئی ہے کہ اپنا لکھا آپ نہیں پڑھ سکتے۔ حیرت ہے ضعیفی نے ہلّہ بول دیا ہے حالاں کہ عمر صرف ۸۲ سال ہے۔"

نثر میں بھی مرزا صاحب کا اسٹائیل وہی ہے جو نظم میں ہے یعنی آسان اور عام فہم تحریر میں رواں کے ساتھ مزاح کی چاشنی بھی ہے۔ بیشتر مضامین پڑھتے ہوئے آپ بور نہیں ہوتے۔ مجھے ان کی مزاحیہ نثری تقاریر سے زیادہ مضامین اچھے لگے۔ کیوں کہ تقاریر تو ظاہر ہے انھیں زبردستی لکھنی پڑی تھیں۔ لیکن مضامین خود انھوں نے اپنے طور پر لکھے اس لیے ان میں زیادہ بے ساختگی اور مزاح ہے۔ موضوعات نئے نہیں ہیں لیکن پڑھنے میں مزہ دے جاتے ہیں۔ بیوی سے نوک جھونک اکثر مضامین میں ملتی ہے ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"بہر حال اب آخری امتحان اور باقی تھا کہ قد ناپا جائے۔ ہم نے کہا کہ براہ کرم آپ کھڑی ہو جائیں۔ چناں چہ وہ کھڑی ہوئیں۔ ہم ان کے بازو کھڑے ہو گئے۔ ہمارا قد ذرا ان سے اونچا نکلا۔ ہم خوش ہو گئے۔ انھوں نے دل میں کہا ہو گا کہ قد کے بڑے ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ عقل بڑی ہونی چاہیے۔"

جیسا کہ مذکورالصدر اقتباس سے ظاہر ہے ان کا اسٹائیل روایتی ہے۔ کتاب کا کوئی اچھا سا نام رکھا جا سکتا تھا مثلاً ایک مضمون کتاب کے اندر "قد کا تعلق" ہے۔ اسی کو کتاب کا عنوان بنایا جا سکتا تھا۔ یہ کتاب جیسا کہ مصنف نے بتایا ہے محمد منظور احمد کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے محمد منظور احمد صاحب ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان کی وجہ سے مرزا شکور بیگ کے یہ مضامین اور نثری تقریریں زیور طبع سے آراستہ ہو سکیں ورنہ ایک بزرگ ادیب کی اتنی اچھی تحریریں منظر عام پر ہی نہ آسکتیں اور دھری کی دھری رہ جاتیں۔

کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی ہے اس لحاظ سے ۲۵ روپے قیمت کچھ زیادہ نہیں لگتی۔ ماہنامہ "شگوفہ" کے توسط سے منگوائی جا سکتی ہے۔

پھر ملیں گے اگر خدا لایا! (اداریہ)

قارئین شگوفہ کی خدمت میں نئے سال کی مبارک باد۔ اس موقع پر شگوفہ کا سالنامہ پیش ہے۔ ہمیشہ کی طرح اس شمارے میں ہم نے تمام نامور طنز و مزاح نگاروں کو یکجا کیا ہے۔ بعض تخلیقات وقت کی کمی کی وجہ سے شامل نہیں کی جا سکیں۔ جس کا ہمیں افسوس ہے۔ گزشتہ سال ہم نے اعلان کیا تھا کہ شگوفہ کا بیس سالہ انتخاب بہت جلد شائع ہو گا جس کے مہمان مدیر جناب یس اے قدوس ہوں گے۔ لیکن اشاعت کے کام میں تاخیر ہو گئی۔ اب ہم اپنے قارئین کو یقین دلاتے ہیں کہ ۲۲ سالہ انتخاب آئندہ تین چار مہینوں میں شائع ہو گا۔

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد ۲۳ ــــــ شمارہ ۲

فبروری ۱۹۹۰ء

فی پرچہ: ۵ روپے

زرِ سالانہ: ۵۵ روپے لائبریریوں سے: ۶۰ روپے

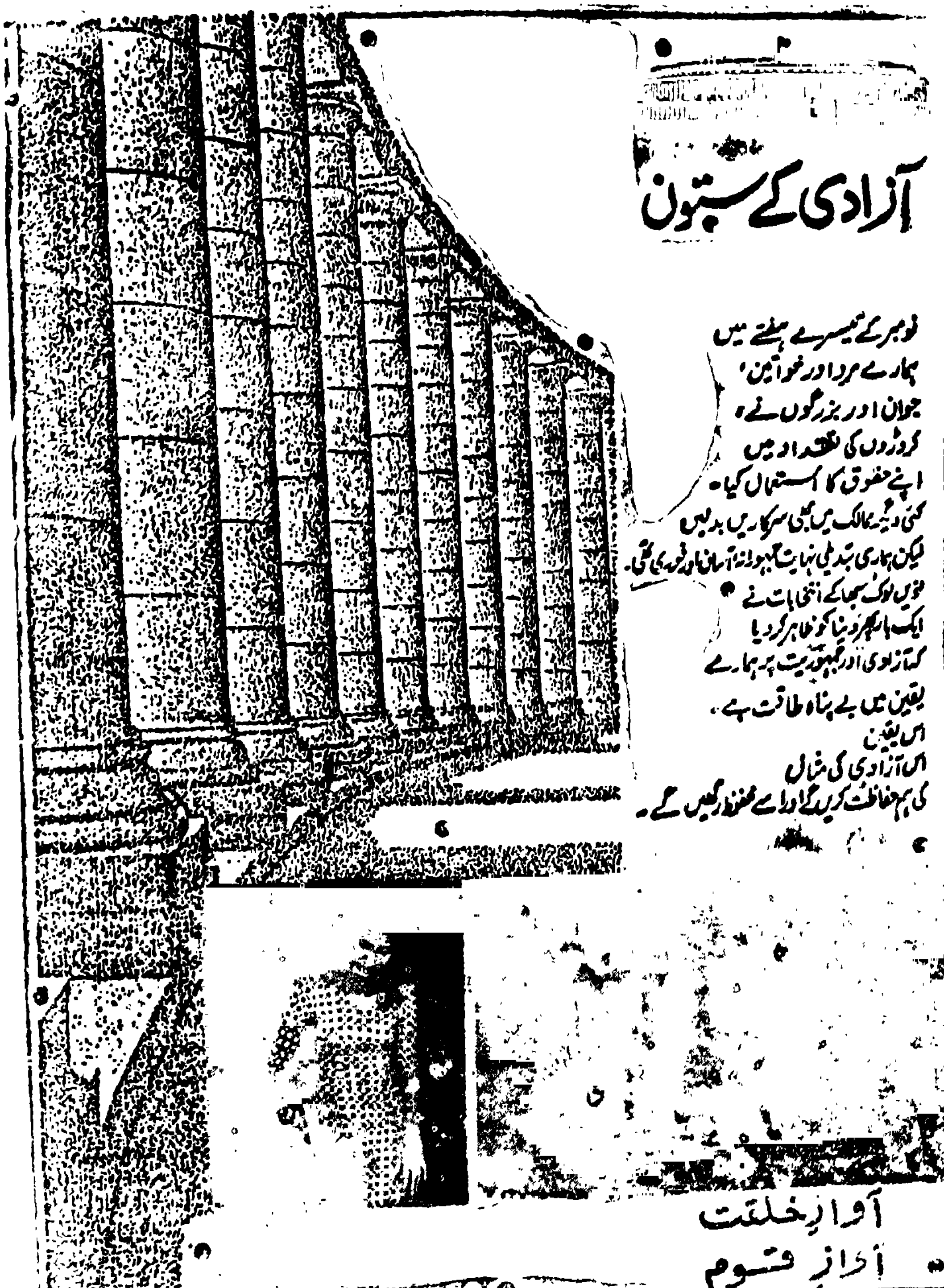
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان حیدرآباد ـ ۲

ترسیلِ زر و خط و کتابت کا پتہ:

شگوفہ، ۳۱۱، بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

فون: 557716 رہائش: 521064

اِس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)


آزادی کے ستون
نومبر کے تیسرے ہفتے میں
ہمارے مرد اور خواتین،
جوان اور بزرگوں نے،
کروڑوں کی تعداد میں
اپنے حقوق کا استعمال کیا۔
کئی دیگر ممالک میں بھی سرکاریں بدلیں
لیکن ہماری تبدیلی نہایت ہموار، آسان اور فوری تھی۔
ہمیں لوک سبھا کے انتخابات نے
ایک بار پھر دنیا کو ظاہر کر دیا
کہ آزادی اور جمہوریت پر ہمارے
یقین میں بے پناہ طاقت ہے۔
اس یقین
اس آزادی کی مثال
کی ہم حفاظت کریں گے اور اسے محفوظ رکھیں گے۔
آوازِ خلقت
آوازِ قوم
davp 89/969

جدّہ میں جشنِ مزاح

مجتبیٰ حسین کا خطبۂ صدارت

(۲۱ رڈسمبر ۱۹۸۹ء کو جدّہ میں منعقدہ ہند پاک جشنِ مزاح میں پڑھا گیا)

معزز خواتین و حضرات!

سب سے پہلے تو میں "بزم اردو جدہ" کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ ان کی عنایت سے آج اس محفل میں مجھے خواہ مخواہ ہی کسی نا معقول شخص کو نہایت احترام کے ساتھ "جناب صدر، جناب صدر کہہ کر مخاطب نہیں کرنا پڑ رہا ہے کیوں کہ اتفاق سے یہ نا معقول شخص میں خود ہوں جو لوگ کہنے اور ہونے کے نازک فرق کو جانتے ہیں وہ اس نکتہ سے بخوبی واقف ہیں کہ جب تک کسی شئے کے ہونے کی بشارت نہ دی جائے تب تک وہ نہیں ہو سکتی۔

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

کارکنان بزم اردو جدہ کی یہ جدت نہیں تو اور کیا ہے کہ انھوں نے مجھ نا چیز کو بیک وقت تین محفلوں کا اکلوتا صدر مقرر کر دیا ہے۔ یعنی ادبی اجلاس، محفل لطیفہ گوئی اور محفل غزل کا مشترکہ صدر —— تاہم صدارت کے معاملہ میں عہدیداران بزم اردو جدہ کی اس فراخدلی کے باوجود مجھے ان سے کوتاہ دلی کی شکایت ہے۔ کوتاہ دلی ان معنوں میں کہ شرعاً میں بیک وقت چار صدارتوں کا بھی مستحق ہو سکتا تھا بھلے ہی میں متحمل نہ ہو سکوں۔ شرع کے معاملہ میں ہم بہت سی باتوں کے متحمل نہیں ہوتے لیکن مستحق ہونے کا دعویٰ تو ضرور کرتے ہیں۔

پتہ نہیں منتظمین کو کیا سوجھی کہ انھوں نے مجھے بیک وقت تین محفلوں کا صدر بنا دیا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ ہے کہ ہمارے ملک میں مشرق وسطیٰ کے کسی ملک سے جب بھی کوئی آتا ہے تو ہم اس کے ہاتھوں میں "ٹو ان ون" اور "تھری ان ون" کو ضرور تلاش کرتے ہیں۔ میں بھی شاید "تھری ان ون" قسم کا صدر ہوں۔ ایک ایسا ہمہ مقصدی اور ہمہ جہتی صدر جس کی صدارت کے آخری دور میں صدارت کی سنگت طبلہ اور ہارمونیم پر بھی کی جائے گی۔ وطن مالوف میں ہم تو یہ سنتے آئے ہیں کہ سعودی عرب وافر مال و متاع اور [illegible] و تفریط کے لیے مشہور ہے۔ جہاں ایک بوند درکار ہو وہاں دریا بھی بہا دیئے جاتے ہیں لیکن صدور کے معاملہ میں اس قلت کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ ماشاء اللہ اپنے وطن میں تو صدور کی اتنی بہتات ہوتی ہے کہ ایک ایک محفل کی صدارت کے لیے دس دس صدر آس لگائے کھڑے رہتے ہیں۔ صدور کی اس کثرت کا نتیجہ ہے کہ کتے کے پتھر مارنے جاؤ تو وہ صدر کے لگ جاتا ہے۔ بعض جلیل القدر صدر تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو جلسوں کی صدارت کرنے کی چاٹ میں جلسہ کے آغاز سے پہلے لوگوں سے

نظریں بچاکر جلسہ گاہ میں جھاڑو لگانے اور جلسہ کے اختتام کے بعد دریاں اور کرسیاں تک اٹھانے کے لیے آمادہ رہتے ہیں۔ اس پر مستزاد منتظمین جلسہ کو یہ بیش بہا عطیات سے بھی نوازتے ہیں۔ افراتفری کے اس ماحول میں آپ نے مجھ کمترین کو صدق دل کے ساتھ تین محفلوں کا اکلوتا صدر بنا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ بعض صورتوں میں داڑھی سے مونچھیں بھی بڑی ہو سکتی ہیں۔

حضرات! میں یہ عرض کرتا چلوں کہ اپنے وطن میں، میں نے جلسوں کی صدارت سے اُس دن توبہ کر لی ہے جب ایک جلسہ کے صدر کی حیثیت سے میں نے منتظمین کو تاکید کی تھی کہ وہ صدر جلسہ کو دس عدد ہار پہنائیں۔ حتیٰ کہ منتظمین کو ہاروں کی رائج الوقت قیمت کے مطابق پیشگی رقم تک دے دی تھی لیکن افسوس کہ منتظمین جلسہ کو ایک ہار تک پہنانے کی توفیق عطا نہیں ہوئی۔ اُس دن میری گردن ہاروں کے . . . بوجھ سے نہیں بلکہ شرم سے جھک گئی اور اب تک جھکی ہوئی ہے۔ ملکی منتظمین جلسہ پر سے میرا اعتماد اب اٹھ سا گیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض جلسوں کے منتظمین نے بعد میں میرا اعتماد پھر سے بحال کرنے کی خاطر یہ انمول تجویز بھی پیش کی کہ میں انھیں ہاروں کی پیشگی رقم دینے کی بجائے رقم کی ادائیگی کا یہ اصول مقرر کروں کہ ادھر ڈائس پر ایک ہار میری گردن میں پڑے اور میں ہار پہنانے والے سے مصافحہ کرنے کے بہانے چپکے سے اُس کے ہاتھ میں ہار کی قیمت رکھتا چلا جاؤں۔

ے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

اب آپ سے کیا چھپانا کہ اس تجویز پر بھی عمل کر کے دیکھ لیا۔ جلسہ کی صدارت تو نہ ہو سکی البتہ پہلے ہی ہار کی قیمت کے مسئلہ پر بھرے مجمع کے سامنے ہم میں اور منتظمین میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ بھاؤ تاؤ کرنے کی بہت کوشش کی۔ سودا طے نہیں پا سکا تو ہم دو روپیے کا ایک ہار دس روپے میں پہن کر غصہ سے ڈائس سے اتر آئے۔ ے

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

ہم سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن گھاٹے کا سودا نہیں کر سکتے۔

حضرات! ہم صدر جلسہ کے فرائض سے بخوبی واقف ہیں۔ صدر جلسہ کا ایک فرض تو یہ ہوتا ہے کہ وہ جلسہ کی کاروائی اور اس کے انعقاد کی غرض و غایت کو جانے بغیر گھنٹوں کرسی صدارت پر بیٹھ سکے۔ ایک منزل تو وہ بھی آتی ہے جب یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ صدر کہاں سے شروع ہو رہا ہے اور کرسی صدارت کہاں پر ختم ہو رہی ہے۔ صدر اور کرسی دونوں یک جان دو قالب بن جاتے ہیں۔ ہمیں اس وقت اس معصوم بچے کی یاد آ رہی ہے جو اپنے باپ کے ساتھ ایک جلسہ میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ اُس نے لگاتار کئی گھنٹوں تک کرسی صدارت پر بیٹھے ہوئے جامد و ساکت صدر جلسہ کو بغور دیکھنے کے بعد اپنے باپ سے بصد اشتیاق پوچھا تھا۔ " ڈیڈی! کیا صدر جلسہ کی چھ ٹانگیں ہوتی ہیں"؟

اس پر باپ نے اس معصوم کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے سمجھایا تھا۔ " نہیں بیٹا! ان چھ ٹانگوں میں سے دو ٹانگیں تو صدر جلسہ کی ہیں اور باقی چار ٹانگیں کرسی صدارت کی ہیں۔ جب جلسہ ختم ہو گا تو تم دیکھو گے کہ دو ٹانگیں تو صدر جلسہ کے ساتھ چلی جائیں گی اور باقیماندہ ٹانگیں کرسی صدارت میں ہی لگی رہیں گی۔ صدر چاہے کتنا ہی معذور اور

ملوج کیوں نہ ہو چل سکتا ہے لیکن کرسی صدارت نہیں چل سکتی ۔

حضرات : ۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ صدر محفل چاہے کتنا ہی جاہل کیوں نہ ہو اُسے اپنے خطبہ صدارت میں دو چار ایسی سنجیدہ باتیں ضرور کہنی پڑتی ہیں جن پر کوئی عمل نہ کر سکے۔ اس رعایت سے مجھے بھی کچھ سنجیدہ باتوں کے کہنے کا حق حاصل ہے ۔ بزم اُردو جدہ کی سرگرمیوں سے میں اچھی طرح واقف ہوں ۔ دیارِ غیر میں رہتے ہوئے آپ اُردو کے لیے وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو اصولاً ہمیں کرنا چاہیئے ۔ سچ تو یہ ہے کہ اس طرح کے کاموں کے لیے استطاعت اور توفیق دونوں نہایت ضروری ہیں اور اپنے ملک میں یہ حال ہے کہ جس کے پاس استطاعت ہے اُسے توفیق نہیں عطا ہوتی اور جسے توفیق عطا ہوتی ہے اُس کے پاس استطاعت نہیں ہوتی ۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ استطاعت اور توفیق دونوں کی دولت سے مالا مال ہیں ۔ بزم اُردو جدہ نے برصغیر ہندو پاک کے طنزو مزاح نگاروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے ایک ایسا نیک کام انجام دیا ہے جو اس کے کئی نیک کاموں سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ افضل بھی ہے ۔ بزم اُردو جدہ نے پچھلے ہفتہ جو مزاحیہ مشاعرہ برپا کیا تھا ویسا مشاعرہ میں نے اپنی تیس سالہ دبی زندگی میں کبھی نہ دیکھا اور نہ سُنا ۔ برصغیر کے سارے بڑے بڑے اور اہم شاعر اس مزاحیہ مشاعرہ میں جمع تھے شاعروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا ایسا ہی ہے جیسے مینڈکوں کو ایک پنسیری میں پکڑنا ۔ یہ سارے شاعر آ کر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوتے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ مینڈکوں نے اب اپنی فطرت بدل لی ہے بلکہ سارا کمال بزم اردو جدہ کی پنسیری کا ہے جس کے دامن میں ہر کوئی کھنچا چلا آتا ہے ۔

اُردو کے ایک ادنیٰ مزاح نگار کی حیثیت سے یہ میرا راسخ عقیدہ ہے کہ جب تک ہر انسان کو اُس کے حصہ کی سبھی خوشیاں اور مسرتیں نہیں مل جاتیں تب تک اس دھرتی پر دائمی امن قایم نہیں ہو سکتا ۔ قدیم وحشی انسان کے ہنسنے سے لے کر آج کے انسان کے قہقہے تک تہذیب نے ایک لمبا سفر طے کیا ہے ۔ لیکن جدید معاشرہ کے تضادات اور کشمکش نے مہذب انسان کے قہقہے کے اصلی روپ کو بدلنا شروع کر دیا ہے ۔ ہمیں جہاں رونا چاہیئے وہاں ہنس دیتے ہیں اور جہاں ہنسنا چاہیئے وہاں رو دیتے ہیں ۔ اہمیت صرف ہنسی کی نہیں ہے بلکہ اس بات کی ہے کہ کب ہنسا جائے ، کیسے ہنسا جائے ، کتنا ہنسا جائے اور کس پر ہنسا جائے ۔ ہمارا معاشرہ دن بدن کچھ اتنا تیز رفتار اور پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے کہ ہم اپنی زندگی کی خوشگواریوں ، لطافتوں اور نزاکتوں کو فراموش کرتے چلے جا رہے ہیں ۔ پرسوں میں نے ایک دوست کو ایک لطیفہ سنایا تو اُس نے لطیفہ پر ہنسنے کی بجائے اپنی گھڑی دیکھی اور بولا ۔ " اس وقت میں بہت جلدی میں ہوں ۔ تمہارے لطیفے کے ساتھ انصاف نہیں کر سکوں گا ۔ اگر تم اجازت دو تو میں اس لطیفہ پر گھر جا کر ذرا اطمینان قلب کے ساتھ ہنسنے کی کوشش کروں گا ۔

حضرات ! میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب تک ہمیں تہذیب اور مخلص انسان کے قہقہے کی بازیافت نہیں ہو جاتی تب تک یہی ہوتا رہے گا ۔ اس [illegible] مزاح نگار بہت کچھ کر سکتے [illegible] ظرافت نگاری کے لیے آدمی کا ظریف [illegible] کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کا باظرف [illegible] نہایت ضروری ہوتا [illegible] خوشی اس بات [illegible] ہے کہ طنز و مزاح کی محفل اس ارض مقدس پر [illegible] ہے جہاں چودہ سو برس پہلے [illegible] انسانیت ایک نئی تہذیب اور ایک نئی

روشنی سے آشنا ہوئی تھی ۔ اس روشنی نے انسانیت کو جینے کا ایک نیا سلیقہ اور نیا آہنگ عطا کیا تھا تہذیب ہی انسانی کو ہنسنے کا سلیقہ سکھاتی ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کائنات میں انسان ہی وہ واحد مخلوق ہے جسے خدا نے ہنسی کی دولت عطا کی ہے (فرشتے تک اس بیش بہا دولت سے محروم ہیں) اس بات سے بھی ہنسی کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے ۔

سب سے آخر میں بزم اُردو جدہ کے کارکنان کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کے وسیلے سے مجھے ارضِ مقدس پر حاضر ہونے کی سعادت نصیب ہو سکی ۔ ڈاکٹر شمس بابر صدر بزم اردو جدہ کے نام اور کام سے میں بہت پہلے سے واقف تھا ۔ ان سے ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی ان کی سرگرمیوں کے حساب سے تو میں انھیں ادب اور فلسفہ وغیرہ کا ڈاکٹر سمجھتا تھا ۔ یہاں آکر پتہ چلا کہ سچ مچ بیماریوں اور دوائیوں والے ڈاکٹر ہیں سچ تو یہ ہے کہ جو ڈاکٹر اُردو زبان میں اور اس زبان کے ذریعہ مریضوں کا علاج کرتا ہے اُس کے پاس نہ جانے کیوں بار بار جانے کو جی چاہتا ہے چاہے آپ صحت مند ہی کیوں نہ ہوں ۔ اب آپ سے کیا چھپانا کہ وطن مالوف میں ہمارے ایک دوست ہیں ڈاکٹر رام پرشاد خالص اور ٹھیٹ اُردو میں علاج کرتے ہیں ۔ جب وہ اپنے میٹھے لہجے کے ساتھ خالص اُردو میں پرسشِ احوال کرتے ہیں تو ساری بیماریوں کے آثار بدن سے یکسر غائب ہو جاتے ہیں ۔ بارہا مجھے احساس ہوتا ہے کہ میرا بلڈ پریشر کافی بڑھا ہوا ہے ۔ ڈاکٹر رام پرشاد کے پاس جاتا ہوں اور وہ اپنی مخصوص اُردو میں جب بڑے چاؤ سے میرا حال پوچھتے ہیں تو لگتا ہے شریانوں میں پہاڑی نالہ کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہوا خون اچانک ایک وشال سمندر کی طرح شانت ہو گیا ہے ۔ وہ فرماتے ہیں ۔ حضور والا ! آپ کا بلڈ پریشر تو صد فی صد معتدل ہے ‘‘ ۔ اور میں کہتا ہوں ۔ ’’ ڈاکٹر صاحب ! حضور یہ میری بیماری کا نہیں بلکہ آپ کی اُردو کا ہے ۔ آپ مرض کی کیفیت مجھ سے کسی اور زبان میں پوچھ کر تو دیکھیں تب آپ کو پتہ چلے کہ میرا بلڈ پریشر کتنا غیر معتدل ہے ۔ سارا کھیلا میرے من کا نہیں آپ کی اُردو کا ہے ۔ آپ کی اردو سے میرے منہ پر جو رونق آ جاتی ہے ۔ آپ سمجھتے ہیں کہ میرا حال اچھا ہے ‘‘ ۔ ڈاکٹر شمس بابر کے طریقہ علاج سے میں سراسر ناواقف ہوں لیکن قیاس اغلب ہے کہ اُن کے اکثر مریض تو ان کی اُردو سے ہی ٹھیک ہو جاتے ہوں گے ۔ ڈاکٹر شمس بابر ادب کا نہایت نکھرا اور ستھرا ذوق رکھتے ہیں ۔ میں انھیں پچھلے دس دنوں سے لگاتار دیکھ رہا ہوں ۔ اُردو ان کے لیے اوڑھنا اور بچھونا ہی نہیں ، اٹھنا بیٹھنا بھی ہے ۔ اردو بہت سوں کے لیے اوڑھنا بچھونا تو ہو سکتی ہے لیکن اُردو میں اٹھنا بیٹھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کوئی اس زبان کو . . . . اپنی طرزِ معاشرت اور زاویہ نگاہ کا حصہ نہ بنا لے ۔ کیا عجب کہ اردو زبان اُن کے طریقہ علاج کا بھی ایک لازمی جز ہو ۔ یہ عین ممکن ہے کہ وہ اپنے مریضوں کو ضروری دوائیں دینے کے بعد ایسے نسخے بھی تجویز فرماتے ہوں ۔

’’ میاں ! صبح میں ناشتہ سے پہلے میر کے دو شعر پانی کے ساتھ پڑھ جاؤ اور رات میں سونے سے پہلے غالب کی ایک غزل دودھ کے ساتھ پی جاؤ ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بعض مخصوص امراض کے علاج کے لیے مریضوں کو کسی شاعر کا مجموعہ کلام بھی مطالعہ کے لیے دیتے ہوں اور قیاس اغلب ہے کہ اس مجموعہ کلام پر جلی حروف میں یہ عبارت بھی درج ہوتی ہوگی ۔ SHAKE THE BOOK BEFORE USE

کسی نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر شمس بابر پچھلے ایک مہینہ سے مزاحیہ مشاعرہ کے انعقاد کے لیے دن رات مصروف عمل رہے ہیں اور اپنے مریضوں کی جانب بھی خاطر خواہ توجہ نہیں دے پا رہے ہیں۔ اس پر میں نے ایک جائز اندیشہ کا اظہار کیا کہ اگر اس عرصہ میں ان کی عدم توجہی کے باعث ان کے مریض خدانخواستہ خود بخود شفایاب ہو جائیں تو کیا ہوگا اس کے جواب میں ڈاکٹر شمس بابر کے ہونٹوں پر ایک ایسی اردو مسکراہٹ پھیل گئی جو اردو زبان اور ان کے مریضوں دونوں کو سخت جانی پر ان کے بھرپور اعتماد کی ترجمان تھی۔ وہ یوں ہنسے جیسے کہنا چاہتے ہوں اردو زبان اور ان کے مریض ایڑیاں تو رگڑ سکتے ہیں لیکن مر نہیں سکتے۔

ایک اچھے ڈاکٹر ہونے کے باوجود وہ ایک نہایت مخلص، بے لوث، نیک نفس اور شریف النفس انسان ہیں۔ ڈاکٹروں میں اور تو کئی خوبیاں ہو سکتی ہیں لیکن مندرجہ بالا خوبیاں تو کئی پتھالوجیکل ٹسٹس کے باوجود ڈاکٹروں میں تلاش نہیں کی جا سکتیں۔ جو ڈاکٹر غلطی سے بے حد شریف النفس واقع ہوتا ہے اس کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں پر کم از کم مجھے تو شبہ سا ہونے لگتا ہے۔ یہ میرا عقیدہ ہی نہیں تجربہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں اکثر مریض ڈاکٹر کی دوا سے کم اور اس کی جھڑکی سے زیادہ شفایاب ہوتے ہیں۔

یاد ش بخیر! وطن مالوف کے ایک اور شریف النفس ڈاکٹر کی مجھے یاد آگئی جو اپنے مریضوں کی کثرت کے علاوہ اپنی بیویوں کی کثرت کے لیے بھی شہرت رکھتے ہیں۔ ایک دن میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھ لیا۔ حضور! آخر آپ نے اتنی ساری شادیاں کس طرح کر لیں۔

نظریں جھکا کر بولے۔ خدا گواہ ہے اس میں میری ذاتی کاوشوں اور کوششوں کو بالکل دخل نہیں ہے کم از کم دو شادیاں تو اس طرح ہوئیں کہ میں نے مریضہ جان کر اس کی نبض مبارک پہ ہاتھ رکھا اور مریضہ نے دبی زبان میں فرمایا دیکھیے ڈاکٹر صاحب! یہ جو آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ہے تو وعدہ کیجیے کہ زندگی بھر میرا ہاتھ اور ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ سچا مرد وہی ہوتا ہے جو ایک بار ہاتھ پکڑتا ہے تو زندگی بھر ساتھ نہیں چھوڑتا۔ چار و ناچار مجھے مناسب سے شوہر اور انہیں مریضہ سے اہلیہ بننا پڑا۔ یہ تو خیر ایک لطیفہ معترضہ تھا۔ ڈاکٹر شمس بابر ان لوگوں میں سے ہیں جن سے مل کر انسان اور اس کی انسانیت پر پھر سے اعتماد بحال ہو جاتا ہے۔

میں یہاں اپنے عزیز ترین دوست اور بزم اردو جدہ کے معتمد عمومی شریف اسلم کا ذکر کرنا بھی ضروری تصور کرتا ہوں۔ میں ان کا شکریہ اس ڈر سے ادا نہیں کرنا چاہتا کہ کہیں وہ اسے سچ مچ قبول نہ کر لیں۔ میں جانتا ہوں کہ "قبول کیا" الاجلان کے لیے تکیہ کلام کی حیثیت رکھتا ہے۔ شریف اسلم میرے اس زمانہ کے دوست ہیں جب آتش نہ صرف جوان تھا بلکہ ابھی بچہ تھا۔ یہ پل دو پل کی بات نہیں نصف صدی کا قصہ ہے۔ شریف اسلم کو میں نے ہر رنگ میں دیکھا ہے ہم دونوں کے ایسے کئی راز ہیں جو ہم دونوں کے سینوں میں دفن ہیں اور اب جب کہ ہم اپنی تاریخ پیدائش سے دور اور اپنی تاریخ وفات سے قریب ہوتے جا رہے ہیں ان کا بالقوہ پوشیدہ رہنا ہی بہتر ہے۔ شریف اسلم یہاں کہ جس طرح کی منظم، معتدل اور صالح زندگی گزار رہے ہیں اسے دیکھ کر یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ آدمی کم کم شریف آدمی ہو تو اس کے بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اس یار طرحدار کی کتنی باتیں ہیں جو اب یاد آ رہی ہیں مگر جیسا کہ میں کہہ چکا

ہوں ہم ان باتوں کی دہلیز کو پھلانگ کر بہت آگے نکل آئے ہیں۔

میں یہاں خصوصیت کے ساتھ حیدرآباد کی مشہور سماجی کارکن محترمہ سلیم اشرف صاحبہ کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ ہندوستان کے شعراء اور ادیبوں کو یہاں لانے کا سہرا سلیم آپا کے سر ہے۔ سفر سے پہلے، سفر کے دوران اور سفر کے بعد انھوں نے جس طرح ہمارا خیال رکھا اور اب تک رکھتی چلی جارہی ہیں اس کا شکریہ لفظوں میں ادا ہو ہی نہیں سکتا۔ بہن کی محبت کیا چیز ہوتی ہے اسے میں تقریباً بھول چکا تھا۔ سلیم آپا کی نگرانی میں یہاں تک سفر کرنے کے دوران میں نے ایک نئے سرے سے بہن کی محبت کی بازیافت کی ہے۔ ان کی فراخدلانہ مہمان نوازی مدتوں یاد آتی رہے گی۔ مجھے تو یہ ڈر ہے کہ اپنے وطن واپس جاکر میں پھر سے اپنی دال روٹی پر کس طرح گزارہ کروں گا۔

حضرات! جب میں یہاں آیا تھا تو گناہوں کا بوجھ میرے کندھوں پر تھا اور اب واپس جانے لگا ہوں تو آپ سب کے احسانات کا بوجھ میرے کندھوں پر ہے۔ ہوائی جہاز میں شاید میں اس بوجھ کو "ہینڈ کیری HAND CARRY" بھی نہ کرسکوں گا اس لیے اس بوجھ کو دل میں چھپا کر ہی لے جاؤں گا کیوں کہ جسم کا یہی وہ عضو ہے جو بوجھ اٹھانے پر آتا ہے تو غموں کے بھاری پہاڑوں کو تک اٹھا لیتا ہے۔

اردو کی بعض بستیاں اجڑ رہی ہیں تو بعض نئی بستیاں آباد بھی ہو رہی ہیں۔ اور ان بستیوں کو آباد کرنے میں آپ حضرات کی بے لوث کاوشوں کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر انور سدید
(لاہور)

پیہ ورنہ

قدیم ترین تذکرۂ دبستانِ سرگودھا

تمہید :-

پچھلے دنوں ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹرس ہسپتال سرگودھا کے غربی جانب ایک زیرِ تعمیر عمارت کی بنیاد کی کھدائی کے دوران سائیں گودھا کے تالاب کے آثار قدیمہ برآمد ہوئے۔ باور کیا جاتا ہے کہ یہ آثار اس زمانے کے ہیں جب اس تالاب کے کنارے سائیں گودھا کا ڈیرہ آباد تھا، قافلے آکر ٹھہرتے تھے، علمی و ادبی محفلیں جمتی تھیں اختلاف اور اثبات کے زاویے اُبھرتے تھے، اس کھدائی سے جو نوادرات ملے ہیں ان میں پرانے سکے، مٹی کے کٹورے، پیتل کی تھالیاں، پتھر کی تختیاں اور چمڑے کی وصلیاں شامل ہیں۔ پتھر کے بہت سے نوکیلے ٹکڑے بھی برآمد ہوئے جو تالاب کی دائیں جانب کے ساتھ برگد کے درخت کے تنے کے پاس پڑے تھے۔ خیال ہے کہ یہ پتھر اس تالاب پر باہر سے برسے تھے۔ اہل ادب کی سب سے زیادہ توجہ سیالکوٹی کاغذ پر لکھے ہوئے ایک مخطوطے نے کھینچی ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ یہ دبستانِ سرگودھا کا قدیم ترین تذکرہ ہے اور اس میں ان شعرا ادبا اور قلمکاروں کے حالات و کوائف درج ہیں جو اس دبستان کے ارکان سمجھے جاتے تھے۔ حال ہی میں ایک تذکرہ نوجوان شاعر محمود اسیر نے "سخنورانِ سرگودھا" کے نام سے مرتب کیا ہے جس میں احمد ندیم قاسمی اور انور سدید ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے اور امن و چین کی بانسری بجاتے نظر آتے ہیں۔ اس نئے تذکرے میں کل ایک سو بہتر شاعر شامل ہیں، لو دریافت تذکرہ دبستان سرگودھا میں کم و بیش چار صد ادبا کا احوال درج ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خطہ گودھا سائیں کے عہد میں بھی شاعری میں خود کفیل تھا۔ ڈنکا اس شہر کا پوری دنیائے ادب میں بج رہا تھا۔ دور دور سے لوگ شاعروں اور ادیبوں کو دیکھنے آتے اور جاتے جاتے کچھ نوکیلے پتھر پھینک جاتے تھے۔ ہم آج کی مجلس میں اس قدیم ترین تذکرے سے چند اقتباس نذرِ قارئین کرتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا

اٹھارہویں صدی کے وسط میں ان کے آبا و اجداد ایران سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے آئے اور سا[ئیں گودھا کا ڈیرہ] بھول جانے کی وجہ سے شہر سے پندرہ کوس کے فاصلے پر ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئے۔ ان گھوڑسواروں کو یہ فضا ایسی پ[سند آئی]

کو بودو باش یہیں مستقل اختیار کرلی۔ ایک روایت کے مطابق تھکاوٹ کی وجہ سے ایسے سوئے کہ اٹھے تو گھوڑے تو اس علاقے کے چور اڑالے جا چکے تھے، اس وقت سے ان لوگوں کا پیشہ کاشت کاری ہے۔ وزیر آغا اسی خاندان کے پرا گریسیو کاشت کار تھے ان کے بزرگوں نے جس زمین پر گھوڑے باندھے تھے وزیر آغا نے اس سے اناج اور ادب افراط سے پیدا کیا۔ کیا نظم، کیا غزل، کیا تنقید، کیا تحقیق، وزیر آغا نے ہر میدان میں گھوڑے دوڑائے اور منزلوں پر منزلیں سر کرتے چلے گئے، ایک کتاب کی سیاہی خشک نہیں ہوتی تھی کہ دوسری کتاب چھاپ دیتے، قسمت کے ایسے دھنی تھے کہ کسی کتاب پر آدم جی انعام نہ ملا، حالانکہ اس انعام کے منصف کئی دفعہ بنائے گئے۔ بلاد مغرب سے ایک شاخ انشائیہ کی توڑ لائے۔ ہر چند زمین موافق نہیں تھی لیکن اس کا پیوند زبانِ اُردو کے پودے میں لگا دیا۔ اتفاق دیکھئے پودا چل پڑا اور پھل پھول لانے لگا، آخر میں انھیں کے نام سے موسوم ہوا۔ عنفوانِ شباب میں ہی دیباچہ نگاری سے تنصف غیر ملتے تھے لیکن فرمائشوں سے تنگ آکر آخری عمر میں توبہ کرلی۔ ان کی کتاب " اردو شاعری " کا مزاج" سے اپنے اور بیگانے سب ناخوش ہوئے۔ ایک تو اس کا موضوع مشکل تھا دوسرے اس میں معاصر شعرا کی تعریف کم تھی۔ لیکن وزیر آغا لکھنے سے باز نہ آئے اور ایک اور کتاب "تخلیقی عمل" لکھ ڈالی۔ مشہور نقاد سلیم اختر نے ان پر تحقیقی مقالہ لکھا اور ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ آزاد مشرب مسلمان تھے۔ خدا کی وحدانیت پر یقین رکھتے تھے۔ محقق تحسین فراقی نے ان کے مذہب کے بارے میں تحقیق شروع کی تھی لیکن جب پتہ چلا کہ ڈاکٹر مظفر عباس یہ کام پہلے سر انجام دے چکے ہیں تو ہاتھ کھینچ لیا۔

غلام جیلانی اصغر

دبستان سرگودھا کے اہم رکن شمار ہوتے تھے۔ حسن رضوی نے کہ اس عہد کے اہم وقائع نگار ہیں ان کا ذکر مختلف دبستانوں کے باب میں کیا ہے۔ (محمود اسیر نے بھی ان کا تذکرہ حروف تہجی کے مطابق سخنوران سرگودہا" میں "غ" کی پٹی میں کیا ہے حالانکہ مخلص کی رعایت سے ان کا تذکرہ "الف" کی پٹی میں انور سدید سے پہلے واجب تھا) انھوں نے لکھنا اس وقت شروع کیا جب مجنون لام الف لکھتا تھا دیوار دبستان پر ان کی زندگی کے بس دو ہی مشغلے تھے تقریر کرنا اور لکھنا۔ آخری عمر میں لکھنے سے بھی کنارہ کشی اختیار کرلی اور تقریروں پر ہی اکتفا کرنے لگے۔ یوں تو نظم، غزل انشائیہ، تنقید سب پر حاوی تھے لیکن بقائے دوام انھیں فن تقریر میں حاصل ہوئی۔ شگفتہ طنز اور برجستہ مزاح سے وہ رنگ باندھتے کہ سننے والے لوٹ پوٹ ہو جاتے اور فرط مسرت سے رونے لگتے افسوس کہ ان کی سب تقریریں ہوا میں بکھر گئی ہیں۔ مشاعرے میں ہمیشہ نئی غزل لکھ کر لاتے اور پرانی غزل ضائع کر دیتے۔ چنانچہ عمر بھر شاعری کرتے رہے لیکن مجموعہ کلام مرتب نہیں کیا۔ پس انھیں سرگودھا کا انجم رومانی سمجھئے۔ ایک دفعہ لاہور کا سفر اختیار کیا۔ واپسی پر سفرنامہ لکھنے کا ارادہ باندھا لیکن پھر سوچا یوسف خاں کمبل پوش کی اولیت پر حرف آجائے گا۔ لہذا ارادہ باندھ کر توڑ دیا۔ اس سے ان کی دوست نوازی ثابت ہوتی ہے۔ وفات سے اکسٹھ سال قبل ان کی ڈائمنڈ جوبلی منائی گئی جس میں اہل لاہور میں سے ڈاکٹر سید عبداللہ، احمد ندیم قاسمی، اور قمر اجنالوی شریک ہوئے۔

اپنے طبعی عہد سے قریباً نوے سال بعد پیدا ہوئے چنانچہ انھیں عمر بھر اپنا زمانہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ جب کچھ آثار پیدا ہوئے تو انھوں نے دنیا سے رخت سفر باندھ لیا اور اپنے پیچھے اگلے زمانوں کی شرافت کے نمونے چھوڑ گئے۔ وطن مالوف سیالکوٹ تھا لیکن وزیر آغا کی صحبت میں بیٹھے تو گھر کا راستہ بھول گئے اور سرگودھا کے ہی ہو کر رہ گئے۔ ان کی کمزوریاں بس دو تھیں ایک حقہ دوسرے غلام الثقلین نقوی کا افسانہ۔ دونوں کے ساتھ عمر بھر نباہ کیا۔ اپنے پیر بھائی انور سدید کے کہنے سننے پر مولانا صلاح الدین احمد پر مقالہ لکھنے پر آمادہ ہوئے لیکن یہ جبری مشقت برداشت نہ کر سکے اور دم توڑ دیا۔ یونیورسٹی کا اجازت نامہ اور مقالے کا خاکہ ان کے ساتھ دفن ہوا۔ میسح الدین صدیقی نے اکادمی ادبیات کی جانب سے لوح بھجوائی جس پر لکھا تھا۔

"ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس"

آخری زمانے میں افسوس کرتے تھے کہ عمر عزیز بیچوان مرید سے دل بہلانے اور رسالہ "اوراق" مرتب کرنے میں ضائع کر دی، ان کے حلقۂ احباب میں ڈاکٹر سہیل بخاری، خورشید رضوی، پرویز بزمی اور صابر لودھی کا نام شامل ہے۔ رسالہ "اوراق" میں رفتگان تازہ" پر انھوں نے جو اداریے لکھے تھے، ان کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا لیکن ناہنجار کاتب نے گم کر دیا۔ دنیا سے جاتے جاتے قواعد اردو مرتب کر گئے اور یہ کتاب اُن کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

ڈاکٹر خورشید رضوی

مولد و مسکن اس بزرگ کا امروہہ تھا، ایک روز حضرت رئیس امروہی کو غزل پڑھتے ہوئے دیکھا تو ڈر گئے اور بھاگ کر سرگودھا آ گئے اور عمر بھر اسی شہر میں آباد رہے۔ غلام جیلانی اصغر کے کالج میں پڑھاتے تھے، وہیں سے غزل کہنے کی چاٹ لگ گئی، یہ شغل ایسا بھایا کہ آخری عمر تک اس سے دل بہلایا۔ طبیعت میں قلندری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس لیے موقعہ غنیمت ملنے پر بھی مال و منال جمع کرنے سے گریز کیا لیکن ایک دفعہ سجاد نقوی کے بہکاوے میں آ گئے اور وسیلہ رزق بڑھانے کے لیے اسلام آباد چلے گئے، وہاں ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ہاتھوں ہاتھ لیے گئے، بچوں کو زبان عربی سکھانے پر مامور ہوئے۔ آمدنی وافر ہونے لگی لیکن دم گھٹنے لگا۔ گھبرا گئے کہ اتنے پیسوں کو کیا کریں گے۔ چنانچہ واپس آ گئے، بولے

"کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر"

ایک اور روایت کے مطابق من جملہ دیگر باتوں کے انھیں اسلام آباد کی شکر پڑیاں میں "ڑ" پسند نہیں آتی تھی اس لیے شہر چھوڑ دیا۔

انھوں نے اوائل عمر میں ایک مکان تعمیر کیا تھا، بقیہ عمر اس کا قرض اتارنے میں صرف کر دی، گورنمنٹ کالج سرگودھا کی لائبریری میں ان کے دو مطبوعہ دیوان محفوظ ہیں، ایک کا نام شاخ تنہا ہے، دوسرے کا سرابوں کے صدف" دونوں پر رائٹرز گلڈ نے انعام نہیں دیا اور جو دیا جاتا تب بھی قبول نہ کرتے، احمد ندیم قاسمی

کے دوست تھے۔ لیکن نشست و برخواست وزیر آغا کے ساتھ بھی، "رسالہ" اوراق" اور"فنون" دونوں میں نمایاں طور پر چھپتے تھے۔ کبھی کبھی ٹی وی کے مشاعروں میں بھی بلائے جاتے اور جب حسن رضوی غیر حاضر ہوتا تو اسٹیج سکریٹری کے فرائض بھی بطیبِ خاطر سرانجام دیتے۔

ان کا پسندیدہ نقاد محمد علی صدیقی تھا۔ فرماتے تھے کہ"ایک تو وہ امروہے کا ہے' دوسرے عینک لگاتا ہے۔" انور سدید انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ تس پر بھی ترک تعلق نہیں کیا۔ حسابِ دوستاں کبھی دل میں نہ رکھا، بس ساتھ کے ساتھ چکا دیتے۔ جو دوست ان کی تعریف کرتا اس کا صلہ باقاعدہ مضمون لکھ کر ادا کرتے۔ غلام جیلانی اصغر اور انور سدید پر بھی موقعہ محل دیکھ کر قلم اٹھایا، شریف ایسے تھے کہ اس کئیے پر کبھی ندامت کا اظہار نہیں کیا۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

یہ علامہ اقبال کے عہد کے آدمی تھے لیکن کچھ اقبال پر تحقیق کے شوق میں اور کچھ نظریہ ضرورت کے تحت ان کی وفات کے بعد پیدا ہوئے تاریخ ولادت ایک اور ماہر اقبالیات' میرزا محمد منور نے کہی ——

"اک محقق تازہ پید البطن گیتی سے ہوا"——

انھوں نے پیدا ہوتے ہی زندگی برائے اقبال کا نعرہ بلند کیا اور آخری سانس تک الاپتے رہے تحقیق بہت زیادہ کرتے تھے جس سے صحت خراب رہنے لگی، کمزور ہوتے ہوتے اتنے دبلے ہو گئے کہ اکثر کتابوں میں گم ہو جاتے اور انھیں تلاش کرنے کے لیے خورد بین کی ضرورت پڑتی، اردو کی بیشتر کتابیں ان کے وزن سے بھاری تھیں۔

ان کا سب سے بڑا کارنامہ پرانے رسائل سے اقبال کے مطبوعہ خطوط کی دریافت ہے، ایک کتاب رجب علی بیگ سرور پر مرتب کی جسے دیکھ کر میرامن ناراض ہو گئے، ایک مجموعہ اقبال کے مطبوعہ خطوط کا مرتب کیا جسے ایک پبلیشر نے رائلٹی ادا کئے بغیر چھاپا۔ سرگودھا سے نکلے تو گورنمنٹ کالج لاہور جا پہنچے، وہاں ڈاکٹر سلیم اختر اور مرزا ریاض کو موجود پایا تو بھاگ کر اورینٹل کالج میں پناہ حاصل کی۔ کچھ عرصہ خواجہ محمد زکریا کی صحبت اختیار کی لیکن پھر اپنی خلوت میں گم ہو گئے اور ایسے گم ہوئے کہ دوبارہ نظر ہی نہیں آئے، طلبا اور طالبات نے سکھ کا سانس لیا، مشہور شاعر عطا الحق قاسمی نے تاریخ وفات یوں رقم کی ——

"آسماں تیری کتب پر شبنم افشانی کرے" —— تاریخ کو حضرات اسے پڑھ کر زیر لب مسکراتے ہیں۔ کیوں کہ اس سے عطا الحق قاسمی کا اپنا سال وفات نکلتا ہے۔

جمیل یوسف

صاحب قیل وقال تھے۔ خود جمیل بھی تھے اور محب الجمال بھی، چنانچہ جہاں کوئی حسین دیکھتے فوراً موہوب ہو جاتے بالآخر حسینوں نے ان سے کنی کترانا شروع کر دی۔ ان کا مجموعہ کلام "گریز اں" اسی واقعے کی یادگار ہے۔

دفعہ تاب جمال نہ لا سکے اور بینائی کھو بیٹھے، زندگی عشق بتاں میں کاٹ دی لیکن حسرت یہ رہی کہ

"بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے"

روایت ہے کہ بیگم کی نوج سے بہت ڈرتے تھے، غزل میں ذکر کسی پری جمال کا آجاتا تو کہتے "بیگم ہم نے غزل میں آپ کا سراپا بیان کیا ہے" یوں ہر جذباتی غلطی پر چادر ڈال دیتے، ان کے سب دیوان اپنی بیگم کے نام معنون ہیں سنا ہے کہ آخری وقت میں مسلمان ہو گئے تھے۔

اوائل عمری کا زمانہ خطہ چکوال میں کاٹا لیکن عمر عزیز کے بہتر ایام سرگودھا میں بسر کئے، اس شہر کا ذکر آتا تو گویا دبستان کھل جاتا، کہتے جو محبتیں یہاں ملی ہیں کہیں نہیں ملیں۔ اپنی محبتوں میں غلام جیلانی اصغر کا نام بھی شریک کرتے جس پر خود جیلانی صاحب کو کبھی یقین نہیں آیا۔ کبھی کبھی کوئٹہ کے ذکر پر ملول ہو جاتے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کے ساتھ بھی ان کی یادیں وابستہ تھیں۔

احمد فراز جب تک پاکستان میں رہا انھیں اپنا حریف سمجھتا رہا لیکن وہ تاب مقابلہ نہ لا سکا اور رضاکارانہ ملک بدر ہو گیا۔ ان کا قول تھا کہ ہمارے ملک میں اچھی شاعری صرف شاعرات نے پیدا کی ہے۔ ایک زمانے میں وہ کشور ناہید کو پسند کرتے تھے، پھر فہمیدہ ریاض کا دم بھرنے لگے، کچھ عرصہ پروین شاکر کو بھی سراہتے رہے لیکن اس پر نظیر صدیقی کا مضمون پڑھا تو وہ ان کے معیار نقد و نظر سے اتر گئی آخر آخر میں شبنم شکیل کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے پائے گئے متروکہ جائیداد میں تین کتابیں چار بیٹے، لاہور کی ان گنت تصویریں اور حسینوں کے بے شمار خطوط چھوڑ گئے، راغب شکیب نے ان پر تحقیق کا ارادہ باندھا تھا کہ اس کی شادی ہو گئی اور وہ کراچی سدھار گیا۔ ان کا ایک دلکش خاکہ رحیم گل نے لکھا ہے جو اب دستیاب نہیں۔

ڈاکٹر سہیل بخاری

اصل نام سید محمود نقوی تھا، سرگودھا میں فضائیہ کے کالج میں لڑکوں کو اردو پڑھاتے تھے، پیدا ہوتے ہی اپنے اصلی نام سے شرمانے لگے، بالآخر سہیل بخاری نام اختیار کیا اور اسی نام سے معروف ہوئے۔ عالم یہ تھا کہ کبھی غلطی سے تنخواہ کے کاغذ پر سہیل بخاری لکھ دیتے تو خازن تنخواہ دینے سے انکار کر دیتا۔ لیکن یہ برا نہ مانتے اور خازن سے اپنا اصلی نام پوچھ کر دوبارہ دستخط کر دیتے۔ تحقیق کے آدمی تھے، اس لیے اپنی ساری عمر پرانی کتابوں کی گرد جھاڑنے میں صرف کر دی جس سے نظر کمزور پڑ گئی، عینک پر گزارہ ہونے لگا۔ حقے کے بہت رسیا تھے، فرماتے لفظ تحقیق حقے سے مشتق ہے۔ ان کی حقہ نوشی سے متاثر ہو کر ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ "حقہ پینا" لکھا۔ حالانکہ وہ خود حقہ نہیں پیتے تھے۔ سہیل بخاری نے یہ انشائیہ پڑھا تو حقہ پینا ترک کر دیا۔

سجاد نقوی ان کی کمزوری تھا۔ جب تک انھیں دیکھ نہ لیتے نہ حقہ گڑگڑاتے، نہ تحقیق آگے بڑھاتے آخری عمر میں شہر کراچی کی طرف نکل گئے۔ وہاں ہر چند ماحول اچھا تھا اور محققوں کا جمگھٹا تھا لیکن چونکہ وہاں حقہ اور سجاد نقوی نہیں تھا اس لیے طبیعت تحقیق کی طرف مائل نہ ہوئی۔ وطن مالوف گونڈوانہ بتاتے تھے۔ بالآخر

س تحطے کو انھوں نے زبان اردو کا مرزبوم قرار دیا۔ ان کے اس نظریے کی سب سے زیادہ تائید سجاد نقوی نے ی لیکن تاحال تردید کسی نے نہیں کی، اس لیے نظریہ ساز محقق شمار ہوئے۔ سرگودھا آنے سے پہلے جوانی کا پچھ حصہ تاج محل آگرہ کے سامنے بیٹھ کر غزلیں کہنے میں گنوایا۔ لیکن مجموعۂ کلام مرتب نہیں کیا۔ ان کا بیشتر کلام پرانے مخطوطوں میں گم ہو گیا ہے۔ انھوں نے تلاش کی زحمت نہیں کی، ان کی بہت سی کتابیں ناشر کے عدم تعاون ی وجہ سے شرمندۂ اشاعت نہ ہو سکیں اور جو چھپیں ان کی رائلٹی نہیں ملی۔

پرویز بزمی

پیشہ ان کے آبا کا سپہ گری تھا لیکن انھوں نے پیدا ہوتے ہی خونخواری سے ہاتھ کھینچا اور کاشت کاری ی طرف آ گئے اور نیشکر، گندم اور مالٹے پیدا کرنے لگے، پھر ناگاہ وزیر آغا پر نظر پڑی کہ کاشت کاری کے ساتھ شکاری بھی کھیلتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے بھی شغل شاعری کا اختیار کیا۔ اور غزل کی زمین میں ہل چلانے لگے۔ کوئی قافیہ رئی ردیف ان سے محفوظ نہ تھی۔ جلد ہی یہ شغل رنگ لانے لگا اور ان کی غزلیں رسالہ "اوراق" اور "تخلیق" میں چھپنے لگیں کہ ان دونوں رسالوں کے مدیران حضرت کے دوست تھے۔ ہر چند بہت سی غزلیں کہیں لیکن مجموعہ کلام فرد فرد ہی رہا۔ ایک دفعہ کیا سوجھی کہ غزل سے ہاتھ کھینچ لیا، رجوع نثر کی طرف کیا اور ایک اخبار میں الم نگاری کرنے لگے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نثر میں بھی رواں تھے۔ شہرت ان کی مزید دور تک پہنچی اور قرب و جوار کے مشاعروں میں بلائے جائیں گے۔ منصوبے بہت بناتے تھے لیکن اکثر ناکام ہو جاتے جب تک راغب شکیب سرگودھا میں رہا یہ اس کی شادی بنوانے میں دلچسپی لیتے رہے، ہر دفعہ نوبت منگنی تک پہونچ جاتی لیکن دیرپا ثابت نہ ہوتی اور ٹوٹ جاتی۔ آخر راغب شکیب نے یہ شہر اور پرویز بزمی کی صحبت چھوڑ دی۔ موصوف ادیبوں کے ساتھ شامیں منانے میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے ایسی محفلوں میں زیادہ توجہ چائے کی میز سجانے میں صرف کرتے۔ چنانچہ ان کی بنا کردہ کوئی تقریب ناکام نہیں ہوئی، اکثر چائے کی میز پر جھگڑا ہو جاتا پیالی سے پیالی بجنے لگتی۔ شرکا مہمان خصوصی کو باتوں میں لگا کر سامان خورد و نوش خود ہضم کر جاتے۔ آخری عمر میں ثقل سماعت کا شکار ہو گئے تھے لیکن اپنے مطلب کی بات سن لیتے تھے اور اچھے لطیفے پر دو دفعہ قہقہہ لگاتے تھے۔ سنا ہے کہ رسالہ "اردو زبان" نے انھیں کے عہد میں "انشائیہ نمبر" شائع کیا، پھر بند ہو گیا (عرض مولف) دبستان سرگودھا کے آثار قدیمہ میں ایک ٹوٹا پھوٹا لوہے کا ڈھانچہ بھی برآمد ہوا ہے۔ گمان غالب ہے کہ یہ پرویز بزمی صاحب کا سکوٹر ہے جس نے موصوف کا بوجھ عمر بھر اٹھایا اور اُف تک نہ کی۔

میرزا محمد منور

آپ یکے از بزرگان خاندان مغلیہ تھے۔ لیکن تلوار آزمانے کے بجائے عمر بھر قلم چلاتے رہے۔ ان پڑھ غبی طالب علموں کو زبان اردو کا سبق پڑھاتے تھے۔ خاندان لودھی کے ایک وقائع نگار صابر علی خان نے لکھا ہے کہ آپ پانی پت کی لڑائی میں شریک تھے۔ مغلوں کے ہتھیار کند تھے اور لودھیوں کی فوجیں کشتوں کے پشتے

لگا رہی تھیں، آپ نے دیکھا تو غیرت اظہار جوش مارنے لگی۔ فی الفور رجز پڑھنے لگے۔ لودھیوں کی فوج تاب نہ لا سکی۔ مغل میدان جنگ میں جم گئے اور فتح یاب ہوئے۔ اس وقت سے خاندان لودھی کے زندہ افراد ان کی نثر نگاری سے خوف کھاتے ہیں اور ان کی شاعری کا سکہ مانتے ہیں۔

شریف اتنے سعے کہ پیدا ہوتے ہی بزرگوں میں شمار ہونے لگے۔ پانی پت کے میدان سے لوٹے تو محکمہ نہر میں ملازم ہو گئے یہاں پیمایش اراضی پہ مامور رہے مگر ان کے مزاج کو یہ کام راس نہ آیا۔ وہاں سے نکلے تو محکمہ ریلوے میں جا گھسے، دیکھا کہ ریل گاڑی جس طرف کو جاتی تھی، پھر اسی طرف سے واپس آجاتی تھی انھیں یہ طریق پسند نہ آیا۔ لہذا نوکری چھوڑ چھاڑ کر اپنے وطن مالوف سرگودہا آگئے۔ کچھ عرصہ انور گوئندی کے مشاعروں میں غزل خوانی کی۔ عبداللہ شاہ قریشی کی صحبت میں بیٹھے۔ پھر خط لاہور کی طرف نکل گئے۔ سرگودھا میں آپ نے نقوش پا یادگار چھوڑ گئے کہ محکمہ نہر کی ملازمت سے بس یہی اثاثہ بچا تھا۔

لاہور میں ایک مرد خردمند کہ نام ان کا رستم کیانی تھا عدلیہ میں بطور جج ملازم تھے۔ آپ نے ان کی صحبت اختیار کی۔ ایک اور بزرگ راجہ حسن اختر کہ مملکت خداداد پاکستان کی سیاست مدن کے شناور تھے اس وقت حیات تھے موصوف نے ان سے بھی میل جول پیدا کیا۔ قیاس ہے کہ ادب و سیاست کی چاٹ ان بزرگوں ہی سے انھیں لگی۔ ان دونوں حضرات کو تو ناگہانی موت آگئی لیکن خدا نے ان حضرت کو حوادث زمانہ سے محفوظ رکھا۔ چلتے چلتے گورنمنٹ کالج لاہور میں پہنچ گئے۔ وہاں مولانا محمد حسین آزاد کی مسند پر بیٹھ کر درس و تدریس کا شغل فرمانے لگے۔ طلبہ ان سے بہت خوش تھے اور ان کے سامنے ان کی تعریفیں کرتے تھے لیکن یہ کسی تعریف کو خاطر میں نہ لاتے اور گھنٹی بجنے کے بعد بھی درس جاری رکھتے۔ ان کے ہم پیشہ مشکور حسین یاد کو یہ ادا پسند نہ آئی۔ اکثر ان کی غیبت کرتے کہ طلبہ کی عاقبت بگاڑ رہے ہیں۔ مرزا صاحب نے بھی پرواہ نہ کی اور کلاس باقاعدہ لگاتے رہے۔

ان کی رگوں میں خون کے بجائے اسلام، پاکستان اور اقبال دوڑ رہا تھا۔ موخرالذکر کا دباؤ بڑھ جاتا تو ڈاکٹر جاوید اقبال کو بلانا پڑتا۔ علامہ اقبال کو بلحاظ عقیدہ "حکیم الامت" کہتے تھے اور جو کوئی دوسرے نام سے پکارتا تو ناراض ہو جاتے۔ ہر سال مرکزی مجلس اقبال میں تقریر فرماتے۔ بعد میں ان کی مانگ بڑھ گئی۔ دساور میں بلائے جانے لگے۔ موضوع کوئی بھی ہوتا اس میں اقبال کو ارادۃً ڈال دیتے جس سے رنگ چوکھا آتا اور خوش ہوتے کہ انھوں نے قومی فریضہ خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ اقبال پر کتابوں پر کتابیں لکھتے چلے گئے۔ سزا کے طور پر اقبال اکاڈمی کے ڈائرکٹر بنا دیئے گئے۔ آپ نے بربنائے شرافت انکار نہ کیا اور اس عہدے کو قبول کر لیا۔ آخری عمر میں سزا معاف کر دی گئی اور یہ خوش خوش گھر واپس آگئے۔

سنا ہے کہ ایک دفعہ عرق النسا کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے لیکن اس سے ان کی تقریر اور تحریر پر کچھ فرق نہیں پڑا۔ بلکہ تیزی سوا ہو گئی، محمد خورشید عالم، نصیر احمد، اور ڈاکٹر صفدر محمود کو اپنے دوستوں میں شمار کرتے تھے خوش قسمتی سے وہ بھی ان کے بارے میں نیک جذبات رکھتے تھے۔ اور ان کی دوستی سے انکار نہیں کرتے

تھے۔ ایک کتاب اردو غزلیات کی لکھی، دوسری میں بعض مزاحیہ مضامین جمع کیے۔ لیکن انھیں زیادہ شہرت اقبالیات میں ملی، اس میں مضامین نوکے انبار لگاتے چلے گئے۔ کسی مضمون میں بند نہیں تھے۔ کسی موضوع میں بند نہیں تھے۔ اردو اور انگریزی دونوں میں رواں تھے۔ عہدِ جوانی میں لاہور شہر میں بسلسلۂ تلاشِ معاش آئے تھے۔ لیکن ساری عمر اسی تکیے میں گزار دی۔ تاہم بربنائے وضع داری دبستانِ سرگودھا کے ساتھ اپنا ناطہ قائم رکھا۔ ان کا تکیۂ کلام "عزیزِ من" اور دل پسند مشغلہ "نظریۂ پاکستان" تھا۔ آپ اس کے بیان سے کبھی بیزار نہ ہوتے۔ خود روتے، دوسروں کو رُلاتے، سقوطِ ڈھاکہ نے انھیں یاسی کی شکست جیسے ملال سے دوچار کر دیا تھا۔ راقم نے اس سانحے کے بعد انھیں ہمیشہ عالمِ استغراق میں پایا۔ ہر وقت کھوئے کھوئے رہتے، جیسے سکتہ طاری ہو۔ بالآخر اسی حالتِ عالمِ جاودانی کو سدھارے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے کہ اس موقعے کی تاک میں تھے اقبال اکادمی کی ٹیلی فون ڈائرکٹری پر قبضہ کر لیا۔ کتابوں کی دوسری الماریوں پر موصوف پہلے ہی تالہ ڈال گئے تھے۔ سرکار کر چابیاں شہرت بخاری کے حوالے کر دیں تاکہ اقبال اکادمی کو اچھی طرح ٹھکانے لگا دیں۔ وقائع نگار اجمل نیازی نے ان کا ایک خاکہ لکھا تھا جو ابھی تک شائع نہیں ہوا اور اب چھپنے کی امید نہیں۔ کیوں کہ اب وہ نہ اقبال اکادمی کے ڈائرکٹر ہیں اور نہ دنیا میں ہیں۔

راغب شکیب :

یہ عزیز خانقاہ ڈوگراں میں پیدا ہوئے لیکن پاؤں میں چکّر تھا اس لیے پیدا ہوتے ہی گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ کچھ وقت ڈیرہ غازی خاں میں گزارا اور گھوڑوں کی سوداگری کرتے رہے۔ لیکن یہ کام ان کے حسبِ طبیعت نہیں تھا۔ سکونِ قلب کی خاطر ایک صاحب کرامت بزرگ حضرت کیف انصاری کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لی۔ اور ان کی تقلید میں شعر کہنے اور تصوّف برائے شعر گفتن کرنے لگے۔ منع کرنے پر بھی باز نہ آتے۔ جب ذرا مشقِ سخن بڑھی تو پیر سائیں حضرت کیف انصاری نے خرقۂ خلافت حقّی (کہ حقّے کا اسمِ تصغیر ہے) کو جانبِ سرگودھا روانہ کر دیا کہ اس عزیز سے نجات کی اور کوئی صورت نہ تھی۔ راستے میں خرقۂ خلافت بیچ دیا۔ اور حقّی توڑ دی۔ لیکن خود بخیریت پہنچ گئے۔

سرگودھا میں یہ گوہرِ قابل ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور تیس طبریہ جمیل یوسف نے اپنے اکاؤنٹس ملازمت پیش کی جو عزیز نے بعماز دعائے خیر قبول کر لی۔ لیکن دل ادب میں اٹکا ہوا تھا۔ اس لیے زیادہ وقت انور سدید اور پرویز بزمی کی صحبت میں گزارا۔ ان اصحاب نے انجمن سازی اور کالم نگاری کی چاٹ لگا دی۔ بس پھر کیا تھا۔ اخبارات میں ترک تازیاں کرنے لگے۔ ٹونکا ان کا پشت اور پیسہ کیمیا ڈبّی تک بکنے لگا۔ رسالہ "اُردو زبان" نے ان کے عہدِ ادارت میں دن دونی ترقی رات چوگنی ترقی کی، آخر آخر میں کاتبوں کی اجرت اور پریس کا بل ادا کرنے کے قابل نہ رہے اور جانب کراچی منہ چھپا کر نکل گئے۔ اس سفر کی یادگار وہ سفرنامہ ہے جو سانحۂ ارتحال تک تکمیل کو نہیں پہنچا۔ ایک اطلاع کے مطابق ادارت کی مضبوط کرسی کارانہ طور پر چھوڑ گئے تھے لیکن اس بیان پر یقین نہیں آتا۔

اُن کا حسنِ سیرت اتفاقی اور حسنِ صورت غیر اتفاقی تھا۔ سرمۂ کحل البصر کبھی استعمال نہیں کیا، پھر بھی

بینائی اتنی تیز تھی کہ عورت اور مرد کو دور سے پہچان لیتے تھے۔ اس کے باوجود عینک لگاتے تھے۔ اس سے ایک تو شخصیت بارعب ہو جاتی دوسرے ان کے نزدیک ناک کا اس سے بہتر اور کوئی مصرف نہ تھا۔ ان کا محبوب مشغلہ منگنی کرانا تھا۔ لیکن کراچی پہنچے تو شادی ہو گئی۔ ناچار اس شغل سے ہاتھ کھینچ لیا۔ شاعری سے توبہ کر لی، نثر سے منہ موڑ لیا۔ ساری توجہ گھرداری میں صرف کرنے لگے۔ ایک روز رابسن روڈ پر جا رہے تھے کہ صہبا لکھنوی کی کار ان سے ٹکرا گئی۔ کار کا تو کچھ نہ بگڑا۔ البتہ صہبا لکھنوی کی تین پسلیاں ٹوٹ گئیں، یہ عزیز صاف بچ گئے۔ لیکن فلکِ ناہنجار کو ان کا بچ نکلنا پسند نہ آیا۔ چنانچہ گلے ہی روز منظر امکانی کے اسکوٹر تلے آ گئے اور جاں بحق ہو گئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے اخباری کالموں کا مجموعہ عطاء الحق قاسمی نے مرتب کیا لیکن یہ شائع نہیں ہوا۔ محمود اسیر نے ان کا ذکر "سخنورانِ سرگودھا" میں بھی کیا ہے۔ راغب مرادآبادی نے قطعۂ تاریخِ وفات کہا؟ جواب دستیاب نہیں۔

انور سدید:

یہ عزیز اپنے آپ کو مصحفی و انشا کے زمانے کا آدمی شمار کرتے تھے۔ طمنچہ ہاتھ میں تھامے ہر وقت چیں بر جبیں رہتے۔ اکثر وار حریف پر کرتے، لیکن اُوچھا پڑتا اور خود ہی زخمی ہو جاتے۔ عمر عزیز مخالفین بنانے میں صرف کر دی۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ

بڑے مزے سے گزرتی ہے چھیڑ چھاڑ میں عمر
خدا کرے کہ حریفوں کا انتقال نہ ہو

مخالفین انھیں وزیر آغا کے ارادت مندوں میں شمار کرتے اور اکثر پھبتی کستے لیکن انھوں نے کبھی برا نہیں مانا اور جو کوئی دوسرا وزیر آغا کے خلاف تیغِ دشنام نکالتا تو یہ اپنا طمنچہ نکال چڑھ دوڑتے۔ اخبار اور رسالے کو پانی پت میدان بنا دیتے، کشتوں کے پشتے لگاتے چلے جاتے اور کبھی نہ تھکتے۔ ان کی تمام عمر دوسروں کی دنیا اور اپنی عاقبت خراب کرتے گزری۔ ادب کا سالانہ جائزہ مرتب کرنا ان کا مشغلہ تھا، اس میں دو چار غلطیاں دانستہ ڈال دیتے کہ کالم نگاران کا ذکر سال بھر کرتے رہیں اور یہ فضیحتا جاری رہے۔ اس میدان میں ڈاکٹر سلیم اختر ان کا واحد حریف تھا۔ ایک دفعہ تو حسن رضوی نے ان دونوں کو اپنے اخبار میں بھڑا دیا، خود پیچھے ہو کر تماشا دیکھتا رہا۔ دانستہ انیس و دبیر کی کیفیت پیدا ہو گئی ادب میں بے ادبی پھیل گئی حسن رضوی نے دونوں کو خوب بھڑا دیا۔ انتظار حسین نے انھیں خدائی فوجدار کہا ہے کیوں کہ پرائی آگ میں کودنے سے گریز نہ کرتے تھے۔

اس عزیز کو شوقِ نمود و نمائش بھی بہت تھا اور اس میں ہر حربہ جائز تصور کرتے تھے۔ ملک کا کوئی اخبار، کوئی رسالہ کوئی میگزین ان سے بچا ہوا نہیں تھا ایڈیٹر کو تعریفی خطوط لکھنا ان کا شیوہ تھا۔ شوقِ خودنمائی [illegible] دفعہ [illegible] نامی خاتون پر ہاتھ ڈال دیا اور خوب رسوا ہوئے۔ لیکن یہ عزیز ذرا نہیں شرمائے۔ [illegible] منابی کا دعویٰ کرتے رہے۔ بالآخر حریفوں کو ہی شرم آ گئی اور دم دبا کے بھاگ [illegible]۔

مشہور ادیب ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے خطوط میں ان کی شاعری کو بہت سراہا ہے لیکن "اوراق" نے ان کی غزل کو کبھی جگہ نہیں دی، انھوں نے وزیر آغا کے خطوط کی کتاب چھاپ دی تاکہ ان کی شاعری کی تعریف دور دور تک پہنچے۔ اپنا دیوان انھوں نے خود مرتب کیا تھا اور ریاض مجید کے حوالے کر دیا۔ تاکہ چھپ نہ سکے۔

ان کی سب سے بڑی کمزوری انشائیہ تھا۔ مشکور حسین یاد کے ساتھ اس کا مقدمہ اختلاف جو اس تک لڑتے رہے۔ بالآخر دونوں بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ مشکور حسین یاد کو احمد ندیم قاسمی نے پانی دکھایا۔ انور سدید پیاسے ہی پڑے رہے۔

تصنیفات ان کی بہت سی ہیں۔ کس کس کا ذکر کیا جائے۔ ہاں ان کی کتاب "وزیر آغا ــــ ایک مطالعہ" ناپسندیدہ کتب میں شمار ہوتی اور فاؤنڈیشن ہاؤس کے پاؤ دستر فنون کے سامنے بر سر عام جلائی گئی۔ آخری عمر میں حضرت احمد ندیم قاسمی جلالہ دجمالہ پر ایک کتاب لکھ رہے تھے کہ فرشتۂ اجل نے روح قبض کر لی۔ نماز جنازہ مشہور عالم دین عطاء الحق قاسمی نے پڑھائی۔ قبر خالد احمد نے کھودی۔ تدفین کے فرائض ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر طاہر تونسوی اور مشکور حسین یاد نے ادا کیے۔ امجد اسلام امجد نے تصدیق کی کہ گہرے گاڑے گئے ہیں، دوبارہ نکل نہیں سکیں گے۔ احمد ندیم قاسمی کو تو یقین نہیں آتا تھا کہ عزیز نا ہنجار فوت ہو گیا ہے۔ آخری وقت میں وہ بھی ان پر مٹی ڈالنے میں شریک ہوئے اور یہ مصرع وفات کہا:

"ہوئی جنبش رگِ جاں فرو، تو اچھا ہے"

دعائے خیر میں اطہر جاوید، تنویر ظہور، ... اور زماں کنجاہی نے شرکت کی، ان کی قبر کا تعویذ اب بھی دیتا ہے اور اس پر ہر سال ترقی پسندوں کا میلہ لگتا ہے۔

حرفِ آخر:

آخر میں یہ اعتراف ضروری ہے کہ اردو کا یہ نادر و نایاب مخطوطہ جو قدیم ترین تذکرۂ دبستانِ سرگودھا کے سے موسوم ہے، ہمیں محض اتفاق سے ملا ہے لیکن ہم نے اس کی دریافت کا سہرا خود اپنے سر پر مضبوطی سے باندھ لیا ہے خطرہ تھا کہ کوئی اور نہ باندھ لے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ سہرا ابھی تک ہمارے سر پر بندھا ہوا ہے اور ہماری اوّلیت پر تاحال کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ حالاں کہ ہمیں زمانۂ حال کے مشہور محقق تحسین فراقی صاحب سے خطرہ لاحق تھا کہ ہماری منزل در پیش گئے، خوشی کی بات یہ ہے کہ اس اطلاع کے چھپتے ہی دنیائے ادب میں غلغلہ بپا ہو گیا اور مبارک باد کے ہمیں اطراف و جوانب سے موصول ہونے لگے، ڈاکٹر سید عبد اللہ نے کہ اس وقت سلسلۂ حافظ محمود شیرانی کے معتمد ہیں۔ ہماری دریافت کو سراہا اور لکھا کہ "ملفوظات مادھو رام کے بعد یہ تحقیقی کارنامہ سب سے بڑا ہے، کیوں کہ اسے ہم نے سر انجام دیا ہے۔" ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے جو ان دنوں کراچی یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو ہیں اور بکرم خوردہ تذکروں کی تلاش میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں فرمایا ہے کہ "اس مخطوطے کی دریافت سے

دبستانِ سرگودھا کے بارے میں مستند ترین معلومات منظرِ عام پر آ رہی ہیں ادبیہ جو کچھ "ادب کی مختصر ترین تاریخ" میں لکھا گیا ہے، باطل ٹھہرتا ہے۔" مورخ، محقق اور نقاد ڈاکٹر جمیل جالبی نے ہم سے اس مخطوطے کی ایک فوٹو کاپی منگوائی ہے۔ ہمیں گمان ہے کہ وہ اسے "تاریخ ادب اردو" میں شامل کرنا چاہتے ہیں، مشہور محقق مشفق خواجہ نے جو جائزہ مخطوطات اردو لکھ کر شہرت بہ مقدار کثیر سمیٹ چکے ہیں فرمایا ہے کہ اس تذکرے کا کوئی اور نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں بھی دستیاب نہیں اور یہ واحد نسخہ ہے جو ہمارے قبضے میں ہے، ہم اس میں جس قدر چاہیں تصرف کر سکتے ہیں۔" ہم اس قیمتی مشورے پر ان کے شکر گزار ہیں

ہم خدا کا لاکھ لاکھ شکر کرتے ہیں کہ یہ تذکرۂ قدیم جسے اب قبولِ عام اور بقائے دوام حاصل ہے۔ ہمارے ہاتھ لگا، اس کی دریافت سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوا۔ اور جو یہ تذکرہ کسی اور کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ اس کا کیا حشر کرتا۔ کسی پنساری کو مل جاتا تو پڑیاں بناتا اور خریداروں میں تقسیم کر ڈالتا۔ پس پردہ ادب کے ان خادموں کے نام جنھوں نے علم کا چراغ ... اور شوق جلایا تھا مٹ جاتا، فلک نا ہنجار خون کے آنسو روتا، نہ ڈاکٹر سید عبداللہ کو خبر ہوتی نہ حسنِ فواد کو، نہ ڈاکٹر جمیل جالبی کو نہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو اور نہ خود ہمیں۔

●○

نسیم سحر (جدہ)

وہ بن میک اپ حسیں ایسی کہاں معلوم ہوتی ہے
کنواری ہو کے چھ بچوں کی ماں معلوم ہوتی ہے

ہے پھرتی باس کی سیکریٹری کی دید کے قابل
یہاں معلوم ہوتی ہے، وہاں معلوم ہوتی ہے

تو کیوں آؤٹ پرچہ اس کا پہلے نہیں ہوتا؟
ہمیں جب زندگی اک امتحاں معلوم ہوتی ہے

محبت میں کوئی تکلیف سے تو بچ نہیں سکتا
مگر یہ بات پہلے سے کہاں معلوم ہوتی ہے

سڑک پر جب نکلتی ہے وہ اپنے چست برقعے میں
نہاں معلوم ہوتی ہے عیاں معلوم ہوتی ہے

میں شادی ریشماں سے کر نہیں پایا اسی باعث
جو لڑکی دیکھتا ہوں ریشماں معلوم ہوتی ہے

وہ برقعے پھینکتی ہے مجھ پہ گھر کی بالکونی سے
مری جاناں کوئی چٹھی رساں معلوم ہوتی ہے

وہ عدت سے نکلتے ہی کرے گی دوسری شادی
جو بیوہ ہو گئی، ماتم کناں معلوم ہوتی ہے

مجھے جو دیکھ کر یوں مسکرا دیتی ہے چپکے سے
سہیلی اُس کی ہے اور راز داں معلوم ہوتی ہے

چلو اب چاند پر ہم بنگلہ اپنا ایک بنوائیں
زمیں تو اب نہایت بے اماں معلوم ہوتی ہے

نکل آئی ہیں کچھ مونچھیں، ذرا بگڑی ہے صورت بھی
بڑھاپے میں تو بیوی بھی میاں معلوم ہوتی ہے

حقیقت کا پتہ دو چار دن کے بعد چلتا ہے
دولھن گھونگھٹ میں کیسی بے زباں معلوم ہوتی ہے

نسیم اظہارِ الفت پر نہ جانے کیوں وہ غارت گر
چڑھا ہو تیر جس میں وہ کماں معلوم ہوتی ہے

ناآشنا

یہ بعد شادی کے میری سمجھ میں آیا ہے
کہ اس سے بڑھ کے کوئی دوسرا عذاب نہیں

ضرور میرے لیے کہہ گئے تھے علامہ
مرے علاوہ کسی سے بھی یہ خطاب نہیں

"خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں"

نریندر لوتھر

سفرنامہ امریکہ
قسط ۷ *

آدھے گھنٹے کی بیوہ

ہمیں ہسپتال سے ڈسچارج کرتے وقت یہ ہدایت دی گئی تھی کہ ہم ایک ہفتے کے بعد چیک اپ کے لیے واپس آئیں۔ اس کے بعد یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ ہماری شفایابی تسلی بخش ہے کہ نہیں اس ایک ہفتے کے لیے ہم اپنے نئے دوست راجو اور چھایا کے گھر منتقل ہو گئے (ان کا تعارف آپ سے پہلے ہو چکا ہے)۔ بیماری اور علاج کی کئی تفصیلات کا پتہ ہسپتال سے نکلنے کے بعد ہی لگتا ہے۔ مثلاً ہمیں بعد میں بتایا گیا کہ آپریشن کے دوران آدھ گھنٹہ کے لیے ہمارا دل جسم سے نکال کر ایک طرف رکھ دیا گیا تھا اور ہمیں بجلی کے ایک پمپ کے سہارے زندہ رکھا گیا یعنی ہم طبی طور پر آدھے گھنٹے سے اوپر مردہ تھے۔ اس وقت بیگم کو ہمیں دور سے صرف دو منٹ کے لیے دیکھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ ظاہر ہے اس آدھے گھنٹے کے لیے بیگم بیوہ تھیں اس وقت ان کے دل پر نہ جانے کیا گزر رہی تھی۔ لیکن سب لوگ انھیں دلاسا دے رہے ہیں۔ اس وقت کے بارے میں صرف بیگم ہی کچھ بتا سکتی تھیں اس لیے ہم کچھ نہیں کہیں گے کہ ہم تو دنیا و فیہا سے بے خبر سو رہے تھے۔

اس طرح ہم دنیا کے ان چند لوگوں میں سے ہیں جو مر کر زندہ ہوئے ہیں۔ موت کے بعد کیا ہوتا ہے موت کے بعد دوسرا جنم ہوتا ہے کہ نہیں، ایسے کئی موضوعات پر اب ہم اتھارٹی ہیں ہم اس بات کی تصدیق کرنے کے موقف میں ہیں کہ موت کے بعد انسان دنیا سے بے خبر اور بے نیاز ہو جاتا ہے اور اسے انتہائی سکون ملتا ہے۔ نہ جانے لوگ موت سے کیوں ڈرتے ہیں۔ ہم تو کہیں گے کہ موت سے کسی قسم کے خوف کی ضرورت نہیں۔ یہ تو ایک نہایت خوشگوار صورت حال کا نام ہے۔ اس لیے ناظرین آپ موت سے گھبرانا چھوڑ دیجئے اور رات بھر آرام سے سو جائیے کیوں کہ آرام سے سونے کا دوسرا نام ہی موت ہے۔ ہماری عارضی موت نے ایک دوسرے مسئلے کا حل بھی مہیا کر دیا۔ آواگمن کے موضوع پر صدیوں سے بحث چلی آ رہی ہے۔ یہ بحث ایسے لوگ کرتے ہیں جنھیں موت یا اس کے بعد کا کوئی تجربہ یا اندازہ بھی نہیں۔

کیوں کہ ہم ایک بار مر چکے ہیں اور مر کے پھر زندہ بھی ہو چکے ہیں اس لیے ہم اس ازلی مسئلہ کا حل مہیا کرنے کے موقف میں ہیں بس سمجھ لیجئے کہ یہ مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حل ہو گیا۔ ہمارے کیس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آواگمن کی تھیوری

---

* (قسط ۶ جنوری ۹۰ میں شائع ہو چکی ہے)

صحیح ہے ہم اس دنیا سے گئے اور واپس آگئے کیوں کہ ہماری موت بہت کم وقتی تھی اور ہمارے مردہ جسم کو دفنایا یا جلایا نہیں گیا تھا اس لیے ہم اسی جسم میں واپس آگئے۔ اگر بالفرض ہم زیادہ دیر تک مردہ رہتے یا ہمارے جسم خاکی کو سپرد خاک یا آتش کر دیا ہوتو ظاہر ہے ہم کسی اور جسم میں داخل ہو جاتے کیوں کہ سب لوگ نئی چیزیں پسند کرتے ہیں۔ اس لیے مردوں کی روحیں بھی نئے اور تازہ جسم پسند کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ تر نئے پیدا ہونے والے بچوں کے جسموں میں داخل ہو جاتی ہیں تاکہ انھیں پھر ایک پوری اور نئی زندگی گزارنے کا موقع مل سکے۔

بیگم نے پوچھا تم اپنی عارضی موت کے دوران کسی اور جسم میں کیوں نہ داخل ہو گئے ہم نے کہا وقت بہت کم تھا اور اتنے وقت میں ہماری روح صرف آپریشن تھیٹر یا زیادہ سے زیادہ اس کے باہر والے ہال تک گھوم سکی۔ اس وقت وہاں جو خالی جسم تھے وہ یا تو عورتوں کے تھے یا بوڑھے لوگوں کے۔ اس لیے ہم نے کسی اور جسم کو پسند نہ کیا۔

بیگم نے کہا ایک لکھ پتی اور خوب صورت امریکن مرد تمہارے بازو ہی پڑا تھا سب لوگ اسی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ تم اس کے جسم میں کیوں نہ داخل ہو گئے وہ عمر میں بھی تم سے زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ہم نے پوچھا کہ اس سے ہمیں یا تمہیں کیا فائدہ ہوتا۔ "میں ایک امیر امریکن کی بیوی بن جاتی"

ہمیں بیگم کے ارمان پورے نہ ہونے پر بڑا افسوس ہوا اور ان کی نادانی پر بھی ہم نے انھیں سمجھایا کہ اس سے تمہیں کو نقصان ہوتا فائدہ نہیں۔ اگر بالفرض ہم اس جسم میں داخل ہو جاتے تو ہم وہ شخص بن جاتے اس طرح اس شخص کی بیوی کو نیا خاوند مل جاتا اور تم دائمی بیوہ ہو جاتیں۔

بیگم نے کہا۔ اگر تمہاری روح اس میں داخل ہو جاتی تو یقیناً تم مجھے پہچان لیتے ہم نے سمجھایا کہ آواگون کا ایک نیا رول یہ ہے کہ جوں ہی ایک روح کسی جسم میں داخل ہوتی ہے وہ اپنا ماضی بالکل بھول جاتی ہے۔ اس طرح نہ تو ہمیں یاد رہتا کہ ہم تمہارے خاوند ہیں اور نہ ہی وہ لوگ اس بات کو مانتے کیوں کہ لوگ جسم پر جاتے ہیں روح پر نہیں۔

یہ وضاحت سن کر بیگم کی پشیمانی کچھ کم ہوئی ان کی آنکھوں میں آنسو بھی آگئے نہ جانے یہ خوشی کے تھے یا غم کے۔ عورت کے دل کی بات کو آج تک کوئی نہ بھانپ پایا کئی بار ہم سوچتے ہیں کہ کیوں نہ اس وقت ہم کسی عورت کے جسم میں داخل ہو گئے۔ اس طرح نسوانی نفسیات کے بارے میں ہماری معلومات کچھ تو بڑھتیں لیکن پھر وہی بات آجاتی ہے کہ اگر یادداشت ہی چلی جاتی تو پھر معلومات میں اضافہ کیسے ہوتا۔

خیر یہ واضح ہو جائے کہ اب ہم نہ صرف امریکہ سے واپس آئے ہوئے ہیں بلکہ دوسری دنیا سے بھی اس کے لیے ابھی تک کوئی ڈگری نہیں بنائی گئی ورنہ ہم اس کو اپنے نام کے ساتھ لگا لیتے۔

چھایا اور راجو کے گھر منتقل ہونے کے چند دن بعد ہماری بھوک بھی بہتر ہو گئی۔ چھایا نے ہمارے لیے ہندوستانی کھانے بنانے کی کوشش کی لیکن ہم نے اسے منع کر دیا کیوں کہ ہمیں عموماً مغربی پکوان زیادہ پسند ہیں اور ہم مہینوں ویسے کھانوں پر گزارہ کر سکتے ہیں۔ امریکہ ایسے لوگوں کے لیے جنت ہے جن کو مختلف قسم کے کھانے کھانے پر اعتراض نہ ہو۔ البتہ جیسا کہ ہمیں ڈر تھا شروع شروع میں ہمیں وہ کھانے ہضم کرنے میں تھوڑی دقت ہوتی

کیوں کہ امریکہ میں کھانے خالص چیزوں سے بنتے ہیں اور ہمارے ہندوستانی معدے کو ملاوٹ آمیز اشیا کھانے کی عادت تھی۔ لیکن انسان ایک ایسی مشین ہے جو ہر حالت میں اڈجسٹ کر لیتی ہے۔ رفتہ رفتہ ہمارا پچھڑا ہوا معدہ بھی ترقی پسند بن گیا۔ اور ہم نے خالص خوراک ایسے کھانا اور ہضم کرنا شروع کر دی گویا ہمارے معدے کے پاس گرین کارڈ ہو۔ ابھی وہاں موسم خزاں تھا اس لیے سردی زیادہ نہیں تھی۔ ایسے بھی ہوسٹن امریکہ کا مدراس ہے۔ زیادہ تر گرم ہی رہتا ہے۔ لیکن کمزوری کی وجہ سے ہمیں دوسرے لوگوں سے ذرا زیادہ سردی لگتی تھی۔

راجو صبح پانچ بجے اٹھ کر تیار ہو جاتا اور چھ بجے کام پر چلا جاتا تھا۔ وہاں سب لوگ بہت جلدی کام پر چلے جاتے ہیں اُس کا دفتر گھر سے کوئی چالیس میل دور تھا۔ زیادہ تر لوگ شہر کے باہر ہی رہنا پسند کرتے ہیں اور اس لیے ان کے وقت کا کافی حصہ "آوا گمن" میں ہی گزر جاتا ہے۔ کئی لوگ تو ناشتہ بھی چلتی گاڑی میں کرتے ہیں۔ کالی کافی کا ایک پیالہ کار میں "گیر" کے پاس رکھ دیتے ہیں۔ سینڈوچ کے ساتھ اسے پیتے رہتے ہیں۔ صبح ۸½ بجے کے قریب بہت رش رہتا ہے۔ اس لیے لوگ اس سے بچنے کے لیے پہلے سے پہلے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجتہً رش صبح ہی شروع ہو جاتا ہے۔ صبح کے وقت ایک طرف اور شام کے وقت واپسی گاڑیوں کی میلوں لمبی قطاریں دیکھی جاسکتی ہیں۔ کیوں کہ ہر کنبہ کے پاس دو یا تین کاریں ہوتی ہیں اس لیے امریکہ میں زیادہ تر شہروں میں بسوں کا کوئی انتظام نہیں۔ یورپ کے مقابلہ میں یہ بات بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ یورپ میں ٹرامیں، بسیں، انڈرگراونڈ ریل وغیرہ سفر کو بہت آسان اور سستا بنا دیتی ہیں۔ امریکہ میں اس کے برعکس کار یا ٹیکسی کا استعمال کرنا پڑتا ہے جو مقابلتاً مہنگا رہتا ہے۔ کیوں کہ وہاں گھر کے کام کے لیے نوکر بھی نہیں ملتے اس لیے گھر کے سارے کام صاحب خانہ یا میم صاحب کو ہی کرنے پڑتے ہیں۔ ہفتہ میں پانچ دن تو وہ لوگ زیادہ تر دفتر یا باہری کاموں میں جٹے رہتے ہیں۔ سنیچر اور اتوار کے دن یعنی "ویک اینڈ" پر وہ لوگ گھر کی صفائی اور دوسرے ذاتی کام کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے لیے آرام حرام ہے۔ پنڈت نہرو نے آرام حرام ہے کا نعرہ امریکہ کے سفر کے بعد ہی ہندوستانیوں کو دیا تھا۔

اپنی مصروفیات کے باوجود چھایا اور راجو ہمیں شام کو گھومنے گھمانے لے جاتے تھے۔ ایک دن ہم نے وہاں کا سپیس سنٹر دیکھا جہاں سے خلائی جہاز اور راکٹ چھوڑے جاتے ہیں۔ ہم نے سمجھا تھا کہ سکیورٹی کی وجہ سے وہ کسی شخص کو سپیس سنٹر کے پاس بھی پھٹکنے نہیں دیں گے لیکن امریکی ہر چیز کو ٹورسٹ اٹریکشن بنا دیتے ہیں۔ آپ ٹکٹ خریدیے اور اندر جائیے۔ نمائش دیکھیے سوال پوچھیے اور آخر میں کینٹین میں بیٹھ کر چائے اور کافی یا اس سے بھی زیادہ گرم یا نرم مشروبات لیجیے۔ ہمارے ہاں بھی ایک سپیس سنٹر ہے لیکن اس کے چاروں طرف میلوں دور پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ درندہ در نہیں مار سکتا اور چرندہ چر نہیں مار سکتا۔ نتیجتہً ہمارے راکٹ بھی اڑ نہیں پاتے۔ حکومت نے راکٹ اڑانے کے لیے ایسے کئی ماہروں کی بھرتی کی ہے جو گیس کے غبارے بیچنے کا تجربہ رکھتے ہیں۔ کئی ایک تو ایسے ماہرین ہیں جو پہلے دیوالی کے لیے آتش بازی کا سامان تیار کرتے تھے لیکن سرکاری نوکری ملتے ہی وہ آرام پرست ہو گئے۔ اور دیوالی والے راکٹ تیار کرنے کی ٹکنالوجی کو بھی بھول گئے۔ اس کا ایک نتیجہ

ں ہمارے دیوالی کے پٹاخے بھی مہنگے ہو گئے ۔ سُننے میں آیا ہے کہ جب حکومت ہند نے چاند میں راکٹ بھیجنے فیصلہ کیا تو پہلے تو مسئلہ پیدا ہوا کہ دن کے وقت راکٹ کیسے چھوڑا جائے کیوں کہ دن کے وقت تو چاند غائب جاتا ہے۔ رات کے وقت راکٹ اس وجہ سے نہیں چھوڑا جا سکتا کہ کچھ دکھائی نہیں دیتا اور پھر بجلی کے بل ہونے کا بھی خطرہ رہتا ہے۔ اس لیے چاند پر راکٹ چھوڑنے کا پروگرام ابھی وقت تک ملتوی کر دیا گیا ہے جب ب ہمارا بجلی کا سسٹم ٹھیک نہیں ہو جاتا۔

ہوسٹن میں ہمیں بتایا گیا کہ جب انسان کو چاند پر بھیجنے کا فیصلہ ہو چکا تو امریکہ کی حکومت نے ایک المی ٹنڈر کے لیے اشتہار دیا اس میں جو شخص چاند پر جانے کے لیے تیار ہو اسے ایک مہر بند لفافہ میں یہ لکھ کر ینا تھا کہ وہ اس کام کے لیے کتنے پیسے لے گا۔ ساری دنیا سے اس کے لیے ٹنڈر آئے لیکن سب سے سستے ٹنڈر ندوستان سے وصول ہوئے ایک ایک لاکھ روپے کا تھا دوسرا دو لاکھ کا اور تیسرا تین لاکھ کا ایک لاکھ مانگنے الا ایک سکھ تھا اس سے پوچھا گیا تو اس نے کہا میں ایک غریب آدمی ہوں اگر زندہ واپس آجاؤں گا تو لکھ پتی ن جاؤں گا۔ اگر مر گیا تو میرا کنبہ خوشحال ہو جائے گا ۔

دوسرا شخص مارواڑی تھا اس نے افسر انچارج سے کہا۔ دو لاکھ میں سے ایک لاکھ آپ کا ایک لاکھ میرا۔ یسرا شخص سندھی تھا۔ اس نے افسر کو سمجھایا کہ ایک لاکھ آپ کے لیے ہے۔ ایک لاکھ میرے لیے اور تیسرے لاکھ سے ہم اس سردار جی کو اوپر بھیج دیں گے۔ نہ جانے کس وجہ سے امریکن سرکار نے کسی بھی ہندوستانی کی آفر قبول نہیں کی ۔

منظوم سفرنامہ

خالد عرفان
(کراچی)

زندہ دلانِ حیدرآباد کا مشاعرۂ طنز و مزاح

اللہ رے مشاعرۂ حلقۂ دکن
شامل ہوئے تھے جس میں سب اہلِ شعور و فن

لوگوں میں ذوقِ شعر بقیدِ حیات ہے
ہم بھی دکن گئے تھے یہ "پرسوں" کی بات ہے

زندہ دلانِ شہرِ دکن ہوش مند ہیں
سارے ہی سامعین ظرافت پسند ہیں

وہ چاہتے تھے محفلِ طنز و مزاح ہو
مقصد یہ تھا کہ اس سے ادب کی فلاح ہو

پندرہ ہزار لوگ فقط اک دکھاوا تھے
باہر جو سُن رہے تھے وہ اس کے علاوہ تھے

کیا ذوق کیا دماغ پس اندیشہ تھا
در اصل یہ ہماری ثقافت پہ طنز تھا

ایک ایک شعر فہم حیث نی نشین تھا
جو ذرہ جس جگہ تھا وہیں "سامعین" تھا

یہ میچ ہو رہا تھا نمائش گراؤنڈ میں
آؤٹ ہوا تھا کوئی فقط ایک راؤنڈ میں

فن کار آ رہے تھے بہت دُور دُور سے
میرٹھ سے بمبئی سے کوئی رام پور سے

کامیڈین ادب کے بڑے نامی آئے تھے
دلی سے چل کے ساغرِ خیامی آئے تھے!

آئے تھے مالیگاؤں سے مختارِ مختصر[1]
قینچی کی طرح آئے تھے میرٹھ سے پاپولر[2]

میں بھی بہ شکلِ مجرمِ طنز و مزاح تھا
میرا گناہ یہ ہے کہ میں بے گناہ تھا

شاعر بہت عظیم یہاں انڈیا کے تھے
میں "نیوایشین"[3] کا تھا وہ ایشیا کے تھے

دیکھی اچار کی طرح چکھے گئے تھے سب
اسٹیج پر سنبھال کے رکھے گئے تھے سب

گوشہ نشین میں بھی انھیں شاعروں میں تھا
یعنی نمک بگھارے ہوئے بیگنوں میں تھا

---

[1] مختار یوسفی
[2] پاپولر میرٹھی
[3] نیو ایشین ہوٹل

طالبؔ[1]، کمالؔ، بیگؔ، حمایتؔ تھے اس طرح
یہ چار میزبان تھے اور گیسٹ ایک تھا
میں سوچتا ہوں قبلہ حمایتؔ کو کیا کہوں
گر بھائی جان کہوں تو کہا مان جائیں گے
اس میزباں نے دردِ شکم دل نشیں دیا
رہتے ہیں اپنی ذات میں درویش کی طرح
سن کر کلامِ طنز امیرِ شگوفہ نے
ہمراہ ان کے مثلِ عبارت رہا تھا میں
یوں دے رہے تھے مجھ کو سوئٹ کی پلیٹ وہ
کہتے ہیں اہلِ علم و ادب، مصطفیٰؔ جنھیں
جب بھی نہ ملے ہیں ملتے ہوئے جھومتے ہوئے
جب بھی ملے ہیں لنچ کی "آفر" لیے ہوئے
گھر میں ڈنر کرایا تو ہوٹل میں ناشتہ
طالبؔ نہ صرف زورِ بیانی کا میٹھا تھا
نقشے عمارتوں کے بناتا ہے مثلِ رنترا
رنگِ غزل حسین عمارت میں بھر دیا
اک اینٹ کی جگہ پہ قوافی لگا دیا!
اک بادشہ نے اس کو محل میں بلایا تھا
کچھ اس طرح جناب نریندر لوتھر سے ملے
مجھ سے ملے "مزاح نشاں" مجتبیٰ حسین
پرویزؔ[2] جو مزاح کے اک رائٹر بھی ہیں
ان "نثریے" کو شعر نگاری سے کیا غرض
انجم مسیح و بوگس وان پیرٹھ، ظریف بھی
مجموعے کی ہر غزل میں "کھٹائی" زیادہ ہے

ارضِ دکن پہ چار ہیں مینار جس طرح
کھانے الگ الگ تھے مگر ٹیسٹ ایک تھا
بھائی کہوں، رفیق کہوں، یا چچا کہوں
"انکل" اگر کہوں تو بُرا مان جائیں گے
کھانا تو دے دیا مجھے چورن نہیں دیا
رستے میں ہیں یہ "آندھرا پردیش" کی طرح
"ایڈٹ" کیا تھا مجھ کو مدیرِ شگوفہ نے
بھارت میں ان کی زیرِ ادارت رہا تھا میں
جیسے کہ جو رہے ہوں "شگوفے" کا پیڈ وہ
حاصل ہیں پورے شہر کی ہمدردیاں انھیں
گزری ہے ان کی عمر جہاں گھومتے ہوئے
کیمرے کو جیسے فوٹو گرافر لیے ہوئے
بیوی سے چھپ کے جیسے کوئی رکھے داشتہ
اس کا سخن بھی جیسے "خوبانی کا میٹھا" تھا
ان کی عمارتیں ہیں سراپا مزاح و طنز
دیوارِ "میوزیم" میں شتر گربہ کر دیا
بحرِ رمل میں کوئی پلازہ بنا دیا!
سنتے ہیں گولکنڈہ اسی نے بنایا تھا
جیسے عروسِ طنز و ظرافت کو بر ملے
ورنہ کہاں میں اور کہاں مجتبیٰ حسین
قامت سے لگ رہے تھے کوئی فائٹر بھی ہیں
اس "ویجیٹیرین" کو نہاری سے کیا غرض
ان میں ادب کے ساتھ ہے ذوقِ لطیف بھی
ایسی ہی شاعری میں کمائی زیادہ ہے

---

[1] طالب خوندمیری ۔ مصطفیٰ کمال ۔ مصطفیٰ علی بیگ ۔ حمایت اللہ
[2] پرویز یداللہ مہدی

چنچل گوڑہ میں حضرت یعقوب[3] رہتے ہیں
اپنی جگہ سند ہے یہ جو لفظ کہتے ہیں

اس شہر میں محقق اعلانیہ ہیں آپ
میرے لیے تو "جامعہ عثمانیہ" ہیں آپ

طبعِ نذیر[4] میں بھی ہے شفقت بھری ہوئی
مہماں نوازیوں میں محبت بھری ہوئی

اہلِ دکن جو بزمِ محبت سجائے تھے
خواجہ حمید[5] مجھ کو بہت یاد آئے تھے

اس شہر میں ادب بھی صحافت کے دم سے ہے
"منصف"[6] کے دم سے اور "سیاست" کے دم سے ہے

رخصت ہوا جو اہلِ دکن سے ملا کے ہاتھ
سب الوداع کہتے تھے مجھ کو ہلا کے ہاتھ

پہنچا جو بمبئی تو فسانہ عجیب تھا
ٹھہرا نہ اس لیے کہ سمندر قریب تھا

فٹ پاتھ بمبئی کی بڑی غم گسار تھی
"عورت پہ مرد" مرد پہ عورت سوار تھی

انسان پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں یہیں
کچھ "حقِ زوجیت" بھی ادا کرتے ہیں یہیں

اس شہر کے ادیب بھی اکثر ظریف ہیں
باقی جو بچ گئے ہیں مزاجاً شریف ہیں

اس شہر میں جو یوسفِ ناظم کی ذات ہے
بیمارِ غم کے واسطے آبِ حیات ہے

فیضی[7] کا فیضِ عام ظریفوں پہ جاری ہے
تنہا یہ بیس تیس ادیبوں پہ بھاری ہے

اس شہر میں ندیم[8] سراپا گلاب ہے
یہ شخص اپنی ذات میں خود "انقلاب"[9] ہے

مجھ پر تو زندگی کی حقیقت یہاں کھلی
ہر شخص اپنی ذات میں لگتا تھا اک گلی

واپس جو بمبئی سے ہوا میں ہواؤں میں
"ایروپلین" اڑنے لگا جب فضاؤں میں

میں یاد کر رہا تھا ثواب و گناہ کو
خوف آ رہا تھا شاعرِ طنز و مزاح کو

خالد امشاعرے میں کسی بھی فضا[10] سے جا
ہونا اگر ہے لیٹ "ایئر انڈیا" سے جا

---

[3] یعقوب میراں [4] نذیر الدین احمد [5] خواجہ حمید الدین شاہد [6] روزنامہ منصف۔ روزنامہ سیاست حیدرآباد [7] فیاض احمد فیضی [8] ندیم صدیقی [9] روزنامہ انقلاب۔ بمبئی [10] فضائیہ

تپِ دِق سے جنگ

1. اگر آپ دو ہفتے سے زیادہ سے کھانسی میں مبتلا ہیں یا اپنے تھوک یا بلغم میں خون پاتے ہیں تو آپ پھیپھڑوں کی تپِ دق کا شکار ہو سکتے ہیں۔

2. اپنا طبی معائنہ کرائیں، خاص طور پر بلغم کا۔ یہ معائنہ پرائمری ہیلتھ سینٹر، ڈسپنسری یا ٹی بی سینٹر میں کرا سکتے ہیں۔



3. تپِ دق کا مکمل علاج ہو سکتا ہے بشرطیکہ ڈاکٹر کی تجویز کی ہوئی دوائیں پابندی سے متعینہ مدت تک کھائی جائیں۔

4. پرہیز علاج سے بہتر ہے، اس لئے اپنے بچے کو بی سی جی کا ٹیکہ لگوائیں۔

سید عباس متقی
(حیدرآباد)

ایک ہنگامہ پہ موقوف الیکشن

ملک کو آزادی کیا ملی کہ سارا ملک ہی آزاد ہو نکلا۔ ہر طرح کے لوگ سیاستداں بن گئے یہاں تک کہ غنڈوں نے بھی لیڈری شروع کر دی۔ شرفا کے دو کام رہ گئے۔ ایک ووٹ دینا۔ دوسرے ووٹ دے کر ایک مدت تک پچھتایا کرنا۔ ہم ووٹ دیتے ہیں نہ پچھتاتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ زندگی اس لیے نہیں کہ ہر پانچ سال بعد پانچ گھنٹے تک طویل قطار میں کھڑے رہ کر پانچ دن تک حیران و پریشان رہیں۔ ووٹ دینا اتنا مشکل نہیں جتنا ووٹنگ کے نتیجے تک صبر و سکون سے گزارہ کرنا۔ ووٹ دینے اور نتیجہ نکلنے کے درمیان کا عرصہ، عرصۂ محشر ہوتا ہے کہیں چاقو چلتا ہے تو کہیں گولی، کوئی ہلاک ہوتا ہے تو کوئی زخمی، کہیں گھر جلتے ہیں تو کہیں دوکانیں یہ تماشے دیکھ دیکھ کر ہم دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ جمہوریت کو سیدھا راستہ دکھا'یا' ہمیں چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کا۔

ہمارے ملک کی سیاست بھی عجیب ہے اگر اسے اونٹ کا نام دیا جائے تو بے جا نہیں ہر شعبۂ حیات میں درکار صلاحیتوں کے اہل افراد کا تقرر عمل میں لایا جاتا ہے مثلاً ٹیچری کے لیے بی ایڈ ہونا شرط ہے۔ کنڈکٹری کے لیے میٹرک لکچرری کے لیے ایم اے ہونا ضروری ہے تو پروفیسری کے لیے ڈاکٹر حتیٰ کہ پولیس میں بھرتی ہونے کے لیے بھی کچھ نہ کچھ ہونا ضروری ہے۔ لیکن منسٹری جیسے اہم عہدے کے لیے کسی بھی ڈگری کی ضرورت نہیں۔ جاہل لیڈر کی بھی قدر و منزلت ہوتی ہے اور برا عتبار جہالت قلمدان سونپے جاتے ہیں اور ہم ایک جاہل کو "قلم" "دان" دیتے جانے پر اپنے قلم کو توڑ دینا چاہتے ہیں اور سعدی سے گلے کرتے ہیں۔ "قلم گفت کہ من شاہ جہانم"؟

کچھ جاہلوں نے جب یہ دیکھا کہ محض شور شرابے، دھکم پیل اور اوٹ پٹانگ ہانکنے سے بے وقوفوں کی ایک ٹولی تابع ہو سکتی ہے اور عقلمند کرسی سونپے جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں تو ان لوگوں نے جن کی تصویریں مختلف تھانوں میں مختلف عنوان سے مختلف فائلوں میں چسپاں ہیں ہاتھ جوڑ کر ایک شیطانی پوز لے لیا۔ ضمانت بھر دی و شاذ ہی ضبط ہوتی ہے اور لگے ووٹ مانگنے۔ دلوں کی کدورت، نفس کی مکاری، شیطانی کرتوت چہرے پر رقصاں لیکن دونوں ہاتھ جڑے ہوئے۔ ہر تقریر میں وعدہ و پیمان کے وہ انبار کہ لیلیٰ کا مجنوں یاد آجائے۔ اس کو ڈرایا، اس کو دھمکایا۔ اس بستی میں نوٹ تقسیم کئے اس علاقے میں پد یاترا کی۔ آخر غرض اپنا الو سیدھا کر لیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ ایم ایل اے کی سیٹ کے لیے کھڑے کیوں ہوتے ہیں ہمارا تو یہ حال ہے کہ اپنے پاؤں پر کھڑے

نہیں ہوسکتے۔ لازماً ہمیں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ایم ایل اے کے لیے کھڑے ہونے سے زیادہ مشکل کام ہے کیوں کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے پیٹ میں حلال کمائی کا ہونا بہت ضروری ہے اور جس شخص کو خدا کے حضور کھڑے ہونے کا خیال ہو شاید ہی وہ اسمبلی یا پارلیمنٹ کے لیے کھڑا ہوگا۔

الیکشن کے موسم میں ہر سمت ایک شور و غوغا برپا رہتا ہے۔ اس زمانے میں شیاطین برہنہ رقص کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں وہ وہ غیبتیں ہوتی ہیں وہ وہ اتہام باندھے جاتے ہیں کہ خدا کی پناہ ہر شخص کا تعارف کھل کر سامنے آتا ہے گویا وہ میدان خطابت نہ ہو میدان قیامت ہو۔

کہیں سے آواز آئی جھنڈو کو ووٹ مت دینا۔ آپ کو یہ جان کر بہت حیرت ہوگی کہ وہ کم بخت تیزاب، پیشاب اور شراب تینوں کو ملا کر پیتا ہے۔ کیا آپ ایسے شخص کو اپنے خالی سروں پر مسلط کرلیں گے جو گوبر پر چپکی ہوئی مکھیوں کو چُن کر کھاتا ہو۔ آپ کو پتہ نہیں اس کے ارادے کس قدر خطرناک ہیں کرسی ملتے ہی وہ آرام کرسی پر دراز ہو جائے گا۔ پھر پانچ سال بعد ہی اٹھے گا۔ آپ کا ووٹ جو آپ کی جان سے زیادہ قیمتی ہے ہمیں دیجیے ہم آپ کی خدمت کے لیے آدھی رات کو تیار ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آدھی رات کو خدمت کی بہت کم "ضرورت" پیش آتی ہے۔ آپ صرف اپنا ہی ووٹ ڈال کر مت چلے جایئے ایسا بے وقوف کرتے ہیں۔ دوسروں کا ووٹ ڈالنا بھی آپ پر فرض ہے۔ آپ کے خاندان میں، محلے میں احباب میں جو جو کھپ گئے ہیں ان کے ووٹ بھی ڈالیے یہ بھی ایصال ثواب کا ایک طریقہ ہے۔ "۳۰ فروری" کا دن مت بھولیے۔ یہ دن آپ کی تقدیر کو بدل دے گا۔ ضروریات کو بالائے طاق رکھیے۔ ناشتہ بھی مت کیجیے۔ آپ کو بہت کچھ کھانا ہے۔ شوہروں کو نابکار بیویوں کی قسم، بیویوں کو نابکار شوہروں کا واسطہ ۳۰ فروری کو ایسا ہی یاد رکھیے جیسے آپ دس دس سال اپنے ایمپلائمنٹ کارڈ کی تجدید کی تاریخ یاد رکھتے ہیں مجھے امید ہے کہ آپ کا ووٹ "آلو" کے لیے ہے۔ آلو اور صرف آلو۔ کورس میں ایک شور سنائی دیا۔ " آلو کو ووٹ دو بیٹوں کو چھوڑ دو"

دوسری سمت سے آواز آرہی تھی۔۔۔۔۔۔" ہاں تو میں آپ سے یہ کہہ رہا تھا کہ آج آپ کو متحد ہونا ہے اور متحد ہو کر ووٹ دینا ہے۔ آپ کا ووٹ آپ کا تاریخی مستقبل ہوگا۔ آج ہر طرف اندھیرا ہے۔ گلی گلی کوچہ کوچہ اندھیرا ہے۔ یہ سب آپ لوگوں کے طفیل ہے۔ آپ اندھوں کی طرح ووٹ دیتے ہیں اور بے وقوفوں کی طرح انتخاب کرتے ہیں۔ آپ سے زیادہ کوئی آلو نہیں ہوگا۔ یاد رکھیے! جو آلو ہوگا وہ الو کو ووٹ دے گا۔ آپ کا ووٹ صرف کتے کے لیے ہے کیوں کہ کتا وفادار ہوتا ہے۔ راتوں میں جاگتا ہے"۔۔۔۔۔۔ مجھ سے کسی نے لقمہ دیا "اور بھونکتا بھی ہے"۔۔۔۔۔۔ "ہاں ہاں بھونکتا بھی ہے اور بھونکتا اس لیے ہے کہ چور اچکے آپ کے مکان آپ کی دوکان میں گھس نہ جائیں۔ آپ تمام بولیے۔ یہ صحیح ہے نا۔۔۔۔۔۔! پبلک میں سے کچھ منچلے بھوں۔ بھوں، بھوں۔ ں۔ ں" کی آواز نکالنے لگے ہیں۔ میں جانتا ہوں یہ آپ کی " بھونکنگ نہیں ہے کتے کی تائید ہے۔ کتا وہ وفادار جانور ہے جو صرف روٹی دینے والے کا وفادار رہتا ہے۔ میں بھی ہوں۔ آپ مجھے ووٹ دیجیے میں اپنی پارٹی کا ہمیشہ وفادار رہوں گا۔ بندر کی طرح پارٹیوں میں چھلانگیں نہیں لگاؤں گا۔ کتے

صبح سے کسی سے نہ بولا کروں گا۔ تم نہ آتے تو آج میں کسی سے نہ بولتا، آنے والوں کو اشاروں ہی اشاروں سے واپس کر دیا کرتا۔ میرا فیصلہ ٹھیک تھا نا، شیخ کلیم اللہ بولے، اچھا، میں سن رہا ہوں، اکٹھا ہی جواب دوں گا۔

میں نے کہا صبح اٹھتے ہی رات کا فیصلہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ صبح کو دماغ تر و تازہ لے کر اٹھا، پرانی باتیں یاد آنے لگیں، پرانے لوگ جو کبھی تھے انھوں نے کیا کیا نہ بولا۔ اب ہرگز نہیں بول سکتے۔ ان کی زبانیں تو کیا ان کے جسم تک گل چکے۔ میرا تو ابھی کچھ بھی نہیں گلا۔ پھر تو بولنا ایک نعمت ہے، خدا کی ایک دین ہے۔ انسان ہی حیوان ناطق ہے، جانور اس [illegible] ہیں۔ انسان کا بولنا منشائے قدرت ہے۔ انسان نہ بولیں تو انسان اور حیوان میں فرق کیا [illegible] جو زبان رکھتے ہیں مگر بولتے نہیں جس عضو کا جو کام ہے اس سے کام نہ لیا جائے تو [illegible] کچھ دنوں بعد یہ خیال آیا کہ توبہ کو توڑ تاڑ دوں۔ کیا توڑ ہی ڈالوں کلیم اللہ بولے، اچھا۔

میں نے بیان جاری رکھا۔ میں تو کچھ بھی نہیں بولتا۔ جب میں بچہ تھا۔ بولنے والی ایک اسّی سالہ بڑھیا تھیں۔ بڑی سینئر SENIOR بیوہ تھیں۔ بڑی طویل مدت سے بیوہ تھیں۔ عنفوانِ شباب ہی سے [illegible]راک تھیں۔ عمر بھر اولاد نہیں ہوئی۔ اولاد نہ ہونے کا الزام اپنے شوہر کے سر منڈھا کرتی تھیں۔ بیس سال پہلے شوہر کو بول بول کر ہی مار چکی تھیں۔ ان کا ماتھا بہت کشادہ تھا۔ قد بڑا لانبا تھا۔ ان کو مارنے کے لیے شوہر کو سیڑھی لگانی پڑتی تھی۔ اللہ اللہ بولنے کا یہ عالم تھا کہ علی الصبح سے جو بولنا شروع کرتیں آدھی رات تک [illegible]دلے ہی چلی جاتیں۔ ان کو مخاطب کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی حویلی کے در و دیوار ہی ان کی سننے کے لیے [illegible]ہت کافی تھے جس لق و دق حویلی میں شوہر کے انتقال کے بعد گزشتہ بیس برس سے وہ رہتی تھیں۔ بس [illegible]یلی رہا کرتی تھیں۔ ان کے بولنے کے چند ہی موضوع تھے۔ میرے باوا کی گود میں پڑے کیڑے، مجھے یہاں [illegible]دس بیاہ دیا۔ پھر میری خبر نہ لی۔ ساری عمر میں بس ایک دفعہ میرے پاس کھڑے کھڑے آیا تھا۔ سانڈنی [illegible] اونٹنی) پر بیٹھ کر آیا تھا، مردانی بیٹھک میں ہی میرے سسرے کے پاس بیٹھا حقہ پیتا رہا۔ میں نے کہا [illegible]پ کے پاس بھی تو آئے ہوں گے۔ بولیں کسی ملّا نے کہہ دیا ہوگا پی لے، حقہ میں کوئی ہرج نہیں، دھواں پیٹ [illegible]ں نہیں جاتا، پچانا تو پیٹ کا ہوتا ہے۔ ان کے شوہر کو ان کے علاوہ، ان سے شادی کرنے کے بعد ہی [illegible]و شادیاں اور کرنا پڑیں۔ ان دونوں سے اولاد بھی تھی۔ تین لڑکیاں وہ دونوں بیویاں اور ان کی لڑکیاں [illegible]لگ ہی حویلی میں رہتی تھیں، بوڑھیا کی حویلی سے الگ تھلگ اور ذرا فاصلے سے۔ اس حویلی کے ایک [illegible]بوڑھی سے ملازم بھی تھے۔ بوڑھاپے میں بھی جری پہلوان لگتے تھے۔ نام تھا چُنّا خاں۔ بوڑھیا کی دونوں [illegible]وتنیں شوہر کی زندگی ہی میں مر چکی تھیں، ان کی لڑکیاں سب زندہ تھیں۔ بوڑھیا ان کو علی الاعلان اور [illegible]واز بلند چُنّا خانیاں کہا کرتی تھیں۔ رات اور دن انھیں کوسا کرتی تھیں۔ میری سوتنوں کی گود میں پٹیں کیڑے [illegible]نا خانیوں کو آوے ڈھائی گھڑی کا ہیضہ، انھیں توڑے طاعون، چنا خانیاں یوں ہوجاں، چنا خانیاں

ہوں ہو جاں (ہو جائیں)، ہم کہتے آپ تو اولاد تبلایا کرتی ہیں، پھر یہ اولادیں کہاں سے آگئیں لیکن ان کے پاس اس کے بڑے واضح ثبوت تھے۔ پھر تو ریڈیو کھل جاتا تھا۔

میں تو دوسروں کو بولنے کا موقع بھی دے دیتا ہوں۔ بعض لوگ تو اپنی ہی کہے جاتے ہیں، دوسروں کو نہیں بولنے دیا کرتے، بدکلام فاحشہ عورتوں کی طرح۔ اسی ٹائپ کے ایک بزرگ تھے۔ اب تو وہ مرگئے۔ ان کے سامعین کو ان کی زندگی بھر یہی حسرت رہی کہ کبھی تو وہ ان کی بھی سن لیتے، کبھی تو وہ انھیں بھی بولنے کا موقع دے دیتے اب وہ سامعین ان کی قبر پر جاتے ہیں۔ فاتحہ پڑھنے کے لیے نہیں، انھیں مجبور جان کر انھیں اپنی سنانے کے لیے،

بولنا تو اسے کہتے ہیں۔ ہمارے باغ کا ایک چوکیدار ہے۔ ہے تھپٹ بہرا۔ اس سے چیخ چلّا کر بولنا پڑتا ہے۔ اس سے کچھ دریافت کرنا ایک بنیادی غلطی کا مرتکب ہونا ہے۔ پہلے تو وہ ہمہ تن گوش ہوکر سنتا ہے دونوں کانوں کے پیچھے ہر ایک ہتھیلی کی دیوار چین کھڑی کرکے، تاکہ آواز دشمن کی طرح نکل نہ بھاگے، پھر گھبرا کر اس کے قصر گوش میں جا پڑے۔ اگر پڑ جاتی ہے اور وہ آپ کے سوال کو سمجھ لیتا ہے، پھر تو یہ ہوتا ہے کہ "یہ ہوں میں نکوہ نے یوں راگ سے جیسے باجہ" اک ذرا چھیڑیئے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔" آپ کے ایک سوال کو سوال ضد جواب سمجھتے ہوئے، شترطرح سے اس کے جواب دینے لگتا ہے۔ آپ کے سننے اور سمجھنے کا انتظار نہیں کرتا۔ بغیر کاما بغیر فل اسٹاپ بولے ہی چلا جاتا ہے۔ آپ سنتے سنتے تھک جاتے ہیں، وہ کہ بولتے بولتے نہیں تھکتا۔ آپ سوال کرنے کی غلطی پر اپنے کان اینٹھتے ہوئے باغ سے باہر چلے آنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ آپ کے پیچھے چل پڑتا ہے، اسی ایک سوال کا جواب دیتا۔ وہ آپ کو چالیس کے بجائے سو قدم تک چھوڑ کر آپ کا پیچھا چھوڑتا ہے۔

بولنے والی مذکورہ بالا ہستیوں کے آگے میں کتنا سا بولتا ہوں، کیا خاک بولتا ہوں، شیخ سعدی کے مقولے کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہی تو بولتا ہوں "تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد"۔ میرے بھی ہنر ہنر کے خانے میں جا پڑے ہیں، عیب عیب کے خانے میں۔ ڈھکا چھپا کوئی عیب رہا ہے، نہ ہنر۔ تم مجھ سے عمر میں ضرور کم ہو، عقل میں زیادہ ہو۔ بزرگی عقل سے ہوتی ہے۔ اسی لیے میں تمہیں اپنا بزرگ ماننے کے لیے مجبور ہوں۔ اب تم ہی بتلاؤ کلیم اللہ، ابنارات کا عہد قائم رکھوں یا توڑ دوں۔

کلیم اللہ بولے، یہ تو سب مثالیں افراط کی ہیں۔ اب تفریط کی سن۔ ایک چپ شاہ تھے۔ جب میں پانچ چھ برس کا تھا۔ وہ میرے دادا کے پاس بیٹھک میں بیٹھنے آیا کرتے تھے۔ بھرا ہوا جسم، لانبا قد، سیاہ داڑھی کم از کم تین بالشت لٹکی ہوئی۔ داڑھی کی چوٹی ناف سے باتیں کیا کرتی تھی۔ عورتوں کے سے لانبے بال، آدھے گردن سے داہنی طرف آدھے بائیں طرف۔ بولتے بالکل نہیں تھے۔ زبان تو تھی ثابت وسالم بھی تھی۔ دکھلایا کرتے تھے کہیں باہر کے آئے ہوئے تھے۔ دو سال ہماری بستی میں رہ گئے۔ سب سے شیر و شکر ہو کر ملتے تھے، بعض کہتے تھے پکوں سے ہنستے، جوانوں کو زبان سے نہیں، اشاروں سے اپنی سرگزشت سناتے تھے۔ جنگال کا رہنے والا ہوں کوئی بہن ہے نہ بھائی، ماں باپ مرگئے، لوہے کا کام کرتا ہوں، روزی کماتا ہوں، گونگا بھی ہوں، بہرا بھی

عاصی سعید
عمری کلاں (مراد آباد)

بولا نہ کروں

چپ رہا کروں، گونگا بن جاؤں، ہونٹوں کو سی لوں، منہ بھی نہ کھولوں۔ میرا بولنا میرے لیے ایک مصیبت ہو کر رہ گیا ہے۔ بعض لوگ بہت بولتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک میں بھی ہوں۔ بولنے کی لت سی پڑ گئی ہے۔ بولے بغیر معدی ہضم نہیں ہوتی۔ خیریت ہے کہ گھر گھر جا کر تو بولتا نہیں، راہگیروں سے بھی نہیں بولتا۔ البتہ کوئی میرے گھر پر آ جائے خواہ اپنے ہی کسی کام سے آئے، خواہ پانچ منٹ بیٹھنے ہی کی نیت سے آئے۔ بس بیٹھا لکھا ہو پھر تو اس کے لیے باعث آزار بن جاتا ہوں۔ اس کے کان کھا ڈالتا ہوں۔ میری زبان تھمنے کا نام نہیں لیتی بس بولتی ہی چلی جاتی ہے۔ میرے مزاحیہ مضامین سناتی ہے لطافت و ظرافت، تلخ و شیریں مگر تمسخر انگیز تجربات زندگی قہقہے لگواتی ہے۔ یہاں تک کہ میرا گلا خشک ہو جاتا ہے پانی کے گھونٹ پی پی کر تر کرتا رہتا ہوں، مخاطب کو بھی پانی پلواتا رہتا ہوں۔ کسی مخاطب کی اچھائی کرنے پر آتا ہوں تو دگنا، سہ گنا، چوگنا کیے ہی چلا جاتا ہوں۔ سن تو لے، خواہ داد نہ دے۔ کسی مخاطب کی برائیاں کرتا ہوں، تو لگی لپٹی رکھتا نہیں، کہے چلا جاتا ہوں، گالیاں دے تو سامنے دے، یہیں بھڑاس نکال لے، گھر کے لیے بچا کر نہ لے جائے۔ قائل ہو یا قائل کرے۔ غرض اچھائی ہو یا برائی، اپنی ہو یا پرائی۔ منھ پر لے آتا ہوں، پیٹ میں رکھتا نہیں۔ پیٹ کو پیٹ ہی سمجھتا ہوں، بات گھر نہیں سمجھتا۔

بیگم کو الگ شکایت ہے، بس کوئی خط کا مارا تمہارے پاس آ بیٹھے، اس سے بولے ہی چلے جاتے ہو، آسمان سے براڈ کاسٹ کرنے لگتے ہو، زمین کو بھول جاتے ہو، ان سب کو بھول جاتے ہو جو زمین پر ہیں۔ یہاں تک کہ مجھے بھی، جو تمہارے پلّے سے بندھی ہوں۔ تمہیں بھگتنے پر مجبور ہوں، بولو تو مجھ سے بولو، اور کسی پر تمہارا کیا حق؟ وقت برباد کرو تو میرا کرو، ذرا مزہ تو چکھنے کو ملے، گھنٹوں گھنٹوں تمہارے گھٹنے سے لگی بیٹھی رہوں، تم بولتے رہا کرو، میں سنتی رہا کروں، نہ روٹی پکاؤں نہ ہنڈیا، گھر میں کوئی بھوکا ہو کر تو مرے، تمہیں نصیحت تو ہو کہ زیادہ بولنا اچھا ہوتا ہے یا برا؟ اس گرانی کے زمانے میں بھی تمہیں کمانے کی فکر نہیں۔ بیگم کی یہ شکووں کی بحث اور سرزنش آمیز نصیحتیں بھی محبت ... بے اثر ثابت ہوتی ہیں۔ اس کان سنتا ہوں، اُس

کان نکال دیتا ہوں۔

ایک روز میرا چھ سالہ بچہ بسکٹ کی ضد کر رہا تھا، خالی چائے نہیں پی رہا تھا، روئے چلا جا رہا تھا بیگم نے مجھ سے بسکٹوں کے لیے پیسے مانگے۔ میں نے مذاق میں کہہ دیا، آج تو نوٹ پھٹ گئے، جیب نکل گئی۔ بیگم مجھے زہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر مجھ پر زہرخند کرنے لگیں، پھر بچے کو مار مار کر زبردستی اُس کے منہ میں چائے انڈیلنے لگیں۔ وہ اور بھی چیخ چیخ کر رونے لگا۔ بیگم نے اس سے کہا، جا دکاندار سے ایک بسکٹ کی بھیک مانگ لا۔

اُس روز تو میری عقل کے بند دروازے کھل گئے۔ اس روز میں نے سوچا، واقعی صحیح فرمایا کرتی ہیں بیگم حقیقت پر انگلی رکھ دیا کرتی ہیں یہ، زیادہ بولنے کی عادت اچھی نہیں بُری عادت ہے۔ کوئی کہیں کا بڑا بولنے والا تو ہوں نہیں، آسکر وائلڈ کی طرح، نہ کوئی بڑا مدلل باتیں کرنے والا ہوں۔ تک سے زیادہ بے تُکا بولتا ہوں، پروفیسر تو ہوں نہیں، وکیل بھی نہیں ہوں، نہ لیڈر ہوں، وہ تو سب بولنے کا کھاتے ہیں۔ میں تو تھا کسان ہوں، بغیر بولے بھی کھا سکتا ہوں، لاؤ پھر کیوں نہ بولنا چھوڑ دوں، بولنا نہ چھوڑوں گا تو کہیں بیگم مجھے نہ چھوڑ دیں۔

اسی روز رات کو محاسبہ کرنے لگا، آج کتنوں سے بولا، کتنا کتنا بولا، مخاطبوں کا کتنا کتنا وقت برباد کیا، گھر کے کام کاج نہیں دیکھے، ماہوار چینی راشن سے ملنے کی تاریخ بھی گزر گئی۔ اب تیل چینی بلیک سے لینا پڑے گا، فصلوں کو جا کر نہیں دیکھا۔ اُن میں الگ نقصان ہوا، کوئی مضمون لکھ لیتا۔ اُس سے بھی گیا۔ اُس کو بھی چھوڑو، بولنے کا کیا نتیجہ نکلا، کتنے میری قوت گویائی کا لوہا مان کر اُٹھے، کتنے مجھے دل دل میں بلنڈر بور (BLUNDER BORE) کہہ کر اُٹھے، کتنے پھر کل کو آئیں گے، کتنوں نے نہ آنے کا تہیہ کر لیا۔ لہٰذا قبل از شب خوابی عہد کر کے سویا بس بول لیا جو بولنا تھا، کل صبح سے نہ بولا کروں گا۔ بولنے کا بائیکاٹ بولنے پر کرفیو کوئی بلائے گا تب بھی نہ بولوں گا، زبان تو اپنی جگہ پر رہے گی، کاٹ تو نہیں جائے گی، بس کہے گی، دوسرا کام اپنا اصلی کام، کھانوں کا ذائقہ لینا، لے کر مجھے دینا، کل صبح سے اس عہد کی خلاف ورزی نہ ہوگی۔ سو گیا۔

صبح اٹھا۔ رات کا عہد خوب یاد تھا۔ منہ ہاتھ دھونے گیا۔ بیگم نے کہا، ناشتہ لاؤں میں نے زبان سے جواب نہیں دیا۔ ناشتے کی میز کی طرف انگلی جھکا کر اشارہ کر دیا، یعنی یہاں رکھ دو۔ ناشتے کے بعد پان کی گلوری منہ میں دابی اور نیچے بیٹھک میں آگیا۔ ملازم نے سڑک کی طرف کا پھاٹک پہلے ہی کھول رکھا تھا۔ میں نے دیکھ لیا۔ اشارے سے کہا اس کو پھر سے بند کر دو۔ کوئی اندر نہ آنے پائے۔ ملازم نے کہا، آپ کے دوست کلیم میاں کی خبر آئی ہے، آپ کہیں باہر نہ چلے جائیں۔ کچھ ہی دیر میں آنے والے ہیں۔ میں نے آہ سرد بھر کر سوچا اب عہد پر کہاں عمل ہو سکے گا۔ سوچ ہی رہا تھا، دیکھتا کیا ہوں، پھاٹک سے شیخ کلیم اللہ چلے آ رہے ہیں۔ میں نے کہا، یار اچھے آگئے تم، میں تمہیں یاد ہی کر رہا تھا، تمہارا ہی ذکر خیر تھا، بڑی عمر ہے تمہاری۔ وہ بولے خیر تو ہے، کیوں یاد کر رہے تھے۔ میں نے کہا ایک مسئلہ در پیش ہے، یہ جو میں بولا کرتا ہوں، ہر وقت بکواس کرتا رہتا ہوں، کیا یہ بات اچھی ہے یار بولنے کی، زندگی سے میں اب تو عاجز آگیا، رات ہی فیصلہ کیا، کل

اور سرکاری ملازمت تو احمقوں کو دوسری مرتبہ نہیں ملتی۔ ایک دن مدرسہ جا رہے تھے کہ ایک شخص کو دیکھا، ہمارے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے گویا وہ آدمی نہ ہو ہماری پرچھائیں ہو۔ ابن صفی کو خدا غریق رحمت کرے ان کی کہانیوں کے طفیل ہم تعاقب کے پیچ و خم سے خوب واقف تھے۔ سمجھ گئے یہ شخص نام پوچھے بغیر ہم پر پیچھے سے حملہ کرنا چاہتا ہے۔ اب کیا کریں نام پوچھتا تو بخوشی اس کے نام کا قافیہ دہراتے یہ تو تمہید کے بغیر ہی مضمون شروع کر رہا ہے۔ ہم نے اپنی رفتار میں تیزی کر دی۔ لیجئے اس کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ ہم نے خاموشی سے خود کو حجام گلی میں موڑ لیا۔ وہ بھی مڑ گیا ہم چلتے رہے وہ بھی چلتا رہا ہمیں حیرت ہوئی کہ یہ گدھا ہے یا گدھے کا سایہ! کنکھیوں سے پیچھے دیکھا۔ اس کی آنکھیں خونبار تھیں۔ ایک ہاتھ جیب میں تھا ممکن ہے چاقو نہاں ہو۔ اس خیال سے ہم لرز لرز گئے۔ کیا عقد ثانی کے بغیر ہی اس دنیا سے گزر جانا ہے۔ ابھی ہماری عمر ہی کیا ہے۔ بےوقوفی چلئے کی تو چالیس برس کے ہوں گے۔ حالانکہ ہم سرکاری طہارت خانوں میں نہیں جاتے کہ طہارت ٹوٹ جاتی ہے۔ مجبوری نے خود کو ایک طہارت خانے میں کھڑا کر دیا۔ شاید ہمارے لیے کھڑے کھڑے یہ کام بھی ممکن نہیں۔ بس صرف کھڑے ہی رہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مردود پان کے ڈبے پر ایستادہ تھا۔ جلدی سے نکل گئے۔ ہم مشرق پر تو وہ مشرق میں۔ ہم مغرب میں تو وہ بھی مغرب میں۔ آخر اسکول آ گیا۔ اور ہم بچوں کے سہارے کلاس میں داخل ہو گئے۔ بچوں کو "رتّی بھر کا بچہ" پڑھا رہے تھے۔ کل راہ میں جاتے جو ملا "بھر کا بچہ" بچے پڑھ رہے تھے۔ اب راہ میں آتے جو ملا کہتے "کا بچہ" "جب دو تین دفعہ یہ مصرع سنا تو حیران رہ گئے۔ نظیر اکبرآبادی کے زمانے میں الیکشن تو تھا نہیں پھر رستے میں انھیں کہتے "کا بچہ کیوں کر ملا۔ ہم نے بچوں کو ڈانٹ پلائی۔ مصرع صحیح پڑھو۔ بچوں نے کہا سر ہم خود حیران ہیں کہ یہ آپ ہمیں کیا پڑھا رہے ہیں۔ آپ اگر گالیاں بھی پڑھائیں گے تو ہم بخوشی پڑھ لیں گے۔ ہم آپ سے بہت ڈرتے ہیں۔ ہم خوش ہو گئے، اگر ہم حال سے ڈر [illegible] کیا ہوا مستقبل ہم سے ڈرتا ہے چپراسی اندر آیا کہنے لگا۔ آپ سے کوئی ملنے آئے ہیں۔ باہر نکلے تو بےاختیار اندر ہو گئے گویا پولیس والے نے کالر پکڑ کر اندر کھینچ لیا ہو۔ باہر وہی مکروہ شکل تھی۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے باہر جھانکا بس اس نے سلام جڑ دیا۔ سلام مدام تمہید پیام۔ آثار کلام اور نشان احترام ہوتا ہے۔ مصافحہ کے بعد کہنے لگا۔ آپ کا پیام موصول ہوا ہے۔ فرصت کدے سے آیا ہوں۔ مجھے آپ کی چال ڈھال کام کاج دیکھنے کے لیے بھیجا گیا ہے وہ ہم سے مل کر بہت متاثر ہوا۔ کہنے لگا۔ آپ PHD کر رہے ہیں اور مدرسہ میں ٹیچر ہیں۔ آپ کو تو پروفیسر ہونا چاہیئے۔ ہم نے قہقہہ لگا کر کہا (شاید خوف جاتا رہا تھا) کالجوں میں جائیدادیں بہت کم ہیں اور ہم اپنے اساتذہ کے بدخواہ نہیں۔ خدا انھیں سلامت رکھے خواہ ہم ٹیچر ہی کیوں نہ رہیں اور یوں بھی یونیورسٹیوں میں جب تک تمام خوب صورت نازک اندام لڑکیوں کا تقرر نہیں ہو جاتا ہم جیسے لائق فائق مردوں کا تقرر آسان نہیں۔ جب وہ رخصت ہو گیا تو ہم سوچنے لگے کہ الیکشن نے تو ہمیں پریشان ہی کر دیا۔ دوست دشمن میں تمیز ہی نہ رہی۔ ہم آخر میں اپنی حکومت سے لیڈروں کی طرح ہاتھ جوڑ کر استدعا کرتے ہیں کہ الیکشن کو دس سالہ بنا کی صورت دی جائے تاکہ باتمیز لوگوں کو کم از کم دس سال تک کوئی طوفان بدتمیزی دیکھنا نہ پڑے۔

غالب ثانی
(حیدرآباد)

اِمسال

روز اِک گُل کھلائیے اِمسال — سال بھر مُسکرائیے اِمسال
نیتا اُچھلے ہیں خُوب پچھلے برس — اُن کو خاموش پائیے اِمسال
چرخ پر جُھولتے تھے جو ہر دم — پیادہ پا اُن کو پائیے اِمسال
سنیاسی تو ہو گیا رخصت — چِنّا بابا بھی آئیے اِمسال
آپ کہنہ کھلاڑی میداں کے — ق — خُوب دُھومیں مچائیے اِمسال
ہو وہ نیتا کی بیوہ یا بیوی — پارلیمنٹ میں لائیے اِمسال
گردنی تھا بُخار پچھلے سال — کمر اپنی بچائیے اِمسال
مُرغ سستا ہوا ہے بکرے سے — خُوب اس کو دبائیے اِمسال
مرحبا آ گیا ہے کمپیوٹر — کاتبوں کو ہٹائیے اِمسال

ذوق تو دال کھائے اور غالب
آپ بریانی کھائیے اِمسال

○

ہے اگر حاجت کسی انعام کی اکرام کی — پہلے عادت ڈالیے آداب کی بدنام کی
ہو گیا اعلان بھولے سے جو راحت فنڈ کا — سنتے ہی باچھیں کھلی جاتی ہیں سب حکام کی
ہے محافظ کو محافظ کی ضرورت ان دنوں — دیکھیے نیرنگیاں اب گردشِ ایّام کی

اس زمانے میں ظفر سا سر پھرا اب کون ہے
فکر رہتی ہے اسے آغاز میں انجام کی

ظفر کمالی (پٹنہ)

کو ایک بار آزمائیے۔

آئیے اب آپ کو ان سے ملاؤں جو کتے کے مقابلہ میں ترینگ رہے ہیں میں نام تو نہیں لوں گا۔ کوئی ہے گھڑو خاں تو اب بے چارے کی نوابی چلی گئی بو باقی رہ گئی ہے۔ دیوڑھی بک گئی ہے باہر کا چبوترہ رہ گیا ہے۔ اب وہ اپنا سودی قرض چکانے کی فکر میں ہے خبردار "گدھے" کو ووٹ نہیں دینا۔ وہ آپ کے گھر کا ہے نہ اپنے گھاٹ کا۔ کون حق دار ہے۔ یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ اس نے اپنی محبوبہ کے آشنا کا قتل کر دیا ہے۔ اپنی دیوڑھی کا ایک حصہ بیچ کر چھٹکارا پایا ہے۔ بھلو نے مرتے وقت یہ بات بتائی ——— دوستو۔ کیا آپ لیے بیچ۔ کم ظرف۔ گدھے کو ووٹ دیں گے۔ نہیں۔ آپ کا کتا آپ کا اپنا ہے۔ راتوں میں جاگنے والا۔ بھونکنے والا۔ غنڈہ کورس۔ آج یہ سب کا کہنا ہے۔ کتا آپ کا اپنا ہے"۔ کتے کو ووٹ دو۔ کتے کو ووٹ دو۔ کتا ... ہم نے اس پچھلے دار بے معنی بکواس کورس کر دونوں کانوں میں اپنی دو عدد انگلیاں ٹھونس لیں۔ گویا صنم خانے میں اذاں دینے کا ارادہ کر رہے ہوں۔ مگر حلق کے پھٹنے کی صدائیں کانوں کے پردوں کو بہر طور پھاڑ رہی تھیں۔

۳۰ فروری آئی تو صبح ہی سے لوگ بغیر ہاتھ منہ دھوئے ووٹ ڈالنے گھر سے نکل گئے ہم بھی ووٹنگ کا تماشہ، لاٹھی چارج، تلبیس شخصی، لوٹ مار، بیلٹ باکس کی چھین جھپٹ دیکھنے گئے۔ ووٹ دینے والوں کی قطار دیکھ کر محبوب کی زلف یاد آگئی تو آپ کا ذوق شوق دیکھ کر کہئیں۔ عورتیں الگ قطار میں تھیں مرد الگ قطار میں۔ چہارم کی لڑکیاں اور سوم کے لڑکے بھی اپنا اپنا ووٹ سنبھالے کھڑے تھے۔ ووٹ دینے کی عمریں کمی کے سبب پولنگ بوتھ بازیچۂ اطفال لگ رہا تھا۔ ممکن ہے آیندہ ہر بچہ دودھ چھوڑتے ہی ووٹ دینے کا اہل قرار پائے۔ آخر بچے کو بھی عقل ہوتی ہے اگر عقل نہ ہوتی تو وہ دودھ کیوں چھوڑتا۔ بغیر محنت کے پیٹ بھرتا رہتا۔ ایک خاتون نے ہم سے فخریہ کہا کہ مولوی صاحب میرے بیٹے نے بہ نفس نفیس چالیس ووٹ ڈالے ہیں ہم نے کہا واقعی وہ علی بابا ہوگا۔ حیرت ہے کہ حکومت ووٹ ڈالنے والے کے ہاتھ رنگ دیتی ہے تاکہ وہ دوسری مرتبہ رنگے ہاتھوں پکڑے جائیں۔ جب خون کے دھبوں کو زبان خنجر کے ساتھ ساتھ آستینوں سے بھی بآسانی مٹا دیا جاتا ہے تو ووٹ کا کالا دھبہ کس شمار میں۔ ایک منچلے نے کہا لیمو کے رس سے وہ دھبہ مٹ جاتا ہے۔ اب ہم نے غور کیا کہ اس دن لیمو اس قدر گراں قیمت میں کیوں فروخت ہو رہے تھے۔

الیکشن کے ایام میں سڑکوں پر ایک عجیب و غریب وحشت ناک سماں ہی ہوتی ہے انسان کم جانور زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ اوپن ٹاپ جیپ کاڑیاں، نعرے، الغرض کی جگہ وہ آوازیں۔ الیکشن شروع ہوتے ہی احباب کے مشوروں کا سیزن شروع ہو جاتا ہے۔ "الیکشن کا زمانہ ہے۔ ذرا دیکھ سنبھل کر جائیے۔ فساد کا اندیشہ ہے۔ سنا ہے کہ کرفیو ہو جائے گا۔ آپ نرے بے وقوف آدمی ہیں۔ اپنی دُھن میں رہتے ہیں۔ شاعری چھوڑیئے۔ نام پوچھا جائے تو نام بتانے میں جلدی نہیں کرنا۔ پہلے نام پوچھنے والے کا خود نام پوچھ لینا۔ پھر اس کا قافیہ کہہ دینا۔ نام پوچھنے والا اگر اپنا نام بتائے رام تو اس کا قافیہ ہے شام۔ اگر رحیم تو اس کا قافیہ ہے کریم

ہمیں حیرت ہوئی کہ الیکشن نے غیر شاعر کو قوافی سے کس قدر مانوس کر دیا ہے واقعی ادب سماج کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

چھوٹو دادا جب کونسلر کے لیے کھڑے ہوئے تو ان کے تمام پوتروں اور پوتریوں نے "لٹوں" اور "جھڑوں" کی قسم کھائی، کہ شہر میں خون کی ندیاں ہی کیوں نہ بہنے لگیں، کمر توڑ سر پھوڑ کوشش کی جائے گی۔ چھوٹو کو سلیقہ سے کھادی میں ملفوف کیا۔ ہاتھ جوڑ کر ایک پوز لے لیا۔ چھوٹے بازار میں بڑا سا کٹ آوٹ لگا دیا جو دور سے [illegible] معلوم ہوتا تھا۔ محلہ کے نوجوان کے دو گروہ ہو گئے۔ پڑھا لکھا طبقہ کہتا تھا کہ جس نے عمر کا بیشتر حصہ جیل میں گزارا ہو جس کے پاس حلال کی ایک کوڑی نہ ہو جو بات کرنے سے پہلے چاقو نکالتا ہو جو کئی قتل میں ملوث ہو وہ ہماری کیا خدمت کر سکتا ہے۔ دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ یہ بھی تو دیکھنا چاہیئے کہ مقابلہ پر کون "مائی کا لعل" ہے "یاڑو بھڑا" بھی تو اپنی پوری ٹیم کے ساتھ مٹک رہا ہے۔ کس شان سے اس نے "آل انڈیا بھڑا دل" بنائی ہے اور "ڈھول" کو اپنے نشان کے طور پر منتخب کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ڈھول کی ایک ایک تھاپ پر ایک ایک مسئلہ حل ہوگا۔ اگر بھارت کے تمام بھڑے ایک ہو جائیں تو وہ ایکشلین کابینہ میں شامل ہوگا۔ چھوٹو کو تقریر کرنی آتی نہیں اور یاڑو مٹک مٹک کر تقریر کر رہا ہے۔ تقریر کے دوران ناچتا بھی ہے۔ ناگنہ کا گیت "میں تیری دشمن دشمن تو میرا" معنی خیز انداز سے گاتا ہے۔ ایک دن تو اس نے چوراہے پر تیزاب کا گیت ایک دو تین شروع کر دیا۔ جی میں آیا اس کے منہ میں تیزاب انڈیل دیں۔ مگر جمہوریت میں چونکہ بھڑے بھی آزاد ہیں اس لیے خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو رہے۔ لوگ اس کی جانب نہ جانے کیوں شد و مد سے مائل تھے اور ادھر چھوٹو دادا "بھیر تپک" میں مصروف۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اسمبلی کو ونگل بنا کے چھوڑے گا۔ ہوا ہی کچھ ایسی چل رہی ہے۔ ہم نے تو فیصلہ کر ہی لیا کہ کچھ ہو بھڑے یاڑو پر چھوٹو دادا کو ترجیح دینی چاہیئے۔ چنانچہ جب ہم ووٹ ڈالنے پولنگ بوتھ پر پہنچے تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ دو تین پہلوان اور دو تین پولیس والے موجود تھے ہم نے کہا "بھئی وہ ہمیں ووٹ ڈالنا ہے"۔ ایک پہلوان جس کے ہاتھ میں ایک مضبوط سونٹا تھا کہنے لگا۔ "تمہارا ووٹ ہم ڈال دیں۔ ہم نے لجاجت آمیز احتجاج کیا۔ ہمارا ووٹ اور آپ حضرات ...... ! وہ بولا۔ ترے کو کیکو۔ پورے محلے کے ووٹاں اپیچ ڈالیں"۔ ہم نے قدرے برہمی سے کہا۔ یہ تو زیادتی ہے۔ آخر ہم ......" زیادہ چخ چخ نکو ـــــ جاتیں یا تیرے کو بھی ووٹ بنا کر ڈبے میں ڈالنا"۔ ہمیں اس گستاخی پر مدبرانہ غصہ آگیا۔ یہ پولیس کی موجودگی میں ..... افسوس ہے ..... ! ارے چوپ ! پہلوان اٹھ گیا۔ ہم لرز کر پیچھے ہٹ گئے۔ جیسے بچہ پالتو کتے سے ڈر جاتا ہے۔ خیریت اسی میں جانی کہ جان بچائی جائے جو لاکھوں کی چیز ہے۔ اس دھاندلی کا نتیجہ یہ نکلا کہ چھوٹو دادا کونسلر بن گیا اور محلہ میں کچرے کے انبار لگ گئے۔ گڑھے اپنی تعداد بڑھانے لگے۔ پانی بھر گیا تو ملیریا پھیلنے لگا۔ بدبو سے محلہ ایک ہو گیا۔ جب لوگ کونسلر کے پاس احتجاج کے لیے جاتے تو انھیں سیدھا دواخانے جانا پڑتا۔ ہم بہت خوش تھے کہ ہم نے ووٹ نہیں ڈالا ہے ورنہ ہم بھی کل روسیاہ ہوتے۔

الیکشن کے موسم میں ہم "مزدوراً" بھی گھر کے باہر قدم نہیں رکھتے لیکن ملازمت بہر حال ملازمت ہے

خامہ بگوش
(کراچی)

غالب اخترالایمان کے مشورے پر عمل کرتا تو بڑا شاعر ہوتا

اس کے باوجود کہ ہمارا عہد۔ بڑی شاعری کا عہد نہیں ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اخترالایمان ہمارے عہد کے ایک بڑے شاعر ہیں۔ راشد اور فیض کے انتقال کے بعد تو برسوں میں صرف وہی رہ گئے ہیں۔ حضرت وامق جونپوری بھی بفضلِ خدا موجود ہیں اور ۸۲ برس کی عمر میں ویسے ہی شعر کہہ رہے ہیں، جیسے پچاس برس قبل کہتے تھے، لیکن ان کی بڑائی عمر کی وجہ سے ہے۔ عمر میں بڑا ہونے کا یہ فائدہ ہے کہ شاعر کو مشاعروں میں سب سے آخر میں پڑھوایا جاتا ہے حالاں کہ غور سے دیکھا جائے تو یہ فائدہ نہیں سراسر نقصان ہے۔ آٹھ دس گھنٹوں تک دوسروں کا کلام سننے کے بعد بزرگ شاعر کی باری اس وقت آتی ہے، جب وہ اپنا کلام سنانے کے تو کیا؟ اٹھ کر گھر جانے کے بھی قابل نہیں رہتا۔

اخترالایمان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے جدید نظم کو فکر و فن کی نئی جہتوں سے آشنا کرایا اور بقول خود اپنے عہد کے آدمی کے روحانی کرب کو لفظوں میں ڈھال دیا ہے۔ ان کا اسلوب عام شاعروں سے یکسر مختلف ہے۔ بظاہر کھردرا، بباطن ملائم۔ وہ خوابیدہ لفظوں کو جگا کر اس جہانِ معنی کا سراغ دیتے ہیں، جو عام نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ مظفر علی سید کا یہ خیال درست ہے کہ جب ہم جدید شاعری پر گفتگو کرتے ہیں تو ہمیں عموماً صرف دو آوازیں سنائی دیتی ہیں، جو راشد اور فیض کی ہیں، جب کہ ایک تیسری آواز بھی موجود ہے، جو پہلی دو آوازوں سے کسی طرح کمتر نہیں اور یہ اخترالایمان کی آواز ہے۔

پچھلے دنوں اختر صاحب کراچی تشریف لائے تو انھیں بقول میر مانندِ جام ، ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ان کے اعزاز میں اتنی تقریبیں ہوئیں کہ سابقہ تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ کسی خاص گروپ کے منظورِ نظر نہیں تھے۔ ترقی پسند ہوں یا تنزل پسند جدیدیے ہوں یا روایتی ادب پرست سب نے انھیں آنکھوں پر جگہ دی۔ حد تو یہ ہے کہ کراچی کے ڈاکوؤں نے بھی انھیں نظر انداز نہیں کیا۔ جس روز وہ انجمن ترقی اردو کے جلسے میں اپنا کلام سنانے اور اپنے بارے میں مظفر علی سید کا مقالہ سننے کے لیے جا رہے تھے، تو راستے میں ڈاکوؤں نے اسلحے کے زور پر ان کی کار چھین لی، جس کی خبر جلی سرخیوں کے ساتھ کراچی کے اخباروں میں شائع ہوئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ڈاکو اختر صاحب کی بیاض چھیننے آئے تھے، لیکن جب معلوم ہوا کہ موصوف بیاض رکھتے ہی نہیں، تمام کلام ان کے ذہن میں محفوظ رہتا ہے، تو ڈاکو غصے میں کار چھین کر لے گئے۔ گندم اگر بہم نہ رسد بھس غنیمت است۔

بیاض چھیننے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس سلسلے میں بعض ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ اختر صاحب کراچی کی ہر تقریب میں کم از کم پچاس نظمیں ضرور سناتے تھے، زیادہ سے زیادہ کی کوئی قید نہیں تھی۔ اس پر کچھ لوگوں نے

سوچا ان کی بیاض ان سے لے لی جائے، مگر ان سادہ لوحوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ اختر صاحب بیاض بردار شاعر نہیں ہیں۔ ان کا حافظہ بے مثال ہے۔ انہیں اپنا سارا کلام اسی طرح یاد رہتا ہے۔ جس طرح بعض شاعروں کو اپنے معاصرین کے عیوب ازبر ہوتے ہیں۔

ہر محفل میں اختر صاحب اپنی شہرۂ آفاق نظم "ایک لڑکا" ضرور سناتے تھے۔ کبھی اپنی مرضی سے اور کبھی دوسروں کی فرمائش پر۔ اس طرح یہ نظم ان کے سامعین کو بھی حفظ ہو گئی۔ اب یہ حال ہے کہ کراچی کے دو ادیب آپس میں کبھی لڑتے ہیں تو ایک دوسرے کو یہ دھمکی دیتے ہیں "اختر الایمان کی نظم "ایک لڑکا"، سنا کر تمہارا مزاج درست کر دوں گا۔

خیر یہ تو مذاق کی باتیں تھیں اصل بات ہمیں یہ عرض کرنی ہے کہ اختر صاحب شاعری کے اعتبار سے ہی خوش کلام نہیں ہیں۔ عام گفتگو بھی وہ بہت اچھی کرتے ہیں اتنی اچھی کہ بعض اوقات سوچنا پڑتا ہے کہ ان کی شاعری زیادہ فکر انگیز ہے یا ان کی گفتگو کراچی کی محفلوں میں انہوں نے گفتگو کا جادو جگایا۔ بہت سے اخباروں، رسالوں میں ان کے انٹرویو شائع ہوئے کیا ہی اچھا ہو اگر ان ساری گفتگوؤں کو کتابی صورت میں مرتب کر دیا جائے۔ اختر صاحب کی شاعری کی کلیات "سرو ساماں" کے نام سے چھپی ہے۔ گفتگوؤں کا مجموعہ "بے سرو ساماں" کے نام سے چھاپا جا سکتا ہے۔ یہ نام اس لیے تجویز کیا گیا ہے کہ اختر صاحب نے اپنے انٹرویو میں اپنے معاصرین کو شاعری کے اعتبار سے بے سرو ساماں ثابت کیا ہے۔

اس وقت ہمارے سامنے اختر صاحب کی وہ طویل گفتگو ہے جو انہوں نے احمد ہمدانی، حسین انجم، اور مظہر جمیل سے کی ہے۔ اور رسالہ "طلوعِ افکار"، کراچی کے دسمبر ۸۹ کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ اختر صاحب نے اپنے معاصرین کے بارے جو کچھ کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ موجودہ دور کے صرف بڑے شاعر ہی نہیں، اکیلے شاعر بھی ہیں۔ یعنی ان کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر شاعر موجود نہیں ہے۔ ترقی پسند شاعروں کو انہوں نے یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ "اکثر ترقی پسند احباب کی شاعری VERCIFICATION یعنی کلام موزوں سے آگے نہیں جاتی"، مجاز، فیض، مخدوم اور فراق کو تو وہ کسی حد تک شاعر مان لیتے ہیں لیکن باقی سب کی شاعری انہیں "تخلیقی شاعری سے باہر کی چیز نظر آتی ہے۔

انہوں نے دو نمائندہ ترقی پسند شاعروں علی سردار جعفری اور کیفی آعظمی کے نام لے کر ایسی باتیں کہی ہیں جس کی توقع کسی بھی با مروت شخص سے نہیں کی جا سکتی۔ سردار جعفری کو شاعر نہیں "موزوں طبع" قرار دیا ہے۔ اور کیفی آعظمی کے بارے میں فرمایا ہے۔ "ایک اور شاعر ہیں کیفی آعظمی، بڑا نام ہے ان کا، آئے دن ان کے جشن ہوتے رہتے ہیں۔ ترقی پسندوں کے مقبول شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ ہماری بھی دوستی ہے لیکن شاعری کے معاملے میں انہیں GENUINE شاعر نہیں سمجھتا ان کے ہاں VERCIFICATION کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اب آپ اپنی کوشش اور اپنے گروپ کی کوشش سے تو شاعر نہیں بن سکتے۔ یہ تو خداداد معاملہ ہے۔ تانہ بخشد خدائے بخشندہ ایسے بے شمار لوگ ہیں جو پروپیگنڈے کے زور پر راتوں رات شہرت حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن ایسی شہرت کس کام کی اور وہ کتنے دن چل سکے گی۔

ترقی پسندوں سے ہمیں بھی بہت سی شکایات ہیں، مثلاً ایک شکایت یہ ہے کہ جب شعر و شاعری کے بغیر بھی آدمی ترقی پسند بن سکتا ہے تو پھر شعر کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ لیکن اختر صاحب کی ناراضگی کچھ ذاتی قسم کی معلوم ہوتی ہے۔ کیفی آعظمی کو وہ ایک طرف اپنا دوست بھی کہہ رہے ہیں اور دوسری طرف ان کی جڑ بھی کاٹ رہے ہیں۔

میں سوچنے لگا کہ ہمارا یہ تجارتی اور کاروباری طبقہ زیادہ ہی شاعرانہ ہوتا جا رہا ہے۔ منشی کام لے آئے مگر شعر سننے میں مصروف ہو گئے ادھر ایک فلک بریلوی بھی ہیں شہر کے بڑے ٹھیکدار۔ اُن کے ہر کام کے سائن بورڈ پر اُن کا شعر لکھا ہوتا ہے۔ اور شعر کے نیچے "فلک بریلوی" موٹے حروف میں لکھا ہوتا ہے۔ اگر بورڈ کا پچھلا حصہ دیکھیں تو وہاں بھی شعر لکھے ملتے ہیں۔ ورکرز کے نوٹس بورڈ پر روزانہ تازہ شعر لکھے ہوتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
جو ورکرز اردو نہیں پڑھ سکتے اُن کی سہولت کے لیے شعر کا ترجمہ ہندی میں لکھ دیتے ہیں۔ شاعری کی شاعری اور کام کا کام۔ شوق بھی پورا ہو رہا ہے اور مال بھی بن رہا ہے۔ ادب کی خدمت بھی ہو رہی ہے۔ منشی اشکری صاحب کے شعر بغور سن رہے تھے اور واہ واہ بھی کہہ رہے تھے اُن کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ نوکری شعر سننے کی کرتے ہیں۔
ہمارے شاعرے جگر۔ جوش اور فراق سے تھے۔ اب وہ لوگ کہاں۔ وہ مشاعروں کی روایات کہاں۔
اب تو ڈرائنگ روم میں مشاعرے ہوتے ہیں اور اکثر ڈرائنگ روم بھی شاعر کا ہوتا ہے۔ یعنی کہ اگر ڈرائنگ روم بڑھیا اور خوبصورت ہے تو آپ شاعری کا دم بھر سکتے ہیں۔ ڈرائنگ روم جتنا بڑا اور خوبصورت ہوگا شاعر کا رتبہ بھی اتنا بڑا ہوگا۔ ایسے مشاعروں میں وسکی کا دور چلتا ہے۔ سامعین میں بھی دور جام چلتا ہے اگر وسکی اسکاچ ہو تو سونے پہ سہاگہ کا کام کرتی ہے۔ یعنی شاعر صاحب کو داد بہت بڑھیا ملتی ہے۔ اور شاعر اعظم بھی کہا جاتا ہے۔ واہ واہ سے ڈرائنگ روم گونج اٹھتا ہے جس کے ساتھ ساتھ جاپانی ٹیپ ریکارڈر پر ٹیپ بھی ہو جاتا ہے میرے دوست ملدیو بھاردواج کا تو میرے شوق سے بالکل مختلف ہے۔ انھیں شاعر اکٹھے کرنے کا شوق ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انھیں اپنے گھر شاعروں کو مدعو کرنے اور ڈرائنگ روم مشاعرہ کا شوق ہے۔ جن میں وہ اپنے محبوب دوستوں اور افسران بالا کو مدعو کرتے ہیں اور بہترین کھانے اور مشروبات کا انتظام ہوتا ہے۔ ملدیو بھاردواج کیا کرتے ہیں اب تک پتہ نہیں چلا۔ اُن سے مل کر آدمی یوں موم ہو جاتا ہے کہ بس پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ بھاردواج کے گھر اُس دن بہت سے شاعر موجود تھے۔ جن میں صبا گل مہری، زخمی پرندہ، ساغر جھومری اور چند خواتین بھی تھیں۔ اُن کا ڈرائنگ روم کچھا کھچ بھرا ہوا تھا۔ باوردی ویٹر وسکی اور سوڈا سرو کر رہے تھے۔ نان ڈرنکرز کے لیے TINNED جوس تھے۔ ٹماٹو اور ینگ پائینپل وغیرہ۔ سگریٹ کے دھوئیں نے بادلوں کا سماں باندھ رکھا تھا۔

ساغر جھومری نے اپنا کلام ترنم سے پیش کیا پیشہ ور شاعر تھا نشے میں جھوم رہا تھا۔ واہ واہ اور تالیوں سے ڈرائنگ روم گونج اُٹھا۔ اِن چند لمحوں کے لیے بھاردواج اتنا اہتمام کرتا ہے۔ ایسے موقعوں پر اُس کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکان ہوتی ہے۔ باری باری سب نے نظم اور گیت وغیرہ سنائے۔ خاصا ڈسپلن بھی تھا۔ یہ دور آدھی رات تک چلتا رہا۔ مشاعرہ برخاست ہوا تو کھانے کا دور چلا۔

شاعر دوست اور مہمان جانے لگے تو بھاردواج اپنے چہرے پر وہی فاتحانہ مسکان سجائے سب کو شب بخیر کہہ رہے تھے یہ شوق بھی بھلا پسند ہے مگر کافی مہنگا ہے۔ اس لیے اس کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اور اپنے پہلے شوق کی طرف رجوع کیا۔ یوں تو میں بہت سے سرمایہ دار شاعروں سے مل چکا ہوں فی الحال دو کا قصہ سنا دیا۔ یہ ملدیو بھاردواج تو خواہ مخواہ بیچ میں آ گیا۔ باقی آئندہ۔ شب بخیر!!!

غزلیں

سراج نرملی

بن ایما پھر سر نہ جائے کہیں
ریکھا جاں سے گزر نہ جائے کہیں

بد دعا بے اثر نہ جائے کہیں
ہاسپٹل سے وہ گھر نہ جائے کہیں

تاش میں مال و زر نہ جائے کہیں
باپ دادا کا گھر نہ جائے کہیں

وائف کو اتنا کیوں ستاتا ہے
گول بستر وہ کر نہ جائے کہیں

"اُلّی گلّی" یوں مارے مارے نہ پھر
"حسن" تیرا بکھر نہ جائے کہیں

شیخ جی کو یہ خدشہ رہتا ہے
اُن کا بیٹا "سدھر" نہ جائے کہیں

اک نظر تم سراج پر رکھو
کوئی شئے پار کر نہ جائے کہیں

محبوب بانجھومی

(بلاسپور)

(روحِ اکبر الٰہ آبادی سے معذرت کے ساتھ)

نہ ترکستان دیکھیں گے نہ پاکستان دیکھیں گے
ہم آپ ٹو ڈیپ مولانا ہیں انگلستان دیکھیں گے

نہ جانے دے ہمیں جنت میں ہم کو، بس یہ کافی ہے
کھڑے دہلیز پر ہم صورتِ رضوان دیکھیں گے

یہی کہہ کہہ کے بہروں ورغلاتا ہے ہمیں شیطاں
تمھارا زورِ ایماں، صاحبِ ایمان دیکھیں گے

وضو کے واسطے حاجت نہیں پانی کے لوٹے کی
صبح اٹھتے ہی ہم تو چائے کا فنجان دیکھیں گے

کہاں تک دربدر بھٹکے گی اُردو بے وطن ہو کر
کہاں تک اس کی بربادی کا ہم سامان دیکھیں گے

بھلا دیں گے دلوں سے اپنے ارشاداتِ گاندھی کو
یہ دن آئے گا، یہ بھی اہلِ ہندوستان دیکھیں گے

گلی کوچے بہت ہیں دیکھنے کو شہرِ دہلی میں
مگر ہم صرف جا کر کوچۂ جیلان دیکھیں گے

دکھا دی ہم نے فوٹو اُن کو اک سلمان رشدی کی
جو کی بچّوں نے ضد ہم صورتِ شیطان دیکھیں گے

نماز و روزہ سے نسبت نہیں ہے دور کی اُن کو
فلک پر ہو کے خوش لیکن مہِ رمضان دیکھیں گے

بنیں گے ایک دن محبوب نیتا ہم بھی بھارت کے
کریں گے ٹور روس و چین و انگلستان دیکھیں گے

بہران کیپلا
(سعودی عرب)

شعرا

مجھے شاعروں سے مل کر بے حد خوشی ہوتی ہے۔ شاعر کیسا بھی ہو خوشی ضرور ہوتی ہے۔ میں بہت سے شاعروں سے مل چکا ہوں ان میں نام نہاد، تک باز، ترنّم، کہنہ مشق، اور جینوئین (GENUINE) شاعر بھی ہیں سب سے مل کر خوشی ہوئی سرمایہ دار سماج میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جن کو شاعری کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ میں معلوم نہیں کر سکا کہ یہ کیونکر ہوتا ہے۔ مگر میں ایسے شاعروں کی کھوج میں رہتا ہوں۔ ان کو ڈھونڈ نکالنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ یہ بڑی مشکل اور محنت سے ملتے ہیں۔

فلک بریلوی کا پتہ مجھے اُن کے کاروبار سے ملا۔ گول چوک کے مشرقی حصّہ میں سول ڈیفینس کی بلڈنگ بن رہی تھی، کانٹے دار فینس (FENCE) میں گیٹ کے جنوبی حصّہ میں بڑا بورڈ لگا تھا انٹرکونٹی نینٹل کنسٹرکشن کمپنی۔ مالکان شام لال گھنشیام لال۔ بورڈ کے نچلے حصّہ میں شعر لکھا تھا۔ شعر کے نیچے موٹے حروف میں فلک بریلوی لکھا ہوا تھا۔ میں اس شعر کی لکھاوٹ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ پہلی بار کنسٹرکشن کمپنی کے کاروباری بورڈ پر شعر لکھا نظر آیا۔ بات واقعی غیر معمولی تھی۔ شوق بڑھا پوچھ تاچھ شروع کی۔ پتہ چلا کہ فلک بریلوی) تو ٹھیکیدار صاحب ہیں۔ جو شاعر بھی ہیں۔ سراغ مل گیا تھا۔ خلوصِ دل سے پیچھا کیا اور فلک صاحب سے ملاقات اُن کے گھر پر ہوئی۔ بہت ہی عالیشان گھر تھا۔ بہرحال فلک صاحب اور اُن کے گھر دونوں کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔

لمبے لمبے سیاہ بال گندمی رنگ درمیانہ قد۔ منہ میں پان بدن پر سلک کا لمبا کرتا گھٹنوں تک کھلے پائنچوں ٹیری کاٹ کا پاجامہ اور پاؤں میں سلمی ستارے والی پنجابی جوتی۔ آنکھوں میں ہلکا ہلکا خمار۔ نہ تو وہ ٹھیکیدار لگے اور نہ شاعر، کچھ ایسی ہی بیچ کی چیز تھے۔ خیر صاحب بہت خلوص سے ملے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ مجھے شاعروں سے ملنے کا شوق ہے تو بہت خوش ہوئے۔ فوراً نوکر کو آواز دی اس کارج' وسکی اور لوازمات کا انتظام ہوا۔ فلک صاحب نے اپنا دیوان کھولا۔ پیک دان میں پیک داغتے ہوئے بولے "آپ کیسے شعر پسند کرتے ہیں؟"

میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ مجھے تو شاعروں سے ملنے کا شوق ہے۔ شعر وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بہرحال حوصلہ کر کے کہہ دیا۔

"فلک صاحب کوئی ماڈرن چیز سنائیے۔"

"اچھا تو تازہ غزل سماعت فرمائیے۔"

یہ حادثہ اُن کے نہایت خوبصورت کشادہ ڈرائنگ روم میں پیش آیا۔ جس میں بہت سے دروازے تھے

اور ہر دروازے میں ملازم" با وردی" اور باادب موجود تھے۔ وسکی کا گلاس ہاتھ میں تھامے میں فلک صاحب کے بالمقابل صوفے پر بیٹھا تھا۔ فلک صاحب نے شعر کہنا شروع کیے۔ شعر کہتے وقت اُن کے جبڑے جڑ سے ہو جاتے تھے، گلے کی نسیں تن جاتی تھیں اور آنکھیں شعر کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ کبھی بند اور کبھی کھل جاتیں، گویا شعر بھی کہہ رہے ہیں اور ساتھ ساتھ آنکھ مچولی بھی کھیل رہے ہیں۔ عالم یہ تھا کہ فلک صاحب شعر کہتے تو نوکر چاکر دروازے کی چوکھٹ سے لگے ہر شعر پر داد دیتے۔ ایسا لگتا کہ چاروں طرف سے داد چلی آ رہی ہے۔ اور فلک صاحب کو داد وصول کرنے کے لیے چاروں طرف گھومنا پڑ رہا تھا۔ کیا دل خوش کن نظارہ تھا۔ شعر سمجھ میں نہیں آئے مگر لطف بہت آیا۔

فلک بریلوی کے کم از کم تین عدد مجموعے چھپ چکے تھے۔ فائن آرٹ پیپر۔ عمدہ چھپائی۔ ہر صفحہ پر نقش کاری خوبصورت جلد سرورق پر اُن کی خوبصورت تصویر تھی۔

فوٹو گرافی کا کمال کہیے کہ تصویر میں صرف کلوز اپ تھا، اُن کا پیچھے کا حصہ فوٹو گرافر نے کمال دانشمندی سے کاٹ دیا تھا۔ حتیٰ اتنے کہ ہر جلد پر اُن کے دستخط تھے۔ دوستوں کو دی گئی جلدوں کے علاوہ باقی سب شیشے کی الماری میں قرینے سے لگی تھیں جیسے اُن سے میری برسہا برس کی ملاقات ہو۔ یہ تو اس شاعر کو بھی مات دے گئے جنھیں میں پانی پت میں ملا تھا۔ لشکری تخلص کرتے تھے۔ لشکری پانی پتی بقول اُن کے لشکری کا لفظ انہوں نے لشکارا سے لیا تھا یعنی کہ "موتی سے لونگ دا پیا لشکارا"۔ بس لشکارا لے لشکری پر اُتر آئے۔ جیسے گرگٹ اتر سے تو گارگی بنتا ہے، بالکل اسی طرح بطور تخلص لشکری پانی پتی اختیار کیا۔

میں دراصل پانی پت، اچار کی معلومات کے سلسلے میں گیا تھا۔ اور لشکری صاحب اچار کے کارخانے کے مالک تھے۔ بس صاحب یوں سمجھیے ایک تیر سے دو شکار ہو گئے۔ اچار بھی مل گیا اور ایک شاعر سے ملاقات بھی ہو گئی۔ لشکری پانی پتی کارخانہ کی دیکھ بھال بھی کرتے تھے اور شاعری بھی کرتے تھے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اس علاقے میں کوسوں کوس تک اُن سے بہتر شاعر پیدا نہیں ہوا۔

"لشکری صاحب حالی بھی تو پانی پت کے تھے"۔ میں نے کہا۔ پوچھا "کون حالی؟ کون تھا وہ!"

عرض کیا "آپ نے حالی کا کلام نہیں پڑھا حالی کو نہیں جانتے!"

وہ بولے "میں نے تو یہ نام آج ہی سنا ہے۔ کون تھا وہ کبھی ملاقات نہیں ہوئی"۔

"خیر چھوڑیے اب ان کا ذکر کیا۔ وہ پاکستان چلے گئے تھے"۔ میں نے اتنا بڑا جھوٹ بول دیا۔ سبب دراصل حالی کا نام سنتے ہی اُن کے چہرے کے تیور بدل گئے تھے۔ میں موقع محل بھانپ کر کہ بات آگے نہ بڑھے اور لشکری صاحب بھڑک کر شعر نہ سنانے شروع کر دیں، جھوٹ بول دیا۔

یہ سُن کر انہیں قدرے سکون ہوا۔ فرمایا کہ آج شام کو اُن کے غریب خانہ پر تشریف لاؤں تاکہ وہ انہیں مومیتھ دوں۔ اتنے میں بڑے منشی داخل ہوئے۔ ہاتھ میں کچھ واؤچر تھے۔ لشکری صاحب کے آگے رکھے اور آداب عرض کیا۔ لشکری صاحب نے شاعرانہ انداز میں آداب کا جواب دیا۔

منشی بولے "لشکری صاحب کچھ تازہ شعر کہے ہوں تو"

اس سے پہلے کہ منشی فقرہ پورا کرتے لشکری صاحب بولے "بیٹھیے عرض کیا ہے!"

ہوں، زبان ہے دکھلایا کرتے تھے) کوئی اشاروں سے دریافت کرتا، آپ دور کیسے آگئے۔ ایک ہاتھ اوپر کو کھڑا کرکے گردن ہلا ہلا کر سمجھا دیا کرتے تھے کہ خدا لایا۔ ہماری بستی میں دو سال رہ کر وہ ایک رات غائب ہوگئے۔ صبح تلاش پڑی، کہاں ہیں کدھر گئے۔ بچے بوڑھے، جوان سب ان کی کٹیا پہنچ گئے۔ ان کا بوریا بستر، ڈنڈا سب غائب تھے۔ یہاں ان کے قیام کے زمانے میں بھی اور ان کے چلے جانے کے بعد بھی کوئی انھیں ولی بتلاتا تھا، کوئی کامل، کوئی خدا رسیدہ کوئی کہتا جنتی ہے، یہاں کے بدلے میں اسے وہاں ایک ہزار زبانیں ملیں گی۔ گویا ایک یہاں کے بدلے میں نوسو ننانوے۔ کوئی کہتا انگریز کا سی آئی ڈی ہے (C I D) کہ یہاں کے لوگوں کے باغیانہ خیالات لینے آیا ہے۔ میرے دادا جان کہا کرتے تھے، اپنے دیس میں کوئی قتل کرکے آیا ہے، اختیاری لازم معلوم ہوتا ہے۔ بال بڑھالئے زبان بند کئے، چپ شاہ بنا پھرتا ہے۔ بعد میں اخباروں میں آ ہی گیا کہ وہ ایک چلتا پرزہ تھا۔ دادا جان کا قیاس درست نکلا۔

آگے کلیم اللہ بولے! بولنا انسان کے خواصِ اربعہ میں سے ہے۔ منجملہ حیوانات، انسان کا ایک امتیازی وصف ہے۔ جانے بولنے کی شروعات تو کہاں سے ہوئی ہوگی۔ دنیا کا پہلا انسان کون تھا جس نے بولنا شروع کیا۔ ڈارون بھی اس پر خاموش ہے۔ ظاہر ہے "ہوں" "ہاں" ہی بولا ہوگا۔ بہرحال بولنا اپنے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا نئی زمانے کے بولنے تک آگیا لیکن جہاں سے چلا تھا وہیں آگیا۔ تاریخ خود کو دہرانے لگی۔ دیکھتا ہوں بعض لوگوں کو السلام علیکم کہا جاتا ہے۔ جواب میں وہ بس "ہوں" کر دیا کرتے ہیں۔ بعض "اوں" کہنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے، اشارے سے جواب دے دیا کرتے ہیں، گردن کو اوپر سے نیچے تک ایک انچ گما دیتے ہیں پھر اپنی جگہ پر لے آتے ہیں۔ آج کے اکثر انسان اول تو بولتے ہی نہیں، خاموش زیادہ رہتے ہیں۔ بولتے بھی ہیں تو بس "ہاں" "ہوں" اور زیادہ بولنا ہو، تو ترکیب اور مصلحت سے بولتے ہیں۔ بولنے اور نہ بولنے دونوں ہی میں افادیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، اس طرح کہ عیب ہوں تو ہرگز بھی ظاہر نہ ہوں، خال خال کوئی ہنر ہے تو مخاطب کو وہ ضرور ظاہر ہو جائے۔ جتنے علم و ہنر نہیں آتے، اُن پر خاموشی کا پردہ ڈال دیتے ہیں مخاطب کو صدفی صد گمان ہو جائے کون سا علم و ہنر ہے، جو ان کے پیٹ میں نہیں۔ حفظانِ صحت کا مفاد الگ حاصل ہو جاتا ہے۔ خاموش رہنے سے جسم کی ہوا کو نکلنے کے لیے راستہ نہیں ملتا۔ اُن کا بولنا آٹے میں نمک کی طرح ہے اُسی سے روٹی مزہ دار لگتی ہے۔ ہر ایک کے گلے سے اُتر جاتی ہے۔ رہی شیخ سعدی والی بات، آج شیخ سعدی ہوتے تو اپنے شعر میں نہ صرف ترمیم کر دیتے، بلکہ شعر ہی کو بدل ڈالتے، عیب والی بات کو تو بالکل ہی گول کر جاتے۔

تو بولتا ہے یا غضب ڈھاتا ہے۔ خود بھی عریاں ہو جاتا ہے، دوسروں کی بھی نقاب کشائی کر دیتا ہے۔ آدھے گھاٹ تک نہیں کرتا۔ تو اپنے زمانے سے بہت ہی پیچھے ہے۔ آج کا انسان ترقی کرتے کرتے تجھ سے کہیں زیادہ آگے نکل گیا۔ تیرا بولنا نمک میں آٹے کی طرح ہے۔ نہ افراط پہ چل نہ تفریط میں آ۔ میانہ روی اختیار کر تو زبان کو بے لگام بھی مت کر۔ اس میں تالہ بھی مت ڈال۔ ضرور بولا کر و مگر وہیں جہاں بولے بغیر تیرا کام ہی نہ چلے۔ میں نے کلیم اللہ سے کہا ماشاءاللہ کہاں یہ میں عقل کا کوتاہ ہوں، مثال دے کر سمجھا یا شیخ

کلیم اللہ کا جی جل گیا۔ غصے سے جواب دیا، مثلاً جہاں بولے بغیر تجھے روٹی بھی نہ ملے۔ بھوک کی شدت سے تیرے پیٹ میں تیری آنتیں نہ بولنے لگیں۔

دوست کلیم اللہ کی نصیحت میں نے گرہ میں باندھ لی۔ مجھے فیصلہ کر لینا پڑا، "بولا نہ کروں گا" - اسی روز سے عمل بھی کرنے لگا۔ نوّے فی صدی کام اشاروں سے لینے لگا، جن کے کرنے میں، ان دنوں میرے ہاتھوں کو ٹانگوں کو، ناک کو، ہونٹوں کو ماتھے کو اور گالوں کو کافی زحمت اٹھانی پڑ رہی ہے۔ گویا زبان کی بلا، اب ان پر آپڑی ہے۔ یہی سوچا کہ مصلحت آمیز ہے، عیب پوش ہے اور جدیدیت سے لبالب بھی۔

اب بیگم بھی مجھ سے خوش ہیں، کلیم اللہ بھی راضی۔ میں خود ہی ہوں جو خود سے ناخوش ہوں!

●●

اسی گفتگو کے دوران آگے چل کر اختر صاحب نے یہ بھی کہا ہے۔ "ابھی تک تو میری شاعری پر لوگوں کی توجہ اطرح (؟) نہیں رہی ہے۔ ترقی پسندوں نے تو خیر دیدہ و دانستہ نظر انداز کیا ہے۔ حالانکہ میری شاعری ان کی شاعری سے کہیں زیادہ ترقی پسندانہ مزاج رکھتی ہے"۔ ترقی پسندوں نے اختر صاحب کو نظر انداز کیا تھا۔ انہوں نے سارے ترقی پسندوں کو خارج از آہنگ قرار دے کر معاملہ کو برابر کر دیا۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد۔

اختر صاحب کا یہ شکوہ بے جا ہے کہ لوگوں نے ان کی شاعری پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ ظاہر ہے "لوگوں" سے مراد "نقاد" ہیں۔ اختر صاحب کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ ان کی شاعری نقادوں کے غلط تخمینوں سے محفوظ رہی۔ ان کو آج جو مقام حاصل ہے وہ ان کی شاعری کی وجہ سے ہے۔ ورنہ نقاد یہ دعویٰ کر سکتے کہ یہ سب کچھ ان کے زورِ بازو کا نتیجہ ہے۔

اختر صاحب صرف ترقی پسندوں ہی سے ناخوش نہیں، دوسرے شاعروں کے بارے میں بھی ان کی رائے خاصی دلچسپ ہے۔ فیض سے انہیں یہ شکایت ہے کہ ان کی شاعری میں سجاوٹ کا عنصر زیادہ ہے۔ وہ سجاوٹ ہی میں الجھ کر رہ گئے۔ اصل معنویت تک نہیں پہنچ پائے۔ ن۔م۔ راشد کے بارے میں وہ فرماتے ہیں۔ "ایک طرح کا بڑبولاپن ان میں بہت ہے۔ غیر ضروری بلند آہنگی پیدا کرنے کی شعوری کوشش نے ان کی شاعری کو مجروح کیا ہے"۔ میراجی کے ساتھ بھی اسی قسم کا سلوک کیا ہے۔ لیکن انہیں راشد کے مقابلہ پر GENUINE شاعر مانا ہے، جس کا مقصد میراجی کی تعریف نہیں، راشد کی مزید تنقیص ہے۔

مجید امجد کے بارے میں کہا ہے "وہ تو ہماری کاپی کرتے ہیں — ان پر ہماری چھاپ رہی ہے۔ زندگی نے وفا نہ کی ورنہ وہ بہتر مستقبل رکھتے تھے"۔ اس قول برحق سے یہ معنی بھی نکالے جا سکتے ہیں کہ مجید امجد کی زندگی نے اس لیے وفا نہ کی کہ وہ اختر الایمان کے نقال تھے۔ لیکن ہمیں ان معنوں سے اتفاق نہیں ہے۔ اختر صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ اگر مجید امجد کی زندگی وفا کرتی تو وہ ان کے نقال کی حیثیت سے بہتر مستقبل رکھتے تھے۔

اختر صاحب نے ازراہ سخن پروری ناصر کاظمی کو اچھا شاعر مان لیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ وہ غزل ہی میں محصور ہو کر رہ گئے، جس کا مطلب یہ کہ اگر وہ غزل کے حصار سے باہر نکل کر نظمیں بھی لکھتے تو زیادہ اچھے شاعر ہوتے۔ ممکن ہے اس بات پر کوئی یہ اعتراض کریں کہ غالب بھی تو غزل میں محصور ہو کر رہ گیا تھا پھر وہ اتنا اچھا اور بڑا شاعر کس طرح بن گیا؟ معترضین کی خدمت میں عرض ہے کہ اختر صاحب نے غالب کو بھی نہیں بخشا۔ حالانکہ غالب کے ساتھ کسی "معاصرانہ چشمک" کا امکان نہیں ہے۔ غالب کا مشہور شعر ہے:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب۔
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

اختر صاحب اس شعر کے بارے میں فرماتے ہیں۔ "اب اس بات کا نہ تو کوئی سیاق ہے نہ سباق۔ لیکن اگر اسی پہلو کو نظم کا پیکر ملتا تو وہ کتنی بڑی نظم ہوتی اور انسان کی تمنا اور زندگی کی تار سائیوں سے کیا خوبصورت ڈرامہ وجود میں آتا"۔

افسوس کہ اختر صاحب غالب کے زمانے میں نہ ہوئے ورنہ ان کے مشورے پر وہ سیاق و سباق کے بغیر باتیں نہ کرتا اور اپنی ساری توجہ "بڑی بڑی" نظمیں لکھنے پر صرف کر دیتا۔

سیاق و سباق اور موضوع گفتگو [illegible]

مظہر جلیل: ساقی فاروقی جدید حسیت کے شاعر ہیں۔ علامتی طرز اظہار بھی رکھتے ہیں۔ آپ ان میں کیا امکانات دیکھتے ہیں۔

اختر الایمان: ابھی تو خیر وہ لکھ رہے ہیں۔ ابھی انہوں نے اپنی شناخت نہیں بنائی۔ راشد کی انگلی پکڑ کر چلنے کی کوشش ان کے امکانات کو کم کرتی ہے۔ انہیں چاہیئے کہ اپنے اندر کے پاورفل شاعر کو باہر آنے دیں۔

احمد ہمدانی: لیکن وہ مصرع لکھنے میں بہت محنت کرتے ہیں۔

اختر الایمان: صرف محنت سے کیا ہوتا ہے بھائی۔

ہمارے نزدیک اس گفتگو کا سوائے اس کے کوئی مقصد نہیں کہ ساقی فاروقی کی کردار کشی کی جائے۔ اوّل تو یہ پوچھا ہی نہیں گیا کہ اختر صاحب کو ساقی میں کیا امکانات دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں کسی اور کو کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ وہاں ہمارے اختر صاحب کو کیا دکھائی دے گا۔ اس سوال کا جو جواب دیا گیا وہ بھی بڑی حد تک نامناسب ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ ساقی نے ابھی تک اپنی شناخت نہیں بنائی۔ اب تک ساقی نے سوائے شناخت کے اور بنایا ہی کیا ہے۔ شاعری تو ضمنی چیز ہے جو شناخت بنانے کے دوران خود بخود بنتی چلی گئی۔

اختر صاحب کو اس پر بھی اعتراض ہے کہ راشد کی انگلی پکڑ کر ساقی چل رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ اعتراض کی نہیں تعریف کی بات ہے۔ ساقی دوسرے شاعروں کی طرح چھلانگیں نہیں لگاتے بلکہ درجہ بدرجہ بلندی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ آج وہ راشد کی انگلی پکڑ کر چل رہے ہیں۔ کل پہنچا پکڑیں گے اور پرسوں راشد کے کاندھوں پر سوار ہو جائیں گے۔ جس طرح آج یہ کہا جاتا ہے کہ احمد فراز کے رنگ میں فیض شعر کہتے تھے۔ اسی طرح کل یہ کہا جائے گا کہ ن۔ م۔ راشد ساقی فاروقی کے مقلد تھے۔

اختر صاحب کا یہ مشورہ بھی صائب نہیں ہے کہ ساقی اپنے اندر کے پاورفل شاعر کو باہر آنے دیں۔ اول تو ہمیں معلوم نہیں ہے ساقی کے اندر کوئی پاورفل شاعر موجود ہے۔ اگر ہو بھی تو اس کا باہر آنا مناسب نہیں۔ ساقی کسی کو اپنے سے زیادہ پاورفل ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ خواہ مخواہ جھگڑا شروع ہو جائے گا۔ لوگ طعنے دیں گے کہ ساقی کو کیا ہو گیا ہے۔ پہلے افتخار عارف سے لڑتا تھا۔ اب اپنے اندر کے پاورفل شاعر کو باہر نکال کر اس سے لڑ رہا ہے۔

احمد ہمدانی نے یہ کہہ کر کہ ساقی مصرعہ لکھنے میں بڑی محنت کرتے ہیں، اپنی دانست میں ساقی کی تعریف کی ہے۔ حالانکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ساقی مکمل نظم یا مکمل غزل پر محنت نہیں کرتے صرف مصرعہ پر محنت کرتے ہیں۔ مصرعہ پر محنت کرنا کون سا مشکل کام ہے۔ استاد قمر مراد آبادی صبح و شام یہی کام کرتے ہیں ان کا ہر مصرعہ ان کی محنت شاقہ کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لیکن جب غزل میں یہی مصرعے آمنے سامنے آتے ہیں تو استاد کی ساری محنت ضائع ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اختر صاحب نے احمد ہمدانی کی بات پر جو تبصرہ کیا ہے، وہ بھی نہلے پہ دہلے کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ صرف محنت سے کیا ہوتا ہے، عجیب سی بات ہے۔ حالانکہ اختر صاحب کو آج شاعری میں جو بلند مقام حاصل ہے۔ وہ ان کی محنت ہی کا نتیجہ ہے۔ اسی گفتگو کے دوران انہوں نے خود اپنی محنت کی روداد ان لفظوں میں بیان کی ہے "یہ نظم اب جو ہم کہہ رہے ہیں تو اس تک آتے آتے بڑا زمانہ لگا ہے۔ بیچ میں ایک پیریڈ ایسا بھی آیا جب میں نے افسانہ نگاری بھی ترک کر دی تھی اور شاعری سے بھی اچاٹ ہو گیا تھا۔ لیکن طبیعت کچھ نہ کچھ کرنے پر اکساتی تھی۔ چنانچہ ہم نے کثرت شروع کر دی پہلوانی کرنے لگے۔ ڈنڈ بیٹھکیں لگاتا۔ سیو کر دوڑتا پھرتا۔ سر منڈوا دیا۔ غرض عجیب واہی تباہی صورت حال در پیش تھی"۔

افسوس کہ ساقی فاروقی نے غلط سمت میں محنت کی۔ خود بہت ڈھنڈورا پیٹا اور دوسروں سے بھی پٹواتے رہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو آج اختر صاحب کو یہ کہنے کا موقع نہ ملتا کہ ساقی جس قسم کی محنت کرتے ہیں اس کے نتیجے میں اچھی شاعری وجود میں نہیں آتی۔

نسیمِ سحر (جدہ)

جدہ میں پہلا ہندوپاک مزاحیہ مشاعرہ

جدہ کی ادبی تاریخ میں پاکستان و ہند کے چوٹی کے مزاح نگاروں کو جمع کرنے اور ایک یادگار مزاحیہ مشاعرہ
ب دینے کا تاریخی اعزاز جدہ کی ایک فعال تنظیم "بزمِ اُردو جدہ" کو حاصل ہوا۔ اس سے قبل جدہ کے اہلِ ادب نے اتنے
بیمانے پر کوئی اردو کا ادبی اجتماع نہیں دیکھا تھا۔ جس طریقے سے اس مشاعرے کو مقبولیت اور پذیرائی حاصل
ہوئی وہ بزمِ اُردو جدہ اور زندہ دلانِ جدہ کی انتظامی صلاحیتوں اور محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔
س مزاحیہ مشاعرے کی پبلسٹی نہ صرف مسائل اور اخبارات کے ذریعے کی گئی بلکہ جدہ کے تمام مرکزی مقامات اور اسٹورز
کے مراکز پر پوسٹر چسپاں کر کے اہلِ ذوق کو اس اہم تقریب کی اطلاع دی گئی۔ دو تختوں کی تعزیت کے بعد بھی انتخاب
ات کیے گئے

اس شاندار مشاعرے میں شرکت کے لیے پاکستان سے سید ضمیر جعفری، دلاور فگار، پروفیسر انور مسعود اور
سرعنایت علی خاں کو مدعو کیا گیا تھا جبکہ ہندوستان سے جناب حمایت اللہ، طالب خوندمیری، پاپولر میرٹھی، خواجہ مجید
ملآبادی، مصطفےٰ علی بیگ اور ساغر خیامی مدعو تھے۔ ایک اور نامور نثری مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین کو بھی دعوت
ی اور نہایت مسرت کا باعث ہے کہ یہ تمام مدعوین تشریف لا کر دونوں محفلوں کا سبب بنے۔

بزمِ اُردو جدہ کے معتمد جناب شریف اسلم نے وقت مقررہ سے کچھ دیر بعد مائیک سنبھالا اور سعودی عرب کے
انے سے تقریب کا آغاز ہوا۔ پھر ایک پاکستانی طالب علم عثمان نے نہایت دلکش انداز میں تلاوت کلامِ پاک کی۔ بعد
کی معروف ادبی شخصیت مولانا فرید الوحیدی کو مسندِ صدارت پیش کی گئی۔ جناب شریف اسلم نے پاکستان
تلن کے مہمان شعرا کا تعارف کرایا اور جدہ کی نمائندگی کرنے والے تین میزبان شعراء سگار لکھنوی، نسیم سحر اور ناظر
و مسند پر مدعو کیا۔ جدہ کے وسیع و عریض آڈیٹوریم میں بھی حاضرین کی کثیر تعداد اور مسلسل آنے والے سامعین کا اشتیاق
روش کے ساتھ تنگیٔ داماں کا منظر پیش کر رہا تھا۔ سامعین کی کثرت سے زیادہ یہ بات بھی باعثِ حیرت تھی کہ ان
سے زیادہ تعداد خواتین کی تھی جو نہ صرف اپنی خوش لباسی کا ثبوت دے رہی تھیں بلکہ مشاعرے کے دوران بھی داد
سامعین بھی بلاشبہ اپنی خوش ذوقی کا اظہار بھی کرتی رہیں۔ صدرِ بزمِ اردو، وحدالحق مقادرہ نے ...
ن مشاعرے کے انعقاد میں پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے خادم حرمین شریفین ... زبان دوستی

مربّی ملک فہد بن عبدالعزیز اور گورنر مکہ شہزادہ ماجد بن عبدالعزیز کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کیا جن کی عنایت اور دلچسپی سے مشاعرے کی اجازت ملی تھی۔ ان کے بعد ہندوستان کے قونصل جنرل برائے جدّہ جناب تلمیذ احمد نے خطاب کیا اور پھر جناب شریف اسلم نے جدّہ کے معروف مزاح گو شاعر جناب ناظر قدوائی والد کو نظامت سنبھالنے کی دعوت دی۔ جناب ناظر قدوائی نے ایک خوب صورت شعر سے مشاعرے کا آغاز کیا اور جدّہ کے میزبان شاعر نسیم سحر کو دعوتِ کلام دی۔ جناب والد نے اس طرح برجستہ اشعار اور دلچسپ اندازِ گفتگو سے آخر تک مشاعرے کی دلچسپی برقرار رکھی اور مشاعرہ نہایت کامیابی سے رفتہ رفتہ اپنے عروج کی طرف گامزن رہا۔ پُراشتیاق اور سخن فہم سامعین بھی اچھے شعروں پر دل کھول کر داد دے رہے تھے۔ جن اشعار پر شعرائے کرام کو خصوصی طور پر داد ملی اُن کا انتخاب پیش خدمت ہے:

نسیم سحر:۔ اپنی آنکھوں پہ لگ گیا چشمہ اسکی آنکھوں میں اس قدر دیکھا
اُس نے ہرگز نہ لفٹ دی ہم کو ہم نے کتنا ہی بن سنور دیکھا

سِگار لکھنوی:۔ عاشق کا گنجا پن تو نہیں بات عیب کی
محبوب گنجا ہو تو قیامت کی بات ہے

ناظر قدوائی والد
شبِ وصال گھڑی دو گھڑی رہا الّا بن
"پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی"

مصطفےٰ علی بیگ
ادھر ہیٹر کے جیسا عشق میرا اُدھر جذبات کا ریفریجریشن
کرکیشن کرنے والے کر رہے ہیں برائے نام ہے اینٹی کرپشن

حمایت اللہ:۔
میں بڑے لوگوں کے گھر کبھی نہیں جا سکتے
میں سمندر ہوں میں سمندر میں نہیں آسکتے

پاپولر میرٹھی
محبوب وعدہ کرکے بھی آیا نہ دوستو
کیا کیا نہ یار ہم نے کیا اس کے پیار میں
مُرغے پکڑ کے چار جلائے تھے پاپولر
"دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں"

پروفیسر عنایت علی خاں
مصرعوں کے التفات کا اعجاز دیکھیے
اکبر کی فکر پیر کو کیا کیا جواں
"بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں"
کی جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

ساغر خیامی
بولا دکاندار کہ کیا چاہیے تمہیں
جو بھی کہو گے میری دوکان پر وہ پاؤ گے

میں نے کہا کہ کتے کے کھانے کا کیک ہے؟
بولا نہیں یہ کھاؤ گے یا لے کے جاؤ گے؟

پروفیسر انور مسعود
لطفِ نظارہ ہے اسے دوست اسی کے دم سے
یہ نہ ہو پاس تو پھر رونقِ دنیا کیا ہے
تیری آنکھیں بھی کہاں مجھ کو دکھائی دیتیں!
میری عینک کے سوا دُنیا میں رکھا کیا ہے؟

پاگل عادل آبادی
"کثرتِ اولاد کا نسبندی ہے واحد علاج"
یہ کہاں تک ہے مناسب کیا خیال ہے آپ کا
مولوی صاحب یہ بولے ہنس کے اے چھوٹے میاں
یہ تمہارا تجربہ ہے یا تمہارے باپ کا؟

خواہ مخواہ حیدرآبادی
کون سا غم ہے جو یہ حال بنا رکھا ہے؟
نہ تو میک اپ ہے نہ بالوں کو سجا رکھا ہے
خواہ مخواہ چھیڑتی رہتی ہیں یہ رخساروں کو
تم نے زلفوں کو بہت سر پہ چڑھا رکھا ہے

طالب خوندمیری
لگا کے مُنہ سے ساغر بولتے ہیں بڑے بے باک ہو کر بولتے ہیں
اگر بیوی چلی جاتی ہے میکے تو گھر میں صرف شوہر بولتے ہیں

پروفیسر ولا فگار
اگرچہ پورا مُسلمان تو نہیں لیکن میں اپنے دین سے رشتہ تو جوڑ سکتا ہوں
نماز و روزہ و حج و زکواۃ کچھ نہ سہی شب برات پہ پٹاخہ تو چھوڑ سکتا ہوں

سیّد ضمیر جعفری:۔ (حیدرآبادی کرکٹر جناب اظہرالدین کے لیے ایک قطعہ)
نو بنو انداز سے سامان تزئین آگیا دل کی تسکین آگیا آنکھوں کی تمکین آگیا
گیند بلّے میں دکن کے ساتھ لے بن کا طلسم آگیا لو آگیا وہ اظہرالدین آگیا

صاحبِ صدر مولانا فرید الوحیدی:۔
مآلِ عاشقی و دلبری سمجھتے ہیں ترے فریب کو اے زندگی سمجھتے ہیں
تم اپنی مست نگاہوں کے زخم کیا جانو جنہیں یہ تیر لگے ہیں وہی سمجھتے ہیں

چائے کے بعد مشاعرے کا دوسرا دور ڈاکٹر شمس بابر کی صدارت میں ہوا جس کی نظامت جناب شریف اسلم نے کی اور اس دور میں مہمان شعراء سے کلام سنا گیا۔ رات تین بجے ڈاکٹر ضیا الرحمٰن صدیقی نے بزم اردو جدہ کی جانب سے عہدیداران

کی طرف سے شعراء اور حاضرین محفل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مشاعرے کے اختتام کا اعلان کیا اور یہ عزم ظاہر کیا کہ جدہ میں آئندہ بھی ایسی خوب صورت اور یادگار محفلیں سجائی جاتی رہیں گی۔

اس یادگار مشاعرہ کو کامیاب بنانے میں بزم اردو جدہ اور زندہ دلان جدہ کے جن کارکنوں اور عہدیداروں نے بے لوث اور ان تھک محنت کی ان میں جناب مظہر عبداللہ، مکرم عبداللہ، امتیاز علی، یونس بن حسن، فاضل ذکریا، ابوطیب محمد یحییٰ ایم اے رحیم، روف حسین، سعید نقوی اور ڈاکٹر سید علی وغیرہ شامل تھے۔ ان کے علاوہ مشاعرے کے انعقاد کے ضمن میں نیشنل الکٹرانکس کے سعودی عرب میں سول ڈسٹری بیوٹر زمیسرز دہلوی کمپنی اور تبسیری (اینٹ لے کا رسک کے مینجمنٹ نے بھی بھرپور تعاون واشتراک کیا۔

جدّے میں قہقہوں کا طوفان

جدہ کے ایک ہاؤزنگ کمپاؤنڈ کے فراخ آڈیٹوریم میں چوٹی کے مزاح نگار جمع تھے جو پاکستان اور ہندوستان سے بزم اردو جدہ کی خصوصی دعوت پر شریک محفل تھے یکے بعد دیگرے ان میں سے ایک مزاح نگار مائک پر آتا اور ان کے ایک ایک جملے سے کھچا کھچ بھرا ہوا آڈیٹوریم کشت زعفران بن جاتا ـــــ یہ کسی فلم کا منظوم سین نہیں بلکہ حال ہی میں بزم اردو جدہ کی طرف سے ہونے والے جشن مزاح اور لطیفہ گوئی کی محفل والی شب کا آنکھوں دیکھا حال ہے۔ ایک ہفتہ قبل ہونے والے عظیم الشان مزاحیہ مشاعرے میں ہندو پاک کے نامور شعراء صاحبان دونوں ہاتھوں سے بھرپور داد سمیٹ چکے تھے اور آج ایک نئے انداز سے زندہ دلان کے ذوق کی تسکین کے لیے مرکز نگاہ بنے ہوئے تھے محفل میں خصوصی طور پر ہندوستان سے تعلق رکھنے والے اور بہ سلسلہ روزگار ریاض میں مقیم ایک عمدہ نثری مزاح نگار ڈاکٹر عابد معز کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

بزم اردو کے جنرل سکریٹری شریف اسلم نے محفل کے آغاز کا اعلان کیا۔ بزم کے صدر ڈاکٹر شمس بابر نے بھی کہا کہ آج اس سلسلے کا آخری پروگرام پیش کیا جا رہا ہے لیکن بزم اردو آئندہ بھی مسرتوں کی دولت بانٹتی رہے گی۔ اب جدہ سے ناظر قدوائی واگر نے ایک قطعہ ڈاکٹر شمس بابر کی نذر کر کے سنایا۔ ان کے بعد جناب حماد مخول بھیلی نے ایک مضمون بعنوان "اڈنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا" کے عنوان سے سنایا۔ ان کے بعد ریاض سے آئے ہوئے مزاح نگار ڈاکٹر عابد معز نے "فارغ البالی" کے موضوع پر ایک بے حد دلچسپ مضمون پیش کیا اور گنجے پن کے بارے میں ایسی دلچسپ باتیں سنائیں کہ ایک ایک جملے پر انھیں بے تحاشا اور بے ساختہ داد سے نوازا گیا۔ دانشور حضرات کے علاوہ سامعین میں بھی فارغ البال لوگوں کی تعداد کافی تھی اور حسن اتفاق سے خود صاحب مضمون بھی کافی حد تک فارغ البال تھے ان بے چاروں

حقیقی معنوں میں "حاصلِ غزل" ثابت ہوا۔ کئی مزاح نگاروں نے اعلانیہ کہا کہ یہ مضمون تو انہی کی فارغ البالی کی شان میں لکھا ہے۔ جناب حمایت اللہ کو تھوڑی دیر قبل ہی بہ اصرار اسٹیج پر مدعو کیا گیا تھا۔ انھوں نے مضمون کے دوران ہی مائیک پر آ کر کہا کہ مجھے تو اس مضمون کے موضوع کی "ڈیمانسٹریشن" کے طور پر اسٹیج پر بٹھایا گیا ہے تو خوب قہقہے لگے۔ پروفیسر عنایت علی خاں نے برجستگی سے کہا "ہنس کے ستم ظریف نے مجھ کو بٹھا دیا کہ یوں"

ڈاکٹر عابد معز محفل لوٹ کر جا چکے تو سید ضمیر جعفری صاحب کو مدعو کیا گیا۔ انھوں نے حیدرآباد کو طنز و مزاح کا گڑھ قرار دیا اور کہا کہ جدہ کی یہ تقریب اُسی روایت کا تسلسل ہے اور زندہ دلانِ حیدرآباد یہاں آکر مزید زندہ ہوئے ہیں۔ دکن تہذیب کا جزیرہ ہے تو جدہ اس کا نخلستان ہے۔ انھوں نے اپنے کالم "رادل رنگ" کے حوالے سے کہا کہ وہ جدہ کے دوران ملنے والی شخصیتوں پر مضامین بھی تحریر کریں گے۔ انھوں نے اسی سلسلے کا تحریر کردہ ایک مضمون جدہ کے ایک بزرگ شاعر اور اپنے قیامِ جدہ کے میزبان مولانا فرید الوحیدی کے بارے میں پڑھ کر بھی سنایا جس کا عنوان "جدہ کا ادبی قطب مینار" تھا۔ خوب صورت جملوں سے مزین اس مضمون میں انھوں نے کہا کہ مولانا فرید الوحیدی وزناً مولانا اور ذہناً مسٹر ہیں۔ شاعر انھیں تاجر اور تاجر انھیں شاعر سمجھتے ہیں۔ مولانا ہر وقت یا تو علامہ اقبال کی صحبت میں رہتے ہیں یا ریال کے تعاقب میں۔ سوتے ہیں تو کتاب ہاتھ میں ہوتی ہے جاگتے ہیں تو پاؤں موٹر میں ہوتے ہیں۔

ضمیر جعفری صاحب محفل کو گرما کے جا چکے تو صاحبِ صدر مجتبیٰ حسین کی باری آئی۔ انھوں نے کہا کہ آج کی تین محفلوں کا صدر بلا شرکتِ غیرے میں ہوں یعنی "تھری ان ون" صدر ہوں اور میری صدارت کا آخری دور طبلے اور ہارمونیم کا ہے۔ انھوں نے کہا کہ دہلی میں تو کتے کو پتھر مارو تو وہ بھی کسی نہ کسی صدر کو لگ جاتا ہے مگر یہاں صدور کی کافی قلت نظر آ رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب تک ہر انسان کو اس کے حصے کی سچی خوشیاں نہیں مل جاتیں تب تک اس دھرتی پر امن قائم نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے کہا کہ ظرافت نگاری کے لیے صرف ظریف ہونا کافی نہیں باضبط بھی ہونا ضروری ہے اور باذوق بھی۔

صدارتی کلمات کے بعد محفل کا دوسرا دور لطیفہ گوئی پر مشتمل تھا جس میں حمایت اللہ خواہ مخواہ بمبئی، دلاور فگار، مصطفیٰ علی بیگ، ضمیر جعفری، پروفیسر عنایت علی خاں، پاپولر میرٹھی، پروفیسر انور مسعود، طالب خوندمیری اور مجتبیٰ حسین صاحبان نے دل چسپ لطیفے سنائے۔ ان لطیفوں میں ادبی لطیفے بھی شامل تھے اور کہیں کہیں مزاحیہ اشعار بھی۔

دوسرے دور کے اختتام پر مزاح نگاروں میں مہمانِ خصوصی جناب فاضل زکریا نے تحائف تقسیم کیے اور چائے کے وقفے کے بعد اس یادگار محفل کا تیسرا دور شروع ہوا جو محفلِ غزل پر مشتمل تھا۔ جدہ کے معروف فن کار جناب صادق [illegible] نے رات کے تین بجے تک آواز کا جادو جگایا۔ طبلے پر ان کی سنگت جناب احمد خاں نے کی۔ اس کے بعد بزمِ اردو کی جانب سے جناب مکرم عبداللہ نے محفل کے اختتام کا اعلان کیا۔ ●

قلمی معاونین سے التماس ہے کہ تخلیقات کا اصل مسودہ ارسال فرمائیں

مسودات خوش خط نہ سہی صاف خط میں روشنائی سے لکھے ہوئے ہوں ۔

وے کے خط

(مراسلے)

عزیزی مصطفیٰ کمال صاحب، خوش رہیے —
کئی ماہ سے ہم لوگ آفاتِ ارضی و سماوی میں گھرے ہوئے ہیں۔ اکتوبر اور نومبر کے مہینے فسادات کی زد میں رہے۔ رام جنم بھومی کے تضیے نے ہزاروں بے قصور لوگوں کی جان لی اور کروڑوں روپے کی املاک لوٹی اور جلائی گئی۔ پٹنہ میں تو اکا دکا وارداتیں ہوئیں، لیکن بھاگلپور تہس نہس ہو گیا۔ میں نے ۱۹۴۶ء کے فسادات بھی دیکھے تھے۔ لیکن اس بار تو شیطنیت کا کاروبار، اس وقت سے کئی گنا زیادہ گھنونا رہا۔

ایک بات اور سن لیجیے۔ میں اس ماہ کی ۱۹ تاریخ کو اللہ کے فضل سے پورے ۷۶ سال کا ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد ۷۷ ویں سال میں داخل ہوں گا۔ اب بالکل پکا ہوا پھل ہوں جو کسی وقت بھی شاخ سے ٹوٹ کر گر سکتا ہے۔ اتنے دنوں تک جو زندہ رہ گیا وہ آپ حضرات کے خلوص اور محبت کے باعث ہوا۔ اہلِ حیدرآباد کے علاوہ ملک کے دیگر علاقوں کے علم دوست احباب نے بھی میری زندگی، بڑھانے میں مدد کی ہے۔ امید ہے کہ نیا سال، آپ کے لیے اور آپ کے توسط سے "شگوفہ" کے لیے ترقی و اقبال کا سال ہوگا۔

آپ کا
۱۲ر جنوری ۹۰ء — رضا نقوی واہی (پٹنہ)

محترمی ڈاکٹر صاحب،
شگوفہ پابندی سے مجھے اور سارے احباب کو مل رہا ہے۔ بہت بہت شکریہ۔
مصروفیت کے باوجود ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ نیا شمارہ ملنے سے قبل ہی زیرِ نظر شمارہ ختم کروں ورنہ شاید دوبارہ وہ وقفہ نہ ملے۔ کئی سالوں کے بعد بھی اس کی شگفتگی میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ یہ سب آپ کی محنت اور محبت کا نتیجہ ہے۔ اور اس کے لیے آپ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

مسعود حسینی (آسٹریلیا)

ڈسمبر کا شمارہ دیکھا (سوئنر ایجنٹ نے دیا ہی نہیں) جناب نریندر لوتھر کا مضمون آب و تاب لیے ہوئے ہے۔ سرریٹ حیدرآبادی صاحب کے انتقال کی خبر سے دلی صدمہ پہنچا۔ افسوس ایک اچھا مزاح نگار اٹھ گیا۔
خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ان کے غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت کی طرف زندہ دلانِ حیدرآباد کو متوجہ ہونا چاہیے اور جلد سے جلد کتابی شکل میں شائع کر دینا چاہیے۔

محبوب مانتھوی (ہلاسپور)

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد ۲۳
شمارہ ۳
مارچ ۱۹۹۰ء

فی پرچہ : ۵ روپے

زرِ سالانہ : ۵۵ روپے

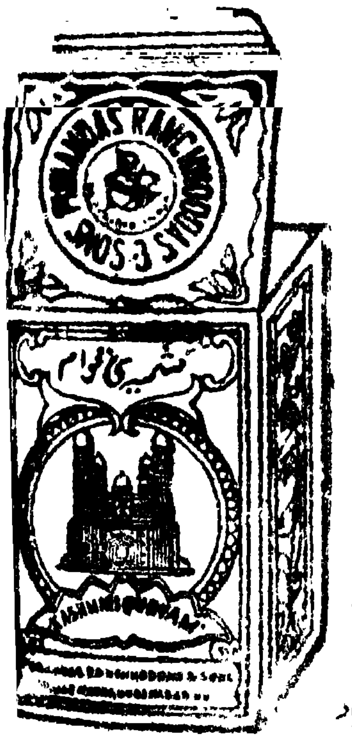
لائبریریوں سے : ۶۰ روپے، بیرونی ممالک سے : ۱۸۰ روپے

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان حیدرآباد ـ ۲

ترسیلِ زر اور خط و کتابت کا پتہ :

شگوفہ، ۳۱ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

فون آفس : 557716
فون رہائش : 521064


کشمیری قوام

اِس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

نریندر لوتھر

قسط (۸)

آنکھوں میں تو دم ہے

(سفرنامۂ امریکہ)

صحت اور بیماری ڈاکٹروں کی دین ہیں۔ وہ اگر چاہیں
صحت مند سے صحت مند شخص کو بیمار قرار دے دیں اور وہ
ہیں تو بیمار کے صحت مند ہونے کا اعلان کردیں۔ ہندوستانی
کٹروں نے فتویٰ دے دیا کہ ہم بیمار ہیں۔ ہم فوراً بستر پر دراز
گئے۔ خوں ریزی کے بعد امریکی ڈاکٹروں نے اعلان کردیا کہ ہم
رست ہیں۔ اُن کے اس حکم کو ہم نے سر آنکھوں پر لیا کہ
رے جسم کے یہی حصّے بوجھ اُٹھانے کے قابل رہ گئے تھے۔ اُن
رائے کے مطابق ہم نے نارمل لوگوں کا چلن اپنالیا۔ چوہے
بل سے باہر نکلنا شروع کردیا۔ غریب الوطن مریض شفا
نے پر ٹورسٹ بن جاتا ہے۔

اب ہم نے ہوسٹن کو صحت مند آنکھوں سے اور ابھی تک
زور ٹانگوں کے سہارے دیکھا۔

ہم آپ کو بتاچکے ہیں کہ ہوسٹن ٹیکساس کا حصّہ ہے اور
یکساس زرعی ریاست ہے۔ بیشتر باشندے کسان ہیں۔ اکثریت
اپنا اپنا رینچ (RANCH) ہوتا ہے۔ ہر رینچ میں ہزاروں
ڑ زمین ہوتی ہے اور ہزاروں مویشی بھیڑیں، بکریاں، گائے
یرہ۔ ہندوستان میں گائے کے ساتھ گوپی کا تصوّر ہوتا ہے۔
ساس میں گوالا یعنی کاؤ بوائے "COW BOY" پائے جاتے
ں۔ ہمیں کسی رینچ میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔

اس ریاست میں تیل کی بہت افراط ہے۔ گھر گھر تیل
کے کنوئیں دکھائی دیتے ہیں۔ پینے کو پانی مانگیے تو لوگ ایک
بوتل تیل دے دیتے ہیں۔ تیل کی دریافت کی وجہ سے یہاں کے
لوگ اور بھی امیر ہوگئے ہیں۔ ہوسٹن کے زیادہ تر باشندے امریکہ
کے "جاٹ" یا "ریڈی" کہے جاسکتے ہیں۔ اُن کے پاس پیسہ
بہت ہے خرچ بھی دل کھول کر کرتے ہیں۔ اُن کی امارت
[illegible] کی ہر [illegible] دیکھا جاسکتا ہے۔ اُن میں

ستر اسٹین لیس اسٹیل (STAIN LESS STEEL) یا شیشے کی بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ اُن عمارتوں کی دیواروں پہ دن بھر
ج طرح کے عکس پڑتے رہتے ہیں۔ اور ان سے نئے نئے اور عجیب وغریب ڈیزائن بنتے رہتے ہیں۔ نتیجتاً وہ عمارتیں
ارا دن گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی رہتی ہیں۔ صبح آپ جس عمارت میں ہو کر آئے ہوں۔ دوپہر کو اُسے پہچاننا مشکل
دجاتا ہے۔ اسی لیے ہر عمارت کا نام اور نمبر ہوتا ہے۔

وہاں سڑکوں اور شہر کی گلیوں سے گزرتے وقت یہ کہنا مشکل ہوتا ہے کہ بازار کہاں ہے۔ وہاں ہندوستانی قسم کے بازار کم ہی ہوتے ہیں کہ سڑک کی دونوں طرف دکانیں ہوں جن کے سامان سے فٹ پاتھ بھی اٹا پڑا ہو۔ وہاں عموماً سارے کا سارا بازار ایک یا دو بڑی عمارتوں کے اندر ہی سجایا ہوتا ہے۔ اس طرح سردی گرمی، دھوپ چھاؤں، بارش، برفباری۔ ہر حال میں آرام سے شاپنگ کی جاسکتی ہے۔ دُکانوں کی آرائش کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جیسے بارات آنے والی ہو۔ صفائی اور قرینے کا یہ عالم کہ سارا دن بازار کی گرد چھان لیجئے اور ایک ذرّہ گرد کا نہ ملے گا۔ کئی بڑی عمارتیں اور ان کی تمام دُکانیں ایک ہی مالک کی ہوتی ہیں۔ بیشتر اُن کے مالک یہودی ہوتے ہیں۔ اُن کو 'ڈپارٹمنٹ سٹور' کہا جاتا ہے۔ ایسے ایک سٹور میں ہماری ایک نَلو سے بھی زیادہ دکانیں سما جائیں اور وہ دیوہیکل سٹور ڈکار بھی نہ لے۔ حیدرآباد کا عابد روڈ ایک سٹور میں اور دلّی کا کناٹ پیلیس زیادہ سے زیادہ دو سٹوروں میں آسانی سے سما سکتے ہیں۔ دُکانوں کو سجانے میں بھی ان لوگوں نے کمال کیا ہے۔ چیزیں ایسے سجا کر اور قرینے سے رکھی جاتی ہیں کہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ دکاندار بے چارے رفاہِ عامہ کی خاطر نقصان اٹھا کر مال بیچ رہے ہیں۔ کبھی اس بہلنے سے، کبھی اُس بہانے سے، کبھی دس، کبھی بیس اور کبھی پچاس فیصد ڈسکاؤنٹ دیا جاتا ہے اور وہ بھی خاص خاص موقعوں پر۔ ہم نے جب کبھی کوئی چیز خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہمیں یہ صلاح دی جاتی کہ ابھی مت خریدو۔ ذرا رُک جاؤ۔ کرسمس کے پاس اور بھی سستی ہوگی۔ کرسمس کے دن قریب آئے تو کرسمس کے بعد خریدنے کی صلاح دی گئی۔ اس طرح ہم بے شمار چیزیں خرید نہ پائے۔ ہمیشہ اور بھی زیادہ چھوٹ کے لالچ میں روک دیئے گئے۔ اس طرح ہم امریکہ میں کافی پیسہ بچانے میں کامیاب ہوئے۔ ایک دن ہم نے ایک کیمرہ خریدنے کا عزمِ مصمّم کرلیا۔ لیکن اس دن ہمارے سب دوستوں نے ہمیں روک دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ایران عراق جنگ بند ہونے والی ہے۔ اس کے بند ہوتے ہی امریکہ میں چیزیں دمڑی کے بھاؤ بکیں گی۔ لیکن ہماری قسمت کہ وہ جنگ آج تک جاری ہے۔

ڈپارٹمنٹ سٹوروں میں سوئی سے لے کر ہاتھی تک ہر چیز مل سکتی ہے۔ ایک دن ہمارا دل ہندوستان کے لیے اُداس ہوگیا۔ ہم نے سوچا چلو دل بہلانے کے لیے ایک ہاتھی ہی خرید لو۔ کئی دُکانوں پر گئے لیکن نہ ہاتھی ملا، نہ ہاتھی کی دُم۔ آخر ہم نے سوئی خرید کر ہی صبر کیا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امریکن اشتہاروں میں کتنی مبالغہ آمیزی ہوتی ہے۔

وہاں جس آسانی سے آپ چیزیں خرید سکتے ہیں، اسی آسانی سے اُنھیں واپس بھی کرسکتے ہیں اس کے لیے آپ کو کوئی وجہ نہیں دینا پڑتی۔ اگر دکاندار بڑے ادب سے آپ سے وجہ پوچھ بھی لے تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ

ہم نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ دکاندار چپکے سے آپ کے پیسے واپس کر دیتا ہے اور وہ شئے واپس لے لیتا ہے۔ ہم نے کئی چیزیں خریدنے کا شوق اسی طرح پورا کیا۔ ایک دن وہ چیز لے لیتے تو دوسرے دن اسے واپس کر دیتے۔ اس طرح سے ہم نے امریکہ میں نہ صرف 'خریدی' کی بلکہ فروخت بھی کی اور اس طرح نہ صرف کاروبار کے نئے گُر سیکھے بلکہ اپنے اندر اعتمادی کے جذبے کو بھی فروغ دیا۔ ایسے موقعوں پر ہمیں اپنا ملک یاد آجاتا ہے۔ یہاں بیشتر دکانوں پر 'وارننگ' بھی ہوئی ملتی ہے کہ ایک بار بچا ہوا مال کسی صورت بھی واپس نہیں لیا جائے گا۔ جہاں یہ نوٹس نہ بھی لگا ہوا ہو، وہاں بھی کسی چیز کو لوٹانے کے لیے آپ کو ایک وکیل، تھانے دار یا شاپ انسپکٹر کو ساتھ لے جانا پڑتا ہے۔ بلے ایسا کام کرنے کی کوشش کریں تو دکان دار سے بھلی بری سننا پڑتا ہے۔ وہ آپ کے دماغ کے ہلکے پن یا بینائی کم بالکل نہ ہونے کی توثیق کرتا ہے۔ امریکہ میں ہمیں اپنے بارے میں ایسی کوئی معلومات فراہم نہیں کی گئیں ـــ ہندوستان میں ہر دکان میں آپ کو "خود کی دریافت" میں مدد کرنے کے لیے والنٹیر ملیں گے۔ امریکن دکاندار چاہے آپ کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوں لیکن کیا مجال کہ سی۔آئی۔اے کے علاوہ کسی اور کو بتائیں۔ ہندوستان میں اگر ہم کسی دکان پر دو تین چیزوں کی قیمت پوچھ لیں اور فوری طور پر ان میں سے ایک چیز نہ خرید لیں یا ایک آدھ ٹیری لین کے تھان پر ہاتھ پھیر کر اس کی ملائمت کا اندازہ لگاتے ہوئے پکڑے جائیں تو دکاندار اپنا اصلی رنگ دکھانے میں دیر نہیں کرتا۔ "کچھ لینا بھی ہے یا قیمتیں ہی پوچھتے رہوگے؟" امریکہ میں ہم نے بے شمار دکانوں کی مختلف چیزوں کو الٹ پلٹ کر ایسے تفصیلی معائنہ کیا گویا ہم انکم ٹیکس کا دھاوا کرنے والے افسر ہوں۔ لیکن ہر ایسی تلاشی کے بعد دکاندار نے صرف 'شکریہ' ہی کہا۔ کئی شریف زادوں نے تو ہمیں پھر آنے کی دعوت بھی دی۔ واقعی امریکہ میں "کھڑکی کی شاپنگ" دل بہلانے کا بہترین طریقہ ہے۔ راجو کے غیاب میں دن کے وقت چھایا اکثر ہمیں مختلف قسم کے اسٹوروں یا مالوں لے جاتی جہاں ہم اپنا دل بہلاتے اور ساتھ ہی اپنی معلومات میں اضافہ کرتے۔ شام کو جب راجو گھر واپس آتا تو ہماری صحت کی بہتری اور ہماری معلومات میں اضافہ دیکھ کر حیران رہ جاتا اور عموماً بھانپ جاتا کہ اس دن کس کس سٹور میں گئے تھے۔

امریکہ میں بیسیوں ٹی۔وی اسٹیشن اور سینکڑوں ریڈیو اسٹیشن ہیں۔ ہر شہر کا اپنا علحدہ ٹی۔وی اور ریڈیو پروگرام ہوتا ہے اور وہ بھی ایک نہیں بلکہ کئی ریڈیو اور ٹی۔وی کے پروگرام چوبیس ۲۴ گھنٹے چلتے ہیں ـــ سب اسٹیشن نجی ہیں۔ حکومت کا اپنا کوئی ٹی۔وی یا ریڈیو اسٹیشن نہیں۔ امریکنوں کا عقیدہ ہے، حکومت کو حکومت کرنا چاہیئے۔ باقی کام عوام پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ ہاں البتہ بیشتر یونیورسٹیوں کے اپنے ریڈیو اور ٹی۔وی اسٹیشن ہوتے ہیں جو عام طور پر طلبا چلاتے ہیں۔ لیکن وہاں یونیورسٹیاں بھی ذاتی ہوتی ہیں۔ امریکہ ذاتی اداروں کا ملک ہے جس کو سرمایہ داری نظام بھی کہا جاتا ہے۔ وہاں صرف تین یا چار کمپنیاں مثلاً اے بی سی، این بی سی اور ایکس وائی زیڈ ملک گیر ہیں ـــ سب سے زیادہ پروگرام خبروں اور موسم کے بارے میں ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی کے ساتھ فخر بھی ہوا کہ امریکہ میں سب سے زیادہ مقبول پروگرام طنزیہ اور مزاحیہ قسم کے ہوتے ہیں اور امریکہ کی مقبول ترین اور امیر ترین عوامی شخصیتیں وہاں کے ٹی۔وی کے مزاحیہ فن کار ہیں۔ جانی کارسن کے پروگرام دیکھنے کے لیے لوگ اپنے سب کام ختم کر کے

ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ فن کاروں کی اکثریت کالے لوگوں کی ہے۔ ہمیں تو ایک بھی سفید فام مزاحیہ فن کار دیکھنے کو نہیں ملا۔

وہاں مزاحیہ پروگراموں کی مقبولیت دیکھ کر ہمیں یہ خیال آیا کہ اگر حیدرآباد کے زندہ دلان' امریکہ چلے جائیں تو یقیناً بہت کامیاب ثابت ہوں۔ وہاں کی ایک کمپنی کو جب معلوم ہوا کہ ہم امریکہ میں ہیں اور زندہ ہیں تو اس نے ہمارا ایک گھنٹہ کا پروگرام ریکارڈ کیا۔ اُنھوں نے ہمیں کہا کہ اگر ہم ہندوستان سے تیار شدہ پروگراموں کے کیسٹ اُنھیں بھیج سکیں تو وہ ہمیں معقول معاوضہ بھی دیں گے۔ لیکن یہ وعدہ فردا والی بات تھی۔ ہمارا ایک گھنٹہ کا پروگرام اُنھوں نے مُفت ہی لے لیا۔ خیر، ہمیں کچھ کوفت نہیں ہوئی۔ کیوں کہ ہمیں ایسے سلوک کی عادت ہے۔ مشکل تو تب پڑتی جب وہ ہمیں معاوضہ دینے کی بات کرتے۔

یہ کمپنی چند ہندوستانیوں نے مل کر شروع کی ہے اور وہ ہندوستانیوں کے لیے پروگرام تیار کرتے ہیں۔ ان ہندوستانیوں کی لگن اور محبّت دیکھ کر ہمیں بہت خوشی ہوئی اور اس خوشی سے ہماری صحت بھی بہتر ہونے لگی۔

اِسی دوران ہم طے شدہ پروگرام کے مطابق معائنے کے لیے دوبارہ ہسپتال گئے۔ وہاں ہم نے آدھا دن گزارا۔ کئی قسم کے ٹسٹ لیے گئے، اس کے بعد ڈاکٹر نے ہمیں بتایا کہ ہم روبہ صحت ہیں اور جب بھی چاہیں ہوسٹن سے جاسکتے ہیں۔

ہوسٹن میں قیام کے دوران راجو سے ہماری مختلف موضوعات پر کافی دوستانہ بحث ہوتی رہی۔ راجو ایک سنجیدہ اور کامیاب سائنسداں ہے۔ اُس نے اٹلی اور جاپان میں اٹامک کارخانوں کے عملوں کے لیے تربیتی کورس منظم کئے ہیں اور ایک آدھ پروگرام ہندوستان میں بھی کرچکا ہے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ امریکہ کے اٹامک ضابطہ بورڈ میں ہندوستانیوں کی اکثریت ہے اور ہندوستانیوں کا شمار صفِ اول کے اٹامک انجینئروں اور سائنسدانوں میں ہوتا ہے۔ اس بات کو سُن کر ہمیں بڑی خوشی ہوئی اور ہم نے اس سے پوچھا کہ اس لحاظ سے ہم پر بھی اٹامک سائنسدان ہونے کا شبہ کیا جاسکتا ہے؟ اُس نے کہا بے شک امریکہ میں ہر ہندوستانی کو اٹامک سائنسدان سمجھا جاتا ہے تاوقتیکہ وہ یہ ثابت نہ کرے کہ وہ ایک عام انسان ہے اور ایٹم کے رازوں سے بے بہرہ ہے۔ اب ایٹم کے بارے میں کوئی بات راز کی نہیں رہی۔ ایک وقت تھا کہ جب اس سے صرف بم بنائے جاتے تھے، اب تو اس سے بجلی بنائی جانے لگی ہے۔ سمندروں کو قابو میں لایا جانے لگا ہے۔ بیماریوں کا علاج کیا جانے لگا ہے اور نہ جانے کیسے کیسے عامیانہ کاموں پر جُٹایا جاتا ہے۔ ہم تو ایٹم کو اس وقت سے جانتے ہیں جب اس سے صرف بم بنایا جاتا تھا۔ اب ایٹم میں کیا رہ گیا ہے؟ اسکول کے بچوں کو بھی اس کے فوائد کے بارے میں پڑھایا جاتا ہے۔ آج کل دیسی گھی نہیں ملتا، اصلی دودھ نہیں ملتا، تو ایٹم کہاں سے ملے گا! وہ دن گئے جب خلیل خاں ایٹم بنایا کرتے تھے۔

شام کے وقت راجو اکثر ہندوستان واپس آنے کی بات چھیڑا کرتا ــــ لیکن اِدھر اُدھر دیکھ کر کہ کہیں

ں کی بارہ سالہ بیٹی کو اس بارے میں پتہ نہ چل جائے وہ ایٹم کے بارے میں کھل کر باتیں کرتا لیکن ہندوستان واپس
نے کی بات بڑے رازدارانہ انداز میں کرتا۔ ایک بار اس کی بیٹی کو پتہ چل گیا کہ ہم اس قسم کی تخریبی باتیں بھی
تے ہیں تو وہ اس پر سخت ناراض ہوئی، یہ صورت حال ہم نے بعد امریکہ کے بہت سے ہندوستانی گھروں میں دیکھی
ہلی پیڑھی کے لوگ جو وہاں اپنی جوانی میں گئے تھے اب کافی دولت کما چکے ہیں اور اعلیٰ معیار زندگی کا مزہ
ھی چکھ چکے ہیں۔ وہ اکثر غریب الوطنی محسوس کرتے ہیں اور اپنے وطنِ عزیز واپس آنے کے بارے میں سوچتے
ں، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کے جوان ہونے سے پہلے ہی واپس آجائیں تو اچھا
ہے نہیں تو بچوں کے اور خاص طور پر لڑکیوں کے گمراہ ہونے کا خطرہ ہے۔ اس کے خلاف ان کے بچے جو امریکہ میں ہی
لے ہیں اور بڑے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کو غیر ملک تصوّر کرتے ہیں۔ جن سہولیات کی انھیں عادت ہو گئی ہے،
ہ ہندوستان میں ابھی نایاب ہیں۔ انھیں ہندوستان، غریب، غلیظ اور پچھڑا ہوا ملک لگتا ہے اس طرح امریکہ
ں ایک پود کا دوسرے سے ٹکراؤ بار بار دیکھنے کو ملتا ہے۔ راجو کی ذہنی کشمکش ہندوستان نژاد امریکیوں کی
لتربیت کی کشمکش ہے اور تقریباً ہر خاندان میں یہ 'تماشہ' روزانہ ہوتا ہے۔ ایسے ڈرامے دیکھ کر ہمیں سکون ملتا ہے۔
چھا ہوا ہم ایسی خانہ جنگی سے بچ گئے۔ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ ؎

ہم کو معلوم ہے امریکہ کی حقیقت لیکن
علاجِ دل کے لیے بس یہ ملک اچھا ہے

ایک امریکن جنرل شیریڈان SHERIDAN نے پچھلی صدی میں کہا تھا کہ اگر اس کے پاس ٹیکساس اور
ہنم دونوں ہوں تو وہ ٹیکساس بیچ کر جہنم میں رہنا پسند کرے گا۔ ہمیں پتہ نہیں کہ اسے ٹیکساس میں کون سی چیز
نی بُری لگی لیکن اگر ہمیں کبھی ایسا فیصلہ کرنا پڑے تو ہم، ہوسٹن کو جہنم پر ترجیح دیں گے خاص طور پہ جب تک
ہاں راجو اور چھایا جیسے نیک، مخلص اور خوش طبع لوگ رہتے ہیں۔

لیکن فی الحال تو یہاں سے جانا ہی تھا ▲▲

اقبال ہاشمی (حیدرآباد)

○

ضبطِ تحریر میں کبھی آئے
آپ لوگوں کی پھسپھسی رائے

جانے کیا چاہتے ہیں ہم سے آپ
یہ کبھی کھل کے سامنے آئے

شور برپا ہے آپ کے دم سے
جانے کب آپ کو قرار آئے

ہم تو کچھ پائے تھے نہ بسم اللہ
وہ تو مشتاق بھی اُتار آئے

آپ نیتا ہیں آپ کے دم سے
انتخابات میں نکھار آئے

آپ کی آنکھ سے ٹپکتی ہے
مستیوں کی جگہ نری چائے

آپ شاعر ہیں ہاشمی لیکن
کچھ کھلائیں تو اعتبار آئے

○

عنایت علی خاں (حیدرآباد، سندھ)

○

جس کی آواز میں شعلہ سا شرر بار نہ ہو
شعر فرماتے ہیں کیوں وہ جو گلوکار نہ ہو

لکشمی گھر میں نہ ہو باپ بھی زردار نہ ہو
تب کوئی دولت و شہرت کا طلبگار نہ ہو

میں مشقت سے گریزاں تو نہیں ہوں لیکن
اس سے وابستہ امیدیں بھی ہوں بیکار نہ ہو

میں تو مے خوار تھا اس واسطے میں خوار ہوا
تو تو مے خوار نہیں مفت میں یوں خوار نہ ہو

آج تم جس کو مری جانِ غزل کہتے ہو
کل وہی جانِ غزل جان کا آزار نہ ہو

کیوں مرے گھر کی منڈیروں پہ ہے کوؤں کا ہجوم
دیکھنا چھچھورا کوئی پسِ دیوار نہ ہو

خواب موسم کی دھنک چھاؤں میں یہ آس گلاب
شیخ چلّی کی بھٹک سوچ کا آزار نہ ہو

میں بھی غالب کی طرح سوچ کے رُک جاتا ہوں
پائے نازک پہ پلستر بھی کہیں بار نہ ہو

آج وہ تُند خُو ہیں کیوں خیر تو ہے
اپنی ممی سے کہیں برسرِ پیکار نہ ہو

رضا نقوی واہی

قصّہ میرے واہی بننے کا

میں دسمبر ۱۹۴۸ء کے آخری ہفتے تک اچھا بھلا رضا نقوی تھا۔ اس نام کے تحت میرا سنجیدہ کلام ۱۹۳۲ء سے ملک کے اہم ماہناموں میں شائع ہونے لگا تھا جن میں چند نام یہ ہیں۔ ندیم اور سہیل (گیا) تسنیم (پٹنہ) نگار (لکھنو) کلیم، ایشیا اور ساقی (دہلی) ادب لطیف اور رومان (لاہور) لیکن ۱۹۴۸ء میں ایک ایسا دلچسپ واقعہ رونما ہوا جس نے دفعتاً میرے قلم کو ظریفانہ شاعری کی جانب موڑ دیا۔ اسی ایک واقعہ کے طفیل اب تک میرے سات مجموعے اردو میں اور ایک ہندی میں شائع ہو چکے ہیں جبکہ سنجیدہ شاعری کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہو سکا۔ اس واقعہ کی تفصیل یوں ہے:۔

دسمبر ۴۸ء کا آخری ہفتہ تھا۔ میں کرسمس کی تعطیل میں والدین سے ملنے وطن گیا ہوا تھا۔ ایک دن صبح کے وقت گھر کے باہر مردانہ بیٹھک کے سامنے دھوپ میں چبوترے پر بیٹھا منھ ہاتھ دھو رہا تھا کہ دیکھا، ایک بزرگ رشتہ دار جو کئی بار دماغی مرض میں مبتلا ہو کر رانچی کے دماغی اسپتال میں زیر علاج رہ چکے تھے اور اس وقت تک نارمل نہیں ہوئے تھے میری جانب تیز تیز قدموں سے چلے آرہے ہیں۔ ایرانی ٹوپی، گرم شیروانی، چوڑی مہری کا پاجامہ پہنے ہوئے ہیں، سفید داڑھی چہرے پر ادھر اُدھر بکھری ہوئی ہے، سُرخ سُرخ آنکھیں ہیں، ایک ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا بھی ہے۔ میرے قریب آتے ہی زمین پر ڈنڈا مار کر کرخت آواز میں بولے "رضا میاں، کیا کر رہے ہو؟ بڑے شاعر بنتے ہو، ادھر آؤ میرے پاس۔" یہ بے ربط گفتگو سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور ان کے ڈنڈے کی زد سے محفوظ رہنے کے لیے چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میرے عزیز نے مجھے خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے پھر کہا.... "ادھر آؤ".... اور یہ کہتے ہوئے مردانہ بیٹھک کے برآمدے سے گزر کر بڑے ہال میں داخل ہو گئے۔ ہال کے تین دروازے تھے اندر کئی بڑی بڑی چوکیوں کا فرش تھا۔ کچھ کرسیاں اور میز ادھر اُدھر پڑے تھے۔ چوکیوں کے فرش پر ڈنڈا رکھنے کے بعد میری جانب متوجہ ہو کر کہنے لگے "بڑے شاعر بنتے ہو، سنو یہ نظم اور صلاحیت ہو تو لکھو ایسی نظم۔" پھر جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال کر تھرک تھرک کر ترنم سے پڑھنے لگے:۔

اے میں لے ادمیں لے ؎ لوہا میں لے، چھوا میں لے

میں دور کھڑا یہ تماشا دیکھتا رہا۔ چند لمحوں میں جب یہ بے تکا کلام ختم ہوا تو وہ کچھ کہے بغیر ڈنڈا اٹھا کر اسی تیز رفتاری سے واپس چلے گئے، جس تیزی سے آئے تھے۔ یہ تکبندی ہندی کے ایک شاعر پروفیسر منورنجن سنہا کے زور قلم کا نتیجہ تھی جو راجندر کالج چھپرا کے پرنسپل تھے۔ ایم۔ایل۔اے حضرات ہدف بنائے گئے تھے۔

بزرگ عزیز کے واپس جانے کے بعد معاً ذہن میں یہ بات آئی کہ جب میں خود مجلس قانون ساز میں ملازم ہوں

اور جب روزانہ ہی ارباب سیاست کو قریب سے دیکھنے کا شرف حاصل کرتا رہتا ہوں تو کیوں نہیں میں بھی ایم ایل اے حضرات کی خبر لوں۔ چنانچہ اسی روز دوپہر تک دس بارہ اشعار لکھ ڈالے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مشہور افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی (مرحوم) پٹنہ کے روزنامہ ساتھی کے مدیر تھے اور اس اخبار میں ایک مزاحیہ کالم "راہی کے قلم سے" کے مستقل عنوان سے لکھا کرتے تھے۔ میں نے اپنے وہ اشعار اُسی راہی کے نام اس نوٹ کے ساتھ پوسٹ کر دیئے کہ میرا نام ظاہر کیے بغیر کسی فرضی نام سے ساتھی میں شائع کر دیں۔ سہیل نے عملی مذاق یہ کیا کہ راہی کے ہم قافیہ لفظ واہی کے نام سے ایم۔ ایل۔ اے۔ کی سرخی لگا کر اشعار شائع کر دیے۔ یوں میرے اچھے بھلے نام کی مٹی پلید ہوئی۔ سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے میرا اصل نام اُس وقت شائع کرنا بہت سی مشکلات کا پیش خیمہ بن سکتا تھا۔ لہذا میں نے اس مذاق کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا۔ میری اس پہلی ظریفانہ نظم کے چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

مجھے پوچھو تو کیا ہوں میں، لگاؤ تو پتہ میرا — پہیلی ہوں، مگر مشکل نہیں ہے بوجھنا میرا
میں اک مجلس کا ممبر ہوں، سوا ہے مرتبہ میرا — مری توقیر، مرنا آنا ہے خود بخت رسا میرا
ہے چوکیدار سے لیکر منسٹر تک پہنچ میری — بڑی ہے دھاک میری اور بڑا ہے دبدبا میرا
میں دو بیگھے کا مالک تھا الکشن سے ذرا پہلے — مگر دو سال میں چمکا ہے یوں بخت رسا میرا
کہ اب اللہ رکھے ہیں پچاس کھیت قبضے میں — "اپنا" روڈ پر بنگلہ بھی ہے اک پُر فضا میرا
کرانن تیل اور لوہے کا کاروبار کرتا ہوں — گزشتہ سال چھوڑے کا بھی کام اچھا چلا میرا
بہ ظاہر میں اخوت اور اہنسا کا پجاری ہوں — بہ باطن ہے مگر فرقہ پرستی سے سلسلہ میرا
خود اپنا پیٹ بھرنا اور کنبہ پروری کرنا — یہی ہے زندگی میری یہی ہے مدعا میرا
میں ہر قانون کی باریکیوں پر غور کرتا ہوں — مگر آزاد ہے قانون کی زد سے گلا میرا
میں ہر دم نیک دیر کرنے پہ ہو جاتا ہوں آمادہ — ذرا سا بھی نظر آتا ہے جس میں فائدہ میرا
وہ افسر جو مجھے پرمٹ دلاتا ہے بہ آسانی — اُسی سے دوستی میری اسی سے رابطہ میرا

تعطیل کے بعد جنوری ۴۹ء میں جب وطن سے پٹنہ واپس آیا تو یہاں ادبی حلقوں میں میری نظم کا چرچا تھا۔ سہیل عظیم آبادی ایک دن میرے دفتر پہنچے اور مُصر ہوئے کہ ساتھی کے ادبی ایڈیشن کے لیے ہر ہفتہ ایک مزاحیہ نظم لکھوں تاکہ ان کے اخبار کے قارئین کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا رہے۔ لہذا میں نے نظمیں لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ موضوعات کی کمی نہیں تھی۔ ملک نیا نیا آزاد ہوا تھا، قومی حکومت برسر اقتدار آئی تھی۔ چند ہی سال قبل دوسری عالمی جنگ ختم ہو کر اپنے پیچھے عوام کے لیے نئے نئے مسائل چھوڑ گئی تھی۔ عوام کا استحصال کرنے والی طاقتیں ابھر رہی تھیں بیروزگاری بڑھ رہی تھی، ضروری اشیا کی کمی نے مفلسی کو سنگین تر بنا ڈالا تھا۔ ایسے میں ظریفانہ یا طنزیہ شاعری کے لیے مواد بکھرا پڑا تھا۔ نظمیں ڈھلنے لگیں اور روزنامہ ساتھی کے ہفتہ واری ادبی ایڈیشن میں شائع ہوتی رہیں۔

اُس زمانے میں بہار کی کابینہ میں دو مسلم وزرا تھے۔ ایک تو مشہور و معروف سیاست داں ڈاکٹر سید محمود، جو آگے چل کر مرکزی کابینہ میں بھی شامل ہوئے اور دوسرے جناب عبدالقیوم انصاری۔ دونوں میں چشمکیں جاری رہتی تھیں۔ ڈاکٹر سید محمود کے تعلیم [illegible] وزارت [illegible] اور تعلیم کے قلمدان سنبھالے تھے اور انصاری

صاحب، وزیر تعمیرات تھے جو روزنامہ ساتھی کو درپردہ مالی امداد بھی دیا کرتے تھے۔ اتفاق سے یا غیرارادی طور پر نظم ایم ایل اے کے بعد میں نے پوسٹ وار ڈیولپمنٹ، گرومور فوڈ، امتحانات میں بیروی، زبان، آزادی وغیرہ جیسے سامنے کے موضوعات پر نظمیں لکھیں تو ڈاکٹر سیّد محمود نے یہ سمجھا کہ عبدالقیوم انصاری صاحب کسی سے اُن کے محکموں کی کارکردگی کے خلاف نظمیں لکھوا رہے ہیں۔ اور انصاری صاحب نے یہ سمجھا کہ سہیل عظیم آبادی واہی کے قلمی نام سے خود لکھ رہے ہیں حالانکہ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ معاشرے کے مختلف شعبوں میں جو اخلاقی گراوٹ اس زمانے میں آ رہی تھی اس کی جانب عوام کے ذہنوں کو متوجہ کروں۔ تقریباً ایک سال بعد سہیل نے انصاری صاحب کے اصرار پر یہ راز کھول دیا کہ واہی میں ہی ہوں۔ لطف کی بات یہ تھی کہ انصاری صاحب سے اسمبلی میں روزانہ ملاقات ہوتی تھی مگر وہ مجھے صرف ایک سنجیدہ شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے۔ اب جو وہ میری واہیاتی شاعری سے بھی واقف ہو گئے تو ایک دن اپنے چیمبر میں بلوا کر کہنے لگے "نقوی صاحب آپ نے اپنے نئے رنگ کو مجھ سے کیوں پوشیدہ رکھا؟ آپ کی مزاحیہ شاعری تو معاشرے پر تنقید ہے۔ اپنی نظموں کا مجموعہ کیوں نہیں چھپواتے؟" میں نے عرض کیا کہ مجموعہ چھپوانے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے اور یہاں چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں؟" کہنے لگے اس کی فکر نہ کیجیے ——— پیسوں کا انتظام ہو جائے گا۔ دوسرے روز انہوں نے اپنے (Descritionary Fund) سے پانچ سو روپے مجھے دلوا دیئے۔ اور میں نے محض چار سو روپے میں نناوے صفحات پر مشتمل اپنا پہلا مجموعۂ کلام "واہیات" ۱۹۵۰ء میں شائع کر دیا۔

۱۹۸۸ء سے لکھنؤ یونیورسٹی کے بی۔ اے کورس میں واہیات شامل کر لی گئی ہے۔ طالب علموں کی ضرورت کے پیشِ نظر اس کا دوسرا ایڈیشن مارچ ۸۹ء میں عابد سہیل صاحب نے اپنے ادارے نصرت پبلشرز کے ذریعہ چھاپا ہے۔

۱۹۵۰ء کے اواخر یا شروع ۵۱ء میں جب جناب عبدالقیوم انصاری کی سرپرستی میں ایک کُل ہند اُردو کانفرنس منعقد ہوئی تو روزنامہ قومی آواز کے اُس وقت کے مدیرِ اعلیٰ جناب حیات اللہ انصاری بھی پٹنہ تشریف لائے اور انہوں نے دورانِ ملاقات مجھ سے کہا کہ "واہی صاحب! آپ کی سنجیدہ ظریفانہ شاعری عصرِ حاضر کے مسائل کو بڑی چابک دستی سے اپنی گرفت میں لیتی ہے اور اسے عام طور پر پسند کیا جا رہا ہے۔ لہذا آپ قومی آواز لکھنؤ کو بھی کچھ بھیجا کیجیے۔" اس حوصلہ افزا گفتگو سے میرا دل بڑھا اور میں قومی آواز کو اپنی ہر تخلیق نظم پابندی سے بھیجنے لگا۔ یہ سلسلہ حیات اللہ انصاری صاحب کے قومی آواز سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی عرصۂ دراز تک چلتا رہا۔ یہ روزنامہ ایک کثیر الاشاعت اخبار ہے اور اس کا ادبی حصہ دوسرے اخبارات میں بھی نقل ہوتا ہے اس لیے میری نظموں کے قارئین کا دائرہ پورے برِّصغیر میں بڑھتا پھیلتا گیا۔

واہیات نظموں کی مقبولیت کی وجہ سے مجھے ملک کے مختلف شہروں کے مشاعروں میں کثرت سے بلوایا جانے لگا۔ ۱۹۷۳ء تک بہار کے شہروں کے علاوہ کلکتہ، بنارس، الہ آباد، لکھنؤ، دہلی، بمبئی، مدراس، بنگلور اور حیدرآباد تک کی دوڑ لگاتا رہا۔ اس کے بعد صحت کی خرابی نے ایسا مجبور کیا کہ مجھے سفر سے الرجی ہونے لگی۔ اس کی وجہ سے امریکہ، کویت، شارجہ، پاکستان، کشمیر سے دعوت نامے آئے لیکن کہیں نہیں جا سکا۔

اب لگے ہاتھوں واہیاتی نظموں کی اشاعت کا حال ملاحظہ ہو۔ جیسا کہ بیان کر چکا ہوں "واہیات" تو جناب عبدالقیوم انصاری (مرحوم) کی وجہ سے شائع ہوئی۔ ... کلام طنز و تبسم کی اشاعت کا واقعہ بھی دلچسپ

۱۹۶۲ء کی گرمیوں کی ایک رات تھی، ایک دوست نے شب کے کھانے پر مجھے مدعو کیا تھا۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ پہلے سے ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ جن سے میں واقف نہیں تھا۔ میزبان سے ادھر ادھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ اتنے میں بزرگ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا کہ واہی صاحب واہیات کے بعد آپ کا کوئی اور مجموعۂ کلام کیوں نہیں شائع ہوا۔ میں نے مختصراً تقریباً وہی جواب دیا جو عبدالقیوم انصاری کو دے چکا تھا کہ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ وہ خاموش ہو گئے مگر کھانے کے بعد انھوں نے پھر سوال کیا کہ کوئی نیا مجموعہ کیوں نہیں چھپواتے۔ میں چڑ گیا کہ خواہ مخواہ ایک شخص جس سے جان پہچان بھی نہیں ہے میرے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کر رہا ہے۔ ترشی سے جواب دیا کہ اخراجات فراہم ہو جائیں گے تو سوچوں گا۔ جب محفل برخواست ہوئی اور میں اپنی سائیکل اٹھا کر کمرے سے باہر نکلنے لگا تو بزرگ موصوف نے کہا کہ میں ریڈیو اسٹیشن کے نزدیک فلاں مکان میں رہتا ہوں، موقع ملے تو کسی دن میرے یہاں آجایئے۔ انھوں نے اپنا نام بھی بتایا۔ دو تین دنوں کے بعد میں ریڈیو اسٹیشن کے قریب سے گزرا تو وہ بزرگ یاد آگئے اور میں ان کے یہاں چلا گیا۔ بیرونی کمرے میں بستر پر لیٹے ہوئے تھے، مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئے، علیک سلیک کے بعد پرانا سوال دہرایا کہ مجموعۂ کلام کیوں نہیں چھپواتے اور اس پر کیا خرچ آئے گا۔ میں نے جواباً کہا کم از کم پندرہ سو روپے صرف ہوں گے۔ وہ کچھ نہیں بولے۔ ملازم کو آواز دیکر چائے منگوائی، خود پی اور مجھے بھی پلائی۔ تھوڑی دیر کے بعد اندر زنانخانے میں گئے۔ واپس آکر میرے سامنے بیٹھ گئے اور بڑی لجاجت سے فرمانے لگے۔ واہی صاحب لیجیے یہ نو سو روپے ہیں، اپنی کتاب چھپوانے کا انتظام کیجیے۔ بقیہ رقم بھی میں دوں گا۔ یہ سن کر میں ہکا بکا رہ گیا کہ

الہٰی یہ ماجرا کیا ہے

خدا کی جانب سے چھپّر پھاڑ کر دینے کی مثل تو سنتا آیا تھا، اب خود پر وہ مثل صادق آرہی تھی پھر بھی رقم لینے سے بظاہر انکار کرتے ہوئے میں نے کہا کہ کتابوں کی نکاسی بڑی مشکل سے ہوتی ہے، مجموعہ چھپ جائے تو نکاسی کیونکر ہوگی اور میں آپ کی کیونکر واپس کر سکوں گا۔ اتنی بڑی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لے سکتا۔ انھوں نے اصرار کرتے ہوئے فرمایا کہ پیسے لے لیجیے اور جب کتابوں کی نکاسی ہو جائے تو اسے واپس کر دیجیے گا، مجھے کوئی عجلت نہیں ہے۔ اب میرے قدم ڈگمگا گئے، مجموعہ چھپوانے کی خواہش نے مجھے موقع پرست بنا دیا اور میں نو سو روپے لیکر سیدھا شہر کے ایک معتبر پریس میں پہنچ گیا۔ وہ رقم منیجر کے حوالے کر کے دوسرے دن مسودہ اسی پریس کے کاتب کو کتابت کے لیے دیا اور روزانہ پریس کی دوڑ لگانے لگا۔ ایک مہینے کے اندر ہی مجموعہ چھپ گیا۔ جلد بندی ہوتے ہی پہلی جلد بزرگ موصوف کو ہدیہ کر دی۔ کتاب اچھی چھپی تھی۔ وہ خوش ہوئے۔ میں نے ان سے کہا کہ اب دوڑ دھوپ کر کے گورنمنٹ کے بعض دفتروں میں اتنی جلدیں نکلواؤں گا کہ آپ کی رقم ادا ہو جائے۔ موصوف نے فرمایا کہ کوئی جلدی نہیں ہے، آپ جب چاہیں رقم واپس کر دیں۔ تین چار ماہ کے بعد دفتر اطلاعات عامہ نے کچھ جلدیں خریدیں، پانچ سو روپے کا چیک ملا۔ میں وہ چیک لیکر بزرگ کے گھر پہنچا۔ چیک دیکھ کر وہ مسکرائے اور فرمانے لگے کہ ابھی اسے رکھئے، جب اور روپے فراہم ہو جائیں تو تیسرا مجموعۂ کلام شائع کیجیے۔ اس کے بعد روپے کا حساب کتاب ہوگا۔ ایک سال گزر گیا، پانچ سو روپے بھی ختم ہو گئے اور پیسے سر پر موصوف کی پونجی رہ گئی۔ اسی دوران ایک شادی کے موقع پر ان سے ملاقات ہو گئی۔ بڑے تپاک سے ملے۔ میں نے شرمندگی کا اظہار

آپ کے روپیے ابتک ادا نہیں کرسکا۔ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے روپے واپس نہیں لینے ہیں میں چاہتا ہوں کہ ان روپیوں کو آپ اپنے اگلے مجموعہ ہائے کلام کی اشاعت پر خرچ کرتے رہیں۔ گذشتہ بیس پچیس برسوں کے دوران میں جب جب ان کی رقم واپس کرنے کے لیے جاتا رہا، وہ برابر یہی کہتے رہے کہ اس رقم سے اپنا کلام چھپواتے رہیے۔ انہوں نے یہ بھی تاکید کی کہ میں کسی کو بھی اُن کا نام نہ بتاؤں۔

تیسرے مجموعۂ کلام نشتر و مرہم کی اشاعت کا قصّہ بھی کچھ ویسا ہی ہے کہ ؎

آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔

زندہ دلان حیدرآباد نے ایک بار اپنی سالانہ تقاریب کے موقع پر ہونے والے مشاعرہ میں مجھے مدعو کیا۔ مئی میں مشاعرہ ہونے والا تھا اور اس موسم میں حیدرآباد کا تکلیف دہ سفر طے کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ لہٰذا میں نے عدم شرکت کی معذرت چاہتے ہوئے ان حضرات کو اپنی چند نظمیں اس درخواست کے ساتھ بھیج دیں کہ مشاعرے میں کسی سے پڑھوا دی جائیں۔ کلام پسند آیا تو ڈاکٹر مصطفیٰ کمال اور دوسرے یاران میکدہ نے میرا ایک تازہ مجموعہ شائع کرنے کی آمادگی ظاہر کی۔ میں نے مسودہ بھیج دیا اور ان حضرات نے بڑی نفاست سے اسے شائع ہی نہیں کیا بلکہ رسم اجراء (جنوری ۱۹۶۸ء) کے موقع پر مجھے مدعو بھی کیا، کئی دنوں تک مہمان رکھا اور میرے ساتھ وہ وی آئی پی جیسا سلوک کیا جو میری زندگی کا ایک یادگار تجربہ ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے چوتھا مجموعہ۔ کلام نرم و نازک چٹکیے چٹکیے مرتب کرکے نسیم بک ڈپو لکھنؤ کے ذریعہ شائع کروایا۔ اس کے بعد میرے منظوم خطوط۔ نام بنام۔ اور ہندی زبان میں چٹ پٹی نظمیں۔ کے نام سے دو مجموعے میرے دوست جناب گوپال متل نے مکتبۂ تحریک دہلی سے شائع کیے۔ چھٹا اور ساتواں مجموعہ (بہ زبان اردو) یعنی متاعِ واہی اور شعرستانِ واہی میرے لڑکوں نے اپنے پریس میں چھاپا جس پر بہار اردو اکادمی نے اشاعتی امداد دی تھی۔

مختصر یہ کہ میری ظریفانہ شاعری کی ابتداء تو اس واقعہ کے بعد ہوئی جب میرے ایک پاگل عزیز نے ایم ایل اے پر ایک ہندی نظم سنا کر ویسی ہی نظم اردو میں لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ لیکن سہیل عظیم آبادی (مرحوم) کے عطا کردہ تخلص واہی نے کھل جا سم سم جیسی کرامات دکھا کر میرے لیے طنز و مزاح کے تو گر کوشیدا اسلوب میں حالاتِ حاضرہ کے بے شمار پہلوؤں پر منظوم تبصرہ لکھنے کی راہ کھول دی ●●

اسمٰعیل آذر
(کٹک)

ہیپی برتھ ڈے

ہر سال برتھ ڈے چلا آتا دبے قدم
ہر سال جشن سال گرہ کا مناتے ہم

ہوتی رہی اسی طرح تجدیدِ زندگی
لگتا کہ ہم نے دہر میں رکھا ابھی قدم

احباب داغتے جو ہمیں نیک خواہشات
دل پر ہمارے ٹوٹ کے گرتے خوشی کے بم

کل شام کو بھی حسبِ روایت تھا برتھ ڈے
بس ٹھیک پونے سات بجے ہوگیا جنم

احباب حسبِ قاعدہ آئے، چلے گئے
خاصے نکل چکے تھے ہمارے بھی پیچ و خم

یوں تھک تھکا کے ہوگئے بستر پہ ہم دراز
پھر کیا ہوا کہ چونک کے اٹھ بیٹھے ایک دم

دیکھا کہ سامنے ملک الموت ہیں کھڑے
شوخی لبوں پہ طنز نگاہوں میں مرتسم

ہم سے کیا خطاب تو اوسان اڑ گئے
کہنے لگے — "عجیب ہے یہ بات محترم

اتنے قریب آکے بھی کیا جانے کس لیے
کچھ اجنبی سے آپ ہیں کچھ اجنبی سے ہم"

○

سنگار لکھنوی
(جدّہ)

قطعات

کلیاں چٹک رہی تھیں فضا باغ باغ تھی
آیا تھا گلستاں میں وہ گیسو سنوار کے
ہم نے تو دل کو چیر کے قدموں پہ رکھ دیا
کوّے کو اُس نے دے دیا صدقہ اُتار کے

ساون کی بہاروں میں ہم کو نہ بھُلا رکھنا
کچھ یاد ہماری بھی اے جانِ وفا رکھنا
نیند آئے تو سوجانا پہ دھیان ذرا رکھنا
کُتّے کو بندھا رکھنا دروازہ کھلا رکھنا

شامِ وصال آئے تو احسان کیا کیا
تھو تھن رہے پھُلائے تو احسان کیا کیا
ہم تو سمجھ رہے تھے اکیلے ہی آؤ گے
ابّا کو ساتھ لائے تو احسان کیا کیا

رؤف خوشتر
(بیدر)

نگری نگری —

بوم الدولہ کو ادھر ہم نے اکثر مجھیروں پر گرجتے ساہوکاروں سے لڑتے اور کتوں سے بھڑتے ہوئے پایا ہے۔ مچھروں اور ساہوکاروں کے متعلق تو ہم نہیں جانتے لیکن کتے بوم الدولہ کی جھڑکی اور پتھر کھانے میں مزہ لیتے اور ان پر غراتے رہے ہیں۔

مگر صاحبو ہماری ان چشم چشمہ انصار اور کبھی کبھی گنہگار نے جب یہ عجیب منظر دیکھا تو مان گئے کہ اپنی گلی میں بوم الدولہ بھی شیر بن جاتے ہیں۔ ورنہ کل تک بھونکنے والے کتے آج بوم الدولہ کو دیکھ کر کھسیانی بلی بنے دہشت گردوں کی طرح چھپتے نہ پھرتے۔ یہ دیکھ کر ان کتوں کو ایک ہی لقب سے نوازنا پڑا۔ جی ہاں "گدھے کہیں کے"۔

بوم الدولہ اپنے ہاتھوں میں ایک عجیب قسم کا ڈنڈا جس کو انھوں نے بعد میں بتلایا کہ یہ بندوق ہے) اور رسیاں لیے اپنے نصف درجن بچوں کے ہمراہ کتوں اور گدھوں کا تعاقب کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی شکار اُن کے ہاتھ آجاتا ہم نے انھیں پکڑا اور اس نئے شغل کے متعلق پوچھا۔

کہنے لگے "میں تو اب انسانوں سے مایوس ہو چلا ہوں۔ اس لیے اب ان جانوروں اور پرندوں کو پھانس رہا ہوں۔ تم تو جانتے ہو کہ کیا کیا نہ ہے ہم نے ستم پیٹ کی خاطر۔ ملازمت بھی کر ڈالی۔ مگر تیس دن بعد جب تنخواہ ہاتھ آئی تو پتہ چلا کہ مفلسی سب پکار کھاتی ہے۔ ورنہ ہم نوکری کو سمجھتے تھے کہ یہ مرد کا اعتبار لاتی ہے۔ دیواروں پر سینما کے پوسٹرس بھی لگوائے۔

اب میں مختلف قسم کے جانور اور پرندے پکڑ رہا ہوں اور حیوانات کے طبی کالج کو فراہم کر رہا ہوں۔ وہاں تجربے کے لیے یہ درکار ہیں۔ میں نے انھیں مینڈک کبوتر اچوہے گدھے اور کتے فراہم کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ فلم شعلے میں جس طرح ٹھاکر اپنے دشمن گبر سنگھ کو زندہ پکڑ کر لانے کے لیے کہتا ہے مجھے بھی ان بے زبانوں کو زندہ پکڑ کر لانے کا حکم ہے۔ تم نہیں جانتے ان کو زندہ پکڑنے میں کتنی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اپنے ہوش و حواس میں کتّا تو خیر پورا کتا ہی ہوتا ہے۔ مگر اپنی گرفتاری کے وقت گدھا بھی گدھا نہیں رہتا لومڑی بن جاتا ہے۔

بھلا ہو اس دادا جان کی بندوق کا جس سے اب جانور آسانی سے قابو میں آ رہے ہیں اس کے چلاتے ہی جانور بے ہوش ہو جاتے ہیں اور ہمارا اشارہ پاتے ہی بچے ان بے ہوش جانوروں کو اٹھا کر کالج کی تجربہ گاہ پہنچاتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ جانور جلد ہی ہوش میں آجاتے ہیں اور موقع پاکر کالج کی تجربہ گاہ سے فرار ہو کر زندگی کی تجربہ گاہ میں اپنی جز وقتی محبوبہ کے پاس پہنچ جاتے ہیں گویا۔

جو کوئے دار سے نکلے تو سوئے یار چلے

جب تک یہ بندوق نہیں ملی تھی تو پریشانی ہی پریشانی تھی۔ اُس وقت کتوّں کو پھانسنے کے لیے روٹیوں اور دال میں بے ہوشی کی دوا ملا کر صحن میں رکھی جاتی تھی مگر کتے غیر متوقع طور پر کثیر العیالی کے باوجود دال روٹی کو ہمارے گھر کے سامنے دیکھ کر ایک معنی خیز غراہٹ کے ساتھ آگے بڑھ جاتے جیسے کہہ رہے ہوں خود کو کھانے کو نہیں ہم کو کھلاتے ہیں۔ پہلے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھر لو۔

مینڈکوں کو پکڑنے کے لیے جب تالاب کے کنارے پہنچے تو دیکھا کہ مینڈک پھدکنا اُچھلنا، اچھل کر پھدکنا کے قول پر رقص بیرا ہیں سوچا کہ یہ منچلے مینڈک کیسے قابو میں آئیں گے؟ یکایک اپنی گلی کے کونسلر یاد آئے جو اپنی صورت اور سیرت کے لحاظ سے سارے محلے میں DEADLY FROG کہلاتے ہیں اور ایک پارٹی سے دوسری پارٹی کی طرف پھدکنے میں ماہر، ووٹروں کے آگے اچھلنے اور کرتب دکھلانے اور ٹوپی ڈالنے میں مشہور ہیں۔ لہٰذا اُن کی ٹوپی حاصل کی اس ٹوپی سے اب مینڈک پھنستے جا رہے ہیں پچھلے دنوں کالج کو پچاس مینڈک فراہم کرنے تھے ایک کھلے ڈبے میں پچاس مینڈک لے گیا۔ ڈاکٹروں نے پوچھا کہ کھلے ڈبہ میں پچاس مینڈک کیسے رہ گئے میں نے جواب دیا۔ جناب یہ ہمارے مینڈک ہیں جب کوئی مینڈک اپنی سطح سے بلند ہونا چاہتا ہے تو دوسرے مینڈک نیچے سے اُسے گھسیٹ کر اپنی سطح تک لاتے ہیں۔

مرغیوں کے بارے میں نہیں بتلاتا کہ مجھے ابھی اسی محلے میں رہنا ہے۔ اب رہا گدھوں کا معاملہ ....

تم تو جانتے ہو کہ گدھوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل، لیکن کیا کریں اب ہمارے لیے گدھا مہربان تو پکا پکوان والا معاملہ ہے۔ اس بندوق سے پہلے گدھوں کو پکڑنے کے لیے سو سو جتن کرنے پڑتے تھے۔ شامو دھوبی (رامو دھوبی کو اب ریٹائر کرنا چاہیئے) کی گدھی صحن میں باندھی جاتی مگر اُف یہ گدھے بھی اب کتنے ہوشیار ہو گئے ہیں۔ وہ اب دور ہی دور کھڑے ہو کر دولتی جھاڑتے ہوئے عجیب عجیب آوازیں نکالتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں کہ

میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

اب اس بندوق نے گدھے بھی اسم با مسمیٰ بن کر آسانی سے قابو میں آ رہے ہیں کبوتروں کو پکڑنے کے لیے ہم اپنی اطلوق شیروانی کو ایک ڈنڈے کے سہارے کھڑے کرتے ہیں۔ ڈنڈے کو رسّی باندھ کر رسّی کا [illegible] کر چھپ جاتے ہیں) اور زمین پر دانے بکھیر دیتے ہیں جب دانوں کو کھانے کے لیے کبوتر آجائیں تو ہم [illegible] کھینچ دیتے [illegible] شیروانی کبوتروں کے اوپر گر جاتی ہے۔

اپنے دکان کے چھپے ختم ہونے کے بعد اب ہم محلے میں آواز لگاتے ہیں، چوکیدار پیچھے تو اکثر گھروں سے زنانہ آواز آتی ہے کہ وہ گھر پر نہیں ہیں بعد میں آئیے گا۔

اس سے پہلے کہ یوم القولہ کسی اور جانور کو پکڑنے کی روداد سناتے ہم نے انھیں روکا اور پوچھا کہ شہر میں حیوانات کا طبی کالج کب اور کیسے کھلا؟

کہنے لگے :

"تمھیں نہیں معلوم پچھلے سال تو کھلا ہے۔ اب یہ سوال کہ کیسے کھلا تو سنو۔ اب ضلع وہی ہے جہاں میڈیکل کالج ہو تعلقہ وہی ہے جہاں انجینیرنگ کالج ہو۔ اب ہر قصبہ میں سینما ہال، شراب خانے اور مختلف قسم کے فنی اور غیر فنی ادارے کھل رہے ہیں۔

اب جمہوریت میں سیاست کے زیر سایہ پرورش لوح و قلم ہو رہی ہے۔ ان اداروں میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ ان میں طلبا کم اور اساتذہ زیادہ ہوتے ہیں۔

بعض انجینیرنگ کالجوں کی عمارات میں وائرنگ کا کام کرنے پر برقی انجینیر، کالج کا احاطہ تعمیر کرنے پر سیول انجینیر اور پرانی لاری کے بوسیدہ انجن کے گرد روزانہ سات چکر لگانے پر آٹو موبائیل انجینیرنگ کی سند دی جاتی ہے

ہم نے ٹوکا" نگران کالجوں کے معیار کو پرکھنے کے لیے فنی اور تکنیکی کمیٹیاں بھی تو ہوتی ہیں۔

بولے :

ہوتی ہیں۔ نگران کمیٹیوں کے ممبروں کو شہر کے سب سے عمدہ ہوٹل کی اوپری منزل پر ٹھیرایا جاتا ہے، وہاں دوربین سے شہر کی پیچ در پیچ گلیاں بتلائی جاتی ہیں کہ سڑکیں تنگ ہیں اور ہماری کاریں کشادہ ہیں اس لیے آپ دوربین سے ہی کالجوں کا معائنہ فرمالیجیے اور یوں ان ممبروں کو مطمئن کیا جاتا ہے۔

ہمارے گاؤں سے ایک صاحب آئے تھے۔ انھوں نے بتلایا کہ ان کے گاؤں میں بھی انجینیرنگ کالج کھل گیا ہے۔ ناٹک گھر کو کالج کی عمارت میں بدل دیا گیا ہے۔ گویا اب تک صرف رات میں ناٹک ہوتا تھا اب دن میں بھی ناٹک کا اہتمام ہوگا۔

پھر وہ گنگنانے لگے۔ نگری نگری دوارے دوارے کھل گئے رے کالجوا۔ ●●

پاگل عادل آبادی

آل راونڈر

وعدہ کسی کے ساتھ تو شاپنگ کسی کے ساتھ
انڈرسٹ کسی کے ساتھ تو بیٹنگ کسی کے ساتھ
ان لیڈروں کا حال حسینوں سے کم نہیں
بولنگ کسی کے ساتھ تو بیاٹنگ کسی کے ساتھ

رن آوٹ

اسکور نائنٹی نائین تھا تھی سنچری قریب
آؤٹ ہونے سے پہلے تم نے میرا پر کتر دیا
پاگل نے تم سے چاہا تھا الفت کا ایک دن
یہ کیا کہ نائنٹی نائین پہ رن آوٹ کر دیا

فاسٹ پچ

کرکٹر اک مرگیا تو قبر میں پوچھا گیا
جاؤ گے دوزخ میں یا جنت میں خود فرمائیے
کرکٹر بولا فرشتوں سے مگر بندہ نواز
پچ کہاں کی فاسٹ ہے پہلے یہ مجھے بتلائیے

کیچ آوٹ

الفت کا رن جو لینے گئے بھاگ سو گئے
فیلڈنگ بھی اتنی ٹائٹ کہ منزل پہ کھو گئے
جب ان کے باپ نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا
گلی گلی کر کھیلتے گئے کیچ آوٹ ہو گئے

چھکا

بیگم نے بیاک فٹ پہ بیلن سے شاٹ کھیلا
پچکی ہے میری تالو مارا ہے ایسا چھکا
کہتے ہیں ڈاکٹر بھی تالی بجا بجا کے
پھیکا ہے اس نے آگے عمران خاں کا چھکا

سکور

جو پوچھنا ہے پوچھیے ہم سب بتائیں گے
کرکٹ کے میچ کا ذرا قصہ سنائیے
منکر نکیر آئے تو مُردوں نے یوں کہا
اسکور کیا ہے پہلے ہمیں یہ بتائیے

○

زندگی کب ہے زندگی کی طرح
آدمی کب ہے آدمی کی طرح

کج روی میں تھی پہلے رعنائی
کج روی اب ہے کج روی کی طرح

گرہ بندھن کی ہے پرانی ہی
شوخیاں اب بھی ہیں نئی کی طرح

شکیل احمد (حیدرآباد)

مختار یونس (مالیگاؤں)

خواب انڈسٹری

خواب وہ تمثیلی فلم ہے جو "کمپیوٹری ٹی وی سیٹ" میں "مخصوص اسکرین" پر ریلیز کی جاتی ہے۔ یہ فلم عموماً نیند کی حالت میں ریلیز ہوتی ہے۔ بعض لوگ چلتے پھرتے خواب دیکھتے ہیں۔ ہوائی قلعہ بنانے والے سپیشل انجینئر تصویر جاناں میں کھوئے ہوئے خواب دیکھتے ہیں۔ خواب کی فلم کا کوئی اسپیشل ٹائم نہیں ہوتا۔ معمولاً تین شو یا پانچ شو کی قید نہیں ہوتی کہ نائٹ شو ہی ہاؤس فل چلتا ہے۔ بلکہ مائینڈ ویسٹ خواب عموماً ڈراؤنے ہوتے ہیں۔ ان خوابوں کو دیکھ کر دماغ گھبرا جاتا ہے اور آنکھوں کی کھڑکیاں کھول دیتا ہے۔

خواب رنگین اور کلر فل بھی ہوتے ہیں یہ خواب عموماً مسرت بخش، روح افزا ہوتے ہیں۔ انسان ایسے خواب کو صحت افزا مقام پر عورت و منگیتر کے روپ میں عیش کرتا ہے۔ بعض اوقات ایسے خوابوں میں کشمیر کی کلیاں کھلتی ہیں۔ سوئٹزر لینڈ کے غنچے کھلکھلاتے ہیں۔ ایسے خوب صورت محلوں کے خواب عموماً جھونپڑے میں رہنے والوں کو نظر آتے ہیں۔ ایسے لگزری خوابوں پر کوئی سرکاری ٹیکس نہیں ہوتا ہے .... یہ خواب ٹیکس فری اور سیکس فری دونوں ہو سکتے ہیں۔

خواب بین خواب دیکھنے کے لیے نہ کسی مخصوص ٹائم کا پابند ہے نہ کسی خاص مقام کا۔ زمان و مکان سے بے نیاز "کائنات اسٹوڈیو" میں "خواب کی شوٹنگ چلتی رہتی ہے بستر پر دراز ہو جائیے تو ۲۰ ریل میٹر والے خواب دیکھے جا سکتے ہیں۔ کرسی پر صرف "ٹریلر خواب" بتایا جاتا ہے۔ صوفہ سیٹ پر اگر خواب بین خراٹے نشر کر رہا ہو تو کروٹ بدلتے ہی خواب دھڑام سے گر جاتے ہیں اور چکنا چور ہو جاتے ہیں۔

خوابوں کے کئی ٹی وی کیسٹ یکے بعد دیگرے اسکرین پر دکھائے جاتے ہیں۔ آپریٹر کون ہے؟ اس کے متعلق جیمس بانڈ تحقیق کر رہا ہے۔ افواہ ہے کہ خواب کے آپریٹر فرشتے ہوتے ہیں۔ ہم اس بات کو صحیح نہیں سمجھتے کیوں کہ کسی فرشتے نے اب تک اقبال جرم نہیں کیا ہے۔

بعض اوقات خواب کے ہر رنگ شو دھوم سے چلتے ہیں۔ بعض لوگ صبح کے "خوابی سیریل" کو سچا خواب سمجھتے ہیں اور ان پر ایمان لاتے ہیں۔ وہاں ہی دوپہر تک ہونے والے میٹنی شو میں بھی شریک ہو سکتے ہیں۔ مگر میٹنی شو کے خوابوں کے کیسٹ کمزور اور کچے پکے ہوتے ہیں۔ یہ کیسٹ براہ راست "پرمیننٹ" یعنی پکی کوری کاپی" میں نہیں ہوتے۔ جہاں کسی نے فلم بین کو جھنجھوڑا

شگوفہ مارچ ۱۹۹۰

فلم فلاپ ہوجاتی ہے اور ڈبے میں چلی جاتی ہے ۔ آنکھ دوبارہ بند کرنے سے "پرانے خواب" لوٹ کر نہیں آتے اگر گا کر بلائیں

آ لوٹ کے آجا میرے خواب   تجھے میرے نین بلاتے ہیں

تب بھی خواب دوبارہ ارشاد نہیں ہوتا ۔

خواب کی ٹی وی سیریل کا سٹ ملٹی اسٹار ہوتی ہے ۔ بڑے بڑے ہیرو ، ہیروئن کریکٹر ایکٹر آرٹسٹ بیک وقت پردے پر آتے ہیں ۔ ویلن بھی منظر میں ٹانگ اڑا دیتا ہے ۔ سماج کے دیگر افراد بھی گیسٹ آرٹسٹ بن کر آتے ہیں ۔ اس فلم کی کاسٹ میں وہ لوگ بھی شوٹنگ میں شریک ہوتے ہیں جو دنیا سے واک آوٹ بلکہ ناک آوٹ کر دیئے گئے ۔ یہ لوگ آج "ملک عدم" کے شہری ہیں مگر خواب میں حصہ لینے کی پرمیشن "اوپر والے" نے عطا کی ہے مرحوم دادا دادیوں ، نانا نانیوں حتیٰ کہ آبا و اجداد بھی اسپیشل (خصوصی جھلک) کا چانس ملتا ہے ۔ خوابوں کی فلم کی کہانی اوٹ پٹانگ ہوتی ہے ۔ اسکرپٹ یا منظر نامہ سراسر غیر فلمی ہوتا ہے ۔ خوابوں میں گیت و سنگیت شاید ہی کچھ اثر ڈھوتے ہیں ۔

خواب کی فلم کے کریکٹر شوٹنگ میں اتنے محو ہوجاتے ہیں کہ انھیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ ابھی بمبئی اسٹوڈیو میں اداکاری کے جوہر دکھا رہے تھے اچانک مدراس کے سٹ پر کام کرنے لگتے ہیں ۔ بعض اوقات تو کلکتہ کا ہوڑہ برج ، کشمیر کا پہلگام اور حیدرآباد کا چار مینار ایک ہی سٹ پر آجاتے ہیں ۔ ابھی اداکار گھر میں پنچایت توڑ رہا تھا اچانک وہ ٹارزن کی طرح جنگل میں خنجر اٹھا کر چیخ دیتا ہے اور پھر لیڈر کی طرح کئی نکاتی پروگرام جنتا میں تقسیم کرنے لگتا ہے ۔

خوابی فلم بینی اس سیریل میں کبھی کامیڈی کرتا ہے ۔ کبھی ٹریجیڈی ۔ عملی زندگی میں چاہے سماجی طور پر کتنا ہی غیر اہم اور معمولی فرد ہو مگر خواب میں وہ لیڈنگ رول ادا کرتا ہے ۔ فلم آسکر ایوارڈ یا فلم فیئر ایوارڈ دینے والے بے بس ہیں ورنہ وہ بہترین اداکار کا انعام ہر خواب بین کو عطا کرتے ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ ایوارڈ ملک عدم کے باشندوں کو بھی مل سکتا تھا جنھوں نے خواب بین کو خواب میں آکر بھرپور دھلائی کر دی تھی ۔ خواب دنیا کی واحد فلم ہے جس میں فلم بین فلم بھی دیکھتا ہے اور فلم میں خود کردار بھی ادا کرتا ہے ۔ ڈبل رول کا یہ اسٹائل صرف خوابوں میں پایا جاتا ہے ۔

بعض ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ خواب کوئی فلم نہیں بلکہ انسان کی ادھوری اور کچلی ہوئی خواہشات ہیں جو دماغ کے "ڈپارٹمنٹ" میں پیدا ہوتی ہیں ۔ ان کی تکمیل میں دنیا و سماج مل کر روڑے اٹکاتے ہیں تب تمنائیں سسک سسک کر حسرت میں تبدیل ہو جاتی ہیں ۔ جب دماغ اپنے محکمۂ شعور سمیت سو جاتا ہے تو لاشعوری قفل کھل جاتا ہے اور تحت الشعور کے " ذہنی قبرستان " سے یہ حسرتوں کے "ڈراکیولا" زندہ ہو جاتے ہیں اور کھوپڑی تھیٹر پر اُدھم مچاتے ہیں گویا کچلی ہوئی ادھوری تمنائیں کچلی بدلی خواب بنتی ہیں بلکہ خواب بُنتی ہیں ۔

خواب کے معنی و مفہوم کو خواب کی تعبیر کہتے ہیں جب یہ تعبیریں شرمندہ ہوتی ہیں تو لوگ کہتے ہیں خواب شرمندۂ تعبیر ہوا ۔ ہم جانتے ہیں اکثر تعبیریں شرمندہ ہونے سے انکار کر دیتی ہیں ۔ انھیں بے شرم تعبیریں قرار دیا جاسکتا ہے جس طرح نصابی و درسی کتابوں کی شرحیں اور گائیڈ نکلتے ہیں اسی طرح خوابوں کی تشریحات کے زندہ گائیڈ بھی ہوتے ہیں جنھیں "تعبیر گو" کہا جاتا ہے ۔ ماضی میں تعبیریں بتانے والے بکثرت دستیاب تھے مگر آج کل تعبیریں بتانے والے کمیاب ہیں اور ہر تعبیر گو ایک ہی خواب کو مختلف معنی پہناتا ہے ۔ عموماً یہ بے وقوف عوام کو بے وقوف بناتے ہیں ۔ مثلاً اگر آپ نے خواب میں انعام کے طور پر

پایا تو پہلا تعبیر گو آپ کو مستقبل کا گورنر یا چندریشن بننے کی بشارت دے گیا۔ دوسرا تعبیر گو کہے گا "حضرت آپ کی جلد ہی کرامات سے قلبی دوستی ہوگی" اگر آپ کے دشمن نے آپ کا قلمی خواب سن لیا تو وہ دنیا میں ڈکلیر کر دے گا کہ خواب دیکھنے والا فٹ پاتھ پر بال پن بیچے گا۔ آل لاٹ ایک روپیہ، ایک روپیہ"

بعض تعبیر گو حضرات کا قول ہے "خواب کی تعبیر اُلٹی ہوتی ہے" اگر خواب میں آپ کا جنازہ اُٹھ رہا تھا تو سمجھ لیجیے آپ کے رقیب کا انتقالِ پُرملال ہوگا۔ اگر آپ خواب میں ڈاکٹر کے روپ میں جلوہ گر ہوئے تو سمجھ لیجیے آپ مریض بنیں سکرات آپ پہ فرض ہوگی۔ ہوسکتا ہے آپ ٹُٹ پونجیے ڈاکٹر کے کمپاونڈر بنیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کسی سرکاری ہسپتال میں آپ وارڈ بوائے یا نرس بننے کا سنہری موقع پائیں گے۔"

خواب صرف افراد ہی نہیں دیکھتے حکومتیں اور قومیں بھی دیکھتی ہیں طاقت ور ممالک کمزور ممالک کو اپنا بنانے کا خواب دیکھتے ہیں اور اس خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لیے مسلح افواج کا استعمال کرتے ہیں۔ چالاک طاقت قومیں برائے ممالک میں فوج و اسلحہ کا استعمال نہیں کرتیں بلکہ غیر ممالک میں کٹھ پتلی مہرے منہ مانگے داموں خرید لیتی ہیں عوامی نمائندے اور حکام و افسران کو بھی خرید لیا جاتا ہے۔ اور اس طرح اپنے خواب کی تعبیر حاصل کر لیتی ہیں۔ ماضی میں سکندر اعظم نے دنیا کو فتح کرنے کے خواب دیکھا تھا مگر خواب کی تعبیر حاصل ہونے سے پہلے ہی محوِ خواب ہو گیا۔ ہٹلر نے جرمن قوم کی برتری کا خواب دیکھا تھا۔ اس نے جنگِ عظیم دوم کا منصوبہ بنایا مگر افسوس وہ بھی ناکام رہا۔ آج کی سُپر طاقتیں ایسے ہی خواب دیکھا کرتی ہیں۔ کمزور قوموں کو خواب نظر آتے ہیں۔ انھیں عموماً ڈراؤنے خواب پریشان کرتے ہیں۔ مثلاً کبھی روس اُن کی طرف ہتھوڑا درانتی لیے جھپٹتا ہے کبھی امریکہ کے جنگی بحری بیڑے ان کا بیڑہ غرق کرتے نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات تو پڑوسی ممالک بھی دانت کاٹتے نظر آتے ہیں۔

غرض یہ حقیقی دنیا عالمِ خواب ہے۔ ہر دور میں خواب دیکھے گئے اور یہ خوابیدہ حالت آج بھی قائم ہے انسان خواب دیکھتا رہا ہے اور دیکھتا رہے گا جب تک اسے ہمیشہ کے لیے گہری نیند نہ آجائے ہوسکتا ہے۔ قبر والوں کو بھی خواب نظر آتے ہوں یہ بات مرنے کے بعد ہی معلوم ہوگی۔

عبدالحفیظ لقب عمران (امراوتی)

○

ہر اک اندازہ کھوٹا ہو گیا ہے
جو سیدھا تھا وہ ٹیڑھا ہو گیا ہے

پلا ساقی نگاہوں سے خدا را
مرا بیوی سے جھگڑا ہو گیا ہے

جو خارج ہو گیا تھا مدرسہ سے
وہ لڑکا آج نیتا ہو گیا ہے

جہاں میں آگیا ہے زلزلہ سا
ترا بیمار اچھا ہو گیا ہے

بہت گھبرا رہا ہے وہ ستمگر
یقیناً کوئی لفڑا ہو گیا ہے

اندھیرے میں چلو سب بانٹ لیں ہم
ابھی تک جتنا چندہ ہو گیا ہے

مری اس شخص سے کیسے نبھے گی
سنا ہے وہ فرشتہ ہو گیا ہے

تو اپنے پیار کی فوراً کمک بھیج
غموں کا مجھ پہ حملہ ہو گیا ہے

مجھے وحشت سی ہوتی ہے بہر حال
مذاق انساں کا گھٹیا ہو گیا ہے

حسینوں سے نہیں مطلب اسے اب
لقب عمران بوڑھا ہو گیا ہے

سید عباس متقی (حیدرآباد)

روٹیاں

کتنی مزے کی آپ پکاتی ہیں روٹیاں
پھر کس خلوص دل سے کھلاتی ہیں روٹیاں

چاندی کے ہاتھ سونے کی شاید ہیں انگلیاں
مہتاب و آفتاب بناتی ہیں روٹیاں

اک انقلاب دہر دکھاتی ہیں روٹیاں
مخدوم، خادموں کو بناتی ہیں روٹیاں

میرے بھی دل میں درد ہے کچھ اپنی قوم کا
کیا کیجیے کہ مجھ کو ستاتی ہیں روٹیاں

روٹی کے واسطے ہی میں کرتا ہوں یہ گناہ
میرے یہ سب گناہ چھپاتی ہیں روٹیاں

کافی نہیں ہے بھوک کے ماروں کو بھوک ہی
کیوں دل جلوں کے دل کو جلاتی ہیں روٹیاں

چوری فریب قتل، دغا، ظلم خودکشی
شیطان آدمی کو بناتی ہیں روٹیاں

روٹی میں بیلتا ہوں تو بنتا ہے انڈیا
اور آپ گول گول بناتی ہیں روٹیاں

کیوں چاہتا ہوں آج ہی میں کل کی روٹیاں
کیوں میرا اعتقاد چراتی ہیں روٹیاں

چلتا ہے تار پر کوئی جلتا ہے آگ میں
کرتب یہ کیسے کیسے سکھاتی ہیں روٹیاں

پہیے کی طرح شہر میں پھرتا ہے رات دن
کیوں متقی کو گول پھراتی ہیں روٹیاں

وجاہت علی سندیلوی

(ڈرامہ)

الکشن اور مرغا

کردار:-

شرما جی : الکشن کے امیدوار
مرزا صاحب : شرما جی کے دوست
ایک عورت
سیلمن } الکشن کے ووٹر
دھرمو پہلوان

(پہلا سین)

ایک آراستہ کمرہ جس میں ۔ ۔ ۔ مرزا صاحب لحاف اوڑھے بستر پر سو رہے ہیں۔ کمرے میں بہت ہلکی روشنی دروازے کی زنجیر کھڑکتی ہے۔ کئی دفعہ۔ پھر آواز سنائی دیتی ہے۔ "مرزا صاحب" "مرزا صاحب" "مرزا صاحب" جو بتدریج بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے۔

مرزا صاحب۔ خراٹوں کے درمیان گہری نیند سے بیدار ہوتے ہیں " ابی کون صاحب ہیں آپ؟ " ——— " سو مرغ یا ددے سے بانگ پر بانگ دیئے جا رہے ہیں " ٹیبل لیمپ کا بٹن دبا کر کمرے میں تیز روشنی کر دیتے ہیں۔ سامنے گھڑی میں سوا پانچ بجا ہے۔

شرما جی :- ابی دروازہ بھی کھولو گے یا گھوڑے بیچ کر سوتے ہی رہو گے ؟

مرزا صاحب :- اچھا آپ ہیں شرما جی۔ کیوں بھائی خیریت ؟ یہ اس وقت آپ میری روح قبض کرنے کہاں آ پہنچے
(مرزا صاحب اٹھ کر دروازہ کھولتے ہیں اور شرما جی ایک کمبل لپیٹے کمرے میں داخل ہوتے ہیں)

شرما جی بستر کے پاس ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے " بھئی آپ بھی سڑک پر گشت کرنے والے کانسٹبل کی طرح بات کرنے لگے۔ دونوں دو دھ شریک بھائی معلوم ہوتے ہیں "

مرزا صاحب :- (بستر پر بیٹھ کر) سڑک پر گشت کرنے والے کانسٹبل سے میرا کیا تعلق۔

شرما جی :۔ "تعلق یہ ہے کہ وہ بھی آپ ہی کی طرح اوٹ پٹانگ باتیں کر رہا تھا خیر اُس نے مجھے ووٹ دینے کا وعدہ تو کر لیا ہے"!

مرزا صاحب :۔ "ابھی کیا بک رہے ہو۔ میں کچھ سمجھا نہیں"۔

شرما جی :۔ مطلب یہ کہ آج آنکھ ذرا جلدی کھل گئی۔ سوچا کہ آپ کو ساتھ لے کر کچھ ووٹروں کے گھروں کا گشت بھی لگا لوں۔ اس وقت سب مرنے ٹاپے ہی کے نیچے مل جائیں گے۔ گلی کی نکڑ پر وہ کانسٹبل مل گیا کہنے لگا یہ آدھی رات کو کہاں جا رہے ہو؟ میں نے کہا صبح کی چہل قدمی کو جا رہا ہوں تو آپ کو معلوم ہے کہ اُس مسخرے نے کیا کہا؟

مرزا صاحب :۔ "کیا کہا اُس نے"؟

شرما جی :۔ "کہنے لگا کہ آدھی رات سے صبح کی چہل قدمی کرنا تھی تو چہل قدمی کر کے ہی کیوں نہیں سوئے تھے"؟

مرزا صاحب :۔ (قہقہہ لگاتے ہوئے) "بھئی اُس نے غلط کیا کیا؟ دیکھئے ناکہ اس وقت ساڑھے پانچ بج رہے ہیں اور آپ اس سے بہت پہلے' نہیں معلوم کب گھر سے نکلے ہوں گے"۔

شرما جی :۔ "کہئے آپ بھی کہیئے۔ لیکن جب میں نے سوتوں کو جگانا اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے تو مجھ پر کسی نصیحت یا فضیحت کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ ہر بڑے نیتا کو شروع میں یہی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اچھا اب یہ چہ میگوئیاں کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھیے اور گشت کے لیے جلدی سے تیار ہو جائیے!

مرزا صاحب :۔ دیکھئے شرما جی میرے آپ کے تیس سال پرانے تعلقات ہیں۔ آپ مجھے اپنا مخلص دوست اور بہی خواہ سمجھتے ہیں یا نہیں"؟

شرما جی :۔ ارے بھائی سمجھتا نہ ہوتا تو اس وقت تمہارے پاس بیٹھا تمہاری یہ بکواس کیوں سن رہا ہوتا لیکن اب یہ لچھے دار باتیں چھوڑیئے اور جھٹ پٹ چلنے کے لیے تیار ہو جائیے۔ اس وقت ہر ووٹر گھر ہی پر ہوگا۔ اُس کو بس وہیں دبوچ لیجئے"۔

مرزا صاحب :۔ "جس بھلے آدمی کے گھر پر اس وقت جا کر بانگ دیجئے گا وہ ہتھے پر سے اُکھڑ جائے گا"۔

شرما جی :۔ "ہم ہر کام نہ کرنے کے بہانے خوب تلاش کر لیتے ہیں۔ ہمارے یہاں یا تو سکیسر خوب چلتا ہے۔ ہم بیٹھے یہ رونا رو رہے ہیں کہ ابھی ٹھیک سے سویرا نہیں ہو پایا ہے اور یورپ اور امریکہ میں اسی وقت ہزاروں کارخانے چل رہے ہوں گے۔ اور کروڑوں روپوں کا مال کھٹا کھٹ بن رہا ہوگا۔

مرزا صاحب :۔ بھئی میں ایک دوسری بات کہنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ اب آپ اگر نگر پالیکا کے الکشن وکشن کے چکر میں نہ پڑیں تو زیادہ بہتر ہے"۔

شرما جی :۔ "واہ بھئی واہ یہ اچھی رہی۔ ہاتھ میں درد ہے تو ہاتھ کاٹ ڈالو۔ ابھی الکشن کے چکر میں نہ پڑوں تو جنتا کی سیوا کیسے کروں"؟

مرزا صاحب:۔ جنتا کی سیوا کرنے کے بہت سے دوسرے طریقے ہو سکتے ہیں۔ کوئی اسکول کھولیے کوئی لائبریری شروع کیجئے کسی اسپتال کے قیام کرانے کی کوشش کیجئے۔ کسی یتیم خانے میں چندہ دیجئے۔ رشوت خوری اور چور بازاری بند کروانے کی مہم شروع کروا دیجئے۔۔۔۔۔"

شرما جی:۔ جی ہاں، جی ہاں! کوئی پاگل خانہ بنواؤں اور اُس میں آپ کے ساتھ بھرتی ہو جاؤں۔ مرزا میں نے ساری خدائی کا ٹھیکا نہیں لے رکھا ہے۔ چراغ پہلے اپنے گھر میں جلایا جاتا ہے۔ مجھے پہلے اپنے وارڈ کی فکر ہے اور اپنے بہنوئی کی۔ بہنوئی کو نگر پالیکا سے ٹھیکہ دلوا کر فوراً اپنے وارڈ کی ساری سڑکیں ٹھیک کروا دوں گا۔ یہ کیا کچھ کم خدمت ہوگی جنتا کی۔ اور پھر سڑکوں پر یہ کیسے چھوٹے بلب لگے ہیں کہ چراغ سے بھی مدھم روشنی دیتے ہیں۔ میرے مجھلے لڑکے کی قصبے میں سب سے بڑی بجلی کے سامان کی دکان ہے۔ ایسے چمچماتے بلب لگوا دوں گا کہ رات دن کو منہ چڑانے لگے گی۔"

مرزا صاحب:۔ شرما جی یہ آپ کا الکشن مینی فیسٹو تو بہت لمبا چوڑا ہے لیکن مصیبت تو یہ الکشن ہے جس میں اپنے آپ کو گلی گلی اور گھر گھر نیلام کرنا پڑتا ہے اور لوگ ووٹ کے بجائے چوٹ دیتے جاتے ہیں۔ آپ غالباً دو الکشن ہار چکے ہیں۔

شرما جی:۔ (انگلی کے اشارے سے) دو نہیں تین۔

مرزا صاحب:۔ اور غالباً آخری الکشن میں آپ کی ضمانت بھی ضبط ہو گئی تھی۔

شرما جی:۔ ابی ضمانت ضبط کر لیے جانے کا قاعدہ میں نے نہیں سرکار نے بنایا ہے اور بالکل غلط اور مہمل بنایا ہے۔ ایک تو بیچارہ امیدوار ہارے اور دوسرے سرکار کا جرمانہ بھی بھرے۔ میری مانی جائے تو ایسے امیدوار کی تسلی کے لیے اس کو الٹی سرکاری امداد ملنا چاہیے جیسے کار حادثوں یا ریلوے کے حادثوں میں مرنے یا زخمی ہونے والوں کو ملا کرتی ہے۔"

مرزا صاحب:۔ "بھائی میں دوسری بات کہنا چاہتا ہوں۔ یعنی ضمانت ضبط ہو جانے کے بعد اب آپ کس برتے پر پھر الکشن لڑنا چاہتے ہیں"؟

شرما جی:۔ آپ ہمیشہ کوئی دوسری بات کہنا چاہتے ہیں۔ ضمانت ضبط ہو گئی تو میری زبان اور پیر تو نہیں ضبط ہو گئے۔ میرے دوست اور ورکر تو نہیں ضبط ہو گئے۔ میں دیوالیہ تو نہیں ہو گیا۔ ایک دفعہ ضمانت ضبط ہو جانے پر میں میدان چھوڑ بیٹھوں تو جنتا مجھے کیا کہے گی۔ ضمانت بچانے کے لیے گھر میں دبک کر بیٹھ رہا"

مرزا صاحب:۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زبان اور!

شرما جی:۔ لیجئے اب آپ ~~شاعری~~ شاعری پر اتر آئے۔ ابی یہ سب حماقتیں بعد میں کر لیجئے گا۔ اس وقت بس جلدی

سے منہ دھویئے اور ساتھ چلئے میرے۔

(دوسرا سین)

ایک گلی میں شرما جی ایک دروازے کی کنڈی کھٹکھٹاتے ہیں مرزا صاحب ساتھ میں ہیں۔

شرما جی:۔ (ہانک لگاتے ہیں) "بھوپو مل جی! بھوپو مل جی! ابھی شریمان بھوپو مل جی۔ (قریب ہی کہیں سے مرغا بولتا ہے)

شرما جی:۔ "شگون تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میرے چناؤ کے نشان والا مرغا بول رہا ہے۔"

مرزا صاحب:۔ پہلے گھر والا مرغا تو دڑبے سے نکلے۔

شرما جی:۔ (پھر چیختے ہیں) "بھوپو مل جی (اور کنڈی بھی کھٹکھٹاتے ہیں) بھوپو مل جی ذرا باہر تو تشریف لایئے (آہستہ سے مرزا صاحب سے کہتے ہیں) "کسی کے آنے کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔ مراد آباد میں مردہ زندہ ہو گیا۔

ایک شریمتی جی:۔ (دروازے کے ایک پٹ کے پیچھے سے) "یہ کون لوگ ہیں آپ جو چیخ چیخ کر سارے محلے کی نیند خراب کر رہے ہیں۔"

شرما جی:۔ بہن جی میں نگرپالیکا کے چناؤ میں آپ کے وارڈ سے امیدوار ہوں۔ میرا انتخابی نشان مرغا ہے۔ بھوپو مل جی ابھی آرام کر رہے ہوں تو ہم لوگ کسی وقت پھر پھیرا لگا لیں گے۔"

شریمتی جی:۔ (بہت تلخ اور طنزیہ لہجے میں) بھوپو مل جی آرام کر رہے ہوں تو ہم لوگ کسی وقت پھر پھیرا لگا لیں گے بہت خوب! میں کہتی ہوں کہ آخر آپ لوگوں کی بہنیں اور بیٹیاں ہیں کہ نہیں؟ آپ کو شرم نہیں آتی کسی شریف عورت پر اس طرح اتہام لگاتے؟ آخر بھوپو مل کون ہوتے ہیں میرے گھر میں آرام کرنے والے۔ محلے والے سنیں گے تو کیا کہیں گے مجھے ([illegible] آوازیں) ایک ایک کی چار لگائیں گے اور میری عزت آبرو مٹی میں مل کر رہ جائے گی۔ بھوپو مل ایسی ہی دوسری گلی میں رہتے ہیں۔ وہ آرام کر رہے ہوں گے تو اپنے گھر میں......"

مرزا صاحب:۔ بھئی شرما جی یہاں سے فوراً چل دیجئے ورنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

شرما جی:۔ ابھی یہاں تو صاف پانی مر رہا ہے۔ پاک دامنی سے پاک دامنی کی جھلک دکھائی دے رہی ہے۔ چور کی داڑھی میں تنکا والا مضمون ہے۔ لیکن خیر بھوپو مل کے ذریعے سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

دونوں آگے بڑھتے ہیں۔ شرما جی ایک ہاتھ سے ایک راہگیر کو روکتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے ایک گھر کی کنڈی کھٹکھٹاتے ہیں۔

(تیسرا سین)

شرما جی اور مرزا صاحب ایک گلی میں جا رہے ہیں۔ دوسری طرف سے ایک بجلی کی تیزی سے آتی

شرما جی :- ارے سلیمن بوا۔ سلام۔ سویرے سویرے اس تیزی سے کہاں چل پڑیں ؟"

سلیمن :- پوچھو مت بھیا! کل سے میرا گھورو غائب ہے۔ اسی کو گھر گھر تلاش کر رہی ہوں"۔

شرما جی :- تو آپ کا گھورو میرے چناو چنہ مرغے ہی پر مہر لگائے گا۔

سلیمن :- بس دعا کرو شرما جی کو گھورو مل جائے۔ ہم دونوں آپ ہی کے نشان پر مُہر لگائیں گے۔ لیکن کیا اب مرغوں کو بھی ووٹ دینے کا ادھیکار مل گیا ہے ؟

مرزا صاحب :- کیا مطلب ؟

سلیمن :- گھورو، تو میرا مرغا ہے "

شرما جی :- بھگوان کرے آپ کا گھورو مل جائے۔ دیکھئے اس پرچے پر جیسا مرغا بنا ہے اُسی پر مُہر لگانے گا ؟"
(جیب سے پرچہ نکال کر دکھاتے ہیں)

سلیمن :- ذرا دیکھوں تو بھیا (شرما جی کے ہاتھ سے پرچہ لیتی ہے۔ اور آنکھیں پھاڑ کر بڑے غور سے دیکھتی ہے۔ پھر اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتی ہے۔ "ہائے یہ تو بالکل میرے گھورو ہی کی تصویر ہے۔ وہی چتون، وہی کیس، وہی اکڑی ہوئی گردن، وہی ڈیل ڈھول، وہی آگے کو جھکی ہوئی چونچ، وہی نیتاؤں جیسی اکڑ فوں چال ڈھال۔ بانگ دیتا تو سارے محلے کی مرغیاں کڑکڑانے لگتیں اور مرغے ڈھابلیوں میں منہ چھپاتے پھرتے"۔

مرزا صاحب :- شرما جی دیکھو آج تمہیں ایک سو فی صدی پکا ووٹ ملا ہے"۔

شرما جی :- (ہنستے ہوئے) بھئی میرے لیے دیر ہو سکتی ہے اندھیر نہیں!
تو ہاں بوا کرپا کر کے آپ اپنے گھورو ہی کی تصویر پر اپنی مُہر لگا دیجئے گا۔ آپ کے محلے بھر کی مہریں اسی پر لگنا چاہئیں! اپنے محلے کے جانور کو چھوڑ کر کسی دوسرے جانور کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھنا چاہیئے"۔

سلیمن :- مگر بھیا بُرا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں ؟ میرے گھورو کی یہ تصویر تمہیں ملی کیسے۔ میں کل شام سے ہلکان ہو رہی ہوں۔ ایک نوالہ منہ میں نہیں ڈالا۔ اپنے گھورو کے لیے انگاروں پر لوٹ رہی ہوں۔ آدھی رات سے ایک ایک مرغے کی بانگ پر کان لگائے بیٹھی ہوں اور تم میرے گھورو کی تصویر لیے اپنا مُوا ووٹ مانگتے پھر رہے ہو۔ کسی غریب کا صبر ایسے نہیں سمیٹا جاتا۔ بتاؤ میرا گھورو کہاں ہے ؟

شرما جی :- (گھگھیاتے ہوئے) "ارے بوا جی یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ ؟ میں آپ کے گھورو کو کیا جانوں"؟

سلیمن :- اب چھوٹے منہ سے بڑی بات نہ نکلوائیے۔ جب گھورو کی تصویر آپ کے پاس ہے تو پھر گھورو کس کے پاس ہو سکتا ہے ؟ ایک تو آپ نے میری اجازت کے بغیر اُس کی تصویر کھنچوائی۔ کہیں اُس کو کسی کی بُری نظر لگ گئی تو میں تو کہیں کی نہیں رہوں گی۔ اور دوسرے آپ یہ سینہ زوری کر رہے ہیں (شرما جی کی آواز کی نقل کرتے ہوئے) میں آپ کے گھورو کو کیا جانوں ؟

مرزاصاحب :۔ "بھئی ذرا ہوش کے ناخون لو! یہ تصویر تو شرما جی کے پاس پندرہ دن سے ہے اور تمہارا گھورو کھویا ہے کل شام کو۔"

سلیمن :۔ تو یہ کہیئے کہ آپ کی اور شرما جی کی ملی بھگت ہے اور آپ لوگ پندرہ دن سے گھورو کی تصویر کھنچانے اس کی تاک میں گھوم رہے تھے اور کل شام کو جب میں ذرا دیر کے لیے بازار چلی گئی تو آپ لوگوں نے اس پر ہاتھ مار دیا۔ دیکھئے میں ابھی سارے محلے کو جمع کرتی ہوں اور سب کے سامنے میرا اور آپ کا فیصلہ ہو جائے گا۔
چیخ چیخ کر پکارتی ہے "سیتارام بابا۔ جمّن کاکا۔ رحمو ماما۔ کلو۔ جگو۔ توتارام بھیا!"
ایک دم سے ایک مرغے کی بانگ سنائی دیتی ہے اور سلیمن یہ کہتی ہوئی بھاگتی ہیں۔ "ارے میرے شہزادہ گھورو تو میرے گھر ہی سے مجھے پکار رہا ہے۔"

مرزاصاحب :۔ بھئی ابھی ابھی تو حجامت ہی بنتے بنتے رہ گئی تھی اس سلیمن کی بچی نے تو محلے میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا تھا۔"

شرما جی :۔ گھورو ہی نے پھانسی پر لٹکایا تھا اور گھورو ہی نے پھانسی سے اتارا۔ دیکھیے کام آیا نہ میرا مرغا۔ بس اب اس طرف کے ووٹ تو پکے سمجھیے۔"

مرزاصاحب :۔ میرا دل تو ابھی تک دھڑک رہا ہے۔ میری مانیے تو بس اب لوٹ چلیے۔"

شرما جی :۔ جی ہاں آپ کی مانیے تو سامنے والے کنویں میں پھاند پڑیئے۔ ابھی اتنے اچھے اچھے تو شگون مل رہے ہیں۔ بس دو تین گھر اور جھانک لیتے ہیں اور پھر چلتے ہیں۔

(چوتھا سین)

شرما جی اور مرزا صاحب ایک گلی میں جاتے ہیں۔ شرما جی ایک مکان کی کنڈی کھڑکھڑاتے ہیں پھر چیختے ہیں "اجی دمڑو پہلوان جی! دمڑو پہلوان جی! بھائی دمڑو پہلوان جی!"
(گھر کے اندر سے بہت سے کبوتر پھرّا مار کر اڑتے ہیں)
دمڑو پہلوان دروازے کا پٹ زور سے بند کر کے لاٹھی لیے ہوئے کھنکھارتے ہوئے بڑے غصے سے نکلتے ہیں۔

دمڑو :۔ کیوں جی کیوں یہ چل پول مچا رکھی ہے؟ جان نہ پہچان خالہ اماں سلام۔ آخر کون ہو تم لوگ؟ کہاں سے بھاگ کر آئے ہو؟ کیا دشمنی کی تھی میں نے جو اتنے سویرے آ کر اپنے غل غپاڑے سے میرا سارا مکان ہلا کر رکھ دیا اور میرا سارا مکان ہلا کر رکھ دیا اور میرا بنا بنایا کھیل بگڑ کر رہ گیا۔

شرما جی :۔ (گڑگڑاتے ہوئے) اجی پہلوان صاحب ہم نگر پالیکا کے ہونے والے چناؤ کے لیے آپ کا قیمتی ووٹ مانگنے آئے ہیں)"

دمڑو :۔ خوب کان کھول کر سن لیجیے۔ میں آپ کو اپنا ووٹ ہرگز ہرگز نہیں دے سکتا۔ بڑی مشکل سے دو نئے

کبوتروں کو دانہ ڈال کر منڈیر سے نیچے صحن میں اتارا تھا لیکن آپ نے کنڈی کھٹکھٹا کر اور گلا پھاڑ کر تو وہ ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ وہ کیا خود میرے گھر کے کبوتر بھی پھر اما رکر اڑ گئے۔ سچ پوچھئے تو بس خون اتر رہا ہے۔ آنکھوں میں آپ کو دیکھ کر۔ اپنی خیریت اسی میں سمجھیے کہ آپ میرے سامنے سے دور دفعان ہو جائیے۔ آپ کو اس گلی کا ایک ووٹ بھی مل جائے تو میری ان مونچھوں کو چھچھوندر کی دم سمجھئے گا۔

(اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دمڑو گھر کے اندر جا کر بڑی زور سے دروازے کا پٹ بند کر دیتا ہے)

شرما جی:۔ (چیخ کر پکارتے ہوئے) چھچھوندر کی دم والے پہلوان۔ بکرے کو نہ بھولیے گا۔ میرا چناؤ چھ بکرا ہے بکرا۔

دروازہ کھلتا ہے۔ دمڑو نکل کر گرجدار آواز میں چیختا ہے "ٹھہرئیے تو رہنا بکرے کی اولاد۔ ابھی اس بدتمیزی کا مزہ چکھاتا ہوں"

شرما جی اور مرزا صاحب بے تحاشہ بھاگتے ہیں۔

(پانچواں سین)

مرزا صاحب:۔ (بری طرح ہانپتے ہوئے) بھئی کمال ہی کر دیا شرما جی۔ یہ کیا حرکت تھی آپ کی؟ سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگتے نہیں تو اس وقت اسپتال میں ہوتے یا قبرستان میں!

شرما جی:۔ (قہقہہ لگاتے ہوئے) ایک دوست ملا تو وہ بھی عقل سے ترپٹ۔ ارے مرزا صاحب اب اس پوری گلی سے ایک ووٹ بھی بکرے کو نہیں مل سکتا۔ بکرے نے تو دمڑو پہلوان کے سب کبوتر بھگا دیئے تھے۔ اب ووٹ ملیں گے خاکسار مرغے کو ؎

سر کو جھکا دے دم کو اٹھا دے
بول میرے مرغے ککڑوں کوں!

●●

رؤف رحیم (حیدرآباد)

غزل

بگلا بھگت ہی آج کے لیڈر ہیں سب کے سب
ویسے بہت خلوص کے پیکر ہیں سب کے سب

داماد، بیٹے اور بھتیجے وزیر کے
اس دورِ بیکسی میں تونگر ہیں سب کے سب

جتنے گروپ باز ہیں شاعر وہ اصل میں
شعر و ادب کی راہ میں پتھر ہیں سب کے سب

کیسے کہوں کہ ملک میں یک جہتی عام ہے
آنکھوں میں میری خون کے منظر ہیں سب کے سب

کرکٹ کا ہے بخار مرے شہر میں ہنوز
بچے بھی میرے دیکھیے اظہر ہیں سب کے سب

کالی گھٹا میں ان کی ہیں رنگِ خضاب سے
جب کہ سفید بال مرے سر ہیں سب کے سب

مہنگی ہوئی پڑھائی ڈونیشن کا دور ہے
بچے مرے اسی لیے گھر پر ہیں سب کے سب

دیکھا ہے کس نے گزرے زمانے کو ڈارون
مانیں یہ کیسے آدمی بندر ہیں سب کے سب

طنّازِ وقت کیوں نہ کہیں اس کو دوستو
اشعار جب رحیم کے نشتر ہیں سب کے سب

قمرالزماں قمر (رانچی)

نیا سال مبارک

مبارک سالِ نو کی دوستو! آہٹ مبارک ہو
خوشی نیتا کو اور جنتا کو اُف اور ہٹ مبارک ہو

عظیم الشان مہنگائی کی کڑواہٹ مبارک ہو
ہر اک فیشن زدہ شوہر کو تھرتھراہٹ مبارک ہو

ہر اک عاشق کو سالِ نو کی گرماہٹ مبارک ہو
مگر نادار اور بیکس کو گھبراہٹ مبارک ہو

میں کہ ہر اک بار اپنا مدعا لکھتا رہا
اک دفعہ ایسی اک دفعہ بس اک دفعہ لکھتا رہا

کون سے القاب ہیں جن کو نہ لکھا ہے کبھی
جانِ من، جانِ تمنا، خوش ادا لکھتا رہا

کل نکالا جائے گا سمجھائے کہا یار نے
اور اندھیری رات کا بھی فائدہ لکھتا رہا

انوار انصاری [illegible]

الجھن

الجھن — یہ لفظ سنتے ہی طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ چہرے کا رنگ فق اور ذہن پریشان ہو جاتا ہے۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے جنم لینے لگتے ہیں اور یہی خواہش ہوتی ہے کہ کہیں دور جا کر ایسی جگہ آشیانہ تعمیر کیا جائے جہاں الجھن سے نجات ملے۔ اس بھاگ دوڑ کی زندگی میں کوئی بشر الجھن سے بچا نہیں ہے۔ کسی نہ کسی الجھن میں ضرور گرفتار ہے۔ دنیا میں بسنے والوں کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ طالب علم، استاد، تاجر، گاہک، ڈاکٹر، مریض، وکیل، موکل، ایڈیٹر، کاتب، انجینئر، بے کار، باکار، غرض کہ سبھی الجھن کے شکار ہیں۔ گویا الجھن نے ایسا جال پھینکا ہے کہ سب ہی اس جال میں اسیر ہو گئے ہیں۔ ہر گھر میں الجھن کا رونا ہے۔ دوست دشمن سب ہی اس سے نالاں ہیں۔ عاشق و معشوق پریشان حال ہیں۔ باپ بیٹے، میاں بیوی اور پڑوسی اس کی زد سے محفوظ نہیں۔ اس الجھن نے دنیا کے امن و امان کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے۔ غرض کہ الجھن کی وجہ سے ہزاروں مسائل پیدا ہو رہے ہیں اور اس دھرتی کا یہ حال ہے کہ:

الجھن کے گھنے جنگل سے یارو
نکل جانے کا رستہ بھی نہیں ہے
عجب ماحول ہے گلشن کا یارو
ہوا کا تازہ جھونکا بھی نہیں ہے

صبح کی سپیدی کے ساتھ ہی الجھن کی ناز برداریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ بیگم سے چائے کی فرمائش کرتا ہوں جواب ملتا ہے چائے چینی دودھ ندارد ہے۔ گیس کب کی ختم ہو چکی ہے۔ کوئلہ بھی ختم ہے۔ پڑوس سے ادھار لے کر سر چولہے [illegible] ہوں۔ سوچا تھا کہ چائے پی کر تازہ دم ہو جاؤں گا اور ایک آدھ مضمون سپرد قلم کر دوں گا مگر چائے لینے کے [illegible] سے پہلے آپ چائے، چینی، دودھ اور کوئلے کا انتظام کیجیے۔ بچے اسکول کی بجائے گھر میں ہی ادھم [illegible] بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ [illegible] کی فیس باقی ہے [illegible] [illegible] [illegible]

طالب علموں کا مستقبل یونیورسٹی کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے غارت ہو رہا ہے مگر وائس چانسلر صاحب اور دوسرے ذمہ دار عہدہ دار اپنی اپنی ڈگر پر رواں دواں شانِ بے نیازی سے زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔

دوکان دار ہول سیلر سے پریشان ہیں۔ قیمتیں آئے دن آسمان کو چھونے لگی ہیں۔ ان کا حال دریافت کرنے پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہول سیلر، ریٹیلر، کھدرا دوکان دار کسی نہ کسی الجھن کے شکار ہیں اور غموں کے بوجھ تلے عوام زندگی کے دن گزارنے پر مجبور ہیں۔ طرح طرح کی الجھنوں سے عوام [illegible] ہیبت طاری ہے۔

سائنس کا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا آج ترقی کی طرف گامزن ہے۔ آئے دن نئی نئی ایجادیں عمل میں آ رہی ہیں۔ نئی ایجادوں کی وجہ سے زندگی گزارنا سہل ہو گیا ہے مگر خاکسار کا یہ خیال ہے کہ سائنس کی بڑھتی ہوئی تیز رفتار ترقی کے ساتھ انسان الجھن کے شکنجے سے باہر نہیں نکل سکا ہے۔ اب تو نئی نئی بیماریاں بھی وجود میں آنے لگی ہیں۔ جس پر فوراً قابو پانا سائنس کے بس کی بات بھی نہیں۔

الجھن نے زندگی دو بھر کر دیا ہے۔ ڈاکٹر کو یہ الجھن ہے کہ کس طرح اور کتنی جلد وہ امیر کبیر بن جائے۔ اس کو مریضوں کے علاج سے اتنی دل چسپی نہیں جتنی اپنے بینک بیلنس سے ہوتی ہے۔ مریض کو یہ الجھن ہے کہ پیسے میں کسی طرح بیماری سے نجات ملے تاکہ گھر والوں کو قرض کا سہارا نہ لینا پڑے۔ مریض دل سے چاہتا ہے کہ ڈاکٹر سے اس کو چھٹکارا ملے مگر حالات کے تحت ڈاکٹر اس کو الجھن میں مبتلا رکھتا ہے۔

ہر پڑوسی کو اپنے پڑوسی سے کچھ نہ کچھ الجھن ضرور ہوتی ہے۔ پڑوسی یہ نہیں چاہتا ہے کہ میرے ہمسایہ کی الجھن ختم ہو بلکہ اس کی تو یہی خواہش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی مسئلے کو لے کر پڑوسی کو الجھن میں مبتلا رکھا جائے۔ انسان اپنے گریبان میں منہ ڈال کر نہیں جھانکتا ہے۔ اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں پر نظر نہیں ڈالتا۔ اس کی نظر تو دوسروں کی کمزوریوں کی جانب مرکوز ہوتی ہے مگر کسی کو کیا پتہ۔

الجھن کے دہانوں پر لوگ بیٹھے ہیں۔ وجود عالم امکاں بکھرنے والا ہے۔

کوئی کہاں تک الجھن سے اپنا دامن بچائے گا۔ الجھن تو زندگی کا ایک جزو بن چکی ہے۔ ہر نفس الجھن سے ہمکنار ہے۔ ہر بشر الجھن سے برسرپیکار ہے۔ غرض کہ زندگی ہی الجھن سے بیزار ہے۔

اسٹرائیک، ہڑتال، توڑ پھوڑ، تخریبی کارروائیاں، درہم برہم منتشر زندگی سب الجھن کی وجہ سے ہے۔ الجھن کا خاتمہ گویا سکون کی زندگی کی آمد کا پیغام ہے۔ اضطراب اور پریشانیوں سے گھری ہوئی زندگی سے اگر انسان بچنا چاہے تو روزمرّہ کی زندگی میں الجھنوں کو کم کرے

الجھن میں پڑ کر آپ بھی الجھن میں مبتلا ہو گئے ہوں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ اپنا قیمتی وقت الجھن کی نذر کریں۔ الجھن سے نجات حاصل کرنا بھی ایک نیک اور عمدہ کام ہے۔ اس نیک کام میں دیر نہ کریں۔ الجھن کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دیں، "الجھن مردہ باد" ہی ہمارا نعرہ ہے۔ اس نعرہ پر لبیک کہیں اور سکون کی زندگی گزاریں۔

ایک کہاوت مشہور ہے: "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ"۔ میرا خیال ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ یہ کہاوت

بھی نام ہست پا چاہیے [illegible] الجھن سے پاؤ۔ دوستوں سے بچنے کے معنی یہ ہیں کہ الجھنوں سے بھی نجات مل جائے گی۔ الجھن کا نہ کوئی وقت مقرر ہے اور نہ کوئی موسم۔ الجھن تو ہمہ وقت انسان کے ساتھ ہی چلتی ہے۔ آپ غور کریں گے تو پتہ چلے گا کہ الجھن کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی حیثیت سے ہر گھر میں ضرور موجود ہے۔ الجھن کے جراثیم ایسے ہیں جن کو دور نہیں کیا جا سکتا۔

وہ ہر زمانے میں پائے جاتے ہیں، ہر قوم میں ملتے ہیں، ہر ملک کا جزو ہے۔ ہر آب و ہوا میں پنپتے ہیں۔ ہر رنگ و نسل میں پروان چڑھتے ہیں۔ وہ جیل خانے میں بھی ملیں گے مندر میں، مسجد میں، گرجا میں، شبستانِ عیش میں، کلبۂ افلاس میں، شہر میں بازار میں، صحرا میں، ویرانے میں۔ غرض کہ الجھن سے چھٹکارا پانا ممکن نہیں۔ ○●

صابر بہاری (مانجی)

سمجھ کو آپ کی یہ کیا ہوا ہے!

لباسِ زندگی اُلٹا ہوا ہے
جدن کپڑے میں ننگا ہوا ہے

ستم ہے یا قیامت کی گھڑی ہے
مقابل باپ کے بیٹا ہوا ہے

دُلہن کے ساتھ ٹی وی ہو فریج ہو
یہ شادی ہے کہ اک سودا ہوا ہے

کمی نیتاؤں کی اب ہے نہ ہوگی
مرے گھر میں بھی اک نیتا ہوا ہے

سمجھ صابر کو آئے یا نہ آئے
سمجھ کو آپ کی یہ کیا ہوا ہے

○

منصور عمر (دربھنگہ)

سچ کا دامن تھام کر اچھا کیا تُو نے مگر
اب ترقی کا تری امکان آدھا رہ گیا

مسکرا کر جب اُلٹ دی اُس نے چہرے سے نقاب
دل میں جو برپا تھا وہ طوفان آدھا رہ گیا

جب سے میں استاد شاعر ہو گیا ہوں شہر کا
غیر مطبوعہ مرا دیوان آدھا رہ گیا

جب تلک زندہ رہے منصور وہ پورا رہا
مر گئے ابنِ صفی عمران آدھا رہ گیا

مرزا کھونچ (بیتیا)

○

مال و دولت نہ سہی خوبئ ظرافت تو ملی
روتے لوگوں کو ہنسانے کی وراثت تو ملی

خواب میں جان گنوائی ہے وطن کی خاطر
چاہے جیسے بھی ملے دوست شہادت تو ملی

سات بیٹوں نے مجھے کچھ نہ دیا ہے پھر بھی
مفت میں سر کی بلا ناغہ حجامت تو ملی

نوکری پائی ہے سرکاری اپاہج بن کر
پیر ٹوٹا تھا مگر مجھ کو لذت تو ملی

گیس پیپر سے بھلے فرسٹ نہیں آسکتا
پاس ہونے کے لیے ایک ضمانت تو ملی

سوندھی سوندھی سی خوشامد کی بدولت ہی سہی
بزمِ اغیار میں کرسی صدارت تو ملی

میرے اخلاق کی داڑھی میں اگر تنکا ہے
اُسی تنکے کی بدولت مجھے شہرت تو ملی

اس کے اشعار رسالوں میں بھلے چھپتے نہیں
سہرہ پڑھنے کے لیے کھونچ کو دعوت تو ملی

امجد علی بھٹی (گجرات)

پان ہی تو ہے

پان کھانا ایک انسانی عمل ہے جس کی اہمیت ہمارے ہاں اتنی ہی ہے جتنی کہ جانوروں میں جگالی کی لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ جانور جگالی کرتے ہوئے ہنس بول سکتے ہیں نہ ملک کی موجودہ صورت حال پر تبادلہ خیال کر سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے احباب سے محبت کر کے تھکان اتار سکتے ہیں جبکہ ہم اس خصوصیت سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے یہی وجہ ہے کہ اب ہی اس میں ہمارے چہرے پیک کے چھینٹوں سے بغیر دھیا ہوا پیکدان نظر آنے لگیں۔

وجود زن سے ہے کائنات میں رنگ اور اس رنگینی کو برقرار رکھنے کے لیے پان ایک مثبت کردار ادا کرتا ہے اور غالباً اس کی وجہ بھی کوئی عورت ہی رہی ہوگی کیونکہ جب تخلیق کائنات کا اصل سبب ایک عورت ہی ہو سکتی ہے تو پان کا موجد مرد کیسے ہو سکتا ہے۔ پان کی ایجاد کے تناظر میں کیا اغراض و مقاصد کارفرما تھے ہم ابھی تک ناواقف ہیں البتہ اتنا معلوم ہے کہ جب ہمارے عشاق نے اسے بھری نظروں سے دیکھا تو انہیں اس میں اپنے محبوب کا دل نظر آیا تو جھٹ سے اس کی ٹریٹ توڑ بھینکی اور اسے علامت محبت کے طور پر پیار بھرے خطوط میں خون دل سے اتارنے لگے سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے احتراماً اپنے سینہ میں دل محبت کی طرح چھپائے رکھا لیکن وہ اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ ایک نیام میں دو تلواریں اور ایک سینہ میں دو دل ہرگز نہیں رہ سکتے تو انہوں نے اشتہار کی شکل دے دی۔ اس اشتہار کو جب ایک تیر انداز عاشق (کیوپڈ) نے غور سے دیکھا تو اس نے ایک زنگ آلود تیر کا اضافہ کر دیا جسے دیکھ کر پہلے تو ہم یہی سمجھتے رہے کہ کمان سے نکلا ہوا ہوگا لیکن جب آتش جوان ہو گیا تو پتہ چلا کہ وہ نظروں کا تیر تھا جس نے ایک عاشق نامراد کے دل کو اس بری طرح سے زخمی کر دیا تھا کہ بمشکل چند قطرے خون نکل سکا جو اشتہار میں بھی واضح طور پر نظر آتا ہے۔ شاید غالب نے یہی دیکھ کر کہا تھا۔ ع

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا

پان کی انفرادی حیثیت صفر سے بھی کم نظر آتی ہے اس میں چند بنیادی لوازمات جب تک نہ ہوں پان، پان نہیں کہلا سکتا۔ پان لگانا، دیہاتوں میں پان لگانے سے بالکل مختلف ہے جس کے لیے کتنی ریاضت درکار ہے اور زور کہ کم از کم دو سال میں پتہ چلتا ہے۔ ہماری عورتیں چونا لگانے میں بڑی ماہر تصور کی جاتی ہیں وہ پان پر ہو یا شوہر نامدار کے جیب پر، تا غیر جانبدار ان کا ثبوت ہی کیں گی۔

کتھا، جو درختوں کی چھال سے بنایا جاتا ہے جو بعد میں ٹھیک ٹھاک کی ایجاد کا سبب بھی بنا اور ستم یہ کہ اس

رقم ۔ منہ لال ہوتا ہے بلکہ گلا بھی اس کی زد میں آجاتا ہے ۔ چنانچہ جب بھی خوب صورت مرمریں جسم کی تعریف مقصود ہوتی کہا جاتا ہے
لال کے گلے سے پان کی لالی صاف اُترتی نظر آتی ہے یعنی جناب گلہ ہوا کانچ کی صراحی کی گردن ہو گئی ۔

سپاری ؛ ۔ جس سے دانت مضبوط اور سخت ہوتے ہیں اتنے بھی نہیں کہ آہنی چنے چبانے کی سوچیں ۔ بات آگئی چنوں کی ہو یا
پاری کی دانتوں کے بغیر ناممکن ہے کیونکہ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ پہلے تو منہ میں دانت نہیں اس پر سے انار کے دانے لگا کر سپاری
چبانے کے خواب دیکھیں ۔

پان کے دیگر لوازمات میں گل قند، بادام، کاجو، کھوپرہ، لونگ، الائچی، سونف، اجوائن، مرونڈے، جلتی جاگتی
یونٹیاں، بھنی ہوئی ککڑیاں اور ریت شامل ہے ۔

سلیقے سے لپیٹے ہوئے پان "گلوری" کہلاتے ہیں پان ہی واحد ایسی چیز ہے جو سلیقہ سے لپیٹنے کے بعد مذکر سے مونث
میں تبدیل ہو جاتا ہے ۔ گلوریاں اگلے وقتوں میں چاندی کے اوراق میں لپیٹی جاتی تھیں لیکن اب کاغذ کا پیرہن جسے عموماً
کھایا نہیں بلکہ پھینکا جاتا ہے ۔ کچھ فراخدل حضرات کاغذ کو خالی پھینکنا اپنی توہین سمجھتے ہوئے اس میں پان کی کترن بطور ٹپ رکھ کر
پھینک دیتے ہیں ا ۔ بقیہ حضرات رومال نہ ہونے کی صورت میں اسی سے اپنی بدقسمتی کے آنسو اور عرق انفعال کو خشک کرتے ہیں
پرانے قبیلوں میں ایک رسم عام تھی کہ شادی بیاہ جیسی پُرمسرت تقریبات کے انعقاد پر قبیلے میں پان تقسیم کیے جاتے تھے
جسے آپ دعوت نامہ بھی کہہ سکتے ہیں اس دعوت کو قبول فرما کر اس گھر کی عورتیں پان کو چبا کر اور ہونٹوں پر پان کی لالی
سجا کر دعوت میں شریک ہوتیں اور اگر خاطر داری اُن کے شایانِ شان نہ ہوتی تو وہی پان داعی کے منہ پر تھوک کر گھر واپس لوٹ
جاتیں اور پھر کبھی اس گھر کی دعوت قبول نہ کرتیں اور یہاں ان ہی پانوں میں دولہے میاں کو سلامی دی جاتی ہے ۔ اکثر دولہے اس رقم
کو تو جیب میں ٹھونس لیتے اور پان واپس تھال میں ڈال دیتے اس غرض سے کہ سسرال پر خرچ کا بوجھ زیادہ نہ پڑے ۔ ایک روایت
یہ بھی ہے کہ شرارتی سالیاں نویلے بہنوئی کی خدمت میں مرچ والا پان پیش کرتی ہیں ۔ اب جو بہنوئی پہلے ہی اس غلط فہمی میں شادی
رچا لیتا ہے کہ سالیاں خوب صورت ہیں تو بیوی بھی خوب صورت ہی ہوگی اس مرچ بھرے پان کو بھی سالیوں کی صورت دیکھ کر
برداشت کر جاتا ہے ۔

کوئلے کی دلالی میں ہاتھ کالے تو پان کی دلالی میں حنائی ہوتے ہیں ہاتھ ہی نہیں کپڑے بھی اور کبھی کبھی دانت بھی حنائی
ہو جاتے ہیں، حنائی ہاتھ اور انگلیوں پر تو بہت سے شعراء کرام نے قلم فرسائی کی ہے اب حنائی دانتوں پر بھی کام ہونا چاہیئے ۔

کچھ شہر ایسے ہیں جہاں پان گھروں میں بڑے ہی سلیقہ کے ساتھ کھلائے اور پارسل کئے جاتے ہیں کہیں اس کے لیے
باضابطہ پان محلوں کی تعمیر و تشکیل پر زور دیا گیا تو کچھ ریاستیں ایسی بھی ہیں جہاں پان کے شائق کو سارا پان محل ساتھ رکھنا پڑتا
ہے تاکہ کسی بھی حالت میں کھایا اور کسی حالت میں تھوکا جا سکے ۔ ایسا تھوکنا بھی دراصل فضول خرچی کے زمرے میں آتا ہے ورنہ
پرانے زمانے میں تو ایسا ہوتا تھا کہ پان کی پیک مہینوں سونے چاندی و پیتل کے بنے خوب صورت پیک دانوں میں محفوظ رکھی جاتی

کلکتہ اور بنارس کے پان کافی مشہور و مقبول ہیں ایک فلمی گانے میں بنارسی پان کی اس خصوصیت پہ روشنی ڈالی گئی ہے
کہ بنارسی پان کھانے سے بند عقل کے تالے کھل جایا کرتے ہیں ہم نے تو کئی بنارسی پان کھائے لیکن ہماری عقل ہنوز بند ہے ۔
دروغ برگردن راوی ایک مرتبہ بنارس میں اسی فلمی دھن سے متاثر ہو کر ایک بھینس بھی پان کے باغیچہ میں گھس پڑی اور تقریباً بار

جٹ کر جانے کے بعد دم سادھ کر سنجیدگی کے ساتھ اپنی عقل کا تالا کھلوانے کا انتظار کرنے لگی اور جب کچھ بات نہ بنی تو تھک ہار کر باہر آئی تو ایک ماہر نفسیات نے اس سے دریافت کیا کہ خالہ جی! آپ بنارسی پان کھا کر تشریف لا رہی ہیں ذرا یہ تو بتائیے کہ عقل بڑی ہوتی ہے یا بھینس؛ تو پہلے اس نے اپنے سر پر پلے کا کمر پورہا کو کھولیا اور پھر سر کو ہلا کر عرض کیا "بھینس بڑی"!
اس بات سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اتنی بڑی قوی الجثہ جسامت رکھنے والی بھینس کی عقل کا تالا نہیں کھل سکا تو ہماری عقل کا تالا کیا خاک کھلے گا۔

انار و قندھاری کی طرح پان بھی کسی خاص موسم کی پیداوار نہیں البتہ ان دونوں کے لیے سازگار ماحول درکار ہے۔ عرصہ دراز سے یہ دیکھا جا رہا ہے کہ پان کی بیلیں ہی ہوا کرتی ہیں جنھیں ایک چھوٹے سے درخت کے اطراف لپیٹا جاتا ہے۔ بیل کے آغاز پر مزید پختہ، درمیان میں پختہ اور اختتام پر ملائم پان لگے ہوتے ہیں کچے اور مزید پختہ پان کے بارے میں رائے عامہ یہ کہتی ہے کہ اول الذکر کھانے میں مزیدار اور موخر الذکر بے مزہ ہوتے ہیں۔

ہندوستان ہی واحد ایسا ملک ہے جہاں پان بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ آبادی کے معاملے میں بھی ہندوستان کسی سے پیچھے نہیں ہے پان دیگر ممالک کو برآمد کیا جا سکتا ہے مگر حکومت آبادی برآمد کرنے کی سوچ رہی ہے لیکن کوئی ملک اسے قبول کرنے پر راضی نہیں ہے کیونکہ ہر ملک آبادی کی حد تک خود کفیل نظر آتا ہے البتہ وہ آپ کو پان کے عوض ہتھیار درآمد کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں بشرطیکہ آپ انہیں پان کھانے کے لیے راضی کر لیں کیونکہ ہم ہندوستانیوں کے لیے جتنا مشکل سائنسی ترقی کرنا ہے اتنا ہی ان ممالک کو پان کے شغل میں مبتلا کرنا ہے۔

خامہ بگوش
(کراچی)

اس دیوان کے
شروع اور آخر کے خالی صفحات پڑھنے والوں کو بہت متاثر کرتے ہیں

آج کل ادبی حلقوں میں وفاحت نسیم کی شاعری ہی کی نہیں، ان کی مہمان نوازی کی بھی بڑی دھوم ہے۔ ان کے دیوان "خواب دریچے" کی تقریب رونمائی ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں منعقد ہوئی جس کا اختتام عشائیے پر ہوا اور اس طرح یہ تقریب رونمائی، عشائیہ رونمائی کا روپ دھار کر ایک یادگار ادبی واقعہ بن گئی۔ یہ مقولہ غلط ثابت ہو گیا کہ شاعری سے کسی کا پیٹ نہیں بھرتا، ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دو سو سے زیادہ افراد کے لیے شاعری شکم سیری کا وسیلہ بنی۔

اس تقریب کے صدر حالی صاحب تھے۔ انہوں نے اپنے صدارتی خطبے میں فرمایا، وفاحت نسیم نے عشائیے کا اہتمام کر کے تقریب کا جو اونچا مقام قائم کیا ہے اس نے دوسرے شاعروں کے لیے مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ بیس تیس ہزار روپے خرچ کرنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ اب لوگ ایسی تقاریب رونمائی میں شرکت نہیں کریں گے، جن میں عشائیے کا اہتمام نہ ہو۔

ہمیں حالی صاحب کے ارشادات عالیہ سے اتفاق نہیں ہے۔ وفاحت نسیم بڑی سمجھ دار خاتون ہیں، انہیں اس کا احساس تھا کہ شرکائے جلسہ تین چار گھنٹے تک ان کی تعریفیں سنیں گے، اس زحمت کی کچھ تو تلافی ہونی چاہیے۔ وہ چاہتیں تو عشائیے کے بجائے شرکا کو اپنے دیوان کا ایک ایک نسخہ دے کر بھی احسان اتار سکتی تھیں لیکن انہیں معلوم تھا کہ کسی کو اپنا دیوان دینا مزید زیر بار کرنے کے مترادف ہے۔ جو لوگ شاعرہ کی تعریفیں سن سن کر نڈھال ہو چکے ہوں ان کے لیے دیوان کا بوجھ اٹھانا مشکل ہوگا۔ عشائیے کا اہتمام کر کے دراصل انہوں نے شرکائے جلسہ کا غم غلط کرنے کی کوشش کی ہے جس کے لیے وہ مبارکباد کی مستحق ہیں۔

رہی یہ بات کہ وفاحت نسیم نے تقریب کا اونچا معیار قائم کر کے دوسرے شاعروں کے لیے مشکلات پیدا کر دی ہیں تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو قابل اعتراض ہو۔ ہمارے شاعر اگر شاعری کا معیار اونچا نہیں کر سکتے تو کم از کم انہیں تقاریب رونمائی کا معیار ضرور اونچا کرنا چاہیے تاکہ ان کی ادبی زندگی میں کہیں تو اونچائی نظر آئے۔

حالی صاحب نے تقریب کے اخراجات کے حوالے سے دوسرے شاعروں کی مشکلات کا تو اندازہ کر لیا، لیکن وفاحت نسیم کی شاعری سے دوسرے شاعروں کے لیے جو مشکلات پیدا ہوں گی ان کا انہیں احساس نہیں ہوا۔ وفاحت نے شاعری کا جو معیار پیش کیا ہے دوسرے شاعروں کے لیے اس معیار تک پہنچنا بھی تو مشکل ہوگا اور کسے معلوم اس معیار

تک پہنچنے میں [illegible] سے [illegible] ان کی شخصیتوں کا اندازہ [illegible] تو ہمارے لیے مشکل ہو جاتی ہیں کیونکہ خوش قسمتی سے ہم نے وفاحت نسیم کو پہلے نہیں پڑھا تھا۔

وفاحت نسیم کی شاعری کے بارے میں ہم نے جو اچھی رائے قائم کی ہے اس کی ایک وجہ تو مشاعرے میں شرکت ہے۔ کیونکہ نہایت اچھا [illegible] جو شاعرہ اتنا اچھا لکھ سکتی ہیں وہ یقیناً نثر بھی اچھی لکھتی ہوں گی۔ دوسری وجہ تقریب میں تقسیم ہونے والا وہ کتابچہ ہے جس میں احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، شہزاد مجاہدی اور شہزاد احمد جیسے اساتذۂ ادب نے نہایت فراخدلی کے ساتھ وفاحت نسیم کی شاعری کے بارے میں دلچسپ باتیں لکھی ہیں۔ جیسی عبدالرحمن بجنوری نے غالب کے بارے میں لکھی تھیں۔ فرق یہ ہے کہ بجنوری نے جب اپنا مشہور مقالہ "محاسن کلام غالب" لکھا تھا تو ان کی عمر ۲۵۔۲۶ برس کی تھی۔ مذکورہ حضرات میں سے کوئی ساٹھ برس سے کم کا نہیں۔ ظاہر ہے پختگی عمر اور پختگی فکر کا اثر [illegible] پڑتا ہے۔

جلسے میں مقررین کی ایک فوج ظفر موج موجود تھی۔ بعض نے محض لفاظی کی اور بعض نے اپنا سارا علم اسی محفل میں خرچ کر دیا۔ اور یوں دامن جھاڑ کر اٹھے جیسے ان کے سر سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔ اپنے سر کا بوجھ دوسروں کے سروں پر ڈال دینا بھی ایک کمال ہے۔ احمد ہمدانی صاحب کا مقالہ اتنا فکر انگیز تھا کہ [illegible] سامعین فکر و تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ ہلکی پھلکی تقریبوں میں ثقیل مقالے پڑھنا ہمدانی صاحب کی ادا کے خاص ہے۔ وہ گوشہ نشین آدمی ہیں۔ لیکن لوگ انہیں گھیر گھار کر جلسوں میں لے جاتے ہیں۔ یہ بات ہمدانی صاحب کے مزاج کے خلاف ہے۔ لہٰذا وہ اپنے غصہ کا اظہار مقالے کی صورت میں کرتے ہیں۔ کسی کتاب کی رونمائی کے موقع پر وہ جو مقالہ پڑھتے ہیں وہ اتنا سنجیدہ ہوتا ہے کہ معمولی قطع تبدیلی کے بعد کسی تعزیتی جلسے میں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

مشہور انشاء پرداز ڈاکٹر علی خاں قلم ہی کے نہیں زبان کے بھی دھنی ہیں۔ ان کی خوش گفتاری بے مثال ہے۔ وہ دوسروں کی طرح گھر سے مضمون لکھ کر نہیں لائے تھے۔ کیونکہ گھر میں انہیں ٹھوس اور معقول کام کرنے کی عادت ہے۔ انہوں نے فی البدیہہ جو کچھ ارشاد فرمایا اس سے ثقیل مقالوں کی پیدا کردہ سرد بازاری ختم ہوئی۔ اور محفل میں گرما گرمی کے آثار نظر آنے لگے۔ خان صاحب نے وفاحت کی شاعری کی خوب تعریف کی اور آخر میں فرمایا "میں نے پیشگی حق نمک ادا کر دیا ہے" مشاعرے کے حوالے سے یہ بات درست ہو سکتی ہے۔ لیکن شاعری کے حوالے سے درست نہیں۔ وفاحت نسیم کی شاعری تو کانِ نمک ہے۔ اس کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک پڑھنے والا "ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد" کے مصداق خود نمک نہ بن جائے۔ مطلب یہ ہے کہ وفاحت کی شاعری میں ایسا جادو ہے کہ پڑھنے والا دین و دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ "خواب دریچے" کا کوئی صفحہ ایسا نہیں کہ دامن کش دل نہ ہو۔ یہاں تک کہ شروع اور آخر کے خالی صفحات بھی پڑھنے والے کو بے حد متاثر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر علی خاں کے بعد [illegible] پر آئے۔ ایک خاں کے بعد دوسرے خاں کے آنے سے محفل [illegible] قسم کی [illegible] یہ کہنا چاہئے کہ یہ تقریباً [illegible] مزاج کا شعر [illegible] نثری نظم ہو سکتی ہے [illegible] شاعر نہیں ہو سکتا۔ [illegible] صاحب نے وفاحت کی شاعری کے بارے میں کچھ نہیں کہا کیونکہ وہ خود اپنی شاعری سے اتنے سیراب ہو چکے ہیں کہ دوسروں کی شاعری ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ انہوں نے صرف شاعرہ کی شخصیت نگاری

کی ادبی تاریخ میں ان کی طرح بیٹھنا کے شعبے سے تعلق رکھتی ہیں۔ منظر صاحب نے بھی جب کوشش کی کہ وہ موزوں شاعری سے پرہیز کریں تاکہ بیکاری کو فروغ ہو لیکن وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ نسیم کو اچھی شاعری کے حوالے سے منظر صاحب کی یہ دوسری ناکامی تھی پہلی ناکامی یہ تھی کہ وہ خود شاعر ہو گئے تھے اور وہ بھی اس طرح کہ شاعری ان کے لیے ذریعہ عزت بن گئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ پہلے عزت دار تھے اور شاعری کی ضرورت تھی نہ گنجائش بہرحال منظر صاحب کا جذبہ قابل ستائش ہے کہ وہ خود جس برائی سے نہ بچ سکے اس سے وہ دوسروں کو بچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

منظر صاحب نے جب یہ دیکھ لیا تھا کہ وضاحت نسیم شاعری چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہیں تو چاہیے تھا کہ وہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتے۔ لیکن منظر صاحب جب خلوص دل سے کسی کا دامن پکڑ لیتے ہیں، تو پھر چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اب انہوں نے مشورہ دیا کہ وہ اپنا دیوان چھپوا لیں۔ وضاحت نسیم نے یہ مشورہ فوراً قبول کر لیا کہ دیوان کی طباعت کا کام منظر صاحب نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ منظر صاحب کے مضمون کا بڑا حصہ شاعرہ کی شخصیت کے بجائے ان کے دیوان کی تصنیف کے بارے میں ہے۔ انہوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ کتابت سے لے کر جلد سازی تک کے مرحلے کس مشکل اور مشقت سے طے کیے گئے۔ منظر صاحب نے اس سلسلے میں جو محنت کی ہے، اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جلد ساز نے کتابیں تیار کر دیں تو انہیں ٹرک میں لادنے اور اتارنے کا کام بھی منظر صاحب کو کرنا پڑا۔ وضاحت نسیم خوش قسمت ہیں کہ ان کو منظر صاحب جیسا مخلص کارکن ملا۔ ورنہ ان کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا۔ تو اتنی محنت کے بعد دیوان کو شاعرہ کے بجائے خود اپنے نام سے چھاپ لیتا۔

اگر منظر صاحب اردو ادب کی تاریخ میں محض اس وجہ سے بھی یاد رکھے جائیں کہ انہوں نے وضاحت نسیم کا دیوان چھپوایا ہے، تو یہ خسارہ کا سودا نہیں ہو گا۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ منظر صاحب خود ہی اردو ادب کی تاریخ لکھیں یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ جو شخص کسی دوسرے کے دیوان کے نسخے ٹرک پر لادنے اور اتارنے کا کام کر سکتا ہے۔ وہ اردو ادب کی تاریخ بھی لکھ سکتا ہے کیونکہ یہ کام بھی بوجھ ڈھونے سے تعلق رکھتا ہے۔

شکیل شاہجہان کاشی

شادی کرکے دیکھ....؟

کیا تھا ـــــ بڑا ارمان تھا شادی کا ـــــ آج پورے دس سال ہوئے ہیں۔ یعنی شادی کی دسویں سالگرہ۔ ہم اپنی بیگم کو شادی کی سالگرہ کا دن تاریخ گزر جانے کے بعد ہی یاد دلاتے ہیں۔ وجہ صرف اتنی ہے کہ اس خطرناک دن کو بار بار منانا نہیں چاہیے۔ بیگم ناراض ضرور ہوتی ہیں لیکن ہم نے بچا لیا ہے۔ بیوی اور محبوبہ میں یہی فرق ہوتا ہے کہ غصہ ختم ہو جاتا ہے تو وہ الٹا شوہر کو مناتی ہے جبکہ ہر حال میں عاشق صاحب کو ہی محبوبہ کو منانا پڑتا ہے۔

ہاں! تو ہم کہہ رہے تھے آج شادی کی دسویں سالگرہ ہے۔ اب ہم یہ سمجھ چکے ہیں کہ انسان سوچ سمجھ کر منصوبے کے تحت جو غلطی کرتا ہے۔ اس کا نام شادی ہے۔ کاش یہی بات پہلے سمجھے ہوتے تو آج.......

شادی سے پہلے ہماری اچھی خاصی شہرت ہوئی تھی۔ اگر کسی خط میں صرف ہمارا نام اور شہر کا نام لکھ کر آجاتا تو وہ ہم تک پہنچ جاتا۔ لوگ ہمیں جانتے تھے، خالد اسد صاحب، لیاقت علی کے بیٹے ہیں، شوکت علی کے بھتیجے ہیں، نسیم اشرف کے بھائی ہیں وغیرہ۔ بڑا فخر تھا اپنی پہچان پر لیکن پھر اچانک تقدیر کی کایا پلٹی۔ ہماری آنکھوں میں شادی کے خوب صورت سپنے سجنے لگے دوست احباب کی ظاہری شادی شدہ زندگی کو دیکھ کر دل میں گدگدی ہوتی جب وہ اپنی بیوی کو لے کر سیر کے لیے نکلتے۔ اپنے ننھے منے بچوں سے مختلف شکلیں بنا کر باتیں کرتے، کھلاتے، بہلاتے۔ سسرال میں دعوتیں اڑاتے۔ سالیوں سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتے۔ کبھی روٹھ جاتے تو سسرال کے سبھی لوگ منانے آتے۔ کیا عزت۔ کیا آؤ بھگت۔ آہ آہ دل بے تاب نے ہم کو کسی فیصلے پر پہنچنے پر مجبور کر دیا۔

ہماری شادی بھی عجیب حادثے کے تحت ہوئی۔ ہمارے مکان کے کچھ ہی فاصلے پر ان کا مکان تھا، بلکہ یہ کہیے پڑوسی ہونے کے ناطے ہم اکثر ان کی طرف دیکھ لیتے۔ پھر ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔ یہ سلسلہ کافی دنوں تک چلتا رہا۔ مسکراہٹ کے وہ دن بڑے لکھ کے تھے۔ محبت کی ہلکی ہلکی چنگاری دل میں سلگ رہی تھی۔ پھر اچانک ایک دن ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں سات جنموں تک ساتھ نبھانے کے عہد و پیماں ہو گئے۔ پیار محبت کی بے شمار باتیں ہو گئیں

ع "ایک سہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ"

جذبات میں بہہ کر کیا کیا کہہ دیا۔ ملاقات کے دوسرے دن ہی ان کے والد محترم چار بزرگوں کے ساتھ ہمارے گھر

وارد ہوتے ۔ ہم پریشان "یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے"۔ لوگ تو برسوں ملتے رہتے ہیں پھر بھی کانوں کان خبر نہیں ہوتی ہماری ایک ہی ملاقات میں بات یہاں تک پہنچ گئی ۔ پتہ نہیں بیگم کے ابا حضور اور ہمارے گھر والوں کے درمیان کیا کیا باتیں ہوئیں ۔ بعد میں باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ ہمارا رشتہ محترمہ سے طے ہو گیا ہے ۔ ہم تجسس میں تھے کہ یہ سب کچھ اتنی جلدی کیسے ہو گیا۔

شادی ہوئی۔ سہاگ رات کو ہم نے بیگم سے پہلا سوال یہی کیا کہ "یہ سب کچھ کیسے ہو گیا"۔ بیگم نے بڑے اطمینان سے بتایا کہ ہماری ملاقات کے دوران جو باتیں ہوئی تھیں وہ ساری باتیں ابا جان کو معلوم ہو گئیں"۔

"تم نے کہا تھا" ہم نے بے چین ہو کر پوچھا

نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ مجھے نیند میں بڑبڑانے کی عادت ہے اور ہماری ملاقات کی ساری باتیں میں نے نیند میں کہہ دیں"۔

شادی کے بعد بیگم کی رات میں بڑبڑانے کی عادت جاتی رہی اور ہم کو دن میں بڑبڑانے کی عادت ہو گئی ۔

ہاں ! تو بڑی پہچان تھی ہماری شہر میں لیکن شادی کے بعد اس پہچان نے اپنا رخ بدل دیا۔ اب لوگ ہم کو دیکھ کر دوسروں سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں ــــــ "وہ دیکھو! عظیم بیگ کا داماد جا رہا ہے"۔ ندیم کا بہنوئی ہے ۔ اور عورتوں میں ہم زبیدہ کے داماد بن گئے اور جوان لڑکیوں میں سلمیٰ کے شوہر کا خطاب ملا ۔ ہماری تمام تر شناخت شادی کے بعد ختم ہو گئی ۔ کریں بھی کیا ۔ یہ رشتوں کا کرب ہے ۔ نئے رشتے پرانے رشتوں پر بھاری ہوتے ہیں ۔ دوستوں کی ظاہری شادی شدہ زندگی کو دیکھ کر ہمارے دل میں شادی کا خیال آیا تھا ۔ اب ہماری اپنی اندرونی زندگی کا حال سنئے ۔ صبح ہوتی ہے بیوی جھنجھوڑ کر اٹھاتی ہے ۔

"اجی! شکر نہیں ہے چائے کیسے بناؤں"۔

"کسی سے بھی بناؤ لیکن مجھے پریشان مت کرو"۔

"اجی! مٹی کا تیل بھی نہیں ہے"۔

"میں کیا کروں"۔

"دیکھو جی! ایسی بات مت کیا کرو۔ نہیں تو میرے دل میں آگ لگ جاتی ہے"۔

"تو اسی سے چائے بنا لو نا"۔ میں کہتا ہوں اور کروٹ بدل کر سو جاتا ہوں ۔ کروٹ بدلنے سے زندگی کے مسائل تو نہیں بدل سکتے ۔

دوسرے ہی لمحہ ہمارا منا روتے ہوئے آتا ہے ۔ "ابا جان بریڈ چاہیئے"۔

ہم اس کو سمجھاتے ہیں "بیٹا روٹی کو ہی انگریزی میں بریڈ کہتے ہیں ۔ اور روٹی ہمارے پاس ہے" لیکن بچہ برابر ضد کرتا ہے ۔ کیوں کہ وہ بریڈ اور روٹی کے فرق کو خوب جانتا ہے ۔

خیر بچوں کو ...

...ٹ چلتے ہیں۔ یعنی دس دن مشکل سے پڑتا ہے۔ اس کے بعد تنخواہ ملتے ہی ہاتھ آجاتی ہے۔ سیلاب اُمڈ پڑتا ہے۔ پیچھے
...سان اپنے دل کی اُمید پر ہی کچھ بُرے دن کاٹتا ہے۔

ہم کو ایک تجربہ یہ بھی ہوا ہے کہ شادی کر کے عورت محفوظ ہو جاتی ہے اور مرد غیر محفوظ ہو سکتا ہے کہ ہمارے ...ں تجربے سے سب متفق نہ ہوں۔ اب ہم بھی اپنی بیگم کے ساتھ سیر کے لیے نکلتے ہیں۔ اپنے ننھے منے بچوں سے مختلف شکلیں ...ا کر باتیں کرتے ہیں، کھلاتے ہیں، بہلاتے ہیں۔ سسرال میں دعوتیں اُڑاتے ہیں۔ سالیوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے ...ں۔ بدتمیز سسرال والے منانے آتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ بہت سے غیر شادی شدہ حضرات ہماری ظاہری شادی شدہ ...ندگی کو دیکھ کر رشک کرتے ہوں گے۔ ان کے دل میں بھی شادی کا خیال گدگدی کرتا ہوگا۔ ہم بھی مشورہ دیں گے۔ ...بے شک۔ شادی کیجئے......

عابدہ محبوب

مینارِ طنز و مزاح
ڈاکٹر شفیق الرحمٰن سے ایک ملاقات

خواب دیکھنا ایک انسانی فطرت ہے۔ اگر خواب مایوسیوں کی آگ میں تپ تپ کر شرمندہ تعبیر ہوں تو خواب کی تعبیر سامنے ہونے کے باوجود انسان سوچتا ہے کہ یہ خواب ہے یا حقیقت؟ ایسا ہی احساس مجھے ۱۲ مارچ ۱۹۸۵ء بروز چہارشنبہ ۱۱ بجے دن ہوا جب ہماری ٹیکسی پاکستان کے دارالخلافہ اسلام آباد میں "اکاڈمی ادبیات پاکستان" کی دو منزلہ صاف ستھری عمارت کے سامنے رکی۔ یہ دن ہمارے ادبی ذوق کی معراج کا دن تھا۔ اکاڈمی کے دفتر پر ہم یعنی میں میری کمرشیل آرٹسٹ بہن روحانہ آرسی اور میرے بھائی محمود علی خان (مقیم کراچی) اپنے دیرینہ پسندیدہ ادیب ڈاکٹر شفیق الرحمٰن سے ملنے آئے تھے جو اکاڈمی کے چیرمن بھی تھے۔

اکاڈمی کا دفتر اوپری منزل پر تھا، آٹھ یا دس سیڑھیاں طے کر کے ہم اوپر پہنچے اور RECEPTIONIST سے اپنا مدعا بیان کیا۔ اس نے اپنے آگے رکھا فون گھمایا اور بات کرنے لگا۔

" انڈیا سے کچھ لوگ آئے ہیں۔ کہتے ہیں فون پر آپ نے آج ملاقات کا وقت دیا تھا......... جی..... جی..... بہتر، یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا اور ہم سے یوں گویا ہوا۔

" چیرمن صاحب میٹنگ میں ہیں۔ آپ لوگ دس منٹ انتظار کریں"! صرف دس منٹ کی بات تھی مگر یہ دس منٹ بڑے صبر آزما بن گئے۔ ان دس منٹوں کے دوران مجھے وہ ساری بھاگ دوڑ یاد آگئی جو حیدرآباد (انڈیا) سے اسلام آباد (پاکستان) تک آنے میں ہوئی تھی۔ میں نے اپنی دانست میں یہی سمجھا تھا کہ شفیق صاحب لاہور ہی میں رہتے ہیں۔ مگر جب لاہور پہنچے تو غالب پبلیشرز نے فون پر بتایا کہ شفیق صاحب تو راولپنڈی میں رہتے ہیں اور ان کا آفس اسلام آباد میں ہے۔ انھوں نے ہمیں شفیق صاحب کے آفس کا پتہ اور فون نمبر دیا۔ ادھر ہم نے بھی سوچ لیا تھا کہ منزل پر پہنچ کر ہی دم لیں گے اور اب منزل پر پہنچ کر راہ کے کانٹے بھی پھول بن بن کر یاد آنے لگے۔

★ میں گھڑی گھڑی "گھڑی" دیکھ رہی تھی مگر اتنی دیر سے جلدی ہو ہی نہیں رہی تھی۔ مجھے فون کی گھنٹی کا انتظار تھا کہ جلد گھنٹی بجے اور ہمیں آفس میں بھیجنے کی ہدایت ملے...

کے اپنے آفس سے باہر تشریف لے آئے۔ یہ موصوف کی شخصیت کا بڑا پن ہی تو تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

"مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید"

★ (شفیق صاحب کے الفاظ کا استعمال)

سلام علیکم کے بعد بھائی صاحب نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"میں اور میری بہنیں آپ کی مداح ہیں۔ فی الحال یہ دو انڈیا سے آئی ہیں۔ ہمیں عرصے سے آپ سے شرف ملاقات کی خواہش تھی جو فطری بھی تھی اور لازمی بھی! اسی لیے آپ کا قیمتی وقت لیا۔"

"شکریہ! میرے لیے یہ مسرت کی بات ہے" موصوف نے مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "آیئے آفس میں بیٹھتے ہیں"

آفس میں بیٹھتے ہی شفیق صاحب نے پوچھا۔

"آپ لوگوں کو راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

بھائی صاحب بولے: "جی بالکل نہیں! ٹیکسی والا ہمیں صحیح لا رہا تھا۔ راستے میں ایک پوسٹ مین نے بھی ہماری رہبری کی۔ سیدھے آپ کے آفس پر آگئے! موصوف بتانے لگے "پہلے یہ آفس گرجا گھر کے قریب تھا۔ وہ علاقہ غیر آباد تھا اس لیے کم لوگ جانتے تھے۔ اب اس نئی عمارت میں آگیا ہے۔ اِدھر چہل پہل زیادہ رہتی ہے!

شفیق صاحب دیکھنے میں پاکستانی کم اور یورپین زیادہ لگتے ہیں۔ بزرگی کو بھی موصوف نے اپنے انداز میں ایسے اپنایا ہے کہ دیکھنے والے کو بے ساختہ یہ مصرعہ یاد آجائے ؎

آثار بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی

NAVY BLUE کلر کی پینٹ، MAROON کلر میں سفید چوکڑی کا شرٹ اور MAROON کلر کا ہی سوئیٹر موصوف کا سراپا بقول محمد خالد صاحب (شفیق صاحب کے عزیز دوست) "بچپنے کے محل سے محبت کا آئینہ دار" تھا۔ موصوف کے افسانوں کی رنگا رنگی، شگفتگی اور جاذبیت یقیناً موصوف کی شخصیت کا ہی حصہ ہیں۔

ایک سکنڈ کے توقف کے بعد شفیق صاحب نے پوچھا۔

"انڈیا میں آپ کہاں رہتی ہیں؟"

میں نے کہا "ہم لوگ حیدر آباد (دکن) میں رہتے ہیں!

شفیق صاحب کچھ یاد کرتے ہوئے بولے۔

"میں ۱۹۴۵ء میں بمبئی اور پونہ ہوتے ہوئے حیدر آباد آیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد فوج کا کچھ سامان پٹنہ میں لوٹانا تھا۔ آپ کا چار مینار ہے نا..... ہم اسی کے قریب ٹھہرے تھے۔ محلے کا نام میں بھول گیا"

میں نے سوال کیا "آپ دوسری جنگ عظیم میں فوجی ڈاکٹر کی حیثیت سے U.K گئے تھے؟"

بولے "ہاں .... اس وقت لندن شہر تو نظر ہی نہ آتا تھا۔ پورا شہر دھوئیں کے بادلوں سے گھِرا تھا۔ ہر طرف بربادی ہی بربادی تھی۔ میں نے تو سوچ لیا تھا کہ جنگ کی یہی رفتار رہی تو نوکری سے استعفیٰ دے ڈالوں گا۔

مذاق سے جنگ ختم ہوگئی"۔

رومانہ نے پوچھا "۱۹۴۵ء کے بعد آپ پھر حیدرآباد تشریف نہیں لائے؟

بولے "نہیں .... نہیں آسکا"!

میں نے کہا "زندہ دلان حیدرآباد" کی عالمی مزاح کانفرنس ۱۹۸۵ء کے لیے آپ کا نام سنا تھا اور کرنل محمد خان صاحب کا بھی۔ مگر آپ لوگ تشریف نہیں لائے؟

بولے۔ شرکت کی دعوت تو آئی تھی مگر ان دنوں یہاں ایک اہم سرکاری تقریب تھی اور اس تقریب میں میرا رہنا بہت ضروری تھا"!

اسی دوران آفس سے متعلقہ ایک صاحب نے کوئی لیٹر لاکر میز پر رکھ دیا۔ شفیق صاحب نے اسے پڑھا۔ (بغیر عینک کے) دو جگہ تصحیح بھی کی اور پھر ان صاحب سے بولے۔

"یہ لیٹر ٹائپ کرواکر آج ہی بھیج دیں"!

اب ہم نے شفیق صاحب سے ان کے کئی مزاحیہ مضامین اور خوب صورت اور پُراثر افسانوں کے بارے میں باتیں کرنی شروع کیں۔ موصوف کا سا شگفتہ انداز، بے ساختہ جملے، بات میں بات پیدا کرنے والے لطائف اور طنز و مزاح کا صاف ستھرا اور حسین امتزاج بہت کم تحریروں میں ملتا ہے۔ میں نے موصوف کے ایک ڈرامہ "ایک دفعہ کا ذکر ہے"! (کتاب "پرواز") کے بارے میں سوال کیا۔

"آپ کو ایسا انوکھا ڈرامہ لکھنے کا خیال کیسے آیا"!

پہلے مسکرائے اور پھر بولے۔

"ایک بار تیرنے گیا تھا۔ کسی نے بتایا کہ پانی میں مگرمچھ ہیں۔ باہر نکل آیا۔ قریب کے ایک گارڈن میں جاکر ان پر بیٹھ گیا۔ یکا یک پلاٹ ذہن میں آیا اور میں نے لکھ دیا"۔

بھائی صاحب نے پوچھا "کیا آپ اب بھی تیرنے جاتے ہیں؟

بولے "ہاں جاتا ہوں مگر گرمیوں میں"!

بھائی صاحب نے پھر کہا۔

"آپ نے دجلہ، نیل اور ڈینوب پر لکھا۔ سندھ پر بھی لکھیئے۔ یہ دریا شاندار ماضی بھی رکھتا ہے!

بولے "بعض دوست احباب نے بھی مجھ سے کہا تھا مگر میں ابھی سوچ رہا ہوں۔ یہ کام بہت وسیع رہے گا"۔

کتاب "مزید حماقتیں" کی ناولٹ "برساتی" کا ذکر آیا تو میں نے ملکہ ایلزبتھ دوم اور ڈیوک آف ایڈنبرا سے شفیق صاحب کی ملاقات کے بارے میں دریافت کیا۔

بولے "ہاں ..... میں مل چکا ہوں۔ ملکہ کی ایک گارڈن پارٹی تھی اور مجھے اس میں مدعو کیا گیا تھا"۔

گفتگو کے دوران دو بار شفیق صاحب نے افسوس کا اظہار کیا ... [illegible]

تگو:
د.: آپ کو ان کا سیٹ دے دیتا ـــــ !''

روماناؔ بولیں" ہمارے پاس آپ کی تمام کتابیں موجود ہیں !

بولے" میں نظرثانی شدہ ایڈیشن کے بارے میں کہہ رہا ہوں !

میں نے بتایا" نظرثانی شدہ ایڈیشن تو ہمارے پاس نہیں ہے ! (قارئین کی اطلاع کے لیے ـ بعد میں شفیق صاحب نے انڈیا کے پتے پر اپنی تصانیف کا نظرثانی شدہ ایڈیشن ارسال فرمایا۔

ہم نے نجی سوالات بھی پوچھے ـ موصوف نے اپنے والد مرحوم اور دو بھائیوں کے انتقال کے بارے میں بتایا۔ اپنے نوکر کا وہ قصہ بھی بیان کیا جس میں نوکر نے خط لکھ کر قرآن شریف اور رومی ٹوپی کی فرمایش کی تھی موہ بولتے رہے اور ہم سنتے رہے ـ موصوف کو سننا ہی ہمیں اچھا لگ رہا تھا۔ مجھے خالد صاحب کا وہ جملہ بھی یاد آگیا جو انھوں نے نقوش (لاہور) کے "شخصیت نمبر" میں شفیق صاحب کے بارے میں بالکل ٹھیک لکھا تھا کہ" میں کسی اور کو نہیں جانتا جس کی باتوں میں آتنی شگفتگی ہو۔"

باتوں باتوں میں' میں نے پوچھ لیا ـ

" سر ! آپ کے کتنے بچے ہیں ـ

بولے" آپ کو پتہ ہے ـ میں نے شادی بہت لیٹ کی سینتیس (۳۷) سال کی عمر میں ..... ! میری بیگم معا کالج میں پرنسپل ہیں ـ میرا ایک لڑکا ATHENS میں ہے دوسرا اسلام آباد میں M.B.A کر رہا ہے اور تیسرا لڑکا دراصل منجھلا لڑکا تھا وہ ایک حادثے میں گزر گیا ـ ہم تینوں کو یکدم شاک ہوا ـ ہم نے دلی دکھ کا اظہار کیا کہ انجانے غم کو پھر تازہ کر دیا۔ موصوف سنا رہے تھے ـ

" اس کی عمر انیس سال تھی۔ وہ بالکل میرا ذوق رکھتا تھا ـ پڑھنا لکھنا، تیرنا، ورزش کرنا، گھومنا پھرنا ...... کتابوں کا بھی اُسے بڑا شوق تھا' شفیق صاحب بتا رہے تھے اور میری نگاہیں مقابل کی کھڑکی سے نظر آنے والے کی طرف اُٹھ گئیں ـ وہ خدا تعالیٰ سے اس زیادتی کا شکوہ کر رہی تھیں کہ اس نے ایسا جانکاہ صدمہ ایسے انسان کیوں دیا جس نے اپنے لاکھوں قارئین کو قہقہوں کے خزانے دیئے ـ

وہ تو اچھا ہوا کہ ملازم چائے لے کر آگیا اور شفیق صاحب کی توجہ فی الوقت چائے کی طرف آگئی ـ مجھے چائے کی عادت نہیں ہے مگر شفیق صاحب کی پیش کردہ چائے میں نے " ادبی ٹانک" سمجھ کر پی لی۔"

میں اپنی پہلی* تصنیف "درد کے پیوند" موصوف کو پیش کرنے ساتھ لائی تھی ـ اس میں حیدرآباد کے فرقہ وارانہ فسادات ۱۹۸۴ء کے بارے میں حقائق پر مبنی مختصر کہانیاں' میں نے لکھی تھیں ـ لڑکے کا سانحہ کر میں نے کتاب کو پرس کے اندر رکھنا ہی بہتر سمجھا ـ مگر بھائی صاحب کو یکایک یاد آ گیا ـ بولے

---

* اپنی دوسری تصنیف " دھیان" ۱۹۸۸ء کا انتساب میں نے شفیق صاحب کے نام کیا ہے ـ

بنہ "تم نے شفیق صاحب کو اپنی کتاب نہیں دی"؟

،فرار کا راستہ ہی نہیں تھا۔ میں نے کتاب پیش کرتے ہوئے کہا ۔

" جناب میرے بھائی صاحب نے زندگی میں دو ہی کام اچھے کئے ہیں ۔ پہلا یہ کہ برسوں پہلے آپ کی کتابوں
ہ واقف کروایا تھا دوسرا یہ کہ آج آپ سے متعارف کروایا ! (شفیق صاحب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ بھائی صاحب
۔ رومانہ بھی اس میں شامل ہوگئے !)

میں کہتی گئی " آپ کی کتابیں پڑھ کر ہی مجھ میں لکھنے کا شوق پیدا ہوا ۔ مگر میں جز وقتی ادیبہ ہوں (
شفیق صاحب کا ہی ایک جملہ یاد آگیا) میری کہانیاں شاہکار تو نہیں ہیں ۔ مگر آپ کو پیش کرتے ہوئے مجھے دلی
مسرت ہو رہی ہے !

شفیق صاحب نے مسکراتے ہوئے کتاب لی اور ٹائیٹل دیکھتے ہوئے کہا ٹائیٹل خوب ہے ۔

میں نے بتایا " یہ ٹائیٹل رومانہ نے بنایا ہے ۔

رومانہ نے پسندیدگی کے لیے شفیق صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا " سر یہ ٹائیٹل تو میں نے ہی
بنایا ہے مگر IDEA عابدہ نے دیا تھا ۔

شفیق صاحب نے ٹائیٹل کے سفید حصے کو ہلکا سا کھرچ کر کہا۔ " یہ ابھرا ہوا لگتا ہے مگر نکلتا نہیں ....
عجب صورت لگتا ہے " موصوف کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے صفحہ (۷) پر رک گئے جہاں "پہلا درد" لکھا
ہوا تھا۔ میں نے فوراً کہا ۔

" یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ہر انسان اپنی پسندیدہ شخصیت کی تقلید کرتا ہے۔ "پہلا درد" اسی تقلید کا مظہر ہے
سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کا نام اپنی کتاب میں لانا چاہتی تھی !

شفیق صاحب مسکرائے اور بولے ۔

" آج کل لندن جانا کچھ مشکل نہیں رہا ۔ اس زمانے میں، میں نے دو چار کتابیں ایسی ہی پڑھی تھیں اس
لیے " مزید حماقتیں " کا دیباچہ ایسے لکھ دیا "!

کتاب کے اندر میں نے ایک پرچی رکھی تھی جس پر شفیق صاحب کی کتاب " لہریں " کا ایک "مضمون" ریویو"
کا جملہ کچھ کمی بیشی کے ساتھ اس طرح لکھا تھا ۔

" مکرمی ! آپ اس کتاب کو دیکھ کر یا چھو کر یا سونگھ کر ہی " ریویو " لکھ دیں تو باعث تشکر ہوگا !

شفیق صاحب پھر مسکرائے اور بولے

" میں ضرور لکھوں گا ..... مگر اس وقت تو وقت کم ہے ۔ آپ مجھے پتہ دے دیں " (موصوف نے
حسب وعدہ مجھے اپنی گراں قدر رائے سے نوازا جو " شگوفہ " ستمبر ۱۹۸۵ء میں صفحہ ۲۰ پر چھپ چکی ہے ۔

کسی بات پر کاتب کا ذکر آیا تو بولے " کسی بھی کتاب کی کتابت صحیح ہونی چاہیے ورنہ معنی اور لطف دونوں

بگڑ جاتے ہیں۔ کرشن (کرشن چندر صاحب) کی ایک کتاب میں کاتب نے بہت سی غلطیاں کر دی تھیں ایک جگہ تخیل
اس نے بخیل لکھ دیا تھا۔ کرشن کو بہت غصہ آیا تھا......"

یکایک شفیق صاحب کو کچھ یاد آیا۔ پوچھا۔

آپ یوسف ساجد کو جانتی ہیں؟

میں نے لاعلمی ظاہر کی تو بولے

"یہ صاحب یونیورسٹی آف حیدرآباد سے پی ایچ ڈی کے لیے مجھ پر کام کر رہے ہیں"۔

(حیدرآباد واپس آ کر میں نے اپنے پسندیدہ ادیب پر ریسرچ کرنے والے ادیب یوسف ساجد کو
آف حیدرآباد کے توسط سے ڈھونڈھ نکالا۔ اور آج یوسف ساجد کو مجھ پر اور مجھے یوسف ساجد پر ناز آتا ہے)

میں نے شفیق صاحب کو آٹوگراف بک دی اور درخواست کی کہ کچھ لکھیں۔ موصوف نے لکھا۔

"زہے روانیٔ عمرے کہ در سفر گزرد"

ہم نے موصوف کے ساتھ تصویر اتروانے کی خواہش کی۔ موصوف رضامند ہو گئے اس طرح کیمرہ کی آنکھ
اس مسرت بخش وقت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مقید کر لیا...... کیونکہ بقول ؎

ازیں نقش کز ما یاد ماند
کہ ہستی را نمی بینم بقائے

بھائی صاحب نے گھڑی دیکھتے ہوئے رخصت چاہی تو بولے۔

"اچھا تو آپ لوگ چل دیئے۔"

بھائی صاحب بولے "جی! ہم نے آپ کو زحمت دی۔ آپ کا قیمتی وقت لیا۔ اس کے لیے بہت بہت شکریہ"
ہم نے لاکھ کہا مگر شفیق صاحب خدا حافظ کہنے گراؤنڈ فلور تک آئے۔ ایک خوش رنگ پستئی کلر کی کار کی
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو کہاں جانا ہے؟ ڈرائیور چھوڑ آئے گا۔"

ہمیں اسلام آباد میں کئی جگہ گھومنا تھا اس لیے ہم نے موصوف کی اس پیشکش کا شکریہ ادا کیا اور
کے باہر آ گئے۔ باہر آتے ہی میں نے بھائی صاحب سے شکایتاً کہا۔

"آخر آپ کو رخصت لینے کی اتنی جلدی کیوں تھی؟"

بھائی صاحب حیرانی سے بولے "جلدی؟ تمہیں پتہ ہے ہم نے ایک گھنٹہ بیس منٹ سے ان کا......"

"حیرانی میں شفیق صاحب کا ہی ایک جملہ میری زبان سے نکل گیا۔

"سچ! اتنی جلدی اتنی دیر ہو گئی!"

مکرم ذیشان (حیدرآباد)

سرگزشت ڈبل کے میٹھے کی !

یہ تو انسان کی فطرت رئیسہ رہی ہے کہ جب بھی کسی چٹخارے دار چیز کا ذکر ہوتا ہے تو رہ رہ کر منہ میں پانی بھر آتا ہے ۔ بعض لوگ آداب محفل کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس پانی کو خون کے گھونٹ کی طرح پی جاتے ہیں لیکن چند حضرات ایسے بھی ہیں جو نہ صرف آداب کو بالائے طاق رکھتے ہیں بلکہ اکثر و بیشتر بے ادبی پر بھی کمربستہ ہو جاتے ہیں ۔ اپنی چھچھلانی زبان کو لٹکائے رال ٹپکائے جاتے ہیں جیسے بچھڑی ہوئی نسل سے تعلق رکھنے والا کوئی کتا ، قصائی کی دوکان کے آگے نہایت تپاک سے ڈھیر سارے ارمان لیے بیٹھا ہے ۔ جہاں تک اشیائے خورد و نوش کا تعلق ہے نت نئے ضابطوں کو روبہ عمل لاکر ہمہ اقسام کے پکوان سے دستر خوان کو سجانا اس سرزمین کا طرہ امتیاز رہا ہے ۔ یہ فرخندہ روایت آج کل کی نہیں بلکہ شہنشاہ جہانگیر کی ملکہ عالیہ نور جہاں کی ڈالی ہوئی بنیاد ہے ۔ دکن کی خواتین نے بھی ایسی ایجادات کی ہیں کہ اگر الفریڈ نوبل کی پیدائش حسن اتفاق سے یا حادثاتی طور پر ہندوستان میں ہوتی تو وہ اپنی زندگی کے تمام سرمایہ کو انھیں دریافتوں و ایجادات کے لیے مشغول کر دیتا اور آج ہندوستان کی سینکڑوں خواتین " نوبل لاریٹ " ہونے کا شرف رکھتیں ۔

باتیں تو اور بھی ہیں لیکن جہاں تک میٹھوں کا تعلق ہے وہیں ڈبل کے میٹھے کا تذکرہ ناگزیر ہو جاتا ہے ۔ دکن کی ابتدا سے ڈبل کے میٹھے کا جنم ہوا ۔ چونکہ کافی عرصہ بعد ایک لذیذ میٹھے سے اہل دستر خوان روشناس ہوئے تھے اس لیے اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی اور دن دوگنی ، رات آٹھ گنی ترقی کرتے ہوئے یہ حضرات شاہی دستر خوان کے ولی عہد بن گئے ۔ اب کیا تھا ہر شاہی دستر خوان پر اس کا ہی سکہ چلنے لگا ۔ نام سنتے ہی بڑے بڑے سورما تک اپنی رال ٹپکائے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ اکثر یہ دیکھنے میں آتا کہ دستر خوان پر ڈبل کے میٹھے کی آمد کے ساتھ ہی ارباب محفل آداب دستر خوان میں بلا جھجک اتنے ترمیمات کر گزرتے کہ جی کو سمجھنے سے پہلے ہی میٹھے کی طشت اپنی بے بسی کا گلہ کرنے لگتی ہے ۔ میٹھوں کے بادشاہ کو اپنی رکابی کی زینت بنانے کے لیے ہر کوئی سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ، بعض اوقات نوبت چھلانگ لگانے پر بھی آجاتی اپنے سے دور رکھے ہوئے طشت کو قریب کرنے کے اشتیاق میں لوگ صبر کے پارہ کو اتنا زیادہ گرا لیتے کہ گھٹنوں کے بل جھک کر میٹھے پر جھپٹنے سے بھی نہیں چوکتے اس دھینگا مشتی ... اور ... سالن میں ڈوبنے کا بھی خیال نہ رہتا ۔ بس ایک معرکہ سر کرنے کی دھن سوار رہتی ... جب ... تو نتیجہ انقلاب دستر خوان کے روپ میں ظاہر ہوا ۔ نومولود میٹھوں نے ... ذریعہ ایسا کردار ادا ... ڈبل کے میٹھے کی تائید و حمایت سے دستبرداری !

کرلی اور دل بدلی سے مرتکب ہوتے چلے گئے اور سینکڑوں برسوں سے حکومت کرنے والے اس میٹھے کو اپنے عہدہ جلیلہ سے مستعفی ہونا پڑا۔

اقتدار اعلیٰ سے بے دخل کر دیئے جانے کے بعد بھی ان کے پیروؤں لوگوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی لیکن وقت اور بخت کس کا ساتھ دیتے ہیں، یہہ کہاوت اس میٹھے پر خوب صادق آتی ہے۔ نئی نسل نے جب قدیم روایات کو نظرانداز کرنا شروع کر دیا تو ڈبل کا میٹھا بھی مایوسی کا شکار ہو کر گمنامی کے اندھیروں کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ اکثر یہہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا کہ وہ بھی کیا دور تھا جب اُسے بادام، اصلی زعفران اور پستہ سے سجایا جاتا۔

لیکن آج! بادام پستہ تو کجا کاجو تک اس کی آرائش کے لیے نصیب نہیں۔ مونگ پھلی سے بہلاتے ہیں، کھویا بھی قلیل مقدار میں ڈالا جاتا ہے۔ چاندی کا ورق زیب تن کرنے والا میٹھا آج جھوٹے ورق کو ترستا ہے۔ دسترخوان کے کسی کونے میں جہاں عموماً کوئی بچہ یا کوئی غیر معروف شخص ہو وہاں اس میٹھے کو جگہ دی جاتی ہے۔ دوسرے تمام میٹھے متعدد مرتبہ بٹرکرائے جاتے ہیں۔ لیکن یہہ بے چارہ چراغ سحری کی طرح ٹمٹاتا ہوا چُپ سادھے اپنی جگہ پڑا رہتا ہے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس جانب دیکھتا ہے جہاں وہ بھی کبھی ہوا کرتا تھا، پھر ایک سرد آہ کے ساتھ خاموش ہوجاتا ہے۔ اسی آہ و فغاں نے اسے شادی بیاہ سے کنارہ کشی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا اور آج کل زیارت و چالیسویں کے موقعوں پر اُسے زحمت دی جارہی ہے اور وہ بھی متعینہ و مقررہ مقدار میں۔ یہہ بھی شاید اس لیے کہ مظلوم کی دعا مرحوم کی مغفرت کا باعث بنے۔ لیکن یہ کون جانتا ہے کہ یہہ میٹھا فاتحہ خوانی کی محفل میں شریک ہو کر خود اپنی آخرت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ہر ترک خود کے آگے رکھی ہوئی چھوٹی سی پلیٹ میں گم سُم دنیا ومافیہا سے بے خبر ایک چھوٹی سی فریاد کو اپنے معصوم اور پُرسکون چہرے پر بکھیرے یہ آخرت کے لمحات گننے لگتا ہے۔ ●●

ادبی لطائف

اختر بستوی

دوستوں کی محفل سے

بُری عادت

بمبئی کے ایک فلمی ہفت روزہ کے ایڈیٹر صاحب کسی کام سے لکھنؤ آئے تو انھوں نے سوچا لگے ہاتھوں اپنے پرچے کے لیے مجاز لکھنوی سے ایک انٹرویو بھی لیتے چلیں۔ مجاز کے روزانہ کے معمولات کا پتہ لگا کر وہ شام کے وقت اُس ہوٹل میں پہنچ گئے جہاں مجاز اکثر بیٹھا کرتے تھے۔ انھوں نے اُن سے اُن کی پیدائش، عمر، تعلیم اور شاعری وغیرہ کے متعلق کئی سوالات کرنے کے بعد دبی زبان سے پوچھا "میں نے سنا ہے قبلہ کہ آپ شراب بہت زیادہ پیتے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟"

یہ سن کر مجاز صاحب یکایک بھڑک اٹھے اور تیز لہجے میں بولے "کس نامعقول نے آپ سے یہ کہا کہ میں شراب پیتا ہوں"۔

ایڈیٹر صاحب نے ہکلا کر کہا "تو کیا آپ شراب نہیں پیتے؟"

مجاز صاحب نے جواب دیا۔ "توبہ کیجیے حضرت۔ مجھے شراب سے دُور کا بھی واسطہ نہیں رہا ہے"۔

ایڈیٹر صاحب پر جیسے حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ چند لمحوں تک وہ بالکل ہکّا بکّا سے رہے پھر ڈرتے ڈرتے بولے "تو پھر آپ سگریٹ کثرت سے پیتے ہوں گے؟"

مجاز نے کہا۔ "جی نہیں میں سگریٹ بھی نہیں پیتا۔ شراب نوشی اور سگریٹ نوشی دونوں بہت ہی بُری عادتیں ہیں اور میں ایسی کسی بھی بُری عادت کا شکار نہیں ہوں"۔

ایڈیٹر صاحب نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں پوچھا "کیا واقعی آپ ایسی تمام بُری عادتوں سے مبرّا ہیں؟"

مجاز نے بہت ہی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "بس مجھ میں ایک ہی بُری عادت ہے۔ اور وہ یہ کہ میں جھوٹ بہت بولتا ہوں"۔ یہ سن کر ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور ایڈیٹر صاحب جھینپ گئے۔

اپنے منہ میاں مٹھو

ایک محفل میں سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی اور شوکت تھانوی یکجا تھے۔ منٹو اپنے افسانے "نیا قانون" کے محاسن پر روشنی ڈال رہے تھے۔ کافی دیر تک وہ اُس کی خوبیاں بیان کرتے رہے۔ اس دوران میں احمد ندیم قاسمی تو بیچ بیچ میں "ہوں" "ہاں" کرتے رہے لیکن شوکت تھانوی شروع سے آخر تک خاموش رہے۔ منٹو نے جب اپنی بات ختم کی تو قاسمی نے شوکت تھانوی سے پوچھا "کیوں بھئی شوکت صاحب آپ کس غور و فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں؟"

شوکت تھانوی نے جواب دیا "[illegible]"

سنا آیا تھا: "اپنے منہ میاں مٹھو بننا" اب سوچ رہا ہوں اِس محاورے کو بدل کیوں کر دینا چاہیئے "اپنے منہ میاں منٹو بننا"۔

فالتو اور پالتو

ایک پر لطف شام کو احمد جمال پاشا کے ڈرائنگ روم میں کچھ بے تکلف دوست جمع تھے۔ محفل میں علمی اور ادبی مباحثوں کے ساتھ ساتھ ہنسی مذاق کی باتیں بھی چل رہی تھیں۔ اتفاق سے وہاں ایک ایسے صاحب بھی بیٹھے تھے جن کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اُن کی نظر بار بار گھڑی کی طرف جا رہی تھی لیکن وہ اس ڈر سے اٹھنا نہیں چاہتے تھے کہ دوستوں کے مذاق کا نشانہ بننا پڑے گا۔ لیکن جب گھڑی نے رات کے نو بجا دیئے اور یاروں نے اُٹھنے کا نام نہ لیا تو وہ گھبرا کر بولے "مجھے تو اب آپ لوگ اجازت دیجئے"۔ ایک صاحب نے مُسکرا کر پوچھا۔ "کیوں حضرت ابھی تو صرف نو بجے ہیں۔ ابھی سے گھر جانے کا بھوت آپ کے سر پر کیوں سوار ہو گیا؟"

انھوں نے جھلّا کر جواب دیا۔ "میں بھی کیا آپ لوگوں کی طرح فالتو ہوں کہ ساری رات گھر سے باہر رہوں؟"

احمد جمال پاشا نے ہنس کر کہا۔ "جی نہیں جناب! خدا نہ کرے کہ آپ فالتو ہوں۔ آپ تو پالتو ہیں"۔

شعلۂ طور

جگر مراد آبادی کا مجموعہ کلام "آتش گل" جس زمانے میں شائع ہوا اُن کی صحت کافی خراب ہو چکی تھی اور انھوں نے مشاعروں میں شرکت کرنا چھوڑ دیا تھا لیکن گونڈہ کے ایک مشاعرے میں لوگ اصرار کر کے انھیں لے ہی گئے اور مسند صدارت پر بٹھا دیا۔ اُس مشاعرے میں ایک ایسے مقامی شاعر بھی موجود تھے جو جگر صاحب کے مخالف تھے اور خود کو اُن سے بڑا شاعر سمجھتے تھے۔ ڈائس پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں "آتش گل" کے چرچے ہو رہے تھے اور لوگ اس مجموعے کی غزلوں کا موازنہ جگر صاحب کے پہلے مجموعہ کلام "شعلۂ طور" کی غزلوں سے کر رہے تھے۔ اُن شاعر صاحب کو یہ باتیں بہت بُری معلوم ہو رہی تھیں اور وہ جلے بھنے بیٹھے ہوئے تھے کچھ دیر بعد جب اُن کے پڑھنے کا نمبر آیا اور وہ مائکروفون پر پہنچے تو اتفاق سے اُن کے سامنے لٹکا ہوا گیس بھبھک گیا اور اُس میں سے سرخ رنگ کی لپٹیں نکلنے لگیں۔ اُنھوں نے گیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی! ذرا کوئی اس "آتش گل" کو میرے سامنے سے ہٹاؤ۔ میری بوڑھی آنکھوں کے لیے اس کی روشنی ناکافی ہے"۔

جگر صاحب اِس جملے میں چھپے ہوئے طنز کو سمجھ گئے لیکن اُس وقت خاموش رہے۔ تھوڑی دیر بعد مشاعرے کے سکریٹری صاحب ایک نیا گیس جلوا کر لے آئے اور اُن کے سامنے رکھ دیا۔ جگر صاحب نے اُسے دیکھ کر فرمایا "لیجئے جناب اب لوگوں نے آپ کے سامنے "شعلۂ طور" لا کر رکھ دیا اس سے آپ کی نگاہیں ضرور خیرہ ہو جائیں گی"!

(بیسویں صدی اکتوبر ۱۹۶۴ء)

دس کے خط

مراسلے

مکرمی ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب۔

آداب

"شگوفہ" برابر مل رہا ہے۔ آپ کی توجہ کے لیے شکر گزار ہوں۔ شگوفہ آتا ہے تو زمین کی مسافت کم ہو جاتی ہے۔ اسلام آباد ٹیلی ویژن کا ایک پروگرام "مہمان خصوصی" کے عنوان کے تحت نشر ہوتا ہے۔ ایک پروگرام میں ہم مہمان خصوصی تھے۔ آپ کے لیے یہ بات دلچسپی کا باعث ہوگی کہ جب مجھ سے پوچھا گیا کہ کھلاڑیوں میں سے آپ کے لیے کس کھلاڑی کو مدعو کیا جائے تو میں نے اظہر الدین کی فرمائش کی۔ اظہر الدین تو نہ آسکے کہ وہ لاہور میں اس وقت کھیل رہے تھے۔ البتہ ان کا انٹرویو نشر کیا گیا۔ ہم نے ایک قطعہ ان کے لیے پڑھا۔

کھیل میں کیا خوب اک اسلوب تزئین آگیا
دل کی تسکین آگیا نظروں کی تمکین آگیا
"گیند بلے" میں دکن کے سانولے پن کا طلسم
آگیا۔ لو آگیا وہ اظہر الدین آگیا

احباب ۔ حمایت اللہ صاحب، نریندر لوتھر جی اور طالب خوندمیری صاحب تک ہماری تسلیمات۔

آپ کا

ضمیر جعفری (لاہور)

محترمی جناب مصطفیٰ کمال صاحب۔

امید ہے کہ جناب والا معہ شگوفہ و متعلقین شگوفہ کے بحمد للہ بخیر و عافیت ہوں گے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ میں جدہ میں بسلسلہ ملازمت فروکش ہوں۔ جناب مرزا شکور بیگ صاحب جدہ تشریف لائے تھے اور ان کے اعزاز میں ایک مخصوص نشست کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ۵۹ء یا ۶۰ء میں ان کو ایک مشاعرہ میں سنا تھا اس کے بعد اب یہ سنہری موقع ہاتھ آیا کہ ان کے معیاری کلام ظرافت نظام سے کچھ حاصل کرنے کچھ سیکھنے کو بھی ملا۔ موصوف کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ نے میری ایک نظم شگوفہ میں شائع کی تھی۔ موصوف نے یہ بھی تاکید فرمائی کہ شگوفہ کے لیے لکھتا رہوں کیونکہ یہ مزاح کا جریدہ ہے۔

سگار لکھنوی۔ جدہ

ماہنامہ شگوفہ کی روز افزوں شگفتگی، مخالفین و حامیانِ اردو کے خزاں رسیدہ چہروں پر بھرپور طمانچہ ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ آپ کا ادارہ نہ صرف زبان و ادب بلکہ تھکے ہوئے ذہنوں کے لیے بھی کسی ہمدرد دواخانے سے زیادہ متاثر کن اور نتیجہ خیز سعی مسلسل کیے جا رہا ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ یہ ایک مستحسن اقدام بھی ہے۔

آج کے اس شورش آلود اور فساد زدہ ماحول میں مزاح لکھنا اور مزاح پڑھنا ایک دل گردہ کا کام ہے۔

اقتیاز حیدر، بمبئی۔

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

عید مبارک

جلد ۲۳

شمارہ ۴

اپریل ۱۹۹۰ء

ایڈیٹر :-
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

سرورق : سعادت علی خاں ۔ کتابت : محمد غالب ۔ محمود سلیم اور دوسرے

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس ، چارکمان ، حیدرآباد ــــ ۲

فی پرچہ : ۵ روپے

زرسالانہ : ۵۵ روپے

لائبریریوں سے : ۶۰ روپے ،

بیرونی ممالک سے : ۱۸۰ روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ :

شگوفہ ، ۳۱۔ ٹیچرز کوارٹرز

معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

فون آفس 537716 فون رہائش : 521064

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مالِ مفت (انشایئے)

چورن (منظومات)

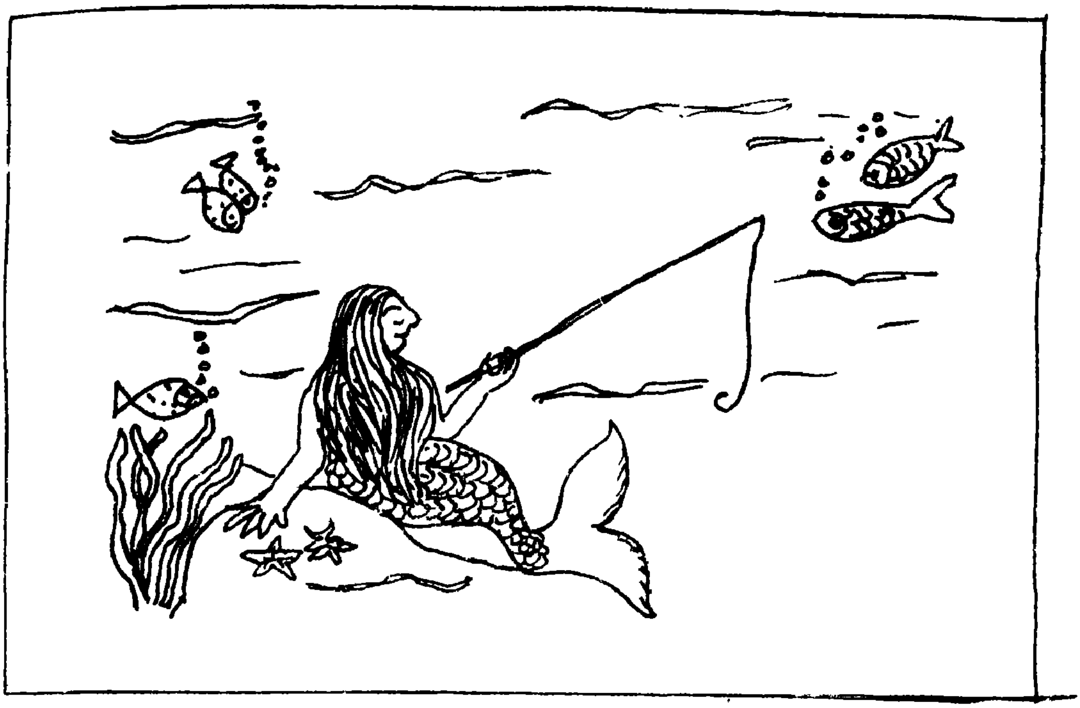
ہوائی کولمبس (سفرنامہ امریکہ)

اڑیں گے پرزے (خاکہ)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

قاضی جی دُبلے (رپورتاژ)

بال کی کھال (تبصرہ)



یوسف ناظم (بمبئی)

انٹرویو کے بیان میں

انٹرویو دو رخی راستہ ہے۔ یہ دیا بھی جاتا ہے اور لیا بھی جاتا ہے۔ اس کے محرکات، مجبوری، ضرورت، آرزو اور شوق ہوتے ہیں۔ دیئے جانے والے انٹرویو میں دو انٹرویو بہت مشہور ہیں۔ ایک تو روزگار کے لیے دیئے جانے والا اور دوسرا ضرورت رشتہ کے سلسلے کا انٹرویو۔ پہلے انٹرویو میں حاضر ہونا پڑتا ہے اور دوسرے میں خود کو پیش کرنا ہوتا ہے۔ دونوں میں تیاری ایک سی کرنی پڑتی ہے۔ بن سنورنا دوسرے انٹرویو میں ذرا زیادہ ہوتا ہے۔ ایک میں ذہانت کا امتحان ہوتا ہے اور دوسرے میں قد و قامت کا اور جسامت کا۔ پہلے انٹرویو میں اگر امیدوار زیادہ ذہین پایا گیا تو اُس کا ناکام ہونا یقینی ہے اور اگر انٹرویو اتفاق سے سرکاری ملازمت کے لیے ہے تو امیدوار کی ذرا سی بھی ذہانت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ دوسرے انٹرویو میں اگر نوجوان قد و قامت اور جسامت کے اعتبار سے مناسب معلوم ہوا وہاں کے متعلق یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ اس شخص میں ذمہ داری کا احساس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے تو یہاں انٹرویو لینے والوں کا پسپا ہونا یقینی ہے۔

ملازمت کا انٹرویو:-

اس انٹرویو میں کم سے کم ۳ ممتحن ہوتے ہیں اُن کے علاوہ ایک بیضوی میز بھی ہوتی ہے ممتحن میز کے شمالی یا جنوبی سرے پر نہیں بیٹھتے۔ درمیانی جگہ پر اپنا محاذ قائم کرتے ہیں۔ امیدوار کے لیے اپنے بالکل سامنے کی نشست مقرر کرتے ہیں تاکہ اُس کا پرونائل پوری طرح نظر آتا رہے۔ تینوں ممتحنوں کے بیچ میں جو شخص بیٹھتا ہے اُس کا درجہ باقی دو ممتحنوں کے مقابلے میں قدرے اونچا ہوتا ہے ویسے تینوں اشخاص امیدوار کی بیخ کنی کرنے میں برابر برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں۔ ان تینوں اشخاص میں سے کم سے کم ایک شخص کا مکمل سوٹ یا جودھپوری کوٹ میں ملفوف ہونا ضروری ہوتا ہے۔ دوسرے ممتحن کچھ بھی پہن سکتے ہیں۔ تینوں کا عینک (اپنی اپنی عینک) لگانا بھی ضروری مانا گیا ہے۔ عینک کی مدد سے انٹرویو لینا آسان ہوتا ہے۔ جس کسی کی بینائی زیادہ کمزور ہوتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ سوالات کرتا ہے اور اپنے سامنے رکھے ہوئے کاغذ پر اندراجات کرتے وقت دوسری عینک لگاتا ہے۔ پڑھنے کی عینک لگا کر جب وہ امیدوار کو دیکھتا ہے تو وہ دھندلا دھندلا نظر آتا ہے۔ یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔ ہر ممتحن کاغذ پر امیدوار کا نام پڑھنے کے بعد امیدوار سے اُس کا نام ضرور پوچھتا ہے۔ اس عمل سے ممتحن اپنے آپ کو گرماتا ہے۔ یہی کاروبار کھیلوں کے میدان میں بھی ہوتا ہے۔ ہر کھلاڑی باضابطہ میچ شروع ہونے سے پہلے اپنے آپ کو ضرور گرماتا ہے۔ میدان پر اتر کر ورزش کرتا ہے۔ کمر پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر مشرق اور مغرب کی سمتوں میں جھکتا ہے۔ کبھی کبھی سامنے کی طرف بھی جھکتا ہے اور بالکل

جاپانیوں کے انداز میں کورنش بجالاتا ہے۔ انٹرویو کے ممتحن چونکہ ذرا مہذب ہوتے ہیں اس لیے انھیں یہ سب کچھ کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ امیدوار اپنا نام پوچھے جانے پر تتراتا ہے۔ بار بار نام پوچھے جانے پر شرمانا ہی پڑتا ہے۔ اور اُسے یہ گمان گزرتا ہے کہ اُس کے نام میں کوئی نقص ضرور ہے جو ممتحنوں کی پریشانی کا باعث ہو رہا ہے۔

ہر امیدوار کی درخواست کے ساتھ اس کی "روداد حیات" بھی منسلک ہوتی ہے۔ یہ روداد جسے بائیوڈاٹا کا ثقیل عنوان دیا گیا ہے، بڑی محنت سے تیار کی جاتی ہے۔ یہ بہت خوش خط لکھی ہوتی ہے۔ اُمیدوار کو اپنی روداد حیات زبانی یاد ہونی چاہیے۔ جھوٹ آسانی سے یاد بھی ہو جاتا ہے۔

اگر کسی امیدوار کو انٹرویو دیتے رہنے کی اچھی خاصی مشق ہے تو کسی نہ کسی انٹرویو میں ممتحنوں کی زد سے اس کا بچ نکلنا کچھ بعید نہیں ہے۔ ایک خاص عمر تک پہنچنے کے بعد ممتحن کا پسیجنا فطری عمل ہے۔ ممتحن جتنے ضعیف ہونگے امیدوار اتنے ہی فائدہ میں رہیں گے بشرطیکہ جواب رقت انگیز ہو اور امیدوار کی آواز میں خفیف سی لرزش ہو۔ معمر بزرگوں کو اگر وہ کم پڑھے لکھے ہوں رقت اور لرزش بہت پسند آتی ہے ـــــ ایک انٹرویو میں جب امیدوار سے سوال کیا گیا کہ آپ یہ ملازمت کیوں کرنا چاہتے ہیں تو امیدوار نے پہلے بزرگ ممتحن کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور پھر رنجش بھری آواز میں جو جواب دیا وہ ناقابل بیان ہے لیکن یہ درد انگیز جواب سُن کر عمر رسیدہ ممتحن نے اپنے دوسرے دو رفقائے کار سے سرگوشی کی اور اس اداکار امیدوار کو منتخب کر لیا گیا ـــــ امیدوار اگر ممتحنوں کی نفسیات سے واقف ہے تو کامیابی اُس کے ہاتھ پاؤں اور قدم چومتی ہے۔ یہ سب تجربے کی باتیں ہیں ـــــ شاید ہی کوئی درخواست گزار ایسا ہوگا جو اپنے پہلے ہی انٹرویو میں سرخرو ہو گیا ہو۔ (ممتحن اتنے بھی گئے گزرے نہیں ہوتے۔

شادی کے لیے انٹرویو:۔

یہ پردکھاوا ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب اس انٹرویو کی بڑی اہمیت تھی۔ دربارِ خاص کی طرح اس کا اہتمام ہوتا تھا۔ پردکھاوے کے موقعہ پر مجمع بھی زرا زیادہ ہوتا تھا۔ ہر دو فریق کے مرد نمائندے بڑے رشتہ خطمی موجود رہتے تھے۔ خواتین پردے کے پیچھے سے جھانک کر متوقع نوشاہ کو دیکھنے کی کوشش کرتی تھیں اور بالعموم کسی اور کو دیکھ کر طے کرتی تھیں کہ یہی ان کا نوشاہ ہوگا۔ پردے کے پیچھے سے ان کی دبی دبی آوازیں دیوان خانے میں ضرور پہنچتی تھیں۔ کچھ رائیں نوشاہ کے کانوں میں بھی پہنچ جاتی تھیں اور کاجو کی برفی اُس کے حلق میں پھنسنے لگتی تھی۔ مزا آتا تھا۔ دولہے کو دیکھنے کے لیے اب اتنے انتظامات نہیں کرنے پڑتے۔ سب کچھ دیکھا بھالا ہوتا ہے۔ پردکھاوے ہوتے ضرور ہیں لیکن اب ان کی نوعیت کچھ اس طرح کی ہو گئی ہے جیسے ٹریڈ کمشنر کے آفس میں کوئی تجارتی معاہدہ ہو رہا ہو۔ بلدیہ کے دفتروں میں بھی سڑکوں اور عمارتوں کی تعمیر کے نرخ نامول (ٹنڈر) پر اسی طرح غور ہوتا ہے۔ اس سمپوزیم میں نوشاہ کی حیثیت ضمنی ہوتی ہے۔ سب کچھ بزرگ طے کرتے ہیں۔ اپنے اپنے مشیروں کے ساتھ کارنر میٹنگ بھی منعقد کرتے ہیں۔ منظر کسی ڈرامے کے اسٹیج کا ہوتا ہے۔ خواتین کی نمائندگی بھی علی الاعلان ہوتی ہے ـــــ شادی کی گفت وشنید

لیے بھی اب جگہ جگہ دفاتر قائم ہوگئے ہیں۔ ابلاغ و ترسیل میں اتنی آسانیاں پہلے نہیں تھیں۔ ان دفتروں میں فریقین
جو آگے چل کر رفیق حیات بنتے ہیں، کے تفصیلات، تصویروں کے ساتھ اس طرح موجود رہتی ہیں جیسے یہ دفتر دفتر عقد و عقدہ
ثانی نہ ہو کوئی پولیس چوکی ہو۔

شادی سے پہلے لڑکی والوں کے گھر میں محفل خواتین بھی منعقد ہوتی ہے جس میں فریق اول کے گھر کی مختلف سن
سال کی خواتین اور لڑکیاں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں۔ (نا کتخدا لڑکیاں بڑھ کر حصہ لیتی ہیں اور دوسری قسم کی خواتین
بھی کر) . . . . یہ محفل اصل میں محافل شادی کا نقیب
اجلاس ہوتا ہے جس کے صدارتی پینل میں نانیاں، دادیاں، پھوپیاں، خالائیں اور اس نوع کی دوسری مستورات شامل
ہو سکتی ہیں۔ لڑکے کی والدہ بھی اپنی بساط کے مطابق ان سب کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ لڑکیاں لیا تنٹ آف آرڈر اٹھانے
کا کام انجام دیتی ہیں (خود ان کا بھی نہیں انجام ہوتا ہے)۔ اب اس قسم کے انٹرویو کے چل چلاؤ کے دن ہیں بس اس کی آخری
رسومات ادا ہونی باقی ہیں ـــــ صرف اکیسویں صدی کی آمد کا انتظار ہے۔

ٹکٹ کے لیے انٹرویو:۔

یہ ایک نیا ٹکٹ ہے جس کا شوق سب کو تو نہیں لیکن بہتوں کو ہوتا ہے۔ اسی ٹکٹ کے سہارے آدمی الکشن میں
کامیاب ہو سکتا ہے۔ یہ ٹکٹ وطن عزیز کا سب سے اعلیٰ ایوارڈ ہوتا ہے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کی طرح آپ اسے بھارتیہ
ادبی ایوارڈ کا نام دے سکتے ہیں۔ جونہی ان ٹکٹوں کی تقسیم کا زمانہ آتا ہے ملک بھر میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔ ٹرینوں اور
بسوں میں بغیر ٹکٹ سفر کرنے والوں کا میلہ لگ جاتا ہے۔ ہوائی اڈوں پر اژدھام ہو جاتا ہے اور سیاسی جماعتوں کے صدر
دفاتر کے چاروں طرف دور دور تک درخواست گذار خانہ بدوشوں کی طرح ڈیرے ڈال دیتے ہیں۔ شہروں کا نظام رسل و
رسائل جو پہلے ہی سے ناگفتہ بہ ہوتا ہے مزید ناگفتہ بہ ہو جاتا ہے۔ غذائی صورت حال بھی متاثر ہوتی ہے۔ اس ٹکٹ کو حاصل
کرنے کے لیے صرف اپنی ایڑی چوٹی کافی نہیں ہوتی کئی اور ایڑیوں اور کئی اور چوٹیوں کا زور درکار ہوتا ہے۔ (چوٹی کا زور
زیادہ کام آتا ہے۔) ـــــ ٹکٹوں کی تقسیم کے بعد خود سیاسی جماعتیں بھی تقسیم ہو جاتی ہیں۔ سیاست اور بغاوت ساتھ
ساتھ چلنے والی وبائیں ہیں۔ انتخابات کے موقعہ پر ایک ہی نشست کے لیے درجنوں امیدوار کھڑے نظر آتے ہیں۔ پرچہ رائے
دہی کسی اخبار کا ضمیمہ معلوم ہونے لگتا ہے اور اگر سارے رائے دینے والے افراد اس پرچے کا مطالعہ پولنگ بوتھ پر کرنے
لگیں تو رائے دینے کا سلسلہ پانچ روزہ کرکٹ میچ کی طرح جاری رہے۔ اتنے بہت سے امیدواروں کی وجہ سے
انتخاب انتخاب نہیں ٹورنمنٹ معلوم ہونے لگتا ہے۔

سیاسی جماعتیں ٹکٹ دینے کے لیے ہر درخواست گذار کا ضابطہ انٹرویو لیتی ہیں جس میں درخواست گذار
کا سابقہ ریکارڈ دیکھا جاتا ہے۔ زیریں دنیا سے اس کے تعلقات کیسے ہیں، اس کے وسائل اور رسوخ کی نوعیت کیا ہے،
کتنے پہلوانوں کی مدد اسے حاصل ہے۔ اس کی مالی حالت اندرونی طور پر کیسی ہے ـــــ ان سارے امور کے علاوہ ایک
نکتہ بھی ہے جس پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ درخواست گذار کتنے مقدموں میں ماخوذ ہے۔ اس مضمون
میں جسے بھی سب سے زیادہ نمبر ملیں وہی درخواست گذار ٹکٹ کا مستحق قرار پاتا ہے۔ الیکشن کا ٹکٹ بادی النظر

میں صرف ٹکٹ ہوتا ہے لیکن اصل میں یہ گولڈن کارڈ ہوتا ہے ۔

(اس انٹرویو میں درخواست گذار کو میلے کپڑے پہن کر جانا ہوتا ہے لیکن یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے)۔

ادبی انٹرویو :- ادب ایک ڈھرے پر چل رہا ہے ۔ شاعری بھی ایک ہی ڈھرے پر چل رہی ہے لیکن کچھ لوگ مصلحتاً یہ خبریں پھیلاتے رہتے ہیں کہ ادب میں نئے رجحانات طلوع ہوئے ہیں ۔ یہی افواہیں ادبی انٹرویو کی تحریک کو تقویت پہنچاتی ہیں ـــــ ادبی انٹرویو کے لیے ایک سوال نامہ تیار کیا جانا ضروری ہے ۔ یعنی انٹرویو فی الفور ہوتے ہیں اور بعض بعد الغور ۔ بعد الغور انٹرویو میں تیار شدہ سوالنامہ متعلقہ ادیب کو دو یا تین ہفتے پہلے بھیج دیا جاتا ہے ۔ تاریخ مقررہ پر ایک ٹیپ ریکارڈر اور ذاتی کیمرے کی مدد سے انٹرویو کی صدابندی اور شبیہ کشی عمل میں آتی ہے ۔ انٹرویو ساز شخص اسے اپنی فرصت کے اوقات میں بار بار سن کر کاغذ پر منتقل کرتا ہے ۔ یہ انٹرویو پتھر کی لکیر ہوتا ہے اور ادیب اپنے کہے ہوئے الفاظ واپس نہیں لے سکتا ۔

ایک ادبی انٹرویو کئی مراسلوں مباحثوں اور مضامین کی پیداوار کا باعث ہوتا ہے ۔ ادب کی بقا اور ترقی اسی میں ہے ۔ جس زمانے میں انٹرویو کی تقاریب کا آغاز نہیں ہوا تھا ادب وقفے وقفے سے جمود کا شکار ہو جاتا تھا اور اگر بدقسمتی سے اس پر جمود طاری نہیں ہوتا تھا تو یہ مائل بہ زوال ضرور ہو جاتا تھا ۔ ہمارے یہاں زوال یافتہ ادب کا کافی ذخیرہ موجود ہے ۔ انٹرویو کی تحریک کی کامیابی ادب کو ہمیشہ رواں دواں رکھتی ہے اور ادیبوں کی شفقت کی وجہ سے یہ ہر روز پروان چڑھتا رہتا ہے ۔

ایک ہی ادیب کئی انٹرویو دے سکتا ہے ۔ مقامات الگ الگ ہونے چاہیں ۔ خیالات تو الگ ہوتے ہی ہیں ۔ سابقہ انٹرویو کی تردید کے علاوہ مراسلوں اور اعتراضات کے جواب کے لیے بھی تازہ انٹرویو ضروری ہوا کرتا ہے ۔ دوسرا انٹرویو نئے مسائل کی ولادت کا کام انجام دیتا ہے ـــــ ادبی انٹرویو ادب کی ایک صنف بن گیا ہے یا عنقریب اسے یہ درجہ حاصل ہونے والا ہے ۔ جوں ہی یہ مرحلہ طے ہوگا ادب میں تہلکہ مچ جائے گا ۔ ادبی دعوے دار اس ادعا کے ساتھ منصۂ شہود اور منظر عام پر آئیں گے کہ اس صنف کے آغاز کا سہرا انہیں کے سر باندھا جانا چاہیے ۔

ادبی انٹرویو عام طور پر سن رسیدہ اور کہنہ ادیبوں سے تماس) کیے جاتے ہیں اور ان سے ایک آخری سوال یہ کیا جاتا ہے کہ آپ نئے اور خورد سال ادیبوں کو کیا پیام دینا پسند فرمائیں گے ؟ اب تک اس قسم کے کوئی پچاس بیانات [illegible] ہو چکے ہیں ۔ یہ بھی ریسرچ کا ایک اچھا موضوع ہے ـــــ ریسرچ کی ڈاکٹریٹ کے تعلق سے ایک نکتہ جو کافی اہم ہے یہ ہے کہ جب ہم طبابت کی خواتین ڈاکٹروں کو لیڈی ڈاکٹر کہتے ہیں تو ادب کی خواتین ڈاکٹروں کو لیڈی ڈاکٹر کیوں نہیں کہہ سکتے ؟ ـــــ اس سلسلے میں بھی ایک انٹرویو کا بندوبست کیا جانا چاہیے ۔ ٭٭

قلمی معاونین اپنی تخلیقات صاف اور خوش خط، صفحہ کی ایک جانب لکھ کر ارسال فرمائیں ۔
مسودات پر پتہ ضرور لکھیں ۔

شفیقہ فرحت (بھوپال)

سب خیریت ہے

شہر الّو نگر کے محلہ گدھا نخاس میں کل شام جبکہ موسم بے حد سہانا اور منظر انتہائی پُر کیف تھا۔ فرقوں کے درمیان بڑے خوشگوار اور دوستانہ ماحول میں نازک سی جھڑپ ہوئی۔

فرقوں کے نام ہم اپنی دیسی پالیسی کے تحت نہیں لکھ سکتے لیکن آپ کی سوجھ بوجھ پر ہمیں پورا بھروسہ ہے۔ بھی کوئی دقت ہو تو کل ہم مرنے والوں کے نام شائع کر دیں گے۔

ہاں تو اس معمولی جھڑپ میں ہر عمر کے مردوں اور بچّوں نے بڑے جوش و خروش سے حصّہ لیا۔ خواتین ے کے پیچھے سے ہمت افزائی کرتی رہیں۔ کچھ دیر بعد اس کھیل میں پولیس بھی شامل ہوگئی۔ مرنے والوں تعداد اکاون (۵۱) اور زخمیوں کی تعداد پانچ سو ایک بتائی جاتی ہے۔ اگر یہ اعداد و شمار آپ کو پسند نہ آئیں تو ان میں حسب مرضی و حسب معیار کمی بیشی کی جا سکتی ہے۔ ہمارے خبر ناموں میں جمع، تفریق، ضرب، تقسیم ہر ایک کی گنجائش ہے۔

زخمیوں میں پولیس کا ایک جوان بھی شامل ہے۔ جس کی شہادت کی انگلی میں ہلکی سی خراش آگئی ہے۔ ویسے میڈیکل رپورٹ کے بعد یہ ثابت ہوا ہے کہ انگلی شہادت کی نہیں بلکہ چھنگلیا ہے۔ اور اس زخمی چھنگلیا سے ایک بوند خون بھی ٹپکا۔ اس کھیل کے دوران آتش بازی کے بھی شاندار مظاہرے ہوئے تقریباً پانچ ہزار جھگی جھونپڑیاں جلائی گئیں۔ لیکن افسوس کہ یہ نظارہ کوئی خاص ایکسائیٹنگ ثابت نہ ہوا۔ کیونکہ آگ جلد ہی بجھ گئی۔ نہیں فائر بریگیڈ بر وقت نہیں پہنچا۔ بلکہ وہ تو سرے سے آیا ہی نہیں۔ وہ شہر میں منزلوں اور افسروں کے باغ بغیچوں کے لیے پانی سپلائی کرنے میں مصروف تھا۔

آگ اس لیے فوراً بجھ گئی کہ خس و خاشاک کا جلنا کیا اور جلانا کیا۔ بھلا جھگی جھونپڑیوں میں ہوتا ہی کیا ہے۔! تماشا تماشا نہ ہوا۔

کرفیو لگا دیا گیا ہے اور "شوٹ ایٹ سائیٹ" کے "آرڈرس" دے دیئے گئے ہیں۔ اور فساد زدہ علاقے ملٹری کے جوان تعینات کر دیئے گئے ہیں جو ہر گلی کے نکڑ پر بیٹھ کے تاش کھیل رہے ہیں۔ لہذا جب یہ کسی کو دیکھیں گے نہیں تو ماریں گے کیوں۔؟ کس قدر امن پسند وادی ہیں یہ!

یوں پریشانی اور فکر کی کوئی بات نہیں۔ حالات پوری طرح قابو میں ہیں ——!!

اور سب خیریت ہے۔

مرنے والوں کے بچے کچھے رشتہ داروں کو اکیس اکیس روپیہ اور زخمیوں کو گیارہ گیارہ روپیہ دیئے گئے ہیں۔ بظاہر یہ رقم کچھ کم ہے یعنی (Below poverty line) غریبی ریکھا کے نیچے لیکن مجبوری ہے کہ حادثوں اور فسادات کی تعداد میں اس تیزی سے اضافہ ہورہا ہے کہ معاوضہ دیتے دیتے سرکاری خزانے خالی ہوچکے ہیں۔

دوسرے یہ کہ معاوضے کی لالچ میں دانستہ طور پر اور منظّم طریقہ پر حادثے اور فسادات کروائے جاتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ اگر کفایت شعاری اور سوجھ بوجھ سے یہ رقم خرچ کی جائے تو ایسی کم بھی نہیں۔ گیارہ روپیہ زخمی کے سفر خرچ کے طور پر دیئے گئے ہیں۔ جس سے وہ دراس کے بھرد بس میں بہ آسانی اور نہایت آرام سے اسپتال تک لنگ کے جاسکتے ہیں۔

اور اکیس ۲۱ روپیہ میں نیا نہ سہی سکنڈ ھرڈ ہینڈ کفن آہی جائے گا۔ د بزرگ کہہ گئے ہیں کہ کپڑا پھٹنے تک استعمال کرنا چاہیئے ۔ د

تو عرض یہ ہے کہ ہر طرح سے خیر ۔ یت ہی خیریت ہے ••!

نریندر لوتھر

قسط (۹)

آدھی خدائی کے پاس

سفرنامۂ امریکہ

ہوسٹن سے ہم سی ایٹل SEATTLE کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ شہر امریکہ کے شمال مغرب میں امریکہ۔ کینیڈا سرحد پر واقع ہے۔ یہاں بیگم کے بھائی رہتے ہیں اور ہندوستانی روایت کے مطابق یہ عین مناسب تھا کہ ایسی بیماری کے بعد سالے کو بہنوئی کی خدمت کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔

'ہوسٹن' ایر پورٹ پر جب ہم سکیوریٹی کے الیکٹرانک دروازے سے گزر رہے تھے تو الارم بجا۔ ہماری تلاشی لی گئی۔ کچھ نہ نکلا۔ دوبارہ پھر دروازے کے اندر گئے تو الارم چلّایا۔ وہاں کی انچارج خاتون افسر نے ہم سے پوچھا کہ آپ کے پاس دھات کی کوئی چیز ہے؟ ہم نے کہا ہمارا دل سونے کا تھا۔ اب اس پر امریکن سہاگا لگ گیا ہے' بالوں میں تھوڑی سی چاندی ہے، اور باقی صرف گوشت پوست کا پتلا ہیں۔

وہ مسکرائی۔ پھر اس نے ہمارا بٹوہ مانگا۔ یہ حسینوں کا پرانا شیوہ ہے۔ مسکرا کر لوٹتے ہیں اور تلوار کے بغیر قتل کرتے ہیں۔ ہم نے چپکے سے بٹوہ اس کے حوالے کردیا اس نے بٹوے سے ساری ریزگاری نکال کر ایک پلیٹ میں ڈال دی اور پھر ہمیں گیٹ سے گزرنے کو کہا۔ اب کی بار الارم خاموش رہا اس خاتون نے سارے سکّے واپس کرتے ہوئے کہا۔ یہ آپ کی دولت بول رہی تھی۔ ہم نے اپنی ساری پونجی سمیٹی۔ اپنے میزبانوں سے بغلگیر ہوئے اور جہاز کی طرف چل پڑے۔

دو ڈھائی گھنٹے کے بعد ہم سینٹ لوئی پہنچے۔ جس ہوائی کمپنی [illegible]

کے لیے اُڑان سینٹ لوئی سے ہو کر جاتی تھی اس طرح جو سفر دو گھنٹے میں طے ہوسکتا تھا اس کو سات آٹھ گھنٹے لگ جاتے۔ اُس سے کوئی بچاؤ نہیں تھا۔ اس طرح ہوسٹن سے سی ایٹل کی اُڑان میں تقریباً آٹھ گھنٹے لگنے تھے ہمارے ایک دوست نے ہمیں صلاح دی تھی کہ اِتنا لمبا سفر ایک ہی اُڑان میں طے کرنے کے بجائے ہم سینٹ لوئی میں ایک دن کا قیام کرلیں۔ اُس نے یہ بھی آفر کیا کہ وہاں اُس کے ہم زُلف ہمیں ایرپورٹ سے گھر لے جائیں گے: رات اپنے پاس ٹھہرنے کا انتظام کردیں گے اور اگلے دن ہمیں سینٹ لوئی کی سیر کرواکے جہاز پر چڑھادیں گے

نیکی اور پوچھ پوچھ! ہم رضامند ہو گئے۔

سینٹ لوئی کا ہوائی اڈہ بہت بڑا ہے۔

یہاں کے ایک شہری چارلس لنڈبرگ نے ۱۹۲۷ء میں اپنے ہوائی جہاز میں بحرِ اوقیانوس کو جو انگلستان اور امریکہ کے درمیان حائل ہے، پہلی بار ایک ہی اُڑان میں پار کیا تھا۔ اس معرکہ آرا اُڑان کی یاد میں ایرپورٹ پر " ہوائی اڑان کی تاریخ ــــ زمانۂ قدیم سے" ایک مستقل نمائش لگی ہوئی ہے۔ یہ نمائش ہر مسافر کو جبراً دیکھنا پڑتی ہے۔ ایرپورٹ کا ڈیزائن ہی ایسا ہے کہ بغیر یہ نمائش دیکھے، مسافر ایرپورٹ سے باہر نہیں نکل سکتا۔ امریکہ کے سفر کے دوران ہم نے یہ نمائش تین بار تفصیلی طور پر دیکھی اور سفر کے اختتام پر یہ حالت تھی کہ ہم ایک آدھ ہوائی جہاز خود بھی بنا سکتے تھے۔ اس نمائش میں جس جہاز نے ایک ہی اڑان میں پورا سمندر پار کیا تھا اور جس کا نام سپرٹ آف سینٹ لوئی 'SPIRIT OF ST. LOUIS' ہے۔ چھت سے لٹکایا ہوا ہے تاکہ دوسرے جہازوں کو عبرت ہو کہ ایسی حرکتیں نہ کریں۔ اس اُڑان سے پہلے انگلستان اور امریکہ کے درمیان ایک سمندر اور ایک مشترکہ زبان حائل تھی۔ اب دونوں ملکوں میں اختلاف کی وجہ صرف ان کی مشترکہ زبان ہی رہ گئی ہے۔ مزیدار بات یہ ہے کہ لندن سے نیویارک تک اڑان میں صرف ۱/۲ ۶ گھنٹے لگتے ہیں جب کہ نیویارک سے لندن تک ساڑھے سات گھنٹے۔

بمشکل تمام ہم نے اتنے بڑے ایرپورٹ کو پیدل پار کیا، باہر نکلے تو یک دم سردی اور بارش کا سامنا ہوا۔ ہوسٹن اور یہاں کے موسم میں وہی فرق تھا جو سردیوں میں مدراس اور دہلی میں ہوتا ہے۔

سینٹ لوئی میں ہمارے میزبان ایک بنگالی ڈاکٹر تھے۔ دسہرہ کے تہوار کی آمد آمد تھی۔ بنگالیوں کے لیے یہ سب سے اہم تہوار ہوتا ہے۔ شہر کے تمام بنگالی شام کو اکٹھے ہوکر اس تہوار کے پروگرام کی تیاری کرتے ہیں۔ جونہی ہم اپنے میزبان کے گھر پہنچے، اس کی بیوی یہ کہہ کر کہ میں ابھی آتی ہوں، غائب ہوگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس کی سولہ سترہ سالہ بیٹی آئی۔ آتے ہی وہ اپنے باپ پر برس پڑی۔ اس کے باپ نے اس کی طرف سے معافی مانگی، جو ہم نے فوراً دے دی۔

رات گئے تک میزبان کی بیوی واپس نہ آئی تو بیگم نے کہا میں کھانا بنا دیتی ہوں۔ میزبان نے اِدھر اُدھر ڈھونڈ کے آٹا دال مہیا کی اور بیگم نے اسی سے ایک شاندار کھانا تیار کردیا۔

کھانے کے بعد میزبان [illegible]

اور ساتھ ہی سخت سردی۔ اس پر بیگم نے کھڑکی کھولنے پر اصرار کیا۔ ہم نے اعتراض کیا اور اس طرح ہمارا پرانا جھگڑا ایک بار پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہر میاں بیوی کی اس بات پر تکرار ہوتی ہے۔ ایک کو سردی لگتی ہے تو دوسرے کو گرمی۔ ایک کھڑکی کھول کے سونا چاہتا ہے تو دوسرا بند کر کے۔ ایک پنکھا چلانا چاہتا ہے تو دوسرا اُسے بند کرنا چاہتا ہے ... ہمیں نہ جانے کیسے یہ خیال آگیا تھا کہ ہماری بیماری کی وجہ سے شاید چند دنوں تک ہمارا لحاظ کیا جائے گا۔ لیکن کئی معاملوں میں بیگم بہت اصول پسند واقع ہوئی ہیں۔ وہ رات ہم نے ٹھٹھرتے ہوئے اور جاگتے ہوئے گزاری۔ نیند کا جو تھوڑا بہت امکان تھا وہ بیگم کے خراٹوں نے ختم کر دیا تھا۔

وہاں کی سردی اور اپنے میزبانوں کی سرد مہری کو دیکھ کر ہم نے پو پھٹنے سے پہلے یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم وہاں سے فوراً چلے جائیں گے۔ ہمارے میزبان کو جب ہمارے اس نیک اِرادے کا پتہ لگا تو وہ خوشی سے پاگل ہو اٹھا اور بھاگ کر گیراج سے اپنی گاڑی نکال لایا۔

وہاں سے سی ایٹل تک کی اڑان چار گھنٹے کی تھی۔ دو گھنٹے کی اُڑان حقیقی اور دو گھنٹے کی اُڑان مجازی۔ یُونہی زبانی جمع خرچ کرنے والی بات کیوں کہ ہم مرکزی وقت سے مغربی وقت کے خطے میں جا رہے تھے۔ امریکنوں کی زندگی کا پتہ جانے کتنا حصّہ وقت کے زبانی حساب کتاب میں ضائع ہو جاتا ہے۔ ابھی تک ہم صرف مغرب کی طرف ہی جا رہے تھے اس لیے ہم اپنی اِس عمر سے پانچ گھنٹے زیادہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ یہ نقصان تو صرف امریکہ کے اندر کے سفر کا تھا۔ اگر ہندوستان سے چلنے کے وقت سے حساب لگایا جاتا تو ہماری عمر کا پورا ایک دن کم ہو چکا تھا۔ بچپن میں ایک شعر پڑھا تھا ؎

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

ایک آدھ گھڑی تو غریب سے غریب شخص بھی گنوانا گوارا کر سکتا ہے۔ لیکن ہمارا نقصان تو اِتنا ہوا تھا کہ تین ہفتے کے اندر پورا ایک دن منہا ہو گیا۔ ہم نے بیگم کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ ایک دن کے اکسٹرا بڑھاپے کی علامت ایک ہلکی سی جُھری کی شکل میں نمایاں ہو گئی تھی۔ شکر کا مقام تو یہ تھا کہ ہم حدِ مغرب تک پہنچ چکے تھے اور اس سے زیادہ وقت گنوانا ممکن نہیں تھا۔ اِسی لیے کئی لوگ امریکہ جاتے وقت اپنی بیویوں کو ہندوستان چھوڑ جاتے ہیں تاکہ وہ خواہ مخواہ بوڑھی نہ ہو جائیں۔ اسی وجہ سے امریکن عورتیں ہندوستان آتی ہیں تاکہ کم از کم ایک دن اور جوان ہو جائیں۔ لیکن وہ جو ایک دن یہاں آنے سے حاصل کرتی ہیں، واپس جانے پر کھو دیتی ہیں۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہماری زندگی کا جو ایک دن امریکہ جانے سے کم ہو جاتا ہے وہ لوٹنے پر واپس نہیں ملتا کیوں کہ یہ ایک قانون ہے کہ "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں"

اسی سلسلۂ خیال سے ایک اور فکر پیدا ہوئی۔ ہم اپنے سالے سے کئی برسوں بعد ملنے والے تھے۔ اس عرصے میں ہم کافی بدل چکے تھے جس کے علاوہ ایک اور دن کا غیر قدرتی بڑھاپا۔ نہ جانے وہ ہمیں پہچان پائے گا یا نہیں۔ بیگم پر یہ خدشہ ظاہر کیا تو انھوں نے دلاسہ دلایا۔ بولیں "بھائی اپنی بہن سے چاہے پچاس سال بعد

بھی ملے اُسے پہچان لیتا ہے۔ آخر خونی رشتہ ہے اور جب وہ مجھے پہچان لے گا تو میں تمہارا تعارف بھی کروا دوں گی۔

یہاں مناسب ہے کہ ہم اپنے سالے کا نام مزید راز میں نہ رکھیں بلکہ اُسے اس کے نام سے پکارنا شروع کردیں۔ آخر کب تک کوئی کسی سالے کو سالا کہتا چلا جائے۔ گالیاں دیتے دیتے بھی زبان اور قلم دونوں تھک جاتے ہیں۔ اور ویسے بھی اس قسم کے مضمون میں بدزبانی زبان ہوجانی چاہیئے۔ اُس کا نام ——— خیر چھوڑیئے نام کو۔ اب آپ سے تکلف کیسا۔ ہم اس کو لالی کہہ کر پکارتے ہیں اور آئندہ اُس کا یہی نام استعمال کیا جائے گا۔ اُس کی بیوی 'میزو رام' کی لڑکی ہے۔ اُس کا نام 'بیاکی' ہے۔

• آدھے راستے میں ہم نے فضا سے نیچے دیکھا تو برفانی پہاڑ نظر آئے۔ صبح کی خبروں میں ہم سُن چکے تھے کہ ملک کے اس حصے میں برف باری شروع ہو چکی تھی۔ ہمیں ویسے تو برف پسند ہے لیکن مشروبات میں۔ اور اس حالت میں ہمیں زیادہ سردی سے بچنے کے لیے تنبیہ کی گئی تھی۔

سی۔ ایٹل ہوائی اڈے پر اُترے۔ کسٹم کا چیک پاس ہی تھا گو ہمیں اُس میں سے گذرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہاں لکھا تھا 'یہاں مذاق کرنا منع ہے' غالباً انہیں ہمارا یہاں آنا پسند نہیں تھا۔ ہم نے اس اعلان کی وجہ پوچھی۔ جواب ملا کہ کئی مسافر ناحق مذاق کرکے ہمارا وقت ضائع کرتے ہیں اور ہمیں ان کی تلاشی لینے میں زیادہ وقت لگتا ہے۔ اس قسم کے مذاق ہندوستان میں عالمی مزاح کانفرنس کے بعد زیادہ ہوگئے تھے۔ ہمیں یہ سُن کر خوشی ہوئی۔

بیاکی اور اس کی بیٹی کیرولین ہمارے استقبال کے لیے حاضر تھے۔ اُنھوں نے بتایا کہ سخت برفباری کی وجہ سے لالی جو کیلیفورنیا گیا ہوا تھا کہیں راستے میں ہی پھنس گیا ہے اور غالباً شام تک آجائے گا۔

سارا شہر برف کی چادر لپیٹے ہوئے تھا۔ برفباری جاری تھی۔ شاید شہر کو چادر کی نہیں کمبل کی ضرورت تھی۔ ایک گھنٹے کے بعد گھر پہنچے۔ سب سے پہلے اُن کے کُتے "جوجو" نے پیار سے بھونک بھونک کر ہمارا استقبال کیا۔ "جوجو" سے ہماری جان پہچان پرانی تھی۔ وہ اُس وقت بھی لالی کے پاس تھا جب وہ ہندوستان میں تھا۔ اتنے برسوں کے بعد اُس نے بڑی آسانی سے ہمیں پہچان لیا اور تب تک بھونکنا بند نہیں کیا جب تک ہم نے اُسے گود میں لے کر ایک دوسرے کو چوما چاٹا نہیں، پیار کرنا اور کروانا انسان کو جانوروں سے سیکھنا چاہیئے ہمیں 'جوجو' کے استقبال سے یہ بھی تشفی ہوئی کہ جب کتے نے ہمیں پہچان لیا ہے تو مالک بھی انکار نہیں کرے گا

اُس خوب صورت گھر میں ہمارے لیے ایک کمرہ تیار کر کے رکھا ہوا تھا۔ کمرے میں بستر بھی تیار تھا ہم فوراً اس میں گھس گئے اور گھر کی بنی ہوئی گرم گرم چائے سے لُطف اندوز ہوئے۔ شام کو لالی اور اس کا بیٹا بھی آگئے۔ لالی نے شمپین کی بوتل کھولی۔ خاص گلابی شمپین۔ اور سب نے ہمارے لیے جام صحت پیا۔

باہر برفباری جاری تھی۔ اس سال پچھلے چالیس برسوں میں سب سے زیادہ اور موسم کے لحاظ سے وقت سے پہلے ہی برف باری شروع ہوگئی لیکن یقین مانئے اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں تھا۔

سی۔ ایٹل پہنچنے کے دو دن بعد ہی ہمارے دائیں پاؤں میں سوجن آگئی اور اس کے ساتھ ہی سخت درد

یہ غالباً گٹھیا کا حملہ تھا۔ ہمیں یہ بیماری پہلے ہو چکی تھی۔ اس لیے ہم نے فوراً ڈاکٹر کو بُلانے کو کہا۔ لالی نے کہا امریکہ
میں ڈاکٹر گھر پر نہیں آتے۔ اُن کے پاس جانا پڑتا ہے اور یہ بڑا جان جوکھم کا کام ہے۔ سرکاری ہسپتال نام کی کوئی
چیز امریکہ میں نایاب ہے۔ مریض کو پرائیویٹ ہسپتال جانا پڑتا ہے۔ وہاں بیماری کی تشخیص ہوتی ہے اور پھر ڈاکٹر
فیس لے کر نسخہ دیتا ہے۔ نسخے کے بغیر کوئی دوا فروش دوا نہیں دیتا۔ نسخہ حاصل کرنے کے لیے
دو ڈھائی سو ڈالر یعنی تقریباً تین ہزار روپے لگ جاتے ہیں۔ امریکہ میں تو لوگوں کو اس بات کی فکر نہیں ہوتی۔
کیوں کہ ہر شخص کی انشورنس ہوتی ہے اور خرچ کا بیشتر حصّہ انشورنس کمپنی دیتی ہے لیکن ہمیں تو یہ خرچ خود
برداشت کرنا تھا۔ ہم نے لالی سے کہا کہ اُسے ابھی تک کسی ڈاکٹر سے دوستی کر لینا چاہیئے تھی لیکن اب کیا ہو سکتا
تھا؟

ناچار ہم نے ہوسٹن میں اپنے پُرانے ڈاکٹر کو فون کیا۔ اُس نے کہا دوائی کا نام تو میں بتا دیتا ہوں
لیکن بغیر نسخے کے کوئی دوا دے گا نہیں۔ ہم نے کہا نسخہ بھیج دو، اُس نے جو جواب دیا اُس سے ہماری حیرانی
کی انتہا نہ رہی۔ اُس نے بتایا کہ امریکہ میں ایک ریاست کے رہنے والے ڈاکٹر کا نسخہ صرف ہمسایہ ریاست
میں چل سکتا ہے۔ دوسری ریاستوں میں تسلیم نہیں کیا جاتا۔ یہ موقع بحث کرنے کا نہیں تھا۔ ہم نے کہا آپ
دوائی ہ جہاز کے ذریعہ بھیج دو۔ اُس نے کہا کہ جب تک دوائی پہنچے گی حالت اور بھی ابتر ہو جائے گی۔

ہمیں اس صورتِ حال پر جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، حیرانی ہوئی۔ اس کے باوجود غصّہ بھی آیا اور
آخر میں اپنی بے بسی پر رونا بھی۔ دُنیا کا سب سے امیر ملک ہونے کے باوجود یہاں ہم جیسے غریب شخص کو طبّی
امداد نہیں مل رہی تھی۔ اس کے برعکس ہندوستان جیسے غریب ملک میں امیر سے امیر شخص بھی کسی بھی سرکاری
ہسپتال میں مفت علاج کروا سکتے ہیں۔ اب ہم پر ظاہر ہوا کہ نہ صرف امیر لوگوں کا بلکہ امیر ملکوں کا دل بھی
پتھر کا ہوتا ہے۔ ایک ملک کے دل کے لیے اتنا بڑا پتھر نہ جانے یہ لوگ کہاں سے لاتے ہوں گے (ایسے سوال
تو بعد میں بھی حل کئے جا سکتے ہیں) اور یہ بھی واضح ہوا کہ سرمایہ داری کی پالیسی اتنی سنگدل اور سنگلاخ کیوں
ہوتی ہے۔ ہمیں ایک دم ہندوستان بہت پیارا لگنے لگا اور دل میں آیا کہ فوراً اڑ کر (ہوائی جہاز پر نہیں، اپنے
پروں پر) واپس چلے جائیں۔ علامہ اقبال نے ٹھیک ہی کہا تھا ؎

"سارے جہاں سے اچھا، ہندوستاں ہمارا"

ہمارے دل میں دیش بھگتی کے جذبات اُمڈ آئے، آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہمارا دل ترنگے جھنڈے
کو سلام کرنے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ لیکن لالی کے پاس ترنگا جھنڈا بھی نہیں تھا۔ ہر طرف سے مایوسی کا سامنا
ہو رہا تھا۔

ہم نے آنسو روکنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد احساس ہوا کہ یہ آنسو دیش بھگتی
کی وجہ سے نہیں بلکہ درد کی وجہ سے آ رہے تھے ہم نے لالی سے کہا ہمیں باہر لے چلو۔ ہم ڈاکٹروں کے پاس
جا کر التجا کریں گے۔ اگر انھوں نے ہماری بات نہ مانی تو ہم ستیہ گرہ کریں گے لیکن اس طرح سوچتے ہوئے

پاؤں لے کر مرنا ہمیں گوارا نہیں۔

ہم سب لوگ فقیروں کی ایک ٹولی کی طرح چل پڑے۔ ہم اس ٹولی کے ہیرو تھے۔ بڑی مشکل سے لنگڑا لنگڑا کر چل رہے تھے۔ جہاں بھی گئے ٹکا سا جواب ملا۔ کئی لوگ تو ہماری طرف ایسے دیکھا کئے جیسے ہمارا دماغ خراب ہوگیا ہو۔ کئی رحمدل خدا ترس ڈاکٹروں نے ہمیں "بابا معاف کرو" کے انداز میں چلتا کر دیا۔ بالآخر ہم ایک ایسے کلینک پر پہنچے جس میں ایک معصوم سا نوجوان جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ ہم نے اپنا ماجرا بیان کیا۔ "بیماری کے تمام کاغذات دکھائے۔ سینہ پھاڑ کے دکھانے ہی والے تھے کہ اُس لڑکی نے کہا بس' بس مجھے آپ پر یقین آگیا۔ ایسا مخلص مریض میں نے امریکہ میں آج تک نہیں دیکھا۔ میں نسخہ لکھے دیتی ہوں اگلے موڑ پر جو پہلی دکان ہے وہاں سے دوائی مل جائے گی۔ یہ کہہ کر وہ غائب ہوگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد مسکراتی ہوئی آئی اور ہمارے ہاتھ میں نسخہ تھما دیا۔ ہماری حالت واقعی زار لگی ہوگی کیوں کہ اُس نے امریکن ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی ہماری مدد کی اور فیس لینے سے بھی انکار کر دیا۔

ہماری آنکھوں میں پھر آنسو آگئے۔ آج کوئی بار بار ملہار راگ چھیڑ رہا تھا۔ یہ ممنونیت کے آنسو تھے۔ ہمیں ایک دم پھر سے امریکہ اچھا لگنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے امریکی جھنڈا لہرانے لگا۔ ہندوستان بھول گیا۔ وہاں کی غلاظت، بھوک، غریبی، بیماری، سب کو ہم نے اپنے دل و دماغ سے نکال پھینکا۔

علامہ اقبال نے یونہی کسی وقتی جذبے کے تحت شاید گنگھیا کے جلسہ کے دوران ایک نظم لکھ دی تھی۔ "سارے جہاں سے اچھا ...." کیا انھوں نے امریکہ دیکھا بھی تھا؟

دوا خرید کر ہم گھر آئے تو جان میں جان آئی۔ فضا پُرامید لگنے لگی۔ درد کچھ کم ہوا، سوزش گھٹنے لگی۔ برفباری رُک گئی۔ آسمان پر ایک خوبصورت سی قوسِ قزح نمودار ہوگئی۔

آپ کو یاد ہوگا ہمیں صلاح دی گئی تھی کہ ہم ہر روز جتنی ہوسکے سیر کریں۔ اس برفانی موسم میں سڑکوں پر سیر کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ہم نے یہ طریقہ نکالا کہ شام کے وقت کسی ڈپارٹمنٹ سٹور چلے جاتے جب تک لالی اور دوسرے لوگ وہاں شاپنگ کرتے ہم وہاں کے دو تین چکر لگا کر اپنی سیر پوری کر لیتے۔ یہ تو ہم آپ کو پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ وہاں کے سٹور کتنے بڑے ہوتے ہیں۔ غالباً وہ ہمارے جیسے کیسوں کو دھیان میں رکھ کر ڈیزائن کئے گئے تھے۔ ہم اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ کسی دکاندار نے ہمارے اس طرح سیر کرنے پر اعتراض نہیں کیا بلکہ کئی بار تو ہمارا لنگ دیکھ کر دکاندار نے ہمیں وہاں بیٹھ کر آرام کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ ہم اس کے جواب میں کوئی نہ کوئی چھوٹی موٹی چیز خرید لیتے اُسے اگلے دن واپس کر آتے۔

امریکہ میں ہر چیز کی بہتات ہے۔ اگر ضرورت ایجاد کی ماں ہے تو امریکہ بیٹیوں کا ٹک ہے۔ کئی ایسی چیزیں، ہتھیار، اوزار، آرائش کے سامان، کھیل کود کے ذرائع، کاریں، دوائیں جن کا ہمیں کبھی خیال بھی نہیں آسکتا تھا۔ ہمیں وہاں دیکھنے کو ملیں۔ کئی تو ایسی چیزیں دیکھنے کو ملیں جن کو دیکھ کر

ضرورت یاد آئی اور ہمیں حیرانی ہوئی کہ ہم اب تک اُن چیزوں کے بغیر زندگی کیسے گزار رہے تھے ۔ جو شخص بھی ایک بار کسی بڑے ڈپارٹمنٹ اسٹور میں داخل ہوتا ہے وہ وہاں سے باہر نکلنے پر بدلا ہوا شخص ہوتا ہے ، وہاں داخل ہونے سے لے کر گھر واپس پہنچنے تک ہر قسم کی ضرورت سہولت اور فضولت وہاں دستیاب ہوتی ہے۔ سودا سلف خریدتے خریدتے آپ تھک جائیں تو چائے خانہ کو موجود پائیں گے ۔ خرید و فروخت کرتے وقت بچے تنگ کریں تو اُن کے کھیل کود کا سامان وہاں مل جائے گا ۔ کوئی حاجت ہو تو اس کو رفع کرنے کے ذرائع حاضر رہیں گے ۔ معذور لوگوں کے لیے کار پارک کرنے کا ، ٹائیلٹ کا ، چیزیں چُننے کا ، پیسہ دینے کا علٰحدہ انتظام ہے ۔ آپ نے اندازے سے زیادہ چیزیں خرید لی ہوں تو کوئی بات نہیں ، فوراً آپ کا کھاتہ کھول دیا جائے گا اور آپ کو اُدھار دے دیا جائے گا ۔ ہندوستان میں اُدھار کو محبت کی قینچی مانا جاتا ہے امریکہ میں اُدھار محبت کا " سیلو ٹیپ " ہے یا گوند ہے ۔ ہندوستان میں ہر دکان پر ' آج نقد اور کل اُدھار ' کے نوٹس لگے ہوتے ہیں اور پھر اُس کے نیچے یہ وضاحت بھی کر دی جاتی ہے کہ کل کبھی نہیں آتا ۔ امریکہ میں انسان اپنے آپ کو رئیس سمجھ بیٹھتا ہے اور پیسہ نہ ہونے پر بھی شاپنگ جاری رہ سکتی ہے ۔ بل چکانے کے لیے بھی ' کیو ' اور ان میں سے کئی ' ایکسپریس کیو ' ہوتے ہیں ۔ بل دینے کے کاونٹر کے پاس ہی چاکلیٹ رسالے ، کیسٹ اور بچوں کی من پسند چیزیں ہوتی ہیں تاکہ آخری وقت بچے ضد کرنا شروع کر دیں کہ ہمیں فلاں چیز لے دو تو وہ آسانی سے مل جائے ۔ امریکیوں نے واقعی انسانی خصلتوں کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے اور اُسے للچانے اور لبھانے کے لیے ہر طرح کے ذرائع استعمال کئے ہیں ۔ وہاں کے سٹوروں میں جانا بذاتِ خود ایک تعلیم ہے ۔ ہماری تعلیم میں جو کمی رہ گئی تھی وہ ہم نے وہاں کے سٹوروں میں جا کر پوری کی ۔

لالی جرمن کار " مرسیڈیز بنز (MERCEDES - BENZ) کا کاروبار کرتا ہے امریکہ میں یہ کار رکھنا سٹیٹس سمبل مانا جاتا ہے اور جس کے پاس یہ کار ہو وہ خود اپنے آپ سے مرعوب ہو جاتا ہے ۔ وہاں کاروں کے سوداگروں کو ایک نمبر پلیٹ پر اپنی مرضی کے مطابق کچھ بھی لکھوانے کی اجازت ہوتی ہے ۔ لالی نے اپنی مرسیڈیز کار پر " مہاراجا " لکھوایا ہے ۔ اس سے اس کا رعب اور دبدبہ دوگنا ہو گیا ہے ۔ ہم جب بھی اُس کار پر جاتے تو کئی لوگ ہمیں گھور گھور کر دیکھتے کہ یہ کون سے مہاراجا کا خاندان ہے ۔

امریکہ میں کاریں ایسے پھرتی ہیں جیسے ہندوستان میں کُتے لیکن ہمارے کُتوں کی طرح وہ بھونکتی نہیں ۔ وہاں کی کاروں کی تعداد ، سائز اور رفتار ہمارے کتوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے ۔ وہاں کی کاریں خاموش بھاگتی پھرتی ہیں ہم نے پوچھا کہ امریکن کاروں میں ہارن کیوں نہیں لگائے جاتے ۔ جواب ملا کہ وہ ہندوستان اکسپورٹ کر دیئے جاتے ہیں ۔ ہارن کے بجائے وہاں کاروں کی بریک استعمال کی جاتی ہے ۔ ہمیں ایک بار لالی نے اپنی کار کا ہارن بجا کر سنایا لیکن اس وعدہ پر کہ ہم امریکہ میں کسی کو بتائیں گے نہیں کہ اُس نے کار میں ہارن لگوایا ہوا ہے ۔ لالی کے سولہ سالہ بیٹے کو بھی کاروں کا بہت شوق ہے ۔ وہ کاروں کے متعلق اتنا کچھ جانتا ہے کہ دُور سے دیکھ کر ہی بتا سکتا ہے کہ کار چل رہی ہے یا کھڑی ہے !

امریکہ میں ہر کنبہ کے پاس کم از کم دو کاریں ہوتی ہیں۔ غریب لوگوں کے پاس صرف ایک ہی کار ہوتی ہے۔ نمبر کے علاوہ کار کی پلیٹ پر آپ کچھ اور بھی لکھوا سکتے ہیں جس کے لیے اکسٹرا لائسنس کی رقم دینا پڑتی ہے۔ ایک عورت نے اپنی اُس کار پر جو اس کے خاوند کو اُسے طلاق پر دینی پڑتی تھی، "یہ لکھوایا تھا" اُس کی تھی"۔

وہاں ہر ریاست کے نام کے علاوہ اُس کا لقب بھی ہوتا ہے۔ جیسے نیویارک کا لقب "امپائر سٹیٹ" ہے اور کیلی فورنیا کا "سنی سٹیٹ" کار پر ریاست کا لقب بھی لکھوایا جاسکتا ہے۔ امریکن لوگ کیونکہ زیادہ تر کاروں ہی میں رہتے ہیں اس لیے وہ اپنی کاروں کے ساتھ کافی چاؤ چونچلے کرتے رہتے ہیں جیسے ہندوستان میں لوگ سائیکلوں اور رکشاؤں کے ساتھ کرتے ہیں۔

سی۔ ایٹل میں ہمارا معمول تھا، صبح اُٹھنا، ناشتہ کرنا، دوائی کھانا، دودھ یا جُوس پینا، اس کے بعد تھک کے آرام کرنا۔

پھر کھانا کھانا، پھر آرام کرنا، چائے پینا، سیر کرنا (یعنی ڈپارٹمنٹ سٹور جانا) پھر کھانا کھانا۔ رات کو اکثر ٹی۔ وی پر فلمیں دیکھنا پھر سو جانا۔ ہم بتا چکے ہیں کہ ٹی۔ وی امریکہ میں دن رات چلتا ہے۔ اگر کسی کو رات میں نیند نہ آئے تو اُسے تارے گننے کی ضرورت نہیں، وہ ٹی۔ وی کے پروگرام گن سکتا ہے۔ تارے گننے کے لیے وہاں ایک علٰحدہ محکمہ ہے۔ ٹی وی میں خبریں بہت سُنائی جاتی ہیں۔ خبروں کے بعد اُن پر تبصرہ۔ اس کے بعد پھر خبریں ٹی وی پر بڑے دلچسپ مباحثے بھی ہوتے ہیں۔ امریکہ بحث مباحثوں کا ملک ہے۔ ان مباحثوں میں بال کی کھال نکالی جاتی ہے۔ اگر اس کھال پر غلطی سے کوئی بال رہ جائے تو اُس کی مزید کھال نکالی جاتی ہے۔ جب کوئی بال نہ رہ جائے تو اُس کھال کی جیکٹ بنائی جاتی ہے جو بعض حسینائیں پہن کر سمندروں میں نہاتی ہیں۔ ایسی جیکٹ کو 'ٹاپ لیس' بھی کہا جاتا ہے۔

ہم ٹی وی پر کئی بار پروگرام دیکھتے دیکھتے سو جاتے اور پھر سوتے سوتے دیکھنا شروع کر دیتے۔ لیکن چونکہ کنبے کے ہر فرد کے پاس علٰحدہ علٰحدہ ٹی وی ہوتا ہے اس لیے وہاں اس بات پر جھگڑا نہیں ہوتا کہ کون سا پروگرام دیکھا جائے جھگڑا کرنے کے لیے دوسری وجوہات ڈھونڈنا پڑتی ہیں جن کی وہاں کوئی کمی نہیں۔

اس طرح سی ایٹل میں لالی کے گھر میں مکمل آرام اور مکمل سے بھی زیادہ خاطر تواضع سے ہمارے زخم پوری طرح ٹھیک ہوگئے۔ ساتھ ساتھ ہم اپنے ناخن بھی کاٹتے رہے۔ ہماری صحت اتنی ٹھیک ہوگئی تھی کہ کئی بار بھول جاتے کہ ہم امریکہ کس لیے آئے ہیں۔ پیشتر اس کے کہ ہماری تواضع میں کمی کے آثار ظاہر ہوتے۔ ہم اپنا ڈیرہ اٹھا دینا چاہتے تھے۔ ایک سہانی صبح جب کہ مطلع صاف تھا، برف باری نہیں ہو رہی تھی، سورج چمک رہا تھا اور سارا شہر بیدار ہو رہا تھا، ہم نے بادل ناخواستہ کوچ کا بگل بجا دیا۔

عنایت علی خاں
(حیدر آباد سندھ)

مذاق ہی مذاق میں

ہم اُن کو لائے راہ پر مذاق ہی مذاق میں
بنے پھر اُن کے ہم سفر مذاق ہی مذاق میں
پڑے رہے پھر اُن کے گھر مذاق ہی مذاق میں
مزے سے ہوگئی بسر مذاق ہی مذاق میں
دکھا گیا عدو ہنسر مذاق ہی مذاق میں
پہنچ گئے وہ اس کے گھر مذاق ہی مذاق میں
کھلا جو اُن کا نامہ بر مذاق ہی مذاق میں
ہمیں بھی ہوگئی خبر مذاق ہی مذاق میں
پہنچ گئے عدو کے گھر مذاق ہی مذاق میں
چڑھایا اُس کو داؤں پر مذاق ہی مذاق میں
اُٹھا لیا اُسے اُدھر مذاق ہی مذاق میں
پٹخ کے توڑ دی کمر مذاق ہی مذاق میں
لطیفہ گوئی کا جو رات چل پڑا تھا سلسلہ
اُبل پڑے کئی گٹر مذاق ہی مذاق میں
اُٹھو کہ اب نمازِ فجر کے لیے وضو کریں
کہ شب تو ہوگئی بسر مذاق ہی مذاق میں

میاں عنایت، آپ کو مشاعروں کی داد نے
چڑھا دیا ہے بانس پر مذاق ہی مذاق میں

قطعات

نسیم سحر
(جدہ)

بیوروکریسی

مری فائل پہ کیسے فیصلہ ہو
کہ دونوں مبتلا ہیں امتحاں میں
وہ افسر صرف انگلش جانتا ہے
"مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں"

نکاحِ ثانی

نکاحِ ثانی پہ میں خوش کچھ اس قدر تھا نسیم
یہ لگ رہا تھا مری لاٹری نکل آئی
دولہن کے چہرے سے لیکن نقاب جب اُٹھا
جو بیوی چھوڑ چکا تھا وہی نکل آئی

آدابِ میزبانی

آپ کا میزبان ہوں ور[illegible]
آپ کو میں مزہ چکھا دیت[illegible]
آپ نے تو سنائیں دو غزلیں
سارا دیوان میں سنا دیت[illegible]

اسمٰعیل ظریف
(حیدرآباد)

سب کے سب

لیبر نہیں ہے کوئی بھی' افسر ہیں سب کے سب
لگتا ہے جیسے مالکِ دفتر ہیں سب کے سب

جن کو ملی ہیں کرسیاں لیڈر ہیں سب کے سب
کس کو سنائیں حال کہ پتھر ہیں سب کے سب

وہ ڈاروِن بھی تھا کوئی پگلا ہوا ' حضور
جو کہہ گیا کہ آدمی بندر ہیں سب کے سب

شیریں کی جستجو میں جو پھرتے ہیں روڈ پر
فرہاد مت کہو انھیں فچّر ہیں سب کے سب

دو چار بکریاں ہیں ہر اک گھر کے سامنے
لگتا ہے اُن کے کوچے میں ڈھنگر ہیں سب کے سب

باوا کو ایک پیسہ بھی دیتا نہیں کوئی
حالانکہ چار بیٹے ہیں باہر ہیں سب کے سب

لڑکے نے کار مانگی اُسے کار مل گئی
لڑکی کے لوگ دل کے سمندر ہیں سب کے سب

بازار کالا جن کے ہے قبضے میں آج کل
تقدیر کے دھنی ہیں، سکندر ہیں سب کے سب

حیوانیت ہے جن کے دماغوں میں اِن دنوں
انسان مت کہو انھیں بندر ہیں سب کے سب

پاکٹ پلیسر اکیلا ہی پکڑا گیا مگر
باوا بھی اُس کے بھائی بھی اندر ہیں سب کے سب

موروثی جائداد کو چکلے لگا دیئے
ایسے نصیب دار ہی بے گھر ہیں سب کے سب

کرکٹ کے جو کھلاڑی ہیں گلیوں میں آج کل
خود کو سمجھ رہے ہیں کہ اظہر ہیں سب کے سب

کوئی کسی سے کم نہیں اس دَور میں جناب
جو مبتدی ہیں وہ بھی سخنور ہیں سب کے سب

پرواہ داد کی نہ تمنّا صلے کی ہے
شعرا بچارے مست قلندر ہیں سب کے سب

جتنے بھی سامعین سخن فہم ہیں ظریفؔ
سُن کر کلام آپ کا ششدر ہیں سب کے سب

اقبال ہاشمی
(حیدرآباد)

غزل

فجر کے بعد سے پکوان کی تیاری ہے
مُنہ میں روزہ ہے مگر آنکھ میں افطاری ہے

ٹکٹکی باندھ کے بیٹھا ہوں میں چولھے کی طرف
کام کا کام ہے بے کاری کی بے کاری ہے

ہے سفر بس کا بھلا آنکھ لگے تو کیسے
نیند کی نیند ہے بیداری کی بیداری ہے

مسئلہ ہے تو فقط گانجہ چرس کا ہے وہاں
اصل میں کوئی مہاجر ہے نہ انصاری ہے

آپ کی بات پہ سب لوگ یقیں کیسے کریں
ہاشمی آپ کا انداز تو اخباری ہے

سید عباس متقی
(حیدرآباد)

کٹی عمر ہوٹلوں میں....!

جب لوگ کہتے ہیں کہ وقت گزرتا نہیں تو ہمیں بڑی حیرت ہوتی ہے کہ یہ کتنے خوش نصیب لوگ ہیں کہ جن کا وقت گزرتا نہیں اور ایک ہم ہیں کہ ہمارا وقت ہی نہیں اوقات گزر رہے ہیں۔ بلکہ بالفاظ دیگر اوقات خراب ہو رہے ہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ بچپن، لڑکپن، اور جوانی اپنے ہاتھوں ہی نہیں ایک دوسرے کے ہاتھ بھی مل رہے ہیں۔ آگے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بڑھاپا لاٹھی ٹیکتا ہمارے قریب آرہا ہے۔ ہم بڑھاپے سے بھاگ بھی نہیں سکتے کہ وہ گرانی کی طرح دُم دبائے چلا آتا ہے۔ اگر ہم واقعی آدمی ہیں اور اگر آدمی کی عمر طبعی ہمارے مقدر میں ہے تو ہمیں یہ جان کر بہت دکھ ہوگا کہ ہم نے اپنی نصف عمر گزار دی ہے۔ اور اگر نصف عمر پر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ یہ نصف عمر مدرسہ میں نہیں، گھر میں نہیں، مسجد میں نہیں بلکہ ہوٹلوں میں گزاری ہے۔

ہوٹل بچپن ہی سے ہمارا پسندیدہ اڈہ رہا ہے۔ جب ہم بچے تھے تو بڑوں کی چائے لانے جایا کرتے تھے، جب بڑے ہوئے تو خود چائے پینے جانے لگے۔ اور اب ماشاءاللہ ضعیف سے ہوگئے ہیں تو چائے پینے کے علاوہ اخبار چاٹنے بھی جایا کرتے ہیں۔ گویا ہوٹل زندگی کے لوازمات کا جزو لاینفک ہو کر رہ گیا ہے۔ ساری عادتیں یکے بعد دیگرے رخصت ہو چکی ہیں۔ لیکن ہوٹلنگ [illegible] بری بلا ہے کہ ہم سے چھٹ نہیں رہی ہے۔ شاید مرزا غالب کے ذہن میں ہوٹلنگ جیسی کوئی نامعقول عادت تھی جس کے متعلق ارشاد فرمایا "چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی"۔

چائے کو ہم برا اس لیے نہیں کہتے کہ اسے ڈاکٹر برا نہیں کہتے لیکن ہوٹلنگ کو برا اس لیے کہتے ہیں کہ اسے ہم برا سمجھتے ہیں اور برا سمجھنے کی معقول وجہ خود ہمارا اپنا سراپا تحقیر وجود ہے۔ اگر کوئی ہوٹلنگ کی برائی بچشم خود دیکھنا چاہتا ہے تو دیدۂ عبرت سے ہمیں دیکھے کہ ہوٹلنگ نے ہمیں کیا سے کیا بنا دیا ہے۔

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔

ہمیں وہ دن اچھی طرح یاد ہے کہ سگریٹ نوشی کی عادت شریفہ پہلے پہل ہم پہ ہوٹل ہی میں وارد ہوئی تھی۔ پہلے کھانس کھانس کر پیا تھا اب پی پی کر کھانستے ہیں۔ ہر سال ہمارے سگریٹ کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ لیکن کھانسی میں اضافہ ہو رہا ہے جس رفتار سے ہم سگریٹ چھوڑتے ہیں اسی رفتار سے کھانسی ستا رہی ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ اگر سگریٹ مکمل چھوڑ دیں تو کہیں کھانسی ہمیں نہ چھوڑ بیٹھے۔ اب یہ کھانسی ہی کا طفیل ہے کہ لوگ زندہ سمجھتے ہیں۔ اب تو یہ عالم ہے کہ اگر ہم کبھی فطری طور پر کچھ دیر کھانسنا بند کر دیتے ہیں تو لوگوں کو اندیشہ ہائے دور و دراز گزرنے لگتے ہیں۔ اور ان تمام برکتوں کا منبع ہوٹلنگ ہی تھی۔

ہوٹلنگ سے دوسرا نقصان، ہماری آنکھوں پر موٹے شیشوں والا یہ کالا چشمہ ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم شوقیہ یہ کالا چشمہ لگاتے ہیں۔ حالانکہ کالا چشمہ لگا کر ہم اپنے کالے کرتوت چھپاتے ہیں۔ کوئی یہ دیکھ نہیں سکتا کہ ہم کیسے دیکھ رہے ہیں، اور

اس سہولت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہم اپنوں کو پرایوں کو خوب گھور گھور کر دیکھتے ہیں۔ جب گرمی نگاہ سے بلور پسینہ پسینہ ہو جاتا ہے تو اسے نکال کر اپنے رومال کے کونے سے نہایت سلیقہ سے پروفیسرانہ صفائی کرتے ہیں۔ اور پھر آنکھوں پر لگا کر آنکھیں چار کرنا بلکہ چشمے چار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم جس سے بھی آنکھیں ملاتے ہیں وہ اُلّو کی طرح محض آنکھیں جھپکا جھپکا کر سیاہ چشمے کے دبیز شیشوں سے ہماری آنکھیں تلاش کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ اور آخر ش آنکھیں سلتا رہ جاتا ہے۔ ہم اپنے اونچے نمبر والے کالے چشمے کو رات میں بھی کانوں کے سہارے آنکھوں پر لٹکائے رکھتے ہیں کہ راتوں کے نظارے نسبتاً زیادہ رنگین ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنی عینک سے ہر رنگ صاف نظر آتا ہے۔ ہماری عینک آدھی دور کی ہے آدھی نزدیک کی۔ ہر شیشہ پر بال سے باریک دھار ہے جس سے ہماری آنکھیں تلوار سے زیادہ تیز ہو جاتی ہیں۔ اور ہم اس دھار کو بھول جاتے ہیں جو تلوار سے واقعی تیز ہوگی اور بال سے واقعی باریک جس پر سے ہمیں بغیر چشمے کے گزرنا ہے۔ الغرض یہ چشمہ بھی ہوٹل کی دین ہے۔ اگر ہوٹل میں نہیں بیٹھتے تو اخبار نہیں دیکھتے۔ اخبار نہیں دیکھتے تو بیچ کا صفحہ نہیں دیکھتے۔ بیچ کا صفحہ نہیں دیکھتے تو پکچر کا شوق نہیں ہوتا۔ پکچر کا شوق نہیں ہوتا تو آنکھیں خراب نہیں ہوتیں۔ آنکھیں خراب نہیں ہوتیں تو آنکھوں پر یہ کالا موٹے شیشوں والا چشمہ کیوں چڑھاتے۔ بُرا ہو اس ہوٹلنگ کا ہمیں نہ صرف آدھا اندھا کر دیا۔ بلکہ آدھا بہرہ بھی۔ آدھے بہرے پن کا آدھا حصہ تو بیگم کی چیخوں کی بدولت وجود میں آیا ہے۔ اور آدھا حصہ پاپ میوزک اور ڈسکو کی مدھر سنگیت کا نتیجہ ہے۔ جو ہر تین منٹ کے وقفے سے تقریباً ہوٹلوں میں نہایت شور شرابے سے بجتا ہے اور ہم باوجود اپنے ضعف کے سن سن کر بغیر سمجھے ہی تھرکنے لگتے ہیں۔ ان گیتوں سے کوئی اور فائدہ ہو یا نہ ہو اردو میڈیم کے بچے تیرہ تک گنتی ضرور سیکھ رہے ہیں۔ اور واقعی تین تیرہ ہو رہے ہیں۔ برسہا برس تک ہم نے کانوں کے پردے پھاڑنے والے گیت محض ہوٹل کی ہر بیٹھک میں سنے ہیں۔ کان، کان مصیبت بن گئے ہیں۔ پہلے سیدھا ہاتھ رکھ کر سن لیا کرتے تھے اب دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر ٹھیک نہیں سن سکتے۔ البتہ ہر بہرے کی طرح مطلب کی بات ضرور سن لیتے ہیں۔ ہمیں یہ کہتے ہوئے بہروں سے کوئی خوف نہیں ہو رہا ہے۔ کیونکہ یہ بات ان کے مطلب کی ہرگز نہیں۔

آج جو ہم ایک منحنی سا الف مالی تا داؤ دکھائی دیتے ہیں، اگر سچ پوچھا جائے تو ہوٹلنگ کے سبب ہی سے ہیں نہار منہ، نہار معدہ گرم گرم چائے (جس میں پتی اور دودھ کی مقدار تی ترمانہ اخلاق کی طرح حد تاقت کا یہ عالم کہ دور سے صرف بار بار نظر آئے دستماس کے احساس کیلئے بابار بلع گریز اس کو یادداشت پیش کرنی پڑتی ہے۔ جب روز دن میں دس مرتبہ معدہ شریف میں تشریف لے جائے گی تو صحت کا یہ عالم نہیں تو اور کونسا عالم ہوگا۔ ورنہ غربت کے باوجود والدماجد اتنا ضرور کما لیتے ہیں کہ اگر اسی پر گزارہ ہوتا تو صحت کی یہ حالت نہ ہوتی۔

ہم قدرے نازک مزاج واقع ہوئے ہیں۔ نفاست کے کچھ جراثیم اس ذرہ بے افلاس کے باوجود داخل طبع ہیں۔ چاہتے ہیں کہ ہوٹلیں صاف ستھری، بیرے اور صاف ستھرے ہوں۔ اور ان کے اخلاق ان سے بھی زیادہ صاف ستھرے ہوں۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ ہم نے آج تک ایسی ہوٹل میں قدم نہیں رکھا جہاں یکسر اس طرح کا مطلوبہ ماحول پاسکیں۔ سنا ہے کہ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں یہ چیز مل سکتی ہے۔ مگر ہم کالے دھندوں سے ابھی نہیں گورے لوگوں سے بھی کافی دور ہیں۔ پھر فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ذرا داخلہ کیوں کر ہو۔ محلہ کی ہوٹلوں کو برداشت کرتے ہیں۔ جنگی ہوٹل انسانیت کا معروف ترین دور ہے۔ شاعرانہ [illegible]

ہر آدمی ہوتے ہیں تو چالیس مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔ فلاں رات میں دو ایک دفعہ ایک سیال شے کا چھڑکاؤ بھی ہوتا ہے۔ جس کی بو سے
یہاں تو نہیں بھاگتیں البتہ ہم فرار ہو جاتے ہیں طرز تماشا کہ وہ لڑکا جو ایک گندہ کپڑا لیتے بے اعتنائی سے میز پر گرا پڑی چائے
صاف کرتا ہے، وہی پانی بھی پلانے پر مامور۔ اس طرح کا پانی پلاتا تو بڑی بڑی کو پانی پلانے سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ کیا مجال جو
دو گھونٹ پانی پی سکیں۔ مزید برآں موصوف کا پانی لے آنا بھی کچھ کم مکروہ نہیں ہوتا۔ اس کے ہاتھ میں جتنی انگلیاں ہوتی
ہیں اتنی ہی گلاسیں بھی ہوتی ہیں۔ اور ہر انگلی سر تا شکم پانی میں غوطہ زن ایک دن تو ہم بہت برہم ہو گئے۔ غلہ پر جا کر تقریر شروع
کر دی۔ جناب یہ کیا غضب ہے۔ میز صاف کرنے والا پانی پلاتا ہے۔ کیا آپ اس خدمت کے لیے کوئی اور لڑکا نہیں رکھ سکتے۔
آپ چائے اچھی نہیں پلا سکتے نہ سہی، پانی تو اچھا پلا دیجئے۔ وہ ایک منٹ تک ہمیں گھورتا رہا۔ گویا وہ کوئی منسٹر ہو اور ہم
اس سے متعلق ذکر رہے ہوں۔ اس کا یہ گھورنا ہمیں بہت کھلا یہ گستاخی تو ازدواجی حقوق میں داخل ہے۔ ہم مکرر ارشاد کا
ارادہ کر ہی رہے تھے کہ اس نے ٹھیٹ بازاری لہجے میں کہنا شروع کیا "زیادہ ٹخ ٹخ نہیں لولا پینا ہے پیو نئیں تو یاں سے
ہٹو" ہمیں اس طرز گفتگو سے شدید احساس ہوا واقعی یا بازار شرفا کا مقام نہیں چنانچہ ہوٹل سے باہر نکل گئے۔

ہوٹل والے شاید شہر کے ہر شہری کو شکر کا مریض سمجھتے ہیں اور ہمارا یہ عالم ہے کہ پانی بھی میٹھا پیتے ہیں چائے تو بدرجہ
اولیٰ شیریں چاہیے لیکن چائے عموماً پھیکی نصیب ہوتی ہے۔ چائے کہو یا چہرے مٹھاس کا احساس نہیں تو یعنی پھیکی چائے کی قیمت
اور والی چائے کی قیمت اس قدر شاید نہ بڑھ جاتی اگر حکومتی سطح پر اس درجہ ناکام کوششیں نہ ہوتیں۔ اب یہ عالم ہے کہ ایک
چائے کامل نوٹ ہضم کر جاتی ہے۔ اور ہم محض ہونٹ چاٹتے رہ جاتے ہیں۔

جب سے ہم نے سنا ہے کہ ہندوستان کے بیشتر بڑے ادیب اور شاعر ہوٹلوں سے برآمد ہونے میں تو
ہم بھی اپنے اوقات ہوٹلوں میں خراب کرنے لگے۔ ممکن ہے اسی ہوٹلنگ کی بدولت ہم بھی بڑے شاعر یا بڑے ادیب ہو جائیں
شاید یہ بات غلط ہے۔ کیونکہ اگر یہ بات صحیح ہوتی تو بیرے بہت بڑے شاعر ہو جاتے۔ یہ بھی تو شاعری کرتے ہیں۔ اب تو
اندازہ ہو گیا ہے کہ بڑے شاعر کے لیے ہوٹلنگ سے زیادہ ہوٹنگ چاہیئے۔

بعض ہوٹلوں میں اس درجہ بھیڑ رہتی ہے کہ بیٹھنے کے لیے پہلے "کیو" میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ ایسی ہوٹلوں میں گھسنا
مشکل، چائے پینا بہت مشکل اور چائے پی کر صحیح سالم واپس نکلنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ اکثر ہوٹلوں میں بیرے
ہماری پکار نہیں سنتے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بیرے ہیں یا بہرے۔ ایک دفعہ ہم پکارے جا رہے تھے۔ او بابا، میاں، بیرے۔ اے
کے ابھی ہم پروفیسر نہیں بنے ہیں لہذا ہمیں اچھی طرح یاد تھا کہ کالج جلد پہنچنا ہے۔ پکارے جا رہے ہیں۔ گویا بے خودی طاری ہو
شنوائی نہ ہوئی۔ میز بجایا کرسی کھٹکھٹائی، کڑک مرغی کی طرح حلق کے نیچے سے آواز نکالی ساری کوششیں بیکار ایک صاحب
ہم پر ترس کھا کر مشورہ دیا اگر آپ کو واقعی چائے پینی ہے تو فوراً گلاس پھوڑ دیجیے۔ جس کے سینے میں خود شیشہ دل ہو وہ کوئی
شیشہ کیا توڑے۔ مرزا غالب کے اس مصرعے کو بہت بے بسی سے پڑھتے ہوئے ہوٹل چھوڑ دی "میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر
بھی نہ سکوں"

جیب میں اگر بڑا نوٹ ہو تو چھوٹی ہوٹلوں میں گھسنا بہت بڑی بے وقوفی ہے۔ ایک دفعہ دوسری تاریخ کو ہماری جیب میں
فقط سو کا نوٹ بچ رہا تھا۔ ہم نے حسب عادت ایک ہوٹل کا رخ کیا اور دھڑلے سے چائے نوش فرمائی اب جو صاحب آفت

ایک منہ بنایا۔ سیٹھ کے پاس جانے کا حکم دیا۔ سیٹھ کے پاس گئے تو اس نے بیرے سے زیادہ منہ بنایا۔ ہمارا منہ تو کمبخت چائے نے پہلے ہی خوب بنا دیا تھا۔ میرا سو کا نوٹ لینے راضی نہیں اور ہم حیواتی کی طرح ملّہ پر غم زدہ کھڑے ہیں۔ کہنے لگا آپ اپنی گھڑی رکھ کر نوٹ بھنا لایئے۔ ہم شریف آدمی ہیں۔ بغیر گھڑی رکھوائے بھی نوٹ بھنا کر چائے کے پیسے دے سکتے تھے۔ لیکن دنیا میں شرفا کی کمی ہے۔ گھڑی رکھ دی اور ہوٹلنگ کا خمیازہ بھگتنے سو کا نوٹ لیے۔ گویا نکل گئے۔ کیا مجال جو چلر ملے۔ ہوٹل سے کالج آگیا۔ کالج سے سسرال آگیا لیکن چلر نہیں ملا۔ ہم نے گھنٹہ نہیں بیے کا پڑھا تھا۔ اب سینہ کھٹکتے ہوئے پڑھ رہے تھے "چلر نہیں ملے گا، چلر نہیں ملے گا۔"

اگر ہمارے گھر سلیقہ کا کھانا پکتا تو ہم ہوٹل کے ہرگز عادی نہ ہوتے۔ ناشتہ گھر پر کرتے ہیں تو ٹیفن ہوٹل میں لیتے ہیں۔ اگر ٹیفن کالج میں لیتے ہیں تو عشائیہ کے لیے کسی ریستوران کا رخ کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہوٹلوں میں عموماً چیزیں تیسرے درجہ کی ہوتی ہیں جو نخالص، ، گھی ہوتا ہے۔ جس کے طفیل آنکھیں بستی ہوسکتی ہیں۔ جگر پر ہاتھ رکھ کر ڈاکٹرس بادہ نوشی کا الزام لگا سکتے ہیں۔ قلقل دراز سے لب بھر خرد اندیاد، نمک سے فشارالدم مسالہ جات سے پیٹ بجارہ تو حسین نظاروں سے دل آوارہ۔ شاید معدہ کے علاوہ آنکھیں بھی غذا کی متقاضی ہوتی ہیں۔ بعض وقت تو خیال گزرتا ہے کہ ہم ہوٹل میں کھانا کھانے آئے ہیں یا ہوا کھانے۔ بہر حال ہماری ہوٹلنگ میں ہماری بیگم کا بھی کافی ہاتھ ہے۔ ہوٹلوں میں کھانا کھانے کے علاوہ اور بھی چیزیں کھالیتے ہیں جو کبھی مرئی ہوتی ہیں کبھی غیر مرئی۔ مثلاً تخم کنکر، مٹی کے ڈھیلے، چاول کے کیڑے، دیا سلائی کے ٹکڑے، بوریے کے تنکے، ناریل کے میوے کی کاڑیاں وغیرہ۔ مکھیوں کو تو ہم جزو غذا سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ دال میں واقعی کچھ کالا تھا ہم نے بیرے سے شکایت کی کہ دال میں مکھی مری پڑی ہے۔ بیرے نے ہماری شکایت نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ صاحب یہ مکھی نہیں۔ کچھ زیرے کے بیج بگھار سے یکجا ہوگئے ہیں۔ کھا لیجئے اپوزیشن کی یگانگت کا مزہ آئے گا۔ ہم نے بیرے پر بھروسہ کیا اور کھالیا۔ تین دن تک خواب میں مکھیاں مارتے رہے۔

کس قدر تعجب خیز بات ہے کہ اس قدر تجربات گوناگوں سے نبرد آزمائی کے باوجود ہم ہوٹلنگ کی منحوس عادت ترک نہیں کرسکتے۔ کاش ہمیں کوئی دوا کے ذریعہ دعا کے ذریعہ ہوٹلنگ کی عادت سے بچائے تاکہ ہم اپنی کمائی کا ایک معتدبہ حصّہ اور زندگی کا مالیق وقت بچا سکیں۔



غالبِ ثانی

رمضان میں

چار سُو اللہ ہُو کا غلغلہ رمضان میں
سحری و افطار کا ہے ہمہمہ رمضان میں

چاند ہوتے ہی سروں پر آگئی ہیں ٹوپیاں
ٹوپیاں ہی ٹوپیاں ہیں جابجا رمضان میں

غُرّۂ شوال پر ہو جائے گا منظر یہ ختم
پھر کوئی دیکھے نہ یہ منظر جو تھا رمضان میں

سائرن اور لاؤڈ اسپیکر کی اذاں کے شور سے
ہوگیا ہنگامۂ محشر بپا رمضان میں

سال بھر کرکے عرق ریزی کما اپنی کمائی
بے محابا ہے اُسے غسلِ صفا رمضان میں

یوں جگانے کے لیے سحری کو فقرا کی ہے یوم
رت جگے پر ہیں کمر بستہ گدا رمضان میں

ہے چٹورا پن فزوں، سحری ہو یا افطار ہو
مانگتا ہے ہر کوئی عمدہ غذا رمضان میں

روزا فزوں کھا دگی ہے! الامان والحفیظ
دُونی ہو جاتی ہے اکثر اشتہا رمضان میں

بچّوں کو ماں پیٹ کر یا دا گھڑوں کو چھوڑ کر
روزہ بہلاتے ہیں دونوں برملا رمضان میں

ہر طرف عربی غذائیں، کیا حلیم اور کیا ہریس
مل گئے ہیں نسخہ ہائے کیمیا رمضان میں

یہ غذائیں ہیں پروٹین اور وٹامن سے بھری
ان کو کہتے ہیں کمر گھٹ کی غذا رمضان میں

روزہ داروں سے زیادہ پیٹوؤں کی ہے اُودھم
ایسے ہی اشخاص ہیں سب بادپا رمضان میں

راندۂ درگاہ درزی کر نہ دے تجھ کو کوئی
عشرۂ اوّل میں سب کپڑے سِلا رمضان میں

عید کے دن دودھ کا لانا ہے جوئے شیر کا
دودھ کو اوّل ہی اوّل ٹِک کرا رمضان میں

کھانے کی حاجت نہیں ہے تگڑی افطار کے بعد
پھر سحر کو کھانا تُو ہرگز نہ کھا رمضان میں

گرمیِ بازارِ رمضاں سے ہے وہ سہما ہوا
غالبِ ثانی کے ہیں اوسان خطا رمضان میں

اسمٰعیل آذر
(ناسک)

جھینگا مُشتی

ایک جھینگے نے اکڑ کر ایک مچھلی سے کہا
دیکھ، کیسا صاف اور شفاف ہے یہ تن مرا
گندگی سے پاک میں تو چیز ہی کچھ اور ہوں
دستِ قدرت کا تراشا قیمتی بلور ہوں
کچھ چمک تجھ میں تو ہے پر یہ نفاست ہے کہاں
پیٹ میں تیرے غلاظت ہی غلاظت، الاماں
اس پہ مچھلی کھلکھلانے لگ گئی ڈنکے کی چوٹ
دیکھ کر جھینگے کی صورت ہو رہی تھی لوٹ پوٹ
ہنستے ہنستے بولی سکھیوں سے "اری بہنو سنو
جھینگا مچھلی پر لگا کا منٹ کرنے لو سنو
کہہ رہا ہے پیٹ میں مچھلی کے میلا ہے بھرا
کوئی اس احمق کو بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا
اے موئے گھامڑ یہ تیرا زعم کس چکر میں ہے
گندگی تیری تو اے نادان تیرے سر میں ہے
تلملا کر رہ گیا جھینگا بڑا کاری تھا گھاؤ
آج بھی جب شرم آتی ہے تو بن جاتا ہے واؤ

○

قیسی قمر نگری
(کرنول)

قطعات

نفرت اغیار سے اپنوں سے محبت ہے مجھے
میں کسی غیر کو گھر میں نہیں گھسنے دیتا
ساس کو اپنی تو رکھتا ہوں ہمیشہ گھر میں
بیوی کی ساس کو گھر میں نہیں گھسنے دیتا

○

کہا دولہن نے ڈرتے ڈرتے دولہا سے شبِ جلوہ
مری کھانا بنانے پر طبیعت ہی نہیں آتی
جواباً ہنس کے دولہا نے کہا "یہ گھر ہے شاعر کا
یہاں کھانا بنانے کی تو نوبت ہی نہیں آتی

○

ایک دن ہم نے بے خیالی میں
کی تھی تعریف ان کی زلفوں کی
آج تک بھی ہماری ہر ڈش میں
بھینٹ ملتی ہے ان کی زلفوں کی

بالو آرٹ کے (احل پور شہر)

پان خوری

آج کا انسان خورد و نوش کی چیزوں کے علاوہ بھی کئی اور چیزیں کھانے پر مجبور ہے بلکہ ایک اندازے کے مطابق ہم لوگ غذا کم کھاتے ہیں اور چغلیاں، گالیاں، کوسے، قسمیں اور رشوت زیادہ کھاتے ہیں لیکن ان سب چیزوں کے ساتھ ہی ہم ہندوستانی جس چیز کو بلا ناغہ کھاتے آتے ہیں وہ ہے پان ۔ ہمارے ملک کے وزیر اعظم سے لے کر ادنیٰ قلی تک آپ کو پان کھاتا ہوا ملے گا۔ پان کھانے کے مقصد بھی جدا جدا ہوتے ہیں کچھ لوگ طلب کے لیے پان کھاتے ہیں تو کوئی منہ صاف کرنے کے لیے اسے منہ لگاتا ہے اور کچھ اپنے پچکے گالوں کو ابھارنے کے لیے اپنے منہ میں پان پالتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ ویسے جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے ہم یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ مشرق میں پان کھانے کا روگ بہت زیادہ عروج پر سہا ہے جبکہ مغرب میں اس کا چلن خال خال ہی دکھائی دیتا ہے اور شاید ایسا اس لیے بھی ہے کیونکہ پان سلیقہ سے کھانا بھی ایک آرٹ سے کم نہیں ہوتا۔ وہ تو ہم لوگوں کا ہی دل گردہ ہے جو ہم اپنے منہ میں چینڈو کی طرح پان ٹھونس کر بھی اٹک اٹک بولے جاتے ہیں ۔ اہل مغرب اگر ہماری طرح پان منہ میں رکھیں تو صاحب بات کرنا تو درکنار اپنا منہ تک نہ کھول پائیں گے ۔

تاج محل، لال قلعہ اور دیوان خاص، دیوان عام اور دیگر تعمیرات کی طرح ہی پان کی تاریخ بھی مغلیہ دور حکومت سے جا کر ملتی ہے ، شاہی طبیبوں کے مشورہ پر منہ کی ایک آدھ بیماری دور کرنے کے لیے جہاں ملکۂ نور جہاں نے سب سے پہلے پان کا بیڑا کھایا وہیں ہم نے منہ کی متعدد بیماریوں میں مبتلا ہونے تک پان کھایا۔ پان منہ میں دبا کر بے داغ لباس کے ساتھ بے دریغ بولے جانا یہ صرف اردو والوں کا ہی وطیرہ ہے اور یہ وہ انفرادیت ہے جو اردو زبان کے علاوہ کسی اور زبان کے حصہ میں نہیں آئی ۔ اردو ہی وہ زبان ہے جو منہ میں پان رکھ کر انتہائی خوبی کے ساتھ بولی جاتی ہے بلکہ اس زبان کا صحیح لطف تو پان منہ میں دبا کر بات کرنے میں آتا ہے جبکہ دوسری زبانیں منہ میں پان کی لگام کو قطعی برداشت نہیں کرتیں . . . . . اسی لیے ہم اس بات کا دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ صحیح اردو کہنے اور لکھنے کے لیے غالب و میر جیسے اساتذہ نے قلم کو اس وقت تک نہیں چھوا ہوگا جب تک کہ انھوں نے پان کھانے کی لت نہیں اپنائی ہوگی یا دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اردو کے عظیم اور نامور شعراء و ادباء نے

زبان کی بجائے محض پان ہی کی بدولت چلایا جاتا ہے اس لیے ہمارا اہل اردو کہلانا پان کھانے پر منحصر ہے۔ اسی لیے تو مشاعروں، سیمیناروں اور کانفرنسوں میں صحیح اردو بولنے کے لیے ہمارے کتنے ہی ادبا، شعرا و دانشور اپنے منہ کو پاندان بنانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔

پان کی ہر دل عزیزی اور مقبولیت کی اس سے زیادہ اور کیا مثال دی جا سکتی ہے کہ وردھا کا ایک قابل ادیب جہاندیدہ شاعر ایم اے پی ایچ ڈی فنکار ماضی میں پان فروش بن بیٹھا تھا اور جس نے پان کھیلے کا نام بھی رکھا تھا "ماسٹر پان سنٹر" اور اشتہار میں ارباب تعلیم کو "نشتر" یوں چبھائے تھے کہ "آئیے ماسٹر پان سنٹر پر تشریف لائیے اور پان کھا کر اس نظام تعلیم پر تھوکیے جو بے روزگار ایم اے پی ایچ ڈی پیدا کرتا ہے۔

لوگ پان کو چبانے کا دم چھلا کہتے ہیں جبکہ درحقیقت پان کا صحیح لطف پانے کے لیے ہی کڑوی کسیلی چائے زہر مار کی جاتی ہے یعنی پہلے چائے سے اچھے بھلے منہ کو بگاڑا جاتا ہے اور پھر اسے واپس اپنی اصلی حالت پر لانے کے لیے پان کا بیڑہ کھایا جاتا ہے۔ پان کے لوازمات بھی کیا خوب ہوتے ہیں یعنی پہلے ہرے ہرے پان کو سفید سفید چونے سے چپڑا جاتا ہے پھر اس سفیدی پر کتھے کی کالک پوتی جاتی ہے اور پھر سونف سپاری اور مسالے، تمباکو کی گلکاریاں کی جاتی ہیں۔ ان دنوں پان میں تمباکو بھی ہمہ اقسام کے استعمال ہونے لگے ہیں جیسے وانگیہ کلکتیا۔ پتّے کا زعفرانی زردہ زعفرانی بھی۔ چار سو بیس کا ہندسہ تعزیرات ہند میں معتوب گردانا گیا ہے اس لیے اس کے دو بھاگ کر دیئے گئے ہیں یعنی تین سو اور ایک سو بیس، جی ہاں یہ دونوں نمبر بھی تمباکو ہی کے ہیں۔ پان کو سیل بند کرنے کے لیے لونگ کا استعمال ہوتا آیا ہے اور واقعی لونگ سے پان کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے پان میں پچی لونگ اور کسی نازنین مہ جبین کی ناک کے دمدماتے تارے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہاں ایک بات کہنے میں ہمیں کوئی تامل نہیں کہ جتنی رغبت ہمیں پان سے رہی ہے اتنی ہی کراہیت ہمیں پان کھانے والی کوٹھے والیوں (سینما کے اسکرین پر) کو پان کھاتے دیکھ کر ہی ہوتی ہے۔ آپ نے بھی دیکھا ہوگا، ہم یہ کتنے ٹھسّے کے ساتھ پان پہ پان کھائے جاتی ہیں اور فر فر اردو بولے جاتی ہیں اب لے دیکر پھر وہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ روانی اور خوبصورتی کے ساتھ اردو بولنی ہو تو پان کھایئے اور شاید یہی وجہ تھی کہ پچھلے زمانے میں امرا و شرفا اپنے بچوں کو تہذیب و اخلاق اور زبان کی باریکیاں سکھانے کے لیے طوائفوں کی خدمات حاصل کیا کرتے تھے اور طوائفوں کو یہ خوبی زباندانی کسی اور کی سنگت سے نہیں بلکہ پان کی صحبت سے میسر آئی تھی۔

عہد پارینہ میں عشق و عاشقی کے معاملات میں جان و دل دیئے اور لیے جاتے تھے جبکہ آج زمانے کی قدریں بدل چکی ہیں اور اس کے ساتھ ہی عشق و محبت کے تیور بھی اب وہ نہیں رہے اس لیے موجودہ دور میں ہم نے ایسے معاملات میں بجائے دل و گل کے پان کے بیڑوں کا لین دین ہوتے دیکھا ہے اور ایسا شاید اس لیے بھی ہونے لگا ہے کیونکہ پان کی شکل اور دل کی ہیئت دونوں یکساں ہوتی ہیں۔ اس لیے اس دل نما شئے میں سونف سپاری کتھا چونا اور مسالہ گوندھ کر اس پر چاندی کا ورق مڑھا جاتا ہے اور پھر اسے لو لیٹر میں باندھ کر محبوب و مطلوب کی جانب بالیں پہ اچھال دیا جاتا ہے اور پھر یہ محبوب پوٹلی کھول کر لو لیٹر پڑھتا ہے اور اس دل نما شئے یعنی پان کو اپنے عاشق کا دل سمجھ کر چبا جاتا ہے۔

ہو یا بعد از موت سوم دہم کی گھڑی ہو۔ کچھ تقسیم ہو نہ ہو پان ضرور تقسیم ہوں گے۔ دکان کا ادگھاٹن ہو یا دیوالی کی تقریبات آپ کو پان کھانے کے لیے بڑے ہی چاؤ کے ساتھ مدعو کیا جائے گا۔ ہماری شادی بیاہ کی رسومات میں بھی پان کے بیڑے کا خاصا دخل رہا ہے۔ وہ یوں کہ پہلے نوشہ میاں پان کے بیڑے کو چباتے ہیں اور پھر اسی بیڑے کو دلہن بھی چباتی ہے اور پھر ساری ازدواجی زندگی میں ایک دوسرے کو چبائے جانے کا سلسلہ بھی یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ پان کا جو تعلق ہمارے رسم ورواج سے ہے وہی رشتہ پان کا ہمارے بھارتیہ کلاسیکل سنگیت سے بھی رہا ہے۔ اسی لیے ہمارے تمام نامور کلاسیکل فنکاروں کی سانسوں کا ناطہ پان کے ساتھ دیکھنے میں آتی ہے۔ چاہے کلاسیکل سنگیت کا ماہر سوامی ہری داس ہو یا سنگیت سمراٹ تان سین ہو۔ بڑے غلام علی خاں ہوں یا منجھلے یا چھوٹے۔ بیگم اختر ہوں یا نصرت فتح علی خاں یا مہدی حسن الغرض ہر کسی نے پان کی طلب کے طفیل ہی کلاسیکل سنگیت کا میدان ملا ہے اسی لیے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ہر کوئی پان کا رسیا کلاسیکل سنگیت کا ماہر ہو سکتا ہے۔ کلاسیکل راگ گانے کے لیے آپ کو سب سے پہلے ایک عدد پان بیڑا اپنے منہ میں احتیاط سے رکھنا ہوتا ہے جس وقت طبلہ، ڈھول، ستار اور سارنگی والے اپنے اپنے سازوں کو ٹھونک بجا کر ٹھیک کرنے میں جٹے ہوں تب آپ اپنے منہ میں پان کے بیڑے پر دانت چلاتے جائیے۔ ادھر جتنے وقت میں ساز تیار ہوں گے ادھر اتنے ہی وقت میں پان کا پیک بھی آپ کے منہ میں موجیں مارے گا...... اور بس یہی وہ پوزیشن ہوتی ہے جس میں کلاسیکل راگ نہایت کامیابی کے ساتھ گایا جا سکتا ہے۔ اس موقع پر آپ اپنا منہ کھول کر کوئی بھی آواز احتیاط کے ساتھ اس طرح نکالیے کہ پان کا پیک منہ میں اِدھر اُدھر ٹھاٹھیں مارتا رہے اور باہر نہ گرنے پائے یعنی آپ کسی بھی لے میں آواز نکالیے اور پان کے پیک کو منہ میں ادھر اُدھر رولتے رہیئے جب تک آپ یہ عمل کرتے رہیں گے تب تک راگ راگنیوں کے چشمے آپ کے حلق سے پھوٹتے رہیں گے اور سامعین سر دھنتے رہیں گے اور آپ کے فن کے قائل ہوتے رہیں گے۔ تالیاں اور واہ واہ نعرہ ہائے تحسین کا شور آپ کا شہرہ چہار سو ہوگا۔

اب آپ لاکھ اپنا سر پھوڑ لیں اور کہیں کہ صاحب ہم نے صرف پان کھایا ہے لیکن سامعین کہیں گے نہیں مہاشے آپ راگ الاپ رہے ہیں۔ الغرض تمام پروگرام میں آپ پان کے پیک کو منہ میں رولتے رہیئے اور پیسے بٹورتے رہیئے جہاں آپ کے منہ میں پان ختم، وہیں سمجھو پروگرام بھی ختم۔ اب چونکہ ہمارے منہ میں بھی پان ختم ہو چکا ہے اور صحیح اُردو لکھنا ہمارے لیے محال ہے اس لیے ہم اپنی بات یہیں ختم کرتے ہیں.......

غزلیں

مجیب الرحمٰن بزمی
رانچی (بہار)

~~تو شعلہ ہے جھلسا تو جل جاؤں گا~~ — تو غنچہ میں بھنورا، مچل جاؤں گا
میں تیری طرح سخت دل تو نہیں — ہو گر نرم لہجہ! پگھل جاؤں گا
میں خود دار ہوں یہ تو ممکن نہیں — زمانے کے سانچے میں ڈھل جاؤں گا
ملے کوئی تجھ سا اگر ہم سفر — تو منزل سے آگے نکل جاؤں گا
جسے 'آج' پہ کچھ بھروسہ نہیں — کہے گا وہ ہر روز کل جاؤں گا
اناڑی سمجھنا نہ بزمی مجھے
میں گرنے سے پہلے سنبھل جاؤں گا

ظفر چکدینوی
(نالندہ)

اُن کی لڑکی نکل گئی آخر — اِک مصیبت تھی ٹل گئی آخر
کتنی توبہ شکن جوانی ہے — اپنی نیّت بدل گئی آخر
ہجر کی شب اگرچہ لمبی تھی — ڈھلتے ڈھلتے یہ ڈھل گئی آخر
کرلی اُس نے رقیب سے شادی — مونگ چھاتی پہ دَل گئی آخر
ہے نظر اُس کی یا کوئی بندوق — دل پہ گولی سی چل گئی آخر
عشق کی نرم آنچ میں تپ کر — حسن کی دال گل گئی آخر
دہلے کے ہاتھوں جب پٹا نہلا — ساری شیخی نکل گئی آخر
شکل پر ان کی ہم جو ریجھے ظفؔر
اپنی صورت بدل گئی آخر

یوسف یکتا
(سکندرآباد)

میکشوں کی تو خوب بن آئی — کبھی ٹھرّا ملا کبھی تاڑی
ٹھیک پہ آگئی ہے پھر گاڑی — کیسی غلطی کئے میرے بھائی
میں تو دُبلا ہوں بید مجنوں ہوں — مجھ کو بیوی ملی ہے کیوں جاڑی (موڑ
پڑھ کر حکمت جناب یکتا نے
اچھے اچھوں کی دیکھ لی ناڑی

خلش جعفری (بمبئی)

گنگو تیلی

اگلے زمانے کے بزرگوں کے متعلق سن رکھا تھا کہ علم حاصل کرنے سمندر پار جایا کرتے تھے تو ان میں جو دل پھینک ہوا کرتے وہ ڈگری کے ساتھ کسی گوری میم کو بھی لے آیا کرتے تھے جس گھر میں گوری میم آجاتی وہ پورے شہر میں مشہور ہو جایا کرتا تھا۔ آج کل لوگ علم اور ڈگری حاصل کرنے کو، کم، کام اور کمانے کے لیے زیادہ جاتے ہیں اور سمندر پار کا جغرافیہ بھی بدل گیا ہے۔ اب لوگ انگلستان سے زیادہ عربستان کو پسند کرنے لگے ہیں۔ سمندر پار سے میم لانا اب فیشن نہیں رہا۔ اب تو لوگ عربستان سے بکسے بھر بھر لاتے ہیں۔ رہ گئیں دلہنیں تو وہ ہندوستان میں بہت ملتی ہیں اور خارج میں کام کرنے والوں کے لیے تو معقول جہیز کے ساتھ بہ آسانی دستیاب ہو جاتی ہیں۔ ان حضرات کا بھاؤ تو بیاہ کے مارکٹ میں اب بھی اتنا تیزی پر ہے کہ ۴۸، ۴۸ سال کے مردوے بھی شادی بیاہ کے اشتہارات میں خود کو لڑکا لکھواتے نہیں شرماتے اور اس عمر کے لڑکے بھی رشتہ طلب کرتے ہیں تو گوری خوب صورت اور ۲۰، ۲۵ برس کی عمر تک کی لڑکی کا! اب اس کو کیا کیا جائے کہ ہم ہندوستانی کئی سو سال سے گوری چمڑی سے مرعوب ہیں اور آج بھی گورے رنگ کو ہم حسن اور خوب صورتی کی پہلی شرط سمجھتے ہیں اور ٹی وی پر کوئی گوری میم نیس کیفے پی رہی ہو تو ہم اس کافی کو دنیا کی بہترین کافی مان لیتے ہیں! خیر بات ہو رہی تھی بکسے بھر بھر کر لانے والوں کی تو ان میں بھی عموماً دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک جو عموماً کلرک ہیں اور ڈرائیور، ان سے زیادہ لانے کی استطاعت نہیں رکھتے اور دوسرے وہ جو ان کے علاوہ بھی ایک "جہان رنگ و بو" ساتھ لے آتے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ایسے لوگ سو پچاس آئٹم مزید ساتھ لاتے ہیں۔ چمچوں، چھریوں سے لے کر قالیچے اور ٹیپ ریکارڈر تک — اور اللہ جن کو زیادہ توفیق عطا فرماتا ہے وہ ایک عدد جاپانی کار بھی لاتے ہیں۔ عموماً یہ ٹویوٹا ساخت کی ایسی خوب صورت گاڑی ہوتی ہے جس کا مقابلہ دیسی دلہن یا بدیسی میم کوئی نہیں کر سکتی —! کیا ہوا اگر ہمارے یہاں پٹرول اور مہنگا ہو گیا ہے بدیسی گاڑی تو گیرج میں بھی کھڑی ہوئی اچھی لگتی ہے ......

اس بار جو ہم بھوپال گئے تو بہت زمانے بعد اپنے دیس کے دیہات کا سفر کیا اور وہ بھی بدیسی کار میں دیہاتی ہم سے زیادہ گاڑی کو دیکھا کرتے تھے۔ بعض لوگ تو اس قدر گھور گھور کر دیکھتے کہ ہم گاڑی کو نظر بد سے بچانے کی دعا مانگنے لگتے۔

ہوا یوں کہ ایک دن صبح ناشتے کے بعد اسد میاں کو گاؤں جانے کا موڈ آ گیا۔ یوں تو ہمارے چھوٹے بھ

ہاں لیکن ڈیڑھ دو سال کی چھوٹ بڑائی کا نہ کبھی ہم نے احترام کروایا اور نہ کبھی انھوں نے کیا۔ یوں کہہ لیجے بے تکلف بھائیوں میں سے ہیں۔

کہنے لگے چلیے آپ کو ہمارے گاؤں کی سیر کروادیں۔ دھان میں پانی لگ رہا ہے وہ بھی دیکھ لیں گے۔ پانی لگنا کاشت کاروں کی اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں دھان کے پودوں کو مناسب وقت اور وقفے سے پانی سے سیراب کرنا۔

اسعد میاں ۲۵ برس عربوں کو کتابیں پڑھنے کی ترغیب دلاتے رہے تھے اس میں وہ کامیاب ہوئے یا نہیں کچھ پتہ نہیں لیکن جب لوٹے تو جاپانی ٹویاٹا گاڑی ان کے ساتھ تھی اور بھوپال میں ان کا نہیں اس گاڑی کا بڑا رعب ہے اور بہت سے لوگ تو انھیں اب گاڑی کی وجہ سے پہچاننے لگے ہیں۔

گاؤں زیادہ دور نہیں تھا۔ شہر سے کوئی پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر۔ دو تہائی راستہ تو ریاستی شاہراہ سے ذریعے طے کیا گیا۔ آزادی کے بعد کسانوں کا جو نیا خوشحال طبقہ پیدا ہوا ہے، شاہراہ کے دونوں جانب وہ اپنے بھاری بھرکم وجود کا احساس دلا رہا تھا —— دور دور تک لہلہاتی فصلیں۔ ٹیوب ویل، بستی، بجلی اور ہریالی میں جیسے سر اٹھائے ہوتے سفید و سرخ رنگ سے بنے ہوئے بنگلہ نما پختہ گھر۔ ایک دو جگہ کسی کچی بغلی سڑک کے موڑ پر انگریزی میڈیم کے اسکول کے بورڈ بھی دکھائی دیتے —— جو ہندی اور اردو کے اس علاقے میں انگلش میڈیم سے تعلیم کا شوق جنون کی حد تک بڑھ گیا ہے۔

ایک جگہ ریاستی شاہراہ کی داہنی بغل سے گاڑی ایک کچی اور ناہموار سڑک پر مڑ گئی یہ اسعد میاں کے گاؤں کی سڑک تھی جو کہیں کہیں کھیتوں میں سے بھی ہو کر جاتی تھی۔ جاپانی گاڑی اس کچے راستے پر بھی مزے سے چل رہی تھی۔ اس وقت محسوس ہوا کہ جاپانی مال بلا وجہ ہی ساری دنیا پر چھایا ہوا نہیں ہے۔ گاؤں زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن اس حد تک ماڈرن ضرور تھا کہ وہاں بجلی پہونچ گئی تھی۔ گاؤں کے مکھیا کے گھر کے قریب گاڑی کو پارک کر کے ہم لوگ کھیتوں کی طرف چلے گئے —— اس روز بچپن کے بعد سے اتنی گلیوں اور کھیتوں کو جانے والی نرم پگڈنڈیوں پر چلنے میں بھی مزہ آیا!

بہت دیر بعد جب ہم کھیتوں کا چکر لگا کر اسعد میاں کے گاؤں والے بچپن کے گھر میں کنویں کا ٹھنڈا اور شیریں پانی اور پیڑوں کی گرم چائے پی کر مکھیا کی ڈیوڑھی پر پہونچے تو بہت سے لوگ بال اور بچے بالک جاپانی گاڑی کو گھیرے کھڑے تھے۔ کچھ لوگ اسے چھو کر بھی دیکھ رہے تھے۔ ایسی گاڑی ان میں سے کسی کسی نے اس وقت شاید فلم میں دیکھی ہوگی جب وہ کسی ہاٹ یا میلے میں اناج فروخت کرنے شہر گیا ہوگا اور اس نے رات وہیں گزار کر فلم دیکھنے کی عیاشی کی ہوگی —— ایک زمانے میں گاؤں والے جب اپنی بیل گاڑیوں میں فصلیں لاد کر شہر لے جاتے اور انھیں دلالوں کے ہاتھ اونے پونے فروخت کر کے کپڑا لتا بھانڈے برتن اور دوسری گھریلو اشیا خریدتے اور رات گزارنے کے لیے کسی میدان میں پڑاؤ ڈال دیتے تو ان میں سے بہت سے شوقین فلم کا آخری شو بھی دیکھ لیا کرتے تھے اب وہ گاؤں کے مکھیا یا بڑے بھیا کے ٹریکٹر ٹرالے میں یا ریاستی شاہراہوں پر دوڑنے والی موٹر بسوں

ہیں بیٹے کہ شہر جانے لگے ہیں اور شہری زندگی سے ان کی آشنائی بڑھتی جارہی ہے ـــــ جو گاؤں شہروں سے نزدیک ہیں ان کے لوگوں کو تو شہروں کی ہوا بھی لگنے لگی ہے۔

اس روز دور دور تک دھان کے لہلہاتے کھیت دیکھ کر اس طرح جی خوش ہو گیا جس طرح راہ کو پُر غبار دیکھ کر غالب کا جی خوش ہوا تھا ـــــ برسوں بعد کھیت، سبزہ زار، دھان کے بے شمار ننھے ننھے پودے جو ہوا کے جھونکوں سے انگڑائیاں لیتے نظر آتے - ان پودوں میں پانی لگاتے ہوئے کسان، بیل گاڑیاں، بہتے نالے، کیچڑ، گوبر، گاؤں کی کھلی فضا ان سب کا جی بھر کر نظارہ کیا تھا - یہ بمبئی کی دنیا سے بالکل ہی الگ - ایک چھوٹی مگر خوب صورت دنیا تھی - اور اس میں سانس لینے کا مزہ ہی کچھ اور تھا - بمبئی میں تو سمنٹ کنکریٹ کے لیے دور دور تک پھیلے ہوئے جنگل اور ان کے پہلو میں چھوٹے بڑے جھونپڑ پٹیوں کی قطاریں، سڑکوں، گلیوں اور فٹ پاتھوں پر کوڑا کرکٹ اور غلاظت کے ڈھیر اور مشینی شہر کے مشینی انسانوں کے یکساں شب و روز دیکھ کر تو جی اوب گیا تھا اور شرم کی بات یہ بھی کہ اب اس سارے غیر انسانی ماحول اور معاشرے پہ شرم بھی نہیں آتی تھی۔

مکھیا نے موسم کا خیال رکھتے ہوئے اور ہمارے بے حد منع کرنے کے باوجود لسی بنوائی جس میں گھر کے تازہ اور خالص دہی کا مزہ تھا ـــــ رخصت ہوتے وقت اس نے ایک مطلوبہ جڑی بوٹی کے لیے کسی کو جنگل بھیجنے کا وعدہ بھی کیا اور پھر خود بھی ایک فرمائش کر دی کہ کسی وقت آپ کی گاڑی میں شہر چلیں گے۔

واپسی میں ریاستی شاہراہ پر سڑک کے کنارے کھڑے چار پانچ بچوں نے گاڑی روکنے کے لیے ہاتھ دکھائے۔ میرے کہنے پر اسعد میاں نے گاڑی روکی تو اس "فول بیا بانی" کو دیکھ کر مجھے حیرت انگیز مسرت ہوئی آٹھ آٹھ دس دس برس کے یہ لڑکے اسکول کا یونیفارم پہنے ہوئے تھے ۔ گلے میں سرخ نکٹائیاں بندھی تھیں اور پیٹھ پر بستے لدے ہوئے تھے ـــــ قریب کی ایک بغلی سڑک سے ایک کچا راستہ ان کے اسکول کو جاتا تھا جس کی خاص بات یہ تھی کہ یہ انگلش میڈیم کا اسکول تھا۔ چھٹی کے بعد یہ ریاستی شاہراہ پہ آگئے تھے اور کسی بس کا انتظار کر رہے تھے ۔ جاپانی گاڑی کی ڈکی بہت بڑی تھی - اس میں یہ پانچوں سما سکتے تھے۔ سر ہمیں اگلے گاؤں کے نکڑ تک چھوڑ دیجئے بس آنے میں ابھی کافی دیر ہے، ان میں سے ایک نے بڑی لجاجت سے درخواست کی - اسعد میاں کا دل پسیج گیا اور وہ ڈکی کھولنے کے لیے اُتر ہی رہے تھے کہ ایک لڑکے نے کہا - سر ذرا تھوڑی دیر ٹھہریئے عمران آتا ہی ہوگا -

معلوم ہوا عمران ان کا ساتھی تھا جو پیچھے رہ گیا تھا -

میں نے پوچھا کہاں رہ گئے عمران خاں ؟ تو اس نے دو انگلیوں کو ملا کر دکھا دیں - ہم لوگ خوب ہنسے اور اسعد میاں نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ وہ عمران خاں کا انتظار کرنے کو تیار نہیں تھے۔

معلوم ہوا کہ گاؤں میں جو عام کسان کے بچے روز صبح پیدل جا کر ریاستی شاہراہ تک پیدل جاتے ہیں اور اس طرح بسوں میں سوار ہو کر قریب کے ان انگلش میڈیم اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں جو کاروباری قسم کے لوگوں نے کھول رکھے ہیں۔ کوئی کوئی اسکول تو کئی کئی گاؤں سے تیس کلو میٹر کے فاصلے

پہ ہے۔ دیہاتی ماحول میں ایک عجیب سا حسن پیدا کر دیا تھا ان بچوں نے یہ سب خوشحال کسان زادے تھے جن کے والدین نے کہیں سے یہ سن رکھا تھا کہ انگریزی میڈیم سے پڑھنے والے بچے بہت تیز (اسمارٹ) ہو جایا کرتے ہیں۔ اسعد میاں کے گھر کی طرف مڑنے والی سڑک کے نکڑ پر کالج کا گراؤنڈ ہے۔ وہاں پہونچے تو سڑک پر طلبہ کا ہجوم تھا۔ یہ کوئی راستہ روکو آندولن تھا۔ معلوم ہوا یہ یونیورسٹی کے نام میں تبدیلی کے لیے کوئی تحریک ہے۔ معلوم ہوا کچھ عرصہ پہلے کسی منتری نے یونیورسٹی کا نام برکت اللہ یونیورسٹی رکھ دیا تھا ——— طلبہ کا مطالبہ تھا کہ یونیورسٹی کا نام راجہ بھوج رکھا جائے ——— راجہ بھوج، برکت اللہ سے بہت پہلے گزرے ہیں اور ان کو تالابوں کے شہر کا بانی بھی کہا جاتا ہے لیکن انھیں اصل شہرت گنگو تیلی کی وجہ سے حاصل ہوئی ——— گنگو تیلی نہ ہوتا تو یہ محاورہ کیسے تشکیل پاتا کہ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی .... رہ گئے برکت اللہ تو ان کے نام سے تو بھوپال ہی میں بہت کم لوگ آشنا ہوں گے۔ بھوپال کے باہر تو ہم آپ جیسے پڑھے لکھے لوگوں نے بھی ان کا نام نہیں سنا ہوگا ——— مگر انھوں نے ان کو یاد کیا تو اس کا خاص سبب بھی ہوگا..... اور سبب آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ ویسے برکت اللہ مجاہد آزادی ہی نہیں، ہندوستان کی پہلی جلاوطن حکومت کے وزیراعظم بھی تھے! کیا یہ بھی ہم ہی کو بتلانا پڑے گا کہ یہ جلاوطن حکومت افغانستان میں قایم کی گئی تھی۔ اب آپ سن وغیرہ نہ پوچھیے کیونکہ یہ تو ہمیں بھی یاد نہیں اور تاریخ میں ہم کبھی اچھے نمبر نہیں لایا کرتے تھے۔

ہم کو ایسا لگا کہ طلبا کچھ بے دلی سے نعرہ بازی کر رہے ہیں، ان کی تحریک بھی دراصل کسی سیاسی پارٹی کے اشارے پر شروع کی گئی تھی جب یونیورسٹی کے نام پر گھر میں بحث چھڑی تو ہم نے کہا راجہ بھوج ریاست کا بانی بھلے ہی ہو جنتا کا نمایندہ نہیں ہو سکتا اس وقت جنتا کا نمایندہ یقیناً گنگو تیلی رہا ہوگا لیکن اس بیچارے کی تو قیامت تک کے لیے تحقیر کر دی گئی ہے ——— آخر محاورہ گھڑنے والوں کو کس نے یہ حق دیا تھا کہ وہ سماج کے ایک اتنے اہم فرد کی یوں تحقیر کریں کہ اردو والے ہمیشہ اسے گھٹیا اور راجہ بھوج کو اعلیٰ و ارفع سمجھتے رہیں ——— گنگو تیلی کے ساتھ تاریخ اور ماہرین لسانیات نے جو ناانصافی کی ہے اس کا تقاضہ ہے کہ یونیورسٹی کا نام گنگو تیلی یونیورسٹی رکھ دیا جائے، گنگو تیلی کی کچھ لاج بھی رہ جائے گی اور برکت اللہ اور راجہ بھوج کے حامی بھی چپ ہو جائیں گے۔ لیکن ہماری تجویز کو سن کر لوگ ہنسی میں اڑا گئے۔ بیچارے گنگو تیلی کی قسمت ہی خراب ہے۔ اب تو اس کی نسل سے آئل مل والوں نے گھانی اور بیل بھی چھین لئے ہیں اور کچھ مدت بعد ان کا ذکر بھی صرف کتابوں میں رہ جائے گا۔

آج تو جو لوگ کرسی نشین ہیں وہ اس ملک کے عام آدمی کو اس کا کوئی حق مشکل ہی سے دینے تیار ہوتے ہیں ...... کل جب عمران اور اس کے ساتھی۔ انل، اودے اور فضل بڑے ہو جائیں گے۔ اور کسی طرح کرسیوں تک پہونچ گئے تو کیا یہ کسان زادے کسی عام آدمی کو کوئی اعزاز دے سکیں گے۔ کسی یونیورسٹی کالج یا اسکول کو کسی سڑک یا گلی کا نام کسی کسان، کسی دھوبی، کسی خاکروب کے نام سے منسوب کر کے اپنا رشتہ اپنے گاؤں اور ان کے پیشوں سے جوڑنے کی کوشش کریں گے۔ اگر ایسا ہو سکا تو شاید گنگو تیلی کی روح کو سکون میسر آ جائے جو صدیوں سے راجہ بھوج کی بڑائی اور اپنی تحقیر کا صدمہ برداشت کر رہی ہے ———!

رضا نقوی واہی

ڈاکٹر عبدالمغنی — ایک خاکہ

پرانے زمانے میں بگڑا شاعر اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے مرثیہ گو بن جاتا تھا۔ آج کے دور میں بعض بگڑے شاعر دوسروں کی عاقبت بگاڑنے کے لیے نقاد بن جاتے ہیں ہوتا یہ ہے کہ ابتدا میں شاعری کی گئی۔ کلام کے ایک یا مجموعے بھی چونکا دینے والے ناموں کے ساتھ چھپوائے گئے (مثلاً ۲۵ نظمیں، ۴۴ نظمیں، کچ سوختہ وغیرہ) لیکن جب کسی نے پرِ بھیا کون ہو" کی منزل میں ہی رہنے کسی نے درخورِ اعتنا نہ سمجھا تو انتقاماً اشہبِ قلم کی باگ تنقید نگاری کی جانب موڑ دی گئی اور حشر یہ ہوا کہ

آپ کو اہلِ قلم سے اک کدورت ہو گئی	نظم ہو یا نثر دونوں ہی سے نفرت ہو گئی
آپ کا قبضہ ہوا تنقید کے میدان پر	ایک مصیبت آ گئی شعر و ادب کی جان پر
خامۂ خونخوار نے اک حشر برپا کر دیا	جو بھی زد میں آ گیا اس کا صفایا کر دیا

——— (واہی)

شاعری کا میدان چھوڑ کر بھاگے ہوئے ایسے نقاد جب بقول پروفیسر سید محمد محسن (سابق صدر شعبۂ نفسیات پٹنہ یونیورسٹی) نرگسیت کے شکار ہوتے ہیں تو کریلا چڑھا نیم کی مثل صادق آتی ہے اور ان کی تنقید نگاری جارحانہ انداز اختیار کر لیتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالمغنی بھی شاعری کی پگڈنڈی پر چل کر تنقید کے اکھاڑے میں اترے، لیکن ان کی فطرت میں نرگسیت کا خمیر نہیں ہے، اس لیے شعر و ادب کی جان کے لیے مصیبت نہیں بنے۔ آدمی ہوشیار ہیں، اپنی چودھراہٹ قائم کرنے کے لیے شاعروں اور ادیبوں کی ٹوپیاں نہیں اچھالیں اور نہ ان بیچاروں کی عاقبت بگاڑنے کے لیے اپنے قلم کو خونخوار بنایا۔

عبدالمغنی صاحب کی شعر گوئی کا سراغ مجھے بڑے ڈرامائی انداز میں ملا تھا۔ کوئی بیس برس ادھر کی بات ہے، ہم دونوں ایک ادبی تقریب میں شرکت کی غرض سے رانچی گئے تھے۔ واپسی میں ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی اور ہم سفر نہیں تھا۔ جب گاڑی کھلی تو مغنی صاحب نے فرمایا کہ آیئے آپ کو اپنے کچھ اشعار سناتا ہوں۔ پھر جیب سے نوٹ بک نکالی اور بڑی خوش الحانی سے غزلیں سنانے لگے۔ اشعار صاف ستھرے اور بڑے جاندار تھے۔ مجھے ان کی اس حیثیت کا پتہ معلوم نہیں تھا اس لیے حیرت اور مسرت کی ملی جلی کیفیت میں ڈوب کر کلام سنتا رہا۔ جب وہ جی بھر سنا چکے تو مجھ سے پوچھ

ہت عرصے میں ان کی شاعری کا تذکرہ کسی اور سے نہ کرنا۔ مجھے ان کی اس ادا پر سخت حیرت ہوئی۔ کیونکہ شعرا جب
ک یا دو غزلیں لکھ لیتا ہے تو اس پر اشعار سنانے کا دورہ پڑتا ہے۔ پھر ان اشعار کی تشہیر کے لیے اخبارات اور رسائل
کی خاک چھاننے لگتا ہے۔ اگر غلطی سے کسی نے ایک شعر سنانے کی فرمائش کی تو وہ پوری پوتھی سنانے پر تُل جاتا ہے لیکن
صاحب ایسے حضرات سے مختلف نکلے۔

بہرحال، اس دوران انھوں نے نقادوں کی صف میں اپنا ایک اہم مقام بنا لیا۔ سیکڑوں تنقیدی مضامین لکھے
ڑکی مجموعے بھی منظرِ عام پر آئے۔ بعض مجموعوں کی قیمت اتنی زیادہ رکھی گئی کہ سوائے اسکالروں یا ان حضرات کے جن
ی دستِ غیب یا بیرونی ڈالر کی ہونی منت ہوتی ہے، کوئی دوسرا خرید کر پڑھ نہیں سکتا۔ لہٰذا میں خدا کو حاضر و
ن کر اقرار کرتا ہوں کہ میں ۔۔۔ کے چند ہی مضامین اور وہ بھی گاہے گاہے ادبی رسائل میں پڑھے ہیں۔ اس لیے
ن کی تنقید نگاری کے بار ۔۔ یں کچھ عرض کرنا یا اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ بلکہ مجھے موصوف سے تنقیدی مضامین
۔۔۔ ان کی کھلی، کھری اور صاف و شفاف شخصیت پسند ہے، اور اسی شخصیت کی چند جھلکیاں اس مضمون میں پیش کرنا
ں گا۔

قارئین کی واقفیت کے لیے یہ عرض کرتا چلوں کہ ڈاکٹر عبدالمغنی، پروفیسر شعبۂ انگریزی پٹنہ یونیورسٹی عمر کے لحاظ سے میرے
صاحب زادے سے دو تین سال بڑے ہیں۔ لیکن میں ان کو اپنے آن بے تکلف دوستوں کی صف میں شمار کرتا ہوں جو خود
ے دو چار برس بڑے ہیں، یا ہم عمر ہیں۔ عمر کے اس تفاوت کے باوجود ذہنی ہم آہنگی نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب کر رکھا ہے
میں اپنی ایک کمزوری بیان کروں۔ طبیعت کا ضدی واقع ہوا ہوں۔ اگر کسی کام کا بیڑا اٹھاتا ہوں تو ہزاروں رکاوٹوں
ا لفتوں کے باوجود اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہی مزاج عبدالمغنی صاحب کا بھی ہے۔ مزاج کی اسی
TENACIT کی وجہ سے میں انھیں ایک جنگلی چوپائے سے تشبیہ دیتا ہوں، جو دائیں بائیں دیکھے بغیر اپنے شکار کی جانب
ی دوڑ لگاتا ہے۔ اور ایک ہی جھٹکے میں اس کا وار انیارا کر جاتا ہے۔ ترکی بہ ترکی جواب یا "من ترا حاجی بگویم" کے
یں مغنی صاحب بھی مجھے اسی سیدھی دوڑ لگانے والے جاندار سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ مزاجی ہم آہنگی کا ایک واقعہ
مثال پیش کرتا ہوں۔

۱۹۶۵ء میں چند دوستوں نے جن میں عبدالمغنی صاحب پیش پیش تھے طے کیا کہ ڈاکٹر اختر اورینوی کی ادبی
ت کے اعتراف کے طور پر ایک رسالے کا اختر نمبر نکالا جائے۔ ابتدا میں اختر صاحب نے اس پروگرام کی مخالفت کی
ہماری ضد کے آگے انھیں جھکنا پڑا۔ پٹنہ میں ایک صاحب "ساغر" نام کا ایک ماہنامہ نکالتے تھے۔ انھیں راضی
ا کہ اختر نمبر اسی رسالے کے نام پر نکلے۔ مضامین حاصل کیے جانے لگے۔ کتابت شروع کرا دی گئی۔ فنڈ کی فراہمی
یے تگ و دو کی جانے لگی۔ اتنے میں چند مفاد پرست حضرات نے اس پروگرام کی شدت سے مخالفت شروع کر دی۔
صاحب (مرحوم) پر دباؤ ڈالا جانے لگا کہ وہ اپنی منظوری واپس لے لیں۔ ایک ماہنامہ اور ایک ہفت روزہ میں
علانات شائع کیے جاتے کہ ساغر کا اختر اورینوی نمبر ایک جعلی منصوبہ ہے جو کبھی شائع نہیں ہو پائے گا
لہٰذا مضمون نگار حضرات مضامین نہ بھیجیں۔ شہر کے ادبی حلقوں میں مخالفت کا ایک بھونچال سا آ گیا۔ ایسا معلوم

کرسکے۔ کوشش کی گئی کہ کاتبوں کے یہاں چھاپہ مار کر جو مواد برائے کتابت دیا گیا تھا، اسے ہتھیا لیا جائے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ساغر کے ایڈیٹر نے صاف صاف کہہ دیا کہ اختر نمبر ان کے ادارے سے نہیں نکلے گا۔ ایسے وقت میں خود اختر صاحب بھی اس پروپگنڈہ سے خائف ہو گئے، ہمارے ساتھ مل کر کام کرنے والے چند نوجوان ساتھی بھی ڈھیلے پڑ گئے۔ ہمارے لیے یہ بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ اختر صاحب نے مجھ سے کہا کہ نمبر نکالنے کا ارادہ ملتوی کر دو، میں نے جواب دیا کہ یہ ناممکن ہے، میں نے جواب دیا کہ یہ ناممکن ہے، خواہ کتنی ہی مخالفت کیوں نہ ہو۔ عبدالمغنی صاحب کا بھی یہی اٹل فیصلہ تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ کس نام سے نمبر نکلے۔ مغنی صاحب کے پاس ریڈی میڈ جواب موجود تھا۔ مسکراتے ہوئے کہنے لگے کہ ـــــ ساغر نو ـــــ کے نام سے (جس کا کوئی وجود نہیں تھا) نمبر نکالا جائے گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ چھ سو صفحات پر مشتمل "ساغر نو" کا اختر اورینوی نمبر آب و تاب سے نکلا۔ ایسے آڑے وقت میں مغنی صاحب نے میرا ساتھ دے کر عزتِ سادات بچا لی۔ آج "ساغر" کا نام تک کوئی نہیں جانتا جبکہ "اقلیدس کا فرضی نقطہ" سمجھا جانے والا "ساغر نو" ادبی دنیا میں آج بھی اختر اورینوی کے فکر و فن اور ان کی شخصیت کی شناخت کے لیے ایک معتبر دستاویز ہے۔

ڈاکٹر عبدالمغنی کی ذات بابرکات ایک ایسی کثیر المقاصد، خودکار مشین جیسی ہے، جس میں لاتعداد بٹن لگے ہوں۔ بٹن دباتے جائیے، اُن کی مختلف النوع تصویریں ابھرتی جائیں گی۔ مدرسہ شمس الہدیٰ کے فارغ التحصیل یونیورسٹی میں شعبۂ انگریزی کے سینیر پروفیسر، بہار انجمن ترقی اُردو کے صدر، کوئی موضوع ہو، قلم برداشتہ تحریر، یا برجستہ تقریر کرنے میں ماہر، سیاسی پلیٹ فارم ہو یا محفل میلاد، رمضان المبارک میں محلے کی مسجد میں تراویح پڑھانی ہو یا نمازیوں کی امامت کرنی ہو، ادبی سمینار میں حصہ لینا ہو یا مشاعرہ کی صدارت کرنی ہو، ہر جگہ حاضر۔ اردو کا مسئلہ ہو یا مسلم پرسنل لا کی بات، وفد کے ساتھ وزیر اعلیٰ سے مل رہے ہیں، انگریزی اخبارات اردو اخبارات میں دھڑا دھڑ بیانات چھپوا رہے ہیں۔ تنظیمی صلاحیت ایسی کہ انجمن ترقی اردو، جو کبھی شاعر کے معشوق کی کمر کا درجہ رکھتی تھی، آج اُردو کی وکالت کا ایسا زبردست ادارہ بن گئی ہے جس کی کوششوں سے اُردو کو ریاست بہار میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل کر رہا۔ کنجوسی کی حد تک ایماندار ہیں۔ انجمن کے صدر ہونے کی حیثیت سے چاہتے تو اپنے گھر پر ٹیلی فون لگوا لیتے۔ لیکن ٹیلی فون صدر دفتر میں لگوایا۔ ایک سکنڈ ہینڈ موٹر خرید لیجئے تو پٹنہ جیسے حریفِ زلفِ دراز، شہر میں انجمن کے کام یا ضرورت مندوں کی سفارش پیروی کرنے کے لیے گھر سے باہر نکلنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ گھنٹوں رکشے یا بھٹری وہیلر کے لیے سڑک پر کھڑے انتظار پر ساغر کی زحمت سے بچ جاتے۔ تیز پٹرول پر جتنی رقم خرچ ہوتی اُس سے بہت زیادہ رقم دوسری سواریوں پر اپنی جیب سے خرچ کرنا پڑتی۔ لیکن یہ پیر مجکار مولوی اور واعظ حق پرست ہیں، انجمن کے پیسے اپنی ذات پر خرچ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اختر اورینوی کے بعد ایسی چو مکھی اور فعّال شخصیت ریاست بہار میں فی الحال کوئی دوسری نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ معشوق ہزار دوست ہوتے ہوئے بھی مجھے بہت عزیز ہیں۔

بہرحال مندرجہ بالا مصروفیات انھیں شہر عظیم آباد تک ہی محدود نہیں رکھتیں بلکہ ریاست بہار کے

مختلف مقامات کے علاوہ ملک کے طول و عرض میں بھی دور دور تک لے جاتی رہتی ہیں جس کے نتیجے میں کبھی کبھی ہفتوں بلکہ مہینوں وطن عزیز سے غائب رہتے ہیں۔ عرصہ ہوا ایک بار جب وہ بہت دنوں تک پٹنہ سے باہر رہے تو میں نے تفریحاً ایک نظم لکھ کر ایک ہفت روزہ میں چھپوا دی۔ موضوع یہ تھا کہ ــــــ

" ایک اخبار میں دو خبریں شاہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئیں۔ پہلی خبر یہ تھی کہ ڈاکٹر عبدالمغنی کسی جلسے کی صدارت کے لیے مظفر پور گئے ہیں۔ دوسری خبر تھی کہ شہر مظفر پور میں دفعتاً مرغوں اور انڈوں کی قیمت آسمان سے باتیں کرنے لگی ہے۔ دس دنوں کے بعد اسی ہفت روزہ میں پھر دو خبریں شائع ہوئیں۔ ایک خبر کی شاہ سرخی یہ تھی کہ ڈاکٹر عبدالمغنی مظفر پور سے واپس گئے۔ دوسری خبر تھی کہ شہر میں مرغوں اور انڈوں کی قیمت گھٹ کر اعتدال پر آگئی"۔

عبدالمغنی صاحب نے میری نظم پڑھنے کے بعد اخبار کے اس شمارے کو اپنے سفری بیگ میں محفوظ کر لیا۔ اس کے بعد جب بھی پٹنہ سے باہر گئے تو جہاں بھی ٹھہرے وہاں سب سے پہلے اخبار کا وہ شمارہ میزبان کو پڑھنے کے لیے دیا۔ سمجھدار میزبان نے اشارہ پاکر بھر کھانے میں اپنے مہمان خصوصی کو مرغ مسلّم کھلایا۔ یہ سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ اب صاحب موصوف کو وہ اخبار ساتھ رکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ کیونکہ ملک بھر میں پھیلے ہوئے میزبان حضرات جناب عبدالمغنی اور مرغ کو لازم و ملزوم سمجھنے لگے۔ اسی موضوع پر میں نے دو منظوم خطوط انھیں لکھے تھے ــــــ ایک آزاد اور دوسرا پابند۔ دونوں کے اقتباسات قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کر رہا ہوں۔

(۱)

آپ بھی خوب ہیں اے حضرت مغنی واللہ
کیوں نظر آپ کی بدلی ناگاہ
ایک عرصے سے ہوئی ہے نہ ملاقات نہ بات
خشک ہے پیڑ روابط کا کوئی ڈال نہ پات
نہ وہ ورسم کی گھنگھور گھٹا ہے نہ ملن کی برسات
یہ چلن آپ کا پہلے تو نہ تھا
گھر کے بھیدی کا یہ کہنا ہے کہ مرغوں کی کشش
کرتی ہے آپ کو آمادۂ کوچہ گردی
خواہ وہ موسم گرما ہو کہ فصلِ سردی
مجلس وعظ میں شرکت کا بہانہ کر کے
آپ رانچی کبھی جاتے ہیں، کبھی بھاگلپور
وعظ و تقریر تو پردہ ہے حقیقت یہ ہے
رکھ دیا مرغ مسلّم نے دیوانہ کر کے
بہر تقریر تو اختر[1] بھی بہت جاتے ہیں
مجلس شعر میں ناچیز بھی ہوتا ہے شریک
منتظم دے کے فقط داد ہی ٹرخاتے ہیں
شاذ ہی مرغ مسلّم ہمیں ہوتا ہے نصیب
میزبان آپ کے لیکن ہیں عجیب
جو کہ ٹیبل پر فقط مرغ رہا کرتے ہیں
پالنے والے سے اب ہم یہ دعا کرتے ہیں
کہ خدایا ہمیں مغنی سی عطا ہو قسمت
محفل شعر و تقاریر میں جب بھی ہو ہماری شرکت
حضرات اختر و ناچیز کو بھر کھانے میں
مرغ و ماہی سے نوازا کرنا

---

[1] ڈاکٹر اختر اورینوی مرحوم

عشق حقیقی شکم و روح کو تازہ کرتا   ایک بات اور کروں گوش گزار
آیئے جب بھی سفر سے واپس   یافت جو کچھ بھی ہو اس میں بھی حصہ دیجئے
کم سے کم ایک جواں مرغ کی قیمت ہی سہی   ورنہ ہم یہی کرنا چاہیں گے جناب اختر
یہی مشہور کریں گے گھر گھر   وعظ و تقریر پہ کچھ کام رہا کب ان کا
نہ ادب سے نہ سیاست سے ہے مطلب ان کو   کیوں بھلا جائیں کہیں قوم کا وہ غم کھانے
وہ تو جاتے ہیں فقط مرغ مسلم کھانے

(۲)

مانا کہ قرار آپ کے معدے کو نہیں ہے   مانا کہ کشش مرغِ مسلّم میں سوا ہے
اور اس کے بلاوے پہ ہیں سرگرم سفر آپ   قدموں تلے ٹاٹا تو کبھی ارضِ حجا ہے
ہر موسوی صاحب کا یہ حقِ تشکی ہے   واللہ مجھے اس کی شکایت نہ گلا ہے
البتہ یہ کہنے کی تو چاہوں گا اجازت   معدے کے اوپر تہ پہ اک دل بھی پڑا ہے
کیا آپ کو اس دل نے کبھی یہ نہیں ٹوکا   دو حرف کا اک کارڈ رقم کرنے میں کیا ہے
میزانِ تعلق پہ مجھے مرغ سے تولا
واللہ نیا باب کرم آپ نے کھولا

آخر میں قارئین کرام سے عرض ہے کہ ڈاکٹر عبدالمغنی کی مرغ پسندی کا تذکرہ محض ادبی داستان کے لیے ہے ، حرف بہ حرف حقیقت پر مبنی نہ سمجھا جائے۔ وہ ایک نارمل مولوی صفت انسان ہیں جو دسترخوان پر چنے جانے والے ف الاقسام ماکولات و خواکہات سے اتنی شدید رغبت اور دلچسپی رکھتے ہیں جتنی قاب میں پڑے مرغ بریاں یونکہ خدا کی جملہ نعمتوں سے (بشرطیکہ خوش ذائقہ اور اشتہا آور ہوں) کسی حال میں بھی وہ انکار کر کے گنہگار نہیں چاہتے۔

اس مختصر سے خاکے میں ڈاکٹر عبدالمغنی کی ڈائنامک شخصیت کا تفصیلی جائزہ پیش کرنا ممکن نہیں تھا لہٰذا ان چند رکو ان کی مصروف اور رنگا رنگ زندگی کی فلم کا ٹریلر سمجھا جائے —— اور اسی پس منظر میں ——

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

اپریل ۱۹۹۰ء
تا

ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی

اردو کی پہلی کتاب (جدید) کے چند اسباق

سبق ۱ : ڈاکیہ

ڈاک پہنچانے والے سرکاری آدمی کو ڈاکیہ کہتے ہیں۔ (کچھ اہل زبان ڈاکیہ کو ڈاکو کی جمع) سمجھتے ہیں۔ ان سے خدا بچائے ...ہ سے عوام کو دو خاص شکایتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ڈاک دیر سے پہنچاتا ہے۔ وہ جلدی ڈاک پہنچائے کا کیسے؟ اس ...خواہ اتنی قلیل ہوتی ہے کہ کسی طرح دال دلیا کھا کر گزارا کرتا ہے۔ ترقی والے کے بارے میں تو وہ سوچ بھی نہیں ...تا۔ تیزی سے کام کرنے کی طاقت آئے کہاں سے؟ لوگ بھی عجیب ہیں۔ جب انہیں پسینجر ٹرین میں منٹوں کا سفر گھنٹوں میں کرنا پڑتا ہے تو کچھ نہیں کہتے۔ ڈاکیہ ذرا دیر سے ڈاک پہنچائے تو آسمان سر پہ اٹھا لیتے ہیں یہ صحیح ہے کہ اس کے ...ں ایک سائیکل بھی ہوتی ہے۔ لیکن آپ نے اس کی سائیکل کی حالت پر کبھی غور کیا ہے؟ یہ ڈاکیہ کی زبوں حالی کی چلتی پھرتی ...یر ہوتی ہے۔ یہ اس لائق نہیں ہوتی کہ اس پر سواری کی جاسکے۔ ڈاکیہ اسے کمہار کے گدھے کی طرح بوجھ ڈھونے لیے استعمال کرتا ہے۔ وہ اس کے کان پکڑے پیدل چل کر ڈاک بانٹتا ہے۔ اس کے لیے ذرا دیر ہو جاتی ہے تو اس میں ...بیچارے ڈاکیہ کی کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ ہم ہی پتہ غلط لکھ دیتے ہیں۔ لہذا مکتوب الیہ کا پتہ نہ چلنے پر خط ضائع کر دیا جاتا ہے۔
ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا خط وقت پر اور صحیح ہاتھوں میں پہنچے تو ہمیں بیرنگ خط لکھنا چاہیئے۔

ڈاکیہ سے متعلق دوسری شکایت یہ ہے کہ وہ لفافہ دیکھ کر نہ صرف مضمون بھانپ لیتا ہے بلکہ پڑھ بھی لیتا ہے یہ ...عام غلط فہمی ہے ڈاک خانے کا گوند ہی ایسا ہوتا ہے کہ لفافہ ٹھیک طرح سے بند نہیں ہوتا اور سارٹنگ sorting ...ادھر ادھر ہونے پر خود بخود کھل جاتا ہے۔ اس میں ڈاکیہ کیا کر سکتا ہے؟

ڈاکیہ کا یونیفارم کھیا لیش شرٹ، پینٹ اور ٹوپی ہے۔ اس یونیفارم کی خوبی یہ ہے کہ اسے بار بار دھونے کی ضرورت ...پڑتی۔ اس کا رنگ ہی ایسا ہے کہ دھونے پر بھی میلا کچیلا ہی نظر آتا ہے۔ اس لیے ڈاکیہ اسے مہینے میں ایک آدھ بار (جی میں ...ر تو) دھو لیتا ہے اس طرح صابن اور یونیفارم کی بچت ہوتی ہے (بار بار دھلنے سے کپڑا پھٹ جاتا ہے نا)
محکمہ ڈاک کے بڑوں کو یونیفارم کے رنگ کے انتخاب کے لیے داد دینا چاہیئے۔

مشق

چلتی پھرتی تصویر سے تم اور کیا سمجھتے ہو؟ تفصیل سے لکھو؟
تمہارا خط مکتوب الیہ کو کبھی نہ پہنچے اس کے لیے تم کیا ترکیب لڑاؤ گے۔؟

۱۴۔ منی آرڈر پہنچانے کا کام تمہارے ذمے کر دیا جائے تو کیا رہے گا ؟

سبق ۲ : ٹیچرس روم

اسکول کا وہ کمرہ جہاں ٹیچرس (teaching) یعنی درس و تدریس کو چھوڑ کر دنیا جہان کے موضوعات زیر بحث لاتے ہیں ٹیچرس روم کہلاتا ہے۔ ٹیچرس روم اپنی شکستہ حالی کے باعث دور ہی سے پہچانا جاتا ہے اسے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، دیواروں کا اکھڑا ہوا پلاسٹر اترا ہوا رنگ وروغن۔ کھڑکیوں کے ٹوٹے ہوئے پٹ دروازے کی چٹخی ہوئی دراڑیں جن سے جھانک کر اندر کا حال معلوم کیا جا سکے۔ ٹوٹا پھوٹا فرنیچر المونیم کے پچکے ہوئے گلاس پانی کا گندہ مٹکا اور اس کے اطراف تھوکی ہوئی پان پیک کی رنگا رنگ رنگت اگلدان کا کام دیا، دیواروں پر کوئلے سے لکھے بے وزن اشعار اور عمر رسیدہ ٹیچرس بیہودہ مذاق کرتے بے ہنگم قہقہے اچھالتے جونیئر ٹیچرس پر لگے اخبارات یہ سب ٹیچرس روم کے اجزا ترکیبی ہیں۔ ٹیچرس روم میں کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ چار کھڑکیاں ہوتی ہیں۔ جو متضاد سمتوں میں کھلتی ہیں۔ کھڑکیوں سے جھانک کر سڑک پر دور تک نظر دوڑائی جا سکتی ہے۔ آتی جاتی رونقوں سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ چائے پان بیڑی والے کو آرڈر (order) دیا جا سکتا ہے۔ موسم کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پاس پڑوس کی خیریت معلوم کی جا سکتی ہے۔ پڑوسیوں میں جھگڑا ہونے پر صلح صفائی کرائی جا سکتی ہے۔ دلاسا دیا جا سکتا ہے۔ معاملہ خواتین کا ہو تو آنسو پونچھنے کے لیے ایثار و مال پیش کیا جا سکتا ہے اور حالات زیادہ سازگار ہوں تو ایک عدد عشق بھی لڑایا جا سکتا ہے۔

جتنے ٹیچرس اتنے موضوعات ٹیچرس روم اس ریڈیو کی طرح ہوتا ہے جس میں بیک وقت کئی اسٹیشن بجتے ہیں۔ چند موضوعات نہایت مرغوب ہیں۔ جیسے غیبت، جو ٹیچر ٹیچرس روم سے غائب ہوتا ہے اس کی غیبت کی جاتی ہے کوئی برا نہیں مانتا کیونکہ سبھی جانتے ہیں کہ یکے بعد دیگرے ہر ایک نشانہ بنتا رہتا ہے (اس حمام میں سبھی ننگے ہیں)

ڈی اے ایچ آر اے یا بیسک پے میں اضافہ بھی رال ٹپکنے والا موضوع ہے۔ کتنے پیسے بڑھ رہے ہیں؟ کس تاریخ سے ملیں گے، کب تک ملیں گے؟ کتنے G.P.F. سے قرض نکال کر حاصل کرتے ہوں گے۔ اور یہ کہ ملنے والی رقم کے نام پر کتنے لوگوں سے قرض لیا جا چکا ہے اور کتنوں سے لیا جا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ

ٹیچر وہ قوم ہے جسے دولت کی دیوی کا شراپ ہے۔ تنخواہ کتنی ہی ہو جائے قرض سے اسے چھٹکارا نہیں، ہر ماہ تنخواہ کا انتظار کرتا ہے۔ اور دوسری تاریخ سے اگلے ماہ کی تنخواہ کے انتظار میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کب Adjustment ہو سکے۔ ٹیچرس روم میں اس کا زیادہ وقت گھر کا ماہانہ بجٹ بنانے رد کرنے اور بنانے میں گزرتا ہے تاہم پھر بھی اسے اس ادھیڑ بن سے چھٹکارا نہیں ہوتا۔ سچ تو ہے۔ ٹیچر گھریلو پریشانیوں میں گھرا رہے گا تو پڑھائے گا کیا خاک!!

کبھی کبھی وہ اپنی معاشی بدحالی کے چکر ویو سے جادوئی انداز میں باہر نکلنے کے لیے سٹے کی لعنت میں پڑ جاتا ہے۔ پھر اعداد کے چکر میں اس کا ذہنی سکون نو دو گیارہ ہو جاتا ہے۔ اور قرض دن بدن بڑھتا جاتا ہے۔ ٹیچرس روم اس وقت اس کے لیے پناہ گاہ بن جاتا ہے جب کوئی قرض خواہ وصولی کے لیے اسکول پہنچ جاتا ہے وہ اپنے ساتھی سے [illegible]
[illegible]

ساتھی اساتذہ یہ کام بڑی فنی چابکدستی سے کرتے ہیں. کیونکہ ایسے مواقع آئے دن ان پر بھی آتے رہتے ہیں۔

ٹیچرس روم میں لکڑی یا لوہے کی الماریاں بھی ہوتی ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ جیسے ہی ان میں کوئی قیمتی چیز جیسے فاؤنٹن پن، ہینڈ بیگ، لائٹر، کتاب پہنچتی ہے، دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو جاتی ہے۔ جبکہ یہ مقفل ہوتی ہیں یہ راز اب تک صیغہ راز میں ہے۔ کہ مقفل الماریوں سے چیزیں کیسے غائب ہو جاتی ہیں۔ سبھی ٹیچرس اس ضمن میں تاسف کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ .. برقی پنکھا بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ عموماً out of order ہوتا ہے۔ یہ بھی غنیمت ہے کم سے کم ٹیچرس کو یہ احساس تو نہیں ہوتا کہ ٹیچرس روم میں پنکھا نہیں ہے۔ اگر پنکھا نہ ہو تو گرمی کا احساس بہت بڑھ جاتا ہے۔ یہ نفسیاتی نکتہ ہے۔ جس کا اسکول کے ذمہ داران خیال رکھتے ہیں۔ ٹیچرس روم میں پائے جانے والے گلاسوں میں کبھی کبھی سوراخ بھی پائے جاتے ہیں۔ ان سوراخوں کا ٹیچرس کی جسمانی صحت پر خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ ان گلاسوں کے روزانہ استعمال سے اچھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے۔ بدن میں چستی اور پھرتی پیدا ہوتی ہے۔ اور موٹا موٹا کوڑا کرکٹ بھی بہہ نکلتا ہے۔

صبح سویرے باسی پانی کا ایک گلاس قبض اور دوسرے کئی امراض کے لیے مفید ہوتا ہے۔ اس لیے چپراسی کبھی ایک دن کبھی دو دن کے وقفے سے پانی بھرتا ہے ان کی تندرستی کا خیال رکھتا ہے۔ برسات میں اسے مٹکا نہیں بھرنا پڑتا۔ چھت کے سوراخوں کے ٹپکوں سے مٹکا اپنے آپ بھر جاتا ہے۔ اور یہ بھلا اچھا ہوتا ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ بارش کے جمع شدہ پانی کا استعمال بہت سی بیماریوں کو انسان کے نزدیک پھٹکنے نہیں دیتا

مشق

۱۔ ٹیچرس روم کی کھڑکیوں کے وہ فائدے تفصیل سے بیان کرو جو اس سبق میں نہیں بتلائے گئے ہیں۔
۲۔ ٹیچرس روم کی الماریوں کا راز اپنے ٹیچر سے معلوم کرنے کی کوشش کرو؟
۳۔ چپراسی ٹیچرس کی صحت کا پورا خیال رکھتا ہے۔ لیکن صحت خود اس کی بنتی ہے ٹیچرس کی نہیں، ایسا کیوں ہے؟
۴۔ تم ٹیچر بننا پسند کرو گے یا چپراسی؟

سبق ۳ : ادبی محفل کا صدر

دیگر محفلوں کی طرح ادبی محفل کا بھی ایک عدد صدر ہوتا ہے۔ عموماً سب سے بزرگ شخص کو صدر بنایا جاتا ہے۔ (جس طرح کسی ٹوٹی پھوٹی فرسودہ چیز کو بطور یادگار رکھ چھوڑتے ہیں) اچھا بھی یہی ہے۔ روایتی چیزیں اب out of fashion ہو گئی ہیں۔ ادب میں بھی ادب جدید کا بول بالا ہے۔ ڈسکو گیتوں کے زمانے میں بھیرویں اور ٹھمری کون کون سنے گا؟

ادبی محفل کا صدر بننا جوکھم کا کام ہے اپنی باری آنے سے پہلے اسے تمام شرکا کی تخلیقات بڑے صبر و تحمل سے سننا پڑتی ہیں۔ صدر بننے کے سلسلے میں گھنٹوں ایک جگہ بیٹھے رہنے کی عادت لازمی قابلیت کی حیثیت رکھتی ہے۔ ریٹائرڈ بزرگ اس ضمن میں نہایت موزوں واقع ہوتے ہیں کسی ادبی محفل کے صدر کی حالت عبرتناک ہوتی ہے۔ وہ محفل میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ سب کی نگاہیں اس پر لگی رہتی ہیں اس کی حرکات و سکنات پوری محفل کو متاثر کرتی ہیں۔ کرسی کے کھٹمل اسے کاٹیں اور وہ کسمسا نہیں سکتا۔ مچھر اس [illegible]

سب کی دلجوئی کرتے کے لیئے یا یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ صدر ہوتے پر مسرور ہے۔ حالانکہ وہ مجبور ہے۔ اسے جماہی بھی آئے تو وہ رومال کا سہارا لے کر اس کا گلا گھونٹ دینا پڑتا ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ کسی کی نظر نہ پڑے۔ اگر وہ آزادانہ طور پر جماہی لے گا تو تخلیق پیش کرنے والا فن کار یہ سوچ کر کہ صدر محفل بور ہو رہا ہے۔ نروس ہو گا سامعین پر بھی اس کی جماہی کا اثر ہو گا۔ انہیں سستی آنے لگے گی۔

اکثر ادبی محفلوں کی صدارت غیر ادبی شخصیتوں کو دی جاتی ہے جو مناسب بھی ہے ایسا آدمی جو ادب سے علاقہ نہیں رکھتا کامیاب صدر واقع ہوتا ہے کیونکہ تمام وقت اس کا چہرہ ٹی وی نیوز ریڈر کی طرح سپاٹ رہے گا۔ کوئی تاثر اس کے چہرے پر نہیں آئے گا اور بور فن کار بھی سمجھے گا کہ وہ فلاپ نہیں ہوا (بلکہ کامیاب رہا) اس طرح اس کی حوصلہ افزائی ہوگی اس کے برعکس شخص کو بڑی پریشانی ہو گی۔ اسے حتی الامکان کوشش کرنی ہوگی کہ بوریت کے تاثرات چہرے سے عیاں نہ ہوں۔ دوسری صورت بور فن کار سے دشمنی مول لینے کے مترادف ہو گی اور اس دشمنی کا خمیازہ کسی اور محفل میں ہوٹ ہونے کی صورت میں بھگتنا پڑے گا۔

صدر محفل نازک ہو تو ادبی محفل سننے کے ساتھ ساتھ دیکھنے کی چیز بھی ہو جاتی ہے۔ کسی ہوٹنگ کرنے والے سامع کو ادبی محفل کا صدر بنا دیا جائے تو پروگرام امن و امان اور سکون کے ساتھ جاری رہ کر ہٹ ہو سکتا ہے جس طرح کسی شریر ترین لڑکے کو کلاس کا مانیٹر بنا دینے پر کلاس میں خود بخود ڈسپلن قائم ہو جاتا ہے۔

مشق

۱۔ تمہیں کون کون سے ڈسکو گانے یاد ہیں؟
۲۔ کیا تم ڈسکو ڈانس جانتے ہو؟ اگر نہیں جانتے تو وجوہات لکھو؟
۳۔ کیا تم کسی ادبی محفل کا صدر بننا پسند کرو گے؟

تفصیلاتِ ملکیت بابت ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد تحت دفعہ ۸۔ فارم نمبر ۴

مقام اشاعت :	۳۱ بیچلرز کوارٹرس معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۱
وقفۂ اشاعت	ماہنامہ
مدیر، طابع و ناشر	سید مصطفیٰ کمال
قومیت و پتہ	ہندوستانی، ۶-۷۶۸-۱۷ دبیر پورہ، حیدرآباد ۲۳

نام حصہ داران جن کا ایک فی صد سے زائد حصہ ہے۔ مسز قیصر کمال
۶-۷۶۸-۱۷ دبیر پورہ، حیدرآباد۔ ۲۳

میں سید مصطفیٰ کمال مدیر، طابع و ناشر شگوفہ اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کی حد تک صحیح ہیں

مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۹۰ء دستخط سید مصطفیٰ کمال

حیدر بیابانی (اچل پور)

مسائلِ آمد و رفت

موت کا سامنا زندگی میں ایک ہی بار ہوا کرتا تھا وہ بھی زندگی کے آخری لمحات میں اور اس کے بعد اللہ اللہ خیر صلا. ... . اس وقت وہ لوگ خوش قسمت گردانے جاتے جو موت کے منہ سے یعنی بیماری یا جنگ سے بچ آتے تھے۔ لیکن ی دوڑتی بھاگتی دنیا میں جب آدمی گھر سے نکلتا ہے تو اُسے ایک دن میں بار بار اور جا بجا موت کا سامنا کرنا پڑتا ۔۔ چاہے وہ شخص پیدل چل رہا ہو یا سائیکل سے، موٹر سائیکل پر ہو یا موٹر کار میں۔ ریل گاڑی میں لیٹا ہو یا ہوائی جہاز بیٹھا محو پرواز ہو ہر جگہ ملک الموت ہم سفر ہوتا ہے اور موقع کی تلاش میں رہتا ہے کہ کب اپنا کام انجام دے۔

قبروں کے لیے کتبے تیار کرنے والے سے مذاقاً ایک شخص نے کہا "تم تو ہمیشہ دعا کرتے ہوگے کہ جلد کوئی شخص مرے تمہیں کتبہ بنانے کا آرڈر ملے۔" اس نے جواب دیا مجھے دعا کرنے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی مجھے جیسے ہی پتہ چلتا ہے ہر کسی شخص نے کار یا موٹر سائیکل خرید لی ہے یا وہ کسی لمبے سفر پر جا رہا ہے تو ویسے ہی اس کا کتبہ بنانا شروع کر دیتا ہوں۔"

آج کل آمد و رفت کے ذرائع اتنے زیادہ اور اتنے تیز ہو گئے ہیں کہ ہر لمحہ زندگی خطرے سے دوچار ہے وہ بھی کیا زمانہ ا جب دنیا میں اتنی کاریں، ریلیں اور موٹر سائیکلیں نہ تھیں، نہ اتنا بھیڑ بھڑکا ہوتا نہ اتنا شور شرابا ہوتا۔ بیلوں کے گلے بجتی گھنٹیوں کے ساتھ صبح سویرے اٹھ جانا اور سرِ شام کسی تانگے پر سوار ہو کر یا سائیکل چلاتے چلاتے گھر لوٹ آنا معمولات میں ل تھا۔ نہ ایکسیڈنٹ کا ڈر نہ ٹانگ ہاتھ ٹوٹ جانے کا خوف۔ اب تو اس تیز رفتار دور میں گھنٹیوں کی مدھر آوازیں، گھوڑوں ٹپ ٹپ اور سائیکلوں کی ٹن ٹن غائب ہو چکی ہے۔ اب تو موٹروں کی گھر گھر، جہازوں کی بھر بھر اور ریلوں کی دھڑ دھڑ کے ہ دل دھڑک دھڑک کے سینے سے باہر آنے لگتا ہے۔ ایک جان کو اتنے خطرے لاحق ہو گئے ہیں کہ اب گھر سے نکلنے سے پہلے بازو ام ضامن باندھ لینا ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔ ہم تو خیر ایک چھوٹے سے ترقی پذیر شہر میں ذرا سکون سے رہتے ہیں لیکن آئے ا بڑے بڑے شہروں کا دورہ بھی رہتا ہے اس لیے ہم اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر کہہ رہے ہیں کہ آج کل ایک سیدھے سادے شہری کے لیے سرکس کا کرتب باز بننا اشد ضروری ہو گیا ہے اگر وہ ایسا نہ کرے تو اپنی زندگی سے کسی بھی جگہ کسی موڑ پر ہاتھ دھو لے۔ چلتی ٹرین پر سوار ہوتے منچلے، بسوں کے فٹ بورڈ پر لٹک کر سفر کرتے بہادر، فراٹے بھرتی سٹی بس بیٹھے اترتے شہری، ہوا سے باتیں کرتی کاروں کو اوور ٹیک کرتے ہوئے موٹر سائیکل سوار وغیرہ وغیرہ یہ سب سرکس کے

حرکت باز نہیں تواد کیا ہیں۔ اس کے علاوہ بھی سڑک پار کرتے ہوئے جس چستی پھرتی کا مظاہرہ کرنا ضروری ہوتا ہے وہ ایک کرتب باز کا ہی حصہ ہے۔

دنیا میں رہتے ہوئے بھی اگر کوئی شخص بے فکری سے چلت پھرت کا مظاہرہ کرے تو وہ دن دور نہیں ہوگا جب اس کی جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ اب تو گھر میں سونا یا آنگن میں بیٹھنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ ہمارے قریبی شہر امراوتی کی مثال ابھی تازہ تازہ ہے کہ کیسے ایک موٹر ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب کے آنگن میں دن دہاڑے دندناتی ہوئی گھس آئی اور بے چارے ڈپٹی صاحب کے ہاتھوں میں موت کا پروانہ تھما گئی۔

ٹریفک کی بد انتظامی کے لیے ایک عام شہری سے لے کر سرکاری و نیم سرکاری محکمے سب ہی ذمہ دار ہیں۔ اوبڑکھابڑ سڑکیں، سڑکوں کے آس پاس پڑے مٹی کے ڈھیر، بیچ راہ میں تنے شامیانے و منڈوے، رکتی چلتی باراتیں، ناچتے، پھدکتے باراتی، سنگل سیٹ سواری پر تین تین چار چار سوار، فلموں کے اشتہار، دس فٹ، لاری پر لدی بیس فٹ لانبی سلاخیں ہاتھ ٹھیلوں پر لدے قطب مینار، چلتی ہوا کے ساتھ اڑتی دھول یہ سب بد انتظامی و اصول شکنی کی زندہ جاوید مثالیں ہیں جن کی وجہ سے کوئی زخمی ہو کر اسپتال کا راستہ ناپتا ہے یا کوئی مردہ بن کر چار کاندھوں پر سوار قبرستان یا شمشان سدھارتا ہے۔ راستے پر پڑے کیلے کے چھلکے پر سے پھسل پڑنا یا کسی پانی بھرے گڑھے میں چھپاک سے پاؤں دھرنا ایک عام بات ہے۔ خاص بات تو وہ ہوتی ہے جب کوئی آوارہ سانڈ یا گائے چپکے سے پیچھے سے آکر آپ کو سینگوں پر اٹھا کر پٹک دے یا کوئی بس آئے اور پانی بھرے گڑھے پر سے یوں گزرے کہ آپ تجریدی آرٹ کا بہترین نمونہ بن جائیں۔

الغرض وسائل آمد و رفت جس قدر بڑھتے جا رہے ہیں مسائل آمد و رفت اتنے ہی زیادہ پیچیدہ اور جاں سوز ہوتے جا رہے ہیں۔ ●●

بیک وقت فکر انگیز، حیرت انگیز، مسرّت انگیز اور شر انگیز کتاب

آصف فرخی کی کتاب "حرفِ من وتو" میں ہر ٹائپ کے ادیبوں کے انٹرویوز مل ہیں۔ بعض ایسے ادیب ہیں جنھوں نے زندگی بھر لکھا ہے، پڑھا کچھ بھی نہیں۔ بعض ایسے ہیں جو زندگی بھر پڑھتے رہے ہیں، لیکن کام کی کوئی چیز نہیں لکھ سکے۔ بعض نے لکھنے اور پڑھنے میں توازن قائم کیا ہے، نتیجہ یہ کہ وہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ بعض انٹرویو دینے والوں نے اپنے علم کی نمائش کر کے انٹرویو لینے والے کو شرمندہ کیا اور بعض نے اپنے علم پر پردہ ڈال کر خود شرمندہ ہونے کی سعادت حاصل کی۔

آصف فرخی اگرچہ نوجوان ہیں، لیکن ان میں ایک بات بوڑھوں والی یہ ہے کہ وہ صرف اردو ادب ہی سے نہیں عالمی ادب سے بھی اچھی خاصی واقفیت رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے بعض ادیب ان کے سامنے اس طرح نظر آتے ہیں، جیسے وہ انٹرویو نہیں امتحان دے رہے ہیں۔ آصف فرخی نے اپنے ٹیڑھے سوالوں سے کئی ادیبوں کو مشکل میں ڈالا اور پھر خود ہی ان سوالوں کے جواب دے کر انھیں مشکل سے نکالا۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کتاب میں اکثر مقامات ایسے نظر آتے ہیں، جہاں یہ احساس ہوتا ہے کہ آصف فرخی خود ہی اپنا انٹرویو لے رہے ہیں۔

آصف فرخی کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ادیب کے محدودات کا خیال رکھتے ہیں۔ کبھی مختصر سوال کر کے طویل جواب حاصل کرتے ہیں اور کبھی طویل سوال کر کے مختصر جواب حاصل کرتے ہیں۔ اس وجہ سے انٹرویو دینے والا ادیب اس حد تک بے فکر ہو جاتا ہے کہ سوالوں سے بے نیاز ہو کر اظہارِ خیال کرتا رہتا ہے۔ اور کہیں کہیں تو "سوال از آسمان جواب از ریسمان" کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ انٹرویو دینے والا طویل گفتگو کے بعد آصف سے پوچھتا ہے: "آپ کا سوال کیا تھا؟"

آصف فرخی کے بارے میں اب تک ہمارا یہ خیال تھا کہ وہ ادبی گروہ بندی میں یقین نہیں رکھتے، لیکن "حرفِ من وتو" سے ہمارے اس خیال کی نہایت عمدگی سے تردید ہوتی ہے۔ چند خاص شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں سے انھیں خدا واسطے کی دلچسپی ہے۔ (خدا واسطے کا بیر ہو سکتا ہے، تو دلچسپی کیوں نہیں ہو سکتی؟) انھوں نے اپنے پسندیدہ ادیبوں کا پروپیگنڈا اس زور شور سے کیا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے کتاب کے

ارفِ طباعت انھیں ادیبوں نے برداشت کیے ہوں۔ انٹرویو لیتے وقت آصف کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی
ح ان کے پسندیدہ ادیبوں کا تذکرہ آجائے۔ بات کوئی بھی ہو رہی ہو، وہ گھما پھرا کر ان ادیبوں کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں
پھر نہیں تو یہی پوچھ لیتے ہیں: "فلاں کی افسانہ نگاری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے"؟ سوال کا انداز ایسا ملتجیانہ
اہے کہ جواب دینے والے کو فلاں صاحب کی تعریف کرنی ہی پڑتی ہے۔

اس کتاب میں ہر نوع کے انٹرویو ملتے ہیں۔ فکر انگیز، حیرت انگیز، مسرت انگیز، یہاں تک ایک آدھ
دلو شر انگیز بھی ہے۔ غلام عباس، سلیم احمد، فیض احمد فیض اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے انٹرویو بلاشبہ فکر انگیز
کیوں کہ ان میں ادب کے بنیادی مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ شمس الرحمن فاروقی اور مظفر علی سید کے انٹرویو حیرت انگیز
یوں کہ ان میں بعض بے بنیاد مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں۔ نیز بعض امور پر ایسی گفتگو بھی ہوئی ہے جو قاری کو
ت میں ڈال دیتی ہے۔ مثلاً افسانے کے نقاد کی حیثیت سے شمس الرحمن فاروقی کی حیثیت مسلمہ ہے۔ انھوں نے
ں فکر انگیز انداز سے افسانے کے فن پر بحث کی ہے، اس سے جدید افسانہ نگاروں کو اپنی راہ متعین کرنے میں بڑی
ں ہے۔ اسی وجہ سے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے افسانہ نگاروں کی پوری ایک نسل کو گمراہ کیا ہے (یہ بات
فاروقی صاحب نے اپنے انٹرویو میں بتائی ہے) یہ بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ فاروقی صاحب "گمراہان جادہ
بھٹکے رہنما ہیں۔ با ایں ہمہ فاروقی صاحب نے اپنے انٹرویو میں اعلان کیا ہے کہ "میں اپنے کو افسانے کے قابل
سمجھتا، میرا بنیادی شعبہ یعنی کہ میرا جو بنیادی مشغلہ ہے، اور قسم کی چیزیں ہیں، لیکن دلچسپی والی بات
یں نہیں ہے۔" افسانے سے فاروقی صاحب کو دلچسپی نہیں ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے افسانہ نگاروں
ری ایک نسل کو گمراہ کیا، ادب کے جن شعبوں سے انھیں دلچسپی ہے، خدا جانے وہاں کیا گزری ہوگی۔ وہاں
سے زیادہ نسلوں کے گمراہ ہونے کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مظفر علی سید کے انٹرویو میں بھی بہت سی باتیں حیرت انگیز ہیں۔ مثلاً عبداللہ حسین اپنی تحریروں میں پنجابی
بکثرت استعمال کرتے ہیں، ان کی اس مستحسن کوشش کی داد سید صاحب نے ان الفاظ میں دی ہے "ان کی
اگا پیرشش کہیں کہیں ان کے ہم وطن استاد امام دین کے قریب پہنچ جاتی ہے۔" ہمارے خیال میں سید صاحب
ستاد امام دین کے ساتھ زیادتی کی ہے، استادِ مرحوم اک عمر کی مشقِ سخن کے بعد جس مرتبے پر پہنچے تھے، عبداللہ
ا چند روزہ مشقِ ستم کے بعد اسی مرتبے تک کس طرح پہنچ سکتے ہیں؟

مظفر علی سید نے ڈاکٹر انور سجاد اور انیس ناگی کے ساتھ بھی ناانصافی کی ہے۔ آصف فرخی نے ان دونوں
ل نگاری کے بارے میں رائے طلب کی تو سید صاحب نے فرمایا "ناول بطور آرٹ فارم کے ان کا دردِ سر
راسید صاحب نے اگر دونوں کے قارئین کے دردِ سر کا خیال کیا ہوتا تو وہ مزید یہ نہ فرماتے "نثر لکھنے کے
ردو زبان پر جو دسترس چاہیے، وہ مشاقی اور بسیار نویسی کے باوجود (ان دونوں کو) حاصل نہیں ہوئی۔ وہ
ت نہیں ہے جو ایک منز منا آدمی کے ہاں ملتی ہے ...... (ان دونوں کے ناول) فکشن کی مد وار زیادہ معلوم

ہوتے ہیں، یہ نسبت اس کے وہ زندگی کے ساتھ کوئی گہری واردات یا کوئی گہرا نفسیاتی تجزیہ بیان کریں۔" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب مفتی صاحب جیسے ادب شناس کو کون بتائے کہ ہمارا سارا جدید ادب ہی فیشن کی پیداوار ہے ۔ اگر انور سجاد اور انیس ناگی نے فیشن کے طور پر ناول لکھ دیئے تو اس میں کیا برائی ہے ۔ ان ناولوں کو ادب کے معیاروں سے نہیں، فیشن کے معیاروں سے جانچنے کی ضرورت ہے ۔ تب معلوم ہوگا کہ انور سجاد اور انیس ناگی نے ناول کے فن کو کس اعلیٰ مقام تک پہنچا دیا ہے۔

کشور ناہید اور ممتاز مفتی کے انٹرویو مسرت انگیز ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کشور ناہید کی گفت گو کا ایک ٹکڑا بطور نمونۂ کلام درج کیا جاتا ہے ۔" ایک فقرہ ! جس کے سننے سے مجھے اس عمر میں خوشی ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ کتنی اسمارٹ، کتنی ینگ لگ رہی ہیں ۔ آپ اپنی عمر سے دس سال چھوٹی لگ رہی ہیں ۔ میں جیسی بھی ہوں تو کہتی ہوں کہ یہ اپنی عمر سے دس سال چھوٹا لگنے کا کوئی شوق نہیں ہے اور نہ بڑا لگنے کا مرض ہے ۔ میری اپنی جو عمر ہے وہی ہوں گی"۔ ہم اس پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے ، کیوں کہ تبصرے کے بغیر بھی یہ اقتباس سمجھ میں آجاتا ہے۔

ممتاز مفتی ماشاء اللہ اردو کے معمر ترین ادیب ہیں ، لیکن اپنے انٹرویو میں وہ کشور ناہید سے بھی دس برس چھوٹے نظر آتے ہیں ۔ انھیں جہاں اور جب موقع ملا ہے، احمد ندیم قاسمی کے خلاف دل کا غبار نکالا ہے ۔ ایک جگہ انھوں نے یہ الزام لگایا ہے کہ ان کے ناول "علی پور کا ایلی" کو گلڈ کا انعام صرف اس لیے نہیں مل سکا کہ قاسمی صاحب اس انعام کے جج تھے ۔ دوسری جگہ ادب میں گروہ بندی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے ۔" احمد ندیم قاسمی سب سے بڑا pioneer تھا، جس نے گروہ بندی شروع کی"!

تین سال گزر چکے ہیں، لیکن مفتی صاحب کے دل سے گلڈ کے انعام کا غم نہیں گیا، حالاں کہ اب تو خود گلڈ ہی گلدستۂ طاقِ نسیاں بن چکا ہے ۔ یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ مفتی صاحب نے گلڈ کے انعام کے حوالے سے قاسمی صاحب کو مطعون کیا ہے ۔ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ وہ اپنی داستانِ غم سنا چکے ہیں ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر قاسمی صاحب گلڈ کے انعام کی رقم اپنی گرہ سے ادا کردیں تو مفتی صاحب کے خلاف اپنی مہم ختم کردیں گے ، لیکن ہمارا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوگا مفتی صاحب صرف انعام کی رقم پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ تیس برسوں کا مرکب سود بھی طلب فرمائیں گے ۔ ظاہر ہے قاسمی صاحب اتنی بڑی رقم ادا نہیں کرسکیں گے ۔ لہٰذا سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ مفتی صاحب سے دست بدست درخواست کی جائے کہ وہ اپنی عمر کا نہ سہی ، قاسمی صاحب کی عمر کا خیال کرتے ہوئے انھیں اب معاف کریں۔

مفتی صاحب کے انٹرویو کے آخری الفاظ بہت معنی خیز ہیں ۔ فرماتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔" بے کار باتیں ہیں ان میں سے ایسی کون سی بات ہے جس کے لیے آپ نے انٹرویو کیا ۔ میں پہلے ہی آپ سے کہہ رہا تھا کہ میرے پاس ایسی کوئی بات نہیں ہے، جس کی خاطر آپ انٹرویو کا اہتمام کریں ۔ پتہ نہیں میں کیا کیا بیکار باتیں کر تا رہا"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ محض انکسار ہے ۔ مفتی صاحب کے انٹرویو میں کئی کام کی باتیں بھی ہیں ۔ مثلاً یہ کہ ایک موقع پر انھوں نے فرمایا ۔" میرے بیٹے نے مجھ سے کہا" بابا آپ اب کہانیاں لکھنی بند کردیں" مجھے شرم آتی ہے"! کہیں ایسا تو نہیں کہ بیٹے نے احمد ندیم قاسمی کی ایما پر یہ بات کہی ہو!

اگر یہ درست ہے تو ہم قاسمی صاحب سے عرض کریں گے کہ اتنی مخالفت بھی درست نہیں ہے۔ آپ کی وجہ سے پہلے گلزار کا انعام مفتی صاحب کے ہاتھ سے نکل گیا تھا، اب بیٹا بھی نکلتا نظر آرہا ہے۔

احباب آخر میں ایک ایسے انتشار کا ذکر جو اس کتاب کی جان ہے۔ یہ انٹرویو افسانہ نگار اور مترجم محمد عمر میمن کا ہے۔ میمن صاحب امریکہ کی وسکانسن یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔ انتظار حسین اور عبداللہ حسین کی متعدد تخلیقات کو انگریزی میں منتقل کر چکے ہیں۔ عبداللہ حسین نے اپنے ناول "اداس نسلیں" میں قرۃ العین حیدر کی تحریروں کے بہت سے ٹکڑے بلا حوالہ شامل کر لیے ہیں۔ اس ادبی سرقے کے بارے میں محمد عمر میمن کو اظہار خیال کرنے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے فرمایا:

"... میرے لیے اس بات کا ذرہ برابر فرق نہیں پڑتا کہ عبداللہ حسین نے قرۃ العین حیدر کے مضمون کے صفحے سرقہ کر لیے ہیں۔ اگر انھوں نے ایسا کیا بھی ہے تو [illegible] نہیں بنا دیا۔"

ایک طرف تو محمد عمر میمن [illegible] اور دوسری طرف اتنے تنگ دست ہیں کہ [illegible] کے مال کو بھی اپنا مال [illegible] اس سوال کی تفصیل یہ ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ پر سرقے کا الزام لگایا ہے۔ [illegible] ان کا انتظار حسین پر جو مضمون ہے، اس کے شروع کے دو صفحوں کا تنقیدی لہجہ اور پورے کے پورے جملے بغیر حوالہ لگائے یا میرا نام لیے میرے "سویرا" والے مضمون سے لیے گئے ہیں۔"

محمد عمر میمن نے اپنے جس مضمون کا حوالہ دیا ہے، وہ انتظار حسین کے بارے میں ہے اور "حافظے کی بازیافت" عنوان سے تقریباً چودہ برس پہلے رسالہ "سویرا" میں چھپا تھا۔ اس وقت یہ مضمون اور ڈاکٹر نارنگ کا مقالہ دونوں ہمارے سامنے ہیں۔ ہمیں تو ڈاکٹر نارنگ کے مضمون میں محمد عمر میمن کے مضمون کا کوئی جملہ نظر نہیں آیا، البتہ کچھ الفاظ مشترک ہیں اور یہ روزمرہ کے استعمال کے الفاظ ہیں، جن پر کسی شخص کی اجارہ داری نہیں ہو سکتی۔ رہا تنقیدی لہجہ تو اس کے چرانے کا سوال اس لیے پیدا نہیں ہوتا کہ اس قسم کی کوئی چیز خود محمد عمر میمن کے مضمون میں موجود نہیں ہے۔

تھوڑی دیر کے لیے اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ محمد عمر میمن کا الزام درست ہے تو پھر یہ دلچسپ صورت حال سامنے آتی ہے کہ ایک طرف تو موصوف عبداللہ حسین کے حوالے سے سرقے کو معیوب نہیں سمجھتے اور دوسری طرف سرقے کو برا کام سمجھتے ہوئے ڈاکٹر نارنگ کو مجرم قرار دیتے ہیں۔ میمن صاحب کی اس عجیب و غریب منطق کا مطلب یہ ہے کہ اگر سرقے کی واردات کسی صاحب ثروت کے مال پر [illegible] ہے اور اگر کسی مفلس کے مال پر ہو تو قابل معافی۔ صاحب ثروت کا کچھ نہیں بگڑتا، مفلس کا آٹا گیلا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اگر یہ کالم ڈاکٹر نارنگ کی نظر سے گزرے تو ہم ان سے گزارش کریں گے کہ وہ آئندہ احتیاط رکھیں، واردات سے پہلے صاحب خانہ کی حیثیت کا خیال ضرور رکھا کریں۔ ■

ڈاکٹر جاہل ناگپوری

ہنسنا منع ہے

زندہ دلان بمبئی کا دعوت نامہ ہی ان کی زندہ دلی کا ثبوت تھا۔ بھی کہ اس میں مقام نشست کا سرے سے ذکر نہ تھا دوسرا لطیفہ یہ ہوا کہ ہم انجمن اسلام ہائی اسکول بھی جا پہنچے تو اکبر پیر بھائی ہال کا پتہ نہ چلا۔ ناچار ہم نے ایک مدرس صاحب کو جا دھرا تو انہوں نے ہمیں اس طرح گھورا جیسے ہم کسی نالائق کے پدر بزرگوار ہوں یا پھر انہیں اس بات پر غم و غصہ تھا کہ ہم اپنی داڑھی سمیت اسکول کیا وندڑ میں کیوں کر داخل ہوئے۔ استفسار حال پر وہ مزید بدحال ہو گئے۔ ہم دل ہی دل میں ڈرے کہیں مدرس محترم کو حال تو نہیں چڑھ گیا۔ ہم سٹ پٹائے اور ان کی حالت پر تاسف کرتے ہوئے سڑک پر نکل آئے۔

صبح کے نو بج رہے تھے اور اب بھی دھیرے دھیرے سرگرم ہو چلی تھی۔ صبح کا سہانا پن اور دل پذیر سکون آتی جاتی سواریوں اور دوڑتے بھاگتے ہجوم میں معدوم ہو چلا تھا۔ یکے بعد دیگرے چند شرفا قسم کے افراد سے ہم نے رجوع کیا بھی تو کھلا کہ ساری آسائشیں بہم آسامیں لیے ہیں۔ ہر کوئی اپنے آپ میں گم اپنی اپنی دھن میں سمایا ہوا۔ خود بینی کا ذات کی تلاش میں سرگرداں اسے مقام دیگر یا دیار غیر کی خبر ہی نہیں ہے۔

مثاً ہمیں انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اپنے قدیمی کرم فرما پروفیسر شیخ فرید کا خیال آ گیا اور تب ہم کو ایسا لگا جیسے ہمیں گیان جیوتی مل گئی ہو۔ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہم نے سڑک پار کی۔ عمارت میں داخل ہوئے اور جلدی جلدی زینے چڑھ کر اوپر جا پہنچے۔ لیکن دروازہ مقفل۔ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے ہوئے ہم پھر سے نیچے کی طرف قدم رنجہ ہوئے۔ دیکھا کہ مالی آبیاری کر رہا ہے۔ اطمینان کی سانس لی۔ چلو عقدہ تو حل ہوا۔ مگر کہاں — ؟ یہ تو ہماری خوش فہمی تھی جب اسکول پچھڑی لاعلم نکلا تو بھلا مالی کیا بتا سکتا کہ دانش گاہ کونسی ہے ؟۔

اب ہم انّ اللہ مع الصابرین پڑھتے اور آبرو کی سلامتی کا شکر کرتے ہوئے باہر نکلے اور بڑی حسرت سے مڑ کر پروفیسر شیخ فرید کی بارگاہ کی طرف نگاہ ڈالی تو جیسے نور کا ایک کوندا چمک گیا — ہم جہاں کھڑے تھے اسی چوکھٹ پر دائیں انگریزی حرفوں میں "اکبر پیر بھائی ہال" اپنے وجود کا اعلان کر رہا تھا۔ جی تو ہوا کہ بڑا سا پتھر اٹھائیں اور سر پہ دے مار کی خبر لے ڈالیں۔ دیکھا۔ کبھی کبھی احساس علمیت اور باخبری کا زعم بھی کیا کیا ذلیل کرتا ہے!

ساڑھے نو ہو چلے تھے لیکن کسی زندہ دل کی خبر نہ تھی۔ ہم نے پھر ایک بار مردہ دلی سے قدم اٹھائے اور ناک سیدھ میں چل پڑے تو چشم ما روشن، دل ما شاد کی لعنت عظیم سے نہال ہوئے کہ سامنے سے معروف طنز و مزاح

نگار ڈاکٹر شیع رحمٰن آکولوی اپنی قد آور مسکراہٹ کی چھتری کھولے ہماری طرف لپکتے ہوئے نظر آئے۔ اب تو گویا ہماری باچھیں بھی کھل گئیں۔

مصافحے اور معانقے کی منزلوں سے گزر کر ملاقات شکوے شکایات کے مرحلوں میں جا پہنچی تو ہم نے تشفی گفتن، خوردن، نوشیدن اور برخواستن کے مصادر رٹ لینے میں عافیت جانی۔ گوشہ عافیت کی طرف مڑے ہی تھے کہ ہری ہری ساروتی ساڑی سے کھیرے مجرے کھلے کھلے اور دُھلے دُھلے سے مزاح نگار فیاض احمد فیضی آدھمکے۔ اے واہ، کرتا پاجامہ کیا پھب رہا ہے۔ مسکراہٹ لبوں سے چھلک پڑنے کو بیتاب اور آنکھوں میں کسی شریر تو خیز کی شگفتگی۔

ڈاکٹر آکولوی نے زندہ دلانِ بمبئی کے جنرل سکریٹری کی پابندیٔ وقت کی تعریف کی سکریٹری صاحب نہ جھینپے نہ کھسیائے تھوڑا سا مسکائے اور فرمایا کہ بمبئی کی ادبی تقریبات کے منتظمین نے مذکورہ قابلِ تعریف روایت کو بڑے جتن سے سنبھال رکھا ہے۔ جہاں کی علمی ثقافتی تقریبات خالص ہندوستانی مزاج کے مطابق انجام کو پہنچتی ہیں۔ معاملہ اردو والوں یا مسلمانوں کا ہو تو کیسا وقت اور کیسا احساس؟

ہم نے ان کا خصوصی شکریہ ادا کیا ورنہ لذّتِ انتظار کی فراہمی کا یارا اور فرصت کسے ہے۔ زمانہ تو بھاگم بھاگ میں مبتلا ہے۔ غنیمت ہے یہی فرصت کی گھڑیاں: سوا دس بجے یوسف ناظم صاحب کی کار پہنچی۔ اڑے اڑے سے بال نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھیں اور تھکا تھکا چہرہ۔ پچھلی نشست کا دروازہ کھلا تو ایک نحیف و نزار خاتون کو برآمد کیا گیا اور بڑی احتیاط سے انہیں داخلِ ہال کیا گیا۔ اب ہم نے خاتون کو دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ ضعیفی اور نقاہت کے بوجھ سے تھرتھراتی ہوئی عصمت چغتائی ہمارے سامنے تھیں۔

ناظم صاحب اردو ادب کی لباوتِ عالیہ کو بستر سے اٹھا کر لے آئے تھے۔ اب ایک ایک کر کے سامعین آنے لگے۔ رفیعہ شبنم عابدی، پروفیسر نعیم الدین، پروفیسر انور ظہیر، شاہد ندیم اور دیگر افراد کا نزول ہونے لگا۔ یوسف ناظم ہمارے پاس سے ہوا کی طرح گزر گئے۔ اپنے وجود کا احساس تو دلایا مگر چھو لینے کی سعادت نہ بخشی۔ آخر ہمیں ہی بتانا پڑا کہ ہم کون ہیں۔

انہوں نے بڑی حیرت انگیز مسکراہٹ اور پھیلی ہوئی آنکھوں سے ہمیں گھورا۔

" ایں یہ تمہاری داڑھی کو کیا ہوا؟ تصویر میں تو بڑی نظر آ رہی تھی۔

" وہ ... وہ ... وہ ہم گڈمڈ ہوئے۔ شاید ہم کہنا چاہتے تھے کہ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں مگر ہمارے لفظوں کو بولنے سے پہلے ہی انہوں نے دوسرا جملہ بھی جڑ دیا " داڑھی کو داڑھی ہونا چاہیئے آزاد غزل نہیں۔ یہ کیا کبھی ادھر سے چھوٹی کر لی تو ادھر سے بڑی کر لی " ہماری داڑھی کی مدحت سرائی کا یہ سلسلہ ابھی اور بھی جاری رہتا۔ لیکن انہیں سامعین کے بیٹھ رہنے اور منتظر صاحب کے جوڑنے کی فکریں بھی لاحق تھیں۔ ہم نے داڑھی کھجاتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور انگلیوں سے داڑھی کی کنگھی کرنے لگے۔

ڈاکٹر آکولوی بہت دیر سے چائے نوشی کیلئے بے چین تھے اور وہ اپنی بے چینی ہماری معیت ہی میں دور کرنا چاہتے تھے۔ لہذا ہمیں ان کا دل رکھنے کے لیے تھوڑی سی مٹھائی، تھوڑا سا کھارا، تھوڑے سے سموسے اتھوڑا سا دہی

اور تھوڑی سی چائے اسٹور کرنے میں ساتھ دینا پڑا۔

ڈاکٹر شیخ رحمان مزاحیہ ادب کے امتیاز بھی واقع ہوئے ہیں یعنی پکے خاصے اونچے پورے مضبوط و توانا اور بڑے تیز مزاج چنانچہ ہم کاونٹر تک بڑھنے کی جسارت نہ کر سکے۔ مبادا پیچھے سے بڑھا ہوا ہاتھ ہماری گردن ہی ناپ جائے۔

ریستوران سے باہر نکلے تو گنے کا رس، کیلے، سنترے، انناس، اپلے اور تربوز وغیرہ بھی ہم سے انصاف مانگتے ہوئے محسوس ہوئے مگر نگاہِ مروت نے محض پان کی ایک گلوری سے التفات کیا۔

اتنا وقت ہو چکا تھا کہ اردو اکیڈیمی کی روایت کے مطابق پروگرام کا آغاز کیا جاتا۔ ہال چاروں طرف سے بھر گیا تھا یعنی چاروں اور دو دو حاضرین یقیناً موجود تھے۔ بہرکیف یوسف ناظم صاحب نے مائک سنبھالا اور گویا ہوئے۔ انہیں سخت افسوس تھا (افسوس سخت کیوں ہوتا ہے ہمیں نہیں معلوم) کہ سردار جعفری صاحب اپنی بیماری کے باعث افتتاح نہ کر سکے اور پروفیسر جاوید خان صاحب منترالیہ کی کسی میٹنگ میں الجھ گئے۔ لہٰذا صدارت نہ فرما سکے مگر انہیں اس بات کی خوشی تھی کہ وہ عصمت چغتائی کو بہتر حالات سے اطلاع دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور اب عصمت آپا نہ صرف افتتاح اور صدارت بلکہ اعلانِ اختتام کی اجازت بھی مرحمت فرمائیں گی۔

عصمت آپا کی ضعیفی اور نقاہت تو متقاضی ہے کہ وہ کوئی پرسنل سکریٹری رکھیں۔ لیکن یوسف ناظم کے اعلان کے مطابق وہ انہیں اپنا بیٹا بنانے والی ہیں۔ اگر یوسف پاپا عصمت آپا کے بیٹے بن سکتے ہیں تو کیوں نہ ہم انہیں پاپا اور گرینڈمدر بنالیں۔ مگر اس وقت ہم کچھ بول نہیں سکتے کیونکہ مائک تو ناظم صاحب کے ہیں ہے اور کچھ بھی بولنے کے لیے مائک اور لاؤڈ اسپیکر بہت ضروری ہیں۔ ہم کفِ افسوس ملتے ہوئے پند نامہ شیخ سعدی یاد کرنے لگے۔

بمبئی کے سامعین بڑے بختاور ہیں کہ ان کے لیے کھانے پینے اور آنے جانے سب ہی خاطر خواہ بند و بست ہوتا ہے۔ اسی لیے سامعین و حاضرین بڑے سے بڑے اہلِ قلم کی پروا نہیں کرتے اور ہر بڑا قلم کار جناب صدر وزیر محترم معزز مہمان خصوصی اور خوبصورت بینروں اور پردوں سے آراستہ اسٹیج کے ساتھ تصویریں کھنچواتا اور خوشی خوشی اپنی راہ لگتا ہے۔

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی سے متعلق سنا کہ وہ اظہارِ تشکر کی ماہر ہیں اور واقعی انہوں نے حاضرین کے علاوہ غائبین کا بھی شکریہ ادا کر کے دکھا دیا۔

عبید اللہ کمال دہلا میں جس سعادت مندی سے ملے تھے بمبئی میں ان کا انداز اتنا ہی استادانہ تھا غالباً بمبئی استادوں کا شہر ہے۔ ہمیں پیشانیِ سجدہ کے سلیمانیت ہوتے کے روشن آثار نظر آئے تو ہم گھبرا کر سامعین کی صف میں آ بیٹھے اس حرکت سے سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ فوٹو گرافر نے جتنی شاندار تصویریں لیں ان میں عصمت چغتائی اور یوسف ناظم ایک خالی کرسی اور قیامت احمد فیضی، ادھر ادھر سے رفیعہ شبنم عابدی، عبید اللہ کمال، رشیدہ قاضی، بانو آرسی، شیخ رحمن آکولوی اور انور ظہیر تو دکھائی دیں گے لیکن ڈاکٹر جابل ناگپوری کا دور دور تک پتہ نہ ہوگا۔ کاش ہم حقیقتاً جاہل ہوتے۔

رفیعہ شبنم عابدی کو شکایت تھی کہ مزاح نگاروں نے سامعین کو ہنسایا نہیں۔ ہمیں اس بات پر اعتراض ہے حقیقت تو یہ ہے کہ سامعین خود ہی نہیں ہنسے۔ دراصل ہنسنے والے سامعین ہم بستیوں سے آتے ہیں جو چھوٹے گاؤں، چھوٹے قصبوں اور چھوٹے چھوٹے محلوں سے آتے ہیں۔ مگر یہاں موجود سامعین یا تو کالونیوں سے آئے تھے یا فلیٹوں اور بنگلوں سے، ان میں ہنسنے والے جتنی ہنسانے

والے ضرور پیدا ہوتے ہیں مثلاً عظیم بیگ چغتائی — ویسے ہم تو پہلے ہی عرض کر چکے کہ سامعین ہنس ہنسنے کیلئے نکلے انہوں نے مزاح نگاروں کو قاتلِ مدار، مداری، یاتری، حاجی، ملاقاتی یا آدمی صورت سمجھ رکھا تھا مزاح نگار نہیں۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہماری تحریر پر سامعین نے داد و تحسین کے (تالیاں) ڈونگرے برسائے وہ بھی اس لیے کہ ایک تو ہم جاہل تھے (عالموں کو جاہلوں پر ہنسنے کا ادھیکار حاصل ہے) دوسرے اس لیے کہ ہماری شکل و صورت فیڈ دیا نہ تھی ہمیں سامعین نے اپنے بھیتیجے جیسا سمجھا اور کیوں نہ سمجھتے آخر ہمارا مضمون بھی تو چچا کی شان میں تھا۔

آخر ہم مضمون پڑھ کر ہٹے اور ادھر یوسف ناظم نے ٹھہرانے کا اعلان فرما دیا۔ ابھی تو مضمون سے پہلے کا ناشتہ بھی ہمیں گھلا تھا۔ اور پوری طرح ساڑھے بارہ بھی نہیں بجے تھے لیکن ان کا صبر ہم پر ختم ہو چکا تھا۔ اور زندہ دلوں کا اصرار تھا کہ لنچ کرلیا جائے۔ آخر قالانصاری بول ہی پڑے۔

"بھئی یہ شرفاء کے کھانے کا وقت نہیں ہے۔ لیکن آپ چاہیں تو کھا سکتے ہیں"

اس پر اتنی زور کا قہقہہ پڑا کہ یوسف ناظم بھی ہنس دیے۔ مگر فوراً ہی فیاض احمد فیضی نے وار کردیا "یوسف ناظم کہتے ہیں کہ جن کی نئی نئی شادیاں ہوئی ہیں انہیں چھوڑ کر باقی لوگ کھا سکتے ہیں"

دوسرے سیشن کا آغاز فیاض احمد فیضی سے ہوا "میرے شہر کی لڑکیاں" کے عنوان سے فیضی نے بڑا خطرناک اور قہقہہ بردوش مضمون سنایا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ محفل میں کوئی لڑکی نہیں تھی۔ رشیدہ قاضی اور رفیعہ شبنم عابدی بے چاری عورتوں کی طرح مسکرا مسکرا کر رہ گئیں اور عصمت چغتائی نے جو ریمارکس پاس کیے وہ یوسف ناظم کے کانوں اور فیضی کی آواز سے آگے نہیں جا سکے۔

فیضی کے بعد جگر تھام کے بیٹھنا کسی طرح ممکن نہ تھا کہ دھان پان سا بدن والے یوسف ناظم کا شگفتہ قلم بڑا ہی توانا مزاح تخلیق کرتا ہے۔ برنارڈ شا کی طرح دبلے پتلے مگر غضب کی ذہانت رکھنے والے یوسف ناظم سبھوں کے پیارے مزاح نگار ہیں۔ انٹرویو کی مختلف قسموں کا بیان بڑے پیار سے سنایا گیا۔

عصمت چغتائی نے کرسیِ صدارت قبول کی تھی لہٰذا بطور سزا انہیں بھی ایک مضمون پڑھنا ہی پڑا اور جس طرح مشاعروں میں صدارتی کلام کو ادب کے ساتھ سنا جاتا ہے ویسے ہی عصمت آپا کو بھی ادب سے سنا گیا۔ خبردار ہنسنا منع ہے!

عابدہ محبوب
(حیدرآباد)

مزید دھجیاں

"نظر توڑ"

ایک شادی کی تقریب میں دلہن بڑی حسین تھی۔ عمر بھی سترہ یا اٹھارہ سال ہو گی۔ شادی کی ویڈیو فلم بنائی جارہی تھی۔ ایک سیاہ فام تیسیم شیم مہمان خاتون فلم میں ہر جگہ دلہن کے ساتھ ساتھ تھیں۔ ویڈیو گرافر نے کئی بار انہیں ٹوکا مگر خاتون نے ہمیشہ سنی ان سنی کر دی۔

ایک بار جب ویڈیو گرافر دلہن کا "کلوز اپ" لے رہا تھا۔ وہ پھر آدھمکیں۔ ویڈیو گرافر نے منع کیا تو وہ حسب عادت انجان ہو گئیں۔ دلہن کی بڑی بہن ان کی اس حرکت کو نوٹ کر رہی تھیں۔ وہ چل کر ویڈیو گرافر سے بولیں۔

"انہیں منع نہ کیجیے کہیں دلہن کو نظر نہ لگ جائے۔ اس لیے ہم نے ہی انہیں ساتھ رہنے کو کہا ہے:"

"الٹی گنگا"

ایک صاحب حج سے فارغ ہو کر اپنی لڑکی اور لڑکے سے ملنے پہلے لندن اور پھر امریکہ گئے۔ تین ماہ بعد وہ انڈیا لوٹ آئے ان کے ایک دوست ان سے ملنے گئے۔ پہلے حج کی مبارکباد دی پھر بولے

"دوست! تم نے سفر غلط کیا!"

"سفر غلط کیا؟" صاحب حیران ہو گئے "وہ کیسے؟"

"پہلے تمہیں لندن اور امریکہ جانا چاہیے تھا اور پھر حج کر کے انڈیا واپس آنا چاہیے تھا۔"

"کانٹ چھانٹ"

"یہ اشوکا کے درخت اس قدر اونچے ہو گئے ہیں کہ جب بھی تیز ہوائیں چلتی ہیں تو ان کے ٹوٹ کر گرنے کا ڈر ہونے لگتا ہے۔

"تم انہیں کٹوا کر چھوٹے کروا دو۔"

"مگر یار یہ تقریباً بیس فٹ اونچے ہیں اوپر سے کٹوانا بڑا مشکل کام ہے۔

تو تم انہیں نیچے سے کٹوا کر چھوٹے کروالو!۔

"استاد کا کام"

دسویں جماعت کی اردو کلاس میں سبق پڑھایا جارہا تھا کہ قطب شاہی دور میں "لنگر کی رسم" کی ابتدا کس طرح ہوئی ایک جملے میں مہاوت اور سائیس کے الفاظ آئے۔ طلبا نے ان کے معنی پوچھے۔ ٹیچر نے بتایا کہ ہاتھی سدھانے والے کو مہاوت اور گھوڑا سدھانے والے کو سائیس کہا جاتا ہے۔ اس پر ایک شریر طالب علم نے پوچھا۔

سیڈم! گدھا سدھانے والے کو کیا کہا جاتا ہے؟
بچے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
"گدھا سدھانے والے کو استاد کہا جاتا ہے!"

۵۔ "محاورہ کا استعمال"

شہر کے ایک گرلز جونیر کالج کی دسویں جماعت کے سالانہ امتحان کا نتیجہ صفر رہا۔ اسی اسکول میں زیر تعلیم دسویں جماعت کی ایک طالبہ نے اپنے سہ ماہی امتحان کے رزلٹ کے پرچے میں محاورہ "چہرہ فق ہو جانا" کا جملہ اس طرح لکھا۔

"ہمارے اسکول کی دسویں جماعت کا سالانہ امتحان کا نتیجہ صفر آنے پر ہمارے پرنسپل صاحب کا چہرہ فق ہوگیا!"

۶۔ "نمائش"

• ایک ادیبہ نے اپنی تصانیف کل ہند صنعتی نمائش کے ایک اسٹال پر فروخت کے لیے دیں۔ نمائش کے اختتام پر بک سیلر نے ادیبہ کو کتب واپس کرتے ہوئے کہا "مجھے افسوس ہے میڈم آپ کی ایک کتاب بھی فروخت نہیں ہوئی!"

ادیبہ نے برجستہ کہا۔
"کوئی بات نہیں! میں نے کتابیں فروخت کے لیے تھوڑی دی تھیں، صرف نمائش کے لیے دی تھیں!!

۷۔ "مسکرائیے کہ......"

شہر کے مشہور اور ہردلعزیز ڈاکٹر کی کلینک پر ایک مریض دردِ شکم کی شدید تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ اس دن ڈاکٹر صاحب کو آنے میں کافی دیر ہوگئی۔ سارے مریض بے چین تھے۔ یکایک وہ مریض اٹھ کھڑا ہوا اور کلینک کی دیوار پر آویزاں تختی کو نکال کر غصے میں پھینک دیا۔ تختی پر لکھا تھا۔
"مسکرائیے کہ آپ ڈاکٹر زیدی کی کلینک پر تشریف لائے ہیں!"

۸۔ "عذر"

محکمہ بلدیہ کے ایک آفیسر نے شہر کی چند خستہ حال سڑکوں کی مرمت کا کام ایک کنٹراکٹر کو دیا۔ پچاس فیصد رقم اڈوانس دی گئی اور باقی رقم کام ختم ہونے کے بعد دینے کا معاہدہ ہوا۔ دو ماہ بعد آفیسر کو پتہ چلا کہ کنٹراکٹر نے سڑکوں کی مرمت کا کام شروع ہی نہیں کیا۔ دو چار دن کی تلاش کے بعد کنٹراکٹر مل گئے۔ انھیں آفس بلوایا گیا۔ انھیں دیکھ کر آفیسر کا غصہ عروج پر پہنچ گیا۔ پوچھا۔
"آپ کو سڑکوں کی مرمت کا کام دیا گیا تھا؟"
"جی سر!"
"آپ کو کام کے لیے آدھی رقم اڈوانس بھی دی گئی تھی؟"
"جی سر!"
"پھر کیا وجہ ہے کہ آپ نے اب تک سڑکوں کی مرمت کا کام شروع نہیں کیا؟"
کنٹراکٹر نے جواب دیا "سر! سڑکیں ہوں تو مرمت کروں، وہاں تو صرف گڈھے ہی گڈھے ہیں!" ○○

بال کی کھال

(تبصرہ)

ڈاکٹر سید حامد حسین
(بھوپال)

گول مال

از شفیقہ فرحت

"گول مال" پروفیسر شفیقہ فرحت کے طنزیہ مزاحیہ مضامین کا تیسرا مجموعہ ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ صرف تیسرا مجموعہ ہے۔ آج کل کی تیز رفتار تخلیق کاری کو مد نظر رکھتے ہوئے تو اب تک اُن کو کم از کم تیس مجموعوں کا خالق ہونا چاہیے تھا کیونکہ اُن کی تخلیقی عمر تیس پینتیس سال سے ہرگز کم نہیں ہے۔ لیکن محترمہ ابھی بھی کسرِ نفسی و نیکی کمال کا بہترین نمونہ بنے کی خام خیالی میں مصروف نظر آتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تخلیقی فنکار کو تخلیق فن کے لیے تحریک کی احتیاج ہوتی ہے۔ لیکن موصوفہ کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ تخلیق مضمون کے لیے تو تھوڑی بہت تحریک کچھ فرمائش اور کچھ اصرار سے کام نکل آتا ہے لیکن ترتیب مجموعہ کے لیے متعلقہ افراد کو اپنے مراتب کے حساب سے تجویز و ترغیب سے لے کر دھمکانے تک نوبت آتی ہے۔

"گول مال" میں تیرہ مختصر مضامین شامل ہیں۔ یہ اختصار خاصی کا وصف ہے۔ اس لیے اختصار کے باوجود دیری میں کمی نہیں رہتی۔ یوں تو شفیقہ فرحت کے مضامین لطف بیان اور لطف واقعہ دونوں خوبیوں کے مالک ہوتے ہیں لیکن اس مجموعے میں خصوصی طور پر ان کے اسلوب کی رنگا رنگی کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ "ہم چوپے کے رسوا ہوئے" بیانیہ انداز کا مزاح ہے جب کہ "ہدایت نامہ جدید" میں کسی وہی کتابی انداز کو طنز کا حربہ بنایا گیا ہے۔ بات میں سے بات پیدا کرنے کے فن کا اندازہ ایک اور مضمون "بیٹا" میں ہوتا ہے۔ "دوست بچی سیاسی" ایک خالص ماحول کی ہلکی پھلکی کہانی ہے۔ "گول مال" واقعات کے ساتھ کھلواڑ کرنے والے مزاح نگار کے قلم سے لکھی گئی آپ بیتی کا نمونہ ہے تو "اس شکار سے اس شکار تک" مزاحیہ نگار کے ساتھ رپورتاژ یا رپورتاژ کے اہتمام کے ساتھ مزاحیہ خاکہ ہے۔ شفیقہ فرحت گذشتہ تیس برس سے لکھ رہی ہیں لیکن ابھی تھکی نہیں ہیں۔ وجہ اُن کے اسلوب کی تازگی ہے۔ انھوں نے ابھی کوئی خاص اندازِ بیان، کوئی خاص تکیہ کلام، کسی خاص قسم کی کج کلاہی یا کج ادائی اپنے نام رجسٹر نہیں کروائی ہے۔ وہ اسلوب کی بساط پر ہر قسم کی چال چلنے میں لطف لیتی ہیں۔ کبھی ڈھائی گھر چل کر مارتی ہیں، کبھی ترچھی چال سے مات دیتی ہیں، کبھی پلٹ کر وار کرنے کو جائز سمجھتی ہیں۔ ان کے مضامین کی اس وجہ سے بعض اوقات صنف وار درجہ بندی کرنا بڑا دشوار ہو جاتا ہے۔ آپ ان میں افسانے سے انشائیہ تک کئی اصناف کے عناصر تلاش کر سکتے ہیں۔ شفیقہ کے اسلوب کی تازگی کا راز یہی ہر دم بدلتا رنگ، الفاظ سے کھیلنے کی قدرت، بات میں بات پیدا کرنے کا گُر، چھیڑ چھاڑ کر فقرہ چست کر جانے کی شوخی اور بے اعتدالی کہہ جانے کی صلاحیت ہے۔

"گول مال" کا عنوان حادثہ ذہن میں شکوک پیدا کرتا ہے، لیکن اس میں مال کھرا ہے قارئین اس سے مایوس نہ ہوں گے۔

"گول مال" از ڈاکٹر شفیقہ فرحت۔ ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نومبر ۱۹۸۹ء صفحات (۱۱۲) قیمت ۱۸ روپیے)

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد : ۲۳
شمارہ : ۵
مئی ۱۹۹۰ء

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ایڈیٹر :
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمالؔ

مجلسِ ادارت :
محمد حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم
طالب خوندمیری

مجلسِ مشاورت :
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
یوسف ناظم
مجتبیٰ حسین

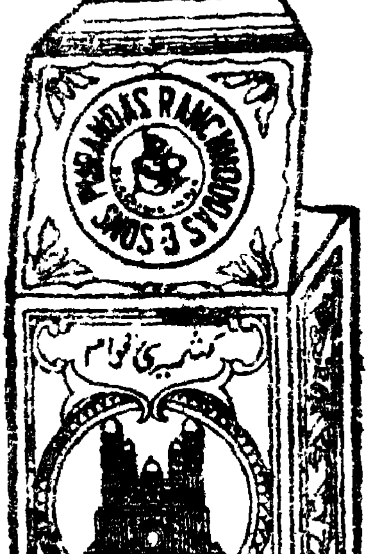
سرورق : عزیز آرٹسٹ
کتابت : محمد غالب، محمود سلیم اور محمد مجاہد

فی پرچہ : ۵ روپے
زرِ سالانہ : ۵۵ روپے
لائبریریوں سے : ۶۰ روپے، بیرونی ممالک سے : ۱۸۰ روپے

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد

خصوصی نمائندے :
بمبئی : — فیاض احمد فیضی
ریاض : — عابد معز
دوبئی : — غلام نجم الدین
آسٹریلیا : — ایس۔ ایم۔ حسینی

ترسیلِ زر اور خط و کتابت کا پتہ :
شگوفہ ۳۱ ٹیچرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
فون : 567716 رہائش : 521064


کشمیری قوام

(فہرست) اس تھیلی کے چٹے بٹّے

ہوائی کولمبس (سفرنامہ امریکہ)

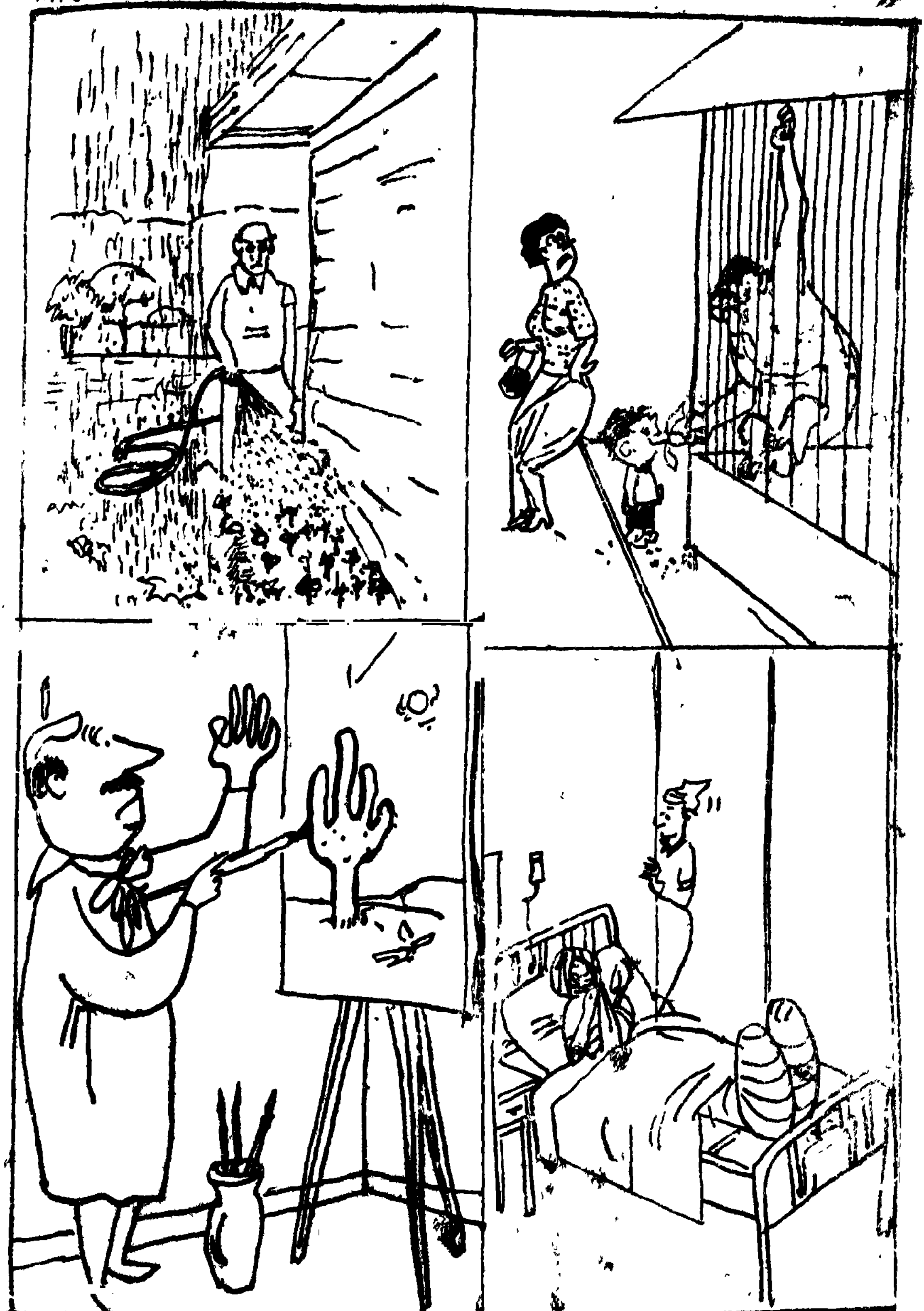
مالِ مفت (انشائیے)

ادب کا جغرافیہ

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

قاضی جی دُبلے (رپورٹ)

چوسر (منظومات)



نریندر لوتھر

ملنا کھوئے ہوئے بچپن کا

سفرنامۂ امریکہ

قسط ۱۰

سی ایٹل سے ہمیں لاس اینجلیز جانا تھا۔ سیدھی اڑان سے یہ صرف دو گھنٹے کے فاصلے پر تھا لیکن ہماری کم بخت ہوائی کمپنی ہمیں بار بار سینٹ لوئی دکھلانے پر مصر تھی۔ ہم نے لاکھ کہا کہ بھئی اب تو ہمیں سینٹ لوئی زبانی یاد ہوگیا ہے اور یہ وعدہ بھی کیا کہ اسے کبھی نہیں بھولیں گے، لیکن ہماری کمپنی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس لیے ہمیں ایک بار پھر دو گھنٹے کا سفر سات گھنٹے میں طے کرنا پڑا۔ ایک بار پھر ہم نے سینٹ لوئی کے ہوائی اڈے پر ہوائی اڑان کی تاریخ کا مطالعہ کیا۔ لاس اینجلیز کو امریکہ میں ایل۔ اے کہا جاتا ہے۔ ہم بھی آئندہ اس کو لام الف یا ل۔ ا ہی کہیں گے۔

لام الف میں ہمارے میزبان ڈاکٹر شاد تھے۔ یہ صاحب حیدرآباد کے مشہور ڈاکٹر اور کینسر کے ماہر ڈاکٹر سیٹھی کے داماد ہیں۔ حیدرآباد میں جو بی بی کینسر ہسپتال ہے وہ انہی کا کھولا ہوا ہے۔ اس طرح حیدرآباد میں کینسر کی بیماری کے بانی کہلانے کے مستحق ہیں۔ اس ہسپتال کو کھولنے کے سلسلے میں جب ایک بار وہ حیدرآباد آئے تھے تو ہماری اُن کے ساتھ پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ نہ صرف شریف ہیں بلکہ خوبصورت بھی ہیں۔ ہم نے یہ اس لیے واضح کیا ہے کہ کئی لوگ خوبصورت ہوتے تو ہیں پر شریف نہیں ہوتے اور اگر شریف ہوتے ہیں تو خوبصورت نہیں ہوتے۔ قدرت نے یہ دونوں خوبیاں یکجا کرنے کی فضول خرچی بہت کم کی ہے۔ ڈاکٹر شاد ل۔ا میں کینسر کے ایک بہت بڑے ہسپتال کے ڈائرکٹر ہیں، ان کی بیگم بھی ڈاکٹر ہیں لیکن کسی دوسرے ہسپتال میں ـــــ صورت اور سیرت سے دونوں میاں بیوی سگریٹ کی ایک کمپنی کے اشتہار کے مطابق "میڈ فار ایچ ادر" یعنی ایک دوجے کے لیے بنائے ہوئے لگتے ہیں۔

ہمارا جہاز ل۔ا کافی دیر سے رات کو پہنچا پھر ہمیں سامان ڈھونڈنے میں بہت دیر لگ گئی۔ اُدھر ڈاکٹر نثار کو پارکنگ کے لیے جگہ نہیں مل رہی تھی اور بے چارے اپنی کار میں ایرپورٹ پر بار بار لفٹ چکر لگا رہے تھے۔ آخر کافی افراتفری کے بعد سامان ملا اور ہم گھر پہنچے۔

ڈاکٹر نثار کا گھر ہالی ووڈ کے پاس ہے جہاں فلم اسٹار، ڈاکٹر اور دوسرے امیر لوگ رہتے ہیں۔ علاقہ پہاڑی سا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ حیدرآباد کا بنجارہ ہل .... لیکن بنجارہ ہل کو یہ درجہ اور مرتبہ دینے سے پیشتر اُس کو تھوڑا سا صاف کر دیا جائے۔ اس کی سڑکوں کی مرمت کر دی جائے۔ گندہ بستیوں کو نکال دیا جائے۔ پانی کی سپلائی باقاعدہ کر دی جائے۔ بجلی بحال کر دی جائے ... لیکن تب تک تو آپ کی آنکھ کھل جائے گی ... ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ بجلی بحال کر دی جائے۔ اس کے بعد موسم ذرا ٹھنڈا کر دیا جائے۔ ہر گھر کے سامنے تین تین کاریں کھڑی کر دی جائیں .... تو کچھ وہاں کا سماں بندھنا شروع ہوگا۔

ڈاکٹر نثار کے گھر میں تو تیرنے کا تالاب بھی ہے جو امریکہ میں بھی خاص امیری کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ ہم نے تالاب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ پانی اصلی تھا۔ حیدرآباد سے جانے والوں کے لیے اتنا سارا پانی ایک جگہ اور ایک دم دیکھنا ایک معجزے سے کم نہیں تھا۔ تالاب کے سامنے والے کمرے میں ایک دیو سائز ٹی۔ وی بھی تھا۔ اُس کے بازو ایک نہایت ہی آرام دہ کمرہ ہمارے لیے تیار تھا۔

چونکہ امریکہ میں عموماً میاں بیوی دونوں کام کرتے ہیں اور کام بھی سویرے جلدی شروع ہوتا ہے اس لیے لوگ ذرا جلدی سونے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ڈاکٹر نثار اور ان کی بیگم بڑی دیر تک ہمارے ساتھ کافی پیتے اور ہمارے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ ڈاکٹر نثار ہر روز ساٹھ میل کے فاصلے پر کام پر جاتے ہیں۔ مسز نثار چالیس میل کا سفر طے کرتی ہیں، جانے سے پہلے بچوں کو تیار کر وا کے اسکول بھیجنا ہوتا ہے اس لیے اُنھیں تڑکے اٹھنا پڑتا ہے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ہم کام اس لیے کرتے ہیں کہ روٹی کما سکیں لیکن امریکہ میں لوگ روٹی اس لیے کھاتے ہیں کہ کام پر جا سکیں۔ اس لیے "بیڈ ٹی" جیسی عیاشی جو انگریزوں نے فارغ البال ہندوستانیوں کو سکھائی تھی، امریکہ میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ وہاں تو لوگ ناشتہ بھی آرام سے نہیں کھا پاتے۔ ہم سمجھتے ہیں جو لوگ زیادہ کھانا اور سونا پسند نہیں کرتے اور جنھیں کام کرنے کا زیادہ چسکا ہوتا ہے وہی لوگ، امریکہ جاتے ہیں۔ وہاں لوگ ہفتے میں پانچ دن بڑی تندہی سے کام کرتے ہیں اور دو دن یعنی سنیچر اور اتوار بڑی محنت سے آرام کرتے ہیں۔ اس دوران بھی وہ اگلے ہفتے کے [illegible]نے کی تیاری کرتے ہیں۔ وہاں تفریح کے بھی بے شمار طریقے ہیں۔ وہاں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو ہفتہ کے دو دن تفریح کرتے ہیں اور باقی کے پانچ دن تفریح کی تیاری۔

لام۔ الف کی آب و ہوا معتدل ہے۔ یہاں ایسٹ کوسٹ (سٹی اسٹیٹ) کے مقابلہ میں سردی قدرے کم تھی۔ اس لیے لام۔ الف میں برف بھی معتدل پڑتی ہے۔ وہ بڑی تیزی سے گرتی اور پھر فوراً ہی پگھل جاتی ہے ایسا لگتا تھا کہ برف نے شراب پی ہوئی تھی اور اپنے آپ کو سنبھال نہیں پا رہی تھی۔

امریکہ میں لوگ بہت کماتے ہیں لیکن پھر بھی امیر نہیں لگتے۔ کسی کے گھر نوکر نہیں دیکھا جا کر کا تو خیر

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کھانا پکانا، برتن صاف کرنا، جھاڑو دینا، سب کام خود ہی کرنے پڑتے ہیں۔ اب ڈاکٹر نثار ہی کو لیجیے، تین تین کاریں رکھتے ہیں اور ڈرائیور ایک بھی نہیں۔ دن بھر کام کرنے کے بعد بے چارے خود ہی لوگوں کو ایر پورٹ سے لینے جاتے ہیں، خود ہی انھیں دور دراز مقاموں پر لے جاتے ہیں اور پھر خود ہی بڑی خوشی کے ساتھ ایر پورٹ پر اُن کو چھوڑ کر اپنی خلاصی کرواتے ہیں۔ ایک کار تھک جاتی ہے تو دوسری ڈیوٹی پر آجاتی ہے لیکن ڈاکٹر نثار سورج کے طلوع ہونے سے پہلے سے لے کر چاند نکلنے تک جُتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹری کے ساتھ تین ڈرائیوروں کا کام بھی کرتے ہیں۔ مرحبا — ! ہمیں ان پر بڑا ترس آیا۔ ہم نے اُن سے کہا کہ آپ کے لیے ہندوستان سے ایک باورچی اور ایک ڈرائیور بھیج دیں گے لیکن امریکن حکومت اتنی بے رحم اور سنگدل ہے کہ اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ اگر دنیا میں عام لوگوں کو نقلِ مقام کی آزادی ہو تو صورتِ حال یہ نہ ہوگی کہ کہیں تو لوگ کام سے مرے جا رہے ہیں۔ اور کہیں بھوک سے۔ جب تک دنیا میں ملکوں کی مطلق العنانی ہے، اس قسم کا اقتصادی اور مالی عدم توازن بدستور قائم رہے گا۔ اقوامِ متحدہ کے باوجود حالات کو سدھارا نہیں جاسکتا۔ امریکہ میں ہر شخص اس لحاظ سے خوش حال ہے کہ اس کی گزر بسر آسانی سے ہو جاتی ہے لیکن ؎

"کیا آبروئے عشق ہو جہاں عام ہو جفا"

اُس امیری کا کیا فائدہ جس سے ہم دوسروں کی غلامی نہ خرید سکیں۔ اُن پر رعب نہ جما سکیں، اُن کو دھمکی نہ دے سکیں؟ ہمیں یہ سن کر قدرے شرمندگی بھی ہوئی کہ امریکہ میں جو شخص ہماری تنخواہ کے برابر کماتا ہے اُسے سرکاری طور پر غریب سمجھا جاتا ہے اور حکومت اس کی مدد کرتی ہے۔ پھر ہم نے شرم کو ایک طرف رکھ کر درخواست کی کہ ہمیں بھی ایک فارم مہیا کیا جائے تاکہ ہم بھی مالی امداد کے لیے عرضی دے سکیں۔ لیکن ہمیں جواب ملا کہ ایسی امداد وہاں حکومت صرف امریکن شہریوں کو ہی دیتی ہے۔ حیرت ہے اتنی دولت اور اتنی تنگ نظری! خیر ہم نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ امریکی معیار سے ہم بے شک غریب ہیں لیکن اپنے ملک میں تو ہم بھی امیر ہیں۔ ہمارے جیسے غریب شخص کے پاس بھی نوکر ہیں، ماما ہے، ڈرائیور ہے، مگر یہ دوسری بات ہے کہ ہم خود غریب ہیں، ہماری ماما غریب ہے، ہمارا نوکر غریب ہے۔ ہمارا ڈرائیور غریب ہے۔ ہمارا مالی غریب ہے حتیٰ کہ ہمارا ملک غریب ہے۔ . . .

. . . خیر چھوڑیے اس بات کو۔ کچھ بھی ہو ہمیں ڈاکٹر نثار کی امیری کے باوجود اُن پر بڑا ترس آیا اور ہم نے انھیں دعوت دی کہ آپ جب بھی تھک جائیں اپنے خسر کے ہاں تھوڑا آرام کرنے کے لیے حیدرآباد تشریف لائیں، انھوں نے ہماری دعوت فوراً قبول کرلی اور اب وہ سال میں ایک آدھ بار حیدرآباد آتے ہیں لیکن ہمیں یہ افواہ ملی ہے کہ وہ یہاں آکر آرام نہیں کرتے بلکہ یہاں کے ہسپتال کے عملہ کو اور بھی تندہی سے کام کرنا سکھاتے ہیں۔ سچ ہے جس کو ایک بار محنت کی عادت پڑ جائے اُسے کوئی بھی نہیں سدھار سکتا۔

ل۔ا میں جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، دنیا کی فلم انڈسٹری کا دارالخلافہ ہالی ووڈ بھی ہے لیکن ہمیں وہاں کوئی چمکتا ہوا فلمی ستارہ نظر نہیں آیا اور ویسے بھی جن فلمی ستاروں سے ہم ملنا چاہ رہے تھے یعنی مارلین منرو، ہچکاک وغیرہ، تو وہ کبھی کے آسمانی ستارے بن چکے تھے۔

ل۔ا میں شہرۂ آفاق یونیورسل سٹوڈیو بھی واقع ہے۔ یہ تقریباً ۵۰۰ ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے اور فلموں کی شوٹنگ کے لیے ہر سہولت مہیا کرتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ پبلک کے لیے بھی کھلا رہتا ہے۔ اس کو دیکھنے کے لیے بارہ ڈالر کی ٹکٹ لگتی ہے اور دیکھنے والوں کو خاص قسم کی بسوں میں بٹھا کر اس نقلی اور کاغذی شہر کے مختلف سٹوڈیو اور نظاروں کی سیر کرائی جاتی ہے۔ اس میں ایک ہسپانوی قسم کا گاؤں بھی ہے۔ ہم وہاں پہنچے تو یک دم بارش آگئی اور سارے گاؤں میں سیلاب آگیا۔ ہم گھبرا گئے۔ ہمیں تسلی دی گئی کہ یہ مصنوعی بارش تھی۔ ایک چھوٹے سے تالاب کے کنارے ایک مصنوعی شخص مچھلیاں پکڑتا ہوا نظر آیا۔ ایک الیکٹرانک وہیل مچھلی نے اُس پر ایک مصنوعی حملہ کر دیا۔ گائیڈ نے ہمیں بتایا کہ یہ فلم "جاز" 'JAWS' کا سین ہے۔ فلم میں تالاب سمندر کی مانند دکھایا گیا ہے۔ اسی طرح ہم نے کئی اور سیٹ 'SET' دیکھے جن کے ذریعے رائی کو پہاڑ، بونے کو دیو اور بات کو بتنگڑ بنا کر دکھایا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ طلسم ہوشربا کا تمام سامان وہاں موجود تھا۔ ایک سٹوڈیو میں ہمارے گروپ میں سے دو تین والنٹیروں کو لے کر پانچ منٹ کے اندر ایک مختصر سی فلم اُن پر بنائی گئی۔ اُس میں وہ خلا باز کے روپ میں دکھائے گئے جو زمین کے گرد بنا کسی راکٹ کے، گھوم رہے تھے۔ اس کے علاوہ وہاں ایک سٹنٹ سٹوڈیو ہے۔ ایک جانور ایکٹروں کا اسٹوڈیو ہے جہاں مختلف جانوروں نے اپنے کمال کا مظاہرہ کیا۔ ہم نے ایک دھوئیں کا غار بھی دیکھا جہاں ایک خونخوار دیو اور ایک بڑے ہیرو کی لڑائی دکھائی گئی۔ اس لڑائی میں دیو نے ہیرو پر فتح پائی۔ ہیرو ہر ملک اور قوم کی فلموں میں فتح پاتا ہے۔ اسی لیے آج کل ہندوستان میں ووٹروں نے فلمی ہیروؤں کو ووٹ دینا شروع کیا ہے کہ وہ حقیقی زندگی میں بھی کٹھن مسئلوں کو اسی طرح حل کر سکیں گے جیسے فلموں میں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ایک بار یونیورسل سٹوڈیو کی سیر کروائی جانی چاہیئے تاکہ ان پر اصلی زندگی اور فلموں کی زندگی کا فرق واضح ہو جائے۔

ع میری زندگی حقیقت، تیری زندگی فسانہ

یونیورسل سٹوڈیو واقعی بہت دلچسپ جگہ ہے۔ وہاں کھانے کے لیے دس قسم کے رسٹورنٹ ہیں اور چودہ دکانیں ہیں تاکہ سیاح وہاں کھا پی کر خوب شاپنگ کر سکیں۔ ہم نے وہاں پورا دن گزار دیا اور جب کافی تھک گئے تو ڈاکٹر نثار اپنی جاپانی کار میں فرشتۂ رحمت کی طرح آن پہنچے۔

دوسرے دن ڈاکٹر نثار ہمیں اور بھی دور لے گئے کوئی چالیس میل کے فاصلے پر جہاں لانگ بیچ (LONG BEACH) ہے۔ وہاں دو نہایت ہی دلچسپ جہاز رکھے ہوئے ہیں۔ ایک دنیا کا سب سے بڑا ہوائی جہاز اور دوسرا دنیا کا سب سے بڑا سمندری جہاز۔ ان دونوں کے درمیان انیسویں صدی کی طرز کا ایک چھوٹا سا انگریزی بازار بھی ہے۔

ہوائی جہاز لکڑی کا ہے جسے ہاورڈ ہیوئیز (HOWARD HUGHES) نامی ایک شخص نے بنایا تھا۔ اس نے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۷۰ء کے درمیان ایک ہوائی جہاز بنانے والی کمپنی بنائی تھی۔ کہتے ہیں تکنیکی اعتبار سے یہ کمپنی آج بھی سب کمپنیوں سے آگے ہے۔ اس ہوائی جہاز کا وزن تقریباً دو سو ٹن ہے اور اس کے پروں کی لمبائی ۳۲۰ فیٹ

آج تک کسی اور ہوائی جہاز کے پروں کی لمبائی ۳۲۲ فیٹ سے زیادہ نہیں ہو پائی ۔ یہ جہاز ۲۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے لگاتار تین ہزار میل تک اڑ سکتا تھا ۔ اس میں ۷۵۰ مسافر یا دو ملٹرن ٹینک یا چھ ہوائی جہاز یا آٹھ ہیلی کاپٹر لے جا سکتے تھے ۔ اس نے صرف ایک بار ہی تین میل کی پرواز کی ۔ اس کے بعد اس کی چھٹی کر دی گئی اور زمین پر ہی رکھا گیا ۔ اس جہاز کو بنانے میں اس کے موجد اور معمار کو کئی چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن اس نے اپنا دعویٰ پورا کر دکھایا کہ لکڑی سے بنا ہوا جہاز اڑ سکتا ہے ۔ اسے دوسری جنگِ عظیم میں استعمال کرنے کے لیے کئی رد و بدل کرنے پڑے لیکن بالآخر اسے استعمال میں نہیں لایا گیا ۔ ہیوگیز ایک ایسا جینیس تھا جس نے اس جہاز کے علاوہ کئی فلمیں بھی بنائیں بعد میں وہ بڑا سنکی ہو گیا تھا اور کسی سے ملتا نہیں تھا ۔ چند برس پہلے نہایت ہی امیر شخص کی حیثیت میں اس کا انتقال ہو گیا ۔ لیکن اس جہاز اور اس کے سنکی پن کی وجہ سے اس کا نام امر ہو گیا ۔

لکڑی کے اس ہوائی جہاز کے بازو سمندری جہاز " ملکہ میری " لنگر ڈال کر پڑا ہوا ہے ۔ یہ جہاز ۱۹۳۰ء میں سکاٹ لینڈ میں بنایا گیا تھا اور اس نے اپنا پہلا سفر ۱۹۳۶ء میں کیا ۔ ایک ہزار اور ایک بار بحرِ اوقیانوس کا سفر کرنے کے بعد ۱۹۶۷ء میں اس کو ریٹائر کر دیا گیا ۔ اس کا وزن اکیاسی ہزار ٹن کے اوپر ہے ۔ اس کی لمبائی ۱۰۱۹ فیٹ ہے ۔ اس کے بارہ ڈیک DECK ہیں اس میں ۱۹۵۷ مسافر سما سکتے تھے اور اس کے عملہ کی تعداد ۱۱۷۴ تھی ۔ ایک گیلن پٹرول سے یہ ۱۱ فیٹ چل سکتا تھا ۔ یہ نہ صرف اپنے وقت کا بلکہ اب تک دنیا کا سب سے بڑا جہاز ہے ۔ صرف ایک جہاز " ملکہ الیزبتھ " کا وزن اس سے زیادہ تھا لیکن وہ ۱۹۷۲ میں ہانگ کانگ میں ڈوب گیا تھا ۔ زیادہ وزن سے یہی ہوتا ہے ۔ اسی لیے عورتیں اپنا وزن کم کرنے میں کوشاں رہتی ہیں ۔ وہ پانی میں ڈوب کر نہیں مرنا چاہتیں ۔ اس جہاز کی تاریخی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مشہور جہاز ۱۹۱۲ء تک کے TITANIC کا وزن صرف چھیالیس ہزار ٹن تھا ۔ وہ اپنے پہلے سفر میں ہی ڈوب گیا ۔ کئی لوگوں کا خیال ہے کہ اسے اس کے سسرال والوں نے ڈبو دیا ۔ کیوں کہ اس کے ساتھ کافی جہیز نہیں لادا گیا تھا ۔ اس آخری جہاز کو دوسری جنگِ عظیم کے دوران جنگی سروس بھی کرنا پڑی ۔ اس مقصد کے لیے اس کے بیشتر حصوں میں تبدیلیاں کر کے اسے سپاہیوں کی بار برداری اور زخمی سپاہیوں کے علاج کے لیے ایک ہسپتال میں بدل دیا گیا جہاں ڈیک پر کبھی ڈانس ہوا کرتا تھا وہاں توپ نصب کر دی گئی ۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اس جہاز کو توڑ دینا طے پایا اس وقت ایک امریکن نے اسے خرید لیا ۔ اب یہ جہاز ایک دلچسپ عجائب گھر کے طور پر یہاں رکھا ہوا ہے اور لوگ ٹکٹ خرید کر دور دور سے اسے دیکھنے کے لیے آتے ہیں ۔ اسے دیکھنے میں ہمیں آدھا دن لگ گیا ۔ اس میں کھانے پینے کے لیے بھی بڑے اعلیٰ قسم کے ریسٹورنٹ ہیں لیکن قیمتیں اتنی زیادہ کہ ہم صرف ایک پیالہ کافی کا پی پائے ۔

یہ دونوں عجوبے دیکھ کر ہم حیران و ششدر رہ گئے ۔ خدایا ! یہ امریکی کس قسم کے لوگ ہیں کہ لکڑی کو اڑاتے ہیں ، لوہے کو تیراتے ہیں اور دل و جگر کو ہلا دیتے ہیں ۔ ابھی ہماری انگلی ہمارے دانتوں کے نیچے ہی تھی کہ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہمارا میزبان دوست ڈزنی لینڈ لے جانے آن پہنچا ۔ ہم نے فوراً اپنی انگلی دانتوں کے تلے سے نکالی اور ان کے ہاتھ میں تھما دی اور پھر اس کے ساتھ ہو لیے ۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی لیکن گم صم ۔ ہم نے وجہ پوچھی

تو پتہ چلا کہ اس کو جبڑے میں کوئی کیڑا لگ گیا تھا جس کی وجہ سے اس کا آپریشن کرنا پڑا۔ ایک طرف کا پورا جبڑا بہ مع ہڈی نکال کر ایک نیا جبڑا بنا کر اُسے لگا دیا گیا۔ اس کے بعد اس بے چاری کا منہ لوہے کے تاروں سے چھ ماہ تک جکڑ کر رکھا گیا۔ بھلا ایک عورت کے لیے اس سے زیادہ تکلیف دہ بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے مُنہ پہ مہر لگا دی جائے! اس وقت اس کی حالت قدرے بہتر تھی اور وہ تھوڑا تھوڑا بول بھی سکتی تھی لیکن بیشتر اس کے کہ وہ پوری طرح بولنے لگتی، ہم وہاں سے چل پڑے۔ سُنا ہے کہ اب وہ مکمل طور پہ ٹھیک ہو گئی ہے اور اس نے معمول کے مطابق بولنا شروع کر دیا ہے۔ اس کا خاوند اب اس کا دوسرا جبڑا بدلوانے کی سوچ رہا ہے تاکہ ایک اور سال تک گھر میں سکون رہے۔

اس کے اگلے دن ہم نے "ڈزنی لینڈ" دیکھا۔ یہ دُنیا بھر کے لوگوں کی تفریحی زیارت گاہ ہے "والٹ ڈزنی" ایک فلم لیبارٹری میں کام کرتا تھا۔ اُس نے پہلے تو فلم کارٹون بنانے شروع کئے اور دنیا کا مشہور کارٹون کیریکٹر "مکی چوہا" (MICKEY MOUSE) ایجاد کیا۔ یہ کارٹون فلمیں زیادہ تر خاموش فلمیں تھیں اور ان میں پنچ تنترا کے طرز کے جانوروں کی زندگی پہ مبنی کہانیاں بنائی جاتی تھیں بظاہر تو یہ فلمیں بچوں کے لیے ہوتیں لیکن بیشتر بالغ پہلے تو چوری چھپے، پھر کُھلم کُھلا ان کو دیکھنے لگے۔ جب اس کی کارٹون فلمیں بہت مقبول ہو گئیں تو اس نے تہیہ کیا کہ وہ ایک ایسا عجیب و غریب، نرالا اور خیالی قسم کا چھوٹا سا شہر بنائے گا جس کا تصوّر ہر قوم کی دیومالا میں ہوتا ہے 'پریوں کا شہر' 'دیوؤں کا شہر' ایسی بستی جہاں پرندے چہچہاتے ہیں، جانور بولتے ہیں لیکن عورتیں خاموش ہوتی ہیں اور جو ہر بچّے کے ذہن میں اس وقت تک محفوظ رہتا ہے جب تک تعلیم کے ذریعہ اس کو کچل نہیں دیا جاتا۔

اس نئی نگری کو بسانے کے لیے اس نے تقریباً ایک سو ایکڑ بنجر زمین خریدی اور اپنے چند قریبی دوستوں کی حوصلہ افزائی اور مالی مدد سے اس نے اپنے تخیل کو حقیقت میں بدلنا شروع کیا۔ یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ جب ۱۹۵۵ء میں ڈزنی لینڈ بنا تو اس پہ تقریباً پونے دو کروڑ ڈالر خرچ ہوئے تھے۔ اس میں ہر قسم کی دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ پہاڑ، مصنوعی جھیلیں (پہاڑ بھی مصنوعی ہیں) ٹرین، جانور، جنگل (مصنوعی) ڈبکنیاں کشتیاں وغیرہ وغیرہ (یہ بھی مصنوعی ہیں) ایک ڈبکنی کشتی میں بٹھا کر آپ کو سمندر میں بیس ہزار فیٹ نیچے لے جاتے ہیں اور وہاں کے نظارے دکھاتے ہیں۔ اصل میں کشتی صرف دو چار فیٹ نیچے ہی جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی ٹرینیں پہاڑوں میں سے سرنگوں کے ذریعہ طوفان کی رفتار سے گزرتی ہیں۔

دو سو سال پہلے کے امریکہ کے سرحدی علاقوں کے ماڈل۔ سو سال سے زیادہ پرانے ریلوے اسٹیشن۔ گویا ایک پورے کا پورا شہر ہے، مُلک ہے جو طلسم ہوشربا ہے۔ فریب نظر ہے۔ شعبدہ بازی ہے ـــ یہ جادو نگری تو بچوں کے لیے بنائی گئی تھی لیکن یہاں بھی بچوں سے زیادہ بالغ لوگ نظر آتے ہیں۔ ہر انسان کے اندر جو بچّہ چھپا بلکہ دبا ہوا ہے وہ یہاں اُبھر کر باہر آجاتا ہے۔ ہم نے بھی اپنے دل و دماغ پہ پڑے ہوئے ملبے کو ہٹایا اور اس چھوٹے سے لڑکے کو ڈھونڈ نکالا جو برسوں سے ملبہ کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ابھی زندہ تھا۔ ہم دونوں آپس میں مل کر بہت خوش ہوئے۔ روئے، ہنسے، اچھلے کودے، ناچے گائے۔ پھر ہیں

ہیبت ہوئی کہ بیگم سے ڈانٹ ڈپٹ ہوگی کہ یہ کیا اودھم مچا رکھا ہے۔ کس کے ساتھ کھیل رہے ہو؟ بیگم نے تو ہمارے سپنوں پر بھی سنسر لگا رکھا ہے بلکہ اگر ہم کبھی ان کے خوابوں میں بھی کسی ایسی ویسی حرکت کے مرتکب ہو جائیں تو اس کی بھی جواب دہی کرنا پڑتی ہے۔ ہم نے ایک بار سمجھایا بھی کہ آپ کے خوابوں پر ہمارا کیا اختیار ہے۔ جواب ملا کہ اگر تم ہمارے خوابوں میں اس قسم کی حرکتیں کر سکتے ہو تو اپنے خوابوں میں کیا کیا نہ کر گزرتے ہو گے؟

لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ بیگم بھی ایک ننھی سی لڑکی کے ساتھ بڑے انہماک کے ساتھ، بے سدھ سی ہو کر کھیل رہی تھیں۔ پھر ہم نے نوٹ کیا کہ جتنے بھی بالغ وہاں آئے ہوئے تھے، وہ دنیا سے بے پرواہ ہو کر اپنے اپنے 'ہمزاد' کے ساتھ ایک اور ہی دنیا میں گم تھے۔ اس وقت اس جادو نگری میں معصومیت کا راج تھا اور ہر کرخت بالغ شخصیت ایک صحت مند بچے میں بدل چکی تھی۔

جس دن 'ڈزنی لینڈ' کی رسم افتتاح ہوئی تھی اُس دن ناظم جلسہ کے فرائض ریگن نامی ایک ایکٹر نے ادا کئے۔ وہ ایکٹر اس وقت امریکہ کا پریسیڈنٹ ہے۔

ڈزنی لینڈ میں گاہے بہ گاہے نئے سیکشنوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح وہ عصری ترقی کا آئینہ دار رہتا ہے۔ والٹ ڈزنی نے خود کہا تھا کہ جو کام میں نے شروع کیا ہے وہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ وہ ہمیشہ زیر تکمیل ہی رہے گا۔ ڈزنی لینڈ کو دیکھنے ہر روز ہزاروں لوگ آتے ہیں۔ ہر لاکھویں شخص کو لاٹری میں ایک کار انعام ملتی ہے۔ انعام میں دیئے جانے والی کاریں گیٹ کے باہر تیار کھڑی رہتی ہیں۔

ہم جب ڈزنی لینڈ میں داخل ہوئے تو ہمارے ٹکٹ کا نمبر ستر ہزار کے قریب تھا۔ ہمارے باہر نکلنے سے پہلے ہی کوئی خوش قسمت شخص لاکھویں نمبر کا ٹکٹ لے کر ایک نئی کار لے جا چکا تھا۔ ہم نے اُسے ڈھونڈنے کی کافی کوشش کی کہ شاید وہ اپنی پرانی کار ہمیں دے دے لیکن اُس جادو نگری میں اُس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ وہ دونوں کاریں لے کر چمپت ہو گیا۔

کوئی بھی شخص جو امریکہ جاتا ہے ڈزنی لینڈ ضرور جاتا ہے۔ سیاحوں کی سہولت کے لیے اب ایک ڈزنی لینڈ مشرقی ساحل پر بھی بنایا گیا ہے تاکہ لوگوں کو یہ تبرتھ یاترا کرنے کے لیے زیادہ دُور نہ جانا پڑے۔ اگر کوئی سیاح ڈزنی لینڈ کو دیکھ نہیں پاتا تو امریکہ کی حکومت اُسے امریکہ سے نکلنے نہیں دیتی۔ اب ڈزنی لینڈ اتنا مقبول ہو گیا ہے کہ کئی ملکوں نے ڈزنی لینڈ کمپنی سے ویسے ہی تجربے بنانے کے لیے مدد مانگی ہے۔ ایک ڈزنی لینڈ جاپان میں بن گیا۔ دوسرے کے لیے اٹلی اور فرانس میں رسہ کشی ہوئی۔ آخر فرانس جیت گیا۔ امریکہ سے واپس آنے پر ہم نے بھی ڈزنی لینڈ کمپنی سے، حیدرآباد میں ایک ڈزنی لینڈ بنانے کے لیے مدد مانگی۔ جواب ملا کہ اگلے تین چار سال ہم فرانس میں مصروف رہیں گے۔ اس کے بعد بات کیجئے۔

ڈزنی لینڈ واقعی ایک کارنامہ ہے۔ ایک شخص کے تخیل کی بلندی پرواز، اُس کی دُھن، ہمت اور ثابت قدمی کی ایک لاجواب مثال ہے۔ ڈزنی نے یہ ثابت کر دیا کہ جینیس (GENIUS) وہ ہے جو وہی کرتا ہے جو اُسے کرنا ہوتا ہے۔ ہم میں سے بیشتر لوگ اس لیے کامیابی حاصل نہیں کرتے کہ ہماری دلچسپی کسی اور کام میں ہوتی ہے لیکن روزگار

کے لیے ہم، جو کام بھی ملے وہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ڈزنی نے پچھلے تیس سالوں میں ہزارہا لوگوں کو روزگار فراہم کیا۔ ایک نئی انڈسٹری کی بنیاد رکھی اور کروڑوں ڈالر کمائے۔ اس کی وجہ سے آج امریکہ کا نام بچے بچے کو معلوم ہے۔ اُس نے وہ کام کر دکھایا جو امریکہ کی فوجیں اپنے ہتھیاروں کے باوجود نہیں کر پائیں۔ ڈزنی ایک ایسا بالغ تھا جس نے اپنا بچپن وقت کے ہاتھوں سے چھین کر واپس لے لیا۔ اور جس نے دوسرے بالغوں کو بھی یہ عرفان دیا کہ آرٹ فطرت سے قرب اور بچپن کے حصول کا نام ہے اپنے اندر کے چھوٹے سے بچے کو مرنے نہ دو۔

ہمارے دماغ سے ڈزنی لینڈ کی یاترا کا نشہ کبھی نہیں اُترے گا۔ اس شاہکار کو دیکھنا ہمارے سفر کا نقطۂ عروج تھا۔ اگر ہم صرف اُسے دیکھ کر ہی واپس آجاتے تو بھی ہماری زندگی سپھل ہو جاتی لیکن ابھی ہمارے پاؤں میں اور چکّر تھا۔

ہمارے اوریجنل پروگرام کے مطابق ہمیں ل۔ا سے کیلی فورنیا جانا تھا لیکن اسی اثنا میں واشنگٹن سے فون آگیا کہ بیگم کی آنکھ کا آپریشن مقررہ دن سے تین دن پہلے ہونا طے پایا ہے اس لیے ہمیں کیلی فورنیا کا پروگرام منسوخ کرنا پڑا۔ فون کے ذریعہ ہمیں یہ خبر وقت پہ مل گئی۔ امریکہ میں ایک شہر سے دوسرے شہر بلکہ دوسرے مُلک کو فون کرنا اتنا آسان ہے جتنا دوسرے شہر سے پہلے شہر کو۔ ہم مثال تو ہندوستان کی دینا چاہتے تھے لیکن اس لیے نہ دے پائے کہ بولنے میں سچ نہ سہی تو کم از کم لکھنے میں تو ہم سچ کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حیرانی کی بات ہے کہ امریکہ میں فون کبھی خراب ہی نہیں ہوتے۔ وہ اتنے سخت جان ہیں کہ طوفان اور برفباری میں بھی کام کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستان میں تو کتنی بار آپ کئی لوگوں کو یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ میں نے بارہا آپ کو فون کرنے کی کوشش کی لیکن آپ کا نمبر ہی نہیں ملا۔ جواب میں دوسرا شخص بھی بڑی بے بسی کے انداز میں کہتا ہے کہ ہاں ٹھیک ہی ہوگا کیونکہ آسمان پہ بادل چھائے ہوئے تھے، فون تو ضرور خراب ہوگیا ہوگا۔

ہمارے ملک میں ہمیں بارہا بارش آنے کی وارننگ اس طرح ملتی ہے کہ یا تو مٹّی سے بھینی بھینی خوشبو آنا شروع ہو جاتی ہے یا ہمارا فون مرجاتا ہے۔ اُس کے فوراً بعد یا اُس سے پہلے ہی بجلی بھی فیل ہو جاتی ہے۔ اس طرح ہمارے ملک میں موسمیات، فونیات اور بجلیات میں بڑا تال میل ہے۔ ایک کو کچھ ہو جائے تو دوسرا فوراً ازراہِ ہمدردی اس کا ساتھ دیتا ہے۔ بجلی اور فون کے خراب ہونے کی بنا پر تین چار موثر بہانے جو ہندوستان میں بہ کثرت استعمال کئے جاتے ہیں امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں نہیں چل پاتے۔ کم بختوں نے کام چوری کے کئی آزمودہ راستے بند کر دیئے ہیں۔

خیر ـــ یہ تو بات ضمناً نکل آئی۔ ہمیں تو یہ کہنا تھا کہ شکر ہے فون کا کہ یہ اطلاع ہمیں بروقت مل گئی کہ ہمیں ایک دم واشنگٹن پہنچنا ہے۔ اب امریکہ میں ہمارا سب سے لمبا ہوائی سفر شروع ہونے والا تھا یعنی مغربی ساحل سے مشرقی ساحل تک لام الف سے واشنگٹن تک "سنہری ریاست" سے "راجدھانی" تک۔ فلمی ستاروں کے شہر سے اُس شہر میں جہاں ایک فلمی ستارہ "وزیرِ اعظم بن گیا تھا۔" ستاروں کی جنگ" کا بانی!

ہماری مراد صدر جمہوریہ ریاستہائے متحدہ امریکہ جناب رونالڈ ریگن سے ہے چنانچہ ہم باخبر، باملاحظہ ہوشیار ہو گئے ـــ

۵۵

ابراہیم یوسف
(بھوپال)

دانشور

آج کل عزیز محترم بے حد مصروف نظر آرہے تھے جب بھی ان سے نیاز حاصل کرنے جاتے وہ کرسی پر یوں اکڑے ہوئے بیٹھے ملتے جیسے کسی تیسرے درجہ کے اخبار کے ایڈیٹر ہوں یا پھر کسی غیر معروف عارضی انجمن کے صدر۔ میز پر کتابوں، رسائل اور اخبارات کے یوں ڈھیر لگے رہتے جیسے کباڑی یا ردی فروش کی دکان ہو۔ ان کا یہ روپ دیکھ کر ہم پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے کیوں کہ عزیز محترم ہم سے متعدد بار کہہ چکے تھے کہ کتابیں وہ کمرے میں سجانے کے لیے اخبار اور رسائل فیشن کے طور پر خریدتے ہیں پڑھنا پڑھانا بے وقوفوں کا کام ہے۔ پھر آج کل ان پر کون سی افتاد پڑی ہے جو وہ یوں اخباروں اور کتابوں میں دفن رہتے ہیں کل جب ہم نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا تو انھوں نے جواب تو خیر گردن ہلا کر ہی دیا مگر ازراہ نوازش کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ بھی کر دیا ہم کرسی پر بیٹھ تو گئے مگر دل میں کھد بدی مچی ہوئی تھی کہ دیکھئے عزیز محترم پٹارے سے کون سا کبوتر نکالتے ہیں کچھ دیر تو وہ ہمیں مسکرا کر دیکھتے رہے ابھی ہم شش و پنج ہی میں تھے کہ وہ آنکھیں بند کر کے سوچتے ہوئے گویا ہوئے ۔

" اگر انسان کے دل میں لگن ہو تو وہ کیا کچھ نہیں کرسکتا۔" بات اس قدر معقول تھی کہ ہمیں سوائے تائید میں گردن ہلانے کے کوئی چارہ نہ تھا۔ اتنا کہہ کر عزیز محترم دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے پھر یکایک آنکھیں کھول کر فرمایا۔

"ہم دانشوروں اور دانشوری پر ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ سوچ کیا رہے ہیں بلکہ سوچ لیا ہے" پھر کتابوں، رسائل اور اخباروں کے انبار کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، یہ دیکھو مواد بھی جمع کرلیا ہے" کچھ دیر ہمارے چہرے کو غور سے دیکھتے رہے پھر گویا ہوئے " اچھا تمہارے نزدیک دانشور کون ہے اور دانشوری کیا ہے " اس غیر متوقع حملہ سے ہم سٹ پٹا کر نروس ہو گئے لیکن جواب نہ دینے کی صورت میں عزیز محترم کا ناراض ہو جانا یقینی تھا اس لیے عرض کیا ۔

" ہمارے نزدیک رشوت خور، کالا بازاری کرنے والے اور اسمگلر دانشور ہیں کہ اپنی اس دانشوری سے وہ عیش کرتے ہیں۔ ہمارا جواب سن کر انھوں نے ہمیں تحقیر آمیز نظروں سے دیکھ کر فرمایا۔ " اگرچہ تمہارے سوچنے کا ڈھنگ منفی ہے مگر اس سے ہمارے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ دنیا میں جہلا اور دانشوروں کا توازن بگڑتا جارہا ہے اور وہ دن دور نہیں جب دنیا میں صرف دانشور ہی دانشور ہوں گے اور جہلا معدوم ہو جائیں گے ۔

" لیکن آپ کو جہلا سے اس قدر رغبت کیوں ہے " ہم نے سوال کیا ۔

عزیز محترم ہمارے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولے "کسی بھی سڑی بھسی انجمن کے ممبر بن جایئے لوگ آپ کے دانشور ہونے کا فتویٰ صادر کر دیں گے۔ اسمبلی اور پارلیمنٹ کا غبی سے غبی ممبر بھی اپنے دانشور ہونے کا اعلان کرتا رہتا ہے۔ دفاتر کے کلرک ریلوے اور بسوں کے ٹکٹ فروخت کرنے والے بھی دانشور طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اب تم ہی سوچو کہ اگر دانشوروں کی پیدائش کی یہی رفتار رہی تو دنیا میں کون سی دلکشی رہ جائے گی سوائے روکھی پھیکی دانشورانہ زندگی کے جس میں ایسی جبراً قہراً "مسکراہٹیں ہوں گی جیسے خود پر ظلم اور مسکراہٹ پر احسان کیا جا رہا ہو۔ لاحول ولا قوۃ ـــــ دنیا کی رونق غیر دانشوروں کے دم سے ہے پھر خلا میں یوں دیکھنے لگے جیسے آسمان سے خیالات کی بارش کے منتظر ہوں۔ کچھ دیر بعد فرمایا "کافی غور کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ دانشوری ایک معمہ ہے جسے حل کرنا بہت مشکل ہے اور اچھا بھلا انسان کب دانشور ہو جاتے کہا نہیں جا سکتا درحقیقت دانشوری کوئی متعدی مرض ہے جو ایک سے دوسرے کو صرف دیکھ لینے سے لگ جاتا ہے اور اس پر بھی دانشوری کے دورے پڑنے لگتے ہیں اور یہ دورے اس قدر شدید ہوتے ہیں کہ نومولود دانشور اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہتا اس لیے دانشوری ہوش و حواس سے بالاتر کوئی چیز ہے۔" اس نادر تھیسس کو سن کر ہمارے ہوش اُڑ گئے اور ہم بے وقوفوں کی طرح عزیز محترم کو دیکھنے لگے کچھ دیر تو وہ ہمیں فاتحانہ انداز سے دیکھتے رہے اور ہماری بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہوتے رہے پھر فرمایا "شاید تمہیں ہمارے خیالات سے اتفاق نہیں۔ اچھا یہ بتلاؤ اگر کوئی ایسا مطالبہ کرے جو اخلاقی معیار سے گرا ہوا ہو اسے تم کیا کہو گے؟"

"پاگل" ہم نے جواب دیا۔

"نہیں ـــــ بلکہ اعلیٰ ذات کا دانشور" عزیز محترم بولے "تمہیں معلوم ہے کہ ان اعلیٰ ذات کے دانشوروں نے اپنے ملکوں میں ایسے قوانین پاس کرائے ہیں کہ مرد مرد سے شادی کر سکے۔ لوطیت پر کوئی پابندی نہ ہو مرد طوائفوں کو سرٹیفکٹ دیئے جائیں کہ وہ چکلوں میں بیٹھ کر باذوق خواتین کو اپنی طرف متوجہ کریں۔ ان دانشوروں کا دعویٰ ہے کہ وہ دنیا کے سب سے مہذب لوگ ہیں اور انھیں باقی دنیا کو بھی اتنا ہی مہذب بنانے کا حق حاصل ہے۔ اب بولو کیا کہتے ہو" اب تو ہمارے کان کھڑے ہوئے کہ عزیز محترم سچ مچ کچھ دانشورانہ گفتگو کر رہے ہیں وہ انگلیوں سے میز پر طبلہ بجانے لگے۔ آنکھوں میں غور و فکر کے آثار تھے تھوڑی دیر بعد بولے۔

"کافی غور و فکر کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ دانشوروں کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ جسے خدا دانشور بنا کر پیدا کرتا ہے اور دوسری وہ جس میں لوگ بزعم خود اپنے آپ کو دانشور منوانے پر تل جاتے ہیں خود کو دانشور منوانے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں اور کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے پہلے مرحلے میں ہر قسم کے عقائد سے توبہ کر کے پاک و صاف ہونا پڑتا ہے کہ عقائد دانشوری کی ضد ہیں پھر دوسرا مرحلہ آتا ہے اس میں دوسروں کے جذبات و احساسات کی نفی کرنے کا حلف اٹھانا پڑتا ہے کہ دوسروں کے جذبات و احساسات کا احترام دانشوری کے منافی ہے اور تیسرے مرحلے میں عقل و خرد سے بیگانہ ہو کر صرف دانشوری پر ایمان لانا ہوتا ہے کیونکہ عقل و خرد اور احترام جذبات آزادی تحریر و تقریر کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹیں ہیں۔ اب رشدی ہی کے معاملہ کو لو اس نے کروڑوں انسانوں کے جذبات کو مجروح کیا اور آزادی کی مگر یہ

خود ساختہ دانشور بغلیں بجا رہے ہیں کہ اس نے آزادیٔ تحریر اور آزادیٔ ضمیر کا استعمال کیا ہے اور جب ان آیات شیطانی پر پابندی لگانے کو کہا جاتا ہے تو دانشور طبقہ یوں چراغ پا ہو جاتا ہے جیسے دنیا کے سارے علم و ادب کو دریا برد کرنے کا مشورہ دیا جا رہا ہو اور اگر ان آیات شیطانی پر پابندی لگا دی گئی تو دنیا ان کے نور سے محروم ہو جائے گی۔ کچھ دیر عزیز محترم خاموش ہو کر سانس ہموار کرتے رہے پھر فرمایا: "دانشوری کا کورس مکمل کرنے کے بعد یہ دانشور مختلف گروہوں میں تقسیم ہو کر اپنے اپنے محاذ پر سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔" ان دانشوروں کا ایک گروہ وہ ہوتا ہے جن کا کام بیانات دینا ہوتا ہے۔ ان بیانات کی حیثیت مصرع طرح کی ہوتی ہے جو اکثر حالات میں بحر میں نہیں ہوتا اس مصرع کو سن کر دوسرے دانشور اس پر گرہیں لگاتے ہیں مصرع طرح تو غیر موزوں ہوتا ہے اس پر جو گرہیں لگائی جاتی ہیں ان کی بھی کوئی کل ٹھیک نہیں ہوتی۔ یہ بیانات انفرادی بھی ہوتے اور اجتماعی بھی۔ اجتماعی بیانات پر بڑے تو بڑے بدیاں بھی دستخط کر کے اپنے عظیم دانشور ہونے کے ثبوت میں چوں چوں کرنے لگتی ہیں۔ ان دانشوروں کے ہتھیار سیاست، مصلحت پسندی اور اظہار فوقیت ہوتے ہیں اور جہاں ان ناموزوں مصرعوں اور گرہوں پر اعتراض کیا گیا کہ ان کی رگ دانشوری پھڑکی اور انھوں نے اعتراض کرنے والے کو حقارت سے" بنیاد پرست ہونے کا سرٹیفکٹ عنایت فرمایا اور بنیاد پرست کا لفظ ہر اس شخص کے لیے استعمال کرتے ہیں جسے اپنی روایات اپنی تہذیب و ثقافت اور عقائد عزیز ہوتے ہیں۔ ماہرین حیوانیات کی رائے ہے کہ جو جانور گروہوں میں رہتے ہیں ان کی بھی کچھ روایات اور ایک تہذیب ہوتی ہے جس پر وہ سختی سے عمل کرتے ہیں مگر دانشور بنیاد پرستوں کو جانوروں سے بھی بدتر سمجھتے ہیں اس کے بعد عزیز محترم نے کرسی کی پشت سے ٹیک کر یوں آنکھیں بند کر لیں جیسے تھک کر نڈھال ہو گئے ہوں ہم ان کی تحقیق پر غور ہی کر رہے تھے کہ وہ پھر آنکھیں کھول کر بولے۔" دانشوروں کا ایک گروہ وہ ہوتا ہے جو ابتدا سیاسی پارٹیوں کے جلسوں میں فرش بچھاتا، جلوسوں میں نعرے لگاتا اور کسی بڑے دانشور کی چمچہ گیری کرتا ہے یہ اکثر حالتوں میں یوں ہی سا پڑھا لکھا ہوتا ہے لیکن قسمت کی سکندری اور چمچہ گری کی بدولت کارپوریشن یا اسمبلی کا ممبر ہو جاتا ہے اور جس روز وہ ممبر منتخب ہوتا ہے اسی دن ایک اور دانشور جنم لے لیتا ہے۔ اس کی دانشوری یہ ہوتی ہے کہ معقول نذرانہ لے کر اپنے اثرات سے استفادے کا کام لوگوں کو کراتا ہے۔ تیسرا گروہ وہ ہے جسے مقراض بدست کا نام دیا جا سکتا ہے ان کی دانشوری یہ ہوتی ہے کہ یہ کتابوں اور رسائل پر قینچی چلا کر ان کے خیالات اور خوب صورت جملوں کو اپنے مقالات میں نگینہ کی طرح جڑ دیتے ہیں اسی گروہ کی ایک ضمنی شاخ بھی ہوتی ہے یہ اخبارات اور رسائل میں برابر مراسلے لکھتے رہتے ہیں کہ ان کا نام چھپتا رہے اور لوگ انھیں بھی دانشوروں کی بلند کرسی پر سجا دیں۔ غرض یہ کہ اب دانشوروں کی دنیا میں کوئی کمی نہیں رہی ہے حد تو یہ ہے کہ ہماری بیگم بھی اپنے دانشور ہونے کا دعویٰ کر رہی تھیں۔"

"آپ کی بیگم" ہم نے حیرت سے کہا۔ "وہ کس طرح۔"

"فرما رہی تھیں کہ میں نے سالن پکانے کا ایک ایسا فارمولا دریافت کر لیا ہے کہ لوگ کم کھائیں گے اس طرح بجٹ کے خرچ میں کافی کفایت ہوگی ——— صرف نمک مرچ کا خرچ بڑھ جائے گا۔"

ہم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "واقعی فارمولا تو دانشورانہ ہے۔" عزیز محترم کچھ دیر خاموش رہے پھر فرمایا: "دانشوروں کو اب

طرزِ گفتگو سے پہچانا جاسکتا ہے۔ ان کے گفتگو کرنے کا ایک اسٹائل ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو وہ اس قسم کا تاثر دیتے ہیں کہ جس سے وہ گفتگو کر رہے ہیں وہ بالکل جاہل ہے اچھا ہے سے گفتگو کرکے اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں اور مخاطب کی سات پشتوں پر احسان سوال کا جواب دینے سے پہلے کچھ دیر آنکھیں بند کرلیں گے اور منہ آسمان کی طرف جیسے جبرئیل ان پر وحی لے کر آنے والے ہوں۔ پھر اس قدر آہستہ آہستہ الفاظ کو چبا چبا کر بولیں گے کہ سننے والے کو ثقلِ سماعت کا شک ہونے لگے گا۔ اگر کسی نے مزید سوال کرلیا تو اسے یوں گھور کر دیکھیں گے جیسے ان کے افکارِ عالیہ کی توہین کی گئی ہو۔" اتنا کہہ کر عزیز محترم نے آنکھیں بند کر کے منہ آسمان کی طرف کرلیا کچھ دیر اسی حالت میں رہے پھر آنکھیں کھول کر فرمایا "دنیا کے لوگ دو واضح بلاکوں میں بٹ چکے ہیں ایک فنڈامینٹالسٹ اور دوسرے اپارچونسٹ۔"

"آپ کس بلاک میں ہیں" ہم نے سوال کیا۔

"لاحول ولا قوۃ" وہ فوراً بولے۔ پھر دونوں کانوں کو پیٹتے ہوئے بولے:

"نہ ہم فنڈامینٹالسٹ ہیں اور نہ اپارچونسٹ ——— سوچ رہے ہیں کہ کیوں نہ ہم ایک انجمن جہلا قائم کرلیں کہ ان دونوں کی یلغار سے محفوظ رہیں اور دونوں میں توازن برقرار رکھنے کے بھی فرائض انجام دیں" اور پھر یوں آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر جیسے مراقبہ میں ہوں۔ ہم آج تک یہ سوچ رہے ہیں کہ عزیز محترم دانشوروں کے کس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

پرانی کار نیا مالک

عابد معز
(ریاض)

ترقی کے ساتھ انسان مشینوں کے جنگل میں پھنستا جا رہا ہے۔ ریفریجریٹر، ٹیلی فون، ٹی وی، ویڈیو، استری، سلائی مشین، کپڑے دھونے اور سکھانے کی مشین، فرش صاف کرنے کی مشین، مصالحہ پیسنے کی مشین، برتن دھونے اور سکھانے کی مشین، بال سکھانے کی مشین، کھانا پکانے کی اور ایسی ہی دوسری مشینوں کے بغیر زندگی کا تصور نہیں ہو سکتا۔ ہمارا آرام کدہ بھی مختلف مشینوں سے لیس ہے۔ ہم نے کچھ مشینیں بیوی کے اصرار پر خریدیں تو کچھ مشینیں آس پاس کے لوگوں کو دیکھ کر خریدیں۔ ہمہ اقسام کی مشینوں کے درمیان ہم بے کار تھے۔ ہمارے دائیں اور بائیں پڑوسیوں کے پاس کار تھی اوپر فلیٹ والے کار بک کروا چکے تھے۔ ہم پہ دباؤ پڑنے لگا کہ ہم بے کار سے باکار ہو جائیں۔ ہم نے بیوی کو سمجھایا۔ کار وہاں رکھنی چاہیے جہاں سڑکوں پر صرف موٹریں شان سے دندناتی پھرتی ہیں۔ ہماری سڑکوں پر ہمہ اقسام کی سواریاں ہوتی ہیں جن میں انسان سے لے کر جانور تک چلتے جاتے ہیں۔ کار رکھنے کا فائدہ نہ ہوگا اور کار سہولت کے بجائے زحمت بن جائے گی کیا تم چاہتی ہو کہ سیکل رکشہ کے پیچھے کار شرمندگی کے ساتھ کچے دھاگے سے بندھی چلتی رہے

بیوی نے ہمیشہ کی طرح ضد کی "میں صرف کار چاہتی ہوں چاہے وہ سڑک پر چلے یا دروازے پر بندھی رہے۔" سمجھانے سے کام نہ بننے پر ہم نے انھیں ڈرایا۔ کار سے بڑے بھیانک حادثے ہوتے ہیں۔ مالی نقصان کے ساتھ جانی نقصان بھی ہوتا ہے کیوں اپنے سہاگ کے پیچھے پڑی ہو' جواب ملا "کئی سہاگنوں کے پاس کار اور سہاگ دونوں سلامت ہیں میں کار کے سامنے کوئی بہانہ نہ چلنے دوں گی۔" ہمیں ہتھیار ڈالنا پڑا۔ بیوی نے اپنی سہیلیوں میں ڈھنڈورا پٹوایا کہ وہ عنقریب صاحب کار ہونے والی ہیں ہم نے اپنے دوستوں سے کار خریدنے کے تعلق سے مشورہ کیا۔ متفقہ مشورہ یہ تھا کہ کار خریدنا اگر حکم حاکم ہے تو ضرور خریدی جائے چونکہ ہمیں اور نہ ہماری بیوی کو کار چلانا آتا ہے۔ ڈرائیور کی تنخواہ ہم دے سکتے ہیں اور نہ ڈرائیور ہمارے خاندان سمیت کار میں سما سکتا ہے، ہمیں چاہیے کہ پرانی کار خریدیں۔ پرانی کار پر ہاتھ صاف کرلیں۔ دوستوں کو بھی کار چلانا سکھائیں جب کار رکھنے کا سلیقہ اور کار چلانے میں مہارت حاصل کرلیں تو نئی چمچماتی کار خریدیں۔ پرانی کار خریدنے کے لیے بیوی کو راضی کرنا ایک مسئلہ تھا۔ ان کی کسی سہیلی کے شوہر نے پرانی کار نہیں خریدی تھی۔ ہماری ترغیب پر وہ پرانی کار کے لیے راضی ہو گئیں۔ انھوں نے کار نہ خریدنے کے مقابلہ میں پرانی کار سے سمجھوتہ کیا ہوگا۔ کامیاب ازدواجی زندگی کا راز یہی ہے کہ شوہر بیوی کے آگے ہتھیار ڈالتا ہے جبکہ بیوی ہار نہیں مانتی سمجھوتہ کرتی ہے۔ ہم پرانی کار کے نئے مالک بننے گھر سے نکل پڑے۔

پرانی کار خریدنے کے لیے ہم نے ضروری سمجھا کہ تجربہ کار، ایماندار اور قابل میکانک کو تلاش کریں اور پھر موصوف پر بھروسہ

کر کے ان کے مشورہ پر کار خریدیں۔ ہم نے تجربہ کار، ایماندار محنتی اور قابل میکانک کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ ہمیں میکانک ایسے ملے جن میں بیک وقت کوئی ایک ہی خوبی پائی جاتی تھی۔ کوئی بھی میکانک ایسا نظر نہ آیا جس میں ہماری مطلوبہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہوں۔ اس ماڈل کے میکانک آج شاید بن نہیں رہے ہیں۔ میکانک کی مدد سے ہم جس طرح کی پرانی کار خریدنا چاہتے تھے ویسی خرید نہ سکے۔ ہم چاہتے سفید رنگ کی کار، میکانک کا اصرار ہوتا کہ کالی کار موقع سے مل رہی ہے خرید لیں۔ ہم ہاتھ والے گیر چاہتے میکانک کا مشورہ ہوتا کہ ایسے گیر پائیدار نہیں ہوتے۔ ہم فرنٹ وہیل ڈرائیو پسند کرتے تو ارشاد ہوتا کہ ہمارے لیے فرنٹ وہیل ڈرائیو مناسب نہیں ہے۔ ہم میکانک کی مردم شناسی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ ہم نے آج تک اپنے سے کچھ نہیں کیا۔ کچھ کرنے کے لیے ہمیں پیچھے سے دھکے کی ضرورت رہی ہے۔ بچپن میں والدین اور اب بیوی کی وجہ سے زندگی کی گاڑی چل رہی ہے۔ ہم خیال میکانک کی تلاش میں ہم ایک ایک ورکشاپ بھٹکتے رہے۔ آخر اس مردم شناس میکانک پر تکیہ کیا اور آنکھیں بند کر کے اُن کی پسند کی کار ہم نے خریدی۔ ہمارے کار خریدنے کے بعد میکانک نے اُسے مرمت کے لیے اپنے پاس رکھ لی اور ہم سے کہا "معمولی کام ہیں پرانی کار کو نئی کار نہیں تو کار بنا کر دوں گا۔ کار میکانک کے پاس رہی۔ جب بھی ہم اپنی کار لینے جاتے میکانک فاضل پرزوں کا بل پیش کر دیتا۔ ہماری بیوی کار کے انتظار میں آنکھیں سیدھی کیے بیٹھی تھیں اس نے ایک دن ہمیں ڈانٹا کار خرید کر میکانک کے پاس چھوڑ آئے۔ اُسے مرمت کے پیسے دینے کے باوجود اپنی کار واپس لانے سے کتراتے کیوں ہو؟ سوال کے جواب میں ہم نے اتنا ہی کہنا مناسب سمجھا "میں کار لے آؤں گا۔" ہماری بے توجہی پر بیوی نے طنز کیا "پچھلے چار ماہ سے یہ نیک کام آپ سے ہو نہیں پایا یا آپ کار نہیں لا سکتے۔ چلیئے میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ کار دیکھ لوں گی اور اس کے میکانک سے نمٹ لوں گی۔" ہمارے فرائض میں بیوی کی دخل اندازی ہمیں پسند نہ آئی اور ہم میکانک سے نمٹنے چل پڑے میکانک نے ہمارے تیور دیکھ پہچان کر کار حوالے کر دی میکانک کے استعمال میں رہنے سے پرانی کار مزید پرانی ہو چکی تھی۔ دوسرے میکانک سے رجوع کرنے سے بہتر ہم نے یہ سمجھا کہ نقصان اٹھا کر بیچ دیں۔

نئی کار خریدنا آسان ہے جیب میں صرف رقم ہونی چاہیئے۔ دوستوں کے مشوروں کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ہی میکانک کی قابلیت کا سہارا لینا پڑتا ہے پیسے دیجئے اور نئی کار اٹھا لایئے لیکن پرانی کار خریدنے کے لیے اپنی معلومات اور قسمت دوستوں کے غلط مشوروں اور میکانک کی فن کاری کو آزمانا پڑتا ہے میکانک کی فن کاری سے ہم واقف ہو چکے تھے۔ دوستوں سے مشورہ کیا وہ ہماری ہی طرح، ہمارا اپنا عکس تھے ورنہ وہ ہمارے دوست کیوں کر بنتے۔ ہم نے اپنی معلومات اور اپنی قسمت کو آزمانا چاہا۔ ہم نے مختلف کار بنانے والی کمپنیوں، ان کی بنائی کار، کار کے مختلف ماڈل، کار کی کارکردگی، کار میں موجود سہولتیں پٹرول کی بچت کا نظام، کار کی طبعی عمر، کار کی تاریخ کار سے ہونے والے حادثات وغیرہ وغیرہ کا بغور مطالعہ شروع کیا۔ کچھ دنوں میں ہمیں کار کے تعلق سے اتنی معلومات حاصل ہو گئیں کہ لوگ، ہمیں کار پر اتھارٹی ماننے لگے۔ دوسرے لوگ ہم سے مشورہ کرنے لگے اور ہمارے مفید مشوروں سے فیض یاب ہونے لگے ہم نے سوچا کار کے تعلق سے ہم اتنا کچھ جان چکے ہیں کہ اب ہمارے لیے کار رکھنا بے معنی سا لگتا ہے لیکن بیوی بچوں کے اصرار پر ہمیں شوق چرایا کیوں نہ ہم ایک ونٹیج کار خریدیں۔ فیشن کے ساتھ ضرورت بھی پوری ہو جائے گی اور ہم ونٹیج کار کی تلاش میں نکل پڑے۔ کئی ونٹیج کاریں، ہمیں بتلائی گئیں جو سڑک کے کنارے معذور کھڑی اپنے فنا ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔ ہمیں ایک کار ملی جو بقید حیات تھی۔ ہم نے مالک سے سودا کیا۔ مالک خوش ہوا اور کہا ہیرے کی قدر جوہری ہی جانتا ہے

کئی لوگ کار کو کباڑا سمجھ کر خریدنے آئے لیکن میں ایسے شاندار ماضی کو دفن کر دوں گا۔ کباڑیے کے ہاتھ کبھی فروخت نہ کروں گا۔ اتنے راہمدردی مالک کار نے ہمیں اس میکانک کا پتہ بتلایا جو اس کار کے میکانزم سے واقف تھا۔ دو چار کباڑیوں کے پتے بھی دیئے جہاں سے اس کار کے پرزے مل سکتے تھے اس کے صلہ میں ہم نے مالک کار کی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کیا اس کار کو پرانی کار کہا جاتا تو ہمیں تکلیف ہوتی تھی۔ ہم کہتے بھائی اس عظیم ماضی کو پرانی کار نہ کہو ونٹیج کار کہو لیکن لوگ ہماری پرواہ اور نہ کار کے جذبات کا خیال اس کار کو لوگ نہ صرف پرانی اور دقیانوسی کار کہتے بلکہ ایک صاحب نے یہ بھی کہا چونکہ آدم کے زمانے میں کار نہیں تھی اس لیے ہم یہ قیاس نہیں کر سکتے کہ بابا آدم اس کار سے دنیا میں تشریف لائے تھے لیکن یہ مسلم بات ہے کہ یہ وہی پرانی کار ہے جو پہلے وائسرے کے زیر استعمال رہی ہے ہم لوگوں کی نادانی کی پرواہ کئے بغیر اپنی ونٹیج کار کو گھر لے آئے اسے صاف کیا نہلایا اور سجایا۔ بیوی بچوں کو شہر کی سیر کرانے کے لیے کار میں بٹھایا۔ کار اسٹارٹ کرنے کے لیے کنجی نما ڈنڈا گھمانے لگے۔ ڈنڈا گول گھومتا رہا مختلف قسم کی آوازیں آتی رہیں لیکن کار اسٹارٹ نہ ہوئی۔ شاندار ماضی کے اطراف حال کے لوگ جمع ہونے لگے۔ بیوی بچے ہمیں ونٹیج کار کے ساتھ چھوڑ کر گھر چلے گئے۔ لوگ فقرے کسنے لگے۔ ہجوم سے بچنے کے لیے ہم گھر پہنچے تو بیوی اور بچوں کے طعنے ہمیں پریشان کرنے لگے۔ گھبرا کر ہم اس میکانک کے پاس پہنچے جس کا پتہ مالک کار نے دیا تھا۔ لگتا تھا میکانک صاحب ہماری کار کو ٹھیک کرنے کی آخری خواہش پوری کر کے رخت سفر باندھیں گے۔ ایک آنکھ سے معذور، کمزور سماعت اور ہاتھوں میں رعشہ، شہر میں اس ونٹیج میکانک کے علاوہ کوئی دوسرا میکانک بقید حیات نہ تھا جو اس کار کے میکانزم سے واقف ہوتا۔ میکانک نے آخری خواہش کے طور پر ہماری ونٹیج کار کا معاینہ کیا اور فرمایا کہ اس کار کا ایک پرزہ تباہ ہو چکا ہے۔ نیا پرزہ تو بنتا نہیں ہے پرانا ڈھونڈنا پڑے گا۔ انھوں نے چند کباڑیوں کے پتے بتلائے۔ ان کباڑیوں کے پاس ہمیں یہ پرزہ نہ ملا تو انھوں نے ان لوگوں کے پتے دیئے جن کے پاس ایسی ہی ونٹیج کاریں تھیں ہم ان سے رجوع ہوئے۔ انھوں نے ہمیں ونٹیج کار اسوسی ایشن کا ممبر بنایا اور اس اسوسی ایشن میں ونٹیج کار کے ایسے جید عالم موجود تھے کہ ہمیں محسوس ہوا ابھی ہم ان کے سامنے پٹرول بھرتے ہیں! ایک صاحب نے بتلایا کہ جو پرزہ ہمیں درکار ہے وہ اب نایاب ہو چکا ہے صرف چھ پرزے کرۂ ارض پر موجود ہیں چار برطانیہ کے شاہی خاندان اور دو ہمارے ممبروں کے پاس ہیں۔ اب آپ کو ساتواں پرزہ ملنا ممکن نہیں ہے۔ مایوس ہو کر ہم نے اپنی ونٹیج کار کو بیچنا چاہا لیکن ہماری طرح اس کا چاہنے والا نہ ملا۔ عرصہ تک ونٹیج کار ہمارے گھر کے سامنے کھڑی رہی بچے کار سے کھیلتے رہے اور کباڑیئے اپنی ضرورت کا پرزہ نکال لے جاتے تھے۔ ونٹیج کار ہمارے گھر کا پتہ بتلانے میں بھی کام آتی رہی۔ آخر ایک دن کچرا اٹھانے والے ہماری ونٹیج کو اٹھا لے گئے اس کار نے ہمیں اتنا رسوا کیا کہ محلہ میں ہمارا نام "ونٹیج" پڑ چکا ہے لوگ ہمیں اصلی نام سے کم اور ونٹیج کے نام سے زیادہ پہچانتے ہیں۔

ایک کم سن خوش رنگ اور آرام دہ پرانی کار ملی۔ ہمیں اس سے پہلی نظر میں الفت ہو گئی۔ دوسری نظر ڈالنا بھی گوارا نہ کیا اور اس کار کو اپنا بیٹھے۔ جب کار چلانے لگے تو پہلی نظر میں ہونے والی محبت کا خمیازہ بھگتنے لگے۔ سیدھے راستہ چلانا چاہتے تو کار ہمیں بائیں جانب کھینچتی۔ دائیں جانب لے جانے کے لیے اسٹیرنگ پر اتنا زور لگانا پڑتا جیسے ہم کار کو دھکیل رہے ہیں۔ بائیں جانب مڑتے تو کار قابو سے بے قابو ہو کر سڑک چھوڑ کر نالوں میں گھس جاتی۔ غلط راہ جانے سے روکنے کے لیے ہمیں بریک پر کھڑے ہونا پڑتا۔

ہوتا ہم کار چلا نہیں رہے ہیں بلکہ کار سے کشتی لڑ رہے ہیں۔ دو دن میں محسوس ہوا کہ کار نے ہمیں ناک آوٹ کر دیا ہے جوڑ جوڑ درد ہونے لگا۔ ہتھیلی اور انگلیوں پر چھالے پڑ گئے۔ تیسرے دن ہم نے کار بیچنے کا فیصلہ کیا۔ کار بیچنے گئے تو ایجنٹ نے کار سے تعلق سے کچھ نہ پوچھا ورنہ ایجنٹ حضرات مختلف سوالات کر کے قیمت کم مقرر کرتے ہیں۔ کار کیوں بیچنا چاہتے ہیں جلدی تو نہیں ہے، چوری کی تو نہیں ہے، ایکسیڈنٹ تو نہیں کیا۔ آپ نے کار کب اور کتنے میں خریدی تھی وغیرہ۔ ہماری خواہش سن کر ایجنٹ نے مختصر سا جواب دیا ٹھیک ہے پچیسویں مرتبہ بھی بیچ دیں گے۔ ہمارے اصرار پر ایجنٹ نے بتلایا کہ عرصہ سے یہ کار لین دین میں ہے۔ بعض پرانی کاریں سڑک پر کم چلتی ہیں خریدی اور بیچی زیادہ جاتی ہیں۔ یہ کار بھی انھیں خوش نصیب کاروں میں سے ایک ہے۔ مالک خوشی خوشی اسے خریدتا ہے۔ کار چلانے سے بجائے پریشان ہو کر چند دن میں اُسے بیچنے چلا آتا ہے۔" ہم نے پوچھا اب کیا ارادہ ہے۔ کس کے سر اسے باندھو گے۔ ایجنٹ نے سوچتے ہوئے جواب دیا، شہر کے آدھے لوگ اس کار سے واقف ہو چکے ہیں۔ اسے بیچنے کے لیے مشکل پیش آ رہی ہے۔ سوچتا ہوں کمپنی کو یہ باور کرواکے کار واپس کر دوں کہ اس کار کے وجود سے کمپنی کی ساکھ کو خطرہ ہے اور منہ مانگی قیمت وصول کر لوں!

آپ کار کیوں فروخت کر رہے ہیں؟ یہ ایک اہم سوال ہوتا ہے جو کار خریدنے والا بیچنے والے سے کرتا ہے۔ بیچنے والے کو تین مرتبہ قسم بھی دلائی جاتے تو شاید ہی وہ اس سوال کے جواب میں سچ کہتا ہے۔ پرانی کار کے پرانے مالک اکثر ایک شان بے نیازی سے جواب دیتے ہیں۔ کار سے دل اٹھ گیا ہے۔ اسے بیچ کر دوسری خریدوں گا۔ ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ اچھی سواری اور اچھی بیوی کا ملنا نصیب کی بات ہوتی ہے اور ہر کوئی خوش نصیب نہیں ہوتا۔ ایک پرانی کار کے مالک سے ہم نے سوال کیا۔ آپ کار کیوں بیچ رہے ہیں، صاحب کار نے صاف گوئی سے کہا: "اس کار سے ایکسیڈنٹ ہوا ہے" ہم نے انھیں مشورہ دیا کہ ایسی منحوس کار سے پیچھا چھڑانا چاہیئے لیکن کار بیچتے وقت ایکسیڈنٹ کا ذکر نہ کریں۔ صاحب کار ہمیں ایکسیڈنٹ کی خوبی بتلانے لگے۔ کار بہت اچھی ہے چلنے میں شاندار رکھنے میں آرام دہ اور اپنے مالک کی وفادار۔ ایکسیڈنٹ دوسری کار کی غلطی سے ہوا تھا۔ اس ایکسیڈنٹ میں میری بیوی مر گئی۔ میں کار سے پیچھا چھڑانا نہیں چاہتا۔ مجھے کار عزیز ہے لیکن جس لڑکی سے میں دوسری شادی کرنے والا ہوں اس کا اصرار ہے کہ میں یہ کار بیچ دوں" مجبوراً کار فروخت کر رہا ہوں۔ آپ کے کام آئے گی۔ کچھ لمحوں کے لیے ہم لالچ میں آ گئے لیکن اس خیال نے ہمیں یہ کار خریدنے سے باز رکھا کہ کیا ضروری ہے کار دوسری مرتبہ بھی وہی کرے۔ دائیں اور بائیں سیٹ سے بہت فرق ہو جائے گا مشنری کا کیا بھروسہ۔

پرانی کار کی تلاش کے دوران ہمیں ایک ایسی کار بھی ہاتھ لگی جس کا ماڈل اور ہماری بیوی کی پیدائش کا سن ایک تھا جتنی مشکل سے ہم نے بیوی کا سنہ پیدائش دریافت کیا تھا اتنی ہی آسانی سے ہمیں بیوی کی ہم عمر کار ہاتھ لگی۔ ہماری بیوی اور ان کی ہم عمر کار میں کئی باتیں یکساں پائی گئیں۔ دونوں اپنی عمر سے کم دکھائی دیتیں لیکن رنگ و روغن کی ہر دو کو ضرورت تھی۔ کار اسٹارٹ ہونے میں وقت لگاتی تو بیوی میک اپ کرنے میں وقت گنواتیں۔ کار بگڑ کر کھڑی ہو جاتی تو بیوی روٹھ کر منہ پھلائے بیٹھ رہتیں۔ کار ٹھیک ہونے کے لیے میکانک کے پاس جاتی تو بیوی کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے ہم انھیں میکے بھیج دیتے۔ چونکہ ہماری بیوی کی پیدائش اور کار کے ماڈل کا سن ایک تھا ہمیں توی امید تھی کہ ہماری بیوی کار کو سگی چھوٹی بہن کی طرح عزیز رکھیں گی لیکن ہماری توقع کے خلاف بیوی کار کو اپنی سوت سمجھنے لگیں۔ کار کا رویہ بھی ہماری بیوی کے ساتھ اپنایت والا نہ تھا۔ کار میں سوار ہونے سے قبل بیوی کار کو برا بھلا کہتی اور کوسنے لگتی تھیں۔ بیوی کار میں بیٹھتی تو کار کبھی چلنے سے انکار کر دیتی یا پھر کچھ دیر بعد ہی کا انجن ادل فول بکتے ہوئے بند ہو جاتا تھا ہماری

بیوی کو اپنی سوت کا وجود بھاری لگنے لگا اور ان دو کو ایک ساتھ سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ آخر وہ وقت بھی آن پہنچا جب بیوی نے دھمکی دی، آپ مجھے اپنے ساتھ رکھیں یا اس موئی کار کے ساتھ رہیں۔ اب میں اس کار کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتی۔" FIRST COME FIRST SERVED قول کو اپناتے ہوئے ہم نے کار کو وداع کیا۔ بیوی نے خوشیاں منائیں۔ ہم نے سمجھا اب ہماری بیوی کار کا مطالبہ نہیں کریں گی لیکن کار کی فروخت کے بعد بمشکل چالیس دن گزرے تھے کہ بیوی پھر کار کے لیے اصرار کرنے لگیں۔ ہم نے بیوی سے پوچھا کون سا ماڈل چاہیے۔ ٹوک کر بولیں "پھر بہت لگی ہے"۔ اس کی پیدائش کے سن کا ماڈل ڈھونڈیے۔

پرانی شے میں پرانے مالک کی باقیات اور یادیں موجود رہتی ہیں۔ پرانی کار اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ہم نے ایک کار خریدی تھی جس پر پرانے مالک کا اثر کچھ زیادہ ہی تھا۔ پرانے مالک پست قد تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ اونچی اٹھی ہوئی تھی۔ جب ہم سیٹ پر بیٹھے تو ہمارا سر کار کی چھت پھاڑ کر باہر نکلنے لگا۔ سیٹ کو پیچھے کرنا چاہا تو سیٹ نے جھکنے سے انکار کر دیا۔ سیٹ کو جھکانے کے لیے میکانک کی خدمات بھی رائیگاں گئیں۔ آخر وہی ہوا۔ جو جھکتے نہیں وہ ٹوٹ جاتے ہیں یا توڑ دیئے جاتے ہیں۔ سیٹ توڑ دی گئی۔ ہمیں اپنی سائز کی سیٹ لگوانی پڑی تب کہیں جا کر ہم کار چلا سکے۔ ایک اور کار میں صاحب کار کے بچوں کی باقیات تھیں۔ اسکول جاتے وقت بچے پچھلی سیٹ کے فوم کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ربر کا کام لیتے تھے۔ جب ہم نے کار خریدی تو پچھلی سیٹ کی جگہ سیٹ کا ڈھانچہ تھا۔ بچے کرکٹ کے کھلاڑی بھی تھے۔ کرکٹ کھیل کر آئینہ پر مکڑی کا جال بنا چکے تھے۔ ایک صاحب کی شاندار ڈرائیونگ کا ریکارڈ کار کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے موجود تھا۔ ہم نے صرف ظاہری نشانات کی چند مثالیں دی ہیں۔ کار کے انجن اور اندرونی پرزوں پر بھی پرانے مالک کی باقیات موجود رہتی ہیں جو نئے مالک پر آہستہ آہستہ عیاں ہوتی ہیں۔ پرانی کار خرید کر چلانے سے پہلے نیا مالک پرانی کار میں پرانے مالک کی باقیات کو مٹانے کی سعی کرتا ہے۔ ویسے بھی کہتے ہیں پرانی کار، پرانا گھر اور پرانی بیوی کو ہر دم ایک ہاتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارا یہ معمول بن گیا تھا کہ پرانی کار خرید کر ورکشاپ لے جاتے اور اسے ٹھیک کرواتے تھے۔ ایک ایسی ہی پرانی کار لے کر ہم میکانک کے پاس پہنچے۔ یہ ہماری بدقسمتی تھی یا میکانک کی فنکاری ایک کے بعد ایک کام نکلتا گیا۔ ایک کے بعد ایک پرزہ بدلا گیا۔ کار چلنے کے قابل ہوئی تو ہم اس حد تک مقروض ہو چکے تھے کہ قرض خواہوں نے پٹرول کے لیے قرض دینے سے انکار کر دیا۔ نتیجتاً بصرفِ زرِ کثیر ٹھیک کروائی گئی کار چلانے کا ارمان پورا کیے بغیر ہی بیچ دینا پڑا۔

جب کوئی پرانی کار خریدنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے یہ جان لینا چاہیے کہ وہ ایک پرانی کار خرید کر اپنی ضرورت پوری نہیں کر سکتا۔ اسے ایک کے بعد ایک کئی پرانی کاریں خریدنی پڑتی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اسے پرانی کار خریدنے کی لت پڑ جاتی ہے۔ اس لت میں چار کی قید بھی نہیں ہوتی۔ ہمیں ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا کہ ہم نے کتنی کاریں خریدیں لیکن یہ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ جتنی پرانی کاریں ہم نے خریدیں اتنی ہم نے بیچی نہیں ہیں۔ کچھ تو یونہی ہمارے گلے پڑ گئیں۔ پرانی کاروں سے تنگ آ کر ہم نے نئی کار خریدنے کا فیصلہ کیا۔ ہماری بیوی بہت خوش ہوئی۔ ہمیں دعائیں دینے لگی۔ ہم نے نئی کار خریدی اور پرانی کاروں کے تجربہ کو قلمبند کر کے موم کے کاغذ میں لپیٹا اور نئی کار میں لٹکا دیا ہے۔ دوست احباب کا خیال ہے کہ نظرِ بد سے بچانے کے لیے ہم نے نئی کار میں تعویذ لٹکا رکھی ہے۔ ●●

ڈاکٹر راہی قریشی (گلبرگہ)

راہی + اقبال

یہ تو بروییل ہے کہ جس کا کوئی کنارہ نہیں
"تو آبجو اسے سمجھا اگر، تو چارہ نہیں"

کبھی تو راہ میں بیوی سے کچھ نکل آگے
"کہ خاکِ زندہ ہے تو، تابعِ ستارہ نہیں"

جو بیگمات کے شوہر ہیں جی ہی جاتے ہیں
"مگر یہ حوصلۂ مردِ ہیچ کارہ نہیں"

ابھی تو تجھ پہ مسلّط ہے صرف خوشدامن
"تری نگہ میں ابھی شوخیٔ نظارہ نہیں"

عجیب چیز ہے شادی کی شیروانی بھی
"وہ پیرہن مجھے بخشا کہ پارہ پارہ نہیں"

طلسمِ بیگمِ بے حس کو توڑ سکتے ہیں
"زجاج کی یہ عمارت ہے، سنگِ خارہ نہیں"

کہاں سے شوخیٔ محبوبہ آئے بیوی میں
"کہ لعلِ ناب میں آتش تو ہے، شرارہ نہیں"

ڈاکٹر انعام الحق جاوید (پاکستان)

مہمان

گھر پہ آن اترے ہیں مہمان خدا خیر کرے
سخت مشکل میں ہے یہ جان خدا خیر کرے
صرف مہمان جو ہوتے تو کوئی بات بھی تھی
ہاتھ میں ان کے ہیں دیوان خدا خیر کرے

گرامر

کس قدر تبدیل گھر گھر کی گرامر ہو گئی
کل تلک بیوی تھی جو وہ آج شوہر ہو گئی
بلبلِ نادان دہلی میں مونث تھی مگر
صوبۂ سرحد میں پہنچی تو مذکّر ہو گئی

بھلوال

بے فائدہ پر تولتا رہتا ہے قفس میں
کچھ بھی تو نہیں ہے یہاں انسان کے بس میں
جس شخص کو اے دوست مرے دیکھ پہ شک تھا
وہ بیٹھ کے دیکھے ذرا بھلوال کی بس میں

تضمین

تری تلاش نے خاصا ذلیل و خوار کیا
ٹرک میں بیٹھ کے دریا کو ہم نے پار کیا
نہ "شہریت" ہی ملی اور نہ تو ہی ہاتھ آیا
غلط کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا

حاجی ایم احمد خوامخواہ
(بمبئی)

قرض

قرض، یہ سہ حرفی لفظ اپنے اندر بڑی جاذبیت رکھتا ہے۔ یہ خیال قطعی غلط ہے کہ قرض مقراضِ محبت ہے۔ اس لیے کہ اگر کوئی قرض لے اور حسبِ وعدہ واپس بھی کردے تو پھر تعلقات اور بھائی چارہ قائم رکھنے کے لیے باقاعدہ جاتا ہے۔ قرض واپس نہ کرنے کی صورت میں مقروض اور قرض دہندہ کے درمیان جو روابط دن بدن بڑھتے جاتے ہیں وہ ایسے تعلقات کو قائم ہی نہیں بلکہ مستحکم کرنے میں بھی ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں اگر آپ کو یقین نہ آئے تو کسی کو قرض دے کر یا کسی سے قرض لے کر آزمائیے۔

وہ شخص کون ہے جس نے قرض نہ لیا ہو۔ بڑی بڑی حکومتیں عالمی بنک کی مقروض ہیں اور اس حد تک مقروض ہیں کہ مقروض ممالک کی پسماندگی اور غربت سے ترس کھا کر عالمی بنک نے ان کا قرض معاف کردیا ہے۔

آپ کو شاید اندازہ ہو کہ نہ ہو لیکن ہم اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرض کی رقم سے حاصل کردہ آسائشیں اور سہولتیں، اپنی ذاتی رقم سے حاصل کردہ تعیشات سے کہیں زیادہ مزہ دے جاتی ہیں۔

قرض لینے کی کئی وجوہات ہیں۔ بعض دفعہ حالات سے مجبور ہو کر قرض لیا جاتا ہے جیسے ہم اپنی بیگم سے اکثر قرض لیتے رہتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو دل ہی دل میں 'گر قبول افتد زہے عزّ و شرف' کا ورد کرتے ہوئے ہم اپنی پوری تنخواہ بیگم کے حوالے کرکے اپنی سعادت مندی کا ثبوت دیتے ہیں اور وہ یہ مراحمِ بیگمانہ ہمارے جیب خرچ کے لیے ایک معمولی سی رقم عنایت کرکے ہمیں مالا مال کردیتی ہیں۔ لیکن خدا بھلا کرے ہمارے دوست احباب کا جو وقت بے وقت دفتر میں آدھمکتے ہیں اور ہمارے 'معمولی جیب خرچ' کو 'غیر معمولی' میں بدل دیتے ہیں تب ہی، خیالِ خاطرِ احباب کی خاطر ہمیں بیگم سے قرض لینا پڑتا ہے۔ ہر بار وہ ہمیں قرض کی رقم سے زیر بار کرتے ہوئے تاکیداً کہتیں کہ "دیکھیے یہ آخری بار قرض مل رہا ہے۔ آپ بہت فضول خرچ ہوگئے ہیں۔" بالآخر ایسے کتنے ہی آخری قرضوں کے بعد جب انھوں نے قرض واپس طلب کی تو ہم نے روزانہ کی بڑھتی ہوئی گرانی اور اپنی زبوں حالی پر ایک دھواں دھار تقریر کی اور ہمارے جیب خرچ کی رقم بڑھانے کی مانگ کر بیٹھے۔ قارئینِ کرام غور کرنے کا مقام ہے۔ ہماری بیگم کی جگہ کوئی اور خاتون ہوتی تو کسی فیکٹری کے مالک کی طرح، پہلے تو ہماری مانگ ہی ٹھکرا دیتی، ہم ہڑتال کرتے۔ ہمیں نوٹس ملتا اور کھڑے کھڑے یہ کہہ کر نکال دیئے جاتے کہ: جا تجھے کشمکشِ عقد سے آزاد کیا —— مگر ہماری تقریر سے وہ اس قدر متاثر ہوئیں کہ اپنی آنکھوں کے

پرنالوں سے دودھاری آنسو بہاتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولیں ۔" مجھے معاف کریں۔ میں بھی کتنی نادان ہوں (وہ تو ہیں ہی) اتنے دنوں تک آپ نہ جانے کتنی تکالیف اٹھا کر اپنا جیب خرچ چلاتے رہے ہیں۔ میں آج ہی سے مبلغ پچاس کے مہنگائی بھتے کا اضافہ کیے دیتی ہوں"۔ وہ دن اور آج کا دن ہے ۔ جب بھی سرکاری ملازمین کے مہنگائی بھتے میں اضافے کا اعلان ہوتا ہے۔ ہماری سرکار بھی ہمارا جیب خرچ بڑھا دیتی ہے ۔۔ ہماری سرکار! زندہ باد!!

کچھ لوگ شدید ضرورت کے تحت قرض لیتے ہیں لیکن واپس نہیں کرتے کہ وہ قرض کو بھی آمدنی سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ ان وجوہات کی بنا پر قرض لیتے ہیں، جن کے بارے میں وہ خود لاعلم ہوتے ہیں اور اس لیے نہیں لوٹاتے کہ انھیں یاد نہیں رہتا کہ کبھی انھوں نے کسی سے قرض بھی لیا تھا۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو عادتاً قرض لیتے ہیں اور عمداً واپس نہیں کرتے یا پھر عمداً قرض لیتے ہیں، عادتاً واپس نہیں کرتے ۔ بعض یہ ترکیب کرتے ہیں کہ قرض لے کر حسب وعدہ واپس کرتے ہیں اور دوبارہ دوگنی رقم بطور قرض حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ برسوں جاری رہتا ہے صرف اس قدر فرق کے ساتھ کہ رقم میں بھی ہر بار اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اس طرح قرض دینے اور لینے والے کے درمیان اٹوٹ رشتہ بندھ جاتا ہے ۔ قرض مانگنے والے چاہے وہ عادی ہوں یا اتفاقی اپنے آپ کو با اصول شخصیت ظاہر کرتے ہیں اس لیے واجب الادا رقم بروقت لوٹا کر قرض دہندہ کا اعتماد حاصل کر لیتے ہیں ۔ جب ایک بار مچھلی کانٹے میں پھنس جاتی ہے تب ایسے انجان ہو جاتے ہیں جیسے انھوں نے کبھی شکار کھیلا ہی نہیں تھا۔ مجھ سے تو آج تک کسی نے بھی پہلی اور آخری بار قرض نہیں مانگا۔ حالاں کہ ہر مانگنے والا یہی دہراتا ہے کہ بس یہ پہلی اور آخری بار زحمت دے رہا ہوں ۔۔" ایک عادی مقروض نے مجھ سے کہا ۔" مہربانی کر کے مجھے کچھ رقم بطور قرض دیں۔"

میں نے کہا ۔" میں مسلسل چار ماہ سے تمھیں قرض دیتا آ رہا ہوں۔ اب کہیں اور کوشش کر لو۔" انھوں نے معصومیت سے کہا ۔۔۔" دیکھیے مجھے قرض لینا اچھا نہیں لگتا اور بہت سے لوگ ہیں جن سے قرض لے سکتا ہوں لیکن آپ ہی کو زحمت دینا مناسب سمجھتا ہوں ۔" جی میں آیا کہ کہہ دوں ۔۔" یہ آخر کس جرم کی سزا میں مجھے آپ کو بھگتنا پڑ رہا ہے ؟ ۔۔" لیکن اتنا ہی کہہ سکا کہ بھائی اس وقت میرے پاس پیسے نہیں ہیں تم کہیں اور بندوبست کر لو ۔۔" بولے ۔۔۔" آپ ہی کسی سے قرض لے کر دیں تو مہربانی ہوگی آپ کو کوئی ٹال نہیں سکے گا ۔۔" میں نے چڑ کر کہا ۔۔" میں نے آج تک کسی سے قرض نہیں لیا ہے۔" مسکرا کر بولے ۔۔۔" یہ آپ کی بہت اچھی عادت ہے ۔ آپ یوں کریں کہ ایک سفارشی چھٹی بیگ صاحب کے نام لکھ دیں کہ وہ مجھے کچھ رقم بطور قرض دیں ۔۔" ایسے ڈھیٹ قرض دار سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا۔ میں نے مطلوبہ رقم دے کر اپنا پنڈ چھڑا لیا ۔۔۔ کچھ لوگ یہ تاثر دیتے ہیں کہ ان کی آمدنی ان کے اخراجات سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہے اور یہ کہ وہ اپنی چادر کے مطابق ہی اپنے پاؤں پھیلاتے رہیں لیکن اس بار ایسا ہوا کہ ...... اور پھر یاد کرتے ہیں : میری مجبوری ! گھما پھرا کر ٹالی مٹک میں فٹ کرتے ہوئے اپنا مدعا کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں ۔۔" بس اسی ماہ کچھ تو کم پڑ گئی ہے آئندہ ماہ سے کوئی تکلیف نہ ہوگی ۔" تکلیف، یہ اشارہ اپنی بہ نسبت ہماری جانب زیادہ رہتا ہے اور یہی تکلیف کسی نہ کسی صورت میں ہر ماہ قائم و دائم رہتی ہے۔

ہیں یہ کہ وہ اس تکلیف کا سرے سے خاتمہ کرنے کی بجائے اسے قرض دہندہ کی جیب میں منتقل کردیتے ہیں۔

میرے دفتر میں چند مستقل قرض دار ایسے ہیں جن کی ہر ماہ کہیں نہ کہیں سے منی آرڈر آنے والی ہوتی ہے جس کی امید پہ وہ مجھ سے قرض لیتے ہیں۔ لیکن میری بد قسمتی دیکھیے کہ وہ منی آرڈر آتا ہی نہیں یا پھر اس وقت آتی ہے جب میں دفتر میں موجود نہیں رہتا۔ دوسرے دن تک وہ رقم کہاں رہنے کی۔ اسے تو خرچ ہونا ہی تھا۔ ایسے لوگ جو مجھ سے بہت جلد واپس کرنے کا وعدہ کرکے رقم اینٹھ لیتے ہیں کچھ دنوں بعد راہ چلتے مجھے دیکھ کر یوں انجان ہوجاتے ہیں جیسے مجھ سے کبھی شناسائی تھی ہی نہیں —— لیکن مجھے بھی تو بہرحال اپنی رقم وصول کرنی ہوتی ہے اس لیے میں انھیں دیکھ کر مسکراتا ہوں۔ وہ کھسیانی مسکراہٹ سے میری مسکراہٹ واپس کردیتے ہیں۔ میں ڈھیٹ بن کر ان سے پوچھتا ہوں —— جناب! آپ نے چار دن بعد رقم واپس کرنے کا وعدہ کیا تھا اور اب چار ہفتے ہو چکے ہیں۔

”—— جی ہاں! مجھے اپنے وعدہ یاد ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ مسکرانے لگتے ہیں۔ جی میں آتا ہے کہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھوں ۔ ”تو کیا وعدے صرف یاد رکھنے کے لیے ہی کیے جاتے ہیں؟“ لیکن مجھے ایک امریکی صدر کی بات یاد آجاتی ہے۔ جب اس سے کسی نے پوچھا تھا —— آپ نے اپنا انتخابی وعدہ پورا کیوں نہیں کیا —— “ اس نے جواب دیا —— ”میں نے وعدہ تو ضرور کیا تھا لیکن یہ کب کہا تھا کہ اسے پورا بھی کروں گا۔“

اب آپ سے کیا چھپائیں۔ قرض ہم نے بھی لیا تھا۔ لوٹانے کی تاریخ قریب آنے لگی تو نیند حرام ہونے لگی بہت پریشان رہے۔ بیگم نے ہماری پریشانی بھانپ کر ایسا مشورہ دیا کہ جس پر ہم آج تک کاربند ہیں۔ کہنے لگیں —— آپ ناحق پریشان ہیں۔ خان صاحب کو جو رقم دینی ہے وہ جیلانی صاحب سے لے کر دے دیجیے اور جب جیلانی صاحب کو دینا ہو گا تب سلیمانی صاحب سے لے لیں۔ سلیمانی صاحب کی رقم حفیظ صاحب سے لے کر ادا کر دیجیے اور حفیظ صاحب کو . . . . . . تو جناب یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے ۔ ■

حسن نواب حسن

افطار پارٹی

سیاسی مسئلہ کچھ حل ہوا افطار پارٹی میں
جو کچھ بگڑا تھا کام اپنا بنا افطار پارٹی میں

کچھ افسر اور کچھ نیتا سے رونق بڑھ گئی گھر کی
نہ آئے مولوی ملّا تو کیا افطار پارٹی میں

بنیں کچھ مصلحت کی پھلکیاں حکمت کے پکوڑے بھی
سیاست کا سموسہ بھی بنا افطار پارٹی میں

تدبّر کا تھا پھل اور چاپلوسی کی تھی شیرینی
ریا کے جوس کا شربت بنا افطار پارٹی میں

نہ سمجھیں لوگ اسے کہ یہ محض اک سیاسی جلسہ تھا
غریبوں کو بھی کچھ بلوا لیا افطار پارٹی میں

قطاریں لگ گئیں کاروں کی گھر کے سامنے اپنے
بنا اک آدمی میں بھی بڑا افطار پارٹی میں

کہا شربت کو سربت پھل کو فل روزہ کو بھی روجہ
بچو مربہ اردو کا بنا افطار پارٹی میں

ادھر بندہ بھی راضی اور ادھر اللہ بھی راضی
کہ دین و دنیا دونوں پا لیا افطار پارٹی میں

اُدھر مہمان یہ سمجھے بڑھی مقبولیت میری
ادھر محنت کا پھل ہم کو ملا افطار پارٹی میں

کہا بیگم نے اتنا خرچ کر ڈالا تو ہم بولے
یہ سمجھو کام اپنا بن گیا افطار پارٹی میں

کہا ہے پکا وعدہ آج مہمانِ خصوصی میں
صلہ بندے کو روزہ کا ملا افطار پارٹی میں

پاگل عادل آبادی

گرمی نامہ

آرزوئے وصال اُف توبہ
اُڑ گئی بن کے بھاپ گرمی میں

سارے استاد بھول بیٹھے ہیں
تک دھنا دھن کی تھاپ گرمی میں

ٹمپریچر چڑھا ہوا ہے یہاں
مت کریں چھیڑ آپ گرمی میں

ان کی زلفوں کی چھاؤں ہے ٹھنڈی
راگ مت یہ الاپ گرمی میں

جذبۂ شوق بھی ہے پینڈنگ میں
ہر تمنّا خلاپ گرمی میں

اچھے اچھوں کی گھل گئی مستی
اُڑ گئی بن کے بھاپ گرمی میں

چپ رہو بک رہے ہو کیا پاگل
یہ اناپ اور شناپ گرمی میں

حیدر بیابانی (اچل پور)

پانی، پانی!

ہمارا ملک بہت بڑا ہے۔ جہاں لاکھوں گاؤں اور ہزاروں شہر ہیں۔ ہمارے اس ترقی یافتہ ملک میں کئی ترقی پذیر شہر ہیں۔ ایسے ہی ایک ترقی پذیر شہر میں ہم بھی رہتے ہیں اسی شہر کے ایک گھنی آبادی والے محلے میں ایک اندھ وشواسی بڑھیا رہتی ہے جہاں بڑھیا رہتی ہے وہاں ایک سارو جنک (عوامی) نل ہے۔ میونسپل کمیٹی کی جانب سے لگایا گیا یہ نل ویسے تو پانی سپلائی کرنے کا ایک سادھن (ذریعہ) ہے لوہے کی نلکی اور ٹونٹی کی صورت میں ایک سادھن۔ لیکن اس بڑھیا کی نظر میں وہ نل بھگوان سمان ہے۔ ایسا دیوتا جو پوجا پاٹ سے خوش ہوتا ہے اور نہ کرنے سے ناخوش ہو جاتا ہے۔ اس لیے بڑھیا روزانہ صبح اٹھ کر "نل دیوتا" کو پرنام کرتی ہے اس کے ماتھے پر تلک لگاکے اس کی ٹونٹی میں ایک پھول ٹھونس دیتی ہے اور یہ یقین کر لیتی ہے کہ اس کی اس پوجا ارچنا سے دیوتا خوش ہو جائیں گے اور وقت پر پانی اگلنے کا چمتکار دکھائیں گے۔

یہ ایک من گھڑت کہانی نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے۔ پچھلے سال کی حقیقت! اب پھر گرمیوں کی آمد آمد ہے پھر وہی ڈرامہ دہرایا جائے گا۔ عام نلوں پر وہی طوفانِ بدتمیزی بپا ہوگا۔ روز نیا تماشا ہوگا۔ جنگ پانی پت یہیں دیکھنے کو مل جاتی ہے دھکم پیل گالی گلوج سب ہی کچھ فری اسٹائل میں ہوتا ہے اس طرح کسی کی آنکھ میں خون اتر آتا ہے تو کسی کی آنکھ میں پانی چھلک اٹھتا ہے۔ نل پر اور گھر میں عورتیں پانی سے جو بھر بیکار رہتی ہیں اپنی جلی کٹی باتوں سے شوہروں کے کیے کرائے پر پانی پھیرتی رہتی ہیں لیکن اپنی کرنی پر پانی پانی نہیں ہوتیں۔ دو پڑوسیوں کے جھگڑے میں تیسری دور کھڑی جنگ کا مزہ لیتی ہے

انسانی جسم کے لیے پانی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ادب میں پانی کو لے کر طرح طرح کی خیال آرائیاں کی گئی ہیں۔ شاعروں نے غزلوں کے ذریعہ پانی سر سے اونچا کر دکھایا ہے۔ چالاک سیاست داں دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دینے کا وعدہ کرکے سادہ لوح ووٹروں سے ووٹ بٹور لیتے ہیں۔

شاعروں نے پانی کا شراب ہو جانے والا قصہ جگہ جگہ دہرایا ہے۔ تریش کمار شاد کہتے ہیں:

تو نے ڈالی نہ مے فشاں نظریں
ورنہ شبنم شراب ہو جاتی

شاید اسی بات کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے ایک دن پانی کی قلت سے نمٹنے کے لیے محکمۂ آب کاری نے محکمۂ آب رسانی کو اپنی خدمات پیش کیں اور ۲۰ مئی ۱۹۸۷ء کا دن مدھیہ پردیش کے شہر ودیشہ کے لوگوں کے لیے یادگار بن گیا کیونکہ

اس دن جب لوگوں نے صبح اٹھ کر اپنے اپنے گھروں اور محلّوں کے نل کھولے تو ٹونٹی سے پانی کی جگہ شراب کا جھرنا پھوٹ پڑا۔ یعنی ہاتھ دھوئے تو شراب سے کلّی کی تو شراب سے اور پیاس بجھائی تو شراب سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ وغیرہ اور جب تک کہ انتظامیہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ساری بستی مست ہو گئی۔ خدا جانے کیا کچھ ہو گیا۔ شاید محکمۂ آبکاری کے ورکروں نے شراب کے نشے میں اپنے گودام سے آٹھ دس ٹینکر شراب کے اٹھا کر مرکزی شہر کی پانی والی ٹنکی میں ڈال دیئے ہوں گے یا پھر حسینانِ شہر و دلشاد نے اپنی مے فشاں نظریں ٹنکی پر ڈال دی ہوں گی۔

پانی آبِ حیات بھی ہے اور پانی سیلابِ عذاب بھی۔ پانی سے معمولی چراغ سے لے کر بڑے بڑے الاؤ تک بجھ جاتے ہیں۔ اب اس جادوئی دور میں پانی سے چراغ جلتے بھی ہیں، الاؤ دہکتے بھی ہیں یعنی بجلی پیدا ہوتی ہے بھارت واسیوں کے حصّے کا دانہ تو پہلے ہی اٹھ چکا ہے گرمیوں میں پانی بھی اُٹھ جاتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ان کی رگوں میں اب نہ تو خون ہوتا ہے اور نہ چہروں پر پانی ہی۔ پہلے پانی پلانا کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا لوگ بڑے بڑے پیاؤ اور سبیلیں لگاتے تھے اور کنویں کھدواتے تھے لیکن اس دور میں تو طالب خوندمیری کے تجربے کے مطابق یہ حال ہے کہ:

صرف دو بوند پڑوسی سے جو مانگا پانی
اس کی آنکھوں میں اچانک اُتر آیا پانی

پانی کی بدولت ہمارے دیش کے ایک گاؤں کے تمام نوجوان لڑکے کنوارے ہی انگاروں کی سیج پر لوٹ رہے ہیں وہاں موسم گرما میں دور دور تک پانی نہیں مل پاتا بھلا کون کٹّر دل ماں باپ اس گاؤں میں اپنی لاڈلیوں کو بیاہے گا اور بوند بوند پانی کو ترسائے گا۔ ایسے ہی کسی بدنصیب گاؤں کی نازک صورتِ حال ایک اسٹیج آرٹسٹ کی زبانی ہم نے بڑی دلچسپی سے سنا پسند کیا اور اسے نیچے درج کر رہے ہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ ہمارے وزیرِ اعظم ایک پیاس زدہ گاؤں کے پیاسے لوگوں سے سیدھا رابطہ قائم کرنے کے لیے اپنی ٹی وی ٹیم کے ساتھ اس گاؤں کو تشریف لے جاتے ہیں اور ان بے چاروں پانی کے ماروں سے یوں سوالات کرتے ہیں:

وزیرِ اعظم: آپ لوگ پانی پیتے ہیں؟
ایک شخص: جی حضور پیتے ہیں۔
وزیرِ اعظم: اس گاؤں میں کتنے لوگ پانی پیتے ہیں؟
ایک شخص، صاحب! پیاس لگتی ہے تو سب ہی لوگ پیتے ہیں۔
وزیرِ اعظم: آپ پانی کہاں سے لاتے ہیں؟
ایک شخص: صاحب، ندی سے لاتے ہیں۔
وزیرِ اعظم: کیا گاؤں میں نل نہیں ہیں؟
ایک شخص: جی نہیں حضور!
وزیرِ اعظم: کیا ندی سے چوبیس گھنٹے پانی ملتا ہے؟

یک شخص: پہلے ملتا تھا۔

زیر اعظم: اب دن میں کتنے گھنٹے پانی ملتا ہے؟ کیا ندی پر ٹائم ٹیبل ہے کہ اتنے بجے سے اتنے بجے تک پانی ملے گا؟

ہی شخص: جی نہیں حضور اب ندی سوکھ گئی ہے بالکل پانی نہیں ملتا۔

زیر اعظم: یہ ندی کیوں سوکھ گئی ہے؟

یہ بات سن کر دیہاتی ایک دوسرے کا منہ تکتے ہیں۔ انھیں کوئی جواب نہیں سوجھتا تو فوراً ضلع کلکٹر کھڑا ہو کر کہتا ہے۔

"سر! دراصل بات یہ ہے کہ گرمیوں میں ٹمپریچر ہائی ہو جاتا ہے اس لیے ندی کا پانی سوکھ جاتا ہے۔" وزیر اعظم کچھ سوچتے ہیں اور پھر کلکٹر سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کیا ہم ندی پر شیڈ وغیرہ ڈال کر کور نہیں کر سکتے تاکہ ندی پر سایہ رہے اور ندی سوکھنے نہ پائے؟"

کلکٹر: نہیں سر، ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ ایسا کرنے سے بارش کا پانی ندی میں نہیں گر پائے گا۔ وزیر اعظم دوبارہ عوام سے مخاطب ہوتے ہیں "ندی پر کوئی باندھ یا پل ہے؟

یک شخص: جی نہیں سر!

وزیر اعظم اسٹیج پر بیٹھے ہوئے افسروں سے مڑ کر کہتے ہیں۔" بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمیں آزادی ملے چالیس سال ہو چکے ہیں لیکن ہم اس ندی پر ایک پل یا باندھ نہیں بنا سکے؟

ایک افسر فوراً اٹھ کر کہتا ہے۔" سر ہمارے پاس پہلے ایسا پروپوزل تھا لیکن سروے کرنے کے بعد پلاننگ کمیشن نے یہ ریلیف دی تھی کہ جس ندی میں بارہ ماہ پانی نہ رہے اس پر باندھ نہیں بنایا جاسکتا۔ وزیر اعظم نے افسوس کے انداز میں دائیں بائیں اپنا سر ہلایا اور کہا" کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم اتنا پانی بھی اریج نہیں کر سکتے کہ اس ندی پر ایک باندھ بنایا جاسکے"۔ . . . . . اور پھر وہ دوبارہ عوام سے مخاطب ہوئے:

"ندی یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"نزدیک ہے۔" ایک شخص جواب دیتا ہے۔

وزیر اعظم: پانی آپ کیسے لاتے ہیں؟

ایک شخص: مٹکی میں بھر کر لاتے ہیں۔

وزیر اعظم: مٹکی گھر سے لے جاتے ہیں یا ندی پر مل جاتی ہے؟

ایک شخص: گھر سے ہی لے جاتے ہیں۔

وزیر اعظم: یعنی ندی پر مٹکیوں کا کوئی انتظام نہیں ہے، ایک مٹکی میں کتنا پانی آتا ہے؟

ایک شخص: قریب ڈیڑھ بالٹی آتا ہے۔

وزیر اعظم: آپ مٹکی بڑی کیوں نہیں لے جاتے؟ تاکہ زیادہ پانی آسکے؟

ایک شخص: حضور، وزنی ہو جاتی ہے۔

وزیر اعظم: عام طور سے مٹکی کی کیا سائز ہوتی ہے؟ I want to see matkee

یہ سنتے ہی ایک افسر دوڑا دوڑا جاتا ہے اور قریب کے ایک گھر سے ایک مٹکی لاکر وزیر اعظم کو دکھاتا ہے۔ صاحب موصوف اسے غور سے دیکھتے ہیں اور سوال کرتے ہیں "یہ مٹکی کس چیز کی بنی ہوئی ہے؟

ایک شخص: صاحب مٹّی سے بنی ہے۔

وزیر اعظم: مٹّی لوکل ہوتی ہے یا باہر سے امپورٹ کی جاتی ہے؟

ایک شخص: صاحب لوکل ہی ہوتی ہے۔

وزیر اعظم: گڈ! ویری گڈ! اچھا جب ندی میں پانی نہیں ہوتا ہے تو آپ پانی کہاں سے لاتے ہیں؟

ایک شخص: پڑوس کے گاؤں کے کنویں سے لاتے ہیں۔

وزیر اعظم: وہ گاؤں اس گاؤں سے کتنی دور ہے؟

ایک شخص: چھ کلومیٹر دور جانا ہوتا ہے۔

وزیر اعظم: کیا واپسی پر بھی اتنا ہی آنا ہوتا ہے؟

ایک شخص: جی حضور!

وزیر اعظم: اس گاؤں سے اس گاؤں تک آنے جانے کے لیے آپ کو کوئی بس یا ٹیکسی مل جاتی ہے۔

ایک شخص: نہیں حضور پیدل ہی جانا ہوتا ہے۔

وزیر اعظم: پانی لانے کے اس کام میں کتنے لوگ لگے ہوئے ہیں؟

ایک شخص: سب ہی لگے ہوئے ہیں!......

اس مکالمہ کے بعد شام ۵ بجے کی عام سبھا میں محترم وزیر اعظم نے اپنی تقریر کا آغاز کچھ یوں کیا۔ "ہم نے دیکھا آپ کے گاؤں میں پانی کا مسئلہ بڑا گمبھیر ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ ہمیں اس سلسلے میں کیا کرنا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہر گاؤں کے پاس ایک ندی ہو یا پھر ندیوں کو ان گاؤں، بستیوں کے پاس لایا جائے جہاں پانی کا مسئلہ ہے اس گاؤں سے اس کنویں والے گاؤں تک سٹی بس چلانا بھی ہمارے پروگرام میں رہے گا۔ آپ لوگ مٹّی کی مٹکیوں میں پانی لاتے ہیں جو اکثر ٹوٹ بھی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں ہم بینکوں سے بات کریں گے تاکہ وہ آپ کو پیتل یا تانبے کی مٹکیاں خریدنے کے لیے آسان قسطوں پر قرض دیں۔ ہماری زیادہ سے زیادہ کوشش رہے گی کہ آپ کے گاؤں میں جلد سے جلد بارش آجائے۔ آپ کی ندی پر پل اور باندھ بنانے کے سلسلے میں بھی ہماری سرکار سے جو کچھ ہو سکے گا کرے گی۔ یہ سب ہمیں کرنا ہے اور ہم کریں گے تاکہ سارے گاؤں میں پانی پانی ہو جائے۔ جے ہند ایچھے بھارت

وزیر اعظم سے لے کر عام آدمی تک پانی کے لیے کیا کچھ نہیں کرتا۔ خواجہ احمد عباس کی ہیروئن دو بوند پانی کے لیے آگ کا صحرا پار کرتی نظر آتی ہے۔ لیکن سلیمان خطیب والا "میٹھا میٹھا موت کا پانی" خوابوں میں بھی دکھائی نہیں دیتا۔ یہاں توتل کا دوا ملا ہوا، بدبودار پانی بھی خون کا پانی کر دینے کے بعد نصیب ہو پاتا ہے۔ ■

محمد رفیع انصاری (بھیونڈی)

پتہ نہیں بیٹا

ہمارے کرم فرما سعید بھائی کو خبریں پڑھنے اور پھیلانے پر ملکہ حاصل ہے۔ ایک دن صبح ہی صبح وارد ہوئے اور کہنے لگے "میاں! کچھ سنا تم نے؟" ہم نے کہا "اب تک تو صرف صبح کا اخبار پڑھا ہے سنا کچھ بھی نہیں ہے۔"

"اماں چھوڑیئے، ایک حیرت انگیز بات تمھیں بتانے آیا ہوں" پھر انھوں نے ہمارے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے منہ کو ہمارے کانوں تک لاتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا "تمھاری پڑوسن جمیلہ اخبار پڑھتی ہے اور روزانہ پڑھتی ہے۔ کبھی کبھی تو اسے گزشتہ کل کا اخبار پڑھتے دیکھا گیا ہے۔"

سعید کے اس انکشاف پر ہم نے سعید کو تقریباً ڈانٹتے ہوئے کہا "یار سعید اس طرح کی افواہ پھیلانا تمھیں زیب نہیں دیتا۔ ہم نے آج تک کسی طالبہ، چراغ خانہ یا شمع انجمن کو تمھاری طرح اخبار اوڑھ کر پڑھتے ہوئے نہ دیکھا ہے اور نہ سنا ہے۔ وہ تو بطاقِ اشیائے غیر ضروری کو اخبار میں لپیٹا کرتی ہیں۔ تمھاری طرح ضرورت نہیں بناتیں۔ ان کے لیے ہنگامی حالات میں یہ اخبار دسترخوان بھی بن جاتا ہے اور رومال بھی اور کبھی کبھی تو کانوں میں گدگدی کرنے کے لیے اس کی خدمات بھی حاصل کی جاتی ہیں۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے" سعید بولے، "لیکن میں کسی افواہ کا ذکر نہیں کر رہا ہوں۔ یہ ایک سچائی ہے کہ جمیلہ اخبار پڑھتی ہے۔"

ہم نے جواباً کہا "ہمیں تو یہ جمیلہ کو بدنام کرنے کی ایک چال معلوم ہوتی ہے۔ اس کا امیج خراب کرنے کی یہ ایک ناپاک کوشش ہے جس کی مذمت کی جانی چاہیے۔"

ہماری بات سن کر سعید بولے "اب تم چاہے مانو نہ مانو مگر جمیلہ اخبار پڑھتی ہے۔"

ہم نے پھر کہا "یار سعید ہم نے آج تک جمیلہ تو درکنار اپنے جمیل میاں کو بھی اخبار کی ورق گردانی کرتے نہیں دیکھا ہے۔"

تب وہ بولے کہ مجھے بھی جمیلہ کا شوق اخبار بینی کچھ معقول نہیں لگتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کچھ ایسا ہو رہا ہے جو نہیں ہونا چاہیے۔ اس ریمارک کے بعد سعید کرسی پر لیٹ گئے اور بڑبڑانے لگے۔

"میں پابندی سے اخبار خریدتا ہوں لیکن مصروفیات کی وجہ سے پابندی سے پڑھ نہیں پاتا۔ رات میں سونے سے قبل مجھے کچھ پڑھنے کی عادت ہے۔ چنانچہ جب مجھے اخبار کی ورق گردانی کا خیال آتا ہے تو اکثر مایوسی ہوتی ہے اور بالفرض اخبار بینی کی شدید ضرورت آن پڑے تو مجھے مطلوبہ اخبار عموماً کوڑا کرکٹ کے ڈھیر سے برآمد کرنا پڑتا ہے۔ جہاں یہ تاریخی سے بے نیاز مردہ سوئیش کی

صورت ہوتا ہے۔"

پہلی بار ہم نے معاملہ میں دلچسپی لیتے ہوئے سدو کو چھیڑا "بھابی صاحبہ تو خبر رساں ایجنسی کہلاتی ہیں۔ کیا وہ بھی اخبار نہیں پڑھتیں؟"

کہنے لگے "جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے میں نے انھیں سنجیدگی سے اخبار پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا ہے! ہاں ایک آدھ بار وہ اشتہارات پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ضرور دکھائی دیں"۔

پھر وہ خبر رساں ایجنسی کیوں کہلاتی ہیں بھلا! ہم نے پوچھا۔

ہمارے اس سوال پر سدو نے اک سرد آہ بھری اور کہا" دراصل انھیں چھپی ہوئی نہیں بلکہ بچھی ہوئی خبروں سے دلچسپی ہے"۔

بھابی صاحبہ دوردرشن تو ضرور دیکھتی ہوں گی؟ ہم نے پوچھا۔

"بولے" وہ سماچار کے علاوہ سب دیکھتی ہیں۔ ٹی وی پر سماچار کا اعلان ہوتے ہی وہ اس طرح دامن جھاڑ کر اٹھتی ہیں گویا کسی نے ان کے سامنے صبح کا اخبار اچھال دیا ہو۔ انھیں وجوہات کی بناپر تو جمیلہ کی اخبار بینی باعث حیرت بنی ہوئی ہے۔ سدو کی پریشانی ہم سے دیکھی نہ گئی۔ ہم نے انھیں صلاح دی کہ بھائی ایسا کرو کہ جمیلہ سے براہ راست مل کر ساری باتوں کا خلاصہ کرلو اور اس جنجال سے نجات پاؤ۔ ہماری صلاح کا اثر یہ ہوا کہ سدو فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے۔ مشورہ تو بہت معقول ہے لیکن میں تنہا جمیلہ سے گفتگو نہ کرسکوں گا۔ میرے ساتھ تم بھی چلو تاکہ تمھاری حیرت بھی دور ہو سکے۔

اول تو ہم نے ٹال مٹول سے کام لیا ہے پھر ان کی ضد کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔

اتوار کو جمیلہ سے انٹرویو لینا طے پایا۔ تمام کارروائیاں مکمل کرلی گئیں۔ سدو نے سوالات کی فہرست ہمارے سامنے رکھ دی۔ ہم نے اس میں تھوڑی سی ردوبدل کی اور مقررہ دن جمیلہ سے بات چیت کرنے کی غرض سے روانہ ہوئے۔

اپنے ڈرائنگ روم میں جمیلہ اخبار کو دونوں ہاتھوں میں تھامے ہماری منتظر تھی (ہم نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا) ہمیں دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ آیئے انکل صاحبان! میں آپ ہی کی راہ دیکھ رہی تھی" سدو نے ہمارا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ تمھارے پڑوسی انکل ہیں" جمیلہ آداب بجالائی۔

"جمیلہ! ہم تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں"...... سدو بھائی نے کہا" بیٹھیے تو سہی انکل ایسی بھی کیا جلدی ہے (ہم دونوں ٹھیک سے بیٹھ گئے)

"اب پوچھئے" قدرے توقف کے بعد جمیلہ گویا ہوئی۔

"بےبی! کیا یہ صحیح ہے کہ تم پابندی سے اخبار پڑھتی ہو؟ ہم نے پوچھا!

"جی ہاں انکل! میں روزانہ ہی اخبار پڑھتی ہوں" جمیلہ نے جواب دیا"

"تازہ پڑھتی ہو یا باسی"؟ سدو کے اس سوال پر جمیلہ اپنی ہنسی ضبط نہ کرسکی۔

بولی "روزانہ تازہ ہی اخبار پڑھتی ہوں"

"کیا تم اخبار کا پہلا صفحہ بھی پڑھتی ہو؟ ہم نے پوچھا۔

"میں اخبار کی ایک ایک سطر پڑھتی ہوں" جمیلہ کا جواب تھا۔

"تم اخبار ہی کیوں پڑھتی ہو۔ رسالہ دوشی، ایک رنگ، انیک رنگ، خزاں رنگ، بہار رنگ وغیرہ وغیرہ کا مطالعہ کیوں نہیں کرتیں ؟" سِدّو نے پوچھا۔

"وغیرہ وغیرہ ...... کا مطالعہ صرف میری سہیلیاں کرتی ہیں"۔ جمیلہ نے باحسرت ویاس کہا۔

"کیا تمھاری سہیلیاں وغیرہ وغیرہ کے علاوہ بھی کچھ پڑھتی ہیں ؟" ہم نے سوال کیا۔

"کم ازکم اخبار تو نہیں پڑھتیں"۔ جمیلہ نے مختصر جواب دیا۔

پھر تم اخبار کیوں پڑھتی ہو ؟ سِدّو نے پوچھا۔

"کیونکہ مجھے وغیرہ وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے"۔ جمیلہ نے سیدھا سا جواب دیا۔ (جمیلہ کا جواب سن کر سِدّو ہمارا منہ تکنے لگے)۔

"جمیلہ بیشتر خواتین اور لڑکیاں، وغیرہ وغیرہ ...... ہی زیادہ دلچسپی سے پڑھتی، ان کے متعلق فرمائش کرتیں اور انہیں خرید کر یا مانگ کر پڑھنے میں فخر محسوس کرتی ہیں"۔ سِدّو بھائی نے کہا۔

"یہ سوال تو آپ کو انھیں سے پوچھنا چاہیے سِدّو انکل"۔ جمیلہ نے سِدّو کے سوال کو الٹ دیا لیکن انھوں نے پلٹ کر پوچھا۔ "اخبار کے علاوہ تم اور کیا پڑھتی ہو ؟"

"...... فلاں فلاں ادبی رسالے بھی میرے مطالعہ میں رہتے ہیں (...... فلاں فلاں رسالوں کا نام سن کر ہم دونوں ششدر رہ گئے یہ تو ہمارے مطالعہ میں بھی نہیں آتے)

"فلاں فلاں ادبی رسالے تمہیں کہاں سے مل جاتے ہیں ؟ ہم نے پوچھا

"میں اُن کی سالانہ خریدار جو ہوں"۔ جمیلہ نے جواب دیا۔

(پھر جمیلہ نے ہمیں اپنی الماری دکھائی جس میں خلاف توقع صرف رسالے ہی رسالے اور اخبارات سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ سِدّو نے الماری میں رسالوں اور اخباروں کو دیکھ کر پوچھا۔

"یہ رسالے اور اخبارات اس قدر سلیقے سے کیوں ہیں جمیلہ !"

"دراصل انھیں میرے علاوہ کوئی اور ہاتھ لگانے کی خواہش نہیں کرتا۔ جواب ملا۔

"کیا ہم ان رسالوں کو دیکھ سکتے ہیں ؟" ہم نے جاننا چاہا۔

"کیوں نہیں۔ دراصل اِن کی ترتیب اور حفاظت کی وجہ یہ ہے کہ میری سہیلیاں اور ہم جماعت ان کی طرف نگاہ کرنا بھی گوارا نہیں کرتیں" جمیلہ نے وضاحت کی۔

سِدّو بھائی کی جس خبر کو ہم افواہ گردان رہے تھے اب اُس کی کلی طور تردید ہو چکی تھی۔ اپنی آنکھوں سے تمام حقائق دیکھنے کے بعد ہم نے سوچا کہ اب یہاں سے لوٹ جانا چاہیئے۔ چنانچہ ہم نے سِدّو کو اشارہ کیا۔

جمیلہ نے بڑی خوش دلی سے ہمیں رخصت کیا اور ہمارا شکریہ بھی ادا کیا۔

جمیلہ کے اظہارِ تشکر کے جواب میں ہمارے منہ سے کچھ نہ نکلا۔ ہم ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہی نہیں تھے کہ ہمیں کیا کہنا چاہیئے۔

لوٹتے وقت ہمارا گزر اسکول اور کالج کیمپس سے ہوا۔ ویڈیو پارلر پر بھی نگاہ کی اور بیوٹی پارلر کے اندر گھر دبھی دیکھا۔ راہ میں رسالوں اور کتابوں کی دکانیں بھی ملیں اور آرائش و زیبائش کے نگار خانے بھی۔ ان تمام مناظر کے پس منظر میں ہم سوچتے رہے۔ "حیرت ہے کہ...... جمیلہ اخبار پڑھتی ہے۔ پابندی سے پڑھتی ہے اور ایک ایک حرف پڑھتی ہے۔

"جمیلہ کا یہ اقدام کیا کسی انقلاب کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے؟"

ہم نے سدو بھائی سے یہ سوال کیا جو بہت دیر سے خاموش تھے۔

ٹالنے کے انداز میں انھوں نے بس اتنا کہا۔

"پتہ نہیں بیٹا"

••

سوپر نرملی

غزل

چکر اُس گھر کے مت لگا نادان
اس کے پچھواڑے میں ہے قبرستان

ریس میں اب درندگی کی یہاں
سب درندوں سے آگے ہے انسان

اچھے اچھوں کی ہو گئی چھٹی
کیا خطرناک ہے تری مُسکان

بڑھ گئے دام ساری چیزوں کے
cheap ہے کچھ تو ہے فقط انسان

خوب ہے بے حیائی کا نعرہ
'خان' مہ زمان میں ترا مہمان'

ظاہری بانکپن کے چکر میں
زندہ درگور ہو گیا انسان

مُردے کی طرح تھا پڑا عاشق
آپ آئے تو آگئی ہے جان

حکم بیگم کا مانتے ہیں سب
جیسے سوپر ہو شاہی یہ فرمان

قیسی قمرنگری (کرنول)

قصۂ شاعر درویش

(مصنف "باغ و بہار" میر امّن دہلوی کی روح سے معذرت کے ساتھ)

جب چوتھے درویش نے اپنی کہانی کو اختتام پر پہنچایا اور تمام درویشوں کے درد سر کو بام پر پہنچایا تو پانچویں درویش کو بھی جوش آیا یعنی کہ نیند سے ہوش آیا۔ اس نے تمام درویشوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا۔ بعضوں کے سر پہ پتھر توڑ توڑ کر جگایا۔ سب کے لیے نیند بھگانے کی دوائی مطلب یہ کہ ایک ایک پیالی چائے منگائی پھر اس کی شاعرانہ طبیعت جوش کھائی تو اس نے اپنی ایک تازہ تازہ گرم گرم مرصّع غزل سنائی تا بقی درویشوں نے جرم چائے کی نوشی میں جب داد دینے کی آواز بلند کی تو اطراف سوئے ہوئے کتّوں نے صدائے احتجاج بلند کی۔ بے بس و لاچار درویش کتّوں کی طبع شعری پر نالاں و حیراں خاموش ہو گئے اور قصۂ شاعر درویش سننے کو پُر جوش ہو گئے۔ پانچویں درویش نے اپنے قصّے کا آغاز کیا تو تمام درویشوں نے اپنی سماعت کو جانباز کیا:

مائیک پر جب کبھی آوازہ ہماری آئی
لوگ کہنے لگے آوازہ ہماری آئی
اب خبردار میاں موت تمھاری آئی
تم جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

ولادت درویش کی اور خوشیاں منانا والدین کا

شہر کرنول سے بہت دور ایک قصبۂ پُر نور میں حکومت برطانیہ کے پٹھو اور فرنگیوں کی جالی کے لٹھو افراد میں مشہور اور مجاہدین آزادی سے مقرور ایک نیم خوش حال خاندان میں یہ شاعر ذی وقار پیدا ہوا تو میرے والدین نے مسرت کی بین بجائی کہ ان کے روشن مستقبل کا ضامن آفتاب ہویدا ہوا۔ ایک سو فقرا اور ڈیڑھ سو شعرا کو کھانا کھلایا گیا اور ایک ایک شال سے نوازا گیا، واحد باپ کی واحد اولاد ہونے کی وجہ بڑی ناز و نعمت سے مجھے پالا گیا اور کبھی تر میرے حلق کو چھوڑا گیا' غرض اٹھارہ کی سن کو پہنچنے تک اور دنیا کے رنگ و بو کو پہچاننے تک میں نے ساتویں جماعت میں آٹھ مرتبہ ناکام ہو کر مدرسہ کی تاریخ میں ایک نیا ریکارڈ قائم کیا اور اپنے آپ کو اس جماعت کا طالب علم دائم کیا۔

بیان پانچویں درویش کے شاعر بننے کا

ایک روز میری ایک حمیت پھڑکی اور دماغ کی رگ پھڑکی تو مجھے آٹھ مرتبہ فیل کرنے والا استاد و ستم ایجاد کو زمین پر دے پٹکا افسوس کہ مجھے گرنوں کا ملا لقب خوب جس کے سبب ہمارا استاد کرتا رہا فریاد گھر میں اسے پیٹتا رہا اور سر ڈک پر لٹکے گھسیٹتا رہا۔ استاد

اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے اور خدا کی بارگاہ میں ادا یہ الفاظ ناپسند کیے کہ اے خالق کائنات وحافظ کلیات! تیرے اس مغرور بندے اور ذہنیت کے گندے نے مجھ لاچار کو بیمار کرنے کی حد تک مارا ہے۔ اور عزت کو میری سر بازار اُتارا ہے۔ تو اسے دنیا و دین میں بدنام کردے، جنت کو اس پر حرام کردے، حال اس کا تودہ بنا کے چھوڑ کر دنیا و دین کے ہر موڑ پر کتے کی طرح جھڑک دیا جائے اور دامن سے لائٹ کے کیڑے کی طرح جھٹک دیا جائے، نہ رشتہ دار اس کے قریب آئے اور نہ بیوی ہی اس کو قریب بلائے اسے خداوند جل جلالہ رسوائی کے لیے اس کی چار سُو تو اسے دنیا کا مفلوک ترین شخص بنا دے، شاعر بنا دے۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

استاد کی فریاد اللہ نے سن لی اور اس نے زندگی کی نئی ڈور بن لی، رفتہ رفتہ مجھ میں شاعرانہ حرکات اور غیر انسانی سکنات کا اضافہ ہونے لگا اور میں ایک ایک مہینے بعد نہانے دھونے لگا، الّو کی طرح رات رات بھر جاگنے لگا، دوستوں سے دور دور بھاگنے لگا، شاعروں سے قربت کرنے لگا۔ انسانوں سے نفرت کرنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے میں شاعر بن گیا، یعنی دنیا و دین میں کا ر بن گیا۔ حد تو یہ ہے کہ مشاعروں میں شرکت کرنے لگا شہر کے بڑے بڑے شاعروں کی صحبت کرنے لگا۔

شرکت کرنا مشاعرہ میں اور محظوظ ہونا سامعین کا

ایک مشاعرے میں مجھے کلام سنانے بلایا گیا، تو ہر طرف سے ایک شور مچایا گیا، سامعین نے پھٹے پرانے جوتوں کے ساتھ نئے نئے سینڈل بھی ڈائس پر پھینکے اور غصّے کے انڈے سینکے۔ چناں چہ میں نے اپنی عقلمندی کو آواز دی اور اپنے شعور کے پردوں کو پرواز دی اور یہ شعر پڑھا:

میں نے جب تم کو یاد بار کیا
اپنے دامن کو تار تار کیا

اور ایک زوردار جھٹکے سے اپنی قمیص پھاڑ ڈالی، سامعین کی حماقت جھاڑ ڈالی، سامعین مسرت سے رقص کرنے لگے اور اپنے کرتے اور تول اچھال اچھال کر میری شاعری کا دم بھرنے لگے، میں مشاعرے کی کامیابی کا ضامن بن گیا اور اپنے اس شاعرانہ ہنگامے پر گنجے کے کیڑے کی طرح تن گیا، منتظمینِ مشاعرہ نے مسرت کی بنسی بجائی اور ایک نئی قمیص مجھے سلوائی، پھر دوسرے مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی تو دوسرے مشاعرے میں بھی میں نے میری غزل پڑھنے اور قمیص پھاڑنے کی حماقت کی۔ سامعین خوش نہ ہوئے البتہ منتظمین مجبور رہے کہ ایک مد قمیص سلائی جائے اور اور مصیبت ٹلائی جائے، تیسری بار بغیر دعوت کے میں مشاعرے میں جا دھمکا تو سارے منتظمین کا غلہ چھکا کلام سنانے کی ضد کرنے لگا تو وہ بے چارے گردش کے مارے پیچھے شاعر پٹھے کو تو دیکھ لے اور فیل اس کے کہ یہ شاعر دی وقار کلام سنانے کو اپنی زبان کھولے انھوں نے میری قمیص اُتار لی، نہ صرف اُتار لی بلکہ ہمیشہ کے لیے مار لی۔

پانا خطاب غالبِ ثانی کا اور کیسہ زر پانچ ہزار کا

ایک مشاعرے میں میں نے غالب کی ایک مشہور غزل پڑھ ڈالی تخلص بدل کر، اور یہ نہ سوچا کہ کیا ہوگا آگے چل کر چوں کہ خدا کی کرنی کے آگے نہ کوئی دوڑے نہ کوئی بھاگے، بڑے کچے ہیں زندگی کے دھاگے، کوئی پیچھے پیچھے تو کوئی آگے آگے غالب مجھ سے ایک سو سال پہلے پیدا ہوگئے اور اردو والے بلا سوچے سمجھے ان کے شیدا ہوگئے۔ جب میری زبان سے لوگوں نے غالب کا کلام سنا تو مجھے خطاب کے لیے چنا۔ صدرِ مشاعرہ نے خطبہ صدارت میں مجھے غالبِ ثانی کے خطاب سے نوازا یعنی میری کالی کلوٹی شاعری کے چہرے پر تھوپا ثقافت کا غازہ، حتیٰ کہ مجھے پانچ ہزار روپے سکۂ رائج الوقت انعام میں دینے کا جاری فرمان کیا اور مشاعرہ ہی میں اس خوش خبری کا اعلان کیا، میں خوشی سے ڈانس پر ڈسکو رقص کرنے لگا اور غرور و تمنّدی کا چارہ چرنے لگا، جب پہنچا میں دوسرے دن صدرِ مشاعرہ کے مکان اور یاد دلاتے ہوئے انھیں اپنا اعلان مانگی پانچ ہزار روپے کی رقم تو بولے ہو کر برہم کہ لو عقل کے ناخن نہیں تم میں شاعری اور شاعروں کے کوئی گُن، فرق سمجھا کرو اعلان اور ایمان میں، شاعر ہو اور رہتے ہو دولت کے ارمان میں، بات ہے سیدھی سادی۔ تم ہو نظم سنا کر محظوظ کرنے کے عادی اور میں ہوں نثر سنا کر محظوظ کرنے کا عادی۔ میں خطاب اور کیسۂ زر سے مایوس ہوگیا اور لوگ خطاب ملنے پر کیوں خوش نہیں ہوتے۔ یہ محسوس ہوگیا۔

کوشش کرنا باپ کا شاعری چھڑانے کے لیے اور بیاہ رچانا درویش کا

میرے شاعر بننے پر میرے باپ کو پریشانی ہوئی، اور ڈھیلی اس کی شیروانی ہوئی۔ اس نے مجھے شاعری سے دور رکھنے اور گھر گرہستی سے مجبور رکھنے کے لیے میری شادی اور میری شاعری کی بربادی کی ٹھانی، اخبارات میں اشتہارات چھپوائے کہ برس دن کے ایک شاعر کو شاعری سے نجات دلانے کے لیے اور اشرف المخلوق بنانے کے لیے رشتہ مطلوب ہے۔ ایک ایسی خاتون سے جو صلاحیت رکھتی ہے اس بات کی کہ اپنے شوہر کو مار پیٹ کے اور شاعری کے علاوہ تمام کاموں میں اس کو گھسیٹ سکے چوں کہ ایسی خواتین کی ہندوستان میں کمی نہیں، میرا رشتہ طے ہوگیا اور میرا نالہ پابندِ نے ہوگیا۔

شبِ نکاح میں نے مکان پر ایک تہنیتی مشاعرہ منعقد کیا اور تمام شعرا کو مشاعرے پر مدعو کیا تو حجلۂ عروسی سے دلہن باہر آئی اور بجلی کی پھرتی سے اس نے صدرِ مشاعرہ کے دونوں پیر ایک ہاتھ سے پکڑ لیے اور دوسرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اپنے دونوں ہاتھوں کو دیا ایک زوردار جھٹکا اور آن کی آن میں صدرِ مشاعرہ کو زمین پر بُری طرح اٹھا پٹکا۔ مبتدی شعرا نے یہ منظر دیکھا تو ان کو پسینہ آگیا اور خطرے میں نظر اپنا جینا آگیا" البتہ کہنہ مشق شعرا ایک کونے میں چھپ گئے۔ جلّ تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو رٹنے لگے اور تہنیتی کلام سنانے پر ڈٹنے لگے پھر کیا تھا مشاعرہ گاہ تبدیل ہونے لگی ورزش گاہ میں اور شعرا کی عادت اور بیگم کی طاقت کے درمیان ہونے لگی ایک جنگِ جارحانہ اور ناکام تھے سارے شاعر دافعانہ، شعرائے کرام کے ملبوسات کے اڑنے لگے پرخچے اور تالیاں بجا بجا کر خوش ہونے لگے چھوٹے چھوٹے بچے، حتیٰ کہ کچھ بے ہوش اور کچھ نیم بے ہوش

شعراء کرام اور سامعینِ عظام کو ایک عدد بیل گاڑی میں لاد کر کانیٹوں کی جھاڑی میں پھنکوا دیا گیا اور مکان کو تالا لگوا دیا گیا۔ اب دلہن بیگم نے مجھے تاکا جس سے میں بے تحاشہ کانپا۔ دلہن نے اپنے داہنے ہاتھ سے کام لیا اور میرے گریبان کو تھام لیا۔ بائیں ہاتھ سے دیا گردن میں ایک زوردار غلیظ تو میں حجلۂ عروسی میں جا پڑا مرتا جیتا۔ دروازہ بند کر دیا اور اپنی کرخت آواز کو بلند کیا "اے میرے شوہر نامراد و خانہ آباد اپنے کانوں کے دروازے کو کھول اور عقل کی ترازو میں انسانیت کے باٹ تول، میری بات غور سے سن اور پیدا کر خود میں شبر لیغنل کے گُن۔ دیکھ کہ تو ہے مثلِ گلشن باورا اور میں ہوں مثلِ ٹن ٹن، اگر تو نے نہ چھوڑی شاعری کی دھن تو سمجھ لینا کہ شامت تیری آگئی اور موت تجھ پر چھا گئی۔ غزل لکھتے ہوئے تو مجھے اگر مل گیا تو جان لے کہ اسی وقت تو معبودِ حقیقی سے مل گیا۔ دیکھ لیا میں نے تجھے لکھتے ہوئے قطعہ یا رباعی تو یاد رکھ کہ ہوں میں تیرے ہاتھ پیر توڑنے کی داعی۔ نظر آجائے تو گر آزاد نظم کہتے تو ننگا کر کے بازار گھماؤں گی اور مر جائے گا تو بے حیائی سہتے سہتے۔ نام لیا مشاعرہ کا تو نے تو سمجھ لینا کہ مرحوم شعرا کی صف میں خود کو شامل کر لیا تو نے۔"

یہ سنتے ہی میری مردانہ وجاہت کو جوش آگیا اور غصے کے مارے پارہ تلوے سے بر دوش ہو گیا۔ میں نے اپنا جوتا ہاتھ میں اٹھا لیا اور پیامن بغل میں دبا لیا بھاگا کھڑکی کود کر اس زور سے کہ کسی کو نظر نہ آیا دور دور سے۔

اے میرے رفیق درویشو! اور بلا نوشو! بھاگتے بھاگتے اور جاگتے جاگتے شاعری کی چاہ میں تمہاری خانقاہ میں تھکن سے چُور، بد ذوق زندگی سے دور آ پہنچا۔ حیات کی اس تنگ دور میں اور بیوی کی مار دو برس میں، میں نے ۵۲ غزلیں ۱۷ نظمیں ۲۲ رباعیاں، ۵ قطعات اور دو سو آزاد نظمیں کہنے کی سعادت حاصل کی ہے جو آپ کے کرتا ہوں گوش گزار، امید کہ کوئی بھی نہ ہوگا بیزار۔

یہ کہہ کر اس نے تمام درویشوں کو دیکھا اور رہ گیا ہکا بکا۔ کوئی بھی موجود وہاں نہ تھا بلکہ دور دور تک کسی کا نام و نشان نہ تھا۔

قصہ شاعر درویش کا ختم ہوا۔ ●○

حامد لطیف حامد (بمبئی)

مگر لکھوائے کوئی اُن کو خط

مرزا غالب تو صبح ہوتے ہی کان پہ قلم اور غالباً ہاتھ میں دوات لے کر انھیں خط لکھنے کی خاطر پابہ رکاب رہا کرتے تھے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مرزا سخت بے چین رہا کرتے تھے لیکن ہم ٹھہرے ایک نمبر کے کاہل اور سست! کبھی کبھی ہمیں اور اکثر ہماری بیگم کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ ہم گزشتہ بارہ برس سے آفس میں نو گھنٹہ یومیہ کے حساب سے قلم کس طرح گھسیٹ رہے ہیں، کبھی کبھی خود ہی فرماتی ہیں، کون کہتا ہے کہ اب معجزات رونما ہونا بند ہو گئے ہیں؟ ہمارا جواب ہوتا ہے اگر مجنوں لیلیٰ کے لیے صحرا کی خاک چھان سکتا ہے فرہاد شیریں کے لیے جوئے شیر لا سکتا ہے تو بھلا ہم آپ کے لیے نوکری نہیں کر سکتے؟

ہاں تو بات ہو رہی تھی خط لکھنے کی! اب یہ پتہ نہیں کہ ہمارے کس بدخواہ نے خواہ مخواہ یہ بے پر کی اڑا دی، کہ ہم خط بہت اچھے لکھ لیتے ہیں حالانکہ کان پر قلم رکھ کر کسی کو خط لکھ کر دینے کی صدا لگانا تو دور کی بات ہے ہم اپنے نام آئے ہوئے کسی خط کا جواب آٹھ دس روز کے اندر اندر دے دیتے ہیں (ایسا بہت کم ہوتا ہے) تو ہم خود حیرت آمیز مسرت اور مسرت آمیز حیرت سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

کوئی اتوار یا چھٹی کا کوئی اور دن ایسا نہیں جاتا کہ ہمیں ایک آدھ خط لکھ کر نہ دینا پڑتا ہو۔ لیکن خط لکھوانے والے کی درخواست اور بیگم کی ضد ٹالی نہیں جاتی اور پھر یوں ہی ہوتا ہے کہ کسی کا خط پورا ہوتے ہی بیگم ہمارے سامنے خط لکھنے کا پیڈ یا پوسٹ کارڈ لا کر رکھ دیتی ہیں کہ دیکھئے کتنے دن ہو گئے ناگپور سے عقیل بھائی کا خط آیا رکھا ہے اب لگے ہاتھوں ان کو بھی...... اور ہمیں بہرحال ایک اور خط لکھنا ہی پڑتا ہے!

بات صرف خط لکھ کر دینے پہ ہی ختم ہو جاتی تو کوئی بات ہی نہیں تھی، مگر بدقسمتی بالائے بدقسمتی یہ ہے کہ ہمیں ان کا جواب لکھنے سے پہلے آیا ہوا خط پڑھ کر سنانا بھی پڑتا ہے (ہم یہ بات یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مرزا صرف خط "لکھ" دیتے ہوں گے، آیا ہوا خط پڑھ کر سناتے ہرگز نہ ہوں گے یعنی،

اگر پڑھوائے کوئی ان کا خط .... نہیں، ہرگز نہیں)!

پہلے سماعت فرمائیے آئے ہوئے خط کا ایک نمونہ، خط کچھ یوں شروع ہوتا ہے...... معاف کیجئے گا، خط سننے سے پہلے وہ پتہ سن لیجئے، جس پر یہ خط آیا ہے۔ غصہ اس بات پر نہیں آتا کہ پتہ کتنا غلط لکھا ہوتا ہے، حیرت

اس بات پر ہوتی ہے کہ خط ٹھیک اُس آدمی کے پاس آجاتا ہے جو اب لکھوانے کے لیے ہمارے سر پر سوار ہے پتہ کچھ یوں ہوتا ہے۔

"درشہر بمبئی میں پہونچ کر مانک موتی اپارٹمنٹ کی دیوار کے پاس کھولی نمبر ۲۱۲ میں محمد مکھو کے ابا کو ملے۔"

اب خط سُنیے اور (لکھنے) اور (لکھوانے) والے دونوں کا سر دُھنیے!

محمد مکھو کے ابا کو کلّھی کی اماں کا سلام۔

"یہ محمد مکھو اور کلّھی کیا ہے بھائی؟" ہم نے پوچھا۔ جواب ملا "ہمارا بڑا لڑکا ہے۔ خوب گورا ہے اسی لیے سب پیار سے اُسے محمد مکھو کہتے ہیں اور صاحب ہماری لڑکی بہت کالی ہے اسی لیے سب اُسے (ہم دونوں بچوں کے اصل نام پوچھنے کی ہمت نہیں کر سکے)۔ آگے کلّھی کی اماں نے محمد مکھو کے ابا کو لکھا........ معاف کیجئے لکھوایا تھا۔

"یہاں سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ تم ہماری بالکل فکر مت کیا کرو۔ بس ہر مہینے منیا ڈر MONEY ORDER برابر بھیجتے رہا کرو۔ خط اگر نہ بھی لکھو تو کوئی حرج نہیں تمہارا حال چال آنے جانے والوں سے پندرہ دن میں معلوم ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہاں اب آگے کا حال سنو، تمہارا پانسو (پانچ سو) روپلی کا منیا ڈر ملا۔ آتے مہینے سے ہزار روپیہ بھیجا کرو، پانسو میں پورا نہیں ہوتا۔ ہاں ایک بڑی اچھی خبر ہے۔ کل رات دو بجے کالی مینا نے ایک بچے کو جنم دیا۔

"کیا"؟ ہم نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا مسکرا کر بولے،

"ہماری بھینس ہے بابو۔ ہم سب اُسے پیار سے کالی مینا کہتے ہیں۔ اُسی نے بچھڑا دیا ہوگا۔ آگے پڑھیا بو"۔ ہم نے آگے پڑھا۔ کل شام کو سفید ہاتھی اپنی چتکبری چڑیل کو کھا گیا"۔

"سفید ہاتھی؟ چتکبری چڑیل؟ ہم نے پھر ادبدا کر پوچھا۔ بدستور مسکراہٹ بھرا جواب ملا۔

"اسے صاحب کچھ نہیں، وہ ہماری اُلٹے پروں والی مرغی ہے۔ لنگڑی بھی ہے اور کٹ کھنی بھی۔ اُسے پڑوسی کا سفید کتا کھا گیا ہوگا۔ آگے پڑھو صاحب"۔ ہم نے دھڑکتے ہوتے دل کے ساتھ آگے بڑھنے سے پہلے سوچا۔

آگے آگے دیکھیے لکھا ہے کیا؟

اب اپنا محمد مکھو بڑا ہشیار ہو گیا ہے۔ کل پہلے دن مدرسے گیا پڑھنے کو۔ وہاں ایک لڑکے کی آنکھ میں انگلی بھونک دی۔ پھوٹتے پھوٹتے بچی۔ دوسرے لڑکے کو اُٹھا کر پٹک دیا۔ مولی ساب نے مارا تو ان کے صافہ کا پھندنا پکڑ کر کھینچ لیا اور ان کی گنجی کھوپڑیا پر ایک چپت مار کر مدرسے کی دری گیلی کر کے گھر بھاگ آیا۔ اللہ کے بڑا ہشیار اور چالاک ہے آگے چل کر بڑا نام کمائے گا۔ تم دیکھ لینا اور آگے سماچار یہ ہے کہ پہلیاں، ٹہلیاں، اور بہلیاں تینوں اچھے ہیں ہم پھر چکرائے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ تینوں ان کے چھوٹے بھائی کے بچوں کے پیار کے نام ہیں جو پہلے پیدا ہوا اُس کا نام پہلیاں جس دوسرے کو ٹہلانا بہت پڑتا ہے اُس کا نام ٹہلیاں اور جس کو ضد کرنے پہ بہلانا پڑتا ہے اس کا نام بہلیاں"——!!

اس سے آگے پڑھا۔

"اب کے مونگ پھلی بہت ہوتی ہے ہم سب ہی نے اتنی کھائی اتنی کھائی کہ ہم سب ہی کو دست لگ گئے۔ ہمارے پیٹ میں تو ابھی تک گڑ گڑ ہو رہی ہے دو چار دن میں ڈگڑو کے چاچا بھی آ رہے ہیں۔ اُن کے ہاتھ تم کو بھی ایک تھیلا بھر بھیج دیں گے زیادہ مت کھانا نہیں تو تم کو بھی .... آدھا تھیلا مونگ پھلی خط پڑھنے اور جواب لکھنے والے بابو کو بھی دے دینا۔ اُن سے کہنا زیادہ نہ کھائیں نہیں تو .... اچھا بس، اب خط ختم کرتے ہیں۔ گڑ کھو اور کلّھی کی طرف سے تم کو سلام۔ ڈگڑو کے چاچا کا سلام۔ باقی اپنی مرغیاں، بلیاں، بکریاں، گائیں اور بھینس سب خیریت سے ہیں۔ ساری کی ساری بھینسیں سامنے والے پچکورے تالاب کے کیچڑ میں پڑی دن رات پگرایا کرتی ہیں۔ انھیں آرام کرتے دیکھ کر میں کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ اگر اپن بھی گائے یا بھینس ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔

خط کا جواب چاہے جب دینا پر چار روپے کا منی آڈر کرنا مت بھولنا۔ فقط تمہاری

گڑ کھو کی اماں

یہ تو تھا آنے والے خط کا نمونہ مع پتہ۔ اب دیکھئے اس کا جواب پتے کے ساتھ۔

در شہر لکھنؤ میں پہونچ کر ضلع (ضلع) ہردوئی سے آگے سندیلہ پہونچ کر، پچکورے تالاب کے پاس بڑی مسجد کے پیچھے کلّھی کی اماں کو ملے۔

کلّھی کی اماں کو گڑ کھو کے ابّا کا سلام۔

تمہارا خط ملا۔ وہاں کا سب حال معلوم ہوا تم خرچ کی فکر مت کرو ہم نے آج صبح پانسو کا منی آڈر کیا ہے۔ دو چار دن میں پانسو اور بھیج دیں گے۔ اب اُس کتے کے منہ کو خون لگ گیا ہے دوسری مرغیوں کو سنبھال کر رکھو۔ مونگ پھلی ضرور بھیجو۔ تم نے اپنی بھینس کے بچھڑے کا نام نہیں لکھا ابکی ضرور لکھو۔ گڑ کھو کے مدرسے کا حال سن کر جی خوش ہو گیا۔ پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آنے لگتے ہیں۔ آخر ہے کس کا بیٹا۔ باقی آنہ باڑہ والوں کو سلام۔ سب بچوں کو دعائیں تمہارا جی بھی چاہا تو کیا ہونے کو گائے یا بھینس! میرا تو جی کرتا ہے میں پردھان منتری ہوتا یا پھر کم از کم امیتابھ بچن پھر سر چاہے پھانسی کے پھندے پر کیوں نہ ہوتا یا پانچوں انگلیاں تو گھی میں ہوتیں خیر ڈگڑو کے ابا کے ہاتھ ایک کلو اصلی گھی ضرور بھیجو (یہ لکھتے ہی ہمیں اپنی ڈھائی انگلیاں اُس گھی میں ڈوبی نظر آئیں جو بہت جلد ہمیں ملنے والا تھا۔ بس اب خط ختم کرتے ہیں۔

تمہارے گڑ کھو کے ابا!

میرے ایک بہت ہی عزیز دوست تھے۔ سید شمیم ناصری مرحوم ایک اچھے شاعر تھے لیکن اس سے زیادہ ایک اچھے انسان تھے۔ انھوں نے مجھے قریب ستر سال پہلے کا چھپا ہوا کلام غالب کا نسخہ حمیدیہ عنایت کیا تھا۔ اکثر جی چاہتا ہے کہ مرزا کی اس غزل کے اس ایک شعر پر خطِ تنسیخ کھینچ دوں۔

وجہ آپ حضرات سمجھ ہی گئے ہوں گے۔

رضا نقوی واہی (پٹنہ)

اردو میں طنز و مزاح — کتنا معیاری، کتنا سطحی

طنز و مزاح ایک قسم کا اسلحہ ہے جو سماجی برائیوں اور برسرِ پیکار طاقتوں کی کاٹ کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں سماج کی ناہمواریوں کے خلاف احتجاج کرنا طنز و مزاح کا منصب ہے۔ اسے معاشرے کی برائیوں پر تنقید کا ایک اسلوب بھی کہا جا سکتا ہے جو شوگر کوٹیڈ کیپسول میں پیش کیا جاتا ہے۔ سماج کے اندر پھیلی ہوئی پراگندگی کا احساس تو کم و بیش سب کو ہوتا ہے لیکن طنز و مزاح نگار کو یہ احساس کچھ زیادہ ہوتا ہے۔

بعض منقدینِ ادب کا یہ خیال ہے کہ طنز و مزاح سرے ہی سے دوسرے درجے کا ادب ہوتا ہے۔ میں اسے نہیں مانتا۔ ادب میں درجہ بندی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ ادیبوں کی درجہ بندی کی جا سکتی ہے کہ کون بڑا۔ کون منجھولا اور کون بونے قد کا ہے۔ مثلاً غالب بھی غزل لکھتے تھے اور اردو کا پہلا قاعدہ پڑھنے کے بعد مکتب کا کوئی منچلا طالب علم بھی غزل لکھنے لگتا ہے۔ ایسے طالب علم کی کمزور غزل کو دیکھ کر یہ فتویٰ صادر کرنا کہ صنفِ غزل ہی کمتر درجے کی صنف ہے بالکل غلط ہوگا۔ رشید احمد صدیقی یا پطرس بخاری کے ظریفانہ مضامین کی موجودگی کے باوجود لوغر مراد آبادی کا پھسپھسا سا کوئی مضمون پڑھ کر یہ کہہ دینا کہ ظریفانہ ادب سرے سے ہی دوسرے درجے کا ادب ہے نامناسب ہے۔ اسی طرح اکبر الہ آبادی کی ظریفانہ شاعری کے سامنے کسی تکبند کا غیر معیاری کلام پیش کر کے فنِ طنز و مزاح کو مطعون نہیں کیا جا سکتا۔

اس سلسلے میں پہلی غور طلب بات یہ ہے کہ اردو زبان کے ابتدائی دور سے آج تک لاکھوں شعرا اور ادبا گزرے ہیں جن کے کلام یا مضامین کو اگر تولا جائے تو مجموعی ذخیرہ ہزاروں ٹن میں ہوگا جبکہ طنز و مزاح لکھنے والے فنکاروں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے اور اسی مناسبت سے ان کا تخلیقی سرمایہ بھی کم ملے گا۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ طنز و مزاح ایک انتہائی مشکل فن ہے اور جو فن مشکل ہوتا ہے اس کو برتنا ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں۔ یہی سبب ہے کہ سودا کے عہد سے لے کر آج تک معیاری طنز و مزاح لکھنے والے شاعروں کی تعداد دو درجن سے بھی کم ہوگی اور نثری طنز و مزاح لکھنے والوں کی تعداد بھی غالب کے دور سے اب تک چار درجن کے لگ بھگ ہوگی۔

سماج کی برائیوں کا اکسپوز کرنے کے علاوہ طنز و مزاح کا ایک دوسرا منصب بھی ہے یہ پژمردہ چہروں کو شگفتگی بخشتا ہے بجھے ہوئے انسانوں کو مسکراہٹیں اور قہقہے عطا کرتا ہے (اس دورِ پُر آشوب میں یہ زندگی کی علامت ہے۔ جوش ملیح آبادی کی

ایک رباعی ہے۔ ؎

غنچے تری زندگی پہ دل ہلتا ہے بس ایک تبسم کے لیے کھلتا ہے
غنچے نے کہا کہ اس جہاں میں بابا یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

خوشی کے قحط میں ظرافت نگار کبھی کبھی افسردہ دلوں کو اپنے اشعار کی زکات تقسیم کرکے انسانیت کی اہم ترین خدمت کرتا ہے۔

اب یہ سوال کہ طنز و مزاح کتنا معیاری کتنا سطحی ہے تو عرض ہے کہ نثر کے میدان میں غالب کے خطوط پطرس بخاری کے مضامین رشید احمد صدیقی کے نثر پارے، فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، کنھیالال کپور، انجم مانپوری، شفیق الرحمٰن، ابن انشا، فکر تونسوی، وجاہت علی سندیلوی، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین، فکر تونسوی اور یوسف ناظم کے انشائیوں کو تنقید کی کسی کسوٹی پر بھی پرکھا جائے اعلیٰ معیار کے ادب پارے ثابت ہوں گے۔ اسی طرح ظریفانہ شاعری کے نخلستان میں اکبر الہ آبادی کے کلام کو نک چڑھے سے نک چڑھے نقاد حضرات بھی اعلیٰ درجے کا کلام مانتے ہیں۔ عبدالغفور شہباز، ظریف جبل پوری، دلاور فگار، راجہ مہدی علی خان وغیرہ کے کلام پر شاید ہی کوئی انگلی اٹھائے۔ اس میدان میں مقدور بھر میں نے بھی [illegible] کیا ہے اب تک میرے سات مجموعے اردو میں اور ایک ہندی میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں کثیر تعداد میں وہ منظوم خطوط بھی شامل ہیں جو احباب کے نام لکھے گئے ہیں اور "شعرستان" نام کی وہ طویل نظم بھی شامل ہے جو سولہ ابواب پر مشتمل ہے جس کے اشعار کی مجموعی تعداد ساڑھے تین سو سے بھی زیادہ ہے۔ ظریفانہ شاعری کے سرمائے میں طویل نظم اور منظوم خطوط اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تمام نظموں کے کسی شعر کے کسی مصرعے میں کوئی بھی غیر سنجیدہ یا سطحی لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ آزادی کے بعد سے اب تک معاشرے کے مختلف شعبوں میں جہاں جہاں برائیاں نظر آئیں میں نے ان برائیوں کی نشان دہی کی ہے اور میرے کلام کو بھی اب تک کسی نے غیر معیاری نہیں کہا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے ایک شعر میں اپنے دور کے ایک ذی اثر فرد کے ظاہر و باطن کی تصویر جس خوب صورتی سے پیش کی ہے ملاحظہ ہو ؎

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

اس شعر نے آفاقی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ اس آئینے میں سماج کے ہر شعبے کے ذی اقتدار لوگوں کے قول و عمل کے تضاد کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔

اسی طرح آج کے دور میں کتابوں پر تبصرے کس طرح لکھے جاتے ہیں اس کی تصویر میں نے بھی ایک نظم میں دکھائی ہے۔ مبصر سے پوچھا گیا کہ حضور آپ ضخیم سے ضخیم کتاب کا مطالعہ چند منٹوں میں کرکے کس طرح تبصرے لکھتے ہیں تو ؎

ہنس کے بولے مطالعہ کیسا!
پڑھ کے لکھا تو تبصرہ کیسا!

یہ ضرور ہے کہ طنز و مزاح کے نام پر مشاعروں میں عام طور سے سستا کلام پڑھا جاتا ہے یا رسالوں میں جو کلام عموماً چھپتا ہے

وہ زیادہ تر سطحی اور غیر معیاری یا صحافتی انداز کا ہوتا ہے۔ معیاری اور اس قسم کے سطحی کلام کے درمیان جو فرق ہوتا ہے اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ کرکٹ گھر کے آنگن اور گلی کوچے میں بھی بچے کھیلتے ہیں اور یہ کھیل بڑے کھلاڑی بین الاقوامی سطح پر بھی کھیلتے ہیں۔ کھیل ایک ہی ہے لیکن کھیلنے والوں کا معیار الگ الگ ہوتا ہے۔ اسی طرح طنز و مزاح بھی ادبی نوعیت کا ایک کھیل ہے جو ہنستے ہنساتے کھیلا جاتا ہے جس کے کھیلنے والوں کا معیار الگ الگ ہوتا ہے۔ یہاں ایک بات یہ بھی عرض کردوں کہ کھانے میں نمک جو رول ادا کرتا ہے، وہی رول طنز و مزاح کا شاعر بھی اپنی شاعری کے ذریعہ ادا کرتا ہے۔ کھانے میں نمک کم یا زیادہ ہوجائے تو کھانا خراب لگتا ہے۔ اس لیے بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے نمک کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے مشاعروں کے شعراء اس احتیاط سے کام نہیں لیتے، اس لیے ان کا کلام عموماً سطحی ہوتا ہے۔ شاید اس کی وجہ سے یہ بھی ہے کہ عام طور سے مشاعروں میں کم پڑھے لکھے سامعین شرکت کرتے ہیں جو مبتذل اور غیر معیاری کلام سن کر خوش ہوتے ہیں اور شعرا حضرات اسی مناسبت سے اپنا کلام سناتے ہیں۔ ایسے شاعروں کی مثال سرکس کے مسخروں جیسی ہوتی ہے جن کا کام نقالی کرکے مجمع کو ہنسانا ہوتا ہے لہٰذا طنز و مزاح اعلیٰ درجے کا بھی ہوتا ہے اور سطحی درجے کا بھی اور یہ طنز و مزاح ہی پر منحصر نہیں ہے۔ دوسرے فنون یا اصناف پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اعلیٰ معیار اور ادنیٰ معیار ہر جگہ موجود ہے —— افسانوی ادب میں بھی غزلوں، نظموں میں بھی اور تنقید و تحقیق میں بھی۔

●●

خامہ بگوش (کراچی)

کشور ناہید
اٹامک انرجی کمیشن کی چیئرمین بھی بن سکتی ہیں

ہمارے پڑھنے والے از راہ کرم ہمیں خط لکھتے رہتے ہیں۔ ان کے خطوں سے جہاں ہمیں اپنی بہت سی غلطیوں کو تصحیح کا موقع ملتا ہے وہیں آیندہ بھی غلطیاں کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے جب یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ بعض لوگ دوسروں کی غلطیوں کی تاک میں رہتے ہیں تو پھر انھیں مصروف رکھنے کے لیے غلطیاں کرتے رہنا ضروری ہو جاتا ہے لیکن ہمارے سبھی مراسلہ نگار غلطیاں نہیں پکڑتے بعض غلطیوں پر اکساتے بھی ہیں خصوصاً وہ شعرائے کرام جو اپنے مجموعے بھیج کر ان پر کالم لکھنے کی فرمایش کرتے ہیں۔ ایسے کرم فرماؤں سے ہم عموماً معذرت کر لیتے ہیں کیونکہ غلطی در غلطی کا مضمون باندھنے کی ہمیں عادت نہیں ہے مجموعہ کلام چھپوا کر جب ایک غلطی کر لی گئی تو اس پر کالم لکھ کر دوسری غلطی کیوں کی جائے۔

استاد لاغر مرادآبادی جب بھی ہمارے نام کوئی خط لکھتے ہیں تو وہ محکمہ ڈاک والوں کے نزدیک بیرنگ اور ہمارے خیال میں بے رنگ ہوتا ہے۔ استاد محترم ہر خط میں ہماری زبان کی کم از کم پانچ چھ غلطیوں کی نشاندہی ضرور کرتے ہیں اور لفافے پر ٹکٹ چسپاں کیے بغیر پوسٹ کر دیتے ہیں تاکہ ہاتھ کے ہاتھ ہمیں غلطیوں کی سزا بھی مل جائے ایک مرتبہ تو انھوں نے تلفظ کی بھی کچھ غلطیاں پکڑ لیں۔ ملاقات پر ہم نے عرض کیا "آپ نے ہمارے چھپے ہوئے کالم کو پڑھ کر تلفظ کی غلطیاں کیسے پکڑ لیں" انھوں نے فرمایا "جو شخص لکھنے میں غلطیاں کر سکتا ہے تو بولنے میں بھی ضرور کرتا ہے۔ اسی قیاس پر آپ کے تلفظ کی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے مزید یہ کہ آپ کے بعض جملوں میں اس وقت تک روانی پیدا نہیں ہوتی جب تک ان جملوں کے دو تین لفظوں کا تلفظ تبدیل نہ کیا جائے۔ کچھ خط ایسے بھی موصول ہوتے ہیں جن میں بعض اہم اور سنجیدہ مسائل پر اظہار خیال کی فرمایش کی جاتی ہے۔ حالانکہ اہم اور سنجیدہ مسائل پر لکھنے میں ہی نہیں ان مسائل کے بارے میں کچھ پڑھنے میں بھی ہمیں تکلف ہوتا ہے۔ ادب اور ادبی مسائل پر لکھتے رہنے کی وجہ سے ہم نے کبھی کسی اہم اور سنجیدہ مسئلے کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ بہر حال اس مرتبہ ہم اپنی روش کے خلاف دو ایسے خط شائع کر رہے ہیں جو توجہ طلب ہیں۔

پہلا خط کراچی کے ایک بزرگ اور معروف ادیب کا ہے وہ اپنا نام بوجوہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔ وہ لکھتے ہیں
..... مشہور شاعر محسن بھوپالی کے حلق کے ٹیومر کا آپریشن ۱۹۸۸ء کے وسط میں لندن میں ہوا تھا۔ سال بھر بعد انھیں مزید

علاج اور چیک اپ کے لیے دوبارہ لندن جانا تھا اس سلسلے میں اکادمی ادبیات کی سفارش پر وفاقی محکمہ صحت نے جولائی ۱۹۸۹ء میں ایک میڈیکل بورڈ تشکیل دیا تھا جس کی رپورٹ کی بنا پر محکمہ مذکور نے فیصلہ کیا کہ علاج کی غرض سے محسن بھوپالی کا لندن جانا ضروری ہے۔ اگست ۱۹۸۹ء میں وفاقی محکمہ صحت نے مجاز اتھارٹی کی منظوری سے اکادمی ادبیات کو ہدایت کی کہ وہ محسن بھوپالی کے علاج اور اخراجات سفر کے لیے رقم فراہم کرے۔ اکادمی ادبیات نے ساڑھے تین ماہ تک اس سلسلے میں کوئی کارروائی نہیں کی۔ بار بار کی یاد دہانیوں کے بعد اکادمی نے کوئی مثبت قدم اٹھانے کی بجائے کام میں مزید تاخیر کی خاطر ۳۰ نومبر ۱۹۸۹ء کو محکمہ تعمیرات حکومت سندھ کے سکریٹری کے نام ایک خط لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ محسن بھوپالی چونکہ حکومت سندھ کے ملازم ہیں اس لیے ان کے علاج کی ذمہ داری حکومت سندھ کی ہے۔ اکادمی کی طرف سے یہ خط اکادمی کے چیرمین احمد فراز کے دستخط سے جاری ہوا تھا۔

اکادمی ادبیات کے پاس ادیبوں کے علاج کے لیے ایک بڑی رقم موجود ہے اس کے باوجود اکادمی کا رقم کی فراہمی کے لیے حکومت سندھ کو خط لکھنا ایک عجیب سی بات ہے۔ اس مسئلے کا انسانی پہلو یہ ہے کہ محسن بھوپالی کا مرض نہایت خطرناک ہے اس کے علاج میں تاخیر کسی بھی طرح مناسب نہیں۔ یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ علاج کے اخراجات کون ادا کرے، اصل اہمیت فوری علاج کی ہے۔ اکادمی نے پہلے تو ساڑھے تین ماہ تک خاموشی اختیار کی اور پھر وفاقی حکومت کی واضح ہدایات کو نظر انداز کرتے ہوئے حکومت سندھ کو خط لکھا جس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اکادمی کو ایک اہم شاعر کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ایسی صورت میں اکادمی کے وجود کا جواز کیا ہے۔

اس خط کے ساتھ متعدد دستاویزات کے عکس بھی ہیں جن سے خط کے مطالب کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ بات واقعی بہت افسوسناک ہے کہ محسن بھوپالی جو ہمارا قومی اثاثہ ہیں ان کے ساتھ بے رحمانہ اور مجرمانہ سلوک ہو رہا ہے۔ محسن صاحب کینسر کے مریض ہیں اور ان کی بیماری کی نوعیت ایسی ہے کہ علاج ... ذرا سی بھی تاخیر مریض کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ حیرت ہے کہ اکادمی ادبیات نے اس سلسلے میں اولاً کوئی کارروائی نہیں کی اور کی بھی تو معاملے کو مزید الجھانے کے لیے کی۔

تغافل سے جو باز آیا جفا کی   تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اکادمی ادبیات کی طرف سے حکومت سندھ کو جو خط لکھا گیا ہے، اس پر اکادمی کے چیرمین احمد فراز کے دستخط ہیں۔ ہمیں یقین نہیں آتا کہ گیارہ برس تک "مزاحمتی" ادب تخلیق کرنے والے احمد فراز اپنے ہی قبیلے کے ایک ممتاز فرد اور مزاحمتی ادب تخلیق کرنے والے شاعر کے علاج کے سلسلے میں "مزاحمتی" رویہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ اس موقع پر ہمیں اکادمی کے سابق چیرمین پریشان خٹک بہت یاد آرہے ہیں۔ ان کے زمانے میں جب کسی ادیب کے علاج و معالجے کا معاملہ در پیش ہوتا تھا تو وہ سب کام چھوڑ کر اس طرف توجہ کرتے تھے۔ محسن بھوپالی کا ۱۹۸۸ء میں جو آپریشن ہوا تھا اس کا بندوبست ان خٹک نے ہی انتظام کیا تھا۔ خٹک صاحب کا اصول یہ تھا کہ ایک ادیب کی جان بہت زیادہ قیمتی ہوتی ہے اس لیے ضابطے کی پابندی یا ضابطگی کی کارروائیوں میں وقت صرف کرنا ناقابل معافی جرم ہے۔ خٹک صاحب کے اسی قسم کے "عیبوں" کی وجہ سے موجودہ حکومت نے ادبیات کی سربراہی سے انہیں سبکدوش کر کے احمد فراز کو "گراں بار" کیا تھا مگر...... مگر ہم احمد فراز کے بارے میں مزید کچھ نہیں کہیں گے کیونکہ آج کل وہ خود زیر عتاب ہیں اور وزیر تعلیم غلام مصطفیٰ شاہ کے شاہانہ احکامات کے تحت اکادمی کی سربراہی سے برطرف کیے جا چکے ہیں۔ اس

سلسلے میں محسن بھوپالی کا کردار یہ ہے کہ انھوں نے احمد فراز کی برطرفی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ ہم بھی محسن بھوپالی کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے احمد فراز کی برطرفی کی مذمت کرتے ہیں۔ اس معاملے میں ہم غلام مصطفیٰ شاہ کو احتجاجی مراسلہ لکھنے والے تھے کہ معلوم ہوا موصوف اپنے علاج کے سلسلے میں سرکاری خرچ پر امریکہ روانہ ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سیاسی سودے بازیوں کے نتیجے میں وزیر بننے والے کی جان ایک شاعر کی جان سے زیادہ قیمتی ہے۔ ہم شاہ صاحب کی صحت و سلامتی کی دعا کرتے ہوئے امید رکھتے ہیں کہ ان کی غیر حاضری میں اکادمی ادبیات کو نیچی کا ایک آدھ کام کرنے کی فرصت مل جائے گی۔ یعنی محسن بھوپالی کو علاج کے لیے بیرون ملک بھجوا دیا جائے گا۔ دوسرا خط کراچی سے تسنیم ضیائی صاحبہ نے لکھا ہے۔ وہ فرماتی ہیں . . . . . . حکومت نے ادب کے نام پر یہ ادبی کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے اس کی وجہ سے ملک کے ادیبوں میں سخت بے چینی پائی جاتی ہے۔ اب تک لاکھوں روپیے کے ادبی انعامات ایسے لوگوں میں تقسیم کیے جا چکے ہیں جن کا ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ حکومت جس پسندیدہ شخص کو مالی فائدہ پہنچانا چاہتی ہے اس کے لیے انعام کا اعلان کر دیتی ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ یہ انعام شخص مذکور کی ادبی خدمات کے اعتراف میں دیا جا رہا ہے۔ ادب کے نام پر قومی خزانے کو لٹانا ادب اور قوم دونوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔

"علمی اداروں میں بھی ایسے لوگوں کا تقرر کیا جا رہا ہے جن میں ان اداروں کے مقاصد کو پورا کرنے کی اہلیت و صلاحیت نہیں ہے۔ جغرافیے کی ایک سند یافتہ خاتون کو ان کی سیاسی خدمات کے صلے میں تاریخ سے متعلق ایک قومی ادارے کا سربراہ بنا دیا گیا ہے۔ داغ دہلوی کے رنگ میں شعر کہنے والے ایک شاعر کی بیگم کی سیاسی خدمات کے صلے میں ان کے شوہر کو اقبال اکیڈمی کی سربراہی سونپ دی گئی ہے۔ نثری نظمیں لکھنے والی ایک شاعرہ کو اردو سائنس بورڈ پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ یہ تقرریاں خالصتاً سیاسی ہیں۔ علمی اداروں کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنا ایک خطرناک رویہ ہے۔ اس سے علم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔"

محترم مراسلہ نگار نے جن باتوں پر تشویش کا اظہار کیا ہے، ہمارے نزدیک وہ دلی اطمینان کا باعث ہیں۔ جس ملک میں "جمہوریت" کے نام پر کروڑوں روپیے صرف کر کے "عوامی نمائندوں" کے ضمیر خریدے جاتے ہیں وہاں چند لاکھ روپیے ادب کے نام پر ضائع کر دیے ہیں کوئی قباحت نہیں۔ اس سے کم از کم یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ ہماری حکومت ادب کی اہمیت سے واقف ہے اور وہ اس کے نام پر خرید و فروخت کا بازار گرم کر سکتی ہے۔

علمی اداروں کے معاملے میں بھی حکومت کا رویہ حقیقت پسندانہ ہے۔ تاریخ سے متعلق ادارے میں جغرافیہ داں خاتون کے تقرر پر اعتراض نامناسب ہے۔ تاریخ اور جغرافیے کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ جغرافیہ کے بغیر تاریخ وجود میں نہیں آسکتی۔ موجودہ برسر اقتدار پارٹی ملک کے جغرافیے میں کاٹ چھانٹ کر چکی ہے اب وہ تاریخ بھی از سر نو لکھوانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ کام وہی لوگ بہتر طور پر کر سکتے ہیں جو جغرافیے کی کاٹ چھانٹ کے اسباب سے واقف ہوں اور اس کا جائزہ پیش کرنے کی صلاحیت و استعداد رکھتے ہوں اس لیے ہماری رائے میں تاریخ کے ادارے کی سربراہی پر جغرافیہ داں خاتون کا تقرر تاریخ کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اقبال اکیڈمی کی سربراہی اگر کسی ایسے شاعر کو سونپی گئی ہے جو داغ کے رنگ میں شعر کہتا ہے تو یہ بھی حکومت کی دور اندیشی کا ثبوت ہے۔ تاریخ ادب میں داغ کا مرتبہ بہت بلند ہے وہ تو اپنے رنگ کے بہترین غزل گو ہی نہیں علامہ اقبال کے استاد بھی تھے۔ اس لیے اگر اقبال اکیڈمی کا سربراہ ایک ایسے شاعر کو بنایا گیا ہے جو داغ کے رنگ میں غزلیں کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت علامہ اقبال کی خدمات کے ساتھ ساتھ ان کے استاد کی خدمات کی بھی معترف ہے۔ اقبال کی خدمات کا اعتراف بہت ہو چکا۔ بہتر ہوگا کہ اب صرف داغ کی خدمات کا اعتراف کیا جائے اور اقبال اکیڈمی کا نام تبدیل کر کے داغ اکیڈمی . . . .

رکھ دیا جائے تاکہ اقبال کا نام داغ دار ہونے سے محفوظ ہو جائے ۔

ایک زمانے میں داغ کی غزلیں بہت مقبول تھیں۔ گوہر جان عرف چھپن چھری جیسی گانے والیوں کی وجہ سے کلام داغ بچے بچے کی زبان پر تھا۔ اقبال اکیڈیمی جب قانونی طور پر داغ اکیڈیمی بن جائے تو اسے چاہیے کہ کلام داغ کو دوبارہ مقبول بنانے کے لیے ٹھوس اقدامات کرے۔ مثلاً موجودہ دور کے ممتاز گلوکاروں کو اکیڈیمی میں بطور ریسرچ اسکالر ملازم رکھا جاسکتا ہے۔ جو محاورات داغ اور زبان داغ پر تحقیق کرسکیں۔ کلام داغ کی تدوین نو کا کام سازندوں وغیرہ سے لیا جاسکتا ہے۔ ادارے کے سربراہ سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ دفتری اوقات میں کلام داغ کی شرح اور فارغ اوقات میں کلام داغ کی پیروڈی لکھا کریں ۔

فاضل مراسلہ نگار کو اس پر بھی اعتراض ہے کہ نثری نظم لکھنے والی ایک شاعرہ کو اُردو سائنس بورڈ کا سربراہ کیوں بنایا گیا ہے۔ شاید مراسلہ نگار کو اس کا علم نہیں کہ اُردو سائنس بورڈ کا تعلق اردو سے ہے نہ سائنس سے اس لیے ہر وہ شخص اس کا سربراہ ہو سکتا ہے جسے اردو یا سائنس سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ جب اشفاق احمد اس بورڈ کے ڈائرکٹر تھے تو کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ اب کشور ناہید ڈائرکٹر ہوئی ہیں تو ہر شخص اعتراض کر رہا ہے۔ کشور ناہید بڑی باصلاحیت خاتون ہیں۔ اُردو سائنس بورڈ کیا چیز ہے وہ تو اس کی مستحق ہیں کہ انھیں اٹامک انرجی کمیشن کا سربراہ بنا دیا جائے ۔ موجودہ حکومت برسر اقتدار رہی تو انشاءاللہ ہم انھیں اس عہدے پر فائز دیکھ لیں گے ۔

ہماری ہر دلِ عزیز حکومت کسی فرد کی اہلیت و صلاحیت کا اندازہ کاغذی ڈگریوں سے نہیں کرتی بلکہ وہ یہ دیکھتی ہے کہ عملی طور پر کوئی شخص کہاں تک حکومت کے کام آسکتا ہے ۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ بعض نامور ادیبوں کو ان کی سیاسی خدمات کے پیش نظر ایسے اداروں سے منسلک کر دیا جائے جہاں انھیں اپنی صلاحیتوں کو بہتر طور پر استعمال کرنے کا موقع مل سکے۔ مثلاً احمد فراز کو نشتر میڈیکل کالج کا پرنسپل، ڈاکٹر انور سجاد کو زرعی یونیورسٹی کا وائس چانسلر اور حبیب جالب کو اسٹیٹ بینک کا گورنر بنا دیا جائے تو ان اداروں کی کارکردگی بہت بہتر ہو سکتی ہے ••

راغب مرادآبادی

تم کون؟

[راغب مرادآبادی کراچی کے نامور شاعر ہیں برجستہ و بدیہہ گوئی میں ماہر۔ امارات میں منعقدہ مزاحیہ مشاعروں کی نظامت ان ہی کے ذمہ تھی۔ یہ اشعار اسی موقع پر سنائے گئے]

غالب کے میں اشعار چراتا ہوں تو تم کون
اور نام سے راغب کے سناتا ہوں تو تم کون

ہیں ڈاکٹر اطہر سے مرے خاص مراسم
ہر سال امارات میں آتا ہوں تو تم کون

کیا ڈگڈگی بجوائی ہے میں نے کبھی تم سے؟
بندر میں سر راہ نچاتا ہوں تو تم کون

پاگل کے اشارے پہ بہ ایمائے ضیا آج
العین میں لوگوں کو ہنساتا ہوں تو تم کون

میں قوم کا لیڈر ہوں، مجھے قوم کا غم ہے
پیتا نہیں خود بھنگ، پلاتا ہوں تو تم کون

العین میں بھی زندہ دلی کی ہے ضرورت
میں پھول ظرافت کے کھلاتا ہوں تو تم کون

رس گھولتی ہے کانوں میں آواز اسی کی
بلبل کو انگوٹھے پہ بٹھاتا ہوں تو تم کون

اس بزم میں ہیں جلوہ فگن خواہ مخواہ آج
اشعار کی داد ان سے میں پاتا ہوں تو تم کون

بمبارے و حمایت ہوں کہ وہ خالد و ساغر
نام ان کے میں اشعار میں لاتا ہوں تو تم کون

اطہر بھی ہیں اور شاہ بھی شیریں سخنوں میں
میں تازہ کھجور ان کو کھلاتا ہوں تو تم کون

ہے سب سے جدا رنگ علی بیگ کا یارو
میں تالیاں خوش ہو کے بجاتا ہوں تو تم کون

بے شبہ دلاور ہیں شہنشاہِ ظرافت
میں ناز اگر ان کے اٹھاتا ہوں تو تم کون

محفل میں، ہلال اور ہیں خالد بھی تو موجود
قدر ان کی سر بزم بڑھاتا ہوں تو تم کون

جاوید ہوں، شاہد ہوں کہ وہ سعدیہ حسنی ہوں
میں ان کو محبت سے بلاتا ہوں تو تم کون

مہمانِ خصوصی ہیں ضمیرِ سخن آرا
ان کے لیے مسند کو سجاتا ہوں تو تم کون

(رپورتاژ)

غلام نجم الدین
(عرب متحدہ امارات - دبئی)

دوسرا
بین الاقوامی مشاعرۂ زندہ دلان
دبئی

آرٹس پروموشن بیورو کے منتظم اعلیٰ جناب ڈاکٹر اطہر زیدی محتاج تعارف نہیں، آپ کی کاوشوں اور اردو دوستی کا سچا جذبہ ہی ہے کہ دوسرا بین الاقوامی مشاعرۂ زندہ دلان بڑے ہی تزک و احتشام کے ساتھ دبئی میں بہ اعزاز سید ضمیر جعفری منعقد ہوا۔

امارت کی ایک اور ہر دلعزیز شخصیت جناب سلیم جعفری کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اہلیانِ دبئی کو عظیم الشان مشاعروں اور بلند پایہ شعرائے کرام سے متعارف کروانے کا سہرا آپ کے سر ہے۔ موصوف اب تک کئی ادبی، سماجی، ثقافتی نشستوں، محفلوں اور عالمی مشاعروں کا انعقاد کر کے کئی شعرائے کرام کو ہدیۂ عقیدت پیش کر چکے ہیں۔

اپنی طرز کا منفرد طنز و مزاح سے بھرپور دوسرا بین الاقوامی مشاعرۂ زندہ دلان ۸ مارچ ۱۹۹۰ء کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر ہال کے سنہرے روپہلے جگمگاتے ماحول میں برپا ہوا۔ ڈاکٹر اطہر زیدی نے مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور یہ شعر سنایا:

تری رحمتوں پہ ہے منحصر مرے ہر عمل کی قبولیت
نہ مجھے سلیقۂ بندگی نہ مجھے شعورِ نماز ہے

مشاعرۂ زندہ دلاں کی تحریک دراصل حیدرآباد دکن سے شروع ہوئی۔ زندہ دلانِ حیدرآباد نے طنز و مزاح کے ادب کو اس کا حقیقی درجہ دلا کر آج سنجیدہ ادب کے ہم رکاب کر دیا۔ طنز و مزاح کی یہ روایت دکن سے دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی اور اس کی لطافت و چاشنی ہی تھی کہ ہر صاحبِ ذوق نے خوب پذیرائی کی جس کا کھلا ثبوت یہاں آپ تمام حضرات کا اس کثیر تعداد میں جمع ہونا ہی ہے۔

اس مشاعرے کی صدارت کے لیے جناب سید خلیل صاحب، چیف ایگزیکیٹو گلدار یمرا ہد کمپنی کو زحمت دی گئی۔ میر مشاعرہ جناب ضمیر جعفری صاحب نے یکے بعد دیگرے تمام شعرائے کرام کو تالیوں کی گونج میں اسٹیج پر رونق افروز ہونے کی دعوت دی۔ مشاعرے کی نظامت کی ذمہ داری جناب راغب مرادآبادی کے کاندھے پر رکھی گئی اور مشاعرے کا باقاعدہ آغاز جناب دلاور فگار نے غالب کی ایک نعت پڑھ کر کیا۔ فارسی نعت کے اشعار کچھ یوں تھے:

قرآنِ پاک اضافۂ شانِ محمدؐ است
نامِ خدا ثبوتِ نشانِ محمدؐ است

گویا زبانِ حق بہ دہانِ محمد است حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمد است
کافی است یک اشارۂ آقا غلام را عبرت بگیر و پختہ کنید ایمانِ خام را

نعت کے بعد لندن سے تشریف لائے ہوئے مہمان شاعر و مصنف جناب شاہ صاحب کو دعوتِ کلام دی گئی۔

ان کی ہر ایک بات میں شامل لگتا ہے مجھ کو میرا دل بھی قاتل لگتا ہے
اس نے جاتے جاتے بس اتنا کہا عمر بھر کا رونا، مشکل لگتا ہے

اس کے بعد آواز دی گئی دکن کے جناب صبغۃ اللہ بمباٹ کو:

موصوف کے تخلص "بمباٹ" کے اعلان سے ہی محفل لالہ زار ہو گئی، بہت کامیاب چوٹے لگائے، خاص کر مرحوم اکبر الہ آبادی کی رباعی سے متاثر ہو کر جو چوٹا پیش کیا وہ خوب سراہا گیا:

ترکاری پیاز کیوں فروشوں سے بھاؤ تاؤ وہ باتوں ہی میں پھولوں کا گجرا چکا لیا
ہنس ہنس کے سب کو جلوہ کی سوغات بانٹی مگر شوہر کو آتا دیکھا تو پردہ گرا لیا

لوگ مرتے کھا گئے اپنی کڑی باسی رہی پی گئے پانی بھی پتھر اور زمیں پیاسی رہی
اس میں خوش حالی کی ایسی گلاٹیاں کھائیں سر گرنہ بیٹیڈ ہو گیا تقدیر چپراسی رہی

جناب انعام الحق جاوید صاحب:

گھر پہ آکے اترے ہیں مہمان خدا خیر کرے سخت مشکل میں ہے اب جان خدا خیر کرے
صرف مہمان جو ہوتے تو کوئی بات بھی تھی ہاتھ میں ان کے ہے دیوان خدا خیر کرے

آؤ پھر تیری خاطر اسے بیگم فارم بیمے کا بھر رہا ہوں میں
گولڈن چانس ہے تمہارے لیے تیسری بار مر رہا ہوں میں

دعوتِ سخن دی گئی حیدرآباد سے آئے ہوئے مہمان شاعر جناب حمایت اللہ کو، موصوف نے خالص دکنی زبان میں اپنا کلام پیش کر کے اس قدر دادِ تحسین حاصل کی کہ یوں لگتا تھا گویا قہقہوں کا بازار لگا ہے۔ دو ایک چوٹے ملاحظہ کیجیے:

تجھ کو ڈھونڈ کی قدر جیسے پو مت چھوڑو یہ دنیا چار دن کی ہے ہمیں اتنے پو مت بھولو
جو تم انگلینڈ میں مہنگے تو دربند یو کا ٹیکو بل کئے کریگا دراز رٹی اللہ تمہارے کو یہ مت بھولو

ہو رشد تے نماز پڑھے کس کے واسطے دنیا کے واسطے پڑھے مطلب کے واسطے
اللہ کے واسطے پڑھو لے تو کیا جی تم جو عمل کے واسطے پڑھے جنت کے واسطے

مرشد مجھے تو بھوت ہی بھوت نفع میں ہیں   یاں چار بیویاں ہیں واں حوراں نفع میں ہیں

ڈاکٹر صاحب میرے بازو کا آدمی کہاں گیا   آپریشن تھا سُنا 'کیا آپریشن ہو گیا
آپریشن بھوت محنت سے کرے اس کا ہمیں   آپریشن کامیاب ہی تھا مگر آن مر گیا
کل تمھارا آپریشن ہے تم تیار رہو   اتنا سُننا تھا کہ پیشنٹ سانس بھی بھول گیا

حمایت اللہ کے بعد مصطفیٰ علی بیگ کو زحمتِ کلام دی گئی: موصوف اپنا ایک جداگانہ انداز رکھتے ہیں۔ انگریزی الفاظ کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ دل جھوم اٹھتا ہے۔ آئیے ان کا یہ انداز دیکھیں:

محبت میں اگر پیدا ہو ٹینشن   تو اکثر ٹوٹ جاتا ہے کنکشن
ادھر ہیٹر کے جیسا عشق میرا   ادھر جذبات کا ریفریجریشن
گدھا کہہ لیجیے آئی ڈونٹ مائنڈ اٹ   مگر ظاہر نہ ہو اپنا ریلیشن
کریشن کرنے والے کر رہے ہیں   پر اسے نام ہے اینٹی کرپشن

سگِ لیلیٰ کی شہرت تو بہت ہے
مگر وہ ہاؤنڈ تھا یا آلسیشن

میزبان شاعر ڈاکٹر زبیر فاروق صاحب:

تقدیر تو ہے میری مانا کہ مگر اس پر، دو اشک تو بہانے دو۔ اب اتنا تو کرنے دو!
پینے سے تمھیں اتنی نفرت تو اب نہیں ہے، اگر ساقی کو تو بلانے دو۔ اب اتنا تو کرنے دو!
تصویر میں ہے وہ بھی کیوں تم نے برا جانا، کچھ نام تو کرنے دو۔ اب اتنا تو کرنے دو!
اُس گھر میں جو کھلتی ہے رکھوں گا وہ بند کھڑکی، پردہ تو ہٹانے دو۔ اب اتنا تو کرنے دو!

دعوت دی گئی خاتون شاعرہ محترمہ سعدیہ حریم کو جو پاکستان سے تشریف لائی تھیں:

لے کے شادی کا وہ ارمان چلا جاتا ہے   ملک سے بے سروسامان چلا جاتا ہے
میری ہر بات پہ اُلٹا وہ عمل کرتا ہے   کبھی لاہور تو ملتان چلا جاتا ہے

غزل کے چند اشعار

اُٹھایا جب سے عورت نے نقاب آہستہ آہستہ
پڑی مردوں کی شکلوں پر نقاب آہستہ آہستہ
نوٹ کے پرزے ان کے جائیے کچھ دن کی رونق ہے
کھلا دے گا بیگم کا عتاب آہستہ آہستہ

نئی شادی ہے اتنا رعب تم شوہر پہ مت ڈالو
چھری کو تیز کرتے ہیں جناب آہستہ آہستہ
وہ جوتے گانٹھتے تھے کل تلک بستی کے نکڑ پر
جو بن بیٹھے ہیں اب جدی نواب آہستہ آہستہ
ابھی تو کہہ رہے ہیں ان کو بیوی سے محبت ہے
ملے گا زن مریدی کا خطاب آہستہ آہستہ

ذرا دل تھام کے بیٹھیں مری باری آئی۔ جناب خوش خواہ مخواہ صاحب کو زحمتِ کلام دی گئی۔ یہ سمجھیں کہ ہنسی کے قہقہوں کا بم پھٹ پڑا۔ میری نظر میں وَن آف دی مشاعرہ ہیں۔ کلام دکھنی اور انداز دل کو چھو لینے والا۔ مشاعرہ لوٹنے کا کمال حاصل ہے۔ موصوف کا تعلق حیدرآباد دکن سے ہونے کے سبب اپنے کلام کو دکھنی محاورے سے خوب سجاتے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

[illegible]ل سہانے بنے رہیں کچھ بھی نئیں ہے کیا بھی نئیں ہے
لوگاں ہنس رہیں اور خوش ہوئیں کچھ بھی نئیں ہے کیا بھی نئیں ہے

[illegible] پہلے سوگئے تو کتے اچھے خواب آتے تھے
اب شادی کر کو پچھتاریں، کچھ بھی نئیں ہے کیا بھی نئیں ہے

[illegible] گئی انگلاں میں جل کو میری جوانی راکھ ہوگئی ہے
کائیکو ہے سو، راکھ اڑا ریں کچھ بھی نئیں ہے کیا بھی نئیں ہے

ان سے جب بولا میں، دیکھو دل میں کیسی آگ لگی ہے
میرے دل میں جھانک کو بولیں، کچھ بھی نئیں ہے کیا بھی نئیں

میٹھے میٹھے جی کیسا کی ہورا بول کو، اللہ یا اللہ کر کو
خود ہی پھر شرما کو بولیں، کچھ بھی نئیں ہے کیا بھی نئیں ہے

دل کے ارماں پورے ہوئیں گے بول کر میں کتا کی خوش تھا
دیدہ مکیہ ان دیکھ کو بولے، کچھ بھی نئیں ہے کیا بھی نئیں ہے

شاعر کو تعریفاں نکو اس کے گھر میں جھانک کو دیکھو
جورو بچے بھوکے مرریں، کچھ بھی نئیں ہے کیا بھی نئیں ہے

حیدرآباد میں کیا کچھ نئیں ہے خوامخواہ واپس آجاؤ
واں دوبئی میں کیا ڈھونڈ لا ریں، کچھ بھی نئیں ہے کیا بھی نئیں

سامعین کے زبردست اصرار پر موصوف کو دوبارہ زحمتِ کلام دی گئی ان کی دوسری غزل کے اشعار:

دیکھو کتا سمجھا روں نئیں بولے تو سنتے نئیں
اپنی من مانی تم کرریں نئیں بولے تو سنتے نئیں

میرے گھر رکھو باواں اماں باوا کے کرتیں
یاں کا لکھا کر واں کا گا ریں نئیں بولے تو سنتے نئیں

کراچی سے جناب خالد عرفان صاحب:

جو سے کار وہ بیوی نئی امپورٹ کرتے ہیں
اگرچہ اس بکھیڑے میں بھی کم پیسا نہیں لگتا

کہا اک شخص نے امپورٹڈ بیوی کے بارے میں
یہ وہ دولت ہے جس کا پوسٹ پہ کسٹم نہیں لگتا

جناب خلیل صاحب کو دعوتِ سخن دی گئی:

عقل میں آتی ہے وسعت تن سکڑ جانے کے بعد
منزلِ پیری کی جانب عمر بڑھ جانے کے بعد

تحریہ کنگھی ہے جس سے بال سلجھاتے ہیں لوگ
یہ ملتی ہے سر کے بال اڑ جانے کے بعد

پاکستان کے جناب ضیاء الحق قاسمی صاحب :

کوئی گاہک لوٹ جائے یہ تو ممکن ہی نہیں
میں نے حاصل کرلیا ہے سیل مینی میں کمال

جناب راغب مرادآبادی بآوازِ خود سخن در ہوئے :

ناخن جو کترنے کی تھی شوہر کو وہ عادت — بیگم نے فقط حسنِ تدبّر سے چھڑا دی
ممی نے پڑوسن سے جو پوچھا کہ وہ کیسے؟ — اٹھلا کے کہا میں نے بتیسی ہی چھپا دی

جناب ساغر خیامی صاحب کو دعوتِ کلام دی گئی اور یہ بھی اعلان کیا گیا کہ آئندہ سال زندہ دلانِ بمبئی کا مشاعرہ ساغر خیامی کے اعزاز میں کے اعزاز میں منعقد ہوگا :

بولا دکان دار کہ کیا چاہیے تمھیں — جو بھی کہو گے میری دکاں پر وہ پاؤ گے
میں نے کہا کہ کتے کے کھانے کا کیک ہے — بولا یہیں پہ کھاؤ گے یا لے کے جاؤ گے

جناب پاگل عادل آبادی کو آواز دی گئی پچھلے سال ان کے ایک شعر میں سیکو گھڑی کا ذکر تھا جس سے سیکو گھڑی کی خوب پبلسٹی ہوئی ۔ وہ شعر یہ تھا :

ہاتھ پر جن کے ہے گھڑی سیکو — وہ نہیں جانتے بجا کیا ہے

اس مناسبت سے [illegible] صاحب منیجنگ ڈائرکٹر العظیم کمپنی (سیکو کے ڈیلر) نے موصوف کو ایک گھڑی سیکو نذر کی۔ آئیے ان کا کچھ کلام دیکھیں :

ادھر تو شہر کے گنجے میری تلاش میں ہیں — ادھر تمام لفنگے میری تلاش میں ہیں
میں جس کے واسطے جوتے چرا کے چل گیا — وہ لے کے ہاتھ میں جوتے میری تلاش میں ہیں

پتے کی بات جو منہ سے نکل گئی پاگل
سنا ہے شہر کے پگلے مری تلاش میں ہیں

اسلام آباد کے جناب سرفراز شاہد صاحب :

کل شام کلفٹن پہ کہا مجھ سے خضر نے — اک شوخ سے جوڑے کی طرف کرکے اشارا
ہو مرد کے ہمراہ اگر اک بتِ کافر — اس مرد کی پہچان کا یہ گر ہے ہمارا
اکڑی ہوئی گردن ہو اگر مرد کی سمجھو — اس شوخ کا عاشق ہے وہ خوش بخت کنوارا
گر جھینپ کے چلتا ہے نگاہوں کو جھکائے — سمجھو کہ وہ لڑکی کا برادر ہے بچارا
لیکن جو نظر آئے تمھیں خستہ و بیزار — سمجھو کہ وہ خاوند ہے تقدیر کا مارا

لندن کے جناب اظہر راز صاحب ۔۔۔

بزمِ ادب میں اب وہ زمانہ بھی آئے گا
شاعر غریب ساتھ میں طبلہ بھی لائے گا

جناب دلاور فگار صاحب کو زحمتِ کلام دی گئی ۔

امریکہ شعر پڑھنے گئے تھے ہمارے دوست خود داددے کے آ گئے سامان رہ گیا
ہم ایک دوسرے کو بتاتے ہیں دہریہ یوں ہے تو ایک میں ہی مسلمان رہ گیا
بدقسمتی ہے ہم ہیں سوار اُس جہاز پر ساحل پہ جس جہاز کا کپتان رہ گیا

ڈاکٹر بشیر بدر کی غزل کے ایک شعر،

یہ پھول کوئی مجھ کو وراثت میں ملے ہیں
تم نے مرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

کی زمین پر چند اشعار:

وہ شخص کبھی جس نے مرا گھر نہیں دیکھا اُس شخص کو میں نے کبھی گھر پہ نہیں دیکھا
داڑھی ترے چہرے پہ نہیں ہے تو عجب کیا یاروں نے ترے پیٹ کے اندر نہیں دیکھا
تفریح یہ ہوتی ہے کہ ہم سیر کی خاطر ساحل پہ گئے اور سمندر نہیں دیکھا
اوروں کی بیاض اس کو بری لگتی ہے لیکن استاد نے خود اپنا رجسٹر نہیں دیکھا

جناب ضمیر جعفری کو زحمتِ کلام دی گئی جن کے اعزاز میں یہ مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ ضمیر صاحب نے سب سے پہلے اس اعزاز پر تشکر کا اظہار کیا اور پھر اپنا کلام پیش کیا۔ چند منتخب شعر دیکھیے ۔

ذکرِ خدا بھی کرے ضمیر اور پریوں پہ بھی مرے ضمیر
ہر منزل آوازیں دے، ارے ضمیر ارے ضمیر

ربط تازہ ہر ایک چہرے ہر ایک منظر کے ساتھ میں بڑھاپے کو نباہوں گا کیلنڈر کے ساتھ

منشی کا بھی افسر ہو تو افسر ہے، پھوس کا بھی ہو بستر آخر بستر ہے
دل میں ایک چنگاری تو سُلگائے رکھو، بوڑھا ہونا مرنے سے تو بہتر ہے

واعظ، امام مسجد کا کتنا جارحانہ ہے خانۂ خدا گویا کوئی توپ خانہ ہے

کبھی ہم سال میں ایک مجلسِ اقبال کرتے ہیں پھر اس کے بعد جو کرتے ہیں وہ قوال کرتے ہیں

فتنہ نہیں، ٹھٹھا نہیں، تکرار نہیں
اس شہر میں شاید کوئی اخبار نہیں

میری بیوی قبر میں لیٹی ہے جس ہنگام سے
میں بھی ہوں آرام سے اور وہ بھی ہے آرام سے

ضلع جہلم میں پاکستانی سرکار نے ایک سڑک کا نام آپ کے نام سے منسوب کیا تو شکریے کے جو اشعار لکھے وہ یوں ہیں:-

شکریہ جہلم کی ضلعی کونسل کا شکریہ
رکھ دیا ہے ایک سڑک کا نام میرے نام پر
جن سکوں گاہوں میں پھیلا ہے مرا بے چین ضمیر
دل میں ان کی یاد شیریں آج تک رکھتا ہوں میں
یوں لیا کرتی ہے میری خانہ بدوشی سے خراج
گھر تو میں رکھتا نہیں لیکن سڑک رکھتا ہوں میں

یہ مشاعرہ تقریباً نصف شب کے بعد اختتام کو پہنچا۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد : ۲۳

شمارہ : ۶

جون ۱۹۹۰ء

ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

سرورق ۔ سعادت علی خاں

کتابت : محمد غالب ۔ محمود سلیم اور محمد مجاہد

فی پرچہ : ۵ روپے

زرِ سالانہ : ۵۵ روپے

لائبریریوں سے : ۶۰ روپے، بیرونی ممالک سے : ۱۸۰ روپے

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد ۔ ۲

ترسیلِ زر اور خط و کتابت

شگوفہ ۳۱ [illegible] مارکٹ حیدرآباد ۔ ۱ فون آفس : [illegible] فون رہائش : 5 .1064

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

کپورستان (بہ یادِ کنہیا لال کپور)

ہوائی گولیاں (سفر نامۂ امریکہ)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

مالِ مفت (انشائیے)

بال کی کھال (تبصرہ)

چوران (منظومات)

کنہیا لال کپور

ہمارا کانووکیشن ایڈریس

کانووکیشن کا موسم تھا۔ ہر کالج میں کانووکیشن ہو رہی تھی۔ جہاں کوئی وزیر، وائس چانسلر یا ماہرِ تعلیم کانووکیشن ایڈریس پڑھ رہا تھا۔ قریب قریب ہر کانووکیشن ایڈریس کاربن کاپی محسوس ہوتا تھا۔ ہم ایک روز سوچ رہے تھے۔ اگر ہمیں کانووکیشن ایڈریس پڑھنے کے لیے کہا جائے تو ہم کیا کہیں گے ۔۔۔ اتنے میں کال بیل زور سے بجی۔ معلوم ہوا ہمارے دوست پرنسپل نارنگ صاحب تشریف لائے۔ انھیں دیکھتے ہی ہمارا ماتھا ٹھنکا کیوں کہ وہ جب بھی آتے ہیں کسی نہ کسی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ دو ایک منٹ رسمی باتیں کرنے کے بعد انھوں نے فرمایا: کانووکیشن ایڈریس پڑھنے کے لیے کوئی کام کا آدمی نہیں مل رہا۔ ہم نے سوچا کہ اگر کسی ایسے ویسے شخص نے یہ فرض انجام دینا ہے تو کیوں نہ آپ کو موقع دیا جائے کیوں کہ بہکی بہکی باتیں کرنے میں آپ کا جواب نہیں۔ اس لیے آپ ۔۔۔۔۔۔ "لیکن نارنگ صاحب!" ہم نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا، "ہمیں کانووکیشن پڑھنے کا کوئی تجربہ نہیں"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ ہمارے طلبا آپ کو ایک آدھ منٹ سننے کے بعد آپس میں باتیں کرنے لگیں گے۔ اور آپ ان کی اس بدتمیزی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جو بھی جی میں آئے کہہ سکیں گے۔ اس لیے دن اور وقت نوٹ کر لیجیے۔ ۱۵ تاریخ صبح کے دس بجے اور مجھے اب رخصت ہونے کی اجازت دیجیے۔" ہمارے احتجاج کے باوجود کسی طرح ہمیں معاف کرنے کو رضامند نہ ہوئے اور مجبوراً ہم نے حامی بھر لی کہ ہم کانووکیشن ایڈریس پڑھیں گے۔

ہم نے ایک بزرگ سے جو پچاس سے زیادہ کانووکیشن پڑھ چکے تھے مشورہ کیا کہ ہمیں کیا کہنا چاہیے ۔ انھوں نے کہا: "مبادا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سب سے پہلے پرنسپل صاحب کا شکریہ ادا کرنا کہ اس نے آپ جیسے نااہل۔ جاہل اور بے علم کو ایڈریس پڑھنے کا اعزاز بخشا۔ اس کے بعد پرنسپل صاحب کی شان میں ایک قصیدۂ مدحیہ پڑھنا کہ ان جیسا قابل اور لائق شخص آج تک پیدا نہیں ہوا۔ بعدازاں ملک کی حالتِ زار پر چند مصنوعی آنسو بہانا۔ بھرّائی ہوئی آواز میں کہنا: خدا جانے اس ملک کا کیا بنے گا پھر سامعین کو ڈرانے کے لیے کہنا: مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ہم سب بڑی تیزی کے ساتھ جہنم میں جا رہے ہیں۔ پھر ایک آدھ پیشین گوئی کرنا کہ اگر فلاں تاریخ تک ہمارے فلاں فلاں لیڈر پرماتما کو پیارے نہ ہو گئے تو ہماری مصیبتوں کا کبھی خاتمہ نہیں ہوگا اگر اب بھی سامعین ہوش میں رہے تو انھیں چند عامیانہ قسم کے مشورے دینا: جیسے وہ شخص خوش نصیب ہے جو بھوکا اور ننگا رہنے کے باوجود خوش رہتا ہے۔ زندہ قومیں کبھی بھیک نہیں مانگا کرتیں۔ یہی وجہ ہے اکثر ختم ہو جاتی ہیں۔ بد اچھا بدنام بُرا ہوتا ہے اس لیے آدمی کو بد ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ کبھی مٹی کا نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ وہ تو آج کل ملتا

، کی نہیں ہماری بات کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے ، اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے ۔ کیوں کہ کئی بار وہ بیٹھنے کا ارادہ ہی ترک کر دیتا ہے ۔ آخر میں آپ طلبا کا شکریہ ادا کر سکتے ہیں کہ گو انھوں نے آپ کے ایڈریس کا ایک لفظ نہیں سنا پھر بھی یہ بڑی بات ہے کہ وہ ہال میں بیٹھے رہے ۔

ہمیں بزرگ کا مشورہ پسند نہیں آیا ۔ یہ تو ہمارے خیال میں دوسروں کے علاوہ اپنے آپ کو دھوکا دینے کے مترادف ہوا ہم نے فیصلہ کیا کہ اپنے ایڈریس میں صرف ایسی باتیں شامل کریں گے جو صداقت پر مبنی ہیں اور بات کا خواہ مخواہ بتنگڑ بنانے سے گریز کریں گے تاکہ سامعین کو یہ شکایت کرنے کا موقع نہ ملے :

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانے میں

چناں چہ جو کانوکیشن ایڈریس ہم نے پڑھا اس کے چند اقتباسات مندرجہ ذیل ہیں :

" ہمیں کانوکیشن ایڈریس پڑھنے کی جو زحمت دی گئی ہے ، اس کا شکوہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن شکریہ کسی حالت میں ادا نہیں کیا جا سکتا ۔ معلوم ہوتا ہے پرنسپل صاحب ضرورت سے زیادہ آرام طلب واقع ہوئے ہیں ورنہ اگر وہ تھوڑی سی کوشش کرتے ، انھیں ہم سے بہتر مقرر مل سکتا تھا ۔ جہاں تک ہمیں یاد ہے ہم نے کبھی ان سے درخواست نہیں کی کہ ہمیں کانوکیشن ایڈریس جیسی فضول چیز پڑھنے کے لیے کہا جائے ۔ بہر حال گلے پڑا ڈھول بجانا ہی پڑتا ہے ۔ اس لیے ہم حاضر ہو گئے ۔ ہم شروع میں ہی یہ بات صاف کر دینا چاہتے ہیں کہ اس ایڈریس میں ایسی کوئی بات نہیں ہوگی جسے آپ پہلے نہیں جانتے ۔ اس کے دوران اگر آپ اونگھنے لگیں یا خراٹے لینے لگیں آپ کو کوئی نقصان یا خسارہ نہیں ہوگا ۔"

مجھے اس بات سے کوئی خوشی نہیں آپ کو آج ڈگریاں مل رہی ہیں ۔ میں آپ کے چہروں سے بخوبی اندازہ لگا سکتا ہوں ۔ آپ کو خوشی کی بجائے رنج کا احساس ہو رہا ہے ۔ اگر یہ بات نہ ہوتی آپ یوں منہ لٹکائے ہوئے نہ بیٹھتے ۔ اگر کسی مجبوری کی وجہ سے ہنس نہ سکتے ، کم از کم زیر لب مسکراتے ۔ مگر آپ تو اتنے غم زدہ نظر آ رہے ہیں جیسے کسی ایسے عزیز کی عیادت کو آئے ہیں جو بستر مرگ پر پڑا ہوا ہے ۔"

[illegible] آپ کو میرا مشورہ نہیں دوں گا کہ ان ڈگریوں پر شہد لگا کر چاٹیں ۔ اول تو شہد بہت مہنگا ہو گیا ہے دوسرے خالص [illegible] چاٹ دیکھیں گے آپ کو محسوس ہوگا آپ شہد کی بجائے شیرہ چاٹ رہے ہیں ۔"

" [illegible] ہیں ۔ ڈگریاں تو مل گئیں لیکن ملازمتیں کیسے ملیں گی جب آپ کسی بھی وزیر کے قریبی [illegible] ہے لیکن آپ اپنی سرکار پر اعتماد رکھیے اس لیے کہ اس نے بے روزگاری کا مسئلہ [illegible] ہے ۔ اگر آپ دس سال میں کچھ کھائے پیے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں ۔ آپ کو خواہ مخواہ فکر [illegible] دس سال تک انتظار کیجیے اور انتظار کے علاوہ یہ دعا کیجیے کہ ہماری موجودہ سرکار کم از کم دس [illegible]

[illegible] ہمارے ملک میں دی جا رہی ہے اس کا کیا فائدہ ہے ۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس

تعلیم کا واحد مقصد طلبا کو اچھے شہری بنانا ہے۔ یہ نہایت خوبصورت اچھی بات ہے لیکن لیکچر سے اچھا شہری صرف "ہمانچہ" تو زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسے روٹی کپڑا اور مکان بھی چاہیے۔ جب تک یہ تینوں چیزیں نہ ملیں، وہ باغی تو بن سکتا ہے اچھا شہری نہیں رہ سکتا!

آپ کے والدین کی حالت آپ سے بھی زیادہ قابلِ رحم ہے، جو کچھ اُن کے پاس تھا وہ انھوں نے آپ کی تعلیم پر خرچ کر دیا بلکہ اگر یہ کہا جائے انھوں نے اپنا پیٹ کاٹ کر اعلیٰ تعلیم دلائی۔ اس میں رتی بھر بھی مبالغہ نہ ہوگا۔ آپ ڈگری حاصل کرنے کے بعد جب آپ کو ملازمت نہیں ملے گی آپ اپنے والدین کے لیے ناقابلِ برداشت بوجھ ثابت ہوں گے۔ اور وہ محسوس کریں گے۔ کاش جتنا روپیہ ان کی تعلیم پر ضائع کیا ہے اس سے انھیں چاٹ کی دُکان کھلوا دی ہوتی۔!"

اس تعلیم کا آپ کو سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ آپ نازک بدن اور نازک مزاج بن گئے ہیں۔ آپ کو ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس کے لیے جسمانی مشقت کی ضرورت ہو۔ آپ کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ (ٹریجڈی) یہ ہے۔ جس قسم کا کام آپ کرنا چاہتے ہیں وہ آپ کو ملتا نہیں اور جس قسم کا ملتا ہے آپ کرنا نہیں چاہتے۔

بہر حال آپ مجھے اپنے پرنسپل یا اپنے آپ کو کوسنے کی بجائے ہمارے ان لیڈروں کو کوسیے جنھوں نے ملک آزاد ہونے کے بعد بھی انگریزوں کے زمانے کے اس فرسودہ تعلیمی سسٹم کو جاری رکھا۔ اب دعا کیجیے کہ خدا تعالیٰ انھیں بہتر سسٹم کو رائج کرنے کی ترغیب دے تاکہ کم از کم آنے والی نسلیں؟

"شاید کپور واحد طنز نگار تھا جس نے اردو زبان کو بھی اپنا موضوع بنایا صرف اپنی کتاب "نرم و گرم" کا انتساب ہی اس کے نام نہیں کیا بلکہ "برج بانو" ایسا لازوال مضمون بھی لکھ گیا تھا۔ یہ مضمون اس کتاب "نوک نشتر" کا پہلا مضمون ہے۔ میں نے اسے کئی بار پڑھا ہے اس کو طنزیہ و مزاحیہ قسم کے مضامین کے خانے میں بند نہیں کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ یہ ایک اردو بیوی کا نوحہ ہے گر درد آمیز ایک طنز ہے مرہم بلکہ ایک چیخ ہے گر دل کو ہلا دینے والی خاموشی بھی رکھتا ہے۔ "برج بانو" آج بھی بے وطن ہے اور دربدر پھرا رہی ہے۔ کپور کو اردو سے اتنی گہری محبت تھی اس کا اندازہ اس مضمون کو بار بار پڑھنے سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ بے شک پطرس اور رشید احمد صدیقی بھی اردو سے بے پناہ محبت کرتے تھے گر وہ اس کی تباہ حالی پر اس طرح نوحہ کناں نہیں ہو سکے۔ کپور کا یہ مضمون آج بھی سخت سے سخت دل انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ واقعی ہندوستان کی تاریخ میں ہندو مسلم فسادات کے علاوہ بھی بہت سے مظالم ہوئے ہیں اور ان کا نشان اردو زبان وہی ہے اور کپور کے یہ جملے پتھر پر لکیر کی طرح ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ (شاید)

باقر مہدی ــــــ شگوفہ کپور نمبر ــ جنوری ۱۹۸۱ء)

کنہیالال کپور

کیا آپ ایک اچھے شوہر ہیں

اگر آپ سے سوال کیا جائے "کیا آپ ایک اچھے شوہر ہیں؟" آپ بڑے وثوق کے ساتھ جواب دیں گے: جی ہاں! بھلا اس میں بھی کوئی شک کی بات ہے۔" اور اگر آپ سے دوبارہ پوچھا جائے۔ آپ اپنے آپ کو ایک اچھا شوہر کیسے سمجھتے ہیں! آپ شاید کہیں گے "مجھے میری بیوی پچھلے پندرہ سال سے برداشت کر رہی ہے۔ ظاہر ہے اگر میں ایک اچھا شوہر نہ ہوتا۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلی جاتی۔" ہماری رائے میں آپ کا جواب آپ کی بیوی کے مزاج پر روشنی ڈالتا ہے۔ کیوں کہ یہ ثابت کرتا ہے۔ آپ کی بیوی بڑی صابر اور شاکر واقع ہوئی ہے جس نے آپ جیسے شوہر کو پندرہ برس برداشت کر لیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے، اس میں کچھ نقائص ہوں جن سے وہ پوری طرح آگاہ ہو اور اس لیے اس نے آپ کے نقائص کو نظر انداز کر دیا ہو۔ ایک نوجوان نے ہنی مون منانے کے دوران اپنی بیوی سے کہا "اب جب کہ ہماری شادی ہو گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں تمھیں تمہارے نقائص سے آگاہ کر دوں۔" بیوی نے جواب دیا تھا: "میں اپنے نقائص سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اگر مجھ میں وہ نہ ہوتے تو مجھے آپ سے بہتر شوہر مل سکتا تھا۔"

ایک اچھا شوہر وہ شخص نہیں ہوتا جو اپنے آپ کو اچھا سمجھتا ہے، بلکہ وہ ہوتا ہے جسے اس کی بیوی اچھا سمجھتی ہے یا جس کو ہمسائے یا قریب سے دیکھنے والے اچھا سمجھتے ہیں۔ اب ظاہر ہے، کوئی بیوی اپنے شوہر کو اچھا نہیں سمجھ سکتی۔ اگر وہ بیوی کو انسان کی بجائے کٹھ پتلی سمجھے یا ایک بے جان موم کی گڑیا تصور کرے۔ اس لیے اگر آپ اپنی بیوی کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ پرماتما نے اسے "دماغ" کے علاوہ سب کچھ دیا ہے، تو آپ غلطی پر ہیں۔ بیوی اگر چاہے آپ کو اپنی انگلیوں پر نچا سکتی ہے۔ اگر وہ نہیں نچاتی یہ محض اس کی شرافت ہے۔ ایک شوہر کے کوٹ کی جیب سے بیوی کو کاغذ کا ایک پرزہ ملا، جس پر لکھا ہوا تھا "چکوری" بیوی کو شک ہوا۔ اس نے پوچھا: "یہ چکوری کون ہے؟" شوہر نے گھبرا کر جواب دیا۔ "چکوری! چکوری تو میرے دوست کی کتیا کا نام ہے جو مجھے بہت پسند ہے۔" دوسرے دن جب شوہر دفتر سے گھر لوٹا۔ بیوی نے کہا: "آپ کی اس کتیا نے آج آپ کو فون کیا تھا کہ آپ اسے ۹ بجے شالیمار ہوٹل میں ملیں۔ میں تو سن کر حیران رہ گئی۔ وہ بڑی اچھی انگریزی بولتی ہے لیکن جیسا کہ آپ نے کہا تھا ہے کتیا ہی۔"

ایک اور عورت نے جب تیسرے دن اپنے شوہر کے لباس پر لال لپ اسٹک کے نشانات دیکھے اور اس سے پوچھا: "وہ یہاں کیسے لگ گئے۔" اس نے چالاک بنتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ ٹماٹر کی چٹنی کے داغ ہیں۔" بیوی بھی کچی

گویا انہیں کچھ بھی نہیں تھی۔ اس نے ایک ہوشیار سراغ رساں کی طرح پتہ چلا لیا کہ دراصل معاملہ کیا ہے اور ایک شام کو اس نے شوہر سے کہا، "آج میں نے اس ٹماٹر کو خوب آڑے ہاتھوں لیا اور سچ پوچھیے تو اس کی چٹنی بنا دی۔ آئندہ وہ آپ کے لباس کے ساتھ لپٹنے کی کوشش نہیں کرے گا۔!"

ایک اچھے شوہر کی ایک پہچان یہ بھی ہے، وہ بیوی سے کسی غیر عورت کی اتنی تعریف نہیں کرتا کہ بیوی سمجھنے لگے اس کا اس پر دل آ گیا ہے وہ جانتا ہے، جب وہ اپنے ہمسایہ یا دوست کی بیوی کی تعریف کر رہا ہوتا ہے بیوی اس کو دل میں کہہ رہی ہوتی ہے جی ہاں آپ اصل میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کی بیوی کی ہر چیز بُری ہے اس میں کوئی خوبی نہیں۔ آپ سیدھی طرح یوں نہیں کہتے گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے اور آپ یہ تسلیم کیوں نہیں کرتے کہ باہر کی مرغیوں کا تعاقب کیوں نہ کیا جائے۔ وہ ہاتھ نہیں آتیں اور اگر ہاتھ آ جائیں تو بہت جلد وہ بھی دال کی طرح لگنے لگتی ہیں؛

اگر آپ اپنی بیوی کی تعریف نہیں کرتے۔ تو پھر ایک اچھے شوہر کہلانے کے حقدار نہیں۔ اگر آپ نے کبھی اس کے خدوخال کی تعریف نہیں کی۔ کبھی اس کی آنکھوں کے بارے میں نہیں کہا کہ وہ آنکھیں نہیں وہ گہری اور نیلی جھیلیں ہیں جن میں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے۔ اس کے ہونٹوں کے بارے میں نہیں کہا، وہ گلاب کی پنکھڑیاں ہیں۔ یا جب اس نے بناؤ سنگھار کیا ہو۔ اس کی جانب اشارہ کر کے یہ نہیں کہا۔ آج تو آپ کو دیکھ کر اختر شیرانی کے یہ اشعار یاد آ گئے۔

تری صورت سراسر پیکر مہتاب ہے سلمیٰ
ترا جسم اک ہجوم ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ
تو اس سنسار میں اک آسمانی خواب ہے سلمیٰ

تو آپ نے ایک اچھا شوہر بننے کا سنہرا موقع ہاتھ سے کھو دیا۔ ہر عورت کی یہ کمزوری ہوتی ہے کہ چاہے کوئی اور شخص اس کے حسن کی تعریف کرے یا نہ کرے۔ اس کا شوہر اگر ہمیشہ نہیں کبھی کبھار اس کے حسن کو اس طرح سراہے جیسے ایک شاعر اپنی محبوبہ کو سراہتا ہے۔ اس معاملے میں اسے جھوٹ یا مبالغے سے بھی کام لینا پڑے تو اسے ہچکچانا نہیں چاہیے۔ بہرحال سچ بول کر اسے اس غلط فہمی کو پاش پاش نہیں کرنا چاہیے۔ جس میں اس کی بیوی مبتلا ہے۔ ایک ڈرامے میں ایک بدصورت مسخرے نے اپنی بدشکل محبوبہ سے کہا: "میری جان! تم کتنی خوبصورت ہو، تمہیں دیکھ کر مجھے لیلیٰ اور شیریں کی یاد آ جاتی ہے۔" محبوبہ بولی: "کاش! میں بھی تمہارے بارے میں ایسی باتیں کہہ سکتی۔" مسخرے نے جواب دیا: "اگر آپ میری طرح جھوٹ بول سکتیں تو ضرور ایسی باتیں کہہ سکتی تھیں!"

اگر آپ چاہتے ہیں کہ بیوی آپ کی ہر بات مانے لیکن آپ اس کی کوئی بات نہ مانیں تو بھی آپ ایک اچھے شوہر نہیں ہیں۔ ہر بیوی کہتی ہے اس کے شوہر کی کامیابی میں اس کا ہاتھ ہے۔ چاہے یہ بات اکثر ماننے کے قابل نہیں ہوتی بلکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ بیوی اوٹ پٹانگ مشورے نہ دیتی تو شوہر کامیاب ہونے کے لیے اتنے پاپڑ نہ بیلنا پڑتے مگر بیوی کا دل رکھنے کے لیے شوہر کہے کہ اس کی کامیابی کے پیچھے صرف بیوی کا ہاتھ ہے تو وہ بیوی کی نظروں میں ہمیشہ کے لیے سما جائے گا۔

کچھ شوہر ہر وقت جلے بھنے رہتے ہیں۔ ہنسنے یا مسکرانے کو گناہ سمجھتے ہیں۔ بیوی سے بات چیت کرتے وقت ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جیسے گفتگو نہیں کر رہے ٹیلی گرام بھیج رہے ہیں۔ اگر بیوی ہنس پڑے، ناراض ہو جاتے ہیں یا جھلا کر کہتے ہیں۔ خواہ مخواہ دانت کیوں نکال رہی ہو۔ اس قماش کے شوہروں کو اچھا کہنے کی بجائے چنگیز خاں یا ہلاکو کہنا چاہیے۔ یہ خنجر یا تلوار سے نہیں بلکہ اپنی خاموشی اور مردہ دلی سے اپنی بیویوں کا کام تمام کرتے ہیں۔

اگر آپ بد مزاج ہیں لیکن آپ کی بیوی خوش مزاج ہے تب بھی آپ ایک اچھے خاوند نہیں کہے جا سکتے۔ البتہ اگر آپ کی بیوی کا مزاج بھی آپ کے مزاج جیسا ہے۔ پھر کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ آپ ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ الجھے رہیں گے اور آپ کے ہمسائے آپ کو آپس میں تو تو میں میں کرتے ہوئے بغلیں بجائیں گے۔ ٹامس کارلائل اور اس کی بیوی دونوں بد مزاج تھے۔ ان کے ایک دوست نے ان کے بارے میں کہا تھا: اچھا ہوا انھوں نے شادی کر لی اور اس طرح صرف دو زندگیاں خراب ہوئیں۔ اگر وہ آپس میں شادی نہ کرتے تو چار زندگیاں خراب ہوتیں ۔"!

ایک اچھا خاوند وہ نہیں ہوتا، جو اندھا یا بہرہ ہو یعنی جو نہ بیوی کے کسی نقص کو دیکھ سکے اور نہ جلی کٹی سن کر جل بھن جاتا ہے۔ ایک اچھا خاوند دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان رکھتا ہے۔ مگر اس قسم کی کامیاب ایکٹنگ کرتا ہے جیسے نہ اسے کچھ نظر آتا ہے نہ کچھ سنائی دیتا ہے۔ ●●

کنہیا لال کپور ــــ بیک نظر

نام : کنہیا لال کپور

والد : شری لالہ ہری رام کپور

والدہ : شریمتی دیوکی کپور

تاریخ پیدائش : ۲۷- جون ۱۹۱۰ء

مقام پیدائش : چک ۲۷۷، تحصیل سندری ضلع لائل پور (پاکستان)

ذات : کھتری

تعلیم : ایم اے (انگریزی)

پیشہ : درس و تدریس (پرنسپل کالج)

اولاد : سات (تین لڑکے اور چار لڑکیاں)

تصانیف : سات (سنگ و خشت، شیشہ و تیشہ، چنگ و رباب، نوک نشتر، بال و پر، نرم گرم، گرد کارواں)

وفات : مئی ۱۹۸۰ء بمقام پونا

کنہیا لال کپور

کہاوتیں دھوکا دیتی ہیں

حسنِ نظر فریب کی طرح کہاوتیں بھی اکثر دھوکا دیتی ہیں۔ "میکاولی" نے ٹھیک کہا تھا ہر کہاوت میں صرف پچاس فی صد صداقت ہوتی ہے (میکاولی کا یہ قول بھی ایک کہاوت ہے اور اس میں بھی پچاس فی صد صداقت ہے) اب آپ اس کہاوت کو ہی لیجیے۔ کاٹھ کی ہانڈی بار بار نہیں چڑھتی۔ ہمارا تو خیال ہے۔ جب تک دنیا میں کاٹھ کے اُلّو موجود ہیں کاٹھ کی ہانڈی بار بار چڑھتی رہے گی شرط صرف یہ ہے کہ خانساماں ہوشیار ہونا چاہیے۔ یعنی اسے ہانڈی چڑھانے کا صحیح طریقہ آتا ہو۔ تجربہ شاہد ہے اگر ایسا نہ ہو تو تیز آگ اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی، ہانڈی کا، خانساماں کا نہیں۔ اگر واقعی کاٹھ کی ہانڈی بار بار نہ چڑھتی تو عیار اور دھوکے باز لوگ ایک آدھ بار دوسروں کو دھوکہ دینے کے بعد اپنے پیشے سے توبہ کر لیتے۔

ایک اور کہاوت ہے۔ جو گرجتے ہیں برستے نہیں۔ خدا جانے یہ کہاوت کس شخص نے کون سے بادل دیکھ کر گڑھی تھی۔ کیوں کہ ہم نے تو ہمیشہ دیکھا ہے کہ گرجنے والے ضرور برسا کرتے ہیں۔ اور پھر جیسا کہ کسی لال بجھکڑ نے کہا ہے۔ یہ کون کہہ سکتا ہے۔ کب کوئی بادل گرجنا بند کر دے اور برسنا شروع کر دے، کچھ سادہ لوح لوگ جو اس کہاوت میں یقین رکھتے ہیں اکثر بارش میں اس لیے بھیگتے ہوئے پائے گئے ہیں کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ بادل صرف گرجتے رہیں گے برسیں گے نہیں اور اس کا آپ کو بھی تجربہ ہوگا۔ جب آپ کا اپنی بیوی سے جھگڑا ہو جاتا ہے وہ پہلے زور زور سے چیختی اور چلاتی ہے اور پھر آنسو بہانے لگتی ہے۔ صرف یہ مثال ہی اس کہاوت کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

آپ نے یہ مشہور کہاوت بھی ضرور سنی ہوگی۔ ماں پہ پوت۔ پتا پر گھوڑا۔ بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ ہمیں تو اس کی صداقت میں بھی شک ہے کیوں کہ کچھ بچے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ماں پر جاتے ہیں نہ باپ پر۔ یعنی جو صرف اپنے آپ پر جاتے ہیں۔ اور آپ نے ایسے گھوڑے دیکھے ہوں گے، جن کے باپ پر کسی گھوڑے کا نہیں خچر یا گدھے کا گمان ہوتا ہے یعنی جو اتنے اڑیل اور بیوقوف ہوتے ہیں کہ انھیں ازراہِ اخلاق ہی گھوڑا کہا جا سکتا ہے۔ دراصل بچہ ماں اور باپ میں سے کسی ایک پہ جا سکتا ہے۔ ایک ایرانی شہزادے کی ایک ایسے نوجوان سے ملاقات ہوئی جس کی شکل اس سے ہو بہو ملتی تھی۔ شہزادے نے حیران ہو کر اس سے پوچھا۔ "کیا تمھاری ماں کبھی شاہی حرم میں تھی۔" نوجوان نے مسکرا کر جواب دیا: "میری ماں تو نہیں لیکن میرا باپ شاہی حرم میں برسوں ملازم رہا ہے۔"

ایک کہاوت یہ بھی ہے گیدڑ کی جب موت آتی ہے وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ خدا جانے مرنے کے لیے گیدڑ کون سے شہر کا رخ کرتا ہے کیا

آج کلکتہ تو جانے دیجیے اور نہ کسی اور شہر میں گیدڑ مرنے کا واقعہ یا سانحہ ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج تک کسی گیدڑ کی موت ہی نہیں آئی یا اس نے شہر میں مرنے کی بجائے جنگل میں مرنا بہتر سمجھا اور یا یہ کہاوت سرے سے ہی غلط ہے۔!

اب ذرا آپ اس کہاوت پر غور کیجیے۔ نیکی کر دریا میں ڈال۔ یہ کہاوت اس لیے دھوکا دیتی ہے کیوں کہ اس کا مفہوم واضح نہیں۔ نیکی کرنے کے بعد کیا اس شخص کو دریا میں ڈالنا چاہیے جس کے ساتھ نیکی کی گئی ہے یا اپنے آپ کو۔ اور اگر نیکی کو ہی دریا میں ڈالنا مقصود ہے تو پھر نیکی کرنے کا فائدہ ہی کیا ہے۔

فارسی کی ایک کہاوت ہے اگر عیسیٰ کا گدھا مکے سے بھی ہو آئے پھر بھی وہ گدھا ہی رہے گا۔ یہ مثل اس لیے دھوکا دیتی ہے کیوں کہ اس میں صرف ایک خاص گدھے کا ذکر کیا گیا ہے۔ باقی گدھوں یا انسانوں کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا۔ ہمارا تو تجربہ ہے ہزارہا انسان متبرک سے متبرک جگہ کی زیارت کرنے کے بعد بھی گدھے ہی رہتے ہیں۔ اس لیے صرف عیسیٰ کے گدھے کو منتخب کرنا زیادتی اور بے انصافی ہے۔

اسی طرح یہ کہاوت آپ نے سنی ہوگی۔ گدھا کیا جانے زعفران کا بھاؤ۔ یہ بھی ایک نہایت گمراہ کن کہاوت ہے۔ اگر گدھا زعفران کا بھاؤ نہیں جانتا تو اسے معاف کیا جا سکتا ہے کیوں کہ وہ بے چارہ تو صرف گھاس کا بھاؤ جانتا ہے۔ لیکن آپ کو ہزارہا آدمی ایسے ملیں گے جو زعفران کا بھاؤ تو کجا زعفران تک کو نہیں جانتے۔ یعنی جن کے خیال میں زعفران کسی ایکٹریس یا کسی ملک کی راج دھانی کا نام ہے۔

ایک اور مشہور کہاوت ہے۔ نیم حکیم خطرۂ جان اس کہاوت میں بھی صرف پچاس فی صد صداقت ہے۔ کیوں کہ کئی بار سالم حکیم بھی خطرۂ جان ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ ایک شخص کا باپ بیمار ہو گیا۔ اس نے پہلے ایک نیم حکیم سے مشورہ کیا اس نے علاج کرنے کے لیے پچاس روپے مانگے۔ وہ شخص یہ رقم ادا کرنے پر راضی نہ ہوا اور ایک ایکسپرٹ یعنی ماہر ڈاکٹر کے پاس اپنے بیمار باپ کو لے گیا۔ ایکسپرٹ نے پانچ سو روپے بطور فیس وصول کرنے کے بعد مریض کا علاج شروع کر دیا۔ ایک ہفتہ کے بعد مریض کی موت ہو گئی۔ نیم حکیم کو جب اس بات کا پتہ چلا اس نے مرحوم کے بیٹے سے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ "جو کام میں پچاس روپے میں کر دینے کو تیار تھا۔ وہ آپ نے پانچ سو روپے دے کر کروایا۔ اس پر بھی آپ اپنے کو عقلمند سمجھتے ہیں۔"

اگر آپ ایمان داری اور غیر جانب داری کے ساتھ کہاوتوں کا تجزیہ کریں آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ ان پر یہ کہاوت صادق آتی ہے۔ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور!

مثال کے طور پر ان چند کہاوتوں کو لیجیے۔ کتے کو گھی ہضم نہیں ہوتا۔ ہم نے مریل سے مریل کتے کو گھی ہضم ہوتے دیکھا ہے۔ چور کے پیر کہاں۔ اگر اس کے پیر نہ ہوتے وہ چوری کر کے کس طرح بھاگ سکتا۔ سانچ کو آنچ نہیں۔ اگر واقعی نہ ہوتی ہر شخص دھرم پتر یدھشٹر یا راجہ ہریش چندر ہوتا۔ کام پیارا ہے چام پیارا نہیں۔ اگر در اصل ایسا ہوتا تو نصف سے زیادہ ہندوستانی بیویوں کو طلاق اور ساٹھ فیصد ایکٹریسوں کو ملازمت سے جواب مل جاتا۔

اپنا اپنا غیر غیر۔ ان دنوں تو اپنوں سے اغیار اچھے ثابت ہو رہے ہیں۔ بقول شاعر:

جنھیں ہم غیر سمجھے تھے وہی مشکل میں کام آئے ؎ بنایا تھا جنھیں اپنا وہ مار آستیں نکلے!

کنہیا لال کپور

....اور حسینوں کے خطوط

فضول بریلوی جن کا انتقال پرسوں ہوا۔ فضول ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ ان کی موت کس طرح ہوئی یہ ایک راز سربستہ ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں ایک مشاعرہ میں انھیں مدعو نہیں کیا گیا اس صدمہ کی تاب نہ لا کر وہ چل بسے۔ کچھ کہتے ہیں مدعو کیا تھا لیکن شعر پر داد نہیں دی گئی۔ حالاں کہ جو غزل انھوں نے پڑھی اس میں اکیس اشعار تھے۔ کچھ کی رائے میں مشاعرہ کے اختتام پر جو ٹھرّا انھیں پیش کیا گیا اس میں پچھتر فی صد پانی تھا۔ اس کا ایک گھونٹ پیتے ہی ان کے دل کی حرکت بند ہوگئی۔ کچھ یہ بھی کہتے سنے جاتے ہیں ان کے کسی رقیب نے شربت میں زہر ملا دی تھی۔ خیر جب تک پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نہیں آتی وثوق سے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ آپ شاید پوچھنا چاہیں گے مرحوم نے اپنے پیچھے کیا چھوڑا۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے بدنصیب بیوہ، چھ بیمار بچے۔ دو میلے پاجامے۔ ایک پھٹی ہوئی شیروانی اور ایک بوسیدہ ٹوپی۔ خیر یہ چیزیں تو شاعر اپنے پیچھے چھوڑا ہی کرتے ہیں جو چیز فضول صاحب چھوڑ گئے ہیں وہ چند حسینوں کے خطوط ہیں جنھیں وہ احباب سے قیمتی سرمایہ سمجھا کرتے تھے۔ دو ایک خطوط آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ایک خط ہے جو انھیں کسی انجانی نے لکھا ہے۔ لکھتی ہیں:

فضول صاحب!

اس دن آپ پر ترس کھا کر آپ کو چائے کا پیالہ کیا پیش کیا آپ سمجھنے لگے مجھے آپ سے پہلی نظر میں محبت ہوگئی ہے۔ چناں چہ آپ نے ہر مجلس میں اس بات کا اعلان اور اظہار کرکے مجھے بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ کاش آپ کو معلوم ہوتا۔ خدا آپ کو لنگور بنانا چاہتا تھا لیکن آپ کو دم عطا کرنے سے پہلے اسے رحم آگیا اور اس نے آپ کو انسان بنا ڈالا۔ میں آپ کو تنبیہ کرنا چاہتی ہوں۔ آئندہ فضول باتیں بنانے سے باز آئیے ورنہ آپ کے سر سے عشق کا بھوت اتارنے کے لیے مجھے مناسب کارروائی کرنا پڑے گی۔"

دوسرا خط بھی انھی محترمہ کا ہے۔

"فضول صاحب!"

بے حیائی کی بھی حد ہوتی ہے۔ آپ میرا خط لوگوں کو دکھا دکھا کر یہ ثابت کر رہے ہیں میں آپ کو عشقیہ خط لکھتی ہوں۔ کیا آپ کا دماغ چل گیا ہے؟ یا آپ کی شامت آئی ہے۔ بیٹھے بیٹھے آپ کی کھوپڑی میں کھجلی اٹھ رہی ہے؟

تیسرا خط بھی انھی کا ہے۔

فضول صاحب!"

آپ کا یہ شکوہ بے جا ہے کہ آپ کو بڑی بے دردی کے ساتھ زدوکوب کیا گیا۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے کب مانا کرتے ہیں۔ امید ہے اب طبیعت صاف ہو گئی ہو گی۔ آئندہ سوچ سمجھ کر شریف خواتین کی محبت کا دم بھریئے گا۔"

چوتھا خط انھیں نسیم بانو نے لکھا ہے۔

فضول صاحب!

اُس رات جب آپ سیاہ مستی کے عالم میں ایک گندے نالے کے کنارے پڑے ہوئے تھے۔ میں اور میرا شوہر آپ کو موٹر میں بٹھا کر گھر لائے۔ آپ کو ہوش میں لانے کے لیے ڈاکٹر کو اپنے ہاں بلوایا۔ آپ نے ہماری اس مہربانی کا یہ صلہ دیا کہ صبح رخصت ہوتے وقت ہمارا قیمتی کیمرہ چرا کر لے گئے۔ شرافت کا تقاضا ہے اسے فوراً واپس کر دیجیے، نہیں تو ہمیں تھانے میں رپٹ درج کرانا پڑے گی۔"

پہلا محترمہ اپنے دوسرے خط میں لکھتی ہیں:

"آپ نے یہ نازیبا حرکت کی ہے کہ کیمرہ کو گروی رکھ کر پچاس روپے قرض لے لیے۔ آپ لکھتے ہیں جلد ہی آپ قرض ادا کر کے کیمرہ چھڑوا سکے آپ اسے واپس کر دیں گے۔ مجھے معلوم ہے آپ حشر تک قرض ادا نہیں کر سکتے۔ میں آپ کو پچاس روپے بطور ضمانت بھجوا رہی ہوں۔ مہربانی کر کے یہ اپنے قرض خواہ کو دے کر ہمارا قیمتی کیمرہ ہمیں لا کر دیجیے۔

یہ ایک اور خط شریمتی مہندر کور نے انھیں لکھا ہے:

"اس دن آپ ہمارے گھر آئے اور آنکھوں میں آنسو لا کر فریاد کی آپ کی بیوی سخت بیمار ہے۔ اس کے پیٹ میں رسولی ہے۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے اگر اس کا فوراً آپریشن نہ کیا گیا وہ جانبر نہ ہو سکے گی۔ آپ نے پچاس روپے بطور خیرات مانگے۔ میں نے اپنے خاوند کے منع کرنے کے باوجود آپ کو یہ رقم دے دی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا آپ نے اس سے شراب خریدی اور جنداپنی قماش کے شاعروں کو اپنے گھر مدعو کر کے جشن منایا۔ بیوی کے بیمار ہونے کی کہانی آپ کے دماغ کی اختراع تھی جو جانتا ہے۔ آپ کی اس حرکت پر بطور تبصرہ غالب کا یہ مصرع آپ کی خدمت میں پیش کروں:

شرم تم کو مگر نہیں آتی"

اور یہ خط ان کی بیوی نے انھیں اپنے میکے سے لکھا ہے: "آپ لاکھ قسمیں کھائیں میں آپ کی باتوں میں نہیں آؤں گی۔ آپ اس سے پہلے کئی بار مجھے یقین دلا چکے ہیں کہ آپ نے مے نوشی اور آوارہ گردی سے توبہ کر لی ہے۔ لیکن میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ کتے کی دُم کو بارہ برس نلکی میں رکھا جائے پھر بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہے گی۔ مجھے اس بات کا بھی علم ہے کہ آپ اس چھنال بیوہ کی محبت کا دم بھرتے ہیں جو آپ سے پہلے کئی شاعروں کو بے وقوف بنا چکی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کیوں چاہتے ہیں میں جلدی سے جلدی آپ کے پاس پہنچ جاؤں گی اسی لیے نا کہ جو ایک آدھ گہنا میرے پاس رہ گیا ہے اسے آپ اونے پونے بیچ کر جشن منائیں۔ یہاں مگر کر سن لیجیے میں کبھی میکے سے واپس نہیں آؤں گی۔ آخر میں صرف ایک بات آپ کے بھلے کے لیے کہتی ہوں یہ بات تہ ... نظر ... ہے

اد. اس لیے ہے کیوں کہ ... کی گئی باتوں کا آپ پر ... ا

بھاڑ میں جائے ... شاعری ... تو اگر ... ابر ا تو ...

... آپ کہیں گے باقی خطوط؟ تو جناب ...

کنہیا لال کپور

ہیں اُدَبا کے بھی مہرباں کیسے کیسے!

اُدَبا دوسروں کے لیے تفریح کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ لیکن ان کی اپنی زندگی اتنی المناک ہوتی ہے کہ جب کبھی وہ اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ میر دردؔ کا یہ شعر بے اختیار اُن کی زبان پر آجاتا ہے:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

بسا اوقات ان کا واسطہ ایسے مضحکہ خیز اشخاص کے ساتھ پڑتا ہے۔ جن کی عجیب و غریب حرکتیں انھیں زیرِ لب مسکرانے یا دبی زبان سے لاحول پڑھنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

مثال کے طور پر شوہر جو شاعر واقع ہوا ہے۔ مصرعِ طرح پر طبع آزمائی کر رہا ہے۔ پاس بیٹھی بیگم اسے بے نقط سنا رہی ہے۔ شاعر بننے سے کہیں اچھا تھا آپ دہی بڑوں کی دکان کھول لیتے ..... ستم ظریفی کی حد ہو گئی۔ گھر میں آٹا ہے نہ دال اور جناب جیسے فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن کا وظیفہ پڑھ رہے ہیں ..... میں کہتی ہوں بھائی کب تک آٹا اُدھار دیئے جائے گی..... میری تو اسی دن قسمت پھوٹ گئی تھی جب میں آپ کے پلّے پڑی!

یک لخت شوہر چونک کر کہتا۔ "خوب بہت خوب پلّے پڑنے کا محاورہ کس خوبی سے باندھا ہے۔ سبحان اللہ"

بیگم جل بھن کر جواب دیتی ہے: "آج کی رات یہی محاورہ کھا کر سو رہیے گا۔ کیوں کہ گھر میں زہر تک کھانے کے لیے نہیں ہے"

شاعر مسکرا کر کہتا ہے: "بیگم دوسرے فقرے کو اس طرح پڑھیے:

زہر تک وہ نہیں ہے گھر میں کھانے کے لیے

دیکھیے اچھا خاصہ مصرع ہو گیا ہے۔ اتفاق سے اگر دوسرا مصرع سوجھ گیا اسے مطلع کر دیں گے۔

"جہنم میں جائے مطلع اور....."

"ہم دونوں" شاعر آہستہ سے کہتا ہے اور ایک بار پھر فکرِ سخن میں مستغرق ہو جاتا ہے۔

II

افسانہ نویس اپنا ادھورا افسانہ مکمل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اچانک اس کے کچھ احباب آدھمکتے ہیں اور آتے ہی یہ شکایت کرتے ہیں۔ جب دیکھو کچھ نہ کچھ لکھ رہے ہیں۔ بندہ پرور کبھی کبھی دماغ کو چھٹی بھی دے دیا کیجیے۔ چلیے، آپ کو فری استعمال

: ﷺ :

کشتی دکھلائیں ۔"

افسانہ نویس بڑے انکسار کے ساتھ کہتا ہے "مجھ ایسے نیم جان کو فری اسٹائل کشتی میں کوئی دلچسپی نہیں ۔ میں جب بھی پہلوان کو دیکھتا ہوں ایک شدید قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہوں اور سوچتا ہوں ۔ کیا اسی خدا نے مجھے بھی بنایا جس نے ان پہلوانوں کو بنایا ہے ۔"

"اگر کشتی نہیں دیکھنا چاہتے ۔ چلیے آپ کو سرکس دکھلائیں ۔"

"معذرت چاہتا ہوں ۔ مجھے ایک افسانہ مکمل کرنا ہے ۔"

"ابھی چھوڑیئے افسانہ مکمل نہ ہوا تو کون سی قیامت آ جائے گی ۔"

"اگر آج نہ لکھا گیا تو کبھی نہیں لکھا جائے گا ۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہوگا ۔ قارئین ایک فضول افسانہ پڑھنے سے بچ جائیں گے ۔"

وہ کشاں کشاں اسے سرکس دیکھنے کے لیے لے جاتے ہیں اور بے چارہ افسانہ نویس ان کی عقل و دانش پر لاحول پڑھ کر رہ جاتا ہے ۔

III

مشہور ... اخبار پڑھ رہا ہے ۔ دروازے پر دستک ہوتی ہے ۔ اجازت ملنے پر ایک صاحب کمرے میں داخل ہوتے ہیں ۔ اپنا تعارف کرانے کے بعد کہتے ہیں ۔ "میں آپ کا غائبانہ مداح ہوں ۔ مجھے صرف دو ناولسٹ پسند ہیں ۔ ٹامس ہارڈی اور آپ ۔ بعض اوقات تو آپ ٹامس کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں ۔ مگر افسوس آپ کی وہ قدر نہیں ہوئی جس کے آپ مستحق ہیں ۔ اگر آپ امریکہ یا انگلینڈ میں بستے اس وقت تک آپ کو نوبل پرائز مل گیا ہوتا ۔" وہ یہ سب کچھ ایک سانس میں کہہ جاتا ہے ۔ ایک مختصر وقفے کے بعد وہ ناولسٹ کو مطلع کرتا ہے ۔ "آپ کو زحمت دینے آیا ہوں اور وہ زحمت یہ ہے مجھے فلاں پرنسپل کے نام جو آپ کا دوست ہے ، ایک سفارشی خط چاہیے ۔"

ناولسٹ زیرِ لب مسکرانے کے بعد سوچتا ہے ۔ انسان بھی کتنا مکار جانور ہے ۔ مطلب نکالنے کے لیے کتنے عجیب و غریب حیلے استعمال کرتا ہے ۔ اگر سفارشی خط لینا ہی مقصود تھا مجھے ٹامس ہارڈی سے بڑا ناولسٹ ثابت کرنے کی کیا ضرورت تھی ۔ جبکہ اصلیت یہ ہے کہ میں اس کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا ۔

IV

ایک ادیب کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد ایک [illegible] کہتا ہے : "بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر ۔ میں نے آپ کی تمام تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے ۔ میں ممنون ہوں گا اگر آپ شام کا کھانا میرے ساتھ کھائیں ۔"

"آپ نے میری کون سی کتابیں پڑھی ہیں ؟"

"تیرِ نیم کش [illegible] ۔ چریٹ راجہ وغیرہ وغیرہ !"

"معاف کیجیے ۔ میں ان میں سے کسی کتاب کا مصنف نہیں ہوں ۔"

"تو آپ فکر تونسوی نہیں ہیں؟"

"نہیں —— !"

"تب تو بڑا مغالطہ ہوا۔ اچھا صاحب تو میں شام کے کھانے کی پیش کش واپس لیتا ہوں۔"

ادیب صاحب اس کا منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔

V

ایک صاحب جو [illegible] موجودہ دور کے سب سے بڑے نقاد ہیں۔ ایک مزاح نگار سے ملتے ہیں اور یہ حیرت انگیز انکشاف کرتے ہیں۔

"میں آپ کو مزاح نگار ہی نہیں سمجھتا۔"

وہ پوچھتا ہے۔ "کیا آپ نے میرے مضامین پڑھے ہیں؟"

"نہیں !"

"پھر آپ یہ فتوے کس طرح صادر کر سکے"

"کیوں کہ میرا خیال ہے آپ کو لکھنا نہ [illegible]"

"آپ نے یہ اندازہ کیسے لگایا ؟"

"میری بیوی نے آپ کا ایک مضمون پڑھا تھا۔ وہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا!"

"ممکن ہے اس کی سمجھ کا قصور ہو۔"

"میں یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ کافی ذہین ہے!"

"آپ کی رائے میں کون سے ادیبا کو مزاح نگار کہا جا سکتا ہے ؟"

"میری رائے میں رتن ناتھ سرشار کے بعد کوئی مزاح نگار نہیں ہوا۔"

"اور نقادوں کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"میں سمجھتا ہوں مجھ سے پہلے کوئی نقاد نہیں ہوا"

"اگر آپ واقعی یہ سمجھتے ہیں مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔ البتہ ایک درخواست ضرور کرنا چاہتا ہوں!"

"وہ کیا؟"

"خدا کے لیے کہیں یہ نہ کہہ دیجیے آپ مجھے مزاح نگار کے علاوہ انسان بھی نہیں سمجھتے۔"

قلمی معاونین

اپنی نگارشات صاف اور خوش خط، صفحے کی ایک جانب لکھا ارسال فرمائیں۔

کنہیا لال کپور

اگر جوانی لوٹ آئے

اگر کسی بزرگ سے جو زندگی کی پینسٹھ بہاریں دیکھ چکا ہے سوال کیا جائے "اگر آپ کی جوانی لوٹ آئے تو آپ کیا کریں گے؟" تو غالباً اس کا جواب ہوگا "شادی۔!" اگر ہم سے یہی سوال کیا جائے تو ہمارا جواب ہوگا "شادی کرنے سے پرہیز۔" ہمیں یاد ہے جب ہماری شادی نہیں ہوئی تھی ایک بزرگ ہمیں نصیحت کیا کرتے تھے "برخوردار اول تو شادی مت کرنا اور اگر شادی کرنی ہی پڑے تو کسی بانجھ عورت سے کرنا۔" ہم ان کی باتوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور کہتے تھے "آپ بچوں سے اتنا کیوں گھبراتے ہیں؟ ہر بچہ اپنی قسمت اپنے ساتھ لاتا ہے۔" وہ فرماتے۔ "قسمت نہیں وہ اپنے ساتھ ایک نئی مصیبت لاتا ہے۔" ہم نے ان کی نصیحت نہ مانی اور شادی کرلی۔ شادی کرنے کے پندرہ برس بعد ہمارا شمار ان خوش قسمت والدین میں ہونے لگا جن کے سات بچے ہوتے ہیں مگر اب ہمیں بھی محسوس ہونے لگا یہ خوش قسمتی کتنی مہنگی پڑتی ہے اور اس کے مقابلے میں چودہ سال قید بامشقت کیوں عین راحت ہے۔

اگر جوانی لوٹ آئے ہم اس غلطی کا ازالہ اس طرح کریں گے کہ جب ہمیں کوئی شخص شادی کرنے کا مشورہ دے گا رحیم کا وہ دوہا سنائیں گے، جس کا مفہوم ہے: "اے رحیم بیاہ تو ایک مصیبت ہے۔ اگر اس سے بچ سکتے ہو تو بچ جاؤ۔ کیوں کہ ڈھول بجا کر پاؤں میں بیڑیاں ڈلوانے کا نام ہی بیاہ ہے۔"

زندگی کے ان اداس لمحوں میں جب بے ساختہ یہ مصرع ہماری زبان پر آجاتا ہے:

جو چال ہم چلے سو نہایت بری چلے

ہمیں خیال آتا ہے اگر جوانی لوٹ آئے تو ہم ان تمام غلطیوں اور لغزشوں سے دامن بچانے کی کوشش کریں گے: جن کی بدولت ہمیں زندگی میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ سچ پوچھیے تو ہمیں سب سے زیادہ گمراہ اقبال کے اس شعر نے کیا:

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

طائر لاہوتی بننے کے شوق نے ہمیں اتنا بددماغ بنا دیا کہ ہم ہر ایک بڑے آدمی کو زمین پر رینگنے والا کیڑا مکوڑا تصور کرنے لگے اور اس کی خوشامد کرنے کی بجائے اس سے توقع کرنے لگے کہ وہ ہماری خوشامد کیا کرے۔ ایک اور شاعر جنھوں نے ہمیں گمراہ بلکہ تباہ کیا میر تقی میر تھے۔ وہ خود مفلس تھے اور دوسروں کو بھی مفلس رہنے کی تلقین کرتے رہے اور یہ یقین دلانے

کی کوشش بھی کی کہ اگر وہ غریب ہیں تو یہ اُن کا نہیں ان کی قسمت کا قصور ہے۔ چناں چہ فرمایا:

بے زری کا نہ کر گلا غافل
رکھ تسلّی کہ یوں مقدّر تھا

آج سے چالیس برس پہلے ایک ایڈیٹر نے ہمیں مشورہ دیا آپ انگریزوں کے حق میں مضامین لکھا کیجیے۔ وہ آپ کی سرپرستی کریں گے۔ ہم نے بڑی بے رخی کے ساتھ جواب دیا۔ ہم آپ کی طرح ضمیر فروش نہیں ہیں۔ ہم تو اپنے قلم کا سارا زور انگریزوں کو بےنقاب کرنے میں لگا دیں گے۔

ایڈیٹر صاحب نے بڑی نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا: "خدارا کچھ اپنی حالت پر رحم کیجیے۔ پیٹ کی خاطر بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔" لیکن ہم نے اپنی حالت پر رحم نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا انگریز حکومت اور ہم فاقے کرتے رہے۔ اگر جوانی لوٹ آئے تو ہم اس شخص کی خوشامد کریں گے جس نے کسی اور کی خوشامد کر کے بلند مرتبہ حاصل کیا ہے۔

ہم جب عمرِ رفتہ کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے جس چیز نے ہمیں سب سے زیادہ نقصان پہنچایا وہ ہماری شرافت یا ہمارا ضرورت سے زیادہ مہذب ہونا ہے۔ یہ راز ہم پر بڑی مدت کے بعد کھلا کہ فی زمانہ شرافت اور بزدلی کو ہم معنی سمجھا جاتا ہے اس لیے شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے بیوی اور بچے بگڑ جاتے ہیں۔ ماتحت اور نوکر سرکش اور گستاخ ہو جاتے ہیں۔ آپ کی ناراضگی کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ کیوں کہ ہر شخص جانتا ہے آپ [illegible] نہیں ہو سکتے اور اگر بالفرض ہو جائیں تو خود بخود من جاتے ہیں۔ ہر ایک آدمی آپ کی پگڑی اچھال سکتا ہے کیوں کہ اسے علم ہے آپ اس کو بے وقوف یا نیم پاگل سمجھ کر معاف کر دیں گے۔ جس دوست کی آپ مدد کرتے ہیں وہ آپ کا شکریہ تک ادا نہیں کرتا، کیوں کہ اسے معلوم ہے "نیکی کر اور دریا میں ڈال" آپ کا اصول ہے۔ اگر جوانی لوٹ آئے ہم صرف اس حد تک شریف اور مہذب بنیں گے جس حد تک دوسرے ہیں۔ اگر ممکن ہوا دوسروں سے کچھ کم ہی مہذب بنیں گے، کیوں کہ اس میں فائدہ رہتا ہے۔

ایک اور غلطی جو ہم نے جوانی میں کی لیکن جس کا خمیازہ بڑھاپے میں اٹھا رہے ہیں، وہ غلط پیشے کا انتخاب ہے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ معلمی ایک معزز پیشہ ہے ہم معلم بن گئے۔ چالیس برس معلم رہنے کے بعد ہم نے محسوس کیا وہ جو نظیر اکبر آبادی نے معلموں کے بارے میں کہا ہے بالکل حقیقت پر مبنی ہے:

وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں
ان کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

مفلسی اور معلمی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ معلم لاکھ پاپڑ بیلے اس کا حال پتلا ہی رہتا ہے۔ جہاں تک سماج میں معلم کی پوزیشن کا سوال ہے، ہمارا تجربہ ہے جس حقارت سے سماج معلموں کے ساتھ پیش آتا ہے شاید مجرموں کے ساتھ بھی نہ آتا ہوگا۔ وجہ یہ ہے سماج جارج برنارڈ شا کی طرح یہ فرض کر لیتا ہے کہ جو شخص کوئی اور کام نہیں کر سکتا وہ معلم بن جاتا ہے۔

اگر جوانی لوٹ آئے تو [illegible] ہو جائیں تو چاٹ کی دکان کھول لیں گے۔ کپڑے دھونے کا صابن تیار کریں گے۔ بندوں کا بیوپار کر لیں گے لیکن معلم نہیں بنیں گے لیکن۔ [illegible] سمجھتے ہیں خیالی پلاؤ پکانے کا کیا فائدہ ہے جیسا ہم جانتے ہیں جوانی کسی حالت میں بھی نہیں لوٹ سکتی۔ گھڑی کی سوئیوں کو پیچھے موڑا جا سکتا ہے

محمد بدیع الزماں (پٹنہ)

کنھیا لال کپور کی طنز نگاری

ـ مضحک پہلوؤں کو روشن کرنے والوں میں جہاں اور بہت سے نام ہیں ان میں ایک نمایاں نام کنھیا لال کپور کا
ان کی تحریر میں حقیقت کی تلاش ملتی ہے جو زندگی سے قربت کا دوسرا نام ہے۔ زندگی سے یہ قربت ان کی طنز
میں سماجی شعور اور علمی بصیرت پیدا کرتی ہے ورنہ علمی بصیرت کے بغیر طنز ایک اوچھا وار ہے یا پھر اپنے رخسا
اپنی تعبیر۔ وہ زندگی کو سلیقے سے اور مجموعی طور پر دیکھتے تھے۔ اور ان کا طنز بمعنی وار نہیں ایک حساس، باشعور ذا
کا درد ہے، داغ ہے اور جستجوئے آرزو ہے۔

طنز ایک قسم کی بے دردانہ تنقید ہے اور عملی جراحی بھی۔ تنقید اور طنز میں نمایاں فرق یہ ہے کہ تنقید
ہے اور طنز تحسین۔ کپور کا طنز گوارا ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس میں شدت اچھے اور بڑے مقصد کے لیے
گئی ہے۔ بقولِ غالبؔ لب کی شیرینی کا کرشمہ یہ ہے کہ اس کی گالیاں کھا کے بھی بے مزہ نہ ہوں۔ لب کی شیرینی
کپور کے طنز کو اس کی مقصدیت کی بنا پر گوارا بناتی ہے۔

کپور علمی اور ادبی تلمیحات اور استعارات پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے رچے ہوئے ذوق نے کلاسیکی اد
سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے مصرعوں کو بڑے فن کارانہ طور پر تبدیلیوں سے کام
اپنی تحریر میں سمویا ہے۔ وہ ظریفانہ استعارات کی مدد سے اپنی طنز نگاری میں روانی اور برجستگی پیدا کرتے
ان کی ظرافت میں اشتعال انگیزی نہیں اور نہ کہیں نفرت و عناد کا شائبہ ہی نظر آتا ہے۔ ان کا طنز خوا
شخص یا جماعت پر ہو اس کا رنگ اور آہنگ ہمیشہ اصلاحی ہے۔ اصلاح کے جذبے کے تحت ہی وہ سماج کی
برائیوں، بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں کے مضحک پہلوؤں کو ابھارتے ہیں۔

کپور کسی موضوع پر بغیر سوچے سمجھے نہیں لکھتے اور یہی وجہ ہے کہ فن کا رشتہ ان کی شخصیت سے
نوعیت کا ہوتا ہے جس طرح ان کا ان کے کرداروں کے ساتھ اپنے کرداروں کی اخلاقی کمزوریوں پر وہ قہقہہ مار کر کبھی
ہنستے اور سامع یا قاری کو اس کا مذاق اڑانے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ اچھے خاصے آدمی میں بھی
کوئی پہلو ایسا نکال لیتے ہیں جس پر بہت کم لوگوں کی نظریں جاتی ہیں۔ ان کے مشاہدے کی یہ واقعیت
ان کے آرٹ کی جان ہے۔ ان کے طنز میں ادبیت کے ساتھ گہرائی ہوتی ہے اور اس گہرائی میں تعمیری

ں کارفرما رہتا ہے ۔ حکومت ، سیاست ، اہلِ سیاست ، افسانہ نویس ، شعرا ، ادیب غرض سماج کے ہر طبقے کے لوگوں
دہ طنز کے تیرِ نیم کش چلاتے ہیں جس کی نوک بہت تیز ہوتی ہے مگر چونکہ وہ جگر کے پار نہیں ہوتے اس لیے اس کی
لش باقی رہ جاتی ہے ۔ ان کے طنز میں سینکڑوں اچھوتے نشتر ہیں اور ہزاروں کھلے نشتر ہیں جو رد عمل ہیں سماج کی
لاقی پستی کا ۔ ان کے طنز کا رخ اکثر و بیشتر اپنی طرف ہوتا ہے مگر اس کی چبھن مخاطب اپنے پہلو میں محسوس کرتا ہے
ں لیے کہ وہ طنز اتنا مہذب اور شگفتہ اور اس کی زبان اتنی شگفتہ اور شیریں ہوتی ہے کہ اُن کا وار مو ثر
ر پور ہوتا ہے اور کبھی خالی نہیں جاتا ۔ طنز و ظرافت خواہ کسی کو تشانہ بنائے اس کا سب سے نمایاں جوہر اس کی
انت ہے ۔ کپور اپنی تحریر میں ہمیشہ یہ خیال رکھتے ہیں کہ اُن کا طنز اپنی لطافت نہ کھو بیٹھے کیوں کہ اس کے بغیر
دیت کو ٹھیس لگتی ہے وہ سطحی محرکات سے بچتے ہوئے ایسی بلندی پر پہنچ جاتے ہیں جہاں اُن کی آواز میں مصلح قوم
شان پیدا ہو جاتی ہے ۔ گرچہ مزاح اور طنز کے درمیان حدِ فاصل بہت نمایاں نہیں ہے مگر کپور نے اپنے طنز کی
میں مزاح اسی قدر شامل کیا ہے جتنا دال میں نمک اور اس طرح مزاح شامل ہوتے ہوئے بھی اُن کے طنز کی
باقی رہتی ہے ۔ کپور کی طنز نگاری کی انہی خصوصیات کے پیشِ نظر ڈاکٹر وزیر آغا نے یہ اظہارِ خیال کیا ہے کہ :

"کپور کا طنز ایک سرجن کے عمل جراحی کی طرح ہے جو ادب اور زندگی کی ناہمواریوں اور غیر
ضروری جذباتیت کے مظاہر کو دیکھتے ہیں اور اپنے نشتر سے ان ناسوروں کو آہستگی سے
چھیڑ دیتے ہیں ۔ اس طور سے گو فاسد مادہ پیدا ہو جاتا ہے اور زخم مندمل ہونا شروع ہو جاتا ہے ۔
ان کی عملی جراحی میں ایک فطری نفاست اور تیزی ہے اور عموماً مریض کو اس درجہ مبہوت کرنے
کے بعد اپنی عملی جراحی کا آغاز کرتے ہیں کہ مریض کو نشتر کی جراحت تک محسوس نہیں ہوتی"۔

کپور کے موضوعات کا تنوع ان کے عمیق مشاہدہ کا پتہ دیتا ہے ۔ "زندگی" ہی کے موضوع کو لیجیے ۔ ہر ادیب
نے اسے اپنی عینک سے دیکھا ہے ۔ کسی نے کہا : زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا ! غالب اپنی زندگی سے اس قدر
زار تھے کہ چیخ اٹھے ، ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے" اقبال نے ناصحانہ رنگ اختیار کر کے کہہ ڈالا : جوئے
شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی ۔ مگر کنہیا لال کپور نے قیدِ حیات و بندِ غم دونوں کو مذاق میں اڑا کر زندگی کو ایک خاص
زاویہ سے دیکھا ہے ۔ انھوں نے زندگی کی تلخیوں کو گوارا بنانے اور ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے رادافانی کی طرح
... ت میں مضمر نہ بتا کر ناہمواریوں اور تلخیوں کو ہنستے کھیلتے گزار دینے کی تلقین کی ہے ۔ زندگی کے معاملات میں کپور کے طنز کی
... ن ان جملوں میں محسوس کیجیے :

"زندگی علی بخش حجام کا گندا استرا ہے جس کے چرکوں کی کوئی تاب نہیں لا سکتا حتی کہ خود علی بخش حجام
بھی ـــ زندگی چھانگا مانگا کا اسٹیشن ہے بے رونق ، اداس ، خستہ حال ـــ زندگی وہ سڑک ہے
جس پر چلتے چلتے آدمی جہنم پہنچ جاتے ہیں ـــ زندگی مصر کی شہزادی کلیوپیٹرا ہے جو عاشق کا دم بھرتی
ہے مگر کسی سے وفا نہیں کرتی ـــ زندگی سرکش گھوڑا ہے جس پر سوار ہونے کی ہر شخص کوشش کرتا ہے

جوہر سوار کو زمین پر پٹخ کر ہوا ہو جاتا ہے۔ زندگی خوب صورت تیتری ہے جو شوخ اور خوب صورت پاکر ہر شخص کو تعاقب کرتے پر مجبور لاتی ہے لیکن جو آپ ہاتھ میں پکڑلیں سے لدی جھاڑی میں غائب ہو جاتی ہے ۔" (چنگ و رباب)

کپور کلاسکی ادب کے حوالوں میں کہیں بد ذوقی کا اظہار نہیں کرتے۔ "زندگی" ہی کے موضوع پر اپنے مضمون "آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟" میں مرزا غالب اور حکیم مومن خاں مومن کی گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے "زندگی کا درد" اور اس کا علاج بڑے لطیف پیرایے میں بیان کرتے ہیں۔

"قبلہ میں (غالب) اس درد کا ذکر کر رہا ہوں جسے عرف عام میں زندگی کہتے ہیں؟" ——— اگر درد سے آپ کا یہ مطلب ہے تو اس کا علاج تو بڑا آسان ہے۔ ابھی بتائے دیتا ہوں ——— "ارشاد" ——— "کسی شخص کو بچھو نے کاٹ کھایا تھا۔ درد سے بلبلاتے ہوئے اس نے کسی دوست سے پوچھا: "اس درد کا بھی کوئی علاج ہے کیا؟" دوست نے جواب دیا: "علاج یہ ہے کہ تین دن چیختے چلاتے رہو چوتھے دن درد خود بخود کافور ہو جائے گا" ——— "واہ حکیم صاحب، آپ نے تو گویا میرے شعر کی ہی تفسیر کر دی۔" "کون سے شعر کی قبلہ؟" ——— "اس شعر کی:

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک"

کپور سماجی برائیوں کو چن چن کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ کثافت کے اس انبار کو دیکھ کر ہمارے دل میں بدی سے گریز اور نیکی کی قدر کرنے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ سماجی معاملوں میں کپور کے طنز کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہمیں اس ماحول کے اتنے قریب لے آتے ہیں کہ ہماری نگاہوں سے کوئی بھی چیز پوشیدہ نہیں رہتی۔ سماج کی مصنوعی چمک دمک اور سماج میں بسنے والے انسان کی ظاہر داری، ریا اور کنبہ پروری کا بھانڈا جیسی لعنتوں کو وہ جس لطیف پیرائے میں پھوڑتے ہیں ان سے لطف لیجیے اور اپنے بیچ ایسے کرداروں کی یاد تازہ کیجیے:

"منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید۔ میں وہ بدقسمت انسان ہوں جس کی امید مرنے پر منحصر ہے۔ اپنے مرنے پر نہیں۔ دوسروں کے مرنے پر۔ ہر رات سونے سے پہلے دعا مانگتا ہوں: "یا رب العالمین! فلاں شاعر، فلاں لیڈر فلاں محبِ وطن اب تو کافی بوڑھا ہو گیا ہے۔ پچھلے دس برس سے قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ اب تو اسے اٹھا لے اب تو یہ جا بھی سکے نہ ہاتھوں میں جنبش ہے نہ آنکھوں میں دم! اسے جنت میں جگہ دے یا جہنم میں۔ کم از کم مجھے اس کے نام پر چندے کا ایک نیا فنڈ کھولنے کا موقع دے۔ میں اس کا بُت نصب کروں گا۔ اس کی یاد میں عظیم الشان لائبریری قائم کروانے کے لیے اپیل کروں گا۔ اس کے پسماندگان کی امداد کے لیے قوم سے خیرات مانگوں گا۔ پانچ ہزار دس ہزار پندرہ ہزار۔ آخر کچھ تو قوم کی جیب سے نکلے گا ہی۔ اے ذوالجلال! کل کے اخبار میں پہلی سرخی جو پڑھوں وہ کسی بڑے لیڈر کی موت سے متعلق ہو۔ خداوندا! میری مالی مشکلات تجھ سے پوشیدہ نہیں۔ لڑکے کو ولایت بھیجنا ہے لڑکی کی شادی

نزدیک آدمی کے کم از کم پندرہ ہزار روپے چاہیے۔ اگر اس حساب سے تین لیڈروں کا جنازہ اُٹھے تو یہ رقم دستیاب ہو سکتی ہے۔ اے خدا تو قادرِ مطلق ہے۔ تین لیڈروں کو قیدِ حیات سے نجات دلانا تیرے لیے چنداں مشکل نہیں؟ اور اگر یہ کسی طرح ناممکن ہے تو پھر کوئی قحط، سیلاب، بھونچال ہی بھیج۔ بنگال کا قحط تو پرانا ہو چکا۔ اب تو کسی نئی آفت کی ضرورت ہے کوئی عالمی طوفان، پلیگ، ہیضہ، ٹڈی دل۔ کوئی ایسی مصیبت جس کے نام سنگ دل سے سنگ دل انسان چندہ دینے پر مجبور ہو جائے۔

("زہ نی تو کسی طور.........")

"محبت انسانی زندگی کا ازلی موضوع رہا ہے اور "عورت" اس کی خاص کردار۔ ہابیل اور قابیل سے لے کر لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور ایڈورڈ ہشتم اور سمپسن تک دامِ محبت میں گرفتار رہے ہیں۔ ادیبوں نے طرح طرح اس کی داستانیں رقم کیں، اس کی تاویلیں کیں اور اس کے محرکات پر صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالے۔ کپور بھی اس موضوع کو اپنے طنز کی گرفت میں لاتے اور "محبت" کو "تضیعِ اوقات" اور "عورت" کو "فعلِ تمنائی" سے زیادہ درجہ نہیں دیتے۔ زندگی اور عورت کی فطرت اور محبت کی حقیقت کپور سے سُنیے:

"محبت پچاس فی صد حماقت ہے اور پچاس فی صد تضیعِ اوقات ہے ـــــ محبت کے تین درجے ہیں۔ حماقت، شدید حماقت اور عشق ـــــ محبت وہ دروازہ ہے جو بسا اوقات پاگل خانے میں نکلتا ہے۔ عورت جملہ شرطیہ یا فعلِ تمنائی۔ ایک ایسی چالاک مچھلی ہے جو کبھی جال میں نہیں پھنستی اور اگر پھنستی ہے تو ہاتھ سے پھسل جاتی ہے۔ عورت دبیز پردہ ہے یا سیاہ نقاب، مجسمِ بے نیازی ہے یا مجسم بے اعتنائی۔ عورت ہندوستان میں آنسو، ترکی میں مسکراہٹ اور انگلستان میں خندۂ بے باک ہے۔ اس کا سب سے بڑا مطالبہ یا سب سے بڑا ماز داں آئینہ اور سب سے بڑی کمزوری محبت ہے۔" (چنگ و رباب)

"کسی خاص خاتون کو باقی سب خواتین پر ترجیح دینے کا نام محبت ہے۔ محبت ایک نہایت غیر جمہوری فعل ہے کیوں کہ جمہوریت میں تمام عورتوں کے حقوق مساوی ہیں۔ محبت، ہوس یا جنسی [illegible] کا شاعرانہ نام ہے۔ یہی وجہ ہے شعرا اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ محض فرضی محبوباؤں سے محبت کرتے ہیں اور یہ ٹھیک بھی ہے کیوں کہ اُن میں سے بیشتر اتنے بدشکل ہوتے ہیں کہ بدصورت سے بدصورت عورت بھی اُن سے پناہ مانگتی ہے۔" (پچا سلیمان)

کپور کا دور اردو ادب کے "جمود"، "ترقی پسند تحریک"، "ادب میں مارکسی نظریات"، "جدید شاعری"، "ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی" جیسی تحریکوں اور بحثوں کا دور تھا۔ ان موضوعات پر انجمنیں قائم کی گئیں، سیمینار اور کانفرنسیں منعقد ہوئیں، رسالوں کے خصوصی شمارے نکالے گئے مگر کپور دور کھڑے ان میں حصہ لینے والوں کی تصویریں دیکھتے رہے۔ رسالوں روئیداد کو بنظرِ غور دیکھتے رہے۔ دُکھتی رگوں کو پکڑنا ایک طنز نگار کا اولین مقصد ہے۔ کپور نے ان ساری بحثوں پر ناقدانہ نظر ڈالی اور اپنے طنز کے نوکِ نشتر کے ذریعہ فاسد مواد اس بحث میں حصہ لینے والوں کے سامنے پیش کیا۔ ذیل میں ان سارے موضوعات پر کپور کے نوکِ قلم سے نکلی چند اچھوتی ضربیں اور چبھتے نشتر ملاحظہ کیجیے جن میں ادب اور زندگی دو...

ایک حقیقت پسندانہ جائزہ لیا گیا ہے :

(١) "ٹیگور، اقبال، رکن، ہمالیہ اور تاج محل کے علاوہ اپنے وطن میں بہت سی ہستیاں قابل ستائش ہیں
مثلاً مچھر، شاعر، عشاق یہ تو وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ اپنے وطن میں مچھر زیادہ ہیں یا شاعر
مگر بہر حال دونوں کافی تعداد میں ہیں۔ مچھروں اور شاعروں میں اس لیے مطابقت ہے کہ دونوں شام
ہونے پر بھنبھنانا شروع کرتے ہیں" ("اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے")

(٢) "وہ جو شیخ سعدی نے کہا ہے: "پسر شو بیاموز" بالکل بجا کہا ہے۔ برسوں ادبی رسائل میں مضامین لکھتے
رہے مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ ہم بھی ادیب ہیں۔ ... ؟ آخر ایک دن جو اپنی گمنامی کا تجزیہ کیا
تو معلوم ہوا کہ قصور اپنا ہی ہے۔ ادبی رسائل میں لکھنا پرلے درجے کی حماقت تھی۔ اول تو ادبی رسائل
کی اشاعت ہی کتنی ہوتی ہے اور پھر انہیں خریدتا اور پڑھتا کون ہے؟ .... اتفاق سے پتہ چلا بمبئی کا
مشہور فلمی رسالہ "قلم باز" اپنا ایکٹریس نمبر نکال رہا ہے۔ ہم نے فوراً ایک مضمون لکھا۔ عنوان تھا: "مس
چنبیلی سے ایک ملاقات"۔ چند دنوں کے بعد ایڈیٹر صاحب کا خط آیا: "مضمون بہت پسند کیا۔ مبلغ
پچاس روپے کا چیک بطور معاوضہ بھیج رہا ہوں۔ چیک کو دیکھ کر باچھیں کھل گئیں اور بے اختیار
منہ سے نکلا۔ واللہ ہم بھی کتنے سادہ لوح تھے کہ ادبی رسائل میں لکھتے تھے۔" ("مس چنبیلی")

(٣) "آج کل شعرا کی جگہ افسانہ نویسوں نے لے لی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ہمیں مرحوم اقبال کا
نعم البدل نہیں مل سکا لیکن مرحوم منشی پریم چند کے ایک سے زیادہ جانشین پیدا ہو چکے ہیں —"
("سنگ و خشت")

(٤) "میرے خیال میں اب لوگ ایسی فلموں سے تنگ آ گئے ہیں جن کا پلاٹ محبت کی [illegible] تکون پر مبنی ہے۔
دو مرد ایک عورت اور دو عورتیں ایک مرد ..... کیوں نہ ایسی کہانی لکھی جائے جس کا پلاٹ محبت کی
کثیر الاضلاع پر مبنی ہو۔ مثلاً بیس اشخاص منتخب کیے جائیں۔ دس آدمی، دس عورتیں اور پھر ان کو
ایک دوسرے سے اس طرح عشق کرتا ہوا دکھایا جائے کہ اگر رمیش کو لیلا سے محبت ہے تو لیلا سریش
پر فریفتہ ہے۔ سریش کملا کی محبت کا دم بھرتا ہے تو کملا سریندر پر دل و جان سے فدا ہے۔ سریندر
کو سروج سے عشق ہے تو سروج مہندر کے دامِ الفت میں گرفتار ہے ... علیٰ ہذا القیاس اس
زنجیر کے حلقے پھیلتے جائیں۔ خاتمے سے پہلے آدھے افراد خودکشی کر لیں اور باقی ایک دوسرے کا سر پھوڑنے
کے بعد جیل خانہ پہنچ جائیں۔ کہانی کا پس منظر ہو ایسا کالج جہاں مخلوط تعلیم کا رواج ہے۔ اور کرداروں میں
طالب علموں کے علاوہ دو چار پروفیسر بھی شامل کیے جائیں تاکہ کہانی اور بھی دلچسپ معلوم ہو"
("فلمی شاہکار")

(٥) "منیجر صاحب، یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ افسانہ نویسی سے توبہ کیوں کر لی؟" منیجر صاحب نے سرد آہ بھرتے

ہوئے جواب دیا: "یہ سب میرے اعصاب کا قصور ہے" ۔ "اعصاب کا؟ کیا آپ کسی اعصابی
مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں؟" ۔۔۔ "نہیں صاحب یہ بات نہیں ۔ دراصل میں تب تک افسانہ نہیں
لکھ سکتا جب تک میرے اعصاب پر کوئی نہ کوئی سوار نہ ہو جائے ۔ شروع میں بقول اقبال عورت
سوار تھی ۔ چنانچہ میں نے عورت کی زلف سے لے کر ٹخنے تک ہر موضوع پر افسانے لکھ ڈالے ۔ جب
عورت نیچے اتری تو فرائڈ سوار ہو گیا ۔ اب میں نے شعور اور لاشعور کی بھول بھلیاں پر جو لکھنا شروع کیا
تو دوسروں کی بات تو الگ رہی خود میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ لکھ کیا رہا ہوں ۔ فرائیڈ صاحب رخصت
ہوئے تو کارل مارکس لپک کر سوار ہو گئے ۔ اب دن رات بھوک، ہڑتال، سرخ سویرا، سرخ دوپٹہ
سرخ ستارا ایسے موضوعات پر لکھنے لگا ۔ کچھ عرصہ کے بعد جب کارل مارکس تشریف لے گئے تو اعصاب
کی کرسی خالی ہو گئی ۔ اب میں انتظار کر رہا ہوں کہ کوئی شخص آئے ۔ اس کرسی پر بیٹھے اور میں لکھنا شروع
کروں" ۔۔۔ ("مجود")

کپور نے "غالب جدید شعراء میں" کے ذریعے جدید شاعری خصوصاً آزاد نظم نگاری کو اپنے تیر و نشتر سے چھلنی کر دیا ہے
یہ ان کی شاہکار تحریر ہے:

طرز حکومت طنز نگاروں کا ہمیشہ موضوع رہا ہے ۔ اقبال نے جمہوریت کے بارے میں کہا تھا:

جمہوریت ایک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اقبال نے جب یہ شعر کہا اس وقت ہندوستان میں جمہوری نظام نہیں تھا مگر کپور نے آزاد ہندوستان کے
جمہوری نظام کو قریب سے دیکھا اور اسے بھی اپنے وار کا نشانہ بنایا ۔ کہتے ہیں:

"ہمارا تجربہ ہے کہ جمہوریت میں زبان قینچی کی طرح چلنے لگتی ہے مگر دماغ سوچنا بند کر دیتا ہے ۔ جمہوریت
کو اس لیے پسند کیا جاتا ہے کہ عوام گفتار کو کردار پر ترجیح دیتے ہیں ۔ جمہوریت تب تک کامیاب نہیں
ہو سکتی جب تک ہر ایک انسان یہ اعتراف نہیں کرتا کہ اس کا ہمسایہ نہیں وہ خود پاپی ہے ۔۔۔"
("چچا سلیمان")

یہ ہیں آزاد ہندوستان کے پروفیسر ہیرالڈ لاسکی المعروف بہ کنہیا لال کپور ۔ کپور کے سبھی کردار سماج کے جانے
پہچانے لوگ ہیں ۔ ان کے آئینے میں سماج کی ساری بے اعتدالیاں اور بیماریاں صاف نظر آتی ہیں ۔ ایک مجاور کا
کردار کپور کی تحریر میں ملاحظہ کیجیے:

"یہ قبر جس کا میں مجاور ہوں کسی فرضی ولی اللہ کی ہے ۔ لوگ اسے پیر بیس گز کے نام سے پکارتے ہیں...
دراصل اس قبر میں کسی مردے کو دفن نہیں کیا گیا ہے ۔ پانچ سال ہوئے میں نے رات بھر جاگ کر اسے
تیار کیا ۔ مجاور بننے سے پہلے میں بھیک مانگتا تھا ۔ لوگ مجھے دھتکارتے تھے ۔ اب میری پرستش کرتے

ہیں۔ یوں تو ہر شخص پیر بینی گرو کا معتقد ہے لیکن طوائفوں کو ان کے مزار سے خاص طور پر عقیدت ہے۔ سال میں دو بار عرس لگتا ہے۔ طوائفیں غزلیں گاتی ہیں۔ قوال قوالیاں سناتے ہیں۔ . . . . . جتنی آمدنی مجھے اس عرس کے موقع پر ہوتی ہے اس سے پانچ اسکول اور دس ہسپتال کھولے جاسکتے ہیں۔ لیکن مجھے ہسپتالوں اور اسکولوں سے غرض؟ مجھے شراب چاہیے، خوب صورت عورتیں۔ جوا کھیلنے کے لیے روپیہ اور ساری نعمتیں مجھے پیر بینی گرو کی عنایت سے میسر ہیں . . . . پیر بینی گرو جو نہ کبھی پیدا ہوا، نہ مرا۔ لیکن جس نے مجھ جیسے قلاش کو پانچ سال کی قلیل مدت میں بھیک منگے سے جاگیردار بنا دیا۔" (زردی کسی طور پر . . . .)

کپور سیاست دانوں سے نہیں ڈرتے۔ ان کی تحریروں میں ایک اہم کردار پولیس انسپکٹر ہے جو انسانی زندگی کا محافظ تو بنا بیٹھا ہے مگر اس کے ذہن کی تعمیر ایسے آب و گل سے ہوئی ہے کہ وہ "دشمنِ جاں" کے روپ میں سامنے آتا ہے:

"ایک پولیس انسپکٹر ایک مشتبہ شخص کے گھر کی تلاشی لے رہے تھے۔ انھوں نے کتابوں کی ایک الماری کھولی۔ اور کتابوں کے ناموں پر نظر دوڑانے لگے۔ انھوں نے ایک کتاب نکال کر پوچھا: "اس کتاب میں کیا لکھا ہے؟" "پڑھ لیجیے۔" "میں ذرا انگریزی کم سمجھتا ہوں۔" "تو پھر رہنے دیجیے۔" "نہیں آپ یہ چند سطر جو اس کے گرد پوش پر لکھی ہیں پڑھ کر سنائیے۔" "لکھا ہے کہ جس ملک میں آزادئ تحریر و تقریر پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں وہ ملک مہذب کہلانے کا حق دار نہیں۔" "یہ الفاظ قابلِ اعتراض ہیں۔" "یہ پنڈت نہرو کے الفاظ ہیں۔" "پھر ٹھیک ہیں۔"

کہا جاتا ہے کہ نیک نیت لوگوں کو اپنی موت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ چناں چہ کنہیا لال کپور کا مورخہ ۱۸ مارچ ۱۹۸۰ء کو خواجہ عبدالغفور کے نام لکھا گیا خط ان کے آخری خطوط ہی سے ہے اس تحریر میں قہقہوں کے ساتھ آنسوؤں کے قطرے بھی شامل ہیں۔ لکھتے ہیں:

"آپ کا دوسرا عنایت نامہ پڑھ کر باچھیں کھل گئیں۔ خاص طور پر یہ فقرے پڑھ کر منہ میں پانی بھر آیا کہ جشنِ کپور کا اہتمام کیا جائے گا۔ جہاں ایک معقول نذرانہ بھی پیش کیے جانے کی امید ہے۔ سوچا آپ کی خدمت میں عرض کیا جائے: حضور نذرانہ بھجوا دیجیے جشن رہنے دیجیے۔ یہاں ان دنوں اپنے سب سے چھوٹے لڑکے مسٹر سریندر کپور کے ہاں پونا میں ہوں اور یہاں ہی اب مقبرہ بنوانے کا ارادہ باندھا ہے۔ اگر مناسب نذرانہ مل جائے تو مقبرہ کی تعمیر شروع کر دوں۔"

مئی ۱۹۸۰ء میں کپور کا انتقال پونا ہی میں ہوا۔ یہ بھی اردو ادب کا المیہ ہے کہ کنہیا لال کپور طنز و مزاح کی دنیا میں منفرد حیثیت رکھنے کے باوجود وہ مقام حاصل نہ کر سکے جس کے وہ مستحق تھے۔ چناں چہ خود فرماتے ہیں:

"قسمت، حکومت اور احباب کا شاکی ہوں کہ ان تینوں نے میرے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جس کا میں مستحق تھا۔ حالاں کہ عمر بھر زندگی نے مجھ سے اور میں نے زندگی سے مذاق کیا۔ اس کے باوجود میرا نظریۂ حیات قنوطی ہے رجائی نہیں:

زندگی در گردنم افتاد بیدل چارہ نیست   شاد باید زیستن، ناشاد باید زیستن

نریندر لوتھر

قسط (۱۱)

جھنڈا بھرتارے

سفرنامہ امریکہ

ایک لمبی اڑان — ہم امریکہ کے مغربی ساحل سے مشرقی ساحل پہنچ گئے۔ اِس اڑان کی وجہ سے تین گھنٹے اور خرد برد ہو گئے۔ امریکہ میں لوگ وقت کی قدر اِس لیے بھی کرتے ہیں کہ وہاں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں جو وقت لگتا ہے وہ تو ایک طرف، اُس کے علاوہ بھی سرکاری جمع خرچ میں وقت ضایع ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں ایسی بات نہیں ہے۔ آپ مُلک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چلے جائیں مجال ہے وقت اپنی جگہ سے ہلے۔ ہندوستان مہاکال کا ملک ہے جب کہ امریکہ اینٹی ٹائم سکیل کا۔ یہاں ہم وقت کاٹنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ وہاں لوگ وقت بچانے کے طریقے سوچتے ہیں۔

آخر جیت وقت کی ہوتی ہے۔ یہاں بھی، وہاں بھی —

امریکہ میں وقت کا اتنا کنفیوژن رہا کہ اس کا حساب رکھنے کے لیے ہمیں ایک کیلکولیٹر خریدنا پڑا —

واشنگٹن میں اشوک اور سونا، ہمارے میزبان ہمیں لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ آدھ گھنٹے میں ہم اُن کے خوبصورت بنگلے میں پہنچ گئے۔ اب تک تو ہم سٹیج کے سنٹر میں تھے اور ہماری پوچھ تاچھ ہوتی تھی لیکن واشنگٹن پہنچنے پر فوکس آہستہ آہستہ بیگم پر شفٹ ہونا شروع ہو گیا۔ اب ڈرامے کا دوسرا ایکٹ شروع ہونے لگا تھا جس میں زیادہ نمایاں رول ہیروئین کا تھا اور وہ تھیں ہماری بیگم۔ اب ہماری حیثیت ایک ریٹائرڈ ایکٹر کی سی ہو رہی تھی۔ ویسے بھی ہماری صحت اب اتنی اچھی ہو گئی تھی کہ ہم اکیلے دو تین گھنٹے آسانی سے گھوم پھر سکتے تھے۔ اب ہماری شخصی آزادی بھی بڑھا دی گئی تھی۔ سچ ہے امریکہ ایکٹروں کا ملک ہے۔

اشوک آئی۔ اے۔ ایس افسر ہے جو ہندوستانی سفارت خانے میں متعین ہے۔ اس کی ایک بیوی ایک بیٹی، ایک آیا، شہر سے باہر ایک خوبصورت سے گھر میں رہتے ہیں۔ اُس کنبے کے سب افراد ہنستے دیکھے

لہجے میں بات کرنے والے ہیں۔ وہ بہت ہی مخلص اور شفیق میزبان ثابت ہوئے۔ خاص طور پر اشوک کی بیوی سونا واقعی بڑی ہی دل والی عورت ہے۔ نہ جانے اُس کے والدین نے اُس کا اتنا مناسب نام کیسے چُنا۔ ہوسکتا ہے کہ ایسے ہی نام کی وجہ سے وہ اتنی اچھی نکلی ہو۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ نام اچھا رکھنا چاہیئے۔ اُس کا اثر غیر شعوری اور دُور رس ہوتا ہے۔ سونا کی خصلت اتنی اچھی ہے کہ اگر اس کا نام کچھ اور بھی ہوتا تو ہم بدل کر سونا ہی رکھ دیتے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ہمیں ایسا قدم اُٹھانے کی ضرورت نہیں پڑی۔

اشوک ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ بانکا اور شوقین بھی ہے۔ امریکہ جانے کے بعد سب سے پہلا کام اُس نے یہ کیا کہ ایک نئی مرسیڈیز بینز MERCEDEZ - BENZ یعنی ایم۔ بی کار خرید لی اور جلد ہی وہ 'ایمبی' کار کا ایکسپرٹ بن گیا جو بھی نیا ہندوستانی واشنگٹن آتا ہے وہ کار خریدنے کے بارے میں اشوک کی صلاح لیتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی شہرت اتنی پھیل گئی کہ کئی بار تو امریکہ کے دُور دُور کے شہروں سے ہندوستانیوں کے فون آنے لگے۔ اُس کے امریکہ جانے کے چھ مہینے بعد 'ایمبی' کار کی فروخت میں اتنا اضافہ ہوگیا کہ ایمبی کار کمپنی نے اشوک کو اپنا آنریری ڈیلر بنانے کی آفر دی لیکن چونکہ ابھی جرمن ڈوبکی کشتیوں کی خرید کی بات چیت چل رہی تھی اس لیے اشوک نے یہ آفر قبول نہیں کی۔

اشوک اور سونا بہ ظاہر بڑے سکون سے رہ رہے تھے لیکن اِدھر کچھ عرصے سے سونا کو یہ شک ہوگیا تھا کہ اُس کے اور اشوک کے درمیان کسی اور کا سایہ آگیا ہے۔ اس وجہ سے وہ کئی بار اچانک اُداس سی ہو جاتی۔ اُسے یہ وہم ہوگیا تھا کہ اشوک اُس سے زیادہ اپنی کار کو پیار کرتا ہے۔ اُس نے نوٹ کیا تھا کہ کئی بار آدھی رات کو اشوک اپنے بستر سے غائب ہوتا ہے۔ آخر اُسے پتہ چلا کہ وہ گیراج میں جاکر اپنی "ایمبی" کار کے ساتھ باتیں کرتا ہے اور وہ بھی جرمن میں۔ ہم نے کہا کہ اشوک کو تو جرمن آتی نہیں ـــ سونا نے کہا "یہی تو تشویش کی بات ہے۔ مجھ سے تو پنجابی میں بھی بات نہیں کرتا اور اپنی "ایمبی" کے لیے خُفیہ طور پر جرمن سیکھ لی ہے۔ عشق میں انسان کیا کیا نہیں کرسکتا"۔ ہم نے سونا سے پوچھا کیا اشوک تمہیں کار میں بیٹھنے دیتا ہے۔ اُس نے جواب دیا "ہاں" اِس پر ہم نے سونا کو تسلی دی کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ اگر کوئی خاوند اپنی بیوی کو اپنی نئی 'ایمبی' میں بیٹھنے دے تو وہ یقیناً اپنی بیوی کو پیار کرتا ہے۔

اشوک ہمیں ہر روز اپنی کار میں لے جاکر مرکزی واشنگٹن میں چھوڑ دیتا۔ ہم وہاں سارا دِن سیر و سیاحت کرتے رہتے اور شام کو ایک مقررہ وقت اور جگہ پر سے وہ ہمیں واپس لے آتا۔ واشنگٹن نئی دہلی کی طرز کا شہر ہے، سرکاری شہر۔ وہ امریکہ کی راجدھانی ہے۔ سرکاری دفتروں کے علاوہ وہاں چند تاریخی عمارتیں اور عجائب گھر بھی ہیں۔ ان میں سے بیشتر عمارتیں اور دفاتر ایک مستطیل احاطے QUADRANGLE میں ہیں۔ اس طرح واشنگٹن میں تمام قابلِ دید مقامات ایک ہی مقام پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ واشنگٹن میں صرف ایک ہی مقام قابلِ دید ہے۔ یہاں کی کئی عمارتیں تو واقعی تاریخی اہمیت کی حامل ہیں اور چند میں صرف دل بہلانے کے اور وقت کاٹنے کے ذرائع مہیا کئے گئے ہیں۔ سب سے مشہور عمارت وہائٹ ہاؤس یعنی "سفید مکان" ہے۔ یہ مکان ہر چار سال میں ایک بار کرائے پر اُٹھا دیا جاتا ہے۔ یہ اُس شخص کو دیا جاتا ہے جو دُنیا کا سب سے

طاقت ور شخص ہو۔ اُس کو چُننے کے لیے قومی انتخابات ہوتے ہیں۔ امریکہ میں دو قومی پارٹیاں ہیں۔ ایک کا نشان ہاتھی ہے دوسرے کا گدھا۔ کئی بار چُنے ہوئے شخص کو چار سال مزید رہنے کی اجازت بھی دے دی جاتی ہے۔ ایک شخص لگاتار بیس برس تک اس مکان میں رہا اُس کا نام 'روز ویلٹ' تھا۔ اُس بے چارے کی ٹانگیں فالج کی ماری ہوئی تھیں۔ اس بنا پر اُس نے درخواست دی کہ اُسے وہیں رہنے دیا جائے۔ اس واقعہ کے بعد امریکہ کے دستور میں ترمیم کر دی گئی۔ اب کسی شخص کو اُس میں ۸ سال سے زیادہ رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ جو شخص وہاں رہتا ہے اُس کو امریکہ کا پریسیڈنٹ یعنی صدر کہا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا نائب بھی چُنا جاتا ہے۔ اُس کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ اگر پریسیڈنٹ کسی وجہ سے مر جائے تو وہ فوراً اُس مکان میں منتقل ہو جائے۔ امریکنوں کو یہ وہم ہے کہ یہ گھر کبھی خالی نہیں رہنا چاہیئے — آج کل وہاں ریگن نامی ایک شخص رہتا ہے جو پہلے ایک ریاست کا گورنر تھا اور اُس سے پہلے ایک ایکٹر — ایکٹروں کا لیڈر بننے کا فیشن امریکہ ہی سے شروع ہوا۔ آج کل یہ رواج ہندوستان میں بہت زور پکڑ گیا ہے۔ اب ایک تجویز پیش کی گئی ہے کہ الیکشن کے لیے ایکٹنگ کی شرط ایک ضروری قابلیت قرار دی جائے اور ووٹ دینے کا حق صرف اُنھیں لوگوں کو دیا جائے جو ہفتے میں کم از کم ایک فلم دیکھتے ہوں۔

ہم نے وائٹ ہاؤس کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا لیکن دیکھنے میں یہ عمارت اتنی بڑی اور شاندار نہیں تھا کہ اس کا دبدبہ ہے۔ ہندوستان میں کئی کلکٹروں کے سرکاری مکان اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ ہندوستان کا کوئی سرکٹ ہاؤس۔ یہ عمارت چاروں طرف سے بڑی آسانی سے دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کی پچھلی طرف ایک چھوٹا سا کھمبا ہے۔ وہ امریکہ کا مرکز ہے اور اسی نقطہ سے امریکہ کے تمام فاصلے ناپے جاتے ہیں۔ ہم نے یہاں سے اشوک کے گھر کا فاصلہ ناپا، بالکل صحیح نکلا۔ اس مکان کو باہر سے تو خیر بڑی آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے لیکن اندر سے بھی دیکھنے کی عام اجازت ہے۔ امریکہ کے پریسیڈنٹ اور اس کی بیوی کو صرف شام کے وقت اس گھر کو استعمال کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ سارا دن پریسیڈنٹ تو دفتر میں رہتا ہے اور اس کی بیوی مکان کے ایک کونے میں دبکی رہتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُن سے اس مکان کا کرایہ نہیں لیا جاتا۔ ہم نے اس مکان کے پیچھے کی طرف کھڑے ہو کر تصویر کھنچوائی کیوں کہ اس کے سامنے کھڑے ہو کر تصویر کھنچوانا تو عام ہے۔ ایک بار ہمارا ارادہ ہوا کہ ریگن سے مل آتے لیکن طرفین کی مصروفیت کی وجہ سے ہم کوئی ایسا وقت نہ نکال سکے جو دونوں کے لیے مناسب ہوتا اگر ہم دونوں مل پاتے تو یقیناً عالمی کشیدگی قدرے کم ہو جاتی۔ لیکن قسمت نے یہ کام گرباچوف کے تفویض کیا تھا۔ ہمارے ایما پر یہ دونوں لیڈر بعد میں ملے ہم نے اپنی ملاقات اگلی بار پر رکھ چھوڑی۔

واشنگٹن کی تاریخی مستطیل کے ایک طرف کانگریس کی عمارت ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ کانگریس نے امریکہ میں بھی اتنا اچھا آفس رکھا ہوا ہے۔ ان دنوں کملاپتی ترپاٹھی کانگریس کے کارگزار صدر تھے۔ ہم نے اُن کے بارے میں پوچھا کہ چلیے اُن سے ذرا گپ شپ کر لیتے ہیں۔ لیکن پتہ چلا کہ ان دنوں وہ ہندوستان آئے ہوئے تھے۔ بعد میں خبر آئی کہ انھوں نے کارگزار صدر سے استعفا دے دیا ہے۔ نتیجتاً یہ ملاقات بھی نہ ہو سکی اس طرح ہم نے کانگریس کے اندرونی اختلافات کے بارے میں اپنا رد عمل ادا کیا۔

”کانگریس کی اپنی لائبریری بھی ہے۔ اس میں دنیا کی بیشتر کتابوں اور ان کے مصنفوں کے نام درج ہیں۔ ہماری پچھلی کتابوں کی کاپیاں چند سال پہلے یہاں سے سرکاری طور پر منگوائی گئی تھیں۔ ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ آیا وہ کتابیں لائبریری میں ہیں یا نہیں۔ ہمیں بڑی خوشی ہوئی جب ہم نے اُس لائبریری کے انڈکس میں ”ایل“ کے تحت اپنا نام بھی پایا۔ اس کے بعد ہمیں یقین ہوگیا کہ اس لائبریری کا معیار واقعی بہت اونچا ہے۔

(بعد میں پتہ چلا کہ یہ ہندوستانی کانگریس کا دفتر نہیں تھا بلکہ امریکن پارلیمنٹ کا۔ وہاں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کو ملا کر کانگریس کیا جاتا ہے۔ ان دنوں یہ دونوں ایوان بند تھے ورنہ ہمیں یہ غلط فہمی نہ ہوتی)

ہم نے وہ عمارت بھی دیکھی جس میں سب سے پہلے کانگریس کے اجلاس ہوتے تھے۔ اُس کے بازو سپریم کورٹ کی پرانی عمارت بھی ہے۔

واشنگٹن میں ایک قطب مینار بھی ہے۔ اس کے اوپر لفٹ کے ذریعہ پہنچا جاتا ہے۔ اس کا نام واشنگٹن مانیومنٹ ہے۔ یہ جارج واشنگٹن کی یاد میں بنایا گیا تھا۔ واشنگٹن امریکہ کا پہلا صدر تھا۔ اُس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

یہاں ایک عمارت میں سو سال پہلے کی ایک صنعتی نمائش جوں کی توں رکھی ہوئی ہے۔ اُس نمائش کی دو نقلیں تیار کی گئی تھیں۔ ایک واشنگٹن میں رکھی گئی اور دوسری حیدرآباد دکن بھیج دی گئی۔ حیدرآباد میں ہر سال یہ نمائش یکم جنوری سے چالیس دن تک دکھائی جاتی ہے۔ اس نمائش کو دیکھ کر اور اس کا مقابلہ واشنگٹن کی نمائش سے کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ پچھلے سو سالوں میں ہم صنعتی اعتبار سے امریکہ سے کتنے آگے نکل آئے ہیں۔ جہاں واشنگٹن کی نمائش بالکل جوں کی توں پڑی ہے، وہاں ہماری نمائش میں ہر سال نئے نئے ایٹم کا اضافہ ہوتا ہے ___ مٹھائی والے، گول گپے بیچنے والے، ہریانہ کے دیسی جوتے نئے نئے سٹالوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

واشنگٹن کی تاریخی عمارتوں میں تین چار مختلف قسم کے عجائب گھر بھی ہیں۔ ایک اُڑان کی تاریخ کا میوزیم ہے۔ اُس کو دیکھنے میں ایک پورا دن لگ گیا۔ ہمیں سب سے زیادہ اچھا سمتھ سونین انسٹی ٹیوٹ (SMITHSONIAN INSTITUTE) لگا۔ ہم نے دنیا بھر میں اتنا شاندار اور بڑا میوزیم نہیں دیکھا۔ اس میں بڑی اچھی چائے، کافی اور دوسرے مشروبات ملتے ہیں۔ ہم نے اس میوزیم میں لنچ بھی کھایا۔ اس میوزیم کے مقابلے میں ہمارے عجائب گھر مردہ خانے لگتے ہیں۔ ہم نے وہاں کئی ایک تصویروں کی کاپیاں خریدیں اور اس طرح اس انسٹی ٹیوٹ کی آمدنی میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔

یہاں جس عمارت نے ہمیں سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ایک مندر ہے۔ اس مندر کے اندر ایک خاصی بدصورت مورتی کرسی پہ بیٹھی ہوئی ہے۔ یہ مندر یونانی طرز کا ہے اور اس کا نام ہے لنکن میموریل۔ یہ ایک بہت ہی سادہ مگر پُرشکوہ عمارت ہے اور ہمیں اس میں اس لیے پناہ لینی پڑی کیوں کہ اس وقت برفباری شروع ہوگئی تھی اور سردی بھی کڑاکے کی تھی۔ زندگی میں پہلی بار بیگم کو سردی سے بے حال ہوتے دیکھا۔ ہم، چند سیڑھیاں چڑھ کر لنکن کے بُت کے نیچے عقیدت اور احترام کے جذبے کے ساتھ کئی منٹ خاموش کھڑے رہے۔ بُت کے پیچھے دیوار پر لکھا ہے ”ابراہم لنکن ___ اس عمارت میں جیسے ہر امریکی کے دل میں اُس کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی“ ہم لنکن کو بچپن (اپنے بچپن) سے جانتے ہیں اور وہ دنیا کی چند شخصیتوں میں سے ایک ہے جس کا ہم تہہ دل سے احترام کرتے ہیں۔

لنکن امریکی تاریخ کا سب سے بڑا ہیرو ہے حالانکہ اس نے امریکہ کو آزادی نہیں دلائی۔ وہ آزادی کے سو سال بعد پریسیڈنٹ بنا اور صرف پانچ سال کے لیے پریسیڈنٹ رہا۔ اس نے جیل نہیں کاٹی۔ مصیبتیں نہیں برداشت کیں۔ اس کی لافانی شہرت کی وجوہات تین ہیں۔ ایک ــــ اس نے ایک بڑی ہی لڑاکو بیوی کے ساتھ ساری عمر گزار دی اور اسے طلاق نہیں دی۔ آج کل کے امریکن جو بات بات پر طلاق دے دیتے ہیں، اس بات کی خاص طور پر داد دیتے ہیں۔ آخر تنگ آکر اس عورت سے نجات پانے کے لیے کسی شخص کو ترغیب دی کہ وہ اسے گولی سے اڑا دے (اسے یعنی خود کو، بیوی کو نہیں) لنکن چونکہ وکیل تھا اس لیے اسے معلوم تھا کہ وہ اگر بیوی کو قتل کر دیتا تو پکڑا جاتا ــــ اس سے دو فائدے ہوئے۔ ایک تو وہ ازدواجی جہنم سے نجات پا گیا اور دوسرے وہ شہید ہو گیا۔ اس کا دوسرا کارنامہ تھا کہ اس نے اپنی صدارت کے دوران ایک ایسی جنگ چھیڑی جو امریکہ کے اندر ہی لڑی گئی جس میں امریکن آپس میں ہی لڑ پڑے۔ امریکہ کے بیشتر صدور نے امریکہ کو دوسرے ملکوں کے ساتھ لڑایا۔ لیکن لنکن نے امریکہ کو خانہ جنگی سکھائی۔ چنانچہ شمال کی جنوب کے ساتھ جنگ ہوئی۔ اس جنگ کے نتیجے کے طور پر امریکن حبشی جو اس وقت تک غلام تھے آزاد ہو گئے۔ اس نے یہ بانگِ دہل اعلان کیا کہ کوئی قوم آدھی آزاد اور آدھی غلام نہیں رہ سکتی۔ ہم بھی اس سے متفق ہیں۔ یہ آدھی پچھلی بات ہمیں بھی پسند نہیں۔ لنکن بہت زبردست مقرر تھا اور اپنی تقریریں نہ صرف خود لکھا کرتا بلکہ انہیں خود ہی پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ اس نے اپنی سب سے مشہور تقریر خانہ جنگی کے دوران گیٹس برگ (GETTYS BURG) کے مقام پر کی تھی۔ اس مختصر تقریر کو پڑھ کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سو سال کی مدت کے بعد رونگٹے کھڑے رکھنے کی قابلیت بہت کم تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ اسی تقریر میں اس نے جمہوریت کی مشہور تعریف بیان کی تھی ”عوام کی حکومت، عوام کے لیے حکومت عوام کے ذریعے حکومت“۔ لنکن امریکہ کا مہاتما گاندھی ہے۔ وہاں کا جواہر لال نہرو ہے۔

تیسری بات جس کے لیے وہ بہت ہر دلعزیز ہوا وہ تھی اس کی حسِ طنز و مزاح۔ وہ بذلہ سنجی میں کمال رکھتا تھا۔ وہ پہلا زندہ دل امریکن تھا۔ اگر وہ حیدرآباد میں پیدا ہوتا تو یقیناً زندہ دلانِ حیدرآباد ہوتا اور اگر وہ آج زندہ ہوتا تو ہم اس کو اپنا صدر بنا دیتے حالانکہ اس کے لیے مجھے خود اس عہدے سے دست بردار ہونا پڑتا۔

لنکن اکثر لطیفوں اور حکایتوں میں بات کیا کرتا تھا۔ لیکن اس کے لطیفوں میں پھکڑپن، پھوہڑپن یا تحریف نہیں تھی جن سے کسی کا دل دکھے بلکہ پنچ تنترا، ایسپ فیبلز (AESOP'S FABLES) اور ستی کی حکایتوں کے عکس ہوا کرتے جو سرچشمۂ ہدایت تھے، نصیحت کے حامل تھے اور نصیحت بھی ایسی جس کی قیمت اور مٹھاس کا احساس بعد میں ہوتا ہے بالکل اسی طرح جیسے کچا آملہ کھانے پر (اور جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے لاتعداد لطیفے اس کے نام کے ساتھ چسپاں کر دیئے گئے ہیں) لنکن کے بے شمار لطیفے ہیں، لنکن کے لطیفوں پر مبنی کئی کتابیں لکھی گئیں۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، لنکن قدرے بدصورت تھا۔ ایک بار اس کے سیاسی حریف نے الیکشن کے دوران ایک تقریر میں کہا کہ لنکن بہروپیہ ہے۔ اس کے دو چہرے ہیں۔ ایک آپ اب دیکھیں گے اور ایک الیکشن کے بعد۔ اس کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ لنکن نے جواباً صرف اتنا کہا کہ اگر میرے دو چہرے ہوتے تو کیا میں یہ بدصورت چہرہ لے کے آپ کے سامنے حاضر ہوتا؟

ایک بار جب وہ پریسیڈنٹ تھا، اس کے ایک دوست نے کسی شخص کی نوکری کے لیے سفارش کی۔ لنکن نے

ایماندارسے اُسنے لینے کو کہا۔ جب وہ شخص لنکن سے مِل چکا تو اُس دوست نے نتیجہ کے بارے میں دریافت کیا۔ لنکن نے قدرے معنکھیں سے کہا۔ مجھے اس کا چہرہ پسند نہیں آیا۔ دوست نے حیران ہو کر کہا اپنے چہرے کے لیے تو کوئی بھی ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ لنکن نے جواب دیا۔ چالیس سال کی عمر کے بعد ہر شخص اپنے چہرے کے لیے ذمہ دار ہوتا ہے۔ ایک اور شخصیت جس کے لیے امریکنوں کے دِلوں میں احترام ہے وہ ہے امریکہ کا جواں مرگ پریسیڈنٹ جان کینیڈی۔ وہ دو سال سے بھی کم عرصہ کے لیے صدر رہا اور لنکن کی طرح گولی کا نشانہ بن کر شہید ہوا۔ اُس نے جو وعدے کئے تھے وقت نے اُن کو ایفا کرنے کی مہلت نہ دی۔ جو امیدیں اُس نے امریکنوں کے دِلوں میں اُبھاری تھیں وہ پوری کرنے سے پہلے ہی، وہ اُٹھ گیا۔ کئی لوگوں کا خیال ہے وہ کھلنڈرا نوجوان صدر خوش نصیب تھا کہ وہ "پکڑے" جانے سے پہلے ہی چلا گیا۔ وہ امریکہ کے آرلنگٹن قومی قبرستان میں دفن ہے جہاں صرف قومی ہیرو اور سپاہی دفنائے جاتے ہیں۔ یہ بہت پُروقار قبرستان ہے اور یہاں لاکھوں سپاہیوں کی سادہ یادگاریں ہیں۔ یہاں جان کینیڈی کے ساتھ اس کا ایک بیٹا اور بیٹی بھی دفن ہیں۔ اُس کا چھوٹا بھائی رابرٹ کینیڈی بھی جسے صدارتی انتخابات کی مہم کے دوران ہلاک کر دیا گیا تھا یہیں دفن کیا گیا۔ کینیڈی کی قبر پر ایک مشعل ہمیشہ جلتی ہے۔ اس قومی یادگار کے سامنے کھڑے ہو کر انسان کا دل تاریخ کی عظمت اور المیہ سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ واپس آکر بھی لگتا ہے۔

واشنگٹن میں وہ مقام بھی دیکھا جا سکتا ہے جہاں ۱۹۶۲ء میں وہاں کے حبشی لیڈر مارٹن لوتھر کنگ نے امریکہ کے کالے لوگوں کو گوروں کے حقوق، برابر سیاسی حقوق دِلوانے کے لیے ایک تاریخی جلوس نکالا تھا (یہاں یہ بات واضح رہے کہ اس کا مصنّف کے ساتھ کسی قسم کا رشتہ نہیں تھا۔ مارٹن لوتھر کنگ ایک پادری تھا جو کالے لوگوں کا سیاسی لیڈر بن گیا تھا۔ اُسے رات میں نیند نہ آنے کی بیماری تھی اور جو تھوڑی بہت نیند اُسے آتی بھی تھی تو اُس میں وہ بھیانک اور ڈراؤنے خواب دیکھا کرتا تھا۔ ایک خواب جو وہ اکثر دیکھا کرتا تھا وہ یہ تھا کہ کالے اور گورے لوگ ایک ہی میز پر اکٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ وہ اس خواب کو حقیقت میں بدلنا چاہتا تھا۔ سی۔ آئی۔ اے کے ڈاکٹروں نے اس کا بہتیرا علاج کیا لیکن اس کی یہ خرابی بڑھتی گئی۔ وہ دن رات امریکنوں کے درمیان برادری اور برابری کا پیغام دہرائے جاتا۔ اُس نے یہ بھی واضح کیا کہ "میں (ایک کالا شخص) گورے شہری کا بھائی بننا چاہتا ہوں ـــــ اس کا سالا نہیں!"

آخر ایک دن کسی نے اُسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس طرح اُسے بیماری سے نجات مل گئی۔ آپ نے نوٹ کیا ہو گا لنکن، کینیڈی اور لوتھر کنگ اِس باب کے تینوں ہیروؤں کو امریکنوں نے ہلاک کیا۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی امریکی لیڈروں کو ہلاک کیا گیا۔ یہ امریکہ کی شاندار روایت ہے۔ وہ لوگ اپنے بدترین مجرموں کو بجلی کی کرسی پر بٹھاتے ہیں اور اقتدار کی کرسی پر بیٹھے ہوئے یا بیٹھنے کے خواہشمند رہنماؤں کو گولی سے اُڑا دیتے ہیں۔ اس طرح بہت بُرے اور بہت اچھے ہر قسم کے لوگوں کے درمیان توازن رکھا جاتا ہے۔ اس سسٹم میں صرف متوسط قسم کے لوگ بچ پاتے ہیں بلکہ وہ پھلتے پھولتے ہیں

اور متوسط طبقے [illegible]

دنیا کی ہر جمہوریت میں سیاسی [illegible]

یہ [illegible]

بات چیت کی ضرورت اس لیے پڑی کہ ڈاکٹر ہماری بساط سے زیادہ پیسے مانگ رہے تھے ہمیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ امریکہ میں ڈاکٹر سودے بازی کرتے ہیں۔ آخر ہمیں ایک ایسا ہندوستانی ملا جس نے اپنے خاندان کے درجنوں لوگوں کا علاج ایک ڈاکٹر سے کروایا تھا اور وہ ڈاکٹر اب اُسے ہر مریض کے لیے "ہول سیل" ریٹ دینے پر تیار ہوگیا تھا۔ اس طرح ہمیں آدھے دام پر علاج کروانے کی سہولت مل گئی۔

بیگم کا آپریشن ہمارے آپریشن کے مقابلے میں بچوں کا کھیل تھا۔ کہاں ہمارے دل کا آپریشن اور کہاں بیگم کے موتیا کا آپریشن اور وہ بھی بائیں آنکھ کا! اور پھر مرد کے دِل کے آپریشن کے مقابلے میں عورت کی آنکھ کے آپریشن کا کیا مقابلہ!؟ کیونکہ بالغرض اگر آنکھ کا آپریشن ناکام ہو جاتا ہے تو جان تو باقی رہتی ہے اور پھر ایک آنکھ سے سب کچھ وہ دیکھا جا سکتا ہے جس کے لیے لوگ دو آنکھیں استعمال کرنے کی فضول خرچی کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک دل کے آپریشن کا تعلق ہے۔ دل تو ایک ہی ہوتا ہے اور یہ اُنیسویں صدی کے غالب کا زمانہ تو ہے نہیں کہ بازار سے جا کر ایک نیا دل خرید لائیں۔ آج کل تو یہ شئے نایاب ہے۔ خیر: ہمارا آپریشن تو ہو چکا تھا اور اب بیگم کی باری تھی۔ عین مناسب تھا کہ سنگینیِ حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ممکنہ سنجیدگی کا اظہار کیا جائے۔

بیگم کا سرجن یہودی تھا۔ اُس کے والدین روس سے آئے تھے۔ ڈاکٹر کی بیوی جو اُس کے کلینک کی مینیجر بھی تھی، ایرانی تھی۔ شاہ کے زمانے کی ایرانی ـــ کام کے دوران اُن دونوں میں عشق ہوگیا تھا۔ ہم نے پہلی بار اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ یہودی مرد جنسی آسودگی کے تحت عشق بھی کرتے ہیں حالانکہ ہم نے سُن اور پڑھ رکھا تھا کہ یہودی صرف کام کے یا پیسے کے یا بیک وقت دونوں کے عاشق ہوتے ہیں۔ اُس ڈاکٹر کی بیوی کے حُسن کو دیکھ کر یہودی ڈاکٹر کے ذوق کی داد دینا پڑی، اور ڈاکٹر کی ذہانت کو دیکھ کر اُس عورت کی ہوشیاری کی۔ المختصر ہمارے پاس جتنی بھی داد تھی۔ ہم نے دونوں میں برابر تقسیم کر دی۔ فی الوقت ہمارے پاس داد کا اسٹاک بالکل ختم ہو چکا ہے (اسی لیے ناظرین نے نوٹ کیا ہوگا کہ ہم نے مشاعروں میں جانا بھی بہت کم کر دیا ہے۔ داد کے بغیر مشاعرے میں جانا تو خالی جیب رسٹورنٹ میں جانے کے مصداق ہے)

ڈاکٹر ڈوبروف نے ایک دن آنکھ ٹسٹ کی۔ اگلے دن پینتالیس منٹ میں آپریشن کر دیا۔ ہم نے آپریشن تھیٹر کے باہر بیٹھ کر ایک T.V کے ذریعہ پورے کا پورا آپریشن دیکھا بلکہ تین آپریشن دیکھے۔ دو بیگم کے آپریشن سے پہلے اور ایک بیگم کا۔ بیگم کا آپریشن شروع ہونے تک تو ہمیں اس کام میں اِتنی جانکاری حاصل ہو چکی تھی کہ ہم نے آپریشن کے دوران ڈاکٹر ڈوبروف کی کئی بار مدد بھی کی۔ مثلاً ہم نے صرف آنکھوں کو دیکھ کر مریضہ کی شناخت کی اور جب چیر پھاڑ زیادہ خطرناک مرحلے میں داخل ہوئی تو اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹر ہماری اس سپرٹ سے بہت متاثر ہوا۔

اس آپریشن کی خاصیت یہ تھی کہ اس کے بعد عینک لگانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ ہندوستان میں موتیا کے آپریشن کے بعد مریض کو موٹی عینک لگانا پڑتی ہے جس سے وہ اُلّو لگتا ہے۔ اگر عینک نہ لگائی جائے تو مریض چمگادڑ بن جاتا ہے اور خواہ مخواہ ٹکریں کھا کھا کر گرتا پڑتا ہے۔ اس آپریشن کے بعد آنکھ کی پُتلی کے اندر ایک لینس لگا دیا جاتا ہے یعنی ایک اندرونی عینک لگا دی جاتی ہے بغیر فریم کی۔

بیگم خود تھیٹر سے چل کر باہر آئیں۔ ہم نے معمول کے مطابق ڈاکٹر سے ہدایات لیں اور

پرہیز کے بارے میں پوچھا۔ ڈاکٹر فاتحانہ انداز میں مسکرایا اور پھر گویا ہوا۔ یہ چاہیں تو خود کار چلاکر گھر جا سکتی ہیں۔ وہاں جاکر فٹ بال کھیل سکتی ہیں۔ ٹی۔ وی دیکھ سکتی ہیں یا پھر سو سکتی ہیں۔ کسی قسم کا پرہیز ضروری نہیں۔ ہم نے گھر آکر اشوک اور ستونا سے پوچھا۔ اُن کے پاس کوئی فٹ بال نہیں تھا۔ لاچار بیگم نے ٹی۔ وی دیکھنے پر ہی اکتفا کیا۔ اُس کے بعد آرام کیا۔ ہم نے بھی ازراہِ ہمدردی آرام کیا۔ مزید دو دن تک الفیا طاً اور آرام کیا گیا۔ اس کے بعد پھر سیر و سیاحت کا پروگرام شروع ہوا۔ فرق اِتنا تھا کہ اب ہماری سیر و سیاحت تاریخی مقامات کی کم اور ڈپارٹمنٹ سٹورز کی زیادہ ہونے لگی تھی۔ حالانکہ اشوک اور ستونا ہمیں اپنی شاپنگ ملتوی کرنے کی صلاح دیتے رہتے۔ لیکن ایسی عورت کو جس کی بائیں آنکھ کا آپریشن ہوا ہو اور جس کے ساتھ ایک ایسی عورت ہو جس کو خاص طور پہ ہر چیز خریدنے پر سفارتی ڈسکاونٹ ملتا ہو کیسے اور کتنی دیر تک روکا جا سکتا ہے (سچ تو یہ ہے کہ خود ہم بھی اب شاپنگ کی طرف مائل ہو رہے تھے)

بیچارہ اشوک دن کے وقت ہمیں سیر کراتا اور شام کے وقت شاپنگ۔ ویسے اُسے یہ کام بُرا نہیں لگتا تھا کیونکہ وہ خود بھی شاپنگ کا شوقین تھا۔ اب ہر شام ہمارے ساتھ شاپنگ کے پیکٹ آنے لگے۔

نتیجتاً اب ہمارا سامان بھاری اور ہماری جیب ہلکی ہونا شروع ہوگئی۔

رؤف خیر (حیدرآباد)

(منظوم خاکہ)

عاشق

ہے ادب پر متواتر عاشق
نام جس کا ہے مناظر عاشق

جو گنیں ہوں کہ منادر عاشق
سب ہیں مسحور کہ ساحر عاشق

گھر ہے بچوں کے دلوں میں اوّل
اور خواتین پہ آخر عاشق

خوش گمانی ہے وطیرہ اس کا
بدگمانی سے ہے قاصر عاشق

سوچ ہے سود و زیاں سے اونچی
کوئی بنیا ہے نہ تاجر عاشق

دسترس حرف و نوا پر اس کو
شعر معشوق ہے شاعر عاشق

رائے بے باک تو لہجہ سفّاک
اور معصوم بظاہر عاشق

جیت اس کی ہے کہ کھیل اس کا ہے
دام میں آئے نہ شاطر عاشق

کشتِ زرخیز میں کیا کیا کچھ ہے
صورتِ خرمنِ وافر عاشق

ان گنت چاہنے والے اس کے
ہے وہ معشوق بظاہر عاشق

تیغ کی تیغ قلم کا ہے قلم
یا تو دشمن رہے یا پھر عاشق

چڑ بہت زرد صحافت سے اُسے
کوچۂ سبز کا طائر عاشق

ہے نہایت ہی عدیم الفرصت
گھر میں معشوق تو باہر عاشق

دشمنوں سے بھی سمجھ لیتا ہے
دوست احباب کی خاطر عاشق

عشق چھٹتا ہے کہیں لٹنے سے
دل فلسطین تو یاسر عاشق

شخصیت اس کی ہے کیا کیا تہہ دار
خالق و طابع و ناشر عاشق

کام بنتا نہیں بے صبری سے
ہے اسی واسطے صابر عاشق

کوئی پرچہ ہو کہیں سے نکلے
ہے کسی طرح سے حاضر عاشق

آسماں ہو کہ زمیں ہو کوئی
ہے سفر شرط۔ مسافر عاشق

کچھ تو تعمیر کا پہلو نکلا
حسن مزدور ہے آجر عاشق

چاند اگر شق ہے تو ثابت حق ہے
صاحبِ دیدۂ ظاہر عاشق

ڈاکٹر راہی قریشی گلبرگہ

راہی + غالب

اس کے ابا ساتھ ہیں اور پیچھے کتا جائے ہے
میں اسے دیکھوں؟ بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

اس دفعہ ایسڈ (ACID) ملا کر دی ہے ساقی نے شراب
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

دستِ و لب کے درمیاں ہے کیا "ببل گم" کا کمال
کھینچتا ہے جس قدر، اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

دل عجب دل ہے کہ دونوں بیویوں کے قرب میں
مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

پائلٹ بننے سے اتنا فائدہ اس کو ہوا
رنگ کھلتا جائے ہے، جتنا کہ اڑتا جائے ہے

BAG میں چوری کا مال اور سامنے C.I.D.
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

اس کے گھر میں شور ہے T.V. کا، V.C.R. کا
نغمہ ہو جاتا ہے واں، گر میرا نالہ جائے ہے

انسپکٹر نے تو کچھ پایا نہیں تفتیش میں
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

ریلوے انجن میں اب ڈیوٹی ہے راہی رات دن
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

قطعات — اعجاز وارثی (سنبھل)

اردو اور وعدے: مرمری لوحوں پر حروف جلی
لکھ دیں پُر شکوہ و عالی شان
کاش اس ملک میں کہیں ہوتا
جھوٹے وعدوں کا ایک قبرستان

سیلی زناں: لباسِ نیم عریاں میں جو گزری ایک دوشیزہ
کہا میں نے ذرا سنیے یہ کیا اندازِ مستی ہے
رکی اور منہ چڑا کر بولی، نو وارد سے لگتے ہو
تمہیں یہ بھی نہیں معلوم یہ اندھوں کی بستی ہے

●

امکان: میرا حلیہ دیکھ کر کہتے ہیں لوگ
آپ اور نیتا، خدا کی شان ہے
میں یہ کہہ دیتا ہوں مستقبل کی خبر
منتری ہونے کا بھی امکان ہے

صلاحیت: کھٹولا اپنی صلاحیت کا بڑے سلیقے سے سامنے لائے ہیں
عجب انداز سے چمچے ہیں بقول خود، پیار بانٹتے ہیں
یہ فکر رہتی ہے بڑھ نہ جائے کسی کا قد ان کے پست قد سے
وہ چھوٹے پودوں کو سینچتے ہیں بڑے درختوں کو چھانٹتے ہیں

خامہ بگوش

دورِ حاضر میں قصیدہ گوئی تنقید کی صورت میں زندہ ہے

ہم ٹی وی نہیں دیکھتے، کیوں کہ ہمیں وقت ضائع کرنے کے بہتر طریقے معلوم ہیں، لیکن پچھلے دنوں اتفاق سے ہمیں ایک پروگرام دیکھنے کا موقع ملا۔ جی خوش ہوگیا۔ پروگرام دیکھ کر نہیں، انتظار حسین کو دیکھ کر، یہ عورتوں کا پروگرام تھا جس میں موصوف مہمانِ خصوصی تھے۔ خوشی کے ساتھ ہمیں حیرت بھی ہوئی کہ انتظار حسین تو اپنے ناولوں اور افسانوں میں بھی نسوانی کرداروں کو بادلِ ناخواستہ شامل کرتے ہیں، آج خود اتنی بہت سی خواتین کے درمیان کسی افسانوی کردار کی طرح کیوں کر موجود ہیں۔

یہ ایک ادبی پروگرام تھا اور محفل میں شریک خواتین ممتاز ادبی شخصیات تھیں۔ موضوعِ گفتگو وہ مسائل تھے، جو ادب تخلیق کرنے والی خواتین کو درپیش ہیں۔ سب سے پہلے پروین شاکر نے یہ شکایت پیش کی کہ جب کوئی خاتون ادبی سفر شروع کرتی ہے تو اسے اعتبار حاصل نہیں ہوتا، یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسے کوئی اور لکھ کر دیتا ہے۔ پروین شاکر نے اپنی مثال دیتے ہوئے کہا، میرے بارے میں پہلے یہ کہا گیا کہ میرے نانا جان مجھے لکھ کر دیتے ہیں، پھر یہ کہا گیا کہ احمد ندیم قاسمی لکھ کر دیتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی مرد اس قسم کے شعر کیسے لکھ سکتا ہے:

کمالِ ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اس کی دلھن سجاؤں گی

پروین شاکر، بلاشبہ بہت اچھی شاعرہ ہیں، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ موجودہ دور میں اردو شاعری کو مالا مال بنانے میں ان کا حصہ دوسروں سے کہیں زیادہ ہے، لیکن ہمیں ان کی اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ مذکورہ شعر صرف کوئی خاتون ہی کہہ سکتی ہے۔ یہ شعر محترمہ کے نانا جان نے یقیناً نہیں لکھا تھا، لیکن اردو شاعری کی تاریخ میں بہت سے ایسے نانا جان گزرے ہیں جنہوں نے اس قسم کی شاعری کی ہے۔ اس وقت انشا، اللہ خاں انشا اور سعادت یار خاں رنگین یاد آرہے ہیں جن کے دیوانوں میں اس قسم کے سینکڑوں اشعار ملتے ہیں جو ان کی نواسیوں سے منسوب ہوتے تو اچھا تھا۔ نمونے کے طور پر دونوں کا ایک ایک شعر ملاحظہ فرمائیے:

میں ترے صدقے نہ رکھ اے مری پیاری روزہ
بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ (انشا)

گرمی کے مارے ناک میں آئی ہے میری جاں
باجی اڑھا دے لاکے کوئی ہلکی اوڑھنی (رنگین)

ڈیڑھ سو سال پہلے اس قسم کی شاعری کو ریختی کہا جاتا تھا جسے "خوشبو" "خود کلامی" اور "صد برگ" جیسے خوبصورت ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

انتظار حسین صاحب نے شاکر سے پوچھا "آپ کے بارے میں لوگوں کو یہ شک کیوں ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا لکھ کر دیتا ہے عصمت چغتائی کے بارے میں کبھی کسی نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔" اس موقع پر کشور ناہید نے پروین شاکر کی وکالت کرتے ہوئے کہا! "ہم بھی جب کالج میں پڑھتے تھے، تو سارے بزرگ بغیر کہے OWN کر لیتے تھے کہ ہاں کوئی بات نہیں۔ لکھ کر دے دیا تھا۔ OWN کرنے میں کیا حرج ہے۔ اگر بزرگوں کو عزتِ سادات ایسے ہاتھ آ جائے۔

معلوم نہیں وہ کون بزرگ تھے جو کشور ناہید کی شاعری کے ذریعہ عزتِ سادات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ حالاں کہ وہ جس قسم کی شاعری کرتی ہیں اسے OWN کرنے سے عزتِ سادات کا حاصل ہونا تو الگ رہا، بزرگی بھی مشکوک ہو جاتی ہوگی۔ کشور ناہید نے پروین شاکر کی وکالت کے جوش میں ایک بنیادی نکتے کو نظر انداز کر دیا ہے۔ پروین کے بارے میں عام لوگ کہتے تھے کہ وہ دوسروں سے لکھواتی ہیں جبکہ کشور ناہید کے بارے میں بزرگ خود اپنی زبانِ مبارک سے فرماتے تھے کہ ہم لکھ کر دیتے ہیں۔ عام لوگوں کی بات کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے لیکن بزرگوں کا احترام اجازت نہیں دیتا کہ ہم اُن کو جھوٹا سمجھیں۔

بزرگوں کا احترام کرنا ہم نے کشور ناہید سے سیکھا ہے۔ اور وہ بھی ٹی وی کا زیرِ تبصرہ پروگرام دیکھنے کے دوران۔ ایک موقع پر انتظار حسین نے کہا کہ عصمت چغتائی کے ہاں اظہار کی جو بے باکی ملتی ہے، وہ آج کل کی لکھنے والیوں میں نظر نہیں آتی۔ اس پر کشور ناہید نے کہا کسی بزرگ کو غلط ثابت کرنا اچھا نہیں لگتا تاہم یہ ضرور کہوں گی کہ انتظار حسین صاحب نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ اس کے بعد کشور ناہید نے کچھ لکھنے والیوں کے نام لیے جن کے ہاں اظہار کی بے باکی پائی جاتی ہے۔ یہ نام سن کر انتظار حسین معنی خیز انداز میں مسکرا دیئے جیسے یہ کہہ رہے ہوں کہ میں نے انہیں لکھنے والوں کی وجہ سے تو پڑھنا چھوڑا ہے۔ ادبی معیار کے بغیر اظہار کی بے باکی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اظہار کی ایسی بے باکی تو طبّی کتابوں اور سیاست دانوں کے بیانات میں بھی ملتی ہے۔

کشور ناہید کی وجہ سے انتظار حسین خاصے سہمے سہمے نظر آ رہے تھے اور ایک موقع پر انہوں نے کہہ بھی دیا کہ میں کشور ناہید سے بہت ڈرتا ہوں اس پر کشور ناہید نے فاتحانہ انداز سے کہا "علم کے معاملے میں میری آپ کی لڑائی نہیں ہے۔" محترمہ نے یہ بڑی عارفانہ بات کہی ہے۔ لڑتے ہم اسی وقت ہیں، جب کسی چیز کے کھو جانے کا خوف ہو یا کسی چیز کے ہاتھ آنے کی توقع ہو، جو چیز موجود ہی نہ ہو اس کے لیے لڑنا بے کار ہے۔

اس پروگرام میں نقادوں کی خاصی مذمت بلکہ مرمت کی گئی۔ ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ عورت اور مرد میں تفریق کرتے ہیں۔ مردوں پر خوب دل کھول کر صفحے سیاہ کرتے ہیں اور عورتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ انتظار حسین نے اس کی سختی سے تردید کی اور یہ کہا کہ آج تک کسی نقاد نے یہ نہیں کہا کہ ہم قرۃ العین حیدر کو اس لیے اہمیت نہیں دیں گے کہ وہ عورت ہے یا اس کے کسی ہم عصر ادیب کو اس لیے اہمیت دیں گے کہ وہ مرد ہے۔

افسوس کہ استاد لاغر مراد آبادی کو اس پروگرام میں مدعو نہیں کیا گیا ورنہ وہ تصویر کا دوسرا رخ پیش کرتے اور بتلاتے کہ ہمارے بعض نقادوں نے تو صرف عورتوں ہی پر لکھنے میں عمریں گزار دی ہیں۔ اردو تنقید کی تاریخ میں جو طویل ترین مقالہ لکھا گیا ہے وہ ایک

شاعرہ ہی کے بارے میں ہے اور ایک مرد نقاد ہی کا نتیجۂ فکر بلکہ تجربۂ فکری ہے۔ اسی شاعرہ کے پہلے مجموعۂ کلام کی تقریبِ رونمائی کے موقع پر جو مجلّہ شائع کیا گیا تھا اس میں ۳۵ نقادوں کی رائیں شامل تھیں اور ہر رائے نقاد کے خود راستہ ہونے کی دلیل تھی۔ اس مجلّے میں قصیدے کے اسلوب میں جو تنقید ملتی ہے، اس کے چند نمونے یہ ہیں:

اس کے لہجے میں بیسویں صدی میں سانس لیتی ہوئی ایک ایسی تازگی کا احساس ہوتا ہے، جو اپنی نت نئی وارداتوں کے اظہار کے لیے کسی ...... کا انتظار کر رہی تھی۔

وہ اپنے دور کی ایک حقیقی، منفرد اور دل کش آواز ہے۔ اس آواز کے جادو سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ اس جادو سے مسحّر ہو جانا، ہم قارئین کا مقدّر تھا۔

یہ لڑکی بے پناہ قوتِ نمو کے ساتھ اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے گلستانِ سخن کا ایک ایسا نہالِ سرسبز بن گئی جس کی چھاؤں میں بیٹھ کر بڑی راحت نصیب ہوتی ہے۔

★ اگر وہ نہ ہوتیں، تو اردو شاعری شالامار باغ کی چاندنی سے محروم رہ جاتی۔

★ وہ ایک ایسی ارتقا آشنا شاعرہ ہے جس کے پاؤں دھرتی کے سینے میں پیوست ہیں اور حنائی انگلیاں افلاک کی ردا میں ستارے ٹانک رہی ہیں۔

★ جب اس کی کوئی چیز پڑھتا ہوں تو یوں لگتا ہے، جیسے اردو شاعری کی دلہن زندگی کے سارے خوب صورت جذبے اور خواب دل میں سموئے، سیج کے سچے گوٹے سے مرصّع عروسی جوڑا پہنے بیٹھی ہے۔

کیا اس قسم کی آرا پڑھنے کے بعد بھی یہ کہنا درست ہوگا کہ ہمارے نقاد لکھنے والیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں؟

کشور ناہید نے اپنے اسلوبِ خاص میں نقادوں کی خوب خبر لی۔ انھوں نے فرمایا: "ہمارے نقاد سولہ صفحے کا جو مقالہ لکھتے ہیں اس میں سات سطروں کا ایک پیراگراف عورتوں کے لیے بھی مخصوص کر دیتے ہیں، جس میں لکھنے والیوں کو نمبر دیے جاتے ہیں، سب سے پہلے شکل و صورت اور خوب صورتی کے لحاظ سے، پھر شوہر کے عہدے کے لحاظ سے اور آخر میں ادب کے لحاظ سے۔

کشور ناہید کی شاعری سے زیادہ، ان کی اسی قسم کی باتوں سے ان کی بے باکیِ اظہار کا اندازہ ہوتا ہے۔ کشور کی اس رائے پر ہم اتنا اضافہ کریں گے کہ ہمارے نقاد صرف عورتوں ہی سے خصوصی سلوک روا نہیں رکھتے، بلکہ مردوں کے بارے میں بھی لکھنے سے پہلے یہ دیکھ لیتے ہیں کہ ان کا عہدہ کتنا بڑا ہے، وہ دوسروں کو فائدہ یا نقصان پہنچانے کی کتنی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کسی ادبی انعام کے جج بنتے ہیں یا نہیں۔

اس پروگرام میں تعلیمی نصاب پر بھی گفتگو کی گئی۔ ایک محترمہ کو شکایت تھی کہ نصاب میں ایسی غزلیں ہوتی ہیں جو عشقیہ نہیں ہوتیں۔ دوسری محترمہ نے لقمہ دیا۔ "حالاں کہ عشق تو انسان کی تہذیب کرتا ہے۔" تیسری محترمہ نے تجویز پیش کی کہ اگر میٹرک کے طالبِ علم کو محبوب کے حوالے سے صحت مندانہ جذبات کے بارے میں کچھ بتا دیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں کیوں کہ مغربی ملکوں میں اسکولوں میں جنسی تعلیم بھی نصاب کا حصہ ہے۔ آخر میں ایک صاحبہ نے شکوہ کیا

کہ نصاب بناتے وقت استادوں سے تو مشورہ کیا جاتا ہے، مگر ادیبوں سے رائے نہیں لی جاتی۔

جس وقت ہم یہ پروگرام دیکھ رہے تھے، اتفاق سے اس وقت وہاں محکمۂ تعلیم کے ایک عہدہ دار بھی تشریف رکھتے تھے۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ آپ نصاب بناتے وقت ادیبوں سے مشورہ کیوں نہیں کرتے۔ انھوں نے جواب دیا "ہم تعلیمی نصاب مرتب کرتے ہیں اس لیے ماہرینِ تعلیم سے مشورہ کیا جاتا ہے جب کبھی عشق و عاشقی کا نصاب مرتب کرنا ہوگا تو ادیبوں کو ضرور زحمت دی جائے گی"۔

رؤف پاریکھ (کراچی)

فرعون انویسٹمنٹ کمپنی اَن لمیٹڈ

مصر قدیم اور مریخ کے تجارتی تعلقات اور خلائی حادثے میں فرعون کی ہلاکت

سائنس دانوں سے ہم بہت تنگ ہیں آئے دن نت نئے گل کھلاتے ہیں۔ ماضی اور مستقبل کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کائنات تباہ ہونے والی ہے کبھی انکشاف ہوتا ہے کہ سورج بجھنے والا ہے اب سوئیڈن کے سائنس دانوں نے ایک پھلجھڑی چھوڑی ہے فرماتے ہیں کہ قدیم مصر اور مریخ کے درمیان تجارتی تعلقات قائم تھے۔ مزید یہ کہ تت نامی فرعون ایک خلائی جہاز کے حادثے میں ہلاک ہوا تھا گویا:

پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی
جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

امریکی سائنس دانوں کے مطابق زمین کی رفتار سست ہو رہی ہے اور چاند ہماری زمین سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن ان سوئیڈن والوں کی اُڑان تو ان سے بھی اونچی ثابت ہوئی۔ چاند کو چھوڑ کر مریخ پر جا پہنچے۔ ایسی خبریں پڑھ کر ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ یہ سائنس اور فلکیات وغیرہ سب ڈھکوسلا ہے بھلا مشتری اور نیپچون پر کون گیا ہے؟ اور انہیں کس نے دیکھا ہے؟ ادھر یہ ماہرین فلکیات ہیں کہ ان سیاروں کی پل پل کی خبر دیتے ہیں۔ ان کی چال اور رخ بتاتے ہیں۔ حساب لگا کر کہتے ہیں کہ اگر فلاں سیارہ اسی رفتار سے چلتا رہا تو اتنے کروڑ اور اتنے لاکھ سال بعد فلاں کہکشاں سے ٹکرا جائے گا۔ یہاں کل کی خبر نہیں اور یہ جانے کس زمانے کی بات کرتے ہیں اور اس کار خیر میں کروڑوں ڈالر پھونک ڈالتے ہیں۔ بڑی بڑی دوربینیں اور آلات لگائے گھات میں بیٹھے رہتے ہیں۔ ساتوں آسمانوں میں تاک جھانک ہوتی رہتی ہے۔

یہ ماہرین خواہ مخواہ اتنی کھکھیڑ کرتے ہیں۔ اِن سے اچھے تو ہمارے پروفیسر اللہ دتہ ہیں۔ ہر ماہ "قسمت" کے نام سے ایک رسالہ چھاپتے ہیں۔ پہلے فٹ پاتھ پر بیٹھتے تھے اور قسمت کا حال بتاتے تھے اب رسالہ نکال لیا ہے۔ اس رسالے میں سیاروں کی چال، ستاروں کا حال اور اثرات وغیرہ مع جنتری چھاپتے ہیں۔ جو چاہو معلوم کر دو محبوب قدموں میں کب آئے گا؟ روزگار کب ملے گا؟ پڑوسی کا کاروبار کب تباہ ہو گا؟ جادو ٹونے اور بھوت پریت کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟ تعویذ گنڈے کا بہترین وقت کون سا ہے؟ آپ کا ستارہ عروج پر کب آئے گا؟ اور ان ساری باتوں کا جواب وہ گھر بیٹھے حساب لگا کر معلوم کر لیتے ہیں۔ ماہرین کے برعکس جھمیلوں میں نہیں پڑتے اور پھر یہ سائنس داں، ماہرین فلکیات

اور ماہر لغویات وغیرہ جنتری دیکھے بغیر کام کرتے ہیں جبھی تو اپنی بھد اڑواتے ہیں۔ الٹی سیدھی پیش گوئیاں کر بیٹھتے ہیں۔ سمجھ دار آدمی پہلے زائچہ کھنچواتے ہیں پھر کوئی کام کرتے ہیں۔ اگر یہ سائنس داں پروفیسر اللہ دتہ کا رسالہ قسمت پڑھ کر اس میں دی گئی ستاروں کی چال کے مطابق پیش گوئی کریں تو ان کا بول بالا ہوگا۔ دشمن کا منہ کالا ہوگا۔ (یہ بھی اس رسالے میں لکھا رہتا ہے) جنتری بڑے کام کی چیز ہے اس سے ستاروں کا حال معلوم ہو جاتا ہے اور قسمت کا بھی۔ بھلا علم فلکیات کا کیا فائدہ ہے؟

اب ان سویڈن کے ماہرین فلکیات کو ہی لے لیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اہل زمین اور مریخ کے درمیان باقاعدہ کاروباری روابط قائم تھے اور مصر والوں نے لاشوں کو حنوط کرنے کی ٹیکنالوجی اہل مریخ سے حاصل کی تھی۔ مریخ والے اس کے عوض زمین سے سونا لے جاتے تھے۔ شاید وہاں بھی خواتین سونے کے زیورات پہنتی تھیں) البتہ ان کے جس انکشاف سے ہم چونک کر رہ گئے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک فرعون خلائی جہاز کے حادثے میں مارا گیا تھا۔ مریخ اور زمین کے یہ تجارتی تعلقات آج بھی قائم رہتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ جو لوگ تلاش روزگار میں دوبئی، سعودی عرب اور یورپ نہیں جاسکتے ہیں وہ شاید مریخ پر روزگار حاصل کر لیتے۔ حالانکہ جعلی ویزا وہاں کا بھی، بھائی لوگ چھاپ لیتے۔

ان ماہرین نے جو کچھ تحقیق دمائی ہے اس کو ذرا چشم تصور سے دیکھیے۔ آئیے پانچ ہزار سال قبل کے دور میں چلتے ہیں۔ یہ مصر ہے۔ قاہرہ کے قریب غزہ کے میدانوں میں بڑے بڑے اہرام سینہ تانے کھڑے ہیں۔ ان اہراموں میں سے کوئی کوئی سکریٹریٹ بلڈنگ ہے اور کوئی اسپتال ہے۔ ایک اہرام میں خلائی کمپنی کا دفتر قائم ہے ایک میں کاؤنٹر ہو رہا ہے۔ ایک اہرام میں کوئی تجارتی کمپنیوں کے دفاتر قائم ہیں۔ سڑک پر ٹریفک رواں دواں ہے۔ لوگ بھاگ آ جا رہے ہیں۔ ایک اہرام پر ... کمپنی کا دفتر ہے جس میں تت نامی فرعون بڑی فرعونیت سے بیٹھا ہے۔ ایک طرف ایئر کنڈیشنر چل رہا ہے۔ دوسری طرف ... چل رہا ہے۔ باہر سکریٹری ٹیلی فون اور انٹر کام لیے بیٹھا ہے۔ اتنے میں ایک لیڈی اسٹنٹ ... پیغام لا کر دیتی ہے۔ اسے پڑھ کر سکریٹری اندر فرعون کے پاس پہنچتا ہے اور کہتا ہے "سر! مریخ سے ٹیلکس آیا ہے۔ گزشتہ ہفتے بھیجی گئی سونے کی کھیپ ناکافی ہے۔ مزید سونا بھیجیے۔ ورنہ وہ ہمیں لاشیں حنوط کرنے کا مسالہ نہیں بھیج سکیں گے"

"لیکن کیوں؟" فرعون دھاڑا۔ "ہم نے سونا ... کے مطابق بھیجا ہے جس پر پچھلے مہینے مریخ کے نمائندے مسٹر تل تل ڈانگ نے دستخط کیے ہیں"

"سر، وہ کہتے ہیں کہ عالمی مارکیٹ میں ڈالر کے ... بڑھنے سے سونے کی قیمت کم ہوگئی ہے۔ لہٰذا جو سونا ہم نے بھیجا ہے ... "

... وہ بولا۔ "یہ ان کی ... " "وہ تو ٹھیک ہے سر! لیکن مریخ والے بڑے ضدی ہیں۔ گزشتہ سال بھی انھوں نے ... بڑھا لیے تھے کہ امریکہ میں ... تیل کا بھاؤ چڑھنے سے خام مال مہنگا ہو گیا ہے اور پھر ہمیں زیادہ ادائیگی کرنی پڑی تھی۔" سکریٹری نے جواب دیا۔

ان کو جاپانی ٹیلکس دے دو کہ اگر انھوں نے پرانی قیمت پر مال سپلائی نہ کیا تو ہم یہی چیز مشتری سے درآمد کر لیں گے بلکہ پلوٹو والے تو ہمیں پوری ٹیکنالوجی دینے کے لیے تیار تھے۔ خام مال بھی وہ ہی فراہم کرتے۔ ہم نے یہ سودا اس لیے نہیں کیا کہ ان کے فاضل پرزے بہت مہنگے تھے اور عالمی بینک سے قرضے کے لیے بھی ہمیں کو بات کرنی پڑتی۔" فرعون نے رعونت سے کہا۔

لیکن اس طرح تو ساری رقم ڈوب جائے گی جو ہم نے سونے کی صورت میں انھیں پیشگی ادا کر دی ہے۔ اور ویسے بھی جاپان والے اس مسئلے کی مارکیٹ کو ہتھیانے کی فکر میں ہیں۔ مریخ والے ان کو مہنگا سودا بیچ دیں گے۔" سکریٹری نے بے چارگی سے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ آخر ہم فرعون ہیں۔ کوئی منتخب حکومت تو نہیں۔ ہم کس چیز سے ڈریں۔" فرعون میز پر مکا مار کر دھاڑا۔

"سر اس سے بہت نقصان ہوگا اور جن لوگوں نے سرمایہ کاری کے لیے ہمیں رقمیں دی ہیں ہم انھیں منافع تو کیا اصل رقم بھی نہیں لوٹا سکیں گے بلکہ معاف کیجیے گا آپ کو سرکاری مہمان خانے میں قیام کرنا پڑے گا۔ ویسے بھی آج کل اخبارات میں سرمایہ کار کمپنیوں کے خلاف بہت کچھ آ رہا ہے۔ ایف آئی اے بھی ہماری نگرانی کر رہی ہے۔" (سکریٹری) نے سمجھا کر کہا۔

"تو پھر ہم کیا کریں؟" فرعون نے بے چارگی سے کہا۔

"آپ ایسا کریں مذاکرات کے لیے مریخ پر چلے جائیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا، مریخ والوں کو ٹیلکس دے دو کہ ہم مذاکرات کے لیے آ رہے ہیں۔ ہمارے لیے خصوصی خلائی جہاز بھیجا جائے۔" فرعون نے کہا۔

اس کے بعد کی کہانی آپ [illegible] مریخ والوں نے چالاکی کی اور فرعون کے لیے ایک کھٹارا سا خلائی جہاز بھیج دیا۔ جو راستے میں ہی دم توڑ گیا اور تباہ ہو گیا۔ اس طرح فرعون صاحب مارے گئے اور مریخ والے ان کا سونا ہضم کر گئے۔

اس کہانی کی تصدیق سویڈن کے عالم فاضل اور نہایت لائق و قابل سائنس دانوں اور ماہرینِ فلکیات کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو ہم نے ابتدا میں نقل کیا ہے۔ آپ کو شاید اس کہانی پر یقین نہیں آ رہا۔ لیکن یہ کہانی سو فیصد سچی ہے۔ چلیے صاحب ہم نے جھوٹ گھڑا ہے۔ اتنے قابل سائنس داں تو جھوٹ نہیں بول سکتے۔

مزید تصدیق کے لیے پروفیسر اللہ دتہ کے رسالے میں دی گئی جنتری دیکھیے۔ اس میں بھی لکھا ہے کہ مریخ والوں کا زائچہ کچھ اچھا نہیں۔ خاص طور پر کاروباری معاملات میں ایمان داری کا خانہ کمزور ہے اور وہاں جن لوگوں نے فرعون انوسٹمنٹ کمپنی آف لمیٹڈ میں سرمایہ کاری کی تھی۔ ان کی رقمیں ڈوب گئیں بالکل اسی طرح جس طرح آج کل کراچی میں برساتی مینڈکوں کی طرح نکل آنے والی انوسٹمنٹ کمپنیوں میں سے کئی کا بھٹہ بیٹھ گیا ہے اور عوام ان کے مالکوں کو چراغ لے کر ڈھونڈ رہے ہیں۔

پروفیسر ایم، اے حفیظ بنارسی
صدر شعبۂ انگریزی (پوسٹ گریجویٹ)
مہاراجہ کالج۔ آرہ

ڈیلی پسنجر

تقدیر میں لکھی ہے جو ڈیلی پسنجری
افسانۂ حیات کا عنواں ہمیں سے ہے
سکریٹریٹ ہو، بینک ہوں یا ہوں کچہریاں
کالج کے لوگ بھی ہیں ہماری سپاہ میں
وہ آدمی نہیں جو رہے ROCK کی طرح
اک بیاگ لے کے گھر سے نکلتے ہیں صبح دم
جاڑا ہو یا کہ گرمی ہو یا فصلِ برشگال
ہم پھاندتے ہیں دوڑ کے اسٹریٹ اور لین
ہم روز پلیٹ فارم کی محفل سجاتے ہیں
گاڑی میں ہم تو کرتے ہیں دُنیا کی سیر بھی
ٹی ٹی سے اور گارڈ سے یارانہ رکھتے ہیں
سیزن ٹکٹ خریدتے ہیں بے دِلی سے ہم
رکھتے ہیں سب کو محوِ سخن اپنی بات سے
دِکھلاتے ہیں ہم اپنی زباں دانی کی بہار
رہتا ہے یہ خیال کسی طرح سے گھسُو
تنقید کرتے جاتے ہیں ہر راہبر پہ ہم
ہم تاش کی بساط بچھاتے ہیں اس طرح
افسر بھی اور کلرک بھی چلتے ہیں ساتھ ساتھ
مدھم سُروں میں گانے بھی ہم گاتے رہتے ہیں

رکھتی ہے ہم کو رقص میں لیلائے زندگی
سچ پوچھئے تو "گردشِ دوراں ہمیں سے ہے
ہر انجمن کی جان ہمیں سے ہے بے گماں
شامل کچھ اہلِ ذوق بھی ہیں اس گناہ میں
پھرتے ہیں ہم تو ایک SHUTTLE COCK کی طرح
اور لوٹتے ہیں رات کو ہو کر نڈھال ہم
یکساں ہمارا حال ہے یکساں ہماری چال
رہتی ہے فکر یہ کہ نہ چھوٹے ہماری ٹرین
گاڑی میں سیٹ کے لیے دھکّے بھی کھاتے ہیں
چلتا ہے اپنا کام ٹکٹ کے بغیر بھی
ہم ہر طرح کا ہاتھ میں پروانہ رکھتے ہیں
کیوں اپنی جیب ہلکی کریں سرخوشی سے ہم
اخبار چھین لیتے ہیں اَوروں کے ہاتھ سے
ہر مسئلے پہ کرتے ہیں ہم بحث زور دار
"ستنسد کھوَن" سمجھتے ہیں کمپارٹمنٹ کو
کرتے ہیں اعتبار بس اپنی نظر پہ ہم
کھولے کوئی کتابِ محبت کو جس طرح
ڈبّے میں سب ہی پہلو بدلتے ہیں ساتھ ساتھ
کاجو سمجھ کے مونگ پھلی کھاتے رہتے ہیں

کمیٹی کو ہم بناتے ہیں اس آن بان سے
ہنستے ہوئے گزرتے ہیں ہر امتحان سے

مفہوم بھائی چارے کا سب کو بتاتے ہیں
دس دس جواں کو دو کی جگہ پر بٹھاتے ہیں

گرتے ہیں ہم مُنہ پہ دانۂ انگور کی طرح
سر پہ اُچھلتے ہیں کبھی لنگور کی طرح

آگے ہم ایک موجِ رواں بن کے بڑھتے ہیں
جب چاہیں ہم اُترتے ہیں جب چاہیں چڑھتے ہیں

ہے کون ہم سے بڑھ کے محبت کا پاسباں
سینے میں اپنے رکھتے ہیں ہم دردِ کارواں

ملتے نہیں کسی سے کبھی فاصلے کے ساتھ
جب چلتے ہیں تو چلتے ہیں ہم قافلے کے ساتھ

آفس میں کام کرنے کی فرصت نہیں ہمیں
"کہتے ہیں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں ہمیں"

ہم واپسی کے واسطے رہتے ہیں بے قرار
کرتے ہیں دفتروں میں بھی گاڑی کا انتظار

'سنڈے' ہمارے واسطے ہے رحمتِ خدا
یہ صبح زرنگار ہے یہ شام جانفزا

بازار میں نکلتے ہیں جھولا لیے ہوئے
بیگم کی شادمانی کا ساماں کیے ہوئے

ڈیلی پسنجروں کا بھی اک خاندان ہے
مانو نہ مانو اپنا بھی کچھ مان پان ہے

تعداد بڑھ رہی ہے ہماری جو روز و شب
کیوں رشک کی نظر سے ہمیں دیکھتے ہیں سب

فضلِ خدا سے اور ترقی کریں گے ہم
اپنے حقوق کے لیے آگے بڑھیں گے ہم

ہم اپنا وزن اپنا نیا WEIGHT مانگیں گے
اک دن ہم اپنا اک الگ اسٹیٹ مانگیں گے

○

فیض الرحمن فیض
(رائچور)

مولانا

ساتھ غنڈوں کو لائے مولانا
خوب ایک ساتھ کھائے مولانا

وضع قطع تو ہے شریفوں کی
ڈھونگ کیسے رچائے مولانا

سوئے میخانہ بھی قدم اُٹھے
کس کو اُلّو بنائے مولانا

تھے کرایہ سے ہوگئے قابض
اس طرح گھر ڈبائے مولانا

کیسے تاثیر اب زبان میں ہو
مفت کا مال کھائے مولانا

مرغ بریانی کی لیے ہوئے ڈش
خوب جوہر دکھائے مولانا

ہاتھ اُٹھا میرا لینے بریانی
ٹانگ اپنی اڑائے مولانا

جب نہ آئے کسی بھی دن دعوت
بیٹھے مُنہ کو پھلائے مولانا

ڈاکٹر سید حامد حسین
(بھوپال)

قاضی کامیاب

دوسروں کو کہتے سن کر ہم بھی انھیں قاضی کامیاب ہی کہتے ہیں۔ کوئی دس بارہ سال پہلے کی بات ہے کہ وہ پڑوس میں ہماری طرح ہی ایک کرایے کے مکان میں آکر رہے تھے اس وقت ان کی آنکھوں پر ایک دھندلا سا چشمہ، سر پہ اُڑتے اڑتے بال، پیشانی پر گرد کی موٹی تہ، کاندھے پر ایک کھادی کا جھولا اور پاؤں میں ہوائی چپل ہوتی تھی کچھ دن تو وقت معمول کے مطابق آہستہ آہستہ چلتا رہا لیکن اس کے بعد اس نے جو رفتار پکڑی تو دیکھتے ہی دیکھتے قاضی کامیاب پورے افق پر گھٹا بن کر چھا گئے اور خورد و کلاں، وزیر و فقیر سب اُن کے دام میں اسیر نظر آنے لگے۔ ہم آج بھی اس کے پڑوس میں اسی کرایے کے مکان میں ہیں جس کی چھت اب پہلے سے زیادہ ٹپکنے لگی ہے۔ لیکن قاضی صاحب ایک زیرِ زمین منزل کو ملا کر چھ منزلہ عمارت کے مالک ہیں اور پورا شہر ان کا کلمہ گو ہے۔

یہی دیکھیے کہ جب کل دو ہفتے کی غیر حاضری کے بعد ہمارا دودھ والا آیا تو ہم نے وجہ پوچھی۔ بولا "صاحب، بھینس کرایے پہ دے دی تھی"۔ "بھینس بھی کرایے پہ چلتی ہے"۔ ہم نے حیرانی سے دریافت کیا۔ "ہاں صاحب قاضی نے لگا دی تھی"۔ "کیسے"۔ "وہ ایک بڑے افسر ہیں نا، ان کی بھینس کو قاضی صاحب نے اسپتال میں داخل کروا دیا تھا، ان کے یہاں بچہ"۔ "لیکن ان کی بھینس کو کیا ہوا تھا"۔ "کچھ نہیں صاحب گابھن تھی۔ قاضی صاحب نے اس کے لیے اسپیشل وارڈ بک کروا دیا تھا"۔ "لیکن اس کی کیا ضرورت تھی"۔ "ارے صاحب اسپیشل وارڈ بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ ایک ہی تو ہے۔ وہ تو قاضی صاحب نے بڑے ڈاکٹر کے لڑکے کا انگریزی اسکول میں داخلہ کروایا تھا اس لیے مل بھی گیا"۔ "تو قاضی صاحب کی اسکول والوں سے بھی پہچان ہے"۔ "ارے انھوں نے اسکول کی عمارت کے نقشے جو پاس کروا کے دیے تھے"۔ "لیکن اسکول کی زمین پر تو کوئی جھگڑا تھا"۔ "ارے وہ تو اس آدمی نے اس لیے کھڑا کیا تھا کہ کچھ لے لا کر صلح صفائی کرے گا۔ اسے اپنی بیٹی کا جہیز جو ادا کرنا تھا۔ تو پھر ہوئی شادی"۔ "ہاں قاضی صاحب نے پرنسپل صاحب کے ایک رشتہ دار سے کم جہیز میں شادی کرا دی"۔ "تو گویا قاضی صاحب کے پاس ہر مسئلے کا حل ہے"۔ "ہاں صاحب خدا ان کا بھلا کرے وہ ہر ایک کی مشکل چٹکی بجا کر حل کر دیتے ہیں"۔

پہلوئے خودی میں ایک پھانس کی شکل میں ہمارے وجود کا ایک مستقل حصہ بن چکے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ہماری بیگم بھی ہمارے وجود کی معنویت کو قاضی کامیاب کے پیمانے سے ناپا کرتی تھیں۔ لیکن اب تھک ہار کر انھوں نے نکھٹے پن سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ لیکن سمجھوتوں کے نرم لحاف میں دبکی ہوئی خود ہماری انا کو اس وقت شدید جھٹکا لگا جب ہماری بیٹی نے ایک دن یہ شکایت کی کہ اُس کی ہم سبق سہیلیاں اُس سے پوچھتی ہیں کہ "ہمارا اپنا گھر کیوں نہیں ہے۔ ہمارے پاس کار کیوں نہیں ہے۔ ہمارے پاس ٹیلی فون کیوں نہیں ہے جب کہ کامیاب انکل کے یہاں دیکھتے ہی دیکھتے یہ سب کچھ آگیا"۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ کرب جو ابھی تک شاید میرے اپنے وجود کا حصہ تھا، اب ایک سیڑھی اور اُتر رہا ہے۔ آگے چل کر محرومی کی یہ تلخی اور پھیلے گی اور پھیلتی جائے گی۔ میں نے محسوس کیا گویا میں ایک ایسا گناہ گار ہوں جس کے گناہ کا سلسلہ ابد تک پھیلا ہوا ہے اور میں نے طے کیا کہ میں اس کرب کے دائرے کو اور پھیلنے نہ دوں گا۔

سب سے پہلا کام تھا اپنا مکان تیار کروانا۔ محکمہ سے قرض لینے کی درخواست مدّتوں سے ہیڈ آفس کے بڑے بابو کی میز پر دبی پڑی تھی۔ چناں چہ اگلے ہی دن صبح بابو جی کے گھر پہنچا۔ ان کے سالے کی مرگی سے لے کر تو دان کے گنج پن تک ہر ایک کے بارے میں پوچھا اور مجرب نسخے بتائے۔ معلوم ہوا کہ شریمتی بابو کے پاؤں میں چوٹ آگئی ہے اور بابو جی کو روزانہ انھیں مرہم پٹی کے لیے اسپتال لے جانا پڑتا ہے اور اسی وجہ سے فائیلوں کی طرف توجہ کرنے کا بھی موقع نہیں مل رہا ہے۔ موقع غنیمت جان کر ہم نے پیش کش کی کہ شریمتی بابو کو ہم اپنی موپیڈ پر اسپتال لے جایا کریں گے اور بابو جی فائیلوں کی طرف توجہ کریں۔ اگلے دن موپیڈ کو نئے تولیے سے صاف کر کے وقت سے پہلے بابو جی کے یہاں جا پہنچے۔ تفصیلی تیاری کے بعد شریمتی بابو نمودار ہوئیں۔ انھیں دیکھنے کے بعد ہماری سانس جو باہر آئی تو اس نے پھیپھڑوں میں فوراً واپس لوٹنے سے انکار کر دیا۔ شریمتی جی وہ مجسّم قاف تھیں جس سے لفظ قوی ہیکل لکھا جاتا ہے۔ ہم نے موپیڈ کی سیٹ کو دیکھا اور پھر شریمتی جی کی جانب۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سیٹ کے مختصر جزیرے پر اس برِ اعظم کی سمائی کس طرح ہوگی۔ قدرت نے ایسے ہی آڑے وقتوں کے لیے پڑوسی بنائے ہیں۔ چناں چہ چند لوگوں کی مشترکہ کوشش سے شریمتی بابو کو سیٹ پر نصب کیا گیا۔ لیکن اب ہم کہاں بیٹھیں۔ ہینڈل اور ہماری معزز سواری کے درمیان صرف ایک کبوتر کی گنجائش تھی۔ یوں ہمیں کبوتر سمجھے جانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن قوانینِ قدرت کے تحت بیٹھنے کے لیے بھی تو کچھ چاہیے ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ہم نے اس بُرے وقت کے لیے کوئی آنکڑا تک نہیں لگوایا تھا۔ پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ بابو جی اپنے نہانے کے لباس میں ایک دم باہر نکل آئے اور نعرے، چیخ اور فوجی کمان کے مشترکہ تاثر کے ساتھ انھوں نے پوچھا "کیا ہو رہا ہے"؟ تو ہم بے اختیاری کی حالت میں خلا میں جا سمائے۔

ہمیں نہیں معلوم کہ موپیڈ کس طرح اسٹارٹ ہوئی۔ ہوش تب آیا جب ... چوراہے پر جمع ہجوم نے ٹریفک کا جائزہ لینے کے لیے ہماری جانب سر گھمایا اور دیکھتے ہی ... موپیڈ کے تحت الحلق ...

ظاہر ہے اس کی سماعت پر کوئی اثر نہیں پیدا کیا۔ چنانچہ دھماکہ دار . . . تصادم ہوا اندھیرا ہوتا تو شاید چنگاریاں بھی دکھائی دیتیں۔ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی بھاگتی دوڑتی دنیا ہی چند ساعتوں کے لیے نہیں تھم گئی بلکہ ایسا لگتا تھا کہ کچھ دیر میں ساری خدائی، دوسری، تیسری اور چوتھی منزلوں سے اُتر کر سڑک پر آجائے گی۔ موپیڈ اور ہم دو پاٹوں کے درمیان آچکے تھے۔ موپیڈ کا ڈھونڈھنے پر بھی کوئی پرزہ سلامت نہ ملا۔ جہاں تک ہمارا سوال ہے۔ دو دن تک ڈاکٹر ہماری ہڈیوں کے ٹکڑوں کو پہچان کر جوڑتے رہے۔ سنا ہے شریمتی بابوجی ہرونڈ کی طرح مرہم پٹی کرا کے ہنسی خوشی گھر لوٹ گئیں۔ لیکن بابوجی موم کے خول میں بند جوالا مکھی کی طرح پھٹ پڑے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم نے جان بوجھ کر ان کی عزیز بیوی کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔

یہ احساس ہو جانے کے بعد کہ اب بابوجی سے کسی تعاون کی امید نہیں، حالت بہتر ہونے پر ہم نے اپنے سکریٹری صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ چھٹی کے دن پابندی سے ان کے یہاں جانے لگے۔ ایک دن ان کے یہاں ایک اور افسر ملاقات کے لیے آئے ہوئے مہمان افسر نے ذکر کیا کہ مہینے بھر کی چھٹی سے واپسی کے بعد وہ اپنے آوٹ ہاؤس میں چوزے پالنا چاہتے تھے۔ ہمیں ایسا لگا کہ قدرت نے یہ موقع ہماری غلیل کے لیے ہی مہیا کیا ہے جس سے ہم ایک نہیں دو دو افسروں کی خوشنودی حاصل کرسکتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے فوراً پیش کش کی کہ چوزوں کا بندوبست ہم کریں گے کیوں کہ ہمارے چچا کا ایک بڑا پولٹری فارم ہے۔ پیش کش منظور کرلی گئی۔ ہم دوڑ کر بازار پہنچے اور چوزوں کے ایک بیوپاری سے بات کی۔ اس نے دوستانہ مشورہ دیا کہ اگر ہم تازہ نکلے ہوئے چوزے خرید لیں تو ایک ماہ کے بعد وہ دوگنے داموں کے ہو جائیں گے۔ بات سمجھ میں آگئی۔ بس چوزے لے کر جب گھر پہنچے تو یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ ڈھائی کمرے کے فلیٹ میں یہ چوزے کہاں رکھے جائیں۔ طے پایا کہ جب تک ان کا ڈربہ تیار نہیں ہوتا انھیں بیٹھک کے لیے استعمال ہونے والے کمرے میں رکھا جائے۔ بس پیلے پیلے، پیارے پیارے، معصوم صورت چوزے کچھ دیر فرش پہ اِدھر اُدھر گھومتے رہے اور پھر پورے کمرے پر چھا گئے۔ کرسیاں، صوفے، لیمپ، آرائش کا سامان کوئی جگہ ایسی نہ تھی کہ وہاں چوزہ نہ ہو اور جہاں اس نے اپنے پیچھے اپنا نشانِ شناخت نہ چھوڑا ہو۔ نفاست اور غلاظت کا فرق و امتیاز ختم ہوتے وقت نہ لگا۔ ہم نے بہرحال مقدرات سے سمجھوتہ کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اس عزمِ مصمم کے ساتھ آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر قدم رکھنا ہی چاہا تھا کہ دو چوزے دریافتِ کائنات کے فطری جذبہ کے دباؤ میں بیتابانہ باہر نکل آئے۔ ہم نے کسی قسم کی چیخ نکالی اور سیڑھیوں پر ان کے پیچھے لپک پڑے۔ ہماری چیخ کی امرجنسی کو ہمارے بچوں نے سمجھا وہ بھی ہمارے پیچھے دوڑے۔ ہمارے بچوں کی بے اختیاری نے فلیٹ کے دوسرے بچوں کو چوکنا کیا وہ بھی نکل آئے۔ بچوں کے ساتھ ان کے والدین بھی حقِ ہمسائیگی ادا کرنے میں ہاتھ بٹانے کے لیے دوڑ پڑے۔ لیکن اس سے قبل کہ تعاقبِ [illegible] کے خطرے سے پولیس چوکنا ہوتا ایک چوزے نے ایک تیز رفتار اسکوٹر کے سامنے چھلانگ لگا کر خودکشی کرلی اور دوسرے نے نالی میں کود کر اس عالمِ کون و فساد کے ہنگاموں سے روپوشی میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔

اسی درمیان محلے کی وہ بلی جو بیزاری کے عالم میں ہمیشہ سیڑھی پر پڑی رہتی تھی انھوں نے اپنے اعصاب میں ا...

طلسمی توانائی محسوس کی اور ہمارے ڈرائنگ روم کے نیم وا دروازے سے اندر نظر ڈالی نہ تھی کہ الہ دین کی طرح اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس سے قبل کہ ہم اس طلسمی غار کا منہ اس کے لیے بند کردیں وہ تین چار چوزوں کو لقمہ بنا چکی تھی اور آٹھ دس کو زخمی کرچکی تھی۔ ہمارے پیچھے پیچھے محلے کا پورا اُڑن دستہ بھی کمرے میں آپہنچا۔ اس کے بعد منظر اتنی تیزی کے ساتھ تبدیل ہوئے کہ ہمیں کچھ نہیں معلوم کہ کس ترتیب سے کیا ہوا۔ الغرض جب پندرہ منٹ کے بعد ہمارا ذہن، شعور و تمیز کے فوکس پر واپس آیا تو ہم نے دیکھا کہ وہ آٹھ ضرب دس فٹ کا کمرہ جسے ہم کبھی ڈرائنگ روم کہا کرتے تھے جیسے اس میں کلنگ کی لڑائی، آرمینیا کے زلزلے اور آل نیتو کے طوفان تینوں نے مل کر رقص کیا ہو۔ بکھرے ہوئے فرنیچر اور ٹوٹے ہوئے آرائشی سامان کے درمیان چند کچلے ہوئے اور زخمی چوزوں کے علاوہ باقی کہاں گئے اس کا کوئی پتہ نہ تھا۔

اس ہولناک تجربہ کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ افسروں کو خوش کرنا اتنا آسان نہیں۔ پھر بزرگوں کا یہ قول بھی یاد آیا کہ اگر آفت مول لینا ہی ہے تو اس اوکھلی میں کیوں نہ سر دو جس کے موسل کا سب سے زیادہ زوردار دھما کا ہو۔ چناں چہ ہم نے یہ طے کیا کہ اب اگر خدمت کرنا ہے تو صرف وزیر کی کریں گے۔ اگر وزیر کو اپنا بنالیا تو پھر عاقبت سنور جائے گی۔ لیکن تجربہ نے یہ بھی سکھا دیا تھا کہ جلد بازی ٹھیک نہیں ہوتی لہٰذا خوب دیکھ بھال کر مناسب موقع کا انتظار کرنا چاہیے۔ چناں چہ وزیر صاحب کے یہاں جانا شروع کردیا۔ جب وزیر صاحب باہر آتے تو ہم بھی سلام کرکے ایک طرف بیٹھ جاتے۔ ہر شخص اپنی مصروفیات پیش کرتا۔ ہم خاموش بیٹھے رہتے۔ جب وزیر صاحب اٹھ کر اندر چلے جاتے تو ہم بھی واپس ہو جاتے۔ تو یہ سلسلہ کوئی ایک ہفتہ تک چلتا رہا۔ پھر جب وہ سب کی باتیں سن چکے تو ہماری طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا کہ کیا بات ہے۔" ہم نے کہا " آپ کے درشن کے لیے آئے تھے۔"

"صرف درشن کے لیے روزانہ آتے ہو؟" ——"جی ہاں" ہم نے کہا۔

وزیر صاحب نے دروازے کے پاس کھڑے ایک شخص کو اشارہ کیا اور اندر چلے گئے۔ اس شخص نے ہم سے سخت لہجے میں کہا " ادھر آؤ" اور اندر ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا۔ اس نے ہماری جیبوں، بغلوں اور پہلوؤں کو ٹٹولا اور پھر ڈانٹ کر بولا " بیٹھ جاؤ۔ پھر اس نے ہمارا، ہمارے والد کا نام پوچھا۔ یہ بھی معلوم کرنا چاہا کہ ہم نے دہشت گردی کی کہاں کہاں ٹریننگ لی ہے اور ہمارا کن لوگوں اور گروہوں سے تعلق ہے۔ ہماری معصومیت سے اس کا مزاج اور زعادہ دونوں بگڑتے گئے۔ آخر ہم نے اس کو اپنی اندرونی جیب سے دفتر کا شناختی کارڈ نکال کر پیش کیا۔ اس نے پہلے اسے اُلٹ پلٹ کر اس طرح دیکھا جیسے وہ نقلی ہو۔ پھر اس نے برابر کے کمرے سے کسی کو فون کیا۔ واپس آکر اس نے اپنے انداز میں جو بات کہی اس کا قابلِ برداشت زبان میں یہ ترجمہ ہوتا ہے کہ ہم اب آئندہ وزیر صاحب کے بنگلے کا رخ نہ کریں۔ اس کے بعد "ورنہ" کے ساتھ جن الفاظ کا استعمال کیا ان کا کسی بھی قسم کی زبان میں ترجمہ کرنے کی قانون اجازت نہیں دیتا۔ پیشانی پر پسینہ اور جسم میں تھرتھری لیے گھر لوٹے۔ دفتر جا سکنے کا سوال ہی نہ تھا۔ اگلے دن جیسے ہی دفتر میں اپنی کرسی سنبھالی چپراسی نے ... ہمارے ہاتھ میں ... دیا جس میں تحریر تھا کہ ہم وزیر صا

پرجاکران کے کاموں میں خلل اندازی کے مرتکب ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ہم نے بغیر حاکم بالا کی اجازت کے وزیر صاحب سے مل کر ضابطے کی خلاف ورزی کی ہے۔ ان دونوں کوتاہیوں کی بنا پر ہمیں سخت ترین تنبیہ کی جاتی ہے اور اس کا اندراج ہماری ملازمت کے ریکارڈ میں بھی کیا جائے گا۔

اسے آپ محرومیٔ قسمت کے علاوہ اور کیا کہیں گے۔ ہمارے اور قاضی کامیاب کے درمیان صرف ایک ڈھائی فٹ کی دیوار کا فاصلہ ہے لیکن کامیابی اور محرومی کے درمیان شاید ایک زندگی سے بھی زیادہ دوری ہے اور اس کے لیے کیجیے تو کیا کیجیے۔

فاروق نشتر (میسور)

ایک خط
۱۹۹۰ء کے نام

امید کہ مزاج ۱۹۹۰ء بخیر ہوں گے۔

اگلے برس تمہارا لگتا بلکتا ۱۹۸۹ء جب ہندوستان آنا چاہا تو ہم نے طے کرلیا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے ہم اسے سرزمین ہند میں گھسنے نہیں دیں گے مگر ایک ہمارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے سارے عوام تو صرف تمہیں چاہتے ہیں یہ چاہت سیکولرازم کی دین ہے مگر تم عیسائی ہو۔ اپنے بھرم کو اسی طرح قایم رکھنا، ورنہ جس دن یہ بھرم بابری مسجد کے تالے کی طرح کھلے گا تم بھی کانگریس آئی کی طرح شکست کے دہانے پہ پہنچ جاؤ گے۔

شاید تم یہی دیکھنے تشریف لائے تھے کہ انتخابات، فسادات، اغوا، رشوت، لوٹ کھسوٹ، قتل و خون، عصمت دری وغیرہ وغیرہ کو یک مشت دیکھ لیا جائے۔ ان پانچ چھ مہینوں میں تمہاری خواہش پوری ہوئی ہوگی۔ مگر یار صرف اس طرح کے سنسنی خیز مناظر دیکھنے کے لیے تم کیوں آئے۔ دو سوپر طاقتوں کی گود میں بیٹھ کر ایک آدھ گرما گرم ہندی فلم دیکھ لیتے آج کل ہمارے رہنما فلموں کے ذریعہ ہی رہنمائی حاصل کرکے الیکشن کے میدان میں کودتے اور اسٹیج پر اچھلتے ہیں۔ مثال کے طور پر کرناٹک کے سابق وزیر اعلیٰ نے فلم "زنجیر" کو دو ڈھائی سو دفعہ دیکھنے کے بعد کرناٹک سے تعلق کی زنجیر کو یوں توڑ دیا جس طرح "زنجیر" کا شیر خان فلمی غنڈوں کے جبڑے توڑتا ہے۔ یہ جبڑے توڑنے کا قانون بہت پرانا ہے۔ ان ہمارے یہاں سیاست داں ہوں یا مشہور غنڈے یہ ایک دوسرے کے جبڑوں کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے بلکہ جبڑوں سے منسلک زندگی کو ہی ختم کر دیتے ہیں۔

تم تو اپنے دوست ناساز کشمیری کو جانتے ہی ہو، یہ کشمیر سے صرف اس لیے فرار ہو کر آگئے تھے کہ ان کے اللہ نے پیٹ بھر کے صاحبزادیاں عطا کی ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ کوئی ان کی صاحبزادیوں کا اغوا کرے اور وہ بھی دن دھاڑے اغوا کرے۔ اس سنگین مسئلہ پر بہادر سنگھ نے انھیں لاکھ سمجھایا کہ "ناساز پتر" تیرا کڑی وزیر داخلہ کا کڑی نہیں کہ یہ لوگ اسے اٹھا لے جائیں۔

اسی بات پر ناساز کشمیری اور بہادر سنگھ میں جھڑپ ہو گئی۔ یہ جھڑپ بالکل معمولی نوعیت کی تھی جس میں نہ چاقو بھالے نکالے گئے اور نہ ہی بم اور کلاشنکوف کا آزادانہ استعمال ہوا بلکہ دونوں نے طے کر لیا کہ وہ اپنے مادر وطن کو لوٹ کر وہیں اپنی جان گنوائیں گے۔ لہٰذا ناساز کشمیر چلے گئے اور بہادر سنگھ پنجاب سدھارے۔

گزشتہ برس اس قسم کے کئی اہم فیصلے بھی ہوئے جن میں .... خیر جانے دو۔ ان فیصلوں کی فہرست شیطان کی آنت کی طرح طویل ہے۔ تم نے سنا ہوگا کہ بھارت جیسے دھارمک ملک میں ایک قانون نام کی چیز بھی تھی۔ مگر آج قانون سکّوں پر مادھوری ڈکشت کی طرح رقص کر رہا ہے اور تم تو جانتے ہو، ہماری فلموں اور فسادات میں ننگا ناچ ہی پسند کیا جاتا ہے۔ جب کوئی فیصلہ ہوتا ہے تو عوام اس فیصلے کے خلاف فیصلہ کرتے ہیں۔ اس طرح ہمارے ملک کا ہر شہری جج ہے اور ہر گلی ..... ؛ جہاں بیک وقت جلیانوالہ باغ کے سین کو دہرایا جاتا ہے۔ ثبوت کے طور پر تم ملک کے نقشہ کو سامنے رکھ لو اور آنکھ بند کر کے کسی علاقہ پر انگلی رکھو۔ دوسرے دن اخبار میں علاقہ جلیانوالہ باغ ہو جائے گا۔

تم لوگوں نے جلیانوالہ باغ کے عظیم الشان حادثہ کی بنیاد بڑی ہی شبھ گھڑی رکھی تھی۔ ہم لوگوں نے آج تک اس سلسلہ کو برقرار رکھا ہے۔ ابھی ۱۹۹۰ء آدھا بھی نہیں گزرا لیکن اس کے نمونے تم دیکھ ہی رہے ہو۔ گزشتہ سال ہمارے یہاں کافی مینڈک ٹرٹرا رہے تھے اور ہم نے ان کی ٹراہٹ سے نجات پانے کے لیے زندہ مینڈکوں کے پیر اکھیڑ کر تمہیں ایکسپورٹ (EX PORT) کیے تھے کیونکہ تم مینڈک کی ٹانگوں کو مرغوب رکھتے ہو لیکن اس برس مینڈکوں نے شاید فیملی پلاننگ کر رکھی ہے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لیے شاید ہمیں انسانی ڈھانچے روانہ کرنے پڑیں گے اس مرتبہ انسانی ڈھانچوں کی کاشت کے لیے ہم نے بھاگلپور کو چنا تھا فی الحال فصل تیار ہے۔

پیارے ۱۹۹۰ء! شاید انسانی ڈھانچوں کی کاشت کے بارے میں سن کر تمہارے جسم میں جھرجھری پیدا ہو رہی ہو لیکن جب تم آ ہی گئے ہو تو اپنے جسم کو جھرجھری پروف بنالو۔ اس میں ورزش خاصی آسان ہے۔ تم ذرائع ابلاغ عامہ سے اس طرح بے پرواہ ہو جاؤ جس طرح اقلیتیں اپنے تحفظ سے بے پرواہ ہو گئی ہیں اور شہر میں مسلسل گشت کرتی ہوئی افواہوں پر کان مت دھرو۔ انسانی ڈھانچوں کی کاشت کے لیے یہ افواہیں کھاد کا کام دیتی ہیں۔

ڈیر ۱۹۹۰ء یہ دَور باہوش عوام کے لیے رہا کہاں ہے لہٰذا خیریت اسی میں ہے کہ تم آ ہی گئے ہو تو باہوش نہ رہو اور نوجوان نسل کی طرح ہوش کھو دو۔ یوں بھی یہ خط تمہیں باہوش کہاں رہنے دے گا۔

والسلام

تمہارا خیرخواہ

ایک محبِ وطن

شاطر گورکھپوری

ہے تو اک جاہلِ مطلق وہ مگر حال یہ ہے
بات جب کرتا ہے مجھ سے تو ادیبوں کی طرح

میں نے چاہا ہے تو اتنا بھی نہ سر چڑھ جائیں
اُن سے کہہ دو کہ رہیں دل میں حبیبوں کی طرح

دل میں تو یہ ہے کہ مر جاؤں میں جھٹ پٹ لیکن
حال وہ پوچھتے ہیں میرا طبیبوں کی طرح

میری اُلفت کا ہے اقرار نہ انکار انہیں
میں جہاں تھا وہیں لٹکا ہوں صلیبوں کی طرح

اُن کی چاہت میں نہ اتنا بھی بڑھ جائے شاطر
پٹ نہ جاؤ کسی دن تم بھی رقیبوں کی طرح

اب کے بخشیں گے نہ مے خوار
شیخ جی رہیے گا ہشیار

گھر آتے ہی بولے ڈیڈی
آ گئے کورٹ کے برخوردار

دھر لی سگِ لیلیٰ نے ٹانگ
پھاند رہا تھا میں دیوار

ثابت سے سیاروں تک
جتنے تارے سب دُمدار

ہم رہزن کی سنیں کیسے
آپ تو ٹھہرے ساہوکار

رشوت کا رسیا ہر کوئی
مہنگائی سے سب بیزار

جتنے شکاری میرے چیلے
میں ہوں شاطر میر شکار

ظفر چکدیوی

جس طرح شیطان لیتا ہے اثر لاحول کا
صاف گوئی سے مری اس طرح گھبراتے ہیں لوگ

آج بھی جکڑے ہوئے ہیں بے طرح اوہام سے
مجھ کو تو پڑھ لکھ کے بھی جاہل نظر آتے ہیں لوگ

حالیہ خوش بختی کا چڑھ جاتا ہے ایسا نشہ
اپنے ماضی کو سراسر بھول ہی جاتے ہیں لوگ

جلد بازی جانے کیوں انسان کی فطرت میں ہے
کرتے ہیں بن سوچے کام اور کر کے پچھتاتے ہیں لوگ

اس طرف ہے حق پسندی اس طرف مکر و ریا
دیکھیں جاتے ہیں اُدھر یا اس طرف آتے ہیں لوگ

جان کر [illegible] مجھ سے کھیلتے ہیں [illegible]
جتنا جاتا ہوں قریب اتنا ہی ٹھکراتے ہیں لوگ

زندگی میں قدر شاعر کی نہیں ہوتی ظفر
ہاں مگر مرنے پہ اس کو یاد فرماتے ہیں لوگ

تبصرہ: از ڈاکٹر محبوب راہی

ناٹ آؤٹ

(مصنفہ ڈاکٹر شیخ رحمن اکولوی)

صفحات: ۱۰۰ قیمت: ۲۰ روپے

ملنے کے پتے: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۲۵
ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد ۱

"بلا عنوان" اور "الف سے قطب مینار" کے بعد ڈاکٹر شیخ رحمن اکولوی کی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں کا تیسرا مجموعہ "ناٹ آؤٹ" دسمبر ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا ہے۔ ناٹ آؤٹ کے متعلق تاریخ ساز طنز و مزاح نگار جناب شفیق الرحمن اپنے تاثرات رقم کرتے ہیں کہ "شگفتہ تحریروں کا مجموعہ "ناٹ آؤٹ" مصنف کی خوش فکری کا آئینہ دار ہے۔ وہ موضوعات تراشنے کا سلیقہ رکھتے ہیں، اندازِ بیان شیریں، شائستہ اور برجستہ ہے۔ بات کہنا اور پھیلانا ساتھ ساتھ توازن رکھنا ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں اصناف کے تنوع سے بھی قاری کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔ ان میں روزمرہ کے مسائل بڑی لطافت کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں اور خوش ذوقی، ادبی تربیت اور تخلیقی عناصر کے دلنشین امتزاج سے یہ کتاب مرتب ہوئی ہے۔"

جناب کرنل محمد خاں کی رائے ہے کہ "شیخ رحمن اکولوی کا اندازِ تحریر سراسر اُن کا اپنا ہے اور یہ ایک باعثِ فخریات ہے۔ ان کے اسلوب کی انفرادیت ہی ان کی پہچان ہے اور شان بھی۔ ان کے دم سے مزاح نگار برادری میں ایک قد آور رکن کا اضافہ ہوا ہے۔" جناب رضا نقوی واہی نے اپنی رائے کا اظہار اِن الفاظ میں کیا ہے "طنز و مزاح کے میڈیم سے معاشرہ کا ایکسرے کرنے والے جتنے ڈاکٹر ہیں وہ انگلیوں پر گنے جانے کے قابل ہیں۔ ان کے درمیان شیخ رحمن اکولوی نے ایک اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔ جی خوش ہوتا ہے کہ ادب میں دوسرے درجے کا ادب کہلانے والی تحریریں اب کٹر ناقدین کے حلق سے بھی اُترنے لگی ہیں اور بے چاروں کو اسے اول درجے کا ادب تسلیم کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ شیخ رحمن اکولوی جیسے چند حضرات کی محنت اور لگن کا نتیجہ ہے۔"

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے تاثرات ہیں کہ "ناٹ آؤٹ کے مضامین میں مزاح کا استعمال ایک سلیقے کے ساتھ ملتا ہے تاکہ وہ ایک سطح سے گرنے نہ پائے۔ یہ لائقِ توجہ ہے"

قارئینِ کرام ان مشاہیر کی آرا کو چھوڑیے۔ اس کتاب سے ماخوذ درج ذیل جملوں کو پڑھیے اور اپنی رائے خود قائم کیجیے:

——— ماڈرن آرٹ نے ہندوستان میں بہت کم وقت میں زیادہ ترقی کر لی ہے۔ پہلے کوئی سر پیر نکل آتا تھا۔ اب تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔" (ہم ہوگئے دِلّی)

——— مالی کی قینچی دیکھنے میں بھیانک لگتی ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ مالی کی تنخواہ وقت پر اور بن مانگے مل جاتی ہے (قینچی)

——— ٹوپی جس طرح عوام کی رائے کو متاثر کرتی ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اچھا بھلا شریف آدمی ذرا ترچھی ٹوپی پہن لے تو لوگوں کی نظر میں اس کا کردار مشکوک ہو جاتا ہے۔

(ٹوپی)

——— کوئی ہم سے اردو شاعری میں غالب کا مقام پوچھے تو ہم کہیں گے کہ غالب اور دوسرے شعرا کی ٹوپیوں کی اونچائی ناپ لیجیے۔ اونچائی کا جو فرق نکلے گا، اس سے غالب کے مقام کی نشان دہی ہو جائے گی (ٹوپی)

زیر نظر کتاب میں مصنف نے جہاں نئے موضوعات کو فنی چابکدستی سے برتا ہے وہیں کچھ روایتی موضوعات کو بھی بلا مبالغہ آگے بڑھایا ہے۔ بطور ثبوت درج ذیل اقتباس پیش خدمت ہے انشائیے "کتے" سے۔

"موسم گرما کی خنک راتوں میں ان کی طبع نازک گدگداتی ہے، جس کے نتیجے میں وقتاً فوقتاً شعر و شاعری کی محفلیں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ یہ محفلیں فی البدیہہ ہوتی ہیں کوئی عمر رسیدہ کتا ایک فی البدیہہ مصرع بآواز بلند پڑھتا ہے۔ تمام حاضرین اسے کورس میں دہراتے ہیں۔ پھر اساتذۂ سخن کتے گرہ لگا کر شعر پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جیسے ہی ملی جلی کوششوں سے شعر پورا ہوتا ہے نو مشق کتے داد کے ڈونگرے برسانے لگتے ہیں۔ اس کے بعد محفل باقاعدہ گرم ہو جاتی ہے۔ استاد کتے اپنی کہنہ مشقی کا سکہ جمانے کے لیے اس قدر اشعار ارشاد کرتے ہیں کہ نو مشق کتوں کو کچھ عرض کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اس صورت حال کو کبھی تو وہ برداشت کر جاتے ہیں اور کبھی بغاوت پر اتر آتے ہیں اور آداب محفل کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اشعار پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کی یہ حرکت بزرگ شعرائے کرام کو گراں گزرتی ہے اور وہ بآواز بلند احتجاج کرتے ہوئے [illegible] ... مگر نو مشق کتے اخلاقی حدود میں رہ کر اساتذۂ سخن کتوں کا کلام سنیں تو جب تک سننے والوں کی قوت سماعت جواب نہ دے جائے یہ نشستیں بڑی کامیابی سے اور دیر تک چلتی رہتی ہیں۔ لیکن ایسا کم ہوتا ہے۔ ان نشستوں کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان میں شعرا ہی سامعین ہوتے ہیں۔ غیر شاعر کتوں کے لیے ان میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ کتے وقت کی قدر کرنا جانتے ہیں، اس لیے گپ بازی میں اپنا اور دوسروں کا وقت برباد نہیں کرتے۔ یہ نشستیں ہفتے میں دو دو تین تین بار منعقد ہوتی رہتی ہیں کہ نو مشق شعرا کو استاد شعرا سے فیض یاب ہونے اور آداب محفل سیکھنے کے مواقع ملتے رہیں۔"

ہر صاحب ذوق قاری کو چاہیے کہ وہ یہ باغ و بہار کتاب پہلی فرصت میں خرید کر اپنی تسکین کا سامان کرے تاکہ بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔

دیے کے خط

(مراسلے)

○ میں ۲ر اپریل کو حیدرآباد سے منتقل ہوکر لکھنؤ آیا ہوں وہاں سے ری ڈائرکٹ ہوکر شگوفہ کا شمارہ ملا۔ حیدرآباد کی یادیں کھل گئیں۔ اب میرا پتہ یہ ہے :

12/642 اندرا نگر لکھنؤ 226016

مخلص ـــــ گیان چند

○ اپریل ۹۰ء کا شمارہ نظر نواز ہوا حسب سابق اس شمارہ کو بھی ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ ایک عرصہ بعد شفیقہ فرحت صاحبہ کو پڑھنے کا شرف حاصل ہوا اس مختصر مگر مفید مضمون سے وہی مزہ آیا جو عرصہ بعد پڑوسی کے گھر ڈبل کا میٹھا کھانے پر آتا ہے۔ نریندر لوتھر صاحب کا سفرنامہ بھی کافی دل چسپ ہے۔ خامہ بگوش کے کیا کہنے ان کے بارے میں کچھ لکھنا سمندر کو قطرۂ آب دکھلانے کے برابر ہے۔ پچھلے شماروں میں ۲۲ سالہ انتخاب نمبر کی اشاعت کی خوش خبری ملی۔ بے چینی میں مزید اضافہ ہوگیا جو ظاہر ہے اسے دیکھنے اور پڑھنے پر ہی ختم ہوگی۔
اس دفعہ کا سرورق بھی تجریدیت لیے ہوئے ہے۔

احمد علی نیفی ـــــ گلبرگہ

○ شگوفہ میں "خامہ بگوش" کا سلسلہ بہت خوب ہے۔ اسے مستقل رکھیے۔ اگر ممکن ہو تو پاکستانی طنز و مزاح نگاروں سے انٹرویو کا سلسلہ بھی شروع کیجیے شگوفہ مارچ ۹۰ء میں ڈاکٹر شفیق الرحمٰن صاحب کا انٹرویو بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

اکبر شیخ رحمٰن اکولہ

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

(اداریہ)

نامور مزاح نگار کنہیا لال کپور نے برسوں روزنامہ ہندسماچار کے لیے نکاہی کالم لکھا۔ ان کالموں سے منتخب بعض مضامین شگوفہ میں قبل ازیں شائع ہوچکے ہیں۔ یہ مہینہ کنہیا لال کپور کی پیدائش کا مہینہ ہے۔ کپور کی یاد کو تازہ رکھنے کیلئے زیرِ نظر شمارہ میں ان کے کالموں سے منتخب مزید چند دل چسپ مضامین شامل کیے جا رہے ہیں۔ کنہیا لال کپور پر شگوفہ کا ایک خصوصی نمبر ان کے انتقال کے فوری بعد شائع ہوا تھا۔ ہمارا ارادہ ہے کہ آئندہ کبھی کپور کے کالموں پر مشتمل ایک خصوصی شمارہ شائع کریں۔ لیکن اس سے قبل ۲۲ سالہ انتخاب کا اہم کام انجام دینا ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ اس کام میں کافی تاخیر ہوچکی ہے۔ شگوفہ کے قاری اکثر ہمیں اس طرف متوجہ کرتے رہے ہیں۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ چند مہینوں میں نثر اور نظم پر مشتمل الگ الگ انتخاب شائع کریں گے۔ پہلے شعری انتخاب شائع ہوگا۔ چناں چہ مہمان مدیر جناب عبدالقدوس ایڈوکیٹ نے قانون کی کتابوں کے ساتھ شگوفہ کی جلدیں بھی اپنے دفتر میں سجالی ہیں۔

○

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۲۳
شمارہ ۷

مدیر
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

جولائی
۱۹۹۰ء

مجلسِ ادارت

محمد حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم
طالب خوندمیری

خصوصی نمائندے:

بمبئی ——— ریاض احمد فیضی
ریاض ——— عابد معز
دوبئی ——— غلام نجم الدین
آسٹریلیا ——— ایس۔ ایم۔ حسینی

مجلسِ مشاورت

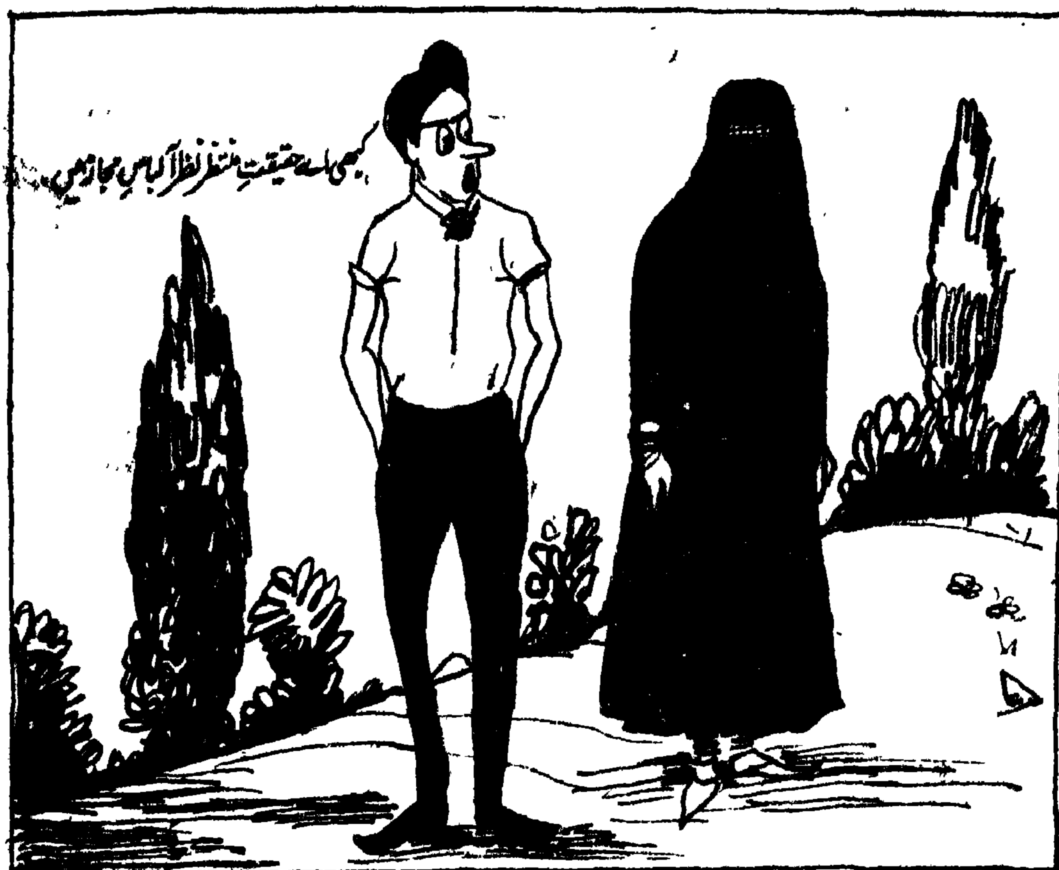
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
یوسف ناظم
مجتبیٰ حسین

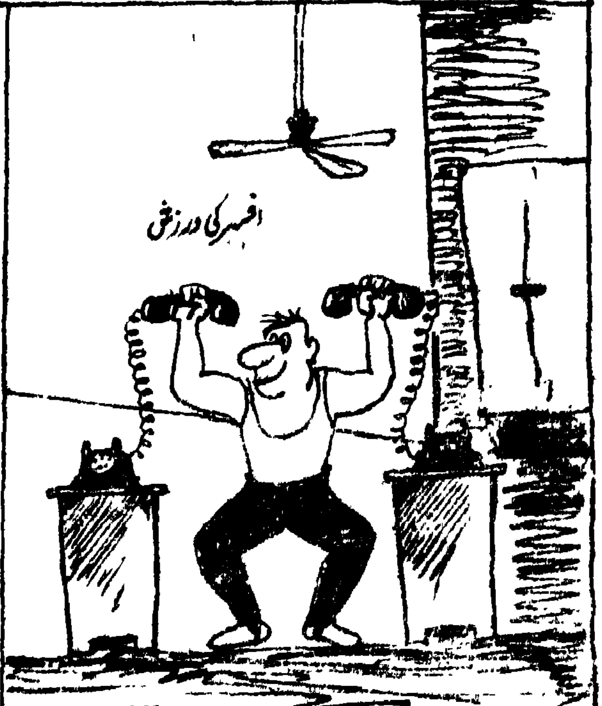
فی پرچہ: ۵ روپے
زرِ سالانہ: ۵۵ روپے
لائبریریوں سے: ۶۰ روپے
بیرونی ممالک سے: ۱۸۰ روپے

سرورق: سعادت علی خاں
کتابت: محمد غالب۔ محمود سلیم۔ محمد مجاہد
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد

ترسیلِ زر اور خط و کتابت کا پتہ:
شگوفہ، ۲۱، بیچلرز کوارٹرز
معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد۔۱

فون آفس: 557716
فون رہائش: 521064


کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں


افسر کی ورزش


بوتل کے حصے

اس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

انور سدید (لاہور)

چند مدیروں کے خطوط

(روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ)

وہ لوگ جنھیں تخلیق کاری اور رسائل کے مدیران سے واسطہ پڑتا ہے جانتے ہوں گے کہ مصنف اور قاری کے درمیان رسالے کا مدیر ہمیشہ ظالم سماج کا کردار ادا کرتا ہے۔ یہ شخص رسالے کو ایک خود مختار سلطنت سے کم نہیں سمجھتا اور خود کو اس سلطنت کا بے تاج بادشاہ تصور کرتا ہے۔ جب تک کوئی ادیب مدیر کی اس حاکمانہ حیثیت کو تسلیم نہ کرے اس کا ادب پارہ رسالے میں جگہ نہیں پا سکتا۔ یہ ناہنجار شخص اپنے اختیارات تمیزی اس طرح استعمال کرتا ہے کہ عظیم سے عظیم اور غیور سے غیور ادیب بھی اس کے سامنے کندۂ ناتراش قسم کا قلم کار نظر آنے لگتا ہے۔ بڑے سے بڑے ادیب کا ادب پارہ جب مدیر کی میز پر پہنچتا ہے تو معمولی تحریر یا حقیر اور کم ترین پرزہ بن جاتا ہے جو ہمہ وقت مدیر کی نظرِ عنایت کا منتظر رہتا ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر تخلیق کی وہ روشنی جس سے پورا جہاں منور ہو سکتا ہے منظرِ عام پر آ نہیں سکتی اکثر اوقات تو یہ روشنی .... میز کے نیچے پڑی ہوئی ٹوکری کی ظلمت ہی میں ڈوب جاتی ہے اور تخلیق کار اپنے گھر پر انتظارِ اشاعت میں عمرِ عزیز کے قیمتی لمحات ضائع کرتا رہتا ہے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ متعدد مدیرانِ جرائد نے اپنی انا کے اس اظہارِ کاذب سے ان گنت اعلیٰ پائے کے ادیبوں کو روشناس خلق نہیں ہونے دیا اور ابتدا ہی میں اُن کی ایسی تخلیق کشی کی کہ وہ ادب کے میدان ہی سے روپوش ہو گئے:

معتد ور ہوا گر تو میں پوچھوں کہ اے مدیر
تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کیے

تاہم کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے راستہ تبدیل کر کے نیک نامی حاصل کر لی۔ ہم اپنا شمار ایسے ہی لوگوں میں کرتے ہیں اور آج یہ عقدہ کھولتے ہیں کہ جو لوگ افسر پہلے اور ادیب بعد میں بنتے ہیں مدیران ان کے سامنے ہمیشہ سر خمیدہ رہتے ہیں اور عام قلم کاروں کو قلم زد کرنے والے مدیران ہی ان کے سب سے بڑے مداح ثابت ہوتے ہیں۔

آپ سے کیا پردہ افسرِ اعلیٰ بننے سے پہلے ہمیں بھی ایک مدیر نے یقین دلایا تھا کہ ہم میں ادیب بننے کا جوہر موجود نہیں ہے، اس رائے سے مایوسی تو ہوئی لیکن ہم نے حوصلہ نہیں ہارا اور افسر بننے کے بعد اپنا اولین مسودہ جب اسی ایڈیٹر کو بھیجا تو وہ ہمارا عہدہ پڑھ کر عش عش کر اٹھا۔ ان کا خیال تھا کہ ہمارے ایسا دیدہ ور تو صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہے ...

ہم ملک کے ممتاز ترین دانشور سمجھے جاتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بیسیوں صبحیں، سینکڑوں دوپہریں اور ہزاروں شامیں منائی جا چکی ہیں، ہم ان گنت ادبی جلسوں کی صدارتیں کر چکے ہیں، درجنوں ادیبوں کو ہم نے اپنے ہاتھ سے ایوارڈ دیئے ہیں۔ اس کے باوجود ہمیں بے مہری کا وہ زمانہ اب تک یاد ہے جب ہمارے شہ پارے ہر طرف سے ٹھکرائے جاتے تھے ہمارے شہ پارے مدیر کے پاس پہنچتے ہی واپس آجاتے تھے۔ اکثر اوقات تو ہمیں صاف پتہ چل جاتا تھا کہ ایڈیٹر صاحب نے تخلیق کا بند لفافہ بھی نہیں کھولا۔ ہمارا نام دیکھتے ہی ایک پروانہ لکھا اور ہمارا جگر پارہ واپس کر دیا۔

پچھلے دنوں ہم نے اس قسم کے خطوط کا ذکر اپنے مخلص ترین دوست اللہ دتہ کالمی صاحب سے کیا تو وہ بولے :

"ہم نے اس موضوع پر بہت سا مواد جمع کر رکھا ہے۔ مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی لینے کا ارادہ ہے۔ اس زمین کو ابھی تک کسی محقق نے نہیں روندا۔ ہمارے پاس مدیرانِ جرائد کے متعدد خطوط محفوظ ہیں، اپنے خطوط بھی ہمارے حوالے کیجیے تاکہ ہم انھیں اپنے مقالے میں محفوظ کر دیں۔ آپ کا نام نامی روشن کریں۔"

یہ سطور لکھتے وقت ہم نے اپنے سب خطوط اللہ دتہ کالمی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیئے ہیں تبادلے میں ہم نے بھی ان کے خزینے کی جھلک دیکھی ہے۔ اب ان میں سے چند خطوط مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کرتے ہیں، مقصد آپ کو راہِ ادب سے ہٹانا یا عبرت دلانا نہیں بلکہ یہ احساس دلانا ہے کہ راہ ادب میں بھی دو چار مشکل مقامات آتے ہیں اور نئے لکھنے والوں ہی نہیں بلکہ سینیئر ادیبوں کو بھی کٹھن راہوں سے گزرنا پڑتا ہے قسم قسم کے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ چند مدیروں کے خطوط ملاحظہ کیجیے :

دفتر ماہنامہ "خون خرابہ"
گلبرگ روڈ۔ لاہور

محترمی!

تسلیمات۔ آپ کی بلند پایہ نظم "تیرہ ظلمات" مل گئی ہے۔ ہم آپ کو مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ یہ عظیم نظم آپ کی لوحِ خیال پر اُتری۔ ہم اسے بلا خوفِ تردید ملٹن کی "جنتِ گم گشتہ" کی ہم پایہ نظم قرار دے سکتے ہیں۔ افسوس کہ اب اس دنیا میں نہ علامہ اقبال مصنفِ بانگِ درا موجود ہیں اور نہ استاد امام دین گجراتی مصنفِ "بانگِ دہل" زندہ ہیں۔ اس نظم کی صحیح داد کون دے گا! ہمارے ماہنامہ خون خرابہ کے قارئین تو اسے مناسب طور پر سمجھنے سے بھی قاصر ہیں۔ اس لیے یہ نظم بصد احترام واپس ارسالِ خدمت ہے۔ ہم آپ کے گراں قدر تعاون کے لیے شکر گزار ہیں اور ماہنامہ پرچہ وی پی کر رہے ہیں تاکہ اس کا معیار آپ کے پیشِ نظر رہے۔

آپ کا نیاز مند ــــ نگار نھالوی
مدیر ماہنامہ "خون خرابہ" ۔ لاہور

ماہنامہ "غیرت"
محلہ چاقو داراں، سیالکوٹ

مکرم بندہ

سلام مسنون، نظم "عذاب النار" کی ترسیل کے لیے ممنون ہوں۔ مہربانی فرما کر وضاحت کیجیے کہ یہ نظم عربی زبان میں لکھی گئی ہے یا اردو میں؟ ہمارے کاتب صاحب کا خیال ہے کہ یہ عربی کی نظم ہے۔ پچھلے شمارے میں، ہم نے عبدالقدیر والد صاحب کی ایسی ہی ایک طویل نظم چھاپی تھی۔ سادھو کی ملیاں کے مولانا ابوزرد صاحب نے ہم پر ایک مقدس زبان کی بے حرمتی کا الزام عائد کیا۔ یہ نظم ماہر عروض و بحور حضرت علیم اوزانی صاحب نے دیکھی ہے انھوں نے کھرعوں کو ایک آسمانی کتاب سے سرقہ قرار دیا ہے۔ ہاں کہیں کہیں ضرورت شعری کی وجہ سے مضمون بدل دیا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

ہمیں افسوس ہے کہ ہم یہ نظم اپنے رسالہ کے لیے قبول نہیں کر سکتے، کیوں کہ یہ رسالہ زبان اردو میں چھپتا ہے۔ کبھی اس رسالے کا عربی ایڈیشن چھاپنے کا خیال آیا تو ہم یہ نظم آپ سے خود منگوالیں گے۔ خاطر جمع رکھیے۔

مخلص

عبرت نصیب نگری

مکرمی!

آداب۔ ہم اس صاف بیانی کے لیے معذرت خواہ ہیں کہ آپ کی غزل ہمارے رسالے میں چھپ نہیں سکتی آپ کو ابھی مشق سخن کی بہت ضرورت ہے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ اشاعت کے لیے بھیجنے سے پہلے غزل کسی ماہر فن کو دکھا لیا کیجیے۔ آپ مناسب سمجھیں تو معمولی معاوضہ پر ہماری خدمات سے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

باسی پریم نگری

مدیر "انیسویں صدی" ملتان

محترمہ نکہت فاطمی صاحبہ

آپ کا افسانہ اچھا بلکہ بہت اچھا ہے لیکن یہ ہمارے پرچے کے لیے موزوں نہیں۔ آپ اسے عورتوں کے کسی رسالے کو مثلاً "قریب النسا" "ترکی مور" "ہدایت نسواں" کو بھجوادیں۔ ضرور چھپ جائے گا۔ نیز یہ بھی بتائیے کہ آپ نے مرد ہوتے ہوئے افسانے پہ زنانہ نام کیوں لکھا ہے؟ معاف کیجیے ہمیں مردوں کو بہنیں بنانے کا فن نہیں آتا۔ کسی اور طرف رجوع کیجیے۔

مہر اجنالوی

ایڈیٹر "گورو گھنٹال" ہسپتال روڈ۔ لاہور

محترمی قربان یاور صاحب

تسلیمات۔ آپ کی غزل میں پانچ اشعار کمزور ہیں، دو اشعار میں کیفیت تحت لحت ہے، تیسرے شعر میں یوں کیجیے کہ،

" بجبر ریل میں ڈال کے" بجبر دھڑ چلے"

والی صورت پیدا ہو گئی۔ اس پر مستزاد ایطائے جلی۔ کہیں کہیں شتر گربہ بھی موجود ہے جیسے آپ کو غالب کی صحبت ہو گئی ہے

مناسب درستی کچی پنسل سے کردی ہے۔ دوبارہ اپنے قلم سے لکھ بھیجیں اور اگر کوئی کہے کہ اس غزل سے طائر لاہوتی کا رنگ جھلکتا ہے تو بالکل نہ مانیں۔ خود میری غزلوں سے ابھی تک ولی دکنی کا رنگ جھلک رہا ہے۔

گزشتہ شمارے میں کاپی جوڑنے والے کی غلطی سے آپ کو شہزاد احمد، ظفر اقبال اور احمد ندیم قاسمی کے بعد چھاپا گیا۔ میں نے دیکھا اور سر پیٹ لیا۔ اتنے مفید آدمی کو ایسی غیر مفید جگہ دی گئی ــــ ہائے ہائے، آپ کو حق تھا کہ برا مانیں۔ سو آپ نے غصہ مجھ پر نکال کر اچھا کیا۔ میں نے غصہ کاپی جوڑنے والے پر نکال لیا ہے۔ اس نے اپنا غصہ گلاس پر نکالا ہے۔ لیکن میں گلاس کی دسترس سے باہر تھا اس لیے نقصان نہیں ہوا۔ تلافیٔ مافات کے طور پر اس دفعہ آپ کو ان سب سے پہلے چھاپ رہا ہوں۔ اب تو آپ خوش ہیں نا!

مجھے ٹی وی کے مشاعرے کا دعوت نامہ ابھی نہیں ملا ضرور راہ میں ہوگا اور وہاں آقا دبیر علی کو کیوں بلایا ہے؟ کیا مشاعرے کو مضافاتی بنانے کا ارادہ ہے؟ اگر یہ روش چل پڑی تو لاہور کے شاعروں کی رزق تلفی ہوگی اور وہ برداشت نہیں کریں گے محترمہ تزئین ذاکر تو آ رہی ہوں گی۔ ان کی شرکت سے محفل سج جاتی ہے۔ اسماں لباس صاحبہ کو بھی ضرور بلوائیں۔ میں نے اس ابھرتی ہوئی شاعرہ کو حال ہی میں اعزازی سند دی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ اگلے پرچے میں آپ کی کم از کم دس غزلیں اکٹھی شائع ہوں، ان کے ساتھ تصویر بھی چھپے اور توصیفی مضمون بھی۔ کہیے کیسی تجویز ہے؟ غزلیں جلدی بھجوا دیں۔ مضمون میں خود لکھوا لونگا۔ میری کتاب پر ٹی وی تبصرہ جلدی کروا دیں۔ بعد از مرگ جو انعام سے پہلے ہو جائے تو کیا بات ہے۔ اظہارِ خیال کے لیے بہزاد احمد، طائر مانسوی، موجد انعام، رضا الحق حشمی کو بلانا مناسب ہوگا۔ یہ سب اپنے نیاز مند ہیں۔

خیر اندیش
طائر لاہوتی

پس نوشت: اگر غزلیں بھی نہ ہوں تو اطلاع دیں۔ یہاں سے انتظام کر لیا جائے گا۔

مدیر ماہ نامہ "قانون"۔ لاہور

جناب محترم!

آداب۔ مجھے ماہ نامہ "جلوۂ جہاں تاب" کے محترم فاضل مدیرِ مسئول نے ہدایت کی ہے کہ میں آپ کی نظم "ضمیر کے مجرم" آپ کو واپس ارسال کردوں۔ ہمارا رسالہ آپ کی نظم کے معیار پر پورا نہیں اُترتا۔ مدیرِ مسئول صاحب کو معلوم ہوا ہے کہ آپ ڈاکٹر کبیر آغا کے گروپ سے تعلق رکھتے ہیں، اس صورت میں یہ نظم ہمیں بھیجنے کا کیا جواز ہے؟ دوسرے آپ نے نظم میں جس شخص کو ضمیر کا مجرم قرار دیا ہے اس کا سراپا ہمارے مدیرِ مسئول سے ملتا ہے۔ اس لیے بھی ہم نظم قبول کرنے سے قاصر ہیں۔ اس صاف گوئی کے لیے ہم معذرت پیش کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ خود آپ کو شرم آنی چاہیے۔

آپ کا خیر اندیش
باقی بریلوی
سابق کاتب و حال مدیرِ معاون ماہ نامہ "جلوۂ جہاں تاب"، کراچی

آداب۔ ہمیں حیرت ہے کہ آپ نے اپنی طویل نظم "قیدِ کلمات" جو ہمارے رسالے کے کم از کم آٹھ صفحات میں بمشکل سما سکے گی۔ ارسال کردی لیکن رسالے کا خریدار بننے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ہم یہ رسالہ زرِ کثیر خرچ کرکے محض خدمتِ ادب کے لیے شائع نہیں کرتے۔ ہم کاغذ کا خرچ، کتابت کی اجرت، پریس کے اخراجات سب برداشت کرتے ہیں۔ لیکن شہرت لکھنے والوں کو دیتے ہیں۔ آپ کو اندازہ ہے کہ اس نظم کی طباعت و اشاعت پر کتنا خرچ آئے گا؟ آپ کم از کم پانچ خریداروں کا چندہ آج ہی بھجوادیں تاکہ نظم کی اشاعت پر غور کیا جاسکے۔

کیا ابوظہبی یا کویت میں آپ کا کوئی عزیز نہیں رہتا۔ اگر رہتا ہو تو اسے ہمارے رسالے کا خریدار بنائیں، اور اگر نہ رہتا ہو تو کسی عزیز کو وہاں بھجوانے کا بندوبست کریں۔ ہم اپنے پرچے میں خلیجی ریاستوں کے شاعروں کو نمایاں طور پر چھاپتے ہیں اور بے وزن اشعار بھی قبول کرلیتے ہیں۔

آپ کا

نادم فیض آبادی

مدیر ہفت روزہ "غیض و غضب" ریپیہ اخبار سٹریٹ لاہور

عزیزِ گرامی! تسلیمات

آپ نے اس دفعہ افسانے کے ساتھ خالص دیسی گھی کا کنستر بھیج دیا۔ حالاں کہ آپ کو علم ہے کہ مجھے ڈالڈا کے سوا اور کوئی گھی ہضم نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر نے دیسی گھی تو بالکل منع کر رکھا ہے۔ ایک تو مہنگا ہے دوسرے اس میں ملاوٹ بہت ہوتی ہے۔ پھر مجھے دیسی گھی پہچاننے کا تجربہ بھی نہیں ہے۔ کوئی یقین ہی نہیں کرتا کہ خالص دیسی ہے۔ ہزارہا کہیے کہ ساہی وال سے فرازی صاحب نے اپنی ذاتی بھینسوں کا بھیجا ہے، کوئی مانتا ہی نہیں۔ آپ نے پچھلی دفعہ جو کنستر بھیجا تھا وہ بھی ڈالڈا کے بھاؤ بکا۔ خیر اب آپ کے خلوص کو ٹھکرانا بھی مناسب نہیں۔ کنستر خاتونِ خانہ کو پیش کر دیا ہے۔ ان کی طرف سے دعائیں، وہ آپ کے گھی اور افسانے کی مدح خواں ہیں اور چاہتی ہیں کہ یہ گھی ان کی زچگی میں کام آسکے۔ آپ اسے حسنِ طلب ہرگز نہ سمجھیں۔

آپ کا افسانہ قابلِ اشاعت نہیں تھا۔ لیکن اب ہمارے کاتب عزیز بخاروی صاحب نے اس میں ترمیم و اصلاح کرکے قابلِ اشاعت بنالیا ہے۔ انھوں نے پہلا پیراگراف حذف کرکے نیا لکھا ہے۔ المیہ انجام کو تبدیل کرکے طربیہ بنا دیا ہے۔ زبان و بیان کی اغلاط بھی منشی بخاروی صاحب نے درست کردی ہیں۔ آپ دیکھیں گے تو عش عش کر اٹھیں گے کہ ہم اپنے لکھنے والوں کی تخلیقات پر کتنی محنت کرتے ہیں۔ منشی عزیز بخاروی صاحب نے مولانا تاجور نجیب آبادی کے مشاعرے سنے ہیں، جب چراغ حسن حسرت اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر کے درمیان ادبی معرکہ ہوا تھا تو یہ اخبار "امروز" میں کام کرتے تھے۔ حسرت صاحب کو نسخۂ قرانی بھاتے تھے، ان کا اصلاح کیا ہوا مستند ہے۔

افسانے کا ترمیم شدہ مسودہ واپس ارسال ہے اسے دوبارہ نقل کرکے بھجوادیجیے اور وہاں اب ساہی وال کا دیسی گھی ہرگز نہ بھیجیں، اس کے بجائے ڈالڈا کے تین چار ڈبے یا زرِ نقد بھیج دیں۔ کیا آپ کے ہاں کھانے کا تمباکو یا نسوار دستیاب ہے؟ یہ فرمائش ہماری خاتونِ خانہ کی ہے۔ ترکستان سے جو قلمی معاون پیدا کرتے تھے وہ اب مغربی جرمنی چلے گئے ہیں۔ یادل ناخواستہ

آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔

پیر امجد شاہ
ایڈیٹر ماہ نامہ "شعر شور انگیز" میکلوڈ روڈ۔ لاہور

مکرم بندہ!

آپ کی غزل ملی۔ عرض خدمت ہے کہ یہ غزل آپ سے پہلے مرزا غالب پر انھیں الفاظ میں اُتر چکی ہے جو آپ نے بے محابا استعمال کیے ہیں۔ جناب ناظر منظوری صاحب تو اسے سرقہ قرار دے رہے ہیں۔ لیکن آپ نے چوں کہ کمال ہوشیاری سے ردیف تبدیل کر دی ہے اس لیے ہم آپ کو شک کا فائدہ دے کر چوری کے الزام سے بری الذّمہ قرار دیتے ہیں۔ ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ یہ غزل کسی اور رسالے کو نہ بھیجیں۔ مفت میں رسوائی ہوگی۔ فقط فقط

خادم الشعرا
نزاکت کیھنچانوی
مدیرہ ماہ نامہ "ادبی چنگاری" چیچوکی ملیاں ضلع شیخوپورہ

حضرت!

تسلیمات! آپ نے "جدید غزل" پہ اتنا طویل مقالہ لکھ کر بھیج دیا لیکن اس میں اس دور کے سب سے بڑے غزل نگار یعنی حضرت جوہر عظیم کا نام تک نہیں لیا جو اس ادبی پرچے کا مدیر ہے اور جس کی عظمت کا چرچا اس پرچے کے سب لکھنے والے کرتے ہیں۔
حضرت! میری غزل پہ دو صال گور کھ پوری، ماہ الرحمٰن صدّیقی، بیاض فتح پوری، عصر لکھنوی، شاداب عندلیبی، گوپی چند بے رنگ اور ڈاکٹر کبیر آقا جیسے ناقدانِ ادب کے مضامین میرے رسالے میں چھپ چکے ہیں اور ایسے توصیفی جملوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں جو میرے رسالے کو غزل برائے اشاعت بھیجتے وقت شعرا لکھتے ہیں۔ بیشتر لوگ متفق ہیں کہ میری غزل نے اس صنف میں نشاۃ ثانیہ برپا کر دی ہے سو آپ کا اغماض آپ کی لاعلمی کی دلیل ہے۔ لیکن اگر آپ اسے سہو قرار دیں تو میں اس عذر کو رد نہیں کروں گا۔
دوسری بات یہ ہے کہ اس مقالے میں آپ نے اپنے محلّے کے شعرا کا ذکر تو فراوانی سے کیا ہے۔ لیکن ہمارے رسالے میں چھپنے والے خلیج کے کسی شاعر کا نام تک نہیں لیا۔ حالاں کہ وہ ہمارے پرچے کے خریدار ہیں۔ آپ کا جانب دارانہ رویہ محلِ نظر ہے۔
مقالہ واپس ارسال ہے۔ اس میں مجوزہ ترمیم و اضافہ کے بعد دوبارہ بھجوائیے اور اس خط کو تلف کر دیجیے۔ مبادا کسی ناہنجار کے ہتھے چڑھ جائے اور وہ آپ کو اور ہمیں بدنام کرے۔

جوہر عظیم
مدیر مسئول۔ ماہ نامہ "جامِ ادب نما" اسلام آباد

جنابِ مکرم ... معظم

کورنش بجا لاتا ہوں تسلیمات عرض کرتا ہوں۔ ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ کو مرکزی حکومت کی اعلیٰ ملازمت کے لیے

منتخب کرلیا گیا ہے اور اب آپ کی تعیناتی کے احکام جاری ہونے والے ہیں۔ کتنا اچھا ہو کہ آپ کی تعیناتی لاہور ہی میں ہوجائے تاکہ حاضرِ خدمت ہونے کا موقعہ ملتا رہا کرے۔ اگر آپ کے مفیدِ مطلب ہو تو یہاں دوستوں سے حکامِ بالا کو خطوط لکھوائے جائیں آپ کی اعلیٰ خدمات ان کے گوش گزار کی جائیں۔ اس قسم کی مہم اخبارات میں بھی جاری کی جاسکتی ہے۔ ہر اخبار میں ہمارے دوست موجود ہیں' اس قسم کی مہم خوب چلاتے ہیں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ کام ہوجاتا ہے۔ میں نے اپنے لیے ایسی ہی مہم "تمغۂ حسنِ ناکارکردگی" لینے کے لیے چلائی تھی اور کامیاب ہوا تھا۔

محترمی عبیداللہ عرشی صاحب بتارہے تھے کہ پچھلے دنوں آپ نے ہمارے رسالے کے لیے ایک گراں قدر مضمون بھیجا تھا۔ جو عزیزی زاہد احمد کی کم نظری کی وجہ سے آپ کو واپس بھیج دیا گیا۔ اس فردگذاشت پر معذرت خواہ ہوں۔ دراصل یہ سب کچھ میری غیر حاضری میں ہوا۔ میں ان دنوں حج کے لیے مکۂ مکرمہ اور مدینہ منورہ گیا ہوا تھا۔ ازراہ کرم اپنا مضمون چپراسی کے ہاتھ آج ہی بھجوا دیں یا کہیں تو خود آکر لے جاؤں۔ پرچہ پریس میں جارہا تھا۔ لیکن اب میں نے اسے آپ کے مقالے کے لیے روک لیا ہے۔ آپ کے مقالے کے بغیر میرا پرچہ کس طرح چھپ سکتا ہے؟ وعدہ کیجیے کہ آپ ہر پرچے کے لیے ایک مقالہ عنایت کریں گے؟

خیر اندیش ۔ آثم چنگیزی
ایڈیٹر رسالہ شب دیگ۔ لاہور

غزلیں

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

جس شخص کو اوپر سے کمائی نہیں ہوتی سوسائٹی اس کی کبھی ہائی نہیں ہوتی
کرتی ہے اُسی روز وہ شاپنگ کا تقاضا جس روز مری جیب میں پائی نہیں ہوتی
پولیس کرالیتی ہے ہر چیز برآمد اُس سے بھی کہ جس نے یہ چرائی نہیں ہوتی
تب تک تو بھری بزم میں لگتا ہے معزز جب تک کہ غزل اس نے سنائی نہیں ہوتی
مکر اور فریب عام ہیں بس اس کے علاوہ
اس شہر میں کوئی بھی بُرائی نہیں ہوتی

○

پروفیسر ہی جب آتے ہوں ہفتہ وار کالج میں
تو اونچا کیوں نہ ہو تعلیم کا معیار کالج میں
کچھ ایسے بھی پڑھاکو پنچھیوں کو ہم نے دیکھا ہے
کہ "پر" دفتر میں "پنجے" شہر میں "منقار" کالج میں
اگرچہ دوسرے مشروب بھی مہنگے نہیں ملتے
مگر چلتا ہے اکثر شربتِ دیدار کالج میں
وہ ڈگری کی بجائے "میم" لے کر لوٹ آیا ہے
ملا تھا داخلہ جس کو سمندر پار کالج میں
مجھے ڈر ہے کہ ہم دونوں کہیں سمدھی نہ بن جائیں
تیری گلنار کالج میں مرا گلزار کالج میں

○

لیمرک

سوچتا ہوں کہ کیوں نہ کار کو مَیں
بیچ دوں اور اپنے پلّے سے
تھوڑے سے پیسے ڈال کر اس میں
اک نیا سائیکل ہی لے آؤں
دن کا سُکھ رات کا سکوں پاؤں

اسرارِ جامعی
(دہلی)

جانِ ظرافت

اسرارِ جامعی نے کیا ہے یہ "ڈِسکوَر"
دوڑائیں آپ لوگ بھی گھوڑی قیاس کی
ہے اختصار جانِ ظرافت کی جس طرح
ویسے ہی ہے یہ شان زنانہ لباس کی

پاک صاف دھندہ

ہم دودھ بیچ کر ہی کھاتے تھے مرغ و ماہی
کیسی گزر رہی ہے اب کیا بتائے بندہ
پانی کی جب سے قلت اس شہر میں ہوئی ہے
گھاٹے میں چل رہا ہے یہ پاک صاف دھندہ

منظور الامین

جوتے

بچپن میں ہم نے جوناتھن سوئفٹ کی کتاب Gullivers travels باتصویر پڑھی تھی، ایک تصویر میں Gulliver کو ایک بڑے سائز کا انسان بتایا گیا تھا جو Lilliput نامی ملک کی زمین پر چت پڑا ہوا تھا۔ اس کے پاؤں کے جوتے بہت بڑے دکھائے گئے تھے جن کو اس ملک کے باشندے چھوٹی چھوٹی ڈوریوں سے باندھ رہے تھے ساتھ ہی اس کے جسم کو بھی، اس تصویر کو ہم اکثر دیکھا کرتے تھے۔ اس وقت ہمارے چھوٹے سے دماغ میں یہ بات پیوست ہوگئی تھی کہ گلیور ایک بڑا سا جن تھا۔

اس کتاب کو پڑھنے کے کچھ دن بعد ہی ہم نے بازار میں ایک دکان کے اوپر لگا ہوا ایک بڑے سائز کا جوتا دیکھا، اس وقت وہ دکان ہمیں دکان کم نظر آئی تھی اور جوتا زیادہ کیوں کہ وہ جوتا اس دکان کے جغرافیے پر پوری طرح حاوی تھا ہم نے اس جوتے کے ساتھ ہی ایک نوٹس لگی دیکھی تھی جس پر لکھا تھا

مفت! مفت! مفت!

یہ جوتا مفت دیا جائے گا اُسے جسے یہ فٹ آجائے،

ہمیں یاد ہے اس جوتے کو دیکھ کر ہم مچل گئے تھے اور ایک منٹ اسے غور سے دیکھتے رہے تھے پھر اپنے پیر پر نظر ڈالی اور یہ اندازہ لگالیا کہ یہ وہ جوتا تھا جو ہمیں فٹ ہونے والوں میں نہیں تھا پھر یہ خیال آیا تھا کہ جوتا Gulliver کو ضرور فٹ بیٹھے گا، حالاں کہ یہ بات غلط تھی، بعد میں سوچا کہ جوتا اس شخص کو فٹ بیٹھتا جس ملک کے لوگ واقعی بڑے سائز کے تھے اور جہاں جاتے ہی خود gulliver کی ہستی Lilliputian ہو کر رہ گئی تھی۔

جوتے ہر سائز میں ملتے ہیں۔ بات اتنی سی ہے کہ اس دنیا میں بعض لوگ اپنے سائز سے بڑا جوتا پہننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ہر قوم اور ملت میں پائے جاتے ہیں۔ ایسوں کا پھر حشر بھی ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس ایک زمانے میں ہمارے چینی بھائی اپنے گھروں میں اپنی لڑکیوں کو لوہے کے جوتے پہنایا کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے پاؤں ٹھٹھر کر رہ جاتے تھے کیوں کہ چھوٹا پاؤں خوب صورتی کی علامت سمجھا جاتا ہے، کہتے بھی ہیں سر بڑا سردار کا، پاؤں بڑا گنوار کا، ان چینی گڑیوں کے پاؤں واقعی چھوٹے چھوٹے خوب صورت نظر آتے تھے، جی چاہتا تھا کہ ان پاؤں کو اٹھا کر سر پر رکھ لیا جائے۔ پاؤں کو سر پر رکھنے کی تلقین بہت پرانی ہے۔ خاص کر پاؤں کو سر پر رکھ کر

بھاگ نکلنے کی تکنیک کو قومیں اور ملتیں صدیوں سے آزماتی اور چمکاتی آئی ہیں، افرادِ قوم پاؤں کو سر پہ کیسے رکھتے ہوں گے اس کا گرتو ہمیں معلوم نہیں ہاں ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ قومیں اپنا بیڑا خود غرق کیسے کر لیا کرتی ہیں :

شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر!

ہاں تو بات چینی نازنینوں کی ہو رہی تھی ان کے لیے کفشک یا جوتے بھی نرم و نازک بنائے جاتے تھے اہلِ چین جوتے اگانے اور چمڑے کی تکنالوجی کے ماہر سمجھے جاتے ہیں، خود ہمارے ملک کے بعض شہروں میں چینی کفش ساز آج بھی ہیں جو پاؤں کے پور پور اور انگلی انگلی کا ناپ لے کر خوب صورت جوتے بنا بنا کر ہم ہندوستانیوں کو پہناتے ہیں کلکتے میں تو ان کا ایک پورا علاقہ ہے چائنا ٹاؤن جہاں انھیں جوتے بنانے والوں کی دکانیں ہیں ان پیشہ وروں کا ہنر دیکھ کر حالی کی بات یاد آتی ہے کہ کمالِ کفش دوزی علمِ افلاطون سے بہتر ہے۔

ابھی ابھی ہم نے چینی نازنینوں کا، ان کے چھوٹے چھوٹے پیروں کا اور ان کے چھوٹے چھوٹے جوتوں کا ذکر کیا۔ ویسے ان خواتین ہی کا کیا ہم نے اپنے شہر ہی کی ایک دوشیزہ کو جوتے کی ایک دکان پر سیلس مین سے یہ پوچھتے دیکھا ہے۔ "کیا آپ کے پاس ایسا کوئی جوتا ہے جو اندر سے تو بڑا ہو لیکن باہر سے چھوٹا دکھائی دے؟"

ان باتوں سے آپ کو کہیں یہ غلط فہمی تو نہیں ہو رہی ہے کہ نازنین دوشیزائیں صرف مشرق میں پائی جاتی ہیں لیکن دلآویز جنس تو مغرب میں بھی اُگائی جاتی ہے اور پائی جاتی ہے، مغرب کے مرد ہم مشرقیوں سے ہزار قدم آگے ہیں۔ یہ نہ صرف اپنی مخالف جنس کے افراد کے پرستار ہی ہوتے ہیں بلکہ دیوانے بھی اس حد تک کہ یہ Gallant نوجوان اپنے گلفام [illegible] کی حسین و نازک جوتیوں تک میں شراب ڈال کر پیتے ہیں، یہ ایک طرح کی رسم ہی ہے۔

جہاں تک اہلِ مشرق کا تعلق ہے۔ یہاں جوتیوں میں ڈال کر شراب نہیں پی جاتی ویسے ہی اوک سے Neat پی جاتی ہے اور خوب پی جاتی ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اتفاقاً شراب پیتا ہوں، احتراماً شراب پیتا ہوں۔ اس کے علاوہ یہاں جوتیوں میں دال بٹتی ہے، یہ آج کی بات نہیں صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ ہمارے ایک شاعر نے عرصہ ہوا یہ سب کچھ دیکھا تھا اور دیکھ کر ہی لکھا تھا :

بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضمون لکھا
میرا مضمون رہ گیا ڈاسن کا جوتا چل گیا

تو صاحبو! اس طرح ہمارے یہاں نہ صرف جوتیوں میں دال بٹتی ہے، بلکہ جوتا چلتا بھی ہے اور جوتا جب چلتا ہے تو خوب چلتا ہے بلکہ چلتا ہی رہتا ہے، اس قدر چلتا ہے کہ لوگ تب گلاب، چمیلی، موتیا، جوہی کے ہار پہننا پہنانا تک ترک کر دیتے ہیں اور "یاروں" کو جوتے کے ہار پہنا کر خوش ہوتے ہیں۔

ویسے ہمارے یہاں بعض بزرگوار سخت محتاط ہوتے ہیں ایسے لوگ دوسروں کو جوتوں کا ہار پہنانا پسند نہیں کرتے بلکہ شال کی تہوں میں یا پوشش کو احتیاط سے پیک کر کے اس شال سے کسی کو اس طرح مارتے ہیں گویا پھولوں کی چھڑی مار رہے ہوں، ساتھ ہی مار کھانے والے پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسے شال میں لپیٹ کر جوتے

مارے جارہے تھے، دوسرے لفظوں میں یہ جوتے مارنے والے اس بات کے قائل ہوتے ہیں کہ گڑ سے جو مرے تو زہر کیوں دوا
کیجیے ہیں ہمارے یہاں سے جاگیرداری، زمین داری، تعلقہ داری وغیرہ کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ آپ کے شہر کے
شائستہ جمہوری باشندے ہیں۔ آپ کو آج بھی ایک آدھ کھیت کھلیان میں یہ تماشا نظر آسکتا ہے کہ کوئی جفادری
زمین دار اپنے منشی کو خطاب کر رہا ہے۔

"منشی، کیا کہا! کالو موچی کے لونڈے نے ہمارے کھیت میں کام کرنے سے انکار کر دیا ہے، پھٹے جوتے
سینے والوں کی یہ ہمت! اسے رامو، شامو، بھولو، پکڑو اس کالو کو اور بغیر گنے پچاس جوتے مارو ——— ایں! کیا کہا تم
ننگے پاؤں ہو تو کس طرح اسے جوتے مار سکتے ہو ——— تمہارے پاس جوتے خریدنے پیسے نہیں ہیں، کوئی بات نہیں یہ
لو میرا نیا جوتا Road master، بلاؤ اس کالو کی شامت اور کرو اس کی اس جوتے سے حجامت"

تو جناب دیکھا آپ نے، جوتا کیسی Multi purpose چیز ہے، اس سے کئی کام لیے جاتے ہیں بلکہ لیے
جاتے رہے ہیں، نئے جوتوں کی تو بات ہی اور ہے پرانے جوتوں کو بھی کام میں لایا جاتا ہے۔ یہ جوتے کار کے پیچھے باندھ
دیئے جاتے ہیں اس کار کے پیچھے جس کے اندر نئے دلہا دلہن نئی زندگی شروع کرنے جاتے ہوئے سوار ہوتے ہیں
ان پرانے جوتوں کا ٹوٹکا یہی معلوم ہوتا ہے کہ خدا کرے آنے والی زندگی میں دلہا دلہن میں جوتم پیزار نہ ہو۔ کہیں
جوتوں کو ٹرک کے پیچھے لٹکا دیا جاتا ہے اور پر یہ لکھ کر: نظر لگانے والے تیرا منہ کالا، بعض حد سے زیادہ مہذب
لوگ تو بڑی بڑی میٹنگوں میں اپنے پاؤں کے جوتے اتار کر فریق مخالف کو دکھاتے ہیں گویا جوتا نہ ہوا آئینہ ہوا کہ لے بھئی جوتا
اور دیکھو اپنی صورت!

جوتا چرانا بھی کمال کی چیز ہے، لوگوں نے اسے آرٹ کا درجہ عطا کر دیا ہے، حیدرآباد میں شادی بیاہ
کے موقعوں پر دلہن کے بھائی سازش کر کے دلہا کا جوتا چرا لے جاتے ہیں اور اس سے پہلے کہ وہ شادی کا ڈنر
کھانے کے لیے ہاتھ دھوئے اپنے جوتے تو حاصل کرنے کے لیے دلہا بھائی کو ایک خاصی رقم سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

ہمارے یہاں کوئی سیلیوں، مشاعروں، موسیقی اور رقص کی بعض محفلوں میں مشرقی طرز سے بیٹھنے کا انتظام ہوتا ہے
یعنی فرش پر آلتی پالتی مار کر یا گھٹنے سکیڑ کر یا حسب توفیق ٹانگیں پھیلا کر، ادھر موسیقی، شعر اور رقص کے پرستار تو تانوں میں محو
رہتے ہیں ادھر چالاک اصحاب جوتے چرانے میں یعنی جوتے چرانے کا فن پرانا ہے دیکھا گیا ہے کہ یار لوگ
عبادت گاہوں تک کو چھاپہ مارے بغیر نہیں چھوڑتے۔ حالی نے بہت پہلے کہا تھا:

اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار　　　اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

ہمارے جو شاعر ہیں وہ جانتے ہیں کہ نہ صرف ان کے شعر بلکہ ان کے جوتے بھی اکثر چرائے جاتے رہے ہیں تبھی انھوں
نے اس وبا سے تنگ آکر اب شرطیں لگانی شروع کر دی ہیں:

شاعر اب اس شرط پر بزم سخن میں آئے گا
اس کا جوتا ختم محفل پر اسے مل جائے گا

کوئی اس جوتے کا سرقہ تو نہیں فرمائے گا

وہ غزل ایسی پڑھے گا جو کبھی سوچی نہ ہو ✣ شرط بس یہ ہے کہ محفل میں کوئی موچی نہ ہو

ہمارے یہاں لوگ ایک دوسرے کو جوتا مارتے ہیں اور اس پر خوش بھی ہوتے ہیں جوتے مار کر اور جوتے کھا کر دونوں ہی صورتوں میں، اس کے علاوہ ایک آدھ بیماری ایسی بھی ہے جیسے مرگی جس میں مرگی زدہ کو پرانا جوتا سنگھایا جاتا ہے گویا جوتا نہ ہوا عطر شمامہ ہوا۔

یہ سوال اکثر سامنے آتا ہے کہ انسان نے جوتا پہننا کیسے سیکھا اور کیوں سیکھا؟ ہمارے خیال میں تب سے جب کہ پہلی بار اس کے پاؤں میں کانٹا چبھا ہوگا لیکن سوال یہ بھی ہے کہ جوتا کیسے بنتا ہے، سیدھا سا جواب یہ ہے کہ کھال سے! وہ ایسے کہ کھال کھینچنے میں انسان کا کوئی ثانی نہیں اپنے ہم جنسوں کی کھال بھی وہ صدیوں سے کھینچتا آتا ہے۔ انسانی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس فن کے کئی ماہر گزرے ہیں، مسمی اٹیلا، چنگیز، ہلاکو سے برخوردار ہٹلر تک، ویسے اس فن کے نئے نئے ماہر بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں، اکثر ساسیں اپنی بہوؤں سے بہت پیار سے فرماتی ہیں "تیری کھال کھینچ کر اس کی جوتیاں بنوا کر پہنوں گی ویسے تیری چمڑی گوری ہے نا اور میرا پوتا:

کیا رذیلاں کا جینا جیتا ہے
تیری جوتیاں میں پانی پیتا ہے!"

تو صاحب جوتا بنانے کے لیے انسان نے جانوروں کی کھال کھینچی دباغت (Tanning) کا process تو صدیوں پرانا ہے سات ہزار سال پہلے چمڑے کے بنے ہوئے آرٹیکلز تو آج بھی ملتے ہیں۔ دباغت کا طریقہ یہ ہے کہ کھال کو بھگو دیتے ہیں لیکن اسے سڑنے کی حد تک برباد نہیں ہونے دیتے پھر تیار چمڑا ہاتھ آجاتا ہے جسے رنگ لیا جاتا ہے مختلف رنگوں میں یہ چمڑا جوتے، سوٹ کیس، پرس وغیرہ بنانے کے کام آتا ہے، پہلے تو ہر شہر میں اکا دکا کفش دوز ہوا کرتے تھے اب جوتے بنانے کی فیکٹریاں بن گئی ہیں۔

ایک زمانے میں سن سے اور رسیوں سے بھی جوتے بنائے جاتے تھے پھر ربر کے، کینوس کے، چمڑے کے اور پلاسٹک کے جوتے بننے لگے انسانی تاریخ کی ابتدا میں لکڑی کے جوتے بھی پہنے جاتے تھے۔ آج بھی آشرموں میں کھڑاؤں پہنے جاتے ہیں انھیں یوپی میں پوّا بھی کہتے ہیں:

بن برکھا کے پہنے پوّا۔ کہے گھاگ اودہے کوّا

یعنی جو شخص بغیر بارش کے کھڑاؤں پہنے تو گھاگ (ایک پوربی ہندی شاعر) کا کہنا ہے کہ وہ شخص کوّا یعنی اجڈ اور بے وقوف ہے۔

ضمناً عرض ہے یہ بات دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے کہ کھڑاؤں کو فارسی میں قبقاب یا نعلینِ چوبیں کہا جاتا ہے، سانپوں اور اژدہوں کے چمڑے کے بھی جوتے بنتے ہیں، بارش کے لیے گم بوٹ، برف کے لیے جوتے اور snow-shoes ہوتے ہیں۔ فوجیوں کے جوتے الگ، فٹ بال اور کرکٹ کے لیے جوتے الگ، اس کے علاوہ آپا شاہی، سلیم شاہی یا ناگرے سامنے سے مڑے ہوئے Bata Sleepers جوتے جو دنیا کے تمام نوجوانوں کے پسندیدہ جوتے ہیں، ہوائی چپلیں، لیڈیز شوز اپنی مثال آپ

ہی ہوتے ہیں، اونچی ایڑی کی جوتیاں اکثر چھوٹے قد کے مرد، احساسِ کمتری کے شکار اپنی بیویوں کو اونچی ایڑی کے جوتے پہننے سے منع کرتے ہیں کیوں کہ وہ نہیں چاہتے کہ ان کی بیویاں ان سے اونچی نظر آئیں یہ اور بات ہے کہ ذہنی طور پر بیویاں ان مردوں سے ارفع اور اعلیٰ ہوا کرتی ہیں۔

عرصہ پہلے عورتوں کے دل جیتنے کے طریقے بھی دل چسپ ہوا کرتے تھے، نعل کے معنی ہیں جوتا، فارسی کا ایک محاورہ ہے نعل در آتش، اس کے مطابق طریقۂ کار یہ تھا کہ کسی شخص کا کسی کو اپنی محبت میں بے قرار کرنا منظور ہوتا تو وہ گھوڑے کی نعل پر اس کا نام لکھ کر آگ میں ڈال دیتا اور کچھ عملِ لا افسوں پڑھتا، بس خاتونِ محترم محبت میں بے قرار ہو کر اپنے طالب کے پاس چلی آتیں اور اس کی مطیع ہو جاتیں۔

جب ہمیں یہ نسخہ اور یہ عمل معلوم ہوا تو ہم نے اسے آزما کر دیکھا، افسوس پڑھنے میں شاید ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی ہوا یہ کہ ہماری محبوبہ آئیں اور سر کے بل آئیں مگر ننگے پاؤں کیوں کہ ان کی جوتیاں ان کے ہاتھ میں تھیں اور سامنے تھا ہمارا سر ہماری گردن پر جو منتظر تھا بہر تسلیم خم بہرحال یہ بات آپ کے علم میں ہوگی کہ جوتے صرف مرد اور عورتیں اور بچے ہی نہیں پہنتے بلکہ بعض جانور بھی پہنتے ہیں جیسے بیل اور گھوڑے انھیں نعل shoes ۔ shoes کہتے ہیں جو شخص یہ جوتے بناتا ہے نعل بند کہلاتا ہے۔ ان جانوروں کو نعل بندوں کے پاس لے جایا جاتا ہے اور یہ جانور کوئی فیس دیے بغیر نئے جوتے پہن لیتے ہیں اور اس کے بعد مٹکتے چھلکتے پھرتے ہیں۔

نئے جوتے پر سے یاد آیا ایک صاحب محفلِ سماع میں جایا کرتے تھے ان کے ساتھ ان کے ایک مرید بھی ہوتے تھے لیکن سماع کی محفل میں ان کا دل زیادہ تر دنیوی معاملوں میں اٹکا رہتا تھا ایک دفعہ ان صاحب نے نئے نعلین (جوتے) خریدے اپنے مرید کے ساتھ محفلِ سماع میں پہنچے لیکن اندر آتے ہوئے جوتوں کو محفوظ جگہ رکھنا بھول گئے۔ جب ذکر نقطۂ عروج کو پہنچا تو حاضرین کو حال آ گیا اور لوگ دائرہ بنا کر رقص کرنے لگے، ان صاحب کو اچانک اپنے جوتوں کا خیال آیا پھر بھی اٹھے اور دائرے میں شامل ہو گئے۔ مرید ان کے پیچھے پیچھے تھا روحانی محفل کا تقاضا یہ نہیں تھا کہ ایک دم سے جوتے جیسی زمینی اور ادنیٰ چیز کی بات کی جائے لیکن دلِ دیوانہ تو جوتوں ہی میں اٹکا تھا آخر آہستہ آہستہ اپنے مرید سے بولے "بیس روپے کی نعلین خریدیں ــــ باہر چھوڑیں ــــ اللہ ہو!" مرید چلتی رقم تھا اپنے بزرگ کی حالت زار کو سمجھ گیا اور بولا "فکر نہ کرنا کمر کے پیچھے باندھ لیا ہے اللہ ہو!"

وہ بیس روپے کے جوتے اب کہاں! اٹھیے بس اب کہ لذتِ خواب سحر گئی! اب تو جوتے ہزار ہزار روپے کے ملنے لگے ہیں اور ... تب بھی اس کا بھروسہ نہیں کہ وہ چرچوں نہیں کریں گے اور اگر چرچوں نہ بھی کریں تو کاٹیں گے نہیں ــــ یقین نہ ہو تو نیا جوتا خرید کر دیکھیں۔

ویسے جوتوں میں جوتا مشہور ہے سنڈریلا Cinderella کا جو اس غریب لڑکی کو ایک مہربان پری نے دیا تھا جسے پہن کر وہ شہزادی (سی) بنی اپنے ملک کے شہزادے سے ملتی ہے۔ شہزادہ اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ پری کے حکم کے مطابق سنڈریلا رات کے بارہ سے پہلے نہیں لوٹ پاتی۔ بارہ کا گھڑیال بجتا ہے وہ بھاگتی ہے ایک سلیپر چھوڑ کر جو شہزادے کو مل جاتا ہے وہ سارے ملک میں اس لڑکی کو کھوجتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ سلیپر جسے فٹ ہو جائے وہ وہی مذکورہ لڑکی

ہوگئی۔ آخر کار وہ سلیپر سنڈریلا ہی کو فٹ ہوتا ہے اور اس طرح ایک غریب، محنتی، خوش اخلاق لڑکی اس ملک کی ملکہ بن جاتی ہے۔

آج ہمارے محلے، شہر، ہمارے ملک میں کتنی سنڈریلائیں ایسی ہیں جن کے پاؤں ایک معمولی سی جوتی تک کے لیے ترستے ہیں جو نہ کسی وجہ نگر ماں کے ساتھ کمار کا سپنا دیکھ سکتی ہیں نہ بلند کے کسی شہزادے کا خواب، کیا کوئی مہربان پری ان معصوموں کی زندگیاں کو بھی خوشیوں سے بھر دے گی؟۔

غزل

مرزا کھونچ (بیسعتیا)

کبھی اُجلا بنا ڈالا کبھی کالا بنا ڈالا
بچلے بہنوئی بننے کو مگر سالا بنا ڈالا

یہ سوچا بعد شادی کے مناؤں گی میں بچا ہوں
مگر کم بخت نے گھر کا مجھے تالا بنا ڈالا

نگر کی نالیاں سب گھر کے پچھواڑے سے جاتی ہیں
بڑھا پانی تو میرے گھر کو بھی نالا بنا ڈالا

بڑی دُو کان تھی لیکن کھلایا ہے اُدھار اتنا
بھلائے فائدہ کر کھو مچا دوالا بنا ڈالا

نامور مزاح نگار یوسف ناظم
کے مضامین کا مجموعہ

البتہ

قیمت : ۱۰ روپے

"بتوسط شگوفہ"

امریکہ کی ماں

قسط ــ ۱۲

ــــــ سفرنامۂ امریکہ

نریندر لوتھر

اب ہمارے پاس بہت تھوڑے دن رہ گئے تھے اور پیسے اُس سے بھی کم۔ ہمارے ایک دوست نے ہمیں بار بار یہ صلاح دی تھی کہ ہم امریکہ میں کم از کم ایک بار ریل گاڑی کا سفر ضرور کریں۔ اس نے کہا تھا کہ واشنگٹن سے نیویارک زیادہ دُور نہیں اس کے علاوہ ریل کے سفر کے دوران بڑے خوب صورت قدرتی نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ہم اس کی باتوں میں آگئے۔ ویسے بھی ہم اس تجربہ سے محروم نہیں رہنا چاہتے تھے اور پھر ہمیں فلاڈیلفیا بھی انا تھا جو واشنگٹن اور نیویارک کے درمیان ہے اور دونوں سے تقریباً برابر فاصلے پر ہے۔ ہم نے واشنگٹن سے نیویارک فلاڈیلفیا ہوتے ہوئے ایک 'گول' ٹکٹ یعنی واپسی ٹکٹ خریدا ـــ

ہم نے پڑھ رکھا تھا کہ پچھلی صدی میں ریلوے کی وجہ سے امریکہ میں بہت ترقی اور اقتصادی ترقی ہوئی تھی۔ کئی فلموں میں امریکن گاڑیاں دیکھی تھیں۔ اس سفر کے بعد معلوم ہوا کہ کہنے کی بات کچھ ہے اور حقیقت کچھ اور۔ اب امریکہ میں ریلوے کو کوئی پوچھتا نہیں۔ زیادہ تر لوگ ہوائی جہاز یا موٹر کار سے سفر کرتے ہیں۔ ان کی نقل و حرکت بھی ٹرکوں سے ہوتی ہے۔ ریل گاڑی تو دیکھنے کو بھی بہت کم ملتی ہے۔ ہم نے امریکہ میں ایک بار بھی کوئی ریل کا گیٹ نہیں دیکھا۔ پتہ نہیں گیٹوں کے بغیر گاڑیوں کو سڑکوں پر آنے سے کیسے روکتے ہیں۔ اب پتہ چلا کہ ان کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

ہمارے ایک اور دوست نے ہمیں کئی بار اپنے ہاں مدعو کرنے کی خواہش کی تھی لیکن ہم اُس کے پاس نہ جاسکے آخر اس نے کہا کہ کوئی خدمت کرنے کا موقع تو دیجئے۔ ہم نے کہا اچھا ٹھیک ہے تم ہمیں اپنی کار میں واشنگٹن سے نیو

اسٹیشن تک چھوڑ آؤ۔ اس دن بڑی بُری طرح برف باری ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی بارش بھی پڑ رہی تھی۔ ایسے موسم میں وہاں کار چلانا آسان نہیں ہوتا۔ ہمارا دوست بہت دیر سے آیا۔ بیشتر اس کے کہ ہم اُس کو بُرا بھلا کہتے اُس نے ہم سے معافی مانگی اور ساتھ ہی بتایا کہ وہ ساٹھ میل دُور سے آیا ہے۔ یہ تو واقعی ظلم تھا۔ ہمیں دس میل تک چھوڑنے کے لیے وہ ساٹھ میل سے آیا تھا! اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا تو اُس کو ہرگز یہ خدمت کرنے کا موقع نہ دیتے۔ وہ اتنا اچھا ڈرائیور بھی نہیں تھا۔ ہر موڑ پر غلط راستے پر مُڑ جاتا اور ہمیں پھر اُسے راہ راست پر لانا پڑتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہم ذلیل و خوار ہوتے ہوئے اسٹیشن پہنچے تو پورا آدھ گھنٹہ لیٹ تھے۔ اب گاڑی کیا ملنی تھی؟ لیکن ہمارے دوست نے اصرار کیا کہ پھر بھی دیکھ لو۔ جب اتنی دور آئے ہیں تو پتہ کرنے میں کیا حرج ہے؟

اسٹیشن کے باہر راجا رام موہن رائے کا بُت دیکھ کر ہم بڑے حیران ہوئے۔ اس کا بُت یہاں لگانے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟ پاس جا کر کتبہ پڑھا تو پتہ چلا کہ وہ کولمبس کا بُت تھا۔ چونکہ اس نے ایک مشرقی قسم کا چوغا پہنا ہوا تھا اس لیے ہمیں اُس پر راجا رام موہن رائے کا بُت ہونے کا شبہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ ایسے کپڑے اُس نے ہندوستان کے لیے پہنے تھے لیکن غلطی سے امریکہ میں اُتر پڑا تھا۔ اگر اُس کا ارادہ امریکہ دریافت کرنے کا ہوتا تو پتلون کوٹ یا جین پہن کر نکلتا۔ اگر وہ بے چارہ ہندوستان پہنچ جاتا تو اُس کا بُت ہندوستان میں نصب کیا جاتا ——— ایک بُت نہیں بلکہ بے شمار بُت ——— کیونکہ ہندوستان بُت پرستوں کا ملک ہے اور پھر یہاں مرے ہوئے لوگوں کو سزا دینے کا یہ بڑا پاپولر طریقہ ہے۔ دیکھئے مہاتما گاندھی اور سبھاش چندر بوس کے بُت گاؤں گاؤں میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم نے سُنا ہے کہ بعض گاؤں میں تو ایک ہی بُت کو مختلف دنوں اور تہواروں پر مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس کا ٹرپل TRIPLE رول ادا کرنا پڑتا ہے۔ کولمبس کا کہیں اور نہیں تو کم از کم حیدرآباد کے ٹینک بند پر تو ضرور مجسمہ لگ جاتا لیکن یہ تو قسمت کی بات ہے۔ ہم نے کولمبس کے بارے میں بہت کچھ سُن اور پڑھ رکھا تھا۔ آج پہلی بار اُس کے درشن ہو رہے تھے۔ اگر ہم ہندوستان میں ہوتے تو ہم شاید اُس کے پاؤں چھو لیتے لیکن امریکہ میں ہم نے اُس کو دل ہی دل میں سلام کیا۔

لیٹ ہو جانے کی وجہ سے ہمارا دوست سخت شرمندہ تھا۔ اُس نے کہا اگر گاڑی چھوٹ گئی تو میں تمہیں اپنی کار میں فلاڈیلفیا چھوڑ آؤں گا۔

ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ گاڑی ابھی پلیٹ فارم پر ہی کھڑی تھی۔ گارڈ سے وجہ پوچھی۔ اُس نے کہا آپ ہی کا انتظار ہو رہا تھا۔ یہ سُن کر ہماری چھاتی پھول گئی۔ یہ عزت و توقیر ہمیں اپنے وطن میں کبھی نصیب نہ ہوئی تھی وہ غریب الوطنی میں ملی۔ اسی وجہ سے بیشتر ہندوستانی امریکہ جاتے ہیں۔ اگر ہندوستان میں بھی ان کے ساتھ مناسب (بلکہ بہتر) سلوک کیا جائے تو وہ باہر ہرگز نہ جائیں۔ ہم نے حکومتِ ہند کے ایک افسر سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ صاحب! ہم بھی دیر سے چلاتے ہیں۔ گاڑیاں تو کیا بسیں، ہوائی جہاز، سمندری جہاز، ڈبکنی کشتیاں، رکشائیں غرض ہر چیز

کے چلنے میں دیر ہوتی ہے لیکن پھر بھی یہ سرپھرے لوگ ہندوستان چھوڑ کر امریکہ جانے پر مُصر ہوتے ہیں۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ ہندوستانیوں کو باہر جانے سے روکنے کی کوشش کرتے کرتے عاجز آگیا ہے۔ حتیٰ کہ اب وہ بھی امریکہ چلے جانے کی سوچ رہا ہے۔

امریکن ریل گاڑی بڑی آرام دہ ہوتی ہے۔ سب سیٹیں گدے دار اور نرم۔ ہر سیٹ آرام کرسی کی طرح ہوتی ہے۔ ڈبے کے دونوں طرف ایسی دو دو سیٹوں کی دو متوازی قطاریں۔ ہر چار سیٹوں کے درمیان ایک میز اور بیچ میں کھلا راستہ۔ ڈبوں میں بہت سی سیٹیں خالی ہوتی ہیں۔ سارے ریلوے سسٹم پر کالے لوگوں کی حکومت ہے۔ ڈرائیور کالا (وہ تو خیر انجن کے دھوئیں سے بھی کالا ہو سکتا ہے) کنڈکٹر "کالا" قلی کالے اور زیادہ تر مسافر بھی کالے ——— ٹی ٹی ٹکٹ چیک کر کے اُسے سیٹ کے اوپر ہی ٹھونس جاتا ہے۔ ہر اسٹیشن کے آنے سے پہلے اُس کے نام کا اعلان لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ ہر ڈبے میں کیا جاتا ہے۔ گاڑی چلنے سے پہلے کنڈکٹر سب دروازے بند کر دیتا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد اعلان ہوا کہ اگلا اسٹیشن 'فلی' ہوگا۔ ہمیں تشویش ہوئی کہ کہیں غلط گاڑی میں تو نہیں چڑھ گئے؟ کہیں ہمارا اسٹیشن نکل تو نہیں گیا؟ اصولاً گاڑی کو اب تک فلاڈیلفیا پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ کئی ایسے خیالات آئے جن پر بیگم اختر کو اکثر رونا آتا تھا۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے کنڈکٹر سے پوچھا ——— فلاڈیلفیا کب آئے گا؟ اُس نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا۔ ابھی تو میں نے اعلان کیا ہے کہ اگلا اسٹیشن 'فلی' ہوگا۔ ہم نے کہا ہم فلاڈیلفیا کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ وہ کچھ مُسکرایا اور پھر بولا ٹھیک ہے۔ 'فلی' پر اُتر جانا تب ہمیں احساس ہوا کہ 'فلی' فلاڈیلفیا کا مخفف ہے۔ امریکن لوگ بڑے سُست واقع ہوئے ہیں۔ ہر نام کو سکیڑ کر چھوٹا کر لیتے ہیں۔

جہاں تک نظاروں کا تعلق ہے۔ ڈبے کے دونوں طرف صرف برف ہی برف دکھائی دے رہی تھی۔ کہیں کہیں حبشی لوگوں کے خستہ حال گھر اور ہر حال میں خوش اُن کے کھیلتے ہوئے بچے نظر آئے۔ سفید برف کے بیک گراونڈ پر کالے لوگ اور بھی اُبھرتے ہیں۔ ریل گاڑی کے سفر سے امریکہ کی خوشحالی کا اندازہ نہیں ہوتا کیا ہمارے دوست نے انہیں بلیک اینڈ وہائٹ نظارے دیکھنے کے لیے ہمیں ریل کے سفر کی ترغیب دی تھی؟

اسٹیشن پر ہمارا استقبال کرنے کے لیے سروج آنے والی تھی۔ ہم اُس کو اِدھر اُدھر ڈھونڈ رہے تھے کہ اچانک ایک امریکن عورت آکر ہم سے بغل گیر ہوگئی۔ ہوش آنے پر پتہ چلا کہ وہ سروج ہی تھی۔ وہ ویسے بھی اسمارٹ، [illegible] اور سکرٹ پہنی ہوئی وہ واقعی امریکن لگ رہی تھی۔ ہمیں چھوڑ کر پھر وہ بیگم سے چپٹ گئی اور دونوں سہیلیاں کافی دیر تک یک جان کھڑی رہیں۔

سروج ہماری بہت پرانی دوست تھی۔ اس کا خاوند حیدرآباد میں انڈین پولیس سروس کا افسر تھا وہ کھلنڈرا اور عیاش تھا۔ ادبی ذوق رکھتا تھا۔ شعر و شاعری بھی کرتا تھا۔ پولیس میں اُس کی کچھ بھی نہیں۔ حتیٰ کہ اُسے نوکری چھوڑنا پڑی۔ اُس کے بعد اُس نے ایک سال میں عثمانیہ یونیورسٹی سے انگریزی ڈپلوما

پی ایچ ڈی کرلی۔ پھر وہ امریکہ چلا گیا جہاں وہ انگریزی کا پروفیسر بن گیا۔ وہاں جانے کے بعد میاں اور بیوی میں نباہ نہ ہوسکا۔ جو شخص پولیس میں نہیں رہ سکا، وہ شادی کے چوکھٹے میں کیسے مقید رہ سکتا ہے؟ سروج کی تمام تر کوششوں کے باوجود طلاق ہوگئی۔ سروج نے اپنی گرہستی کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن جب ناکام رہی تو اس نے زندگی نئے سرے سے آغاز کرنے کی ٹھان لی۔ ہندوستان سے بی۔اے کیا ہوئی تھی جو گرہستی میں سب بھلا چکی تھی۔ امریکہ میں پہلے کام کرنا شروع کیا۔ ساتھ ساتھ پڑھائی بھی جاری رکھی۔ یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا۔ اس جدوجہد میں اس کے چھوٹے بھائی نے اس کی بڑی مدد کی لیکن سروج اپنی خود اعتمادی اور اپنے عزم کی بنا پر کامیاب ہوئی۔ اب وہ 'فلی' شہر کی ایمپلائمنٹ کی ڈائرکٹر ہے۔ وہ اکیلی رہتی ہے اور ایسی ہی دوسری عورتوں کو صلاح و مشورہ دیتی ہے اور روزگار ڈھونڈنے میں مدد دیتی ہے۔ اس نے یہاں تک پہنچنے میں بہت مصیبتوں کا سامنا کیا، لیکن اب اس کی چھپی ہوئی دبی ہوئی زخم خوردہ شخصیت پوری آن بان کے ساتھ اجاگر ہوئی ہے۔ زخم کا کوئی نشان اس نے رہنے نہیں دیا۔ اب وہ کھل کر ہنستی ہے جو دل میں آئے کرتی ہے۔ گو ہم اسے تقریباً پندرہ برس کے عرصہ کے بعد ملے تھے لیکن وہ پہلے سے پندرہ برس جوان لگ رہی تھی۔ اس میں واقعی حیرت انگیز حد تک خود اعتمادی پیدا ہوگئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ انسان کو ایک بار یہ قطعی فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ آیا زندگی اور جینا اس کو غلام بناکر رکھے گی یا وہ ان پر حاوی ہوکر رہے گا۔ بس!

سروج کی کہانی بہت لمبی اور نصیحت آمیز ہے اس کو سن کر ہر عورت کا دل چاہتا ہے کہ اسے بھی طلاق مل جائے تاکہ وہ بھی اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرسکے۔ یہاں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ہم اس کی نئی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے اور اس کے گرویدہ ہوگئے۔

فلی امریکہ کی ماں ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ جس کو عام لوگ صرف امریکہ ہی کہتے ہیں، یہیں پیدا ہوا تھا (یا پیدا ہوئے تھے) وہاں کی تیرہ ریاستوں کے نمائندوں نے ایک سہانی شام پہلے خود چائے پی اور پھر بوسٹن کی بندرگاہ کو چائے پلائی۔ چائے خالص تھی، اس سے ان کے اندر اتنا جوش پیدا ہوگیا کہ انھوں نے انگلستان کے خلاف آزادی کا اعلان کردیا۔ جارج واشنگٹن نامی ایک زمین دار جو انگریزوں کے تحت فوج میں افسر رہ چکا تھا۔ وہ آزاد طبیعت کا تھا۔ اس لیے اسے فوج سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ باغی فوجوں کا جنرل بن گیا تھا اور بعد میں ان کا کمانڈر ان چیف۔ اچانک آزادی ملنے سے فوجی افسروں کو بہت ترقی ملتی ہے مثلاً عیدی امین سارجنٹ سے کرنل اور پھر فیلڈ مارشل بن گیا تھا۔ جارج واشنگٹن نے بھی بڑی ترقی کی اور انگریزوں کو شکست پر شکست دی۔

ہم یہ بتانا تو بھول ہی گئے کہ جارج واشنگٹن کمانڈر ان چیف بننے سے بہت پہلے پیدا ہوچکا تھا۔ کہتے ہیں وہ بچپن میں سچ بولنے کا عادی تھا۔ اس کی سچائی اور دیانتداری کی کہانیاں کافی مشہور ہیں کہتے ہیں کہ ایک بار اس کے باپ نے ننھے واشنگٹن کو ایک کلہاڑی تحفہ کے طور پر دی تھی۔ واشنگٹن نے اس سے اپنی ... کے ایک نوخیز درخت کو کاٹ دیا۔ اس کے باپ کو کلہاڑی سے استعمال

پسند نہیں آیا غالباً وہ یہ چاہتا تھا کہ واشنگٹن اس سے قتل کرنے کی پریکٹس کرے۔ باپ نے جب غصے میں پوچھا کہ درخت کس نے کاٹا ہے تو واشنگٹن نے بے دھڑک اپنے جرم کا (باپ کی نظروں میں) اقبال کر لیا۔ کہتے ہیں (وہی لوگ جن کا حوالہ اس پیراگراف کے شروع میں دیا گیا ہے) کہ اس بات سے وہ اتنا مشہور ہوا کہ بعد میں وہ امریکہ کا پہلا صدر بنا۔ مارک ٹوین کا خیال ہے کہ واشنگٹن بڑا چالاک بچہ تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اس ڈرامائی انداز سے سچ بولنے سے اُسے ضرور کوئی بڑا فائدہ ہوگا، واقعی اگر اتنے چھوٹے سے سچ بولنے کا اِتنا بڑا انعام مل سکتا ہے تو ہم بھی سچ بولنے کے لیے تیار ہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ ایک من گھڑت کہانی ہے جو واشنگٹن کے پریذیڈنٹ بننے کے بعد اُس کے پی۔آر۔او نے گھڑی ہوگی۔ ورنہ اتنے چھوٹے بچوں کی اتنی چھوٹی چھوٹی سچائیوں کا حساب کون رکھتا ہے، ویسے تو ہم نے بھی کئی سچ بولے ہیں لیکن عموماً ایسی حرکتوں سے ہمارا نقصان ہی ہوا ہے۔

اس لیے واشنگٹن کے بچپن کے اس واقعہ سے کوئی 'مارل' اخذ نہیں کرنا چاہیئے۔ ہر شخص کو موقع اور ملک کے مطابق سچ یا جھوٹ بولنا چاہیئے صرف اتنی احتیاط برتنی لازم ہے کہ جھوٹ پکڑا نہ جائے۔ ہاں سچ کھلے عام بولا جا سکتا ہے۔ وہ کبھی پکڑا نہیں جاتا۔ کیوں کہ بہت کم لوگ اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔

واشنگٹن، گو کہ، تقریباً ڈھائی سو سال پہلے پیدا ہوا تھا، لیکن وہ بڑے ترقی پسند اور ماڈرن خیال کا آدمی تھا مثلاً وہ ستی کا مخالف تھا۔ چنانچہ اُس کو ثابت کر دکھانے کے لیے اُس نے ایک ایسی بیوہ سے شادی کی جو عمر میں اُس سے بڑی تھی۔ شادی کے بعد وہ عورت بیوہ نہیں رہی لیکن واشنگٹن کی موت کے بعد پھر وہ بیوہ ہوگئی۔ بعض عورتوں کو بیوہ بننے کا اتنا شوق ہوتا ہے کہ اُن کو بیوگی سے بچانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ کئی مرد تو اِسی کوشش میں ایک نہیں کئی عورتوں کو بیوہ بنا جاتے ہیں۔

پریذیڈنٹ بننے سے پہلے واشنگٹن امریکہ کی دستور ساز اسمبلی کا بھی صدر تھا۔ ہم نے وہ عمارت بھی دیکھی جس میں امریکہ کا آئین تیار کیا گیا تھا۔ اور جہاں سے آزادی کا اعلان کیا گیا تھا۔ یہ لکڑی کی بنی ہوئی چھوٹی سی عمارت ہے۔ آزادی ہمیشہ چھوٹی چھوٹی عمارتوں میں جنم لیتی ہے۔ اور بڑے بڑے محلوں میں دم توڑتی ہے۔ امریکہ کی آزادی کے اعلان نامہ میں اُس وقت کے انگریز بادشاہ جارج سوم کے خلاف گالیاں زیادہ اور آزادی کا ذکر کم ہے۔ ظاہر ہے وہ کافی غصہ میں لکھا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اتنی اہم دستاویز میں تین چار غلطیاں بھی ہیں۔ غصے میں عموماً اِنسان غلطی کر بیٹھتا ہے اور پھر یہ تو ایک ساری قوم کے غصے کی بات تھی۔ اس اعلان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمام انسان پیدائش سے برابر ہوتے ہیں۔ یہ بات ہمیں حقائق کے مغائر لگتی ہے۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ پیدائش کے وقت کئی بچے کمزور اور چھوٹے ہوتے ہیں۔ اور کئی بڑے اور صحت مند۔ خیر۔ یہ اُس وقت کے امریکی لیڈروں کی رائے تھی لیکن بہتر ہوتا اگر وضاحت کر دی جاتی کہ بعد میں بعض لوگ بڑے کیسے بن جاتے ہیں اور بعض لوگ چھوٹے کیسے رہ جاتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ سائنس کی اتنی ترقی کے باوجود امریکن لوگ ابھی تک اِس تھیوری کو مانتے

ہیں۔ اس اعلان میں پہلی بار جمہوریت کا ایک اور بنیادی دعویٰ بھی گیا گیا۔ یعنی عوام پر صرف اُن کے نمائندے ہی ٹیکس لگا سکتے ہیں۔ یہ اُصول ویسے تو صحیح ہے لیکن اس کا ایک نقصان وہ اثر یہ ہوا کہ اب عوامی نمائندے دُنیا کے ہر ملک میں بے تحاشا ٹیکس لگائے چلے جاتے ہیں۔ خیر وہ زمانہ گیا جب ہم سارے جہاں کا درد جگر میں رکھتے تھے۔ ڈاکٹروں نے آپریشن کر کے وہ تمام درد ہمارے دل سے نکال کر باہر پھینک دیا ہے۔ صرف انکم ٹیکس بھرنے پر دل میں ٹیس اُٹھتی ہے لیکن کبھی بُرے حال نہیں۔

'رِچمنڈ' امریکہ کی سب سے پہلی راجدھانی تھی۔ یہ بڑا خوب صورت شہر ہے یہاں پُرانے سٹائل کی کئی عمارتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہاں ایک دریا بھی ہے جس کا نام لال ہندوستانی سرداروں کے ناموں کی طرح بڑا عجیب اور مشکل سا ہے۔ اس شہر کے پاس ہی جنگ آزادی کے دوران امریکن فوجوں نے دو سخت سردیاں گزاری تھیں۔ اُسی کی یاد میں ایک قومی پارک بنایا گیا ہے۔ یہ اٹھارویں صدی کے سپاہیوں کے خیموں، ان کی جھونپڑیوں، ان کی وردیوں، طرز رہائش کے نمونے اور جنرل واشنگٹن کے ہیڈ کوارٹر پر مشتمل ہے۔ یہاں بڑے خوبصورت لان ہیں جہاں لوگ پک نک کرتے ہیں اور پھر سووینیر خریدتے ہیں۔ ایسی یادگاروں کو دیکھ کر حالیہ نسل "پدرم سلطان بود" کا تصور کرتی ہے۔ سیاحوں کو اس وقت کے امریکنوں کی بہادری، دلیری اور جہالت اور آج کل کے امریکنوں کی ڈرپوکی، کاہلی اور عیاشی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے گائیڈ نے ہمیں جارج واشنگٹن کا بُت بھی دکھایا۔ اُس کے کارنامے سُن کر بیگم نے اُس سے پوچھا "آج کل وہ کہاں رہتا ہے؟"

گائیڈ نے نہایت احترام سے جواب دیا "میڈم اُسے مرے ہوئے دو سو سال ہو چکے ہیں۔"

"اوہ" بیگم ذرا نادم ہوئیں اور پھر پوچھا "کیا اس کے والدین زندہ ہیں؟"

وہاں کی یونیورسٹی بھی بہت مشہور ہے۔ اس کے علاوہ وہاں کا آرٹ میوزیم بھی اعلیٰ معیار کا ہے۔ وہاں ہم نے ماڈرن آرٹ کے کئی شہرۂ آفاق نمونے بھی دیکھے۔ آرٹ کے لیے ہنرمندی اور تخیل ضروری ہے۔ تخیل کے بغیر صرف ہنرمندی سے دستکاری پیدا ہوتی ہے جس سے کئی کارآمد چیزیں مثلاً چٹائیاں، شال، تپائیاں اور مرتبان وغیرہ بنتے ہیں۔ اس کے برخلاف (ہنرمندی کے بغیر) صرف تخیل سے ماڈرن آرٹ پیدا ہوتا ہے!

ہم میوزیم میں مختلف قسم کی تصویریں دیکھ رہے تھے کہ ایک بوڑھی عورت نے ہمارے کندھے کو تھپکتے ہوئے پوچھا "کیا آپ ماڈرن آرٹ کو سمجھ پاتے ہیں؟"

ہم ایسے امتحانی سوال کے لیے تیار نہیں تھے۔ ابھی جواب کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ اُس نے کہا "ماڈرن آرٹسٹ وہ شخص ہے جو آنکھیں موند کر کینوس پر رنگ پھینکتا ہے۔ پھر اسے کپڑے سے پونچھ کر اُس کپڑے کو ماڈرن پینٹنگ کہہ کر بیچ دیتا ہے۔"

اس تشریح پر ہم مسکرا پڑے۔ کچھ تسلی بھی ہوئی کہ ہماری طرح اور بھی لوگ ہیں جو ماڈرن آرٹ کو کچھ نہیں سمجھ پاتے۔ اس عورت نے سرگوشی کے انداز میں کہا "گھبراؤ نہیں ماڈرن پینٹنگ کو سمجھنا

بڑا آسان ہے۔ اگر کوئی پینٹنگ آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو سمجھ لو کہ وہ ماڈرن پینٹنگ ہے۔" ابھی ہم اِس ریمارک کو ہضم بھی نہ کر پائے تھے کہ وہ پھر گویا "اچھا میں آپ کو ایک ایسا گُر بتاتی ہوں جس سے آپ پتہ چلا سکیں گے کہ کوئی ماڈرن پینٹنگ مکمل ہو چکی ہے یا نہیں۔ اس کا سب سے آسان اور آزمودہ طریقہ ہے کہ اُس پینٹنگ کو چھو کر دیکھو۔ اگر اس کا رنگ سوکھا ہوا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ پینٹنگ پوری ہو چکی ہے۔"

اُس ایک دن میں ہم نے گویا ماڈرن پینٹنگ پر کریش کورس CRASH COURSE کر لیا۔

آپ نے اکثر سُنا ہوگا کہ ماڈرن پینٹنگ کو دیکھ کر پتہ نہیں چلتا کہ یہ اُلٹی ہے یا سیدھی۔ یقین مانیے ہم نے اُس میوزیم میں ایک پینٹنگ دیکھی جو واقعی اُلٹی تھی۔ یہ تصویر مارسل ڈیو چامپ MARCEL DU CHAMP کی بنائی ہوئی تھی۔ وہ ایک امریکن آرٹسٹ تھا جو فرانس میں پیدا ہوا تھا۔ یہ میلان کئی امریکنوں میں پایا جاتا ہے کہ پیدائش کے وقت وہ کسی بیرونی ملک میں چلے جاتے ہیں۔ کئی امریکن تو مرتے بھی غیر ملکوں میں ہیں۔ یہ رواج کوریا اور ویٹ نام کی جنگوں کے دوران بہت پاپولر ہو گیا تھا۔ امریکی دفتر خارجہ کا کہنا تھا کہ اس طرح امریکی زمین قبرستان بنانے میں ضائع نہیں ہوتی۔ ہاں تو ہم اُس آرٹسٹ کی بات کر رہے تھے۔ وہ ۱۸۸۷ء سے ۱۹۸۸ء تک زندہ رہا۔ ۱۹۸۸ء میں وہ مر گیا اور ابھی تک مرا ہوا ہے۔ اُس کی زیرِ ذکر تصویر کا نام ہے 'بہشت'۔ 'بہشت' کو آپ اُلٹا کر لیں یا سیدھا، ہر حال میں بہشت ہی رہے گا۔ یہی بہشت کی تعریف بھی ہے۔ ویسے بھی ہم جیسے لوگوں کو اُلٹے اور سیدھے بہشت میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں جہنم کو ہم دور ہی سے پہچان لیتے ہیں۔ کیوں کہ وہاں کئی بھلے لوگ اُلٹے لٹکے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ اچھا تو اب ہم اس اُلٹی پینٹنگ کی طرف آتے ہیں۔ اس پینٹنگ کی پُشت پر ایک اور پینٹنگ ہے جس میں ایک بادشاہ اور ملکہ دربار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اُس کی پُشت پر پینٹنگ کرتے وقت آرٹسٹ نے غلطی سے کینوس اُلٹا رکھ دیا تھا۔ ڈیو چامپ ایک سُست قسم کا آرٹسٹ تھا جیسا کہ بیشتر آرٹسٹ ہوتے ہیں۔ اُس نے دوبارہ تصویر بنانے کی بجائے کہہ دیا کہ اس کو ایسے ہی ٹانگ دو۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ اور ملکہ کو تو صرف انقلاب کی صورت میں اُلٹا ٹانگا جا سکتا ہے۔ اُس وقت تک بیشتر انقلابات (یعنی فرانسیسی، امریکی اور روسی) ہو چکے تھے، اُلٹا ٹلنگنے کی صورت میں وہ بے چارے تخت سے گر جاتے جو کہ آرٹسٹ کا منشا نہیں تھا۔ شاہوں کو تخت سے اُتارنے کے اور بھی مہذب طریقے ہیں اُلٹا صرف ڈکٹیٹروں کو ٹانگا جاتا ہے جیسا کہ اٹلی میں مسولینی کو ٹانگ دیا گیا تھا تاکہ لوگوں کو عبرت ہو۔ اس طرح آرٹ اور سیاست میں آپسی گہرے رشتے کا پتہ چلتا ہے۔ یہ واقعہ ہم نے اس لیے رقم کیا کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ پینٹنگ کا اُلٹا یا سیدھا ہونا محض ایک لطیفہ ہی نہیں حقیقت بھی ہے۔ ویسے امریکہ ایک ایسا ملک ہے جہاں ہر قسم کا لطیفہ حقیقت میں اور ہر قسم کی حقیقت لطیفے میں بدل دی جاتی ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اِس قسم کی آزادی مصنفوں کو حاصل نہیں۔ وہ تو صرف ایک ہی طریقے سے لکھ سکتے ہیں۔ ہاں کئی مصنف ایسے ہیں جو اوٹ پٹانگ لکھتے ہیں۔ ایسے لکھنے والوں کی بھی امریکہ میں ہی

بھاتا ہے۔ ہندوستان میں ایسے ادیب صرف شاعری کرتے ہیں۔

اس میوزیم میں دُنیا کی مشہور تصویروں کی نقلیں اور آرٹ کے موضوع پر لکھی ہوئی قسم قسم کی کتابیں بکتی ہیں۔ ہم نے وہاں سے پال کلی PAUL KLEE کی کتاب "ماڈرن آرٹ پر" (ON MODERN ART) خریدی تاکہ پینٹنگ کی تھیوری اور فلاسفی کو کچھ سمجھ سکیں۔ یہ کتاب بڑی اچھی ہے۔ کلی کا کہنا ہے کہ عام انسان پینٹنگ میں اس قسم کی مشابہت ڈھونڈتا ہے جو کیمرے سے لی گئی فوٹو میں ملتی ہے۔ اگر ویسی مشابہت کسی پینٹنگ میں نہ ملے تو عام انسان کا فیصلہ ہوتا ہے کہ پینٹنگ اچھی نہیں۔ کلی کا قول ہے کہ آرٹ کو پرکھنے کے لیے اس قسم کی کسوٹی مناسب نہیں۔ آرٹسٹ پر کسی تجربے، مشاہدے یا چیز نے جو تاثر چھوڑا ہے، آرٹسٹ اُسی کا اظہار کرتا ہے۔

نوٹ کیجیے، "تاثر" ـــــ چیز، تجربہ، مشاہدہ نہیں، بلکہ اُن کا تاثر۔ ظاہر ہے مختلف لوگ مختلف وقت پر مختلف موڈوں میں مختلف تاثر لیں گے۔ فن کار وہی تاثر آپ تک پہنچاتا ہے۔ فن کار ایک عمل کو پیش کرتا ہے۔ ایک سبجیکٹ جو آپ کے سامنے ہے، ماضی میں کیسا تھا، مستقبل میں کیا ہو سکتا ہے، اُس کے امکانات کیا ہیں۔ آرٹسٹ آپ کو ان کی جھلکیاں دکھاتا ہے اور اس طرح آپ کے شعور کو گہرا اور آپ کی بصارت کو وسیع تر بنانے میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔

یہ تو صرف پال کلی تھا۔ اس کے علاوہ اور کئی اساتذہ اور ماہروں کے شاہکار ہم نے دیکھے اور اُن کی تھیوریاں پڑھیں۔ چار گھنٹے کے بعد جب ہم تھک کر میوزیم سے باہر نکلے تو سورج ہماری طرف دیکھ کر خوب ہنسی۔ ہم نے وجہ پوچھی تو کہنے لگی کہ اب تم خود بالکل ماڈرن پینٹنگ لگ رہے ہو۔ ہم نے کہا "کہیں اُلٹا تو نہیں ٹانگ دو گی!؟

اُس نے کہا "پہلے پیٹ پوجا کریں گے۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنی پک نِک باسکٹ کھولی اور ہم نے ایک مشہور بُت کے سایہ تلے بیٹھ کر اپنی تکان دور کی اور نہایت ہی لذیذ کھانا کھایا۔

▲▲

خامہ بگوش (کراچی)

انگوٹھا چھاپ ادیبوں کا طوطی بولتا ہے
کیوں کہ یہ طوطی بول سکتا ہے، لکھ نہیں سکتا

ہم عزلت گوشہ نشین ہیں، ہمیشہ ایک ہی حال میں رہتے ہیں کسی نئی حکومت کے آنے سے خوشی ہوتی ہے نہ پرانی حکومت کے جانے کا غم، جانے والے ہم سے اجازت لیے بغیر رخصت ہو جاتے ہیں اور آنے والے . . . . پیشگی اطلاع کے بغیر آ جاتے ہیں لیکن پیپلز پارٹی کی حکومت بنی تو ہمیں اس وجہ سے خوشی ہوئی کہ ہمارے وہ ادیب اور دانشور جو ایک عرصے سے ادب اور دانشوری کے نام پر (دم بدم) کا عذاب سہہ رہے ہیں روزگار سے لگ جائیں گے یہی ہوا، ہمارے کئی پسندیدہ شاعروں اور شاعرات کو ایسے ایسے اداروں کی سربراہی مل گئی جہاں عام حالت میں انہیں کلرکی بھی مشکل سے نہیں مل سکتی تھی۔

ہمیں سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی کہ احمد فراز کو اکیڈمی آف لیٹرز کا چیرمین بنا دیا گیا، کوئی کچھ بھی کہے ہم احمد فراز کے دل سے قدردان ہیں، شیر شاہ سوری کے بعد وہ دوسرے پٹھان ہیں جنھوں نے پورے برصغیر پر حکومت کی ہے، شیر شاہ سوری نے تلوار کے زور پر نام حکومت ہاتھ میں لی تھی، احمد فراز نے قلم کے ذریعے یہ اعزاز حاصل کیا ہے، پاکستان اور ہندوستان میں کہیں بھی چلے جائیے، گانے والوں اور گانے والیوں کی زبانوں پر احمد فراز ہی کی غزلیں ملیں گی، ساقی فاروقی کہتے ہیں کہ احمد فراز جب غزل لکھتے ہیں تو وہ یہ بات ذہن میں رکھتے ہیں کہ ان کی غزلیں گائی جائیں گی۔ لہذا وہ شاعری سے زیادہ گائیکی کے "تقاضوں" کو پورا کرتے ہیں، ہمیں اس متعصبانہ رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ احمد فراز شاعری کرتے ہوئے ذہن کو درمیان میں لاتے ہی نہیں دل سے کام لیتے ہیں، کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ اچھی شاعری کی تعریف یہ ہے کہ "از دل خیزد بر دل ریزد" یعنی شاعری وہ ہے جو دل سے اٹھے اور دل کو متاثر کرے۔

ہاں تو جب احمد فراز کو اکیڈمی آف لیٹرز کا چیرمین بنایا گیا تو ہمیں اس لیے خوشی ہوئی کہ جس طرح احمد فراز کے دن پھرے ہیں، اسی طرح پاکستان کے تمام ادیبوں کے دن پھر جائیں گے، اکیڈمی صحیح معنوں میں ادیبوں کے مفادات کا خیال رکھنے والا ادارہ بن جائے گی مگر افسوس کہ ابھی احمد فراز کے اعزاز میں مبارکبادی تقریبات کا سلسلہ جاری تھا کہ انھیں اکیڈمی کی چیرمین شپ سے برطرف کر دیا گیا۔ حکومت نے احمد فراز کے ساتھ وہی سلوک کیا جو غالب سے اس کے محبوب نے کیا تھا۔

مجھے رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

گیارہ برس تک مزاحمتی ادب تخلیق کرنے کا یہ صلہ اس حکومت نے دیا جس کے قیام کے لیے احمد فراز نے شب و روز محنت کی تھی۔ انہیں احمد فراز کی برطرفی کی اطلاع لاہور کے چند ادیبوں کے اس بیان سے ہوئی جو اخباروں میں چھپا تھا اور جس میں موصوف کو ان کے عہدے پر بحال کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ کراچی کے ادیبوں کو بھی اس سلسلے پر دلی افسوس ہوا اور ایک دردناک اپیل تیار کی گئی جس پر کچھ ادیبوں نے دستخط کئے اور کچھ نے انگوٹھے کا نشان ثبت کیا، آج کل انہیں انگوٹھا چھاپ ادیبوں کا طوطی بول رہا ہے کیونکہ یہ طوطی بول ہی سکتا ہے لکھ نہیں سکتا۔ [illegible] افسوس کہ یہ اپیل اخباروں میں شائع نہیں ہو سکی کیونکہ جن ادیبوں کو اپیل کی اشاعت کا کام سونپا گیا تھا انھوں نے اسے اس بنا پر تلف کر دیا کہ اس سے عوامی حکومت بدنام ہو گی۔

پھر ایک دن اخباروں میں ایک دلچسپ خبر چھپی، کسی اخبار نویس نے وزیر تعلیم سید غلام مصطفیٰ شاہ سے احمد فراز کی برطرفی کا سبب پوچھا، تو انھوں نے فرمایا۔ "میں نے سوچا احمد فراز کو اکیڈمی سے چلے جانا چاہیے، لہٰذا وہ چلا گیا۔" قطع نظر اس سے کہ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب سوچتے بھی ہیں، یہ جملہ شاہ صاحب کی شخصیت کی ۔۔۔۔۔ نہایت عمدہ تصویر پیش کرتا ہے، ایک ایسی تصویر جو غرور، تکبر، فرعونیت اور خود پسندی کے رنگوں سے بنائی گئی ہو، ہمارا خیال تھا کہ شاہ صاحب کے اس بیان کی اشاعت کے بعد آمریت کے زمانے میں مزاحمتی ادب تخلیق کرنے والے ادیب یک جا ہو کر اس آمرانہ انداز گفتگو کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں گے، لیکن کسی طرف سے کوئی آواز بلند نہیں ہوئی، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام "مزاحمتی ادیب" آج کل برسرِ روزگار ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ ان کے ساتھ بھی وہی سلوک ہو، جو احمد فراز کے ساتھ ہوا ہے۔

یہ تو تصویر کا ایک رخ تھا، دوسرا رخ احمد فراز کے ایک انٹرویو کے ذریعے سامنے آیا جو پچھلے دنوں انگریزی روزنامے "ہیرلڈ" میں شائع ہوا ہے۔ اس انٹرویو میں احمد فراز نے اکیڈمی سے اپنی علاحدگی کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ سید غلام مصطفیٰ شاہ ذاتی نمود و نمائش کے لیے اکیڈمی کو استعمال کرتے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ماضی قریب میں شاہ صاحب نے قائداعظم اور علامہ اقبال کے بارے میں جو ہرزہ سرائی کی تھی اس کے خلاف شدید ردِ عمل ہوا تو موصوف نے احمد فراز سے کہا "کچھ ایسے ادیبوں کی خدمات حاصل کرو جو میرے حق میں لکھیں۔" فراز نے جواب دیا۔ "اس قسم کے کام اس طرح نہیں ہوتے۔ ادیبوں کی خدمات حاصل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ آپ نے قائداعظم اور اقبال کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اگر آپ اسے درست سمجھتے ہیں تو اپنے موقف پر ثابت قدم رہیے اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے خیالات کو صحیح طور پر پیش نہیں کیا گیا تو آپ ایک وضاحتی بیان جاری کر کے اپنے اصل خیالات پیش کر دیجیے۔" شاہ صاحب کو فراز کا جواب پسند نہ آیا، ان کا خیال تھا کہ فراز کراچی کے ادیبوں کو جمع کریں گے اور اکیڈمی کے فنڈ سے "نذرانے" پیش کر کے شاہ صاحب کے حق میں مضامین لکھوائیں گے، لیکن احمد فراز کے جواب نے انھیں مایوس کر دیا۔

بدنامی کے دھبوں کو دھونے کے لیے شاہ صاحب نے دوسرا طریقہ اختیار کیا، انھوں نے اکیڈمی آف لیٹرز کے

فنڈ سے پانچ لاکھ روپے اقبال اکیڈمی کے کھاتے میں منتقل کر دیئے تاکہ وہ یہ ثابت کر سکیں کہ وہ اقبال کے خلاف نہیں ہیں، شاہ صاحب نے قائداعظم کی شان میں جو گستاخی کی تھی اس کی تلافی کے لیے قائداعظم پر ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا گیا، اس کے اخراجات بھی اکیڈمی نے برداشت کیے جو لاکھوں میں تھے۔ احمد فراز نے شاہ صاحب کو سمجھایا کہ اس قسم کے کاموں کے لیے وزارتِ تعلیم کو اپنے وسائل کام میں لانے چاہئیں، اکیڈمی کے فنڈز کو صرف نہیں کرنا چاہیے، لیکن شاہ صاحب نے سنی ان سنی کر دی۔

اختلافات کی خلیج اس وقت اور وسیع ہو گئی جب شاہ صاحب نے اپنے ایک جیبی ادارے سندھ گریجویٹس ایسوسی ایشن کے لیے اکیڈمی کی طرف سے ایک لاکھ روپے کے عطیے کا اعلان کیا، گویا اکیڈمی نہ ہوئی حلوائی کی دکان ہو گئی، سندھ گریجویٹس ایسوسی ایشن کا ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس غلط بخشی پر احمد فراز نے بقولِ خود، شدید احتجاج کیا، ظاہر ہے ان حالات میں شاہ صاحب یہی سوچ سکتے تھے کہ احمد فراز کو اکیڈمی سے چلے جانا چاہیے، سو ایسا ہی ہوا۔

اس سارے جھگڑے میں غلطی احمد فراز کی ہے، یہ ضیاء الحق کی آمریت کا زمانہ تو تھا نہیں کہ احمد فراز جو چاہتے سو کرتے۔ چھ سال تک غیر ممالک میں آمریت کے خلاف مہم بھی چلاتے رہتے اور ضیاء الحق کے دور ہی میں واپس آکر چھ سال کی تنخواہ یک مشت وصول کر لیتے، یہ جمہوریت کا دور ہے، اس میں تو وہی کچھ ہوگا، جو جمہوریت کے مائی باپ چاہیں گے، ہمارے خیال میں احمد فراز کو شاہ صاحب کے مقابلے پر نہیں آنا چاہیے تھا، فنڈ اکیڈمی کا ہے، اگر شاہ صاحب اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں تو اس میں کسی کی گرہ سے کیا جاتا ہے۔

احمد فراز کے مذکورہ انٹرویو سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کو ادب اور ادیبوں کے مفادات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، یہ درست نہیں، شاہ صاحب نے ہمیشہ ادیبوں کی فلاح و بہبود کے لیے سوچا ہے، ہم جگہ کی کمی کی وجہ سے صرف ایک مثال پیش کریں گے، پچھلے دنوں شاہ صاحب نے اکیڈمی کے سربراہ کی حیثیت سے اعلان کیا تھا کہ اکیڈمی اپنے خرچ پر مرحوم ادیبوں کے مزار تعمیر کرائے گی، اس جملے میں جو جہانِ معنی پوشیدہ ہے، جس کی تفصیل کے لیے تو دفتر کے دفتر درکار ہوں گے، اجمالاً یہ کہا جا سکتا ہے، زندہ ادیبوں کے مزار بنوانے کی اس لیے ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ اکیڈمی کا دفتر ہی کافی ہے جہاں پہنچ کر ادیب اپنے آپ کو زندہ درگور محسوس کرتے ہیں، مرحوم ادیبوں کے مزار بنوانے کا فائدہ یہ ہے کہ اس طرح مرنے کے بعد ادیبوں کی قدر دانی کی روایت قائم ہوگی، ہم اگر زندوں کے حقوق ادا نہ کر سکیں تو کم از کم مُردوں کی دیکھ بھال ضرور کرنی چاہیے، یہ نیکی کا کام ہے اور نیکی کبھی ضائع نہیں جاتی، نیکی کو دریا میں ڈالنے سے بہتر ہے کہ ادیبوں کے قبرستان میں ڈالا جائے۔

زندہ ادیبوں کی دیکھ بھال ایک معمولی اور آسان کام ہے، شاہ صاحب کی مشکل پسند طبیعت کی داد دینی چاہیے کہ انہوں نے ایک بڑے کام کو ہاتھ میں لیا ہے، اب اکیڈمی ایک تعمیراتی ادارے کی صورت اختیار کر لے گی اور ادیبوں کے شاندار مزار تعمیر کرائے گی۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ اکیڈمی کا نام اس کے کام سے مناسبت نہیں رکھتا لہٰذا بہتر ہوگا کہ اسے "انجمن برائے تعمیر مزارات اہلِ ادب" کا نام دے دیا جائے۔ ہمارے [illegible]ل میں نام کی تبدیلی مناسب نہیں ہے کیوں کہ اکیڈمی موجودہ نام سے خاصی مشہور ہو چکی ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ایک آدھ لفظ بڑھا دیا جائے جو مزارات کی تعمیر کے کام سے مناسبت رکھتا ہو، ہماری تجویز ہے کہ اکیڈمی آف لیٹرز کو آئندہ اکیڈمی آف ڈیڈ لیٹرز کہا جائے۔

●●

اسماعیل ظریف
(حیدرآباد)

نور جہاں ہوتی ہے

نئے فیشن میں نئی بات جہاں ہوتی ہے
کم لباسی میں وہاں شرم کہاں ہوتی ہے

نوجوانوں کی غزل ہوتی ہے کمسن یارو
جو کہ بوڑھے ہیں غزل ان کی جواں ہوتی ہے

ویسے اغیار کو ہم سر پہ بٹھا لیتے ہیں
ہاں مگر اپنوں پہ تنقید یہاں ہوتی ہے

کسی فن کار پہ فقرے نہ اچھالو یارو
کیوں کہ فن کار کے منہ میں بھی زباں ہوتی ہے

رخصتی پا کے جو سسرال کو جاتی ہے دلہن
چار ہفتوں کے لیے نور جہاں ہوتی ہے

لڑکا انکار جو کر دیتا ہے شادی کے لیے
اس کے انکار میں کچھ بات نہاں ہوتی ہے

آج سے بیس برس پہلے جو تھی بات اس میں
ان کی انگڑائی میں وہ بات کہاں ہوتی ہے

نہ تو مرکز پہ ہے عاشق نہ تو معشوق کوئی
عشق میں اب وہ کہاں آہ و فغاں ہوتی ہے

باپ کی جان پہ پلتا ہے جواں جو بیٹا
کام دھندے کی اسے فکر کہاں ہوتی ہے

دھاندلی بازی ضروری سی ہے شہرت کے لیے
یوں ہی گھر بیٹھ کے تشہیر کہاں ہوتی ہے

تھان پر تو سبھی یکساں نظر آتے ہیں حضور
چال میدان میں گھوڑے کی عیاں ہوتی ہے

قافلہ یوں تو سفر کرتا ہے دن میں پھر بھی
نور جہاں چوروں کا ہے شام وہاں ہوتی ہے

واہ وا کے لیے رنگین غزل میں اکثر
داستاں عشق کی جھوٹی ہی بیاں ہوتی ہے

جس کی فطرت میں دل آزاری کا جذبہ ہوگا
اس کی فطرت میں جھوٹ بھی نہاں ہوتی ہے

چاند پر چاندنی راتیں کہاں ہوتی ہیں ظریف
نہ بہار رہتی ہے اس جا نہ خزاں ہوتی ہے

شریر نظام آبادی

کرنے والے دنیا میں دس کے چار کرتے ہیں
ایک ہم ہیں سولہ سو کے ہزار کرتے ہیں

کام کچھ نہیں کرتے یہ ہمارے نیتا جی
پر خطاب پبلک سے تو دو دو بار کرتے ہیں

لوگ جس سے چڑتے ہیں کام ہم وہی یارو
اک دفعہ نہیں کرتے بار بار کرتے ہیں

یہ جو تھی بیوی ہی ان کی سب سے تیز ہے تب ہی
ڈر کے وہ بھی چوتھی سے خوب پیار کرتے ہیں

جو اُدھار ملتا ہے سب شریر لاتے ہیں
اور ادائی برسوں میں قسط وار کرتے ہیں

رفیع احمد (مالیگاؤں)

مرزا غالب اور ہم

کہاں مرزا غالب اور کہاں ہم۔ اُن کے اور ہمارے درمیان ایک صدی سے بھی زیادہ طویل فاصلہ حائل ہے۔ تاہم دل میں یہ خیال اکثر انگڑائیاں لیتا ہے کہ کاش مرزا صاحب سے ایک بار خواب ہی میں ملاقات ہو جاتی تو چند ایک موضوعات پر اُن سے دو دو باتیں ہو جائیں۔

مرزا غالب کو آم بہت مرغوب تھے۔ ان کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک بار مرزا صاحب احباب کے ساتھ بیٹھے آم کھا رہے تھے۔ ہر شخص اپنی بساط کے مطابق آم کی شان میں قصیدہ پڑھ رہا تھا۔ جب سب گہر افشانی کر چکے تو کسی نے مرزا صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ حضرت آپ بھی تو کچھ کہیے۔ مرزا صاحب نے کہا "بھئی میرے نزدیک تو آم میں دو خوبیاں ہونی چاہئیں۔ میٹھا ہو اور بہت ہو۔"

اگر ہماری ملاقات مرزا غالب سے ہو تو ہم ان کی خدمت میں عرض کریں گے کہ حضور! آپ کے نزدیک آم میں صرف دو خوبیاں ہونی چاہئیں لیکن خاکسار کے نزدیک آم میں تین خوبیاں ہونی چاہئیں۔ میٹھا ہو، بہت ہو اور سستا ہو۔ تیسری خوبی تک آپ کی رسائی اس لیے نہ ہو سکی کہ آپ کو آم خریدنے نہیں پڑتے تھے۔ آم آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آداب بجا لاتے تھے۔ کبھی بادشاہ کی طرف سے آموں کے ٹوکرے چلے آ رہے ہیں، کبھی احباب کی جانب سے۔ آج مرزا تفتہ نے بھیج دیئے تو کل کسی اور شاگرد نے آموں کا تحفہ روانہ کر دیا۔ آپ تو روزانہ دعوت آم تناول فرماتے ہوں گے۔ کہیں دو چار دن بغیر آم کے گزر گئے تو بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آپ میں حسن طلب کی خوبی بھی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ ہم نے وہ واقعہ بھی کتابوں میں پڑھا ہے کہ ایک روز بہادر شاہ ظفر آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ جن میں آپ بھی موجود تھے، باغ میں ٹہل رہے تھے۔ آم کے پیڑ رنگ برنگے آموں سے لدے ہوئے تھے۔ اس باغ کے آم صرف بادشاہ اور بیگمات کے لیے مخصوص تھے۔ آپ بار بار آموں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بادشاہ نے آپ سے دریافت کیا "مرزا، اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو؟" آپ نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا تھا "پیر و مرشد دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں"

آپ کی بات سن کر بادشاہ نے تبسم فرمایا اور اسی روز ایک ٹوکری عمدہ عمدہ آموں کی آپ کو ارسال کر دی۔

مرزا صاحب، آپ نے اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کے آم چکھے ہوں گے۔ بے شک آج بھی دلی میں عمدہ قسم کے آموں

کے باغات پائے جاتے ہیں۔ جن میں الفانسو، دسہری، ملغوبہ، چوسہ اور ہاپس جیسے آم پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن وہ عوام کی قسمت میں کہاں؟ بازار میں صرف عام قسم کے آم ہی دستیاب ہیں۔ بہترین قسم کے آم تو خواص کے دسترخوان کی زینت بن چکے ہیں۔ عوام آم کے عاشق زار ہیں، اور سرکار کو زرمبادلہ درکار ہے۔ چناں چہ لنگڑا بھی لنگڑاتے ہوئے ہندوستان سے باہر بھاگ جاتا ہے۔

مرزا صاحب، آپ کے عہد کے حکمران بڑے رعایا پرور تھے۔ ہمارے نصیب میں تو شکم پرور لکھے ہیں۔ آپ کی سرکار کسی کو نوازنے پر آتی تو خلعتِ فاخرہ کے علاوہ جاگیر میں چند گاؤں یا شہر بھی عطا کر دیتی تھی۔ اگر آپ اس جمہوری دور میں ہوتے اور سرکار اپنے کسی درباری یعنی منسٹر کے اشارے پر آپ کو نوازنے پر آتی تو... زیادہ سے زیادہ ایک کاغذ کا ٹکڑا آپ کے ہاتھ میں تھما کر کہتی کہ لیجیے صاحب، اب آپ پدم شری مرزا غالب ہو گئے۔ اسے بھی ہماری سرکار کی فراخدلی سمجھیے کہ اس نے آپ کے جیتے جی آپ کی قدر کی ورنہ مرنے کے بعد کبھی بھولے بسرے آپ کی یاد ستاتی تو کسی تنگ گلی کو بیچ کر آپ کے نام سے منسوب کر کے آپ کی سات پشتوں پر احسانِ عظیم کرتی۔

مرزا صاحب، آپ نے مرزا تفتہ کے نام ایک خط یوں رقم کیا تھا: "میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جس میں اطراف و جوانب سے دو چار خط نہ آتے ہوں۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے"۔ اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وقت گزارنا آپ کے لیے امرِ محال تھا۔ وقت کاٹنے کا ذریعہ صرف خطوط نویسی تھی۔ آج وقت کاٹنے کی بہت ساری تیز ترین چھریاں ایجاد ہو چکی ہیں۔ وقت گزارنے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وقت برباد کرنے کے بہت سے ذرائع... دستیاب ہیں۔ اخبارات اور رسائل کا تو سیلاب آیا ہوا ہے۔ صرف آپ کے وطنِ عزیز دہلی سے اتنے سارے اخبارات اور رسائل شائع ہوتے ہیں کہ ان کے پڑھنے میں ایک دن کیا ایک مہینہ بآسانی گزر سکتا ہے۔ اگر آج کے طلبا کی طرح آپ میں پڑھنے لکھنے کی امنگ نہ ہو تو آپ شب و روز ریڈیو سن سکتے ہیں۔ ریڈیو سنتے سنتے بور ہو جائیں تو ٹی۔وی سے شوق فرمائیے۔ اس جادو کے ڈبے کو دیکھ کر آپ دانتوں تلے انگلیاں دبالیں گے۔ ٹی وی قابلِ دید بھی ہے اور قابلِ شنید بھی۔ خبریں، اشتہارات، ڈرامے، مشاعرے، قوالیاں اور فلمیں وغیرہ وغیرہ غرض اس سائنسی صندوق میں تفریح کے خزانے پوشیدہ ہیں۔ ہماری حکومت غریبی کو پرے ہٹانے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے مگر وہ اتنی ڈھیٹ اور بے شرم ہے کہ ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ کسی انگریزی فلم کی ہیروئن کی طرح پبلک سے چمٹی ہوئی ہے۔ چناں چہ عوام کو غمِ روزگار سے نجات دلانے کے لیے وزرا ٹی وی کے جال بچھانے میں مصروف ہیں۔ غریبوں کا دل بہلانا بھی ان کی خدمت کرنا ہے۔ آپ کا دل بہلانے میں اگر ٹی وی بھی ناکام رہے تو سینما دیکھیے۔ سینما دیکھنے سے آپ جان جائیں گے کہ آج کا ہندوستانی مرد ناچنے کودنے کے علاوہ بڑا جنگجو بھی ہے۔ آپ پر یہ انکشاف بھی ہو گا کہ ہمارا دیش اتنا غریب ہے کہ یہاں کی عورتوں کے پاس تن ڈھانکنے کے لیے برابر کپڑے بھی میسر نہیں آتے۔

غالب صاحب، آپ کی زندگی بڑی تنگ دستی میں گزری۔ ذیل کا شعر اس کا شاہد ہے

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

آپ کے ہم عصروں نے آپ کے کلام کی قدر نہیں کی ورنہ آپ کو یہ نہ کہنا پڑتا کہ

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

آپ بیسویں صدی میں تشریف لا کر تو دیکھیے۔ دنیا والے آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ آج دنیا آپ کے دیوان کی دیوانی ہے۔ آپ کی بدولت ہزاروں افراد برسر روزگار ہو گئے... کتنے ہی ادبا و شعرا نے آپ پر قلم گھس گھس کر نا موری حاصل کی ہے۔ آپ کی ذات کے طفیل درجنوں گویے عزت کو بن گئے۔ اردو کے کتنے ہی کافر اردو پر ایمان لے آئے۔ رسائل کے ایڈیٹروں کے نزدیک تو آپ کی شخصیت گویا قارون کا خزانہ ہے۔ آپ کی یاد میں نمبر پر نمبر نکال کر دامن اردو کو مالا مال کر رہے ہیں اور خود بھی مالا مال ہو رہے ہیں۔ دیوانِ غالب، دیوانِ عام بن چکا ہے۔ ہر ایرا غیرا نتھو خیرا دیوان غالب شائع کر کے اپنی غریبی دور کر سکتا ہے۔ خیر باتوں باتوں میں کافی تاخیر ہو چکی ہے۔ آپ چند روز کی رخصت لے کر زمین پر آ جائیے پھر آپ کی صدارت میں ایک عالمی مشاعرہ منعقد کیا جائے گا۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ آج شمع اردو کے پروانے دنیا کے گوشے گوشے میں موجود ہیں۔

۵۵

اقبال ہاشمی (حیدرآباد)

غزل

یہ غذائیں مذاق کرتی ہیں یا قضائیں مذاق کرتی ہیں
دھیان میں گم رشی منی لیکن مینکائیں مذاق کرتی ہیں
کس طرف جاؤں اے خدا ابتلا سب دشائیں مذاق کرتی ہیں
کچھ مرض لا علاج ہوتے ہیں کچھ دوائیں مذاق کرتی ہیں
کیا غضب ہے کہ اس عالم سے فاختائیں مذاق کرتی ہیں
جھونپڑا جھونپڑا نہیں رہتا جب گھٹائیں مذاق کرتی ہیں

ہاشمی برگ و بار ہے اب بھی
کیوں ہوائیں مذاق کرتی ہیں

سڑک پر

کیا کیا نظر آتا ہے اسے یار سڑک پر صوفی بھی نظر آتے ہیں میخوار سڑک پہ
کرتے تھے میاں مجنوں کبھی پیار سڑک پر اب دام میں لیلیٰ کے ہیں بیزار سڑک پر
ہوتا ہے کبھی وصل کا اقرار سڑک پر ہو جاتا ہے پھر قول سے انکار سڑک پر
رکشہ ہو کہ ٹھیلا ہو کہ ہو کار سڑک پر چلتے ہیں یہاں سینکڑوں بے کار سڑک پر
"ہم ایک ہیں" نعرہ بھی لگاتے ہیں یہیں سب ہوتی ہے پھر اک آن میں تکرار سڑک پر
بک جاتے ہیں سڑکوں پہ تک ایمان مرے یار مل جاتے ہیں ایسے بھی خریدار سڑک پر
پرواہ ٹریفک کی کسی کو بھی نہیں ہے ہوتے ہیں شب و روز ہی تہوار سڑک پر
پی کر کوئی بن جاتا ہے ہٹلر کا بھی انکل محتاج نظر آتا ہے مختار سڑک پر
ہر جنس یہاں ملتی ہے چاول کہ ٹماٹو روزانہ لگا کرتا ہے بازار سڑک پر
ہوتی ہے کبھی شہر میں رحمت کی جو بارش آ جاتی ہے کس شان سے منجدھار سڑک پر

کیا اور کوئی جگہ مناسب نہیں ملتی
کیوں کہتے ہو صابر میاں اشعار سڑک پر

صابر بہاری (رانچی)

نوار انصاری (رانچی)

داداگیری

آج کل داداگیری کا زمانہ ہے۔ داداگیری کے بغیر کوئی شہرت حاصل نہیں کر سکتا۔ یوں تو داداگیری ہر شعبۂ زندگی سے منسلک ہے مگر داداگیری کا کمال میدانِ سیاست اور صحافت میں خوب دیکھنے میں آتا ہے۔

داداگیری کے لیے کسرتی جسم اور خاصے ڈیل ڈول کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس ذرا ہمت کی ضرورت ہے۔ کمزور اور نحیف جسم و جان والے حضرات بھی داداگیری کر سکتے ہیں اور روٹی روزی کا بندوبست بخوبی کر سکتے ہیں۔

تو داداگیری ہے کیا؟ صحیح کام کو غلط طریقے سے انجام دینا بھلے ہی صحیح طریقے سے کام انجام دینا معاشرے کے لیے ضروری ہو مگر وہ کام ہی کیا جو صحیح ڈھنگ سے انجام دیا جائے۔ اگر کوئی شخص صحیح اور سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے تو اس کی عقلِ سلیم پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ ہر چیز کو غلط ڈھنگ سے انجام دینے میں ہی عافیت محسوس ہوتی ہے۔ حال ہی میں داداگیری کا سیاسی روپ دیکھنے کا موقع ملا۔ گوپال گنج بائی الکشن میں کامیاب ہونے کے لیے میدانِ سیاست کے بڑے بڑے "دادا" اپنی لچھے دار تقریروں سے جنتا کا دل [illegible] رہے تھے۔ کچھ "دادا" گولی بندوق پر تکیہ کیے بیٹھے تھے۔ کچھ دادا روپیہ پیسہ پھینک کر تماشہ دیکھ رہے تھے جنتا میں کافی چہل پہل تھی۔ جیوں جیوں الکشن کا وقت قریب آتا گیا کمزور "دادا" میدانِ الکشن سے دور بھاگنے لگے اور جیت، آخر، قت ور "دادا" کی ہوئی۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس"

آئے دن شہروں میں داداگیری کا کرتب دیکھنے کو اور سننے کو ملتا ہے۔ ایک بار اپنے ہی شہر رانچی میں رانچی بس اسٹینڈ کے پاس ایک چھوٹے سے ہوٹل میں چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ شام کا وقت اور آفتاب روپوش ہونے ہی والا تھا اچانک دو تین نقاب پوش "دادا" ہوٹل میں گھس آئے۔ ایک نے دوکان دار کو ایک چانٹا رسید کیا۔ دوسرے نے نوکر کو تھپڑ مارا اور تیسرے نے "کیش" کو اپنے قبضے میں کیا اور منٹوں میں یہ جا اور وہ جا یعنی وہ "دادا" لوگ موٹر سیکل پر بیٹھ کر رفوچکر ہو گئے۔ یہ تو داداگیری کا ایک معمولی کارنامہ تھا۔ اب تو داداگیری کے بل پر منٹوں میں گولی چل سکتی ہے، جان جا سکتی ہے، عصمت لٹ سکتی ہے، گھر بار تباہ و برباد ہو سکتا ہے۔

انکم ٹیکس، سیلس ٹیکس، گفٹ ٹیکس، ویلتھ ٹیکس، واٹر ٹیکس، میونسپل ٹیکس، پروفیشن ٹیکس سے تو عوام بخوبی واقف تھے ہی۔ اب ایک اور نئے ٹیکس کا اضافہ ہو گیا ہے یعنی اب عوام کو "داداگیری ٹیکس" بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔ داداگیری

ٹیکس کی رقم متعین نہیں ہوتی ہے بلکہ اس ٹیکس کی وصولی "دادا" کی مرضی سے ہوتی ہے۔ "دادا" اگر چاہے تو ایک دن میں گھر کی ساری پونجی وصول کرسکتا ہے۔ داداگیری ٹیکس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا ہے۔ سال میں یا مہینے میں کسی وقت بھی یہ ٹیکس وصول کیا جاسکتا ہے۔ "دادا" کا لبادہ اوڑھ کر پولیس بھی اس ٹیکس کو فٹ پاتھ دکان داروں سے ہنسی خوشی وصول کرتی ہے۔ داداگیری ٹیکس کا دوسرا نام رنگ داری ٹیکس ہے۔ اب تو اس ٹیکس کی مقبولیت روز افزوں بڑھتی جارہی ہے۔ حکومت کے کئی شعبوں میں اس کا دخل ہو چکا ہے۔ ٹھیکہ داروں کی بھی چاندی ہوگئی ہے۔ داداگیری ٹیکس کے نام پر وہ اپنا کمیشن بھی ادا نہیں کرتے ہیں بلکہ حکام کو ڈراتے ہیں۔

داداگیری کی مقبولیت دیکھ کر ملک کے کچھ لوگوں نے "دادا" کو اپنے نام کا جزو بنالیا ہے۔ مثلاً "دادا جی چائے والا" "دادا جی ٹی شرٹ والا" "دادا جی پان والا" "دادا جی مٹھائی والا" "دادا جی بانس والا" وغیرہ۔

داداگیری اب ایک معقول پیشہ بن چکا ہے۔ اس پیشے کو اپنا لینے سے بہتیرے کام انجام پاسکتے ہیں۔ ہمارے محلے میں ایک شخص کو زمین خریدنی تھی۔ جب زمین خریدنے میں مشکلیں پیش آنے لگیں اور مالک زمین کسی طرح زمین فروخت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوا تو اس آدمی نے ایک "دادا" کی خدمت مستعار لی اور "دادا" کی حکمتِ عملی سے چند دنوں میں زمین اسے حاصل ہوگئی۔

اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلبا بھی داداگیری سے مستفید ہونے لگے ہیں۔ اپنی مرضی سے امتحان میں شریک ہوتے ہیں۔ اگر پرچہ سخت آئے تو حسبِ مرضی امتحان سے واک آوٹ کر جاتے ہیں اور امتحان ہی کو کینسل کرادیتے ہیں۔ پروفیسر حضرات بھی کبھی کبھار "داداگیری" کا کمال دکھاتے ہیں۔

شریفوں کا گزر بسر ان دنوں محال ہو گیا ہے۔ شرافت کو اب بے وقوفی سے تعبیر کیا جانے لگا ہے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے داداگیری کے سائے میں اپنی زندگی گزاری جائے۔ اس میں نقصان کم فائدہ زیادہ ہے۔ ▲▲

ممتاز مہدی
(حیدرآباد)

کھڑے کھڑے اور بیٹھے بیٹھے

راشن کی دکان کی لائن میں کھڑا ہونا، سینما لائن میں کھڑا ہونا جیسے روزگاروں کی صف میں کھڑا ہونا۔ یہ تکی حماقتوں کے ساتھ انتخابات میں کھڑا ہونا تو عام سی باتیں ہیں۔ لیکن پلین میں کھڑا ہونا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ چلتی ٹرین کے ڈبے کی چھت پر کالر اونچی کر کے کھڑا ہونا لطف و سرور اور ایڈونچر سے بھرپور ہوتا ہے۔ تماشہ دیکھتے ہوئے کھڑا ہونا علحدہ بات ہے۔ کھڑے کھڑے خود تماشہ بن جانا بڑا مضحکہ خیز ہوتا ہے۔ اصل تماشہ بن کے کھڑا ہونا تو دولھا بن کے اپنے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہے۔ سر پر تاج، آنکھوں پہ سہرا، کانوں میں آوازیں جس سے دماغ پہ بار کہ ہر آواز کو سمجھنا آپ ضروری سمجھتے ہیں۔ پریشانیاں لانے والی شیروانی (معہ پاجامہ) غرض سر تا پا تماشہ ہی تماشہ، جتنے شادی شدہ حضرات بارات میں کھڑے ہوتے ہیں وہ رنجیدہ، کبیدہ، خمیدہ نظر آتے ہیں کیوں کہ ان کو اپنا تماشہ رہ رہ کر یاد آنے لگتا ہے پھر بھی کوئی یوں ہی کہہ دے کہ دوبارہ سہرا پہنو گے تو فوری ان کی باچھیں ایسی کھلیں گی کہ آر۔ کے لکشمن کا کارٹون لگیں گے اور پل بھر میں پھر خمیدہ۔ کنوارے باراتی اس کے برخلاف نہ مسکراتے تھکتے ہیں نہ گاتے اور کھاتے۔ بچے تو شادی کے موقع پر بیٹھنے کا نام نہیں لیتے، فقط کھڑے کے کھڑے بلکہ دوڑتے بھاگتے نظر آتے ہیں۔ صاف ستھرے کپڑوں میں پُرجوش، جھگڑتے، روتے، چھیڑتے پھر رہے ہوں گے بہرحال نچلا نہ بیٹھیں گے کھڑے ہی ملیں گے۔

بطورِ سزا ایک ٹانگ پہ کھڑا ہونا جتنا پُرلطف اور باعثِ تفریح ہوتا ہے۔ سر کے بل اُلٹا کھڑا ہونا اتنا ہی لطف انگیز نہیں ہوتا۔ ٹریفک کے پیشِ نظر ایک فٹ یا تھ سے مخالف جانب کے فٹ پاتھ کو پالینے کی خواہش لیے کھڑا ہونا اپنی بے بسی کی عجیب مثال ہے۔ آنکھوں کے سامنے تیز رفتار سواریاں دوڑنے لگتی ہیں وہ کم ہوتی ہیں سست رفتار سواریاں ایک ریلے کی طرح بہہ نکلتی ہیں۔ یہ سلسلہ رکتا ہی نہیں۔ سڑک کراس کرنے اگر بچہ کھڑا ہے تو اس کی خواہش میں جوان ہو جائے جوان ہو تو بوڑھا، بوڑھا ہو تو بُت بنا کھڑا ہو جائے تا آں کہ قیامت ہی سامنے نہ آ کھڑی ہو جائے۔

محبوبہ کے انتظار میں کھڑا ہونا، کسی بڑے لیڈر کی آمد کی توقع میں کسی خاص سڑک کے کنارے اپنی اپنی جگہ کا ریزرویشن کر کے کھڑا ہونا، بس کے انتظار میں کھڑا ہونا، ریل یا پلین کے انتظار میں کھڑا ہونا [illegible] دراصل دماغی ورزش کی غرض سے کھڑا ہونا ہے۔ اس وقت ساری الجھنیں [illegible] کھڑے [illegible] کو سوائے [illegible] نہیں دیتا۔ البتہ الجھنیں خصوصیت [illegible] اتفاقی کھڑا ہونا [illegible]

کسی غیر اصولی بات کے لیے دوست کی حمایت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ تصویر کھنچوانے کے لیے فیملی کے ساتھ کھڑا ہونا بھی اتنا ہی دعوتِ تماشہ کا باعث ہے جتنا کہ کسی آفیسر کی خوشامد کے لیے مسکہ تھامے کھڑا ہونا۔

تحریری کام تو بیٹھے بیٹھے ہی کرنا ہوتا ہے جبکہ تقریر کھڑے ہو کر کرنا لازمی ہے۔ ہاتھ پاؤں چاہے تھرتھراتے رہیں تقریر ضرور کھڑے ہو کر ہی کی جاتی ہے۔ حجامت بیٹھے بیٹھے، لڑائی کھڑے کھڑے، کیرم بھی کھیلئے بیٹھے بیٹھے، پھل پھول توڑیئے کھڑے کھڑے، دکان داری بیٹھے بیٹھے، خریداری کھڑے کھڑے، بیچیے بیٹھے بیٹھے، مصافحہ کھڑے کھڑے۔ غصہ اتارنے کا فارمولہ یہ بتایا گیا ہے کہ کھڑے کھڑے غصہ آئے تو بیٹھ جائیے اور بیٹھے بیٹھے غصہ آئے تو لیٹ جائیے۔ بیٹھی ہوئی حالت میں غصہ آئے تو کھڑے ہو جائیے۔ کھڑے ہونے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ کوئی بیچ بچاؤ کے لیے ہے کہ نہیں ورنہ سامنے والا لڑائی کے عالم کر کھڑے کھڑے ہی اکڑ جائے گا۔

مزدور اور معمار تخلیقی کام کھڑے کھڑے ہی انجام دیتے ہیں اور ہر تخریبی کام کھڑے کھڑے ہی انجام پاتا ہے۔ کھڑے کھڑے پر یاد آیا کہ کھڑا دوپٹہ تو خواتین پہنتی ہیں آپ چاہے کچھ بھی پہنتے ہوں ہر موقع پہ کھری کھری، کھڑے کھڑے ہی کہیے جو ہوتا ہو، دیکھا جائے گا۔ ●●

بابو آر کے (اپل بوڑھر)

بکرا قربانی کا

عید قرباں جیسے جیسے قریب آرہی تھی ویسے ویسے . . . ہمارے گھر میں قربانی کے تذکرے ہونے لگے تھے۔ بازار کا دن آتے ہی ہم قربانی کا بکرا خریدنے نکلے۔ بازار جاتے وقت راستے میں ہمارا مقصد و منشا یہی تھا کہ ہر کوئی پہچان لے کہ ہم قربانی کے لیے بکرا خریدنے جارہے ہیں۔ اس کام کی شروعات ہم نے اپنے محلے کی پہلی گلی سے کرڈالی۔ ہم نے اپنی جیب سے سو روپیہ کا نوٹ نکال کر کرانے والے لالہ سے کہا۔ ارے لالہ، ذرا سو کے چھٹے تو دینا۔ کم بخت بکرے والے کے پاس چلّر کہاں ہوگا۔ بھلا! لالہ بولے "خاں صاحب، بکرا ذرا اچھا ہی لانا۔ ہم نے آس پاس کے لوگوں کو سنانے کے لیے اونچی آواز میں کہا۔ ارے لالہ، خان صاحبان بکرا کبھی خراب لاتے ہیں؟" وہاں سے نکل کر ہم آگے بڑھے اور چوراہے پہ آگئے۔ یہاں شناسا دوستوں کے کچھ چہرے دکھائی دیئے۔ ہم نے یہاں بھی موقع سے فائدہ اٹھایا۔" ارے او، رحمو، ذرا ادھر تو آ! وہ قریب آیا تو ہم نے سب کو سنانے کے لیے چلانے کے انداز میں کہا "دیکھ ابھی تو ہم قربانی کے لیے بکرا لینے بازار جارہے ہیں تو شام میں ہری اور نفیس گھاس گھر پہ پہنچا دینا۔ دیکھ بھولنا مت!" ہم نے رحمو کو دس روپے کا نوٹ تھما دیا اور آگے بڑھے۔ راستے بھر ہماری کوشش یہ رہی کہ ہر کوئی ہم سے پوچھے کہ ہم کہاں جارہے ہیں تاکہ ہم شان سے کہہ سکیں کہ قربانی کے لیے بکرا لینے جارہے ہیں۔ اب صاحب بازار پہنچ کر ہم نے ایک خوب صورت فربہ بکرے کا سودا کیا اور بکا لے بھی لیا۔ بکرے کی فربہالت قربانی کے فلسفے سے زیادہ ہماری شان اور مالی حیثیت کی غماز تھی۔ ہم بازار سے نکل کر بکرے کے لیے پھول کی دکان پر پہنچے۔ اس سے ایک عدد موٹا سا موگرے کا ہار بنوا کر بکرے کے گلے میں ڈالا۔ پھر چار چیلی کے گجرے بنوا کر اس کے پیروں میں باندھے۔ نرم و گداز ریشمی رسّی اس کے گلے میں ڈالی۔ رسی کا سرا ہم نے دامنِ محبوب کی طرح اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ ہم سینہ تانے بکرے کے آگے چلتے رہے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ لوگ خاطر خواہ طریقے سے ہماری جانب متوجہ نہیں ہورہے ہیں۔ تب ہم نے اس کا حل بھی ڈھونڈ نکالا۔ ہم نے دکان سے گھنگھرو خریدے اور بکرے کے پیروں میں باندھ دیئے۔ بکرا ٹھمک ٹھمک کر چلنے لگا۔ گھنگھرو کی چھن چھن تھی۔ ہمارا فخر سے پھولا ہوا سینہ تھا اور لوگوں کی ہماری جانب اٹھتی ہوئی نگاہیں تھیں اور ہم چاہتے بھی یہی تھے۔ ہم نے راستے میں ?? سے پی تو بکرے کو دودھ پلایا۔ ہوٹل میں اگر ہم نے بھجیے کھائے تو اس کے سامنے بیرے رکھے۔ لوگ باگ دیکھنے لگے اور قربانی

کے بکرے سے ہماری والہانہ محبت کا ذکر کرنے لگے۔ اس طرح ہمارا اور قربانی کے بکرے کا یہ جلوس گھر پہنچ کر اختتام کو پہنچا۔

بکرے کے ہمارے گھر میں قدم رنجہ فرمانے سے پہلے ہی گھر کے افراد نے گھر کے دروازے پر دیدارِ عام کے لیے لکڑی کی رنگین کھونٹی گاڑ رکھی تھی۔ اسٹیل کی چمچماتی تھالی میں ہری ہری نرم و نفیس گھاس موجود تھی اور بکرے کے استراحت فرمانے کے لیے نائلون کی پاک و صاف دری بچھادی گئی تھی۔ ہمارے گھر پہنچتے ہی گھر کے جملہ افراد نے بکرے کا پُرجوش استقبال کیا پھر باری باری رسم گل پوشی بھی ادا ہوئی۔ جوشِ الفت میں بچوں نے بکرے سے بوس و کنار کا سلسلہ قائم کیا اور بیگم نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر ممتا کی ٹھنڈک پہنچائی اور ہم نے بھی اس کی پیٹھ تھپتھپا کر حقِ پدری ادا کیا۔ اڑوس پڑوس کے بچوں نے بکرے کے گرد حلقہ سا بنالیا تھا اور آنے جانے والے بھی ذرا دیر کے لیے ٹھٹھک کر یہ ماجرا دیکھے جاتے تھے۔ رات ہوتے ہی ہم نے اپنی کھٹیا گھر سے نکال کر بکرے کی آغوش میں بچھادی اب تو بکرے سے ایک منٹ کی دوری بھی ہمارے لیے محال تھی۔ دن نکلتے ہی ہم نے بچوں سے کہا "ذرا اس بے چارے کو چہل قدمی کرالاؤ ..... رات سے بندھا پڑا ہے اعضا شکنی رہی ہوگی۔" تب بچوں نے اسے کھولا اور گلیوں میں چہل قدمی کے ساتھ ساتھ سڑکوں پر آوارہ گردی کرائی۔ اور چار گھنٹے بعد اس حالت میں گھر پہنچے کہ بے چارہ بکرا بیٹھ بیٹھ جاتا تھا اور جگالی بھی سوچ سوچ کر مردہ دلی کے ساتھ کرتا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ہم نے نیم گرم پانی میں نیم کے پتے ڈال کر اس کے پیر دھوئے مختلف قسم کے تیلوں سے مساج بھی کیا۔ یہ سب کرنے کے بعد ہم نے منے میاں سے پوچھا کیوں بیٹے تم بکرے کو کدھر کدھر لے گئے تھے؟ منے میاں نے تمام گشتی حال پیش کر دیا۔ ہم نے پھر پوچھا کیوں بیٹے! اپنے بکرے کو تو سب ہی دیکھ رہے ہوں گے۔ منے میاں بولے ہاں۔ ہاں..... صرف دیکھ ہی نہیں رہے تھے بلکہ جل بھی رہے تھے۔ ہم نے پوچھا اور بیٹے وہ تمہارے اسکول کے ماسٹر نے ہمارے بکرے کو دیکھا..... ہاں ہاں دیکھا..... لیکن ذرا اچٹتی نظر ڈالی اور گھر میں دبک گئے۔ میں آدھا گھنٹہ ان کے انتظار میں کھڑا رہا لیکن وہ گھر کے باہر نکلے ہی نہیں۔ ہم نے کہا "بیٹے تمہیں زیادہ دیر تک کھڑے رہنا چاہیے تھا بلکہ بکرے کو ان کے گھر کے اندر گھسا دیتے تو بہتر تھا۔ ارے گزشتہ سال اس نے قربانی کیا دی ایک مصیبت کردی تھی۔ دن رات آتے جاتے کم بخت بکرے کو اپنے دروازے کے سامنے گھنٹوں کھڑا کر دیتا تھا..... کم ظرف کہیں کا..... اب ہماری باری آئی تو بکرے سے آنکھیں چُراتا ہے!" دوپہر میں ہم نے بچوں کو تاکید کی کہ عصر کے بعد بکرے کو نہلانے کے لیے ندی پر لے جانا۔ ویسے تو ہم اسے گھر میں بھی نہلا سکتے تھے لیکن اپنی قربانی کو مشتہر کرنے کے لیے جس طرح چہل قدمی کے نام پر تمام شہر کا گشت بہتر تھا اسی طرح ندی پر نہلانے کے لیے لے جانا بھی کچھ برا نہیں تھا۔ اسی دن ہم نمازِ ظہر ادا کرنے محلے کی مسجد میں گئے۔ پیش امام صاحب وضو کر کے اٹھے تو ہم نے انہیں بآوازِ بلند مخاطب کیا "امام صاحب، ذرا دیکھنا کہیں بھول نہ جانا۔ عید کے دن بکرے کو ذبح کرنے ذرا جلدی آجانا!" پھر نماز کے بعد نمازیوں میں مسجد کے اندر ہی قربانی کے مسئلے پر، بکروں کی حالت اور ان کی قیمت پر

ڑا گرم تکرار شروع ہو گئی۔ ہر کوئی اپنے بکرے کی تعریف و توصیف میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں تھا۔ ی کا بکرا سو کلو کا تھا ..... تو کسی کا بکرا بکرا نہیں چربی کا پہاڑ تھا۔ طاقت میں کوئی گینڈے کے برابر تھا اور کوئی ستی و پھرتی میں چیتے سے دو ہاتھ آگے تھا۔

عصر کے بعد بچے بکرے کو گھماتے پھراتے ہوئے ندی پر نہلانے لے گئے۔ بچوں نے ندی پر بکرے کو بتکلف نہلایا اور پھر دوبارہ شہر کا گشت کراتے مغرب کے بعد لوٹے۔ الغرض چار دنوں تک ہمارے بچوں اور بکرے کا یہی معمول تھا۔ چار دنوں کے متواتر شہری گشت کی وجہ سے ہانپنے لگا تھا۔ کھانا پینا بھی برائے نام رہ گیا تھا۔ ہم نے ویٹرنری ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ انھوں نے اچھی طرح چیک اپ کے بعد بتایا کہ بکرا تشویش ناک حالت کو پہنچ چکا ہے۔ انھوں نے بکرے و دوا وغیرہ پلائی۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد خود ہم نے بکرے کی نزاعی کیفیت پر غور کیا تب یہ بات ہماری سمجھ میں آئی ڈاکٹر جھوٹا ہے اس کی تشخیص بکواس ہے ..... ہمارے بکرے کو نہ تھکاوٹ ہے نہ نقاہت اور نہ کوئی مرض ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ جانور ذی فہم زیادہ اور چالاک بہت ہے۔ کل اسے داعی اجل کو لبیک کہنا ہے اس لیے اس چھٹی حس نے اسے اس کا حشر بتا دیا ہے ...... اپنے موت کے خطرے کو بھانپ کر اپنا حوصلہ کھو چکا ہے۔ خیر حب جیسے جیسے رات گزرتی رہی اس کی حالت بگڑتی رہی بالآخر فجر کی اذان کے ساتھ ہی اس دنیا سے اپنا منہ موڑ لیا۔

محلے میں بکرے کے جاں بحق ہونے کا چرچا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ہم نے معصوم بکرے کو قربانی کا اشتہار بنا کر لسل چار دن تک شہر کا گشت کروایا۔ اسے ایک پل چین سے رہنے نہیں دیا۔ جس کی وجہ سے اس نے اپنی جان جان ریں کے سپرد کر دی تو صاحب دنیا آخر دنیا ہے جو جی میں آیا کہتی ہے کہنے دیجیے ..... خدا نے اپنے بندوں کے دلوں اور ان کی نیتوں کو دیکھتا ہے۔ ہم تو خوش ہیں کہ ہماری نیت تو قربانی کی تھی۔

رؤف رحیم (حیدرآباد)

غزل

[illegible] وحشت کا ملال ہے
مجبوری میں حرام سنا ہے حلال ہے

جب سے ہیں شیخ ساتھ حسینوں کا کال ہے
قسمت میں اپنی باسی کڑھی ابلی دال ہے

چہرے پہ مردنی ہے طبیعت نڈھال ہے
نزدیک اب شباب کا شاید زوال ہے

دشنام ہر طرف سے ہیں فرمائشوں کے ساتھ
دو بیویوں کے بیچ میں جینا وبال ہے

استاد نے پڑھی ہے جو شاگرد کی غزل
اُن کا یہ کارنامہ فقید المثال ہے

یارب تو مجھ کو گنجا بنا دے تو ٹھیک ہے
قرضوں میں آج ڈوبا ہوا بال بال ہے

کھاتے ہیں ہم کسی کا تو گاتے کسی کی ہیں
دادا کے نام فاتحہ نانا کا مال ہے

استاد کا کلام ہے اپنے کلام میں
ہم سے مقابلہ کرے کس کی مجال ہے

مجھ میں اور اس میں فرق بس اتنا ہے اے رحیم
چھپا رسال میں ہوں وہ پیدا رسال ہے

صاف صاف — منہ پھٹ ناگپوری

مغلوکیت کا آنکھ میں منظر اتر گیا
جب اپنے گھر میں سالوں کا لشکر اتر گیا

منگل کو اس کا فون ملا آ زمین پر
میں بدھ کو آسمان سے زمیں پر اتر گیا

پورس کے ہاتھیوں کی بلندی کو دیکھ کر
گھوڑے سے ہڑبڑا کے سکندر اتر گیا

اے دوست کب سے بارِ گراں تھا یہ دوش پر
اچھا یہی ہوا کہ مرا سر اتر گیا

فضلِ خدا سے بیوی جسے چاند سی ملی
سمجھو کہ اندھے غار میں شوہر اتر گیا

ناٹک رچا تھا اس نے ڈرانے کے واسطے
سینے میں اتفاق سے خنجر اتر گیا

دہلی میں کانگریس کے جب بلوے ہو گئے
تو لیڈروں کے جسم سے کھدر اتر گیا

منہ پھٹ بڑی عجیب بلا ہے یہ مفلسی
میں دوستوں کے ذہن سے اکثر اتر گیا

تین شعر — منجل حیدرآبادی

اس گرانی میں تو یارو ہر کوئی مجبور ہے
جس جگہ جاؤ فقط اک چائے کا دستور ہے

ہے [illegible] سے جو چھیڑی میں نے ترکِ چائے کی بات
ہنس کے یاروں نے کہا حضرت قیامت دور ہے

جلتے جاتے کر گئی [illegible] کی یہ بات
آپ تو منجل سمجھتے تھے بڑھاپا دور ہے

وجاہت علی سندیلوی

مسکراہٹوں کے دیئے جلانے والا
ـــــــــ ماچس لکھنوی

ادب اور تہذیب کے گہوارے ہمارے مردم خیز شہر لکھنؤ میں بہت سے ایسے شاعر گزرے ہیں اور اب بھی موجود ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو تمام تر طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے لیے وقف کر رکھا تھا یا ہے۔ اس رنگا رنگ شہر میں ایسے شعرا بھی گزرے ہیں جنھوں نے زیادہ تر مزاحیہ شاعری کی ہے اور اس سلسلے میں سب سے پہلا نام جان صاحب کا زبان پر آتا ہے۔ معیاری طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے سلسلے میں ظریف لکھنوی کا نام گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اور وہ اپنے دور میں ہمیشہ سرفہرست رہے۔ بیسویں صدی کے پہلے نصف حصے میں اکبر الہ آبادی کے بعد انہیں کا نام لیا جاتا ہے اور آج بھی اردو کی فکاہیہ شاعری میں ان کا مقام بہت بلند ہے غالباً ۱۹۳۶ء میں منعقد ہونے والے اس مشاعرے میں جس میں ظریف لکھنوی نے اپنی وہ مشہور غزل پڑھی تھی جس کا ایک شعر یہ بھی تھا ـــــ

وحشت میں ہر اک نقشہ الٹا نظر آتا ہے — مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے

میں بھی موجود تھا۔ قیصر باغ، بارہ دری کے اس مشاعرے میں جس میں اُس وقت کے سب ہی بڑے شعرا موجود تھے۔ بیان نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے ایک ایک شعر پر ظریف لکھنوی کو کس انداز سے داد تحسین ملی تھی گمان گزرتا کہ واہ واہ، سبحان اللہ، مکرر ارشاد وغیرہ کے نعروں سے بارہ دری کی چھت اُڑ جائے گی۔ ایک ایک شعر پانچ پانچ چھ چھ مرتبہ پڑھوایا گیا تھا۔

ظریف لکھنوی کا آخری دور ماچس لکھنوی کی ظریفانہ شاعری کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا۔ ان دونوں شعرا کے درمیان خانگی تعلقات اور روابط کا تو مجھے علم نہیں البتہ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ ماچس لکھنوی، ظریف لکھنوی کی ان روایات اور اُس ادب کے پروردہ اور تربیت یافتہ تھے جس میں بیان کی صفائی، زبان کی صحت، عروض کی پابندی اور مزاح کی شائستگی کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔

ماچس لکھنوی ایک بہت شائستہ با اخلاق، دوست نواز اور منکسر المزاج انسان تھے۔ یوں وہ زیادہ تر خاموش رہتے لیکن بے تکلف دوستوں کی محفل میں پہونچ جاتے تو اُن کی گل افشانی گفتار کے جوہر کھلتے۔ وہ بڑا دردمند دل رکھتے تھے۔ غم اپنا ہو یا پرایا وہ اُسے غیر معمولی شدت سے محسوس کرتے۔ دنیا انھیں ایک چہکنے ہنسانے والا مزاحیہ شاعر سمجھتی ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ انھوں نے اپنی ابتدائی زندگی میں بہت سی چوٹیں کھائی تھیں اور کئی محرومیوں کا شکار رہے تھے۔ صحیح کہا گیا ہے کہ عموماً وہی لوگ ہنستے ہیں جن کا دل اندر سے روتا ہے۔ ادب جہاں انکشاف

ذات ہے، وہیں اپنی ذات سے فرار کا ایک وسیلہ بھی بنا ہے۔ ماچس صاحب سیلز ٹیکس کے دفتر میں ایک کلرک تھے۔ مزاحیہ شاعری میں انھیں جو مقام اور شہرت حاصل تھی اُس کو دیکھتے ہوئے ان کا یہ معمولی عہدہ بہت فروتر تھا لیکن انھوں نے خود اس کو کبھی اپنی کسرِ شان نہیں سمجھا اور اسی کو ذریعہ معاش بنا کر قناعت اور خوش دلی سے اپنی زندگی گزار دی۔ اُن کی شاعری ہی اُن کا اوڑھنا بچھونا اور سرمایہ حیات تھی۔ وہ مشاعروں کے شاعر تھے اور مشاعروں ہی سے انھوں نے ایسا نام کمایا تھا کہ وہ قریب اور دور کے شہروں اور قصبوں میں اکثر بلائے جاتے اور بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنے جاتے۔ اپنے شعروں پر جی بھر کر داد و تحسین وصول کرنا گویا مشاعرہ لوٹ لینا ان کی زندگی کا سب سے اہم نصب العین تھا۔ ماچس صاحب نہ صرف اپنی کہنہ مشقی کی وجہ سے زود گو تھے بلکہ اکثر برجستہ اور فی البدیہہ اشعار بھی کہہ لیتے۔ ان کو اپنا بیشتر کلام زبانی یاد تھا اور احباب کی فرمائش پر بیاض کی مدد کے بغیر گھنٹوں اپنا اور اکثر دوسرے شعرا کا کلام سنایا کرتے۔

کہا جاتا ہے کہ ماچس لکھنوی نے اپنی شاعری کا آغاز سنجیدہ غزل سے کیا تھا اور اُسی میں اکثر طنزیہ اور مزاحیہ اشعار بھی کہہ دیا کرتے لیکن جب ایسے اشعار مقبول عام ہونے لگے تو انھوں نے ماچس تخلص اختیار کیا اور صرف انھیں کے ہو رہے۔ ان کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری بڑی طرحدار اور جاندار تھی۔ اپنے وقت میں اُسے بڑی قبولیت اور شہرت عام حاصل تھی۔ لکھنؤ اور کانپور کے بڑے بڑے مشاعروں میں وہ اپنے ہم عصر سنجیدہ شاعری کے اساتذہ کے ساتھ شرکت کرتے اور اپنے کلام سے محفل کو زعفران زار بنا کر داد و تحسین سے جھولیاں بھر لیتے۔

ماچس لکھنوی اچھے خاصے پڑھے لکھے انسان تھے اور انھیں علم و ادب سے ایک فطری لگاؤ تھا لیکن اُن کا مطالعہ زیادہ وسیع نہیں تھا۔ انھیں خود بھی اس کا احساس تھا اور وہ ندانند و بداند کہ بداند کے مرض کا شکار بھی نہیں تھے لہٰذا انھوں نے کبھی معلم، ناصح یا فلسفی بننے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے زندگی کے دقیق یا پیچیدہ مسائل کو اپنی ظریفانہ شاعری کی حدود سے ہمیشہ باہر سمجھا اور صحیح سمجھا۔ انھوں نے زندگی کو ایک عام انسان کی نظر سے دیکھا اور اُس کے خوشی اور غم میں شریک رہے۔ کہا گیا ہے کہ ایک بڑے آدمی بننے سے کہیں زیادہ مشکل کام ایک عام آدمی ہونا ہے۔ بڑا آدمی تماشا اور عام آدمی تماشائی ہوتا ہے۔ زندگی کے اسٹیج پر بیشتر تماشا کرنے والے سے کہیں زیادہ صبر آزما رول تماشائی کا ہوتا ہے یعنی وہ ہر قسم کی بوالعجبیاں دیکھے۔ انھیں برداشت کرے اور خاموش رہے۔ غالب نے خوب کہا ہے ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ماچس لکھنوی کے کلام میں یقیناً عمومیت زیادہ ہے لیکن ہم کو اس کا صرف منفی نہیں بلکہ مثبت پہلو بھی دیکھنا چاہیے۔ اُس میں گہرائی کم تو گیرائی زیادہ ہے اُس میں آفاقیت نہیں ہے لیکن اُس میں عصری حسیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور وہ ایک طرح سے اپنے دور کے سماجی شعور کی تاریخ ہے۔ بھلے ہی اس کا بیشتر حصہ نظر سے خوش گزرے قسم کی ہلکی پھلکی شاعری کی تعریف میں آتا ہو اور اس میں پائیداری کے عناصر زیادہ نہ ہوں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ اپنے زمانے کے حالات پر عوامی اور عمومی ردعمل کا ... ان ہے اور وہ زبان حال سے کہہ رہی ہے ع۔ افلاک کے جور سے نہ ہارا انسان۔ یعنی انسان اپنے مصائب پر بھی ہنس سکتا ہے۔ اس ناآسودہ، مضطرب، دشواریوں سے بھرپور، کرب زدہ زندگی میں زندہ دلی

اور ہنسنے ہنسانے کی کسی بھی کوشش کو خصوصاً جب کہ اُس میں خونِ جگر بھی صرف ہوا ہو اور خلوصِ نیت بھی شامل ہو ایک سعیِ نامشکور ہرگز نہیں قرار دیا جاسکتا۔

جہاں ظلمت مقدر ہو گئی ہو　　وہاں رقصِ شرر بھی کم نہیں ہے

ماچس لکھنوی نے غزل کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن مثلاً نظم، قطعہ، رباعی، ترجیع بند، پیروڈی وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی ایک نظم ایجیٹیشن بہت مشہور ہے۔ حکومت نے ایک گلی میں پیشاب کرنے کی ممانعت کے سلسلے میں ایک بورڈ لگوا دیا تھا۔ اس پر وہاں کے اہلِ سیاست نے عوام کو ورغلا کر ایک انوکھے انداز سے ایجی ٹیشن کروایا تھا جس کی تفصیلات بہت مضحک اور دلچسپ انداز سے بیان کی گئی ہیں اور بالآخر انھیں کامیابی ہوئی تھی اور حکومت نے اپنا حکمِ امتناعی واپس لے لیا تھا۔ یہ نظم ایک طنز ہے اس بات پر کہ سیاسی شاطر کے جذبات کو کیسی کیسی فروعی اور جہالت کی باتوں پر بھڑکا کر اپنا الّو سیدھا کرتے ہیں۔ خود شاعر کہتا ہے ؎

فائدہ کیا ہے کوئی پوچھے ان اہلِ ہوش سے
ان فضول ایجی ٹیشن ان انوکھے جوش سے

ماچس لکھنوی کے مزاح میں جب طنز کی آمیزش ہو جاتی ہے تو وہ اور زیادہ پُرلطف اور تیکھا ہو جاتا ہے۔ ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

شیخ آئے جو محشر میں تو اعمال ندارد　　جس مال کے تاجر تھے وہی مال ندارد

یہ اپنی مقبولیت کے باعث شعری ضرب الامثال میں شامل ہو گیا ہے اور اکثر سنجیدہ تحریروں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے میں طولِ کلام سے بچنے کے لیے ماچس لکھنوی کے اپنے پسندیدہ اشعار کو پیش نہیں کرنا چاہتا لیکن اس غزل کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں جو جدت اور ندرت کا نمونہ ہیں ؎

تحقیق کیا اُن کا جو شجرہ تو یہ پایا　　کچھ یوں ہی سی ننہیال ہے ددھیال ندارد
ماں باپ بہن بھائی سب اُن کے ہیں مگر ساتھ　　اب گھر میرا سسرال ہے سسرال ندارد
مستقبلِ رنگیں کے لیے اہلِ وطن کا　　جو حال ضروری تھا وہی حال ندارد
محشر میں گھس آیا ہے گرہ کٹ کوئی شاید　　یارب ہے مرا نامۂ اعمال ندارد

مزاح کا ایک بہت معیاری انداز یہ بھی ہے کہ کوئی غیر متوقع بات کہی جائے یا ماچس لکھنوی کے یہاں اکثر یہ انداز ملتا ہے سامع ان کے بعض اشعار کے پہلے مصرعوں کو سن کر قاری اس تجسس میں پڑ جاتا ہے کہ وہ اب کیا کہیں گے اور وہ دوسرے مصرعے میں کوئی غیر متوقع مذاق کی بات کہہ جاتے ہیں۔ اس ضمن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خوشی یہ مجھ کو نہیں ہے کہ مر گئے واعظ　　خوشی یہ ہے کہ مرے فاتحہ کا کھا نہ سکے
منھ اُدھر اُس نے بسورا ادھر آنسو ٹپکے　　کہاں لہرائی گھٹا اور کہاں برسا پانی
ہنس کے نوکر سے مری عرضِ تمنا یہ کہا　　لا کے پلوا دو ذرا آپ کو ٹھنڈا پانی

پھر ڈاکٹر حکیم کریں ان کا کیا علاج   آنکھیں ہیں جن کی ٹھیک مگر سوجھتا نہیں
کیا پوچھتے ہو شعروں میں سرے کوئی نہیں بات   یہ بات ہے، کیا کم کہ کوئی بات نہیں ہے
اس امید پہ پھاڑا تھا گریباں لیکن   سوئی تاگا بھی نہ دو گے مجھے معلوم نہ تھا

اکثر ماچس لکھنوی نے ایسے قاعدوں یا ایسی باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس طرزِ معاشرت اور پس منظر کی جھلک دکھلاتے ہیں جس کے کہ وہ پروردہ تھے ـــ

میں ہی کہ اب خنجر ڈوبتا ہوں خون کے دریا میں   وہ ہنس کر پوچھتے ہیں مچھلی مچھلی کتنا پانی ہے

زمانے میں چھوٹے لڑکوں میں ایک کھیل رائج تھا جس میں ایک لڑکے کو بیچ میں کھڑا کر کے باقی لڑکے اس کے گرد گھومتے اور پوچھتے مچھلی مچھلی کتنا پانی؟

ہو کے شاعر، شعرا پر نہ کرو تنقیدیں   بند ہو جائے نہ بیٹا کہیں حقہ پانی!

میرے خیال میں مزاح کا نقطۂ عروج وہ ہے جب وہ کرب کی حدود کو چھو لے۔ ماچس لکھنوی کے بعض اشعار اسی نوعیت کے ہیں۔

آدابِ بزمِ دوست مرے ہم نشیں نہ پوچھ   سب قاعدے ہیں اور کوئی قاعدہ نہیں

قاعدے عوام پہ نافذ کیے جاتے ہیں صاحبِ اقتدار حضرات اپنے آپ کو کسی قاعدے کا پابند نہیں سمجھتے۔ ایک عام آدمی ان باتوں کو بڑی حسرت سے دیکھتا ہے۔

شکر کی کیا بات کیا پانی پہ فقرے ملتے ہیں ـــ
ہم سے بیچاروں کو دیدار ترا ہے نایاب   اور گوداموں میں کوئی حد ہے ترا بے حساب
گھر میں جو مہمان آتے ہیں تو آتا ہے حجاب   چائے بھی ان کو پلا سکتے نہیں خانہ خراب
ہائے اب کس سے کہیں پیش جو دشواری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

بیچارے چھوٹے آدمیوں کے لیے چھوٹی ہی باتیں بڑی ہوتی ہیں اور وہ انھیں کو پانے کے لیے کیسی گڑگڑاہٹ اور لجاجت سے دعا مانگتا ہے:

میں بن سکا جو نہ لیڈر تو خیر جانے دے   یہی مراد مری خالقِ انام آئے
وہ اب سبیل نکال اے مسبب الاسباب   مشاعروں کی صدارت میں مرا نام آئے

ماچس لکھنوی مشاعروں اور محفلوں کے شاعر تھے۔ ان کا کلام پڑھنے سے زیادہ سننے میں لطف آتا ہے۔ مشاعرہ زدگی کے باعث ان کے کلام میں ایسے اشعار بھی کم نہیں ہیں جو مشاعرے کے مجمع، طبقے سے داد تو حاصل کر سکتے لیکن شائستگی کے معیار پہ پورے نہ اترتے یا جن میں ذہانت اور برجستگی کے بجائے محض عامیانہ مذاق پایا جاتا ہے۔

عشق ناصح کو بھی ہو جائے تو پھر پوچھوں گا   چاہ ہی روز میں مانگیں جو نہ بیٹا پانی

جا پڑی بنت عنب پر جو نظر واعظ کی　　رال داڑھی پہ گری منہ میں بھر آیا پانی
یوں جبیں گھستے ہیں شیخ و برہمن بعد نماز　　جیسے کوّے چونچ رگڑیں گندگی کھانے کے بعد

مزاحیہ شاعری کے سلسلے میں بے تکلف بزمی محفلوں یا محدود نشستوں میں بیشتر زیادہ گڑ والے گلگلے جیسے (ایک قسم کی پھکڑ بازی کہہ لیجئے) پسند کیے جاتے اور انھیں پر زیادہ واہ واہ ہوتی اور واہ کے ڈونگرے برستے۔ کسی بھی شاعر اور خصوصاً کسی ظریف شاعر کا اس تعریف و تحسین کی ترغیب سے نکلنا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے۔ ناچیس لکھنوی بھی اس اسی کی زد میں آئے ہیں۔ لیکن زیادہ نہیں۔ ان کے یہاں بھی عامیانہ اور سطحی دل لگی کی شاعری کافی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کے کلام میں مذاق سلیم، خیال کی ندرت اور اظہار کی جدت کے عناصر کی کمی نہیں ہے۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہے کہ کچھ ارباب ذوق ناچیس لکھنوی کا کلام جمع کر کے اسے شائع کرانا چاہتے ہیں۔ اپنے سے پہلے اٹھ جانے والوں کا احترام کرنا، ان کی روایات اور نگارشات کو محفوظ کرنا ایک لازمی اور بڑی ادبی خدمت ہے ڈاکٹر افضال احمد سلمہ نے اس سلسلے میں بڑے بیش قیمت نمایاں سر کئے ہیں۔ آرزو [illegible] اور دیگر اکابرین ادب کی بکھری یادوں کو جمع کر کے انھوں نے پیچھے آنے والوں کو راستہ دکھانے کے لیے بہت سے چراغ روشن کر دیئے ہیں۔ ناچیس صاحب کے کلام کی اشاعت میں صرف اُن کی شمولیت ہی اس بات کی ضامن ہے کہ یہ کام ضرور حسن و خوبی تکمیل کو پہونچے گا۔

نقش ہائے رفتگاں ہیں راہ میں جلتے چراغ
دور تک کی منزلوں کا اِن سے ملتا ہے سراغ

●●

غزل ——— عبدالحفیظ لقب عمران (امراوتی)

آتی ہے اچھے موڈ میں قسمت کبھی کبھی
تسکین کی نکلتی ہے صورت کبھی کبھی

احباب سارے بنتے ہیں اولاد نائی کی
ہو جاتی ہے ہماری حجامت کبھی کبھی

اک دایہ نے بتائی مجھے کل عجیب بات
ہنستا ہے بچہ وقتِ ولادت کبھی کبھی

جمہوریت کے صدقے الکشن کے دور میں
کھل جاتی ہے غریبوں کی قسمت کبھی کبھی

مونچھیں پکڑ کے کھینچ رہا ہے عدو مجھے
مشکل میں ڈال دیتی ہے طاقت کبھی کبھی

سینے پہ بیٹھ جاتا ہے چڑھ کر وہ فیل تن
نازک ہماری ہوتی ہے حالت کبھی کبھی

امید ہم نے ان سے کرم کی رکھی لقب
سرزد ہوئی ہے یہ بھی حماقت کبھی کبھی

غزل ——— مجیب الرحمٰن بزمی

بدن کا لوچ، نگاہوں کی آب دیکھیں گے
کہاں ہے اس میں محبت کا باب دیکھیں گے

تنورِ عشق کا پہلے جلائیں گے دل میں
پھر اس کے بعد ترا پیچ و تاب دیکھیں گے

کچھ اور بڑھ کے حدِ احتیاط سے آگے
نگاہِ ناز کا ہم بھی عتاب دیکھیں گے

فقیر بن کے صدا دیں گے ہم ترے در پر
اسی بہانے تجھے بے نقاب دیکھیں گے

تمام عمر انھیں جھونپڑوں میں جب گزری
تو کیا امید کہ محلوں کا خواب دیکھیں گے

گرہ میں باندھ لے اک دن ضعیفی آئے گی
رہی حیات تو تیرا شباب دیکھیں گے

انسان گھٹ کے نقطۂ پرکار بن گیا

شہزاد معصومی

بازارِ زیست حرص کا بازار بن گیا
ہر رنگ دار شہر کا سردار بن گیا

بڑھتا گیا ضمیر فروشی کا دائرہ
انسان گھٹ کے نقطۂ پرکار بن گیا

بویا گیا نفاق کا جو بیج کھیت میں
پھولا پھلا تو لاشوں کا انبار بن گیا

یہ ہے سماج واد تو اللہ کی [illegible]
سمجھا تھا ہم [illegible]

محمد اظہر حیات (ناگپور)

بس کچھ نہ پوچھیے ۔ مہینے کے آخری دن

خدا رکھے ہمارے ایک بزرگ ہیں وضع دار ... روایت کے پاسدار اور تنخواہ دار کہ ایک لگی بندھی تنخواہ پر سر کاٹ دی۔ نوکری کی، بڑی شان سے کی۔ پابندی سے قرض لیتے تھے اور پابندی سے چکاتے تھے اللہ کے فضل سے ابھی موصوف بقیدِ حیات ہیں اور انھیں کا ایک قول دہرانے کی سعادت ہم حاصل کر رہے ہیں۔ کہا کرتے ہیں کہ میاں مہینے کے تین عشرے ہیں۔ .... دس دس کے۔ پہلے دس دن یعنی پہلا عشرہ تر بتر دوسرا عشرہ کاٹ کسرا اور تیسرا عشرہ دیدنی —— ان کی اس تقسیم زبانی کو ہم اس وقت سمجھے جب کہ خود نوکر ہوئے اور تینوں عشروں سے بہ نفسِ نفیس گزرنے کا اتفاق ہوا۔ رمضان کی تقسیم اکثر مولوی صاحبان سے سنی تھی کہ اول عشرہ رحمت دوسرا عشرہ مغفرت اور تیسرا آگ سے نجات ہے مگر تنخواہ دار کے لیے ہر مہینہ چاہے وہ رمضان ہی کیوں نہ ہو زحمت ہی زحمت ہے۔ گویا پہلا عشرہ رحمت کی بجائے زحمت! اور دوسرا عشرہ مغفرت تو کجا ول نہیں ہوتی اور تیسرا عشرہ آگ سے نجات کی بجائے تنخواہ دار کے تن بدن میں! دل و دماغ میں آگ ہی آگ لگی ہوتی ہے۔ تنخواہ درحقیقت 'تن کھا' ہوتی ہے جو تن کھاتی ہے من کھاتی ہے اور صبح و شام کا چین کھاتی ہے۔

آخری عشرہ شروع ہوتے ہی ہماری جیب اور بیوی کا بٹوا اس طرح خالی ہو جاتا ہے جیسے عاشقِ نامراد کی آنکھوں سے آنسو غائب ہو جاتے ہیں گھر میں رکھے اناج کے خالی ڈبے تو ہاتھ لگاتے چڑچڑا اٹھتے ہیں تو بس بیتے ہوئے اچھے دنوں کی یاد رہ جاتی ہیں۔ باقی ہر چیز دھواں دھواں، خواب خواب معلوم ہوتی ہے۔ ہاں یاد زیادہ رہتا ہے تو دال آٹے کا بھاؤ۔ صبر و شکر کی کیفیات کا غلبہ ہوتا ہے۔ ضبط و تحمل، انکساری و عاجزی والی صفاتِ حسنہ خود بہ خود ان دنوں میں عود کر آجاتی ہیں۔

مہینے کے آخری دن کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں کہ خدا یاد آجاتا ہے۔ بس کچھ نہ پوچھیے عجیب بے خودی کا عالم طاری رہتا ہے ان دنوں۔ ہر دم کسی نہ کسی سوچ میں غرق رہتے ہیں مگر دیکھنے والے سمجھتے ہیں کہ ہم یادِ الٰہی میں غرق ہیں۔ اس طرح لوگ ہمیں خدا ترس، خداشناس و خدا رسیدہ سمجھتے ہیں۔

لیکن کچھ لوگوں کے لیے —— بلکہ اکثریت کے لیے پہلی تاریخ کے بعد سے ہی مہینے کے آخری دن شروع ہو جاتے ہیں۔ تنخواہ ملی ساہوکار، بنیا، بزاز، دودھ والا، اخبار والا، مالک مکان سب کا بقایا ادا کیا اور خود باقی بچے۔

برخداوندی بجالائے۔

مہینے کے آخری دنوں کا اپنا ایک چارم اور دل کشی ہوتی ہے۔ دیکھیے نا اگر مہینے کے آخری دن نہ ہوں تو مہینے کے ابتدائی دنوں کی قدر کون کرے گا۔ اسی مہینے کے آخری دنوں .... کا مزہ ان لوگوں کے نصیب میں نہیں ہے جو بیویاں کی ہیں جنھیں دستِ غیب کی مدد حاصل ہے یا یوں کہیے کہ گنگا نہائے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگ بھلا کیا جانیں ایّامِ آخر کے مزے۔

یہاں تو مہینے کے آخری دنوں میں یہ حال ہوتا ہے کہ اخبار کی ردّی بھی محبوبۂ دل نواز کی طرح حسین لگتی ہے۔ یہ اس آڑے وقت میں کام آنے والی چیز کو کن ذہنیت نے اسے ردّی کہہ کر پکارا کہ یہ مونسِ جان تنخواہ دار، متوسط طبقے کی رفیقِ دیرینہ ہے۔ دراصل سرمایہ دار طبقے نے اس کی حیثیت کا مذاق اُڑایا ہے۔

مہینے کے آخری دنوں میں آپ اسکوٹر گھر میں رکھ کر صحت بنانے کے لیے پیدل چل سکتے ہیں اس طرح سے آپ گلی کوچوں کی راہ سے گھر بھی پہنچ سکتے ہیں جس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ دکان دار کی نظروں سے بچ جاتے ہیں۔

یہ سب کچھ اور بہت کچھ آپ کہہ سکتے ہیں لیکن مہمان سے بچنا ذرا مشکل ہی ہے مگر بڑے تجربہ کاروں نے اس کے بھی راستے نکال ہی لیے ہیں۔ ہاں ایسا کوئی شعر لکھ کر دروازے کی چوکھٹ پر لٹکایا جائے تو مہمان شرطیہ واپس جائے گا۔

خالی ہے جیب آخری ہفتہ ہے ان دنوں
مہمان آج گھر میں نہ آئے خدا کرے

اور بعض تجربہ کاروں نے اس سے آسان ترکیب بتائی ہے کہ آپ خود کسی کے گھر مہمان چلے جائیں اور گھر پر ذرا بڑا سا تالہ ڈال جائیں۔ لیکن اس بات کا خیال رہے کہ جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے۔ آپ نے دیر کی اور کوئی مہمان آپ کے گھر آدھمکا۔

مہینے کے آخری دنوں کا ذکر ہے کسی صاحب کا ایک کُتا گم ہوگیا انھوں نے ایک اخبار میں اشتہار دیا کہ کتے کو ڈھونڈ کر لانے والے کو ۵۰۰ روپے کا نقد انعام دیا جائے گا۔ اشتہار کی اشاعت کے بعد موصوف شام کو اخبار کے دفتر گئے تاکہ معلوم کریں کہ کتے کا پتہ چلا یا نہیں دفتر پہنچے تو دیکھا کہ دفتر میں سناٹا بول رہا ہے۔ ایک دم ہڑتال کا سا ماحول ہے اونگھتے چوکی دار سے دریافت کیا کہ ماجرا کیا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ آج جو کتے کے لیے اشتہار چھپا ہے اسی کتے کی تلاش میں سب کے سب نکل گئے ہیں۔

بہاء الدین ریاض (کٹک)

کرکٹ تیرا دوسرا نام

محبت کھیل ہے کرکٹ کا چاہے کوئی کچھ کہہ لے
محبت کرنے والے "اوپنر" میداں میں آتے ہیں
مقابل ٹیم کے غیض و غضب کے وار سہتے ہیں
پھر ان کے چہروں پہ اک مسکراہٹ پھیل جاتی ہے
مقابل ٹیم کے "بالر" ہنر اپنا دکھاتے ہیں
وہ ہر پل "سوئینگ" کی یا "یارکر" کی زد میں رہتے ہیں
پریشانی انھیں پہلے [illegible] ہوتی ہے
کبھی "کارڈنر" کے ہاتھوں سے "سلیپ" میں کیچ ہوتا ہے
مگر ڈر جاتے ہیں ماں باپ کی وہ "پیس بولنگ" سے
بھر وسہ خود پہ کر کے "جو کریز" کو چھوڑ دیتے ہیں
محبت کی یہ جوڑی توڑنے "بالر" گرجتے ہیں
وہ پریمی جوڑیوں ہی بے کار ہی کا رسک لیتے ہیں
کوئی "ہک" کرتا ہے بالر کو دینے اک سبق اچھا
مگر یہ کھیل کرکٹ کا نہ اس پر ختم ہوتا ہے
ذرا سا کشمکش و پیچ ہی کھیل کو اک موڑ دیتا ہے

محبت کرنے والے خوف کب کھاتے ہیں موسم سے
"انگ" بھر ساتھ رہنے کا ارادہ دل میں لاتے ہیں
ذرا پہلے پہل کچھ دیر تک نروس سے رہتے ہیں
نظر میداں کے ہر گوشے کا نقشہ کھینچ لاتی ہے
"کٹر" اور "گوگلی" سے خوب ان کو آزماتے ہیں
اور "ایل بی ڈبلیو" ہونے کا وہ صدمہ بھی سہتے ہیں
مگر کچھ ساتھ رہنے کی [illegible] دیتے ہیں
وہ گھبرا بھائی رشتے داروں کا پریشر ہوتا ہے
وہ "کلیر بولڈ" اکثر ہوتے ہیں گیندوں سے ڈر ڈر کے
پڑوسی چھپ کے پیچھے سے انھیں "اسٹمپ" کرتے ہیں
کبھی "باؤنسر" کبھی "بمپر" کبھی "سیمر" برستے ہیں
کھڑے اک پاس والے ہی کو اپنا کیچ دیتے ہیں
مگر وہ "لائین" ہی کے پاس کیچ ہوتا ہے بے چارہ
رنوں کے جوڑنے میں ہر کھلاڑی دو "سپرٹ" ہے
غلط اک فیصلہ ہی ان کی جوڑی توڑ دیتا ہے

وہ جوڑی مہرباں جس پہ کبھی تقدیر ہوتی ہے
"انگ" بھر ساتھ رہتے ہیں مسرت پاؤں دھوتی ہے

o

تبصرہ نگار: مضطر مجاز

بال کی کھال

(تبصرہ)

شعر و حکمت (دورِ دوم)

کتاب – ۲

مرتبین: مغنی تبسم اور شہریار   قیمت: ۱۰۰ روپے

ملنے کا پتہ ۲/۵۹–۳–۶ سائیان کیپاڈیہ لین حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۴

اردو زبان کے اس دورِ ابتلا و انحطاط میں شعر و حکمت جیسے جریدوں کا اجرا کسی معجزے سے کم نہیں (۸۶۸) صفحات پر محیط یہ وقیع انتخاب نظم، غزل، افسانہ، فکاہیہ، ترجمہ اور مصاحبہ تقریباً ہر صنفِ سخن کا احاطہ کرتا ہے۔ مشاعروں اور غزل گائیکی کے ہاتھوں شعر اب صرف سماعی تفریح کا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے۔ ان الم ناک حالات میں شعر کو تنہائی میں بیٹھ کر پڑھنے اور پڑھ کر ذہنی اور روحانی نشوونما کا اہتمام شاید اب دیوانوں ہی کا کام رہ گیا ہے اور ان دیوانوں کے سرخیل ہیں مغنی تبسم اور شہریار۔

حصّۂ نظم: یہ حصّہ (۹۹) نظموں اور (۹۰) غزلوں پر مشتمل ہے جو بڑا امتیازی ہے۔ ورنہ فی زمانہ اکثر رسالوں میں صرف غزلوں کی بھرمار ملتی ہے کہ اس کا فن بڑا سہل الحصول ہے اور "ہر بوالہوس نے یہ حسن پرستی شعار کر رکھی ہے"! اس حصّے کی اہم خصوصیت تین شاعروں کا ایک علٰحدہ گوشہ ہے۔ منیب الرحمٰن وحید اختر اور افتخار نسیم۔ منیب الرحمٰن کی نظموں میں نئی دنیا کا سرد اور برف پوش دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ نظمیں بظاہر بیانیہ اندازِ بیان لی ہوئی ہیں مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کی بات کہتی ہیں اور آہستہ آہستہ داخلی کیفیات سطح پر تیرنے لگتی ہیں۔ منیب الرحمٰن نے دور از کار علامتیں تراشنے کے بجائے استعارے سے زیادہ کام لیا ہے۔ ان کی ایک اور خصوصیت ان کا تمثیلی طرزِ اظہار ہے جس نے ان کی نظموں کو معانی کی کئی پرتوں عطا کی ہیں۔

—— ایلیٹ کی مشہورِ زمانہ تین آوازوں (ڈرامہ، خطابت اور خود کلامی) میں وحید اختر کے مزاج سے سب سے زیادہ ہم آہنگ خطابت ہے۔ وحید اختر کے اپنے ذاتی غم (ان کی اہلیہ کا ہوائی جہاز کے امریکن مزائل کے ہاتھوں تباہی میں انتقال) انعکاس ان نظموں میں ملتا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ وحید اختر نے یہ نظمیں فوری تاثر اور تحریک کے دباؤ میں لکھی ہیں جس کی وجہ سے وہ شدید تاثر انگیزی سے مملو ضرور ہیں لیکن اس سے ان میں ایک طرح کا کھرا پن پیدا ہو گیا ہے اگر وہ تھوڑا سا وقت دے کر ان فن پاروں کو وجود بخشتے تو ممکن ہے کہ ان میں معانی کی اور بھی کئی جہتیں نمودار ہوتیں اور ان کا کرب اور جذبہ استعارے کا روپ دھارتا۔ غمِ فراق کو غمِ آفاق اور غمِ ذات کو غمِ کائنات بننے کے لیے غالباً حلقۂ صد کامِ نہنگ سے ہو کر گزرنا ضروری ہے!

—— افتخار نسیم کی نظموں کی پُراسراریت اور اس کا موضوع

دونوں چونکا دینے والے ہیں اور شاید دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بھی۔ ہم جنسی یا امرد پرستی اردو اور فارسی شاعری کے لیے کبھی شجرِ ممنوعہ نہیں رہی بلکہ کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ تصوف کی طرح امرد پرستی بھی برائے شعر گفتن خوب بود! رعایتِ لفظی اور ضلع جگت کے سہارے عطار کے لونڈے سے دوا لینا یا معمار کے لونڈے کی خاطر کا پتھر ہونا یا سبزۂ خط کا زمرد ہونا اور کاکلِ سرکش کا افعی ہونا جیسے بہت سے دلچسپ اظہار ہمیں مل جائیں گے لیکن ان میں تجربے اور کرب کی وہ تپک نہیں جو کسی بھی شاعری کا خونِ حیات ہے۔ اسی کرب ناکی سے گزرتے ہوئے افتخار نسیم نے عورتوں کے خیر خواہوں (Feminists) سے یہ سوال کر کے مبہوت بھی کر دیا ہے کہ وہ عورت کے استحصال پر تو چیخنے چلاتے ہیں لیکن ایک "گے" (GAY) کو سمجھنے والا کوئی نہیں۔ شاید اردو میں اس نوع کی شاعری پہلی مرتبہ سامنے آئی ہے۔

دیگر شعرا: اس خصوصی گوشے کے علاوہ حصۂ نظم میں تیس شعرا کی (۵۶) تخلیقات شامل ہیں جن میں کشور ناہید کی نظمیں حسبِ معمول ڈھلتی عمر کی زرد عورت کی غم انگیز روداد سناتی ہیں تو شہریار کی نظمیں تحت شعور کی خواب ناک فضاؤں کی سیر کراتی ہیں اور شفیق فاطمہ شعریٰ اور آگے بڑھ کر شاید لاشعور کے سراب آسا جلوے دکھلاتی ہیں۔ دیگر نمایاں شعرا میں حمید الماس نے علامتوں سے زیادہ کام لیا ہے۔ علی ظہیر ایک مخصوص پُراسراریت سے، رؤف خیر اور حسن فرخ بین الاقوامی اور قومی سیاسی مسائل کے علامتی اظہار سے اور غضنفر... اپنی سماجی یاس انگیزی سے ہمیں چونکاتے ہیں۔ یاس اور انگیزی جو ہماری نسل کا مقدر بن چکی ہے۔ تقریباً تمام نظموں کے نمایاں عناصر میں ہے۔

——— حصۂ غزل میں (۵۰) شعرا کی (۹۰) غزلیں شامل غزل بڑی حد تک رعایتِ لفظی کا کھیل ہے۔ تھوڑی سی مشق و مزاولت اور قادر الکلامی شاعروں میں دادسے ڈونگرے پٹہ کے لیے کافی ہے لیکن زیرِ نظر انتخاب میں ایسی غزلیں زیادہ ہیں جن میں رعایتِ لفظی اور قادر الکلامی سے کم کام لیا گیا۔ اسی کے ساتھ جہاں جہاں جذبے کی تپک اور دل کی گداز رعایتِ لفظی سے منتج ہوئی ہے رنگ اور چوکھا آگیا ہے۔

○

یہ میرے عہد کی مخلوق جی رہی ہے مگر
نفس کی آمد و شد پر مدار ہے اس کا
(محمود ایاز)

○

پانو کے نیچے کوئی شے ہے زمیں کی صورت
چند دن اور اسی وہم کی تشہیر کریں
(شہریار)

○

ہم نے خود اپنی رات کو اتنا طویل کر لیا
ورنہ ہمارے دور میں جینے کا ڈھب کچھ اور ہے
(شہریار)

○

لے ڈوبتے بچوں کو شکر بادہ فروشاں
ہم لوگ اگر کڑوی کہانی نہیں لکھتے
(رضا صفی)

○

گراں تا گراں آسمانوں میں رکھ
مجھے زندگی بھر اڑانوں میں رکھ
(ذکی بلگرامی)

آندھیوں نے بہت زور لگایا لیکن
خشک پتوں کے سوا گھر سے مرے کیا نکلا

(علی الدین نوید)

o

سر راہ سراغ دکھا دے مجھے
میرے سامنے سے ہٹا دے مجھے

(غیاث متین)

o

جس روپ میں بھی چاہو تماشا گر رہو
اتنا ہو اپنے ہونے کی پہچان تو رہو

(رؤف خیر)

چلچلاتی دھوپ سی تقریر کا دینے جواب
ہم سہانی شام کا لہجہ اٹھا کر لے گئے

(ستار صدیقی)

o

سرشار زندگی کے نئے ذائقوں [illegible]
غم ہے وہ ذائقہ جو مزہ دے گیا مجھے

(قطب سرشار)

مندرجہ بالا دس اشعار علی الحسابی طور پر منتخب کیے گئے ہیں جو شہریار کے علاوہ سب حیدرآبادی شعراء کے ہیں ... ان میں صرف (۱) شعر ایسے ہیں جن میں کسی قدر رعایت لفظی سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن اس رعایت لفظی نے ان اشعار کو پست نہیں بلکہ بلند ہی کیا ہے کیوں کہ ان میں رعایت لفظی مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک زیریں رو کے طور پر آ گئی ہے جس میں شاعر کی شعوری کوشش کو دخل نہیں۔ اس کے برخلاف مابقی چھ اشعار میں کسی قسم کی بھی رعایت لفظی نہیں پائی جاتی۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب شاعر کے یہاں کہنے کے لیے کوئی بات ہو۔ یہ وہ غزلیں ہیں جن کا مشاعروں والی شاعری سے کوئی تعلق نہیں، صرف تنہائی میں پڑھنے اور حظ اٹھانے کے لیے ہیں۔

فکاہیے: یوسف ناظم، نریندر لوتھر اور دلیپ سنگھ کے فکاہیے بھی بڑی خاصے کی چیزیں ہیں۔ یوسف ناظم نے اداریہ نگاری کا مذاق اڑایا ہے۔ ناظم صاحب نے اس مضمون میں خلاف معمول بریکٹوں سے کام نہیں لیا۔ اخباری اداریوں اور ادبی اداریوں دونوں کی خوب خوب خبر لی ہے۔ نریندر لوتھر پر انگریزی مزاح کی چھاپ ہے۔ غالباً پطرس کے بعد وہ پہلے مزاح نگار ہیں جنھوں نے اردو کو برٹش لطیف مزاح سے روشناس کرایا ہے۔ لوتھر صاحب کا تعلق اگرچہ پنجاب سے ہے مگر ان کے مزاح میں پنجابی پھکڑپن نہیں۔ ماڈرن طرز رہائش کی بے ڈھنگیوں پر ان کا مضمون "میرا کمرہ" بڑا خوبصورت طنز ہے۔ دلیپ سنگھ ایک ابھرتے ہوئے مزاح نگار ہیں اور مزاح کا ایک آف بیٹ کیریکٹر مرزا کا انھوں نے انتخاب کیا ہے جس سے لوگ اب ادب چکے ہیں۔

افسانے: افسانوں میں اقبال متین اور ساگر سرحدی کے دو طویل مختصر افسانے شامل ہیں۔ اقبال متین کا افسانہ کہیں کہیں لائٹ بلیو کوک شاستر ہو گیا ہے اور کہیں کہیں مذہبی حیثیت اور شعائر مذہبی (حدیث شریف) کا مذاق اڑانے کی کوشش کی گئی ہے --- ساگر سرحدی نے فلمی دنیا کی زندگی اور اس کے کرداروں کی پیچیدگیوں کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے جہاں شراب اور عورت بطور ایک شے (کموڈیٹی) استعمال ہوتے ہیں --- مختصر افسانوں میں جیلانی بانو، درعوض سعید سے لے کر بیگ احساس اور مظہر الزماں خاں جیسے جانے پہچانے نام ملتے ہیں۔

تراجم: ترجمہ شاید تخلیق سے زیادہ مشکل کام ہے کہ اس

.. کلام میں 'حفا' کا لحاظ کریں تو خوب صورتی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اس حصے میں بھی مشرقی اور مغربی ادب کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اقبال کے علاوہ نہ صرف وولے شوئنکا، میلان کندیرا اور دستوئفسکی کی نمائندہ تخلیقات کو اردو کا جامہ پہنایا گیا ہے بلکہ مرہٹی ادب سے نظم اور نثر کا بڑا نمائندہ انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

مصاحبے : اردو کے مشہور ادیب گوپی چند نارنگ اور مرہٹی ادیب وشنو سکھارام کھانڈیکر (جو مرہٹی سے ترجمہ ہے) کے مصاحبے بھی بڑے خاصے کی چیز ہیں جن میں عصری ادب کے پیچ در پیچ مسائل پر بڑے گمبھیر مباحث ہوتے ہیں۔

تحقیق و تنقید : اس شمارے میں ایک تحقیقی مضمون اقبال کی ازدواجی زندگی سے متعلق بھی ہے جو مشہور محقق اور ماہر اقبال جگن ناتھ آزاد کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ پھر گوپی چند نارنگ شمس الرحمٰن فاروقی اور وزیر آغا وغیرہ کے تنقیدی مقالے عصری ادب کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔

مختصر یہ کہ شعر و حکمت کا یہ شمارہ علم و ادب کی دنیا کی ایک متاع بے بہا ہے جو ادب کے ہر باذوق قاری کی تسکین کے لیے ایک جوئے لطف کی طرح ہے اور سراج الدین ظفر کے الفاظ میں :

سیراب مزرعِ جگرِ سوختہ ہوا ●●

ڈاک کے خط

(مراسلے)

بجناب مدیر صاحب

سلام مسنون۔

شگوفہ ملتا ہے تو گویا آپ سے ملاقات ہو جاتی ہے اور وہ مختصر سی مجلس یاد آجاتی ہے جو آپ سے دفتر میں لاہور کے مقام پہ ہوئی تھی۔ افسوس کہ پھر نہ آپ لاہور آسکے، نہ ہمیں حیدرآباد پہنچنے کی توفیق ہوئی، بس ڈاک کے کبوتروں کے وسیلے سے تحریری تبادلہ کر رہے ہیں۔ شگوفہ سے دل بہلا رہے ہیں۔

شگوفہ کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ میرا ڈاکیہ پہلے خود پڑھتا ہے پھر اپنے پوسٹ ماسٹر کو پڑھاتا ہے جو پرچہ ان دونوں میں سے کسی کو پسند آجائے وہ سنبھال کر رکھ لیتے ہیں اور لوگوں کو دکھاتے ہیں کہ ان کی اہلِ حیدرآباد تک رسائی ہے، وہ انھیں رسالے بھجواتے ہیں۔ یہ کچھ نہیں بھجواتے۔ وہ اپنے اس شوق میں کبھی کبھی مجھے بھی شامل کر لیتے ہیں۔ میں اس "ڈوکویں" ملاقات پر خوش ہو جاتا ہوں اور ان سے شکایت نہیں کرتا۔ کہیں سارے پرچے دابنے نہ لگیں۔

احمد سعید۔ لاہور

یہ جان کر آپ کو افسوس ہوگا کہ شگوفہ میں اکثر شائع ہونے والے مشہور شاعر ظفر چکدینوی کا ۱۳ رجون کو انتقال ہو گیا۔ جن کے شمارے میں آپ نے ان کا کلام شائع کیا ہے۔ عبدالقیب ظفر چکدینوی، چکدین تھانہ استھانواں ضلع نالندہ سے تعلق رکھتے تھے۔ گزشتہ سال ہیڈ ماسٹر چکدین ہائی اسکول کی حیثیت سے وظیفہ پر علحدہ ہوئے تھے۔ یک المیوریم سے ان کی دو کتابیں "تنکا اور شہتیر" اور "زیرِ خند" شائع ہو چکی ہیں۔

حمید اللہ بیگ المیوریم پٹنہ ۱۳

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

اداریہ

ایک عرصے کے بعد اُردو کے تخلیق کاروں کو یہ حوصلہ افزا خبر ملی کہ نامور ادیب قرۃ العین حیدر کو اس سال گیان پیٹھ ایوارڈ کی صورت میں ملک کا سب سے اہم امدادی ادبی اعزاز عطا کیا جا رہا ہے۔ ۱۹۶۹ء میں فراق گورکھپوری کو گیان پیٹھ ایوارڈ دیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں پچھلے بیس سال میں اردو زبان کا کوئی ادیب یا شاعر اس اعزاز کے قابل نہیں سمجھا گیا جب کہ خود قرۃ العین حیدر کو بہت پہلے اس انعام سے نوازا جا سکتا تھا۔ بہر حال خوشی ہے کہ انسانی نفسیات اور تہذیب و تاریخ پر گہری نظر رکھنے والی اس بے مثال صاحبِ طرز ناول نگار و افسانہ نگار کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ ادارۂ شگوفہ قرۃ العین حیدر کی خدمت میں دلی مبارک باد پیش کرتا ہے۔

گزشتہ مہینے ممتاز مزاحیہ شاعر ظفر چکدینوی کا انتقال ہو گیا۔ ادھر چند مہینوں سے وہ علیل تھے۔ جس کا ان کے خطوط میں بھی اکثر ذکر رہنے لگا تھا۔ شگوفہ سے ظفر چکدینوی کو خاص لگاؤ تھا۔ ابتدا ہی سے ان کا قلمی تعاون ہمیں حاصل تھا۔ ہم اس مخلص و ہمدرد ساتھی کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و ملال کا اظہار کرتے ہیں۔ اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت سے نوازے۔ اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

○

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۲۳ شمارہ ۸

اگست ۱۹۹۰ء

جشنِ آزادی مبارک

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت
محمد حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم
طالب خوندمیری

مجلسِ مشاورت
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
یوسف ناظم
مجتبیٰ حسین

خصوصی نمائندے:
بمبئی ـــــ فیاض احمد فیضی
ریاض ـــــ عابد معز
دوبئی ـــــ غلام نجیم الدین
آسٹریلیا ـــــ ایس۔ ایم حسینی

فی پرچہ: ۵ روپے
زرِ سالانہ: ۵۵ روپے
لائبریریوں سے: ۶۰ روپے
بیرونی ممالک: ۱۸۰ روپے

سرورق، طالب خوندمیری کتابت، محمد غالب، محمد مجاہد
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد۔
ترسیلِ زر و خط و کتابت کا پتہ:
شگوفہ، ۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
فون آفس: 557716 مکان: 521064


کشمیری قوام

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مال مفت (انشائیے)

مال مسروقہ (ڈائجسٹ)

ہوائی کولمبس (سفرنامہ امریکہ)

قاضی جی دبلے (کوائف بمبئی)

اڑیں گے پرزے (خاکہ)

بال کی کھال (جائزے)

پچوڑن (منظومات)

ترقی اُردو بیورو کی تازہ مطبوعات

		صفحات	قیمت
۱۔ ابوالکلام آزاد۔ شخصیت، سیاست، پیغام	پروفیسر رشید الدین خاں	۳۳۶	۲۱/۰۰
۲۔ ابوالکلام آزاد۔ ایک ہمہ گیر شخصیت	مرتبہ " "	۶۸۸	۵۸/۰۰
۳۔ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء	اختر اورینوی	۳۴۷	[illegible]/۰۰
۴۔ دکن میں مرثیہ اور عزا داری	رشید موسوی	۳۱۵	۱۷/۰۰
۵۔ رہبر اخبار نویسی	سید اقبال قادری	۷۵۲	۶۲/۰۰
۶۔ عربی ادب کی تاریخ (اوّل)(تیسرا ایڈیشن)	عبدالحلیم ندوی	۳۶۰	۲۰/۰۰
۷۔ " " " " (دوم)	" "	۳۹۰	۲۶/۰۰
۸۔ غزل اور غزل کی تعلیم (دوسرا ایڈیشن)	اختر انصاری	۲۳۲	۱۸/۰۰
۹۔ فکر و تحقیق (تحقیقی مجلہ پہلا شمارہ)	مرتبہ ترقی اُردو بیورو	۲۸۸	۱۵/۰۰
۱۰۔ البیرونی کے جغرافیائی نظریات	ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی	۱۶۸	۱۱/۰۰
۱۱۔ تاریخ اور سماجیات	عائشہ بیگم	۱۴۰	۴/۵۰
۱۲۔ جغرافیہ کی ماہیت اور اس کا مقصد	ایس ڈبلیو وولرج/انیس احمد صدیقی	۲۴۰	۱۹/۰۰
۱۳۔ اردو افعال	سونیا چرنیکووا	۳۲۴	۲۴/۰۰
۱۴۔ آہنگ اور عروض	کمال احمد صدیقی	۲۲۴	۱۸/۰۰
۱۵۔ فرہنگ اصطلاحات ریاضیات (انگریزی، اُردو)	مرتبہ ترقی اردو بیورو	۷۶	۵/۰۰
۱۶۔ فرہنگ اصطلاحات لسانیات	"	۱۱۲	۲۰/۰۰
۱۷۔ لسانیات کیا ہے؟	ڈاکٹر ڈیوڈ کرسٹل/نصیر احمد خاں	۱۶۰	۱۱/۰۰
۱۸۔ مختصر اردو لغت (اُردو۔اُردو)	ترقی اردو بیورو	۹۴۸	۶۵/۰۰
۱۹۔ دکن میں اُردو	نصیر الدین ہاشمی	۲۹۶	۱۵/۵۰
۲۰۔ دیوانِ آبرو	مرتبہ پروفیسر محمد حسن	۳۷۸	۲۵/۰۰
۲۱۔ ہندوستانی سماج، ساخت اور تبدیلی	ضیاء الدین احمد	۴۶۰	۳۸/۰۰

شعبۂ فروخت و نمائش

ترقی اُردو بیورو ویسٹ بلاک 8 آر۔ کے پورم، نئی دہلی 110 066

فون: 609746

عابد معز (ریاض)

تکیہ

جب ہمیں مضمون لکھنا ہوتا ہے تو ہم آنکھیں بند کیے تکیے پر سر رکھے سوچنے لگتے ہیں۔ مضمون خیال کی کھڑکی پر دستک دینے لگتا ہے۔ کچھ دیر تکیے سے مصروف مشورہ رہتے ہیں اور پھر اُٹھ کر مضمون قلمبند کرنے لگتے ہیں اس مرتبہ بھی ہمارا تخلیقی عمل جاری تھا کہ تکیے نے کہا "میں نے تمھیں اچھے اور بُرے ڈھیر سارے مضامین دیئے ہیں جن کے بِرتے پر تم اِتراتے پھرتے ہو۔ کبھی تم کو خیال آیا کہ مجھ ناچیز تکیہ پر مضمون لکھیں ؟" ہمیں لگا تکیے نے ڈنک مارا ہے۔ ہم اٹھ بیٹھے اور اپنے دیرینہ رفیق ہمدم اور دوست پر مضمون لکھنا شروع کیا۔

ہمارا اور تکیہ کا ساتھ بہت پرانا ہے۔ یاد نہیں کب سے تکیے پر تکیہ کر رہے ہیں۔ ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو تکیے پر پایا۔ تحقیق کی تو پتہ چلا کہ تکیہ ہمارا جنم جنم کا ساتھی ہے۔ انسان جب پیدا نہیں ہوتا تبھی سے امید پر تکیہ کا ساتھ شروع ہوتا ہے۔ ماں بچّہ کی پیدائش سے پہلے بڑے جاؤ سے چھوٹے چھوٹے کپڑوں کے ساتھ ایک عدد چھوٹے تکیہ کا انتظام کرنے لگتی ہے۔ اکثر اوقات سر کے تکیے کے ساتھ مزید دو بغلی تکیے بھی تیار کر لیے جاتے ہیں۔ غرض تکیے کے سہارے بچّے کی زندگی شروع ہوتی ہے۔ پلٹنے لگتا ہے تو بازو تکیہ رکھا جاتا ہے۔ روتا ہے یا ضد کرتا ہے تو ماں تکیے پر تھپک تھپک کر بہلاتی ہے۔ تکیے کے سہارے بیٹھنا سکھایا جاتا ہے۔ تکیے پر پہلی کتاب رکھ کر پڑھائی شروع کی جاتی ہے عمر کے ساتھ پڑھائی کا انداز بدلتا ہے۔ تھوڑا بہت علم سر میں سما جاتا ہے تو تکیے سے کتاب اٹھا کر ہاتھ میں پکڑی جاتی ہے اور سر کو تکیے پر رکھا جاتا ہے۔ غرض ہماری تعلیم و تربیت میں تکیے کا اہم رول ہوتا ہے۔ تکیہ کو خراج پیش کرنے کے لیے ہمیں تکیے کے ساتھ ادب سے پیش آنا سکھایا جاتا۔ تکیے پر پیر رکھنا تو دور اس پر بیٹھنا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ہمیں یاد ہے، بچپن میں تکیے پر بیٹھتے تو دادی ماں ڈراتی تھیں کہ ہماری دُم نکل آئے گی۔ تکیے کے ساتھ بدتمیزی کرنے پر خود تکیہ سزا دیتا ہے۔ گردن پکڑتا ہے۔ حجام تو یہ بتلا کر دیتا اور سزا کے طور پر سر اور گردن پر مالش کی شکل میں دھپّے رسید کرتا ہے۔ تب کہیں جا کر گردن کی پکڑ چھوٹتی ہے۔

تکیہ بچپن میں ماں کی گود ہی ثابت نہیں ہوتا بلکہ جوانی میں محبوبہ کا نعم البدل اور بڑھاپے کا ساتھی بھی ہوتا ہے۔ بچے کو سلا کر ماں بازو تکیہ رکھ کر اپنے کام میں جُت جاتی ہے۔ معصوم بچّہ نیند میں تکیے پر سر رکھ کر ماں کی آغوش کا ...

گھنٹوں سوتا ہے۔ بعض بچوں کو تکیے پر ہاتھ رکھ کر سونے کی لت پڑ جاتی ہے۔ جو بڑے ہونے پر مشکل سے چھوٹتی ہے۔ جوانی میں محبوبہ کی یاد سے بے چین ہو کر بانہوں میں بھینچ لیتے ہیں۔ ہمیں کسی نے (شاید دھوبی نے) بتلایا تھا تکیے پر اکثر لپ اسٹک کے نشان نظر آتے ہیں۔ بڑھاپے میں تکیہ بہترین ساتھی ثابت ہوتا ہے۔ تکیوں کی تعداد بھی بڑھ جاتی ہے۔ تکیہ سہارا دے کر بوڑھے شخص کو بٹھاتا ہے۔ کمر اور گھٹنے کے درد کے علاج میں فائدہ مند ہوتا ہے!

تکیے کے بغیر زندگی گزارنا مشکل ہے۔ تکیہ نہ ہو تو نیند نہیں آتی اور جب نیند نہیں آتی تو انسان تھک جاتا ہے۔ بستر نہ ہو کوئی مضائقہ نہیں لیکن سستانے اور سونے کے لیے تکیہ ضرور چاہیے۔ بے سروسامانی میں ہاتھ تکیہ بنتے ہیں۔ ہاتھوں کو موڑ کر ایک کے اوپر ایک رکھا اور ہاتھوں کے تکیے پر سر رکھے آرام سے سو گئے۔ مزدور کا تکیہ اس کے اوزار بنتے ہیں تو عالم کا تکیہ اس کی کتابیں۔ تکیے مختلف اشیا کے بنتے ہیں۔ کپڑے، روئی، فوم، بھوسہ، پرندوں کے پر، ناریل کی چھال، ریت وغیرہ۔ کوئی نرم تکیہ پسند کرتا ہے تو کسی کو سخت تکیہ چاہیے۔ کوئی گول تکیے پر سر رکھتا ہے تو کوئی چوڑے تکیے پر آرام کرتا ہے۔ چاہے کیسا بھی ہو ہر بشر کو تکیہ چاہیے جو اس کے سر کو اونچا اٹھائے اور تھکان مٹانے کے لیے اسے نیند کی آغوش میں پہنچا دے۔ اسی لیے سفر میں بھی لوگ تکیہ ساتھ رکھتے ہیں۔ ہوا بھر کر استعمال ہونے والا تکیہ سفر کا بہترین ساتھی ثابت ہوتا ہے۔ ہمارے ایک صنعت کار دوست اپنی کامیاب زندگی کا راز اپنا خاندانی تکیہ بتلاتے ہیں۔ ہر دم، ہر وقت تکیہ ان کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ فیکٹری تکیے کے ساتھ جاتے ہیں۔ بزنس میٹنگ میں تکیہ ان کے پاس رہتا ہے۔ دوسرے شہر میں وہ جائیں تو تکیہ ان کے بریف کیس میں موجود ہوتا ہے۔ جہاں انھوں نے تھکان محسوس کی اپنا تکیہ نکالا، تکیہ میں ہوا بھری، تکیہ پر سر رکھ کر دیر سستایا، غور و فکر کی، تکیے سے صلاح و مشورہ کیا اور پھر تازہ دم اپنے کام میں جٹ گئے۔

عموماً ہم ایک ہی تکیے پر تکیہ کرتے ہیں۔ بعض اشخاص دو چار تکیوں کے ساتھ رہنا پسند کرتے ہیں۔ . . . . سر کے نیچے ایک یا ایک سے زائد تکیے دائیں اور بائیں بازو تکیے۔ پیٹھ یا کمر کے نیچے تکیہ۔ ایک سے زائد تکیے ہمیں گوارا لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ایک تکیے پر ایک ہی سر قابض ہو۔ کوئی بھی اپنے تکیے کو دوسرے کے ساتھ بانٹنا نہیں چاہتا چاہے وہ کتنا ہی قرابت دار کیوں نہ ہو۔ وقتی طور پر ایک تکیہ پر دو سر ضرور ٹکا ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہر کوئی اپنا سر اپنے تکیے سے چپکائے رکھتا ہے۔ تکیے کے برخلاف بستر بانٹا جاتا ہے۔

تکیے پر سر رکھتے ہی فکر کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ ادیب، مفکر، شاعر، سیاست داں سے لے کر عام انسان تک تکیے پر لیٹے سوچتے ہیں۔ گھر کا بجٹ، بچوں کی تعلیم، لڑکی کا رشتہ، آفس کے معاملات، ملک کی سیاسی صورت حال، مسائل اور نہ جانے کس کس عنوان پر تکیہ پر تکیہ کیے غور کیا جاتا ہے۔ ہم نے اپنے ایک دوست سے عام انتخابات کے تعلق سے ان کے خیالات جاننا چاہے تو انھوں نے فرمایا: "یار آج شام میں تکیے پر سر رکھ کر اس بارے میں غور کروں گا اور کل تمہیں اپنے خیالات سے آگاہ کروں گا۔" بعض مرتبہ تکیے پر سر رکھے سوچنے اور غور و فکر کرنے

کا عمل طویل اور تکلیف دہ بن جاتا ہے۔ نیند اُڑ جاتی ہے۔ تکیے پر لیٹے کروٹیں بدل بدل کر سوچ میں ڈوب جاتے ہیں۔ تکیے پر سر رکھے غور و فکر کرنے کے مختلف انداز ہوتے ہیں۔ آنکھیں بند کیے ٹانگوں کو ہلاتے ہوئے سوچنا بہتر نتائج دیتا ہے بعض اشخاص تکیے پر سر رکھے آنکھیں چھت یا آسمان کو لگائے سوچتے ہیں تو بعض اپنا چہرہ تکیے میں چھپائے سوچنے کا عمل جاری رکھتے ہیں۔

ادیبوں اور شاعروں کو تکیے سے خاص انس ہوتا ہے۔ تکیے پر سر رکھے گھنٹوں سوچتے رہتے ہیں۔ تکیے سے مضامین اور موضوعات آنے لگتے ہیں۔ لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھتے اور لکھنے لگتے ہیں۔ ہمارے ایک شاعر دوست سے جب پوچھا گیا کہ آپ شاعری کیسے کرتے ہیں۔ وہ جواب دیتے ہیں مجھے شاعری کی تحریک تکیے سے ملتی ہے میں تکیے پر سر رکھے سوچنے لگتا ہوں تو شعروں کا نزول ہوتا ہے۔ تخلیقی عمل سے تھک جاتا ہوں تو تکیے پر سر رکھے سو جاتا ہوں۔ جب بھی ہمارے دوست مشاعروں میں جاتے ہیں اپنا تکیہ اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ سفر کے دوران تکیے کے سہارے شاعری کرتے ہیں اور اپنا تازہ کلام سنا کر مشاعرہ لوٹ لیتے ہیں۔ ایک مرتبہ اتّفاق سے موصوف کا تکیہ ایک مترنم شاعر کے تکیے سے بدل گیا۔ مشاعرہ میں موصوف نے بے وزن کلام تحت اللفظ میں سنایا اور ہوٹ ہوئے۔

تکیے کی طبّی افادیت بھی ہے۔ مختلف بیماریوں میں تکیے کی اونچائی بڑھتی اور گھٹتی ہے۔ تکیے کی سختی اور نرمی، گرمی اور ٹھنڈک بھی بیمار پر اثر انداز ہوتی ہے۔ سر درد میں گرم تکیہ آرام دیتا ہے تو بخار میں ٹھنڈا تکیہ راحت پہنچاتا ہے۔ گھر کی بڑی بوڑھی خواتین امراض کے لیے جڑی بوٹی تکیے کے نیچے رکھتی ہیں۔ تکیے کے سہارے کرتوت اور عملیات ہوتے ہیں۔ شوہر کو قابو میں رکھنا ہو تو تعویذ تکیے کے نیچے رکھیے۔ نوجوان سے اس کی محبت چھیننا ہے تو تکیہ پر "عملیات" کروائیے۔ نظر لگی ہے تو تکیے پر دعا پڑھوائیے۔ دشمن کا خاتمہ کرنا ہو تو اس کے تکیے میں پتلے چھپائیے۔ گردن پکڑی گئی ہے تو تکیہ دھوپ میں سکھائیے۔ اولاد کی خواہش ہو تو چھوٹے بچوں کے تکیے پر سات راتیں گزاریئے

تکیہ خواب دکھاتا ہے۔ سوتے اور جاگتے ہر وقت خواب تکیے کی مرضی کے ہوتے ہیں۔ ان میں تنوع ہوتا ہے۔ دیکھنے والے کا ان پر بس نہیں ہوتا۔ کبھی رومانی تو کبھی ڈراؤنے۔ کبھی یاد رہ گئے تو کبھی بھول گئے۔ ہمارے ایک دوست سے زیادہ سونے کی وجہ دریافت کرنے پر کہتے ہیں "میرا تکیہ اچھے خواب دکھاتا ہے۔ یہ خواب دیکھ کر میں زندگی کی تلخیوں کو بھول جاتا ہوں اور مجھ پر ایک نشہ طاری ہو جاتا ہے۔ میں اس نشہ کا عادی ہو چکا ہوں۔ میں اس نشہ کے لیے زیادہ سے زیادہ سونا چاہتا ہوں۔ جاگتے میں بھی خواب دیکھے جاتے ہیں جسے چاہیں دیکھیے کوئی روک ٹوک نہیں کسی فلمی حسینہ کے ساتھ ہنی مون پر جائیے۔ کسی ملک کا وزیر اعظم بنیے۔ ہمارا تکیہ ہمیں خواب دکھاتا ہے کہ ہم اردو کے صف اوّل کے انشائیہ نگار ہیں۔ لوگ ہماری کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں اور ہماری کتابیں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہی ہیں۔ کتابوں کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ہم تکیے سے اپنا سر اٹھاتے ہیں کہ یہ عقدہ [illegible]

کسی ادبی کی اردو کتاب کے بارے میں ہم ایسا خواب دیکھ سکتے ۔

ہر دور میں تکیے پر خالی اور بے وزن سر نے تکیہ کیا ہے جب کہ تکیے کے اندر اور نیچے کام کی چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ پچھلے زمانے میں تکیہ خزانے کا کام دیتا تھا۔ لوگ پیسے، زیورات وغیرہ تکیے میں چھپا کر رکھتے تھے۔ خزانے والا تکیہ ہر دم صاحب تکیہ سے چمٹا ہوتا تھا۔ آرام کیا تو سر کے نیچے، بیٹھے تو کمر کے پیچھے اور چل پھر رہے ہیں تو بغل میں تکیہ موجود ہے۔ ہماری دادی ماں کے پاس بھی ایک ایسا ہی خزانے والا تکیہ تھا۔ وہ کہتی تھیں "بیٹا ہمارے زمانے میں صندوق اور الماریاں نہیں ہوتی تھیں۔ قیمتی اشیا اور پیسے تکیے میں محفوظ رہتے تھے۔ جب ہم دادی اماں کے پاس جاتے وہ اپنے تکیے سے مٹھائی کے لیے پیسے دیتی تھیں گھر کے بڑے لوگ کھسر پھسر کرتے تھے کہ تکیے میں دادی ماں نے اپنا زیور چھپا رکھا ہے۔ ہر کوئی دادی ماں کے تکیے کی تاک میں رہتا تھا کہ کب خاندانی خزانہ باہر آئے گا۔ وقت کے ساتھ تکیے کے اندر کی قیمتی اشیا تکیے سے باہر آئیں اور اب انھیں تکیے کے نیچے رکھا جاتا ہے۔ زیورات، کنجیاں، عینک، بٹوہ، روپے پیسے، رومال، دوائیں، گھڑی، کاغذات اور نہ جانے کیا کچھ جان سے عزیز چیزیں تکیے کے نیچے رکھی جاتی ہیں۔ گہری نیند میں بھی تکیے کے نیچے کی اشیا پر نظر رہتی ہے۔ کسی شخص کو نیند سے جگانا ہے تو تکیے کے نیچے کی اشیا نکال لیجیے۔ اگر کوئی اس عمل سے بیدار نہ ہو تو سمجھیے کہ وہ گھوڑے بیچ کر سونے والی نیند سوتا ہے۔

تکیے سے بہتر کوئی دوست نہیں ہوتا۔ تکیے سے مشورہ کرنے پر وہ ہمیں وہی مشورہ دیتا ہے جو ہمارا خیال بلکہ ہمارا ارادہ ہو۔ تکیے کے برخلاف کسی دوست سے مشورہ کیجیے تو موصوف اپنی شخصیت کو مد نظر رکھتے ہوئے صلاح دیتے اور اپنے انداز سے ہمارے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تکیہ ہمارا پیارا اور سچا دوست ہے۔ وہ ہمیں ہمت دیتا ہے کہ جیسا ہم چاہتے ہیں ویسا ہی کریں۔ چند دن قبل ہم اپنے عزیز دوست کے ساتھ شاپنگ کر رہے تھے۔ ہمیں ایک شرٹ پسند آیا۔ ہم نے اپنے دوست کی رائے لی۔ موصوف کا مشورہ تھا "تمھارے لیے یہ شرٹ مناسب نہیں ہے۔ اس کا شوخ رنگ تمھیں اچھا لگتا نہیں۔" رات جب ہم نے تکیے کو اپنے دوست کا مشورہ سنایا تو تکیے نے کہا "کیا تم کسی گلفام سے کم ہو جو تم پر شوخ رنگ نہیں جچے گا۔" دوسرے دن تکیہ کا مشورہ مان کر ہم نے شرٹ خریدا۔ آج بھی ہم اس شرٹ کو بڑے چاؤ سے پہنتے ہیں۔ تکیہ ہر دم ہمارا ہم خیال نہیں ہوتا۔ بعض مرتبہ وہ ہماری گوشمالی پر اتر آتا ہے۔ تکیہ ہمارے ضمیر کو جگا کر اور اس سے سازش کر کے ہمیں پریشان کرتا ہے ہماری حرکات کا محاسبہ کر کے ہمیں نصیحت کرتا ہے۔ ہمیں ہماری غلطیوں کا احساس دلاتا ہے۔ ایسے وقت تکیہ ہمیں آفت کا پرکالہ لگتا ہے۔ جھلا کر ہم تکیہ پٹک کر بستر چھوڑ دیتے ہیں۔

تکیہ ہمارا ہم راز ہے۔ ایسے کئی راز ہیں جن کی وہ دوسروں کو ہوا تک نہیں دیتا۔ ہم اپنی بیوی کے ساتھ رہتے ہوئے کسی اور کو دل میں بسائے رکھتے ہیں۔ یہ راز ہمارا تکیہ جانتا ہے۔ مجال ہے کبھی تکیے نے ہماری بیوی سے کچھ کہا ہو۔ ہماری بیوی تکیے کی صفائی کرتی ہیں۔ میلے غلاف بدلتی ہیں۔ تکیے میں سے کھٹمل نکالتی ہیں لیکن تکیے کا ظرف دیکھیے، کبھی اس نے ہمارے عشق کی بھنک بھی پڑنے نہ دی۔ تکیے کے برخلاف ہمارے شرٹ کو لیجیے۔ محبوبہ سے گلے ملے نہیں کہ بال خود پر چپکا کر

جغلی کھاتا ہے۔ رومال سے آنسو پونچھے تھے کہ وہ اپنے دامن میں پرانی خوشبو بسائے شکایت کرنے لگا۔

شترمرغ، شکاری سے بچ کر ریت میں منہ چھپاتا ہے۔ ایسے ہی ہم زندگی کے مسائل سے گھبرا کر اپنا منہ تکیے میں چھپاتے ہیں۔ تکیے پر سر رکھ کر دن تمام کی محرومیوں کا رونا روتے ہیں، دنیا اور اپنے دشمنوں کو جی بھر کر کوستے ہیں۔ بچپن میں ہم ماسٹر کی مار کھا کر دعا کرتے تھے کہ خدایا تو ماسٹر کو ہماری طرح بچہ بنا کر انھیں ہمارے ساتھ پڑھنے بلکہ مار کھانے سکول بھیج اور ایک جلاد استاد کے ہاتھوں ان کی خوب پٹائی ہو۔ کچھ اور بڑے ہوئے تو تنومند ساتھی لڑکوں کی مار کھا کر اپنی کمزوری کا رونا روتے تھے۔ وقت اور بڑھا تو لڑکیوں کے فراق میں آہیں بھرتے تھے اور اب غم روزگار سے نڈھال ہو کر ہچکی بندھ جاتی ہے۔ ہر دور میں تکیہ ہمارا ہمدرد اور رفیقِ زندگی بنا ہمارے آنسو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے، دلاسا دیتا ہے، ہمت بندھاتا اور تھپک تھپک کر نیند کی آغوش میں پہنچا دیتا ہے۔ تھکن دور کرنے کے بعد ہمیں تر و تازہ دنیا کے مسائل سے الجھنے کے لیے بھیجتا ہے۔

زندگی بھر اچھے برے حالات میں بہ حیثیت دوست، ہمدرد، غمگسار، ناصح اور نہ جانے کیا کچھ بنا تکیہ ہمارے ساتھ رہتا ہے۔ سر کے نیچے پڑا ہمیں جینے کے انداز سکھاتا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے نئی امنگیں پیدا کرتا ہے۔ غرض تکیہ زندگی سے عبارت ہے۔ تبھی تو زندگی کے روٹھنے پر ہمارے اپنے جن پر ہماری زندگی تکیہ کیے ہوتے ہیں، ہمارے نیچے سے تکیہ ہٹا لیتے ہیں اور تکیے کے بغیر ہمیشہ کے لیے سلا دیتے ہیں۔

●●

رشید عبدالسمیع جلیل (حیدرآباد)

سہرا

بڑی مشکل سے برسوں بعد سو پر جب بندھا سہرا
اکڑ کر رہ گئی گردن پسینے میں بھرا سہرا

پرانی بات ہے پھر بھی ہمیشہ یاد آتی ہے
بہ مشکل چند گھنٹے ہی رہے سر پر رہا سہرا

اب آٹے دال کا کیا بھاؤ ہے معلوم ہوتا ہے
اگرچہ ابتدا میں خوب صورت سا لگا سہرا

جہیزی برتنوں کو زنگ لگ جائے تو کیا حاصل
یہی کچھ سوچ کر ہم نے گوارا کر لیا سہرا

بڑے ماموں نے اُٹھ اُٹھ کر اُٹھایا اپنے ہاتھوں سے
کلاہِ کج کی کمزوری سے جب بھی جھک گیا سہرا

پہنچنا دیر سے دولہے کا سنتے آئے ہیں لیکن
نہ پہنچے جب تلک قاضی پڑھے بس فاتحہ سہرا

اُدھر اک شور سا اُٹھا کہ قاضی جی بدھارے ہیں
اِدھر مارے خوشی کے خود بخود ہلنے لگا سہرا

طبق لبریز تھی بادام، مصری اور کھجوروں سے
یہ جب اُلٹی تو قدموں میں اُچھل کر آ گرا سہرا

کبھی دلہن نہیں پہنچی کبھی نوشاہ غائب ہے
کرے اس شومیٔ قسمت کا اب کس سے گلہ سہرا

گزر جاتی ہے پوری شب کبھی تکمیلِ فہرس میں
نہیں کرتا کسی سے پھر بھی کوئی التجا سہرا

بکھر جاتی ہے قبل از عقد خوشبو چار سو لیکن
نظر آتا ہے بعد از عقد سر پر ٹوکرا سہرا

عزیزو کیا بتائیں حال تم کو اپنی شادی کا
کئی احباب شاعر تھے مگر کس نے پڑھا سہرا؟

قویٰ ڈھیلے ہیں لیکن لکھنا ہے عقدِ ثانی کا
دعا کرتے ہیں روزانہ دکھا دے یا خدا سہرا

گلاب اور موتیا مہنگے ہوئے جاتے ہیں روز افزوں
چلیں اب باندھیے کاغذ کے پھولوں سے نیا سہرا

○

سرفراز شاہد (اسلام آباد)

شبِ غم کے اندھیروں میں کمی ہونے نہیں دیتے
یہ کیسے بلب ہیں جو روشنی ہونے نہیں دیتے

مسلمانوں کی خواہش ہے کہ وہ سب ایک ہو جائیں
مگر ان کو اکٹھا مولوی ہونے نہیں دیتے

مشینوں سے بنا لیتے ہیں ہم کیا کیا [illegible] انساں
مگر ہم آدمی کو آدمی ہونے نہیں دیتے

بنا رکھا ہے بچے کی ولادت [illegible] ہم نے
کبھی ہونے یہ دیتے ہیں اور کبھی ہونے نہیں دیتے

غزل میں آج بھی شاہد ظرافت ہم سے قائم ہے
[illegible] صنفِ سخن کو ختم بھی ہونے نہیں دیتے

ابراہیم یوسف (بھوپال)

عزیز محترم اور فٹ بال میچ

ہمارا خیال تھا کہ عزیز محترم کو کھیل کود سے اللہ واسطے کا بیر ہے۔ جب بھی کھیل کود کا موضوع چھڑتا تو وہ گفتگو سے بے تعلق ہو کر دیواروں کو یوں تاکنے لگتے جیسے نظروں سے ان کی پیمائش کر رہے ہوں اور اگر انھیں گفتگو میں شریک کرنے کی کوشش کی جاتی تو وہ یوں ہوں ہاں کرتے جیسے بادلِ ناخواستہ کسی باتونی بچے کو بہلا رہے ہوں۔ ٹی وی پر کرکٹ دیکھنا ہماری کمزوری ہے۔ جب ہم انھیں کرکٹ دیکھنے کے لیے مدعو کرتے تو وہ لاحول پڑھ کر برنارڈ شا کے حوالے سے فرماتے یہ بھی کوئی کھیل ہے ایک بے وقوف گیند پھینکتا ہے۔ دوسرا اس پر ہٹ لگاتا اور تیسرا گیند کے پیچھے دوڑنے لگتا ہے۔ ہمارے بے حد اصرار پر وہ ہمارا دل رکھنے کے لیے بیٹھ تو جاتے مگر صوفہ کی پشت سے ٹیک لگا کر فرماتے "میں تھوڑی دیر قیلولہ کر رہا ہوں لنچ ٹائم پر آواز دے لینا۔ لنچ لینے کے بعد تاکید کر دیتے ٹی بریک پر جگا لینا۔ کبھی بے حد خلوص اور اپنائیت ظاہر کرتے ہوئے فرماتے"۔ جب اپنا اظہر الدین میدان میں اترنے تو مجھے بتلا دینا"۔ اور جب اظہر الدین میدان میں اترتا اور انھیں مطلع کیا جاتا تو تھوڑی تھوڑی آنکھیں کھولتے اور فرماتے "اچھا آگیا اپنا پہلوان میدان میں"۔ پھر آنکھیں بند کر لیتے اور حکم دیتے "جب آوٹ ہو تو اس کا اسکور بتا دینا"۔ ایک مرتبہ ہم نے عرض کیا کہ حضور اور بھی اچھے کھلاڑی ہیں مگر آپ کو صرف اظہر الدین ہی کا نام یاد ہے تو فرمایا "ارے میاں وہ تنہا کھلاڑی ہے جس نے بہت سے ریکارڈ بنائے ہیں جیسے رن آوٹ ہونے کا"۔ ہم نے اپنا سر پیٹ لیا کہ بے چارے اظہر الدین کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا اور جب ہم نے انھیں اظہر الدین کے کھیل کی خوبیوں کا قائل کرنے کی کوشش کی تو فرمایا "وہ تو سب ٹھیک ہے مگر ریکارڈ پھر ریکارڈ ہے خواہ رن آوٹ ہونے کا ہی کیوں نہ ہو"۔

عزیز محترم لنچ سے پہلے ہی قیلولہ کیا فرماتے پورے کمرے کو سر پر اٹھا لیتے۔ خراٹے کمرے میں گونجنے لگتے۔ کبھی تو وہ بے تال اور بے سُرے ہوتے کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے بہت سے اژدہے ایک ساتھ پھنکار رہے ہوں۔ ایسا اتفاقاً ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے کوئی کبڈی کا کھلاڑی کبڈی کبڈی کہتا ہوا دوسرے کے پالے میں جا ملا ہو۔ جلد ہی ان کے خراٹوں کا پروگرام شروع ہوتا ہمارے بچے کرکٹ بھول کر ان کے خراٹوں میں دلچسپی لینے لگتے۔ ہمارے

بچوں نے ان کے خراٹوں کو مختلف اقسام میں تقسیم کر رکھا تھا۔ کبھی خرخر کی آواز مسلسل اور تیز تیز نکلتی اسے ریپڈ فائرنگ کا نام دیا گیا تھا۔ کبھی خرخر کی آواز اس قدر بلند ہوتی کہ پورا کمرہ گونجنے لگتا۔ یہ خاراشگاف کہلاتا۔ خاراشگاف کی آواز مسلسل بلند ہوتی جاتی اور جب انتہائی عروج پر پہنچ جاتی تو پھر ایک پھُس سی آواز نکلتی یہ پس فائر کہلاتی۔ ہمارے بچوں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ عزیزِ محترم کے خراٹوں کا جواب دنیا میں نہیں ہے اس لیے ان کا نام گنیز بک آف ورلڈ رکارڈ میں درج ہونا چاہیے۔

جب سے ورلڈ کپ فٹ بال شروع ہوا تھا عزیزِ محترم غیر متوقع طور پر میچ دیکھنے کے لیے بے حد مستعد ہوگئے تھے۔ دن رات فٹ بال اور گزشتہ میچ پر تبصرہ کرتے رہتے۔ ان کے تبصرے کچھ اس طرح کے ہوتے۔ فلاں ٹیم کی وردیاں بڑی شاندار تھیں۔ فلاں ٹیم کا کوچ بہت شور مچا رہا تھا وغیرہ وغیرہ۔ رات آٹھ بجے ہمارے گھر پر تشریف لاتے اور فرماتے آج سوا بارہ بجے سے فلاں فلاں ٹیموں کا مقابلہ ہے کہیں گھوڑے نہ بیچ دینا۔ میچ دیکھنا ہے۔ ہم عرض کرتے کہ نیند خراب کرنے سے کیا فائدہ صبح اس کی ویڈیو اور کارڈنگ دیکھ لیں گے تو فرماتے۔ اور یجبل پھر اور یجبل ہے۔ ٹی وی والے رات میں کچھ ہیرا پھیری نہ کردیں۔ وہ ٹرو کاپی ہونے کا سرٹیفکیٹ تو دیتے نہیں ہم ان کے شک اور احتیاط کے قائل ہوجاتے۔ رات نو بجے پھر آن دھمکتے اور فرماتے چلو اٹھو میچ دیکھنا ہے ورنہ تم خوابِ خرگوش کے مزے لوٹنے لگوگے۔ ہم عرض کرتے پہلے کھانا کھائیں گے پھر یہیں بیٹھ کر میچ بھی دیکھ لیں گے تو فرماتے خیر کھانا تو ہم تمہارے ساتھ کھالیں گے مگر میچ اپنے کلر ٹی۔ وی پر ہی دیکھیں گے۔ تمہارے بلیک اینڈ وائٹ پر مزا نہیں آتا۔ ہم سبکی محسوس کرتے ہوئے کہتے کہ آپ ہماری کم مائیگی کا مذاق اڑا کر ہماری توہین کر رہے ہیں تو جواب دیتے "برادر! اس میں توہین کی کون سی بات ہے۔ خدا نے خود قرآن میں فرمایا ہے کہ عزت اور ذلت دینا خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت۔ اگر خدا نے ہمیں یہ عزت دی ہے تو تمھیں سر جھکا کر اسے قبول کرلینا چاہیے اور ہم سر جھکا کر ان کے ساتھ ہولیتے۔

گھر پہنچتے ہی میچ دیکھنے کے انتظامات شروع ہوجاتے۔ کمرے میں صوفے کرسیاں اور میزیں جو قرینے سے سجی ہوتیں ان کی ترتیب کچھ اس طرح بدلنے کی کوشش کی جاتی کہ گمان ہوتا کہ کمرے میں لوٹ مار ہوئی ہے۔ ہر کرسی اور صوفے پر بیٹھ کر ٹی۔ وی اسکرین پر نظر ڈالی جاتی اور فرمایا جاتا کھیل کو کس صحیح زاویے سے دیکھنا چاہیے۔ میچ کے دوران ہر منٹ پر برابر اپنی نشست بدلتے رہتے کیوں کہ گیند کے ساتھ ساتھ زاویہ کا اڈجسٹ کیا جانا ضروری تھا۔ ان کی بیگم صاحبہ کمرے کے اس منظر کو دیکھ کر خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتیں اور کہتیں "صبح کمرے کو ایڈجسٹ کرنے میں ایک دو گھنٹے صرف کرنا پڑے گا تو فرماتے "دیکھو بیگم۔ ہم چالیس سال سے تمھیں ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کر رہے [illegible] شکایت زبان پر نہیں لائے مگر آپ نے چند دن میں جبیں بول دی" بیگم صاحبہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتیں [illegible] ایڈجسٹ کر رہا ہے یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ خدا ناشکرے شوہر سے محفوظ رکھے"

تو فوراً فرماتے "اور ناشکری بیوی سے بھی۔ اور ہاں ہمارا دوربین کہاں ہے ذرا وہ دے دینا"۔ ہم حیرت سے پوچھتے "حضرت دوربین کا کیا ہوگا" تو فرماتے "پھر جب دور کا شاٹ لیتا ہے تو دوربین کی ضرورت پڑتی ہے"۔ ہم گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر لیٹ جاتے تو وہ تکیہ چھین کر فرماتے "کھیل دیکھنے کے آداب کا احترام کرو۔ کھیل لیٹ کر نہیں بیٹھ کر دیکھا جاتا ہے"۔ ہم مجبوراً سزا سے با مشقت برداشت کرنے لگتے۔ بیگم صاحبہ کو حکم تھا کہ ہر آدھے گھنٹے بعد چائے کی سپلائی جاری رہے۔ ہم کو بیگم صاحبہ سے ہمدردی ہوجاتی وہ کھیل کے دوران اونگھتی رہتیں۔

جب کھیل کے دوران کوئی کھلاڑی دوسرے کھلاڑی کے پیر میں پیر الجھا کر گرا دیتا تو ہم نعرہ لگاتے واہ کیا اَنٹی ماری ہے اگر کوئی کھلاڑی تھوڑا اچھل کر گرتا تو ہم کہتے یہ دھوبی پاٹ تھا۔ ارے دیکھیے اس نے کلاجنگ کا داؤ آزمایا تو وہ گھور کر ہمیں دیکھتے اور فرماتے "میاں عجیب جاہل آدمی ہو۔ یہ پہلوانوں کا دنگل نہیں فٹ بال میچ ہے فٹ بال میچ"۔ ہم عرض کرتے "اس کو کہتے ہیں ایک ٹکٹ میں دو مزے یہ پہلوانی کی پہلوانی اور میچ کا میچ"۔ اگر کوئی کھلاڑی گر کر تڑپنے لگتا تو ہم کہتے "لاحول ولاقوۃ۔ کس قدر بزدل کھلاڑی ہے۔ ہمارے بزرگ تو تلوار کا گھاؤ کھا کر بھی یوں نہیں تڑپتے تھے"۔ اس پر وہ ٹھنڈی سانس بھر کر فرماتے "ہمارے بزرگوں کی بھی یہی آن تھی مگر اب زمانہ ایسا بدلا ہے کہ لوگوں کو عزتِ نفس کا بھی خیال نہیں ہے"۔ اور جب کوئی کھلاڑی گول کر دیتا اور اس کے ساتھی کھلاڑی اس سے لپٹ جاتے اور اس پر سوار ہو جاتے تو عزیز محترم فرماتے "یہ انتہائی سفلہ پن کا مظاہرہ ہے اس سے مخالف ٹیم کی کس قدر دل شکنی ہوتی ہوگی۔ خوشی کے اس نامعقول مظاہرے پر پابندی لگنا چاہیے"۔

جب ہم راتوں کے جاگنے کی شغل سے بیزار ہوگئے تو عرض کیا "حضور! آپ تو کھیلوں اور کھیلوں کے ذکر سے ایسے بھاگتے تھے جیسے لاحول سے شیطان۔ لیکن فٹ بال سے اس قدر دلچسپی۔ بات کچھ غیر معمولی ہے"۔ کچھ دیر وہ خاموش رہے پھر ٹھنڈی سانس لے کر فرمایا "اس کھیل سے ہماری کچھ یادیں وابستہ ہیں"۔ ہم نے انھیں ٹٹولنے کے لیے کہا "جوانی کی یادیں ہوں گی"۔

"ارے کہاں میاں"۔ انھوں نے کہا۔ "جوانی ہم پر آئی کہاں تھی"۔

"گویا قدرت نے آپ کے لیے اپنا نظام ہی بدل دیا تھا"۔ ہم نے کہا۔

"نہیں ایسی بات تو نہیں تھی"۔ وہ بولے۔ "بلکہ مطلب یہ ہے کہ نہ ہم نے کسی لڑکی کو دیکھ کر سیٹی بجائی نہ سینہ پر ہاتھ رکھ کر آہیں بھریں اور نہ لڑکیوں کا جھنڈ دیکھ کر ان کے سامنے سے ڈسکو کرتے ہوئے گزرے۔ پھر کہاں کی جوانی"۔ پھر اپنی بیگم کی طرف اشارہ کر کے بولے "۲۱-۲۲ سال کی عمر میں ہمارے سر منڈھ دی گئی تھیں۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی ایک مرتبہ انھیں دیکھ کر سیٹی بجائی تو فرمایا۔ شرم نہیں آتی۔ امی سنیں گی تو کیا کہیں گی۔ بس اس دن سے آج تک جھک مار رہے ہیں"۔

ہم نے ۔۔ دیکھا کر عزیز ۔۔ پٹری سے اتر رہے ہیں تو عرض کیا "آپ کی وہ یادیں"۔ ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔

ہم دو تین سال کے تھے۔ ہمارے ابّو نے گیند لاکر دی تھی۔ ہم اس سے فٹ بال کھیلتے تھے۔ جب ہماری ٹھوکر سے گیند دور چلی جاتی تھی تو ایسی خوشی ہوتی تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ ہماری امّی اور باجی گول کیپر بنتی تھیں۔

"امّی اور باجی۔۔۔ دو دو گول کیپر" ہم نے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔ وہ دونوں گیند ہاتھ سے پھینکتی تھیں۔" کچھ دیر خاموش رہے۔

پھر بولے "۔ جب گول کیپر گیند ہاتھ سے پھینکتا ہے تو ان دونوں کی صورتیں نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔" اور پھر آنکھیں بند کرکے شاید یادوں میں کھو گئے۔ آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

۵۷

مشتاق احمد یوسفی

غنودیم، غنودیم*

(پس و پیش لفظ)

"احسان بھائی! منوّر حسین بھی رخصت ہوگئے۔ انتقال سے پہلے . . . . "

"کس کے انتقال سے پہلے؟ میاں احسان الٰہی نے اپنی بے نور آنکھوں سے چھت کے پنکھے کو تکتے اور فالج زدہ ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے اٹھا کر اپنے دل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ انھیں رہ رہ کر اپنی جانتا کے درد کا شبہ ہو رہا تھا۔

یہ جنوری ۱۹۸۷ء کا ذکر ہے۔ مجھے اپنا مدّعا بیان کرنے میں خاصی دشواری ہو رہی تھی۔ میاں احسان الٰہی پانچ سال سے صاحبِ فراش تھے۔ فالج کے حملے کے بعد وہ امراضِ قلب کے اسپتال میں دس بارہ دن "کوما" میں رہے۔ جب ہوش آیا تو انھیں معلوم ہوا کہ ان کا آدھا جسم مفلوج ہو چکا ہے۔ بینائی جاتی رہی۔ قوتِ گویائی بھی بری طرح متاثر ہوئی۔ حافظہ آنکھ مچولی کھیلنے لگا۔ صرف تکلیف دہ باتیں یاد رہ گئیں۔

اگر اب انھیں کوئی پہلی بار دیکھتا تو یہ باور نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی سوا چھ فٹ، دو سو دس پونڈ اور پہلوانی ڈیل ڈول والا شخص ہے جو بہتّر سال کی عمر میں صبح چار بجے ڈیڑھ گھنٹے ڈنڑ بیٹھک لگاتا، پھر ایک گھنٹے ٹینس کھیلتا اور دن میں چار پانچ میل پیدل چلتا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں دل کے پہلے شدید دورے کے بعد انھوں نے بد پرہیزی، بیٹھکوں اور بزم آرائیوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ لندن گئے تو ابن الحسن برنی کی طرح انھیں بھی کہیں کوئی زینہ نظر آجاتا تو اس پر چڑھتے ضرور تھے۔ کہتے تھے "اس سے دل قوی اور بڑھاپا پسپا ہوتا ہے۔ ساٹھ پینسٹھ برس پہلے چنیوٹ کے نواح میں کوئی درخت ایسا نہیں تھا جس پر میں نہ چڑھا ہوں۔" ڈاکٹروں نے غذا میں سخت پرہیز کی تاکید کی۔ انھوں نے چنیوٹ سے اصلی گھی اور آم کا اچار منگوانا تو چھوڑ دیا، لیکن چنیوٹی کُنّا[۱]، سندھی بریانی، برنس روڈ کی تر تراتی تافتان، کوئٹہ کے سجّی کباب، بادام کی حیدرآبادی لوزات، ملتان کے انور رٹول ـــــ مختصر یہ کہ دل کے مریض کے لیے خودکشی کے نسخے کے جملہ اجزا ـــــ نہیں چھوٹے۔ خود ہی نہیں۔ اپنے معالجوں کو بھی گھر بلا کر بڑے شوق اور اصرار سے کھلاتے۔ کہتے تھے، لذیذ غذا سے مرض کا مقابلہ

---

[۱] کُنّا: گھڑے یا مٹی کے برتن میں پکا ہوا سوندھا سالن۔ چنیوٹ کی خاص ڈش۔

* مشتاق احمد یوسفی کی نئی کتاب "آبِ گم" کا پیش لفظ

کرنے کا حوصلہ اور طاقت پیدا ہوتی ہے! وہ بدستور اپنے خلاف وضعِ طبّی معمولات پر قائم رہے۔ روزے بھی نہیں چھوڑے کہ بچپن سے رکھتے چلے آتے تھے۔ اسی طرح پنج وقتہ نماز اب بھی باقاعدگی سے قضا کرتے تھے۔ تاویل یہ پیش کرتے کہ اب شروع کر دوں تو لوگ کہیں گے، میاں صاحب ایک ہی ہارٹ اٹیک میں اٹھک بیٹھک کرنے لگے! ذیابیطس بھی ہو گئی۔ لیکن سونے سے پہلے ایک پاؤ فل کریم والی آئس کریم ضرور کھاتے۔ جتنے ذہین تھے اس سے زیادہ خود رائے ہر مسئلے پہ ——— خواہ طبّی ہی کیوں نہ ہو ——— وہ الگ اپنی رائے رکھتے تھے "آئس کریم قلب کو ٹھنڈک پہنچاتی اور بلڈ پریشر کو قابو میں رکھتی بشرطیکہ مقدار قلیل نہ ہو۔ سرگودھا یا ساہیوال اپنے سمدھیانے جاتا ہوں تو تکلف میں آئس کریم کا ناغہ ہو جاتا ہے۔ رات بھر کروٹیں بدلتا رہتا ہوں۔ جس رات آئس کریم نہ کھاؤں، اس رات مچھر بہت کاٹتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں آپ کو معلوم ہے، یورپ کی سیاحت پر گیا تھا۔ کئی دن تک بریانی نہیں ملی۔ چناں چہ ویانا میں ہرنیا کا آپریشن کرانا پڑا! آپ میرے چٹورپن اور بدپرہیزی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ غالب کو دیکھیے۔ ساری عمر ناقدری اور عسرت و تنگ دستی کا رونا روتے رہے، خصوصاً آخری دنوں میں۔ لیکن ذرا مرض الموت میں ان کی آخری غذا تو ملاحظہ فرمائیے۔ صبح کو سات بادام کا شیرہ قند کے شربت کے ساتھ۔ دوپہر کو سیر بھر گوشت کی یخنی۔ تین شامی کباب۔ چھ گھڑی رات گئے پانچ روپے بھر شراب خانہ ساز اور اسی قدر عرقِ شیر (+)۔ بھائی میرے! یہاں اللہ کا دیا سب کچھ ہے، سوائے ستم پیشہ ڈومنی کے۔ لیکن مجھے تو مرض الموت کے بغیر بھی اتنی کیلوریز میسر نہیں۔ اور ہاں، شراب کے ضمن میں بادۂ بنگالی کے بجائے خانہ ساز کی شرط توجہ طلب ہے۔ علاوہ ازیں، صرف پانچ روپے بھر شراب غالباً اس لیے پیتے تھے کہ اگر اس کی مقدار بڑھا دیتے تو پھر اتنا ہی عرقِ شیر بھی زہر مار کرنا پڑتا۔ بھائی میرے! میں تو دودھ کی آئس کریم صبر و شکر سے کھاتا ہوں۔ کبھی تولہ ماشہ کی قید نہیں لگائی۔"

ڈاکٹروں سے اکیس رہے اور مرض کی تشخیص کرانے کے بعد اکثر بایو کیمسٹری سے خود اپنا علاج کرتے۔ ایسے قوتِ ارادی کے مالک اور ایسے بقراط مریض پر ڈاکٹر کو بھی غصہ نہیں آتا، ترس اور پیار آتا ہے۔ حلقۂ یاراں میں جب وہ خوش گفتاری پر آتے تو ڈمپل ان کے رخسار ہی میں نہیں، فقروں میں بھی پڑتا تھا۔ بالآخر ان کی بدپرہیزی اور لاجواب کر دینے والی منطق کا نتیجہ فالج کی شکل میں رونما ہوا۔

میں ڈرائنگ روم اور برآمدے سے ہوتا ہوا ان کے کمرے تک پہنچا تو دیکھا کہ ان کے میوزک روم میں (جس میں نو دس لاؤڈ اسپیکر اس خوبی سے لگائے گئے تھے کہ ایک بھی نظر نہیں آتا تھا) تالا پڑا ہوا تھا۔ ان کی ذاتی لائبریری بھی، جس کی سینکڑوں کتابوں کی قیمتی جلدیں انھوں نے نظامِ دکن کے شاہی جلد ساز سے بطورِ خاص بنوائی تھیں، چار سال سے بند پڑی تھی۔ اسی لائبریری میں انھوں نے میرا تعارف نیاز فتح پوری، مولانا محمد ایوب دہلوی، محمد حسن عسکری اور سلیم احمد سے

(+) عرقِ شیر: [illegible] کا عرق جو ضعفِ معدہ [illegible] دیا جاتا تھا۔ غالب [illegible]

کرایا تھا۔ اور یہیں سے انھوں نے ایک دفعہ آدھ گھنٹے تک مجھے فون پر استاد بندو خاں کی سارنگی سنوائی تھی کہ وہ اپنے شوق اور لطف میں دوستوں کو شریک کرکے اپنی خوشی دوبالا کرنے . . . کے رمز سے واقف تھے۔

فون پر سارنگی سنوانے کا قصہ یہ ہے کہ ان کے والد مرحوم حاجی محمد یعقوب صاحب اپنے گھر میں تاش، پرائی عورتوں کے فوٹو (مراد ایکٹرسوں سے تھی) اور پاندان رکھنے کے خلاف تھے ہی، گانے کی محفل کے بھی روادار نہ تھے۔ فرماتے تھے "میاں جی! موسیقی حرام تو ہئی ہے۔ منحوس بھی ہوتی ہے۔ جس گھر میں ایک دفعہ طبلہ یا گھنگھرو بج گئے، اس گھر کے سامنے ایک نہ ایک دن ڈھولک اور قرقی کا ڈھول بجنا لازمی ہے۔ وہ گھر اجڑے ہی اجڑے۔ اسے میری وصیت جانو۔" وصیت کے احترام میں میاں احسان الٰہی اس مترنم نحوست کا اہتمام عاجز کے گھر کرواتے تھے۔ لیکن الحمدللہ! مرحوم کی پیش گوئی کے مطابق ہمارے گھر کے سامنے کبھی قرقی کا ڈھول نہیں بجا۔ کسی بھی گھر کے سامنے نہیں بجا، جب کہ اس عرصے میں ہم نے (کرائے کے) نو گھر تبدیل کیے۔ میاں احسان الٰہی اپنے گھر میں موسیقی صرف تین صورتوں میں جائز و مباح سمجھتے تھے۔ اول گانے والی زندہ حالت میں نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے گانے کا صرف ریکارڈ یا ٹیپ ہو۔ دوم، ان کے گھر میں گانے والا بالکل تنہا گائے۔ یعنی نہ طبلے کی سنگت ہو اور نہ ان کے علاوہ کوئی اور سننے والا موجود ہو۔ نیز یہ اندیشہ نہ ہو کہ گانے کے بول سمجھ میں آجائیں۔ یعنی راگنی پکی ہو۔ سوم۔ گانے والے کو داد کے سوا کچھ اور نہ دینا پڑے۔ مطلب یہ کہ گانے والا فی سبیل اللہ گلوکاری کرے۔ مرزا کہتے ہیں کہ ان پاکیزہ شرائط و قیود کے ساتھ جو شے ظہور میں آئے گی، وہ والدِ مرحوم کی وصیت تو ہو سکتی ہے، موسیقی ہرگز نہیں۔

میاں احسان الٰہی اس وقت کمرے کے وسط میں ایک اونچے اسپتالی بیڈ پر نئی ریشمی رضائی اوڑھے نیم غنودگی کے عالم میں لیٹے تھے۔ دائیں دیوار پر عالمِ جوانی کی دو تصویریں ٹنگی تھیں۔ ایک میں وہ مولانا حسرت موہانی کے ساتھ کھڑے تھے۔ دوسری میں وہ بندوق کا بٹ (کندہ) مردہ نیل گائے کی تھوتھنی پر رکھے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ دونوں تصویروں کے نیچے ان کی ویل چیئر (معذوروں کی کرسی رواں) رکھی تھی۔ ان کے سرہانے ایک اونچے اسٹول پر وہ قیمتی دوائیں سجی تھیں جن کے ناکارہ و بے اثر ہونے کا وہ نیم زندہ اشتہار تھے۔ اس وقت تو ان کے حافظے کا قائل ہونا پڑا۔ اس لیے کہ انھوں نے تواضع کے لیے فریسکو سے میری پسندیدہ گرم جلیبیاں اور ناظم آباد کے ملا حلوائی کے گلاب جامن منگوائے تھے۔ طرف دیوار سے لگے ساگوان کے کنگ سائز بیڈ پر تکیے نہیں تھے۔ ان کی بیگم کے انتقال کو دو مہینے ہوئے تھے۔ دروازے کے سامنے والی کھڑکی کے کارنس پر ایک چھوٹا سا کیسٹ پلیئر اور ان مشاعروں کے ٹیپ رکھے تھے جو گزشتہ پچیس میں اس لان پر ہوئے تھے جس کے لیے گھاس ڈھاکے سے، گلاب اور پام کے درخت پنڈی اور سری لنکا سے منگوائے تھے۔ فالج کے پیشِ نظر پنکھا، ایئرکنڈیشنر، کھڑکیاں، بری خبروں کی اطلاع، بچوں کا داخلہ — سب بند تھے۔ مجھے ایسا لگتا کہ ان کی سماعت بھی متاثر ہو چکی ہے۔ میں نے ذرا اونچی آواز میں دہرایا:

"ہمارے یارِ جانی مسعود حسین مر گئے۔"

"ہاں، مجھے کسی نے بتایا تھا۔" انھوں نے بڑی لکنت سے کچھ کہا جس کا مطلب میں نے یہی سمجھا۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتے۔

میری بات پروہ اپنی توجّہ بیس پچیس سیکنڈ سے زیادہ فوکس نہیں کر پا رہے تھے اور حاضر دماغی کے اس مختصر سے کوندے میں اپنا مدّعا بیان کرنے میں مجھے خاصی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔

وہ بات یہ تھی کہ اٹھائیس سال کراچی میں رہنے کے بعد میں نے جنوری ۱۹۷۹ء میں لندن جانے کے لیے رختِ سفر باندھا تو پہلے اپنے دونوں دوستوں (جن کے نام رسمی خانہ پری کی خاطر میاں احسان الٰہی اور منور حسین فرض کر لیجیے۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ دوست کو کسی بھی نام سے پکاریں، گلوں ہی کی خوشبو آئے گی) کی باتیں اور یادیں انہیں کی زبانی ٹیپ پر محفوظ کیں۔ مفصّل نوٹ بھی لیے ان یادداشتوں پر مبنی و مشتمل دس خاکے اور مضامین لندن میں بڑی تیز قلمی سے لکھ ڈالے اور حسبِ عادت پال میں لگا دیئے کہ ڈیڑھ دو سال بعد نکال کر دیکھیں گے کہ کچھ دم ہے بھی یا نرے سوختی ہیں۔ میاں احسان الٰہی اور منور حسین سے دوبارہ ان کی اشاعت کی اجازت چاہی جو انھوں نے بخوشی اور غیر مشروط طور پر دے دی۔

میں نے صاف کرنے کے لیے مسودہ نکال کر دیکھا تو ایک عجیب کیفیت سے دوچار ہوا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے یہ سب کچھ کسی اور نے لکھا ہے۔ یہ بھی بالکل عیاں تھا کہ یہ دو کتابوں کا مواد ہے۔ میں ایک مسودے سے دو کتابیں برآمد کرنے کا جتن کر رہا تھا کہ منور حسین کا ایک مختصر سا خط موصول ہوا، جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ مجھے تو ذاتی طور پر کوئی تامّل یا اعتراض نہیں۔ لیکن ممکن ہے اس کی اشاعت میرے اعزّہ و اقربا کو اچھی نہ لگے۔ لہٰذا ان باتوں اور یادوں کو میرے نام سے منسوب نہ کیا جائے۔ قبل اس کے کہ میں کراچی جا کر ان سے اس موضوع پر مفصّل گفتگو کروں۔ دو تین مہینے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

میری روداد سن کر میاں احسان الٰہی نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا کہ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ آپ جیسا مناسب سمجھیں کریں۔ پھر کہنے لگے، بہت دن ہو گئے۔ اب پاکستان آ بھی جایئے۔ ہمارے بعد آئے تو کیا آئے۔ بینائی بالکل جاتی رہی۔ کبھی کبھی مجھے آپ کا چہرہ یاد نہیں آتا۔ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ سینتیس سال میں میں نے انہیں دوسری بار روتے دیکھا۔

اب میں عجیب پس و پیش میں مبتلا ہو گیا۔ دونوں کی یادیں اور باتیں ایک دوسرے میں کچھ اس طرح گتھی اور گندھی ہوئی تھیں کہ ان جڑواں سیامی تحریروں کو بے ضرر عمل جرّاحی سے علاحدہ کرنا میرے بس کا کام نہ تھا۔ اور نہ یہ ممکن تھا کہ ایک کے نام، مقام اور شناختی کوائف کا تو انکشاف کر دوں اور دوسرے کی تلبیس لباس کر کے افسانوی لبادہ پہنا دوں۔ ان حالات میں میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ سارے مسودہ کو ایک قلم مسترد کر کے نہ صرف نام اور مقام بدل دوں بلکہ اوّل تا آخر سب کچھ fictionalise کر دوں، جس کا ان دونوں سے کوئی تعلق نہ ہو اور میں نے یہی کیا۔

چناں چہ "اَبرِ گم" کے پانچ کہانی نما خاکوں میں آپ جو کچھ ملاحظہ فرمائیں گے، اس کا ان دوستوں کے واقعاتِ زندگی یا ان کے احباب، بزرگوں اور لواحقین سے قطعاً کوئی تعلق یا مماثلت نہیں ہے۔ مودبانہ گزارش ہے کہ فکشن کو فکشن ہی سمجھ کر پڑھا جائے۔ اگر کوئی واقعہ سچ یا کردار "اصلی" نظر آئے تو اسے محض سوء اتفاق تصور فرمائیے۔ تمام تر واقعات و کردار فرضی ہیں۔ البتہ جن مشاہیر کا ذکر جہاں کہیں "بہ بدی" یا برینائے تنقیص آیا ہے، اسے جھوٹ نہ سمجھا جائے۔ اتنا ضرور ہے کہ میں نے حتی الامکان منور حسین اور میاں احسان الٰہی کے مخصوص پیرایۂ بیان اور اندازِ گفتگو کی لٹک ——— اور کہیں کہیں آپس کی نوک جھونک کے دوران شرارِ جستہ و فقرہ برجستہ ——— کو جوں کا توں برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

یوں بھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ یہ فکشن ہے یا سچی واردات یا ان دونوں کا ملغوبہ جسے آج کل FACT + FIC tion) Faction) کہا جاتا ہے۔ ایک چینی دانا کا قول ہے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ بلی سیاہ ہے یا سفید۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ چوہے پکڑ سکتی ہے یا نہیں۔

اس پس منظر کا ذکر و وضاحت مجھ پر اس لیے بھی واجب ہے کہ اس کتاب کا اصل محور، محرک اور باعثِ تصنیف ہر دو یارانِ رفتہ کی صحبت اور مطائبات ہیں جو میری زندگی کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں وہ صحبتِ یاراں میں ہر لمحے کو ایک جشن سمجھ کر گزارتے تھے۔ اس قرض اور نعمتِ عظمٰی کا اخفا بددیانتی ہوگی۔

جس اکھڑی اکھڑی گفتگو کا اوپر ذکر آیا ہے، اس کے کچھ ہی دن بعد میاں احسان الٰہی بھی اپنے رب سے جا ملے اور دیس سونا کر گئے اور اب میں ایک بین الاقوامی مالیاتی ادارے کے زیرِ تربیت گیارہ سال لندن میں گزارنے کے بعد وطن کو مراجعت کی تیاری کر رہا ہوں۔ ان کا گلہ اور خدشہ صحیح ثابت ہوا۔

پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو ذاتی، ادبی، پیشہ ورانہ، سیاسی اور قومی اعتبار سے اس عشرۂ رائیگاں میں زیاں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ سب کچھ کھو کر بھی کچھ نہ پایا۔ البتہ ملکوں ملکوں گھومتے اور وطن سے دور رہنے کا ایک بیّن فائدہ یہ دیکھا کہ وطن اور اہلِ وطن سے محبت نہ صرف بڑھ جاتی ہے بلکہ بے طلب اور غیر مشروط بھی ہو جاتی ہے۔

سفر کردم بہر شہری دویدم
بہ لطفِ حسنِ تو کس را ندیدم [1]

نقصان یہ کہ ہر خبر اور افواہ جو ادھر سے آتی ہے دل دہلانے اور خون جلانے والی ہوتی ہے۔ پاکستان کی افواہوں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ سچ نکلتی ہیں۔ یہ عمل دس گیارہ سال تک جاری رہے تو سائیں آدمی کی کیفیت سیسموگراف کی سی ہو جاتی ہے، جس کا کام ہی زلزلوں کے جھٹکے ریکارڈ کرنا اور ہمہ وقت لرزتے رہنا ہے۔ دور افسوس یہ ہوتا ہے جیسے

---

[1] مطلب یہ کہ میں ملکوں ملکوں، شہروں شہروں گھوما۔ لیکن تیرے حسن کا، اور حسن کا نقصان جو کہ میں نے کہیں نہیں دیکھا۔

ہماری سیاست کا قوام ہی آتش فشاں لاوے سے اٹھا ہے۔

دن رات ہے اک زلزلہ تعمیر میں میری

لیڈر خود غرض، علما مصلحت بین، عوام خوف زدہ اور راضی برضائے حاکم، دانشور خوشامدی اور ادارے کھوکھلے ہو جائیں (رہے ہم جیسے لوگ جو تجارت سے وابستہ ہیں تو ع کام اس فرقہ تجار سے نکلا نہ کوئی) تو جمہوریت آہستہ آہستہ آمریت کو راہ دیتی چلی جاتی ہے۔ پھر کوئی طالع آزما آمر ملک کو غضب ناک نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ تیسری دنیا کے کسی بھی ملک کے حالات پر نظر ڈالیے۔ ڈکٹیٹر خود نہیں آتا۔ لایا اور بلایا جاتا ہے۔ اور جب آ جاتا ہے تو قیامت اس کے ہمرکاب آتی ہے۔ پھر وہ روایتی اونٹ کی طرح بدوؤں کو خیمے سے نکال باہر کرتا ہے۔ باہر نکالے جانے کے بعد کھسیانے بدو ایک دوسرے کا منہ نوچنے لگتے ہیں۔ پھر ایک نایاب بلکہ عنقا شے کی جستجو میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے سے زیادہ جبی اور تابع دار اونٹ تلاش کر کے اسے دعوت دینے کے منصوبے بنانے لگتے ہیں تا کہ اس کی پیٹھ پر بیٹھ کر اپنے خیمے میں رہ سکیں اور آقائے سابق الانعام یعنی پچھلے اونٹ پر تبرا بھیج سکیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ڈکٹیٹر سے زیادہ مخلص اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس معنی میں کہ وہ خلوصِ دل سے یہ سمجھتا ہے کہ ملک و ملت سے جس طرح ٹوٹ کر وہ محبت کرتا ہے اور جیسی اور جتنی خدمت وہ تن تنہا کر سکتا ہے، وہ پوری قوم کے بوتے کا کام نہیں۔ وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اس کے جگر میں سارے جہاں کا درد ہی نہیں درماں بھی ہے۔ نیز اسی کی ذات واحد خلاصۂ کائنات اور بلا شرکتِ غیرے سرچشمۂ ہدایت ہے۔ لہٰذا اس کا ہر فرمان بمنزلہ صحیفۂ سماوی ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ فرامیں خیال میں

اس میں شک نہیں کہ اس کے پاس ان لامسائل (Non - issues) اور فرضی قضیوں کا نہایت اطمینان بخش حل ہوتا ہے جو وہ خود اپنی جودتِ طبع سے کھڑے کرتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اخباری معمے (کراس ورڈ) بنانے والوں کی طرح پہلے وہ بہت سے حل اکٹھے کر لیتا ہے اور پھر اپنے ذہنِ معمہ ساز کی مدد سے ان سے آڑے ترچھے مسائل گھڑتا چلا جاتا ہے۔

راۓ کی قطعیت اور اقتدار کی مطلقیت کا لازمی شاخسانہ یہ کہ وہ بندگانِ خدا سے اس طرح خطاب کرتا ہے جیسے وہ سب پتھر کے عہد کے وحشی ہوں اور وہ انھیں ظلمت سے نکال کر اپنے دورِ نامخدائی میں لانے اور بن مانس سے آدمی اور آدمی سے انسان بنانے پر مامور من اللہ ہے۔ وہ ہمہ وقت اپنی شیشہ پلائی ہوئی دیوار سے خطاب کرتا رہتا ہے۔ مگر قبۂ آدم حروف میں اس پر لکھا ہوا نوشتہ اسے نظر نہیں آتا۔ مطلق العنانیت کی جڑیں دراصل مطلق الالٰہانیت سے پیوست ہوتی ہیں۔ چناں چہ اوامر و نواہی کا انحصار اس کی جنبشِ ابرو پر ہوتا ہے۔ انصاف کی خود ساختہ ترازو کے اونچے نیچے پلڑوں کو اپنی تلوار کا پاسنگ، کبھی اس پلڑے اور کبھی اس پلڑے میں ڈال کر برابر کر دیتا ہے۔

ہر کہ آمد عدالتِ نو ساخت

ایسی سرکار دولت مدار کو مابہ دولت مدار کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ نقل کفر، کفر نہ باشد، مرزا عبدالودود بیگ تو (جو ابتدا میں ہر حکومت کی زور شور سے حمایت اور آخر میں اتنی ہی شد ومد سے مخالفت کرتے ہیں) ایک زمانے میں اپنے کان پکڑتے ہوئے یہاں تک کہتے تھے کہ اللہ معاف کرے، میں تو جب اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم کہتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا جیسے رجیم سے یہی somnopeder مراد ہے! نعوذ باللہ۔ ثم نعوذ باللہ۔

پھر جیسے جیسے امورِ سلطنت پر دفورِ تمکنت اور ہوسِ حکمرانی غالب آتی ہے۔ آمر اپنے ذاتی مخالفین کو خدا کا منکر اور اپنے چاکر ٹولے کے نکتہ چینیوں کو وطن کا غدار اور دین کا منحرف قرار دیتا ہے اور جو اس کے دستِ آہن پوش پر بیعت میں عجلت سے کام نہیں لیتے، ان پر اللہ کی زمین کا رزق، اس کی چھاؤں اور چاندنی حرام کر دینے کی بشارت دیتا ہے۔ ادیبوں اور تلامیذ الرحمٰن کو شاہی مطبخ کی بریانی کھلا کر یہ بتلاتا ہے کہ لکھنے والے کے کیا فرائض ہیں اور نمک حرامی کسے کہتے ہیں۔ وہ یہ جانتا ہے کہ ادب اور صحافت میں ضمیر فروشی سے بھی زیادہ مفید مطلب ایک اور قبیلہ ہوتا ہے جسے مافی الضمیر فروش کہنا چاہیے۔ اس سے وہ تصدیق کراتا ہے کہ میرے عہد میں اظہار و ابلاغ پر کوئی قدغن نہیں۔ مطلب یہ کہ جس کا جی چاہے۔ جس زمین اور جس بحر میں قصیدہ کہے۔ قطعاً کوئی روک نہیں بلکہ وزن، بحر اور عقل سے خارج ہو تب بھی ہم خارج نہیں کریں گے۔ بامتثالِ امر، قصائدِ نو کے انبار لگ جاتے ہیں۔

روز اک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ

جیسے اور دور گزر جاتے ہیں، یہ دور بھی گزر گیا۔ لیکن کچھ لوگ ایسے خوف زدہ اور چڑھتے سورج کی پرستش کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ سورج ڈوبنے کے بعد بھی سجدے میں پڑے رہے کہ نہ جانے کب اور کدھر سے نکل آئے۔ کبھی کسی نے کوئی بھر کے زبردستی کھڑا کرنا چاہا بھی تو معلوم ہوا کہ کھڑے نہیں ہو سکتے۔ جوڑ بند سب اکڑ کر رہ گئے ہیں اور اب وہ اپنے تمام معمولات اور فرائض منصبی و غیر منصبی حالتِ سجود ہی میں ادا کرنے کے عادی و خوگر ہو گئے ہیں۔ یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا۔

ارجن ٹائن ہو یا الجزائر، ترکی ہو یا بنگلہ دیش یا عراق و مصر و شام، اس دور میں تیسری دنیا کے تقریباً ہر ملک میں یہی ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے —— سیٹ، مکالمے اور ماسک وقتی اور مقامی تبدیلیوں کے ساتھ۔

متذکرہ صدر دس تحریریں، جو اپنی ساخت، ترکیب اور دانستہ و آراستہ بے ترتیبی کے اعتبار سے، مونتاژ اور پھیلاؤ کے لحاظ سے ناول سے زیادہ قریب ہیں، اسی دورِ ضیاع کا ملخاب ہیں۔ ان میں سے صرف پانچ اس کتاب میں شامل ہیں۔ کہتے ہیں کسی نے ایمنول جوزف سائز سے پوچھا کہ آپ نے انقلابِ فرانس میں کون سا شاندار کارنامہ انجام دیا تو اس نے جو سہ لفظی جواب دیا وہ تاریخ کا حصہ بن گیا "J'ai Vécu" (Survived) یعنی میں اپنے آپ کو بچا لے گیا لیکن مجھے معلوم نہیں میں خود کو اپنے آپ سے بھی بچا پایا یا نہیں۔ وطن اور احباب سے گیارہ سال دوری اور مہجوری کا [illegible] طبیعت پر [illegible] ہوتا ہے، اس کی پرچھائیاں آپ کو جہاں تہاں ان تحریروں میں نظر آئیں گی۔ یوں لندن بہت دل چسپ

جگہ ہے۔ اور اس کے علاوہ بظاہر کوئی اور خرابی نظر نہیں آتی کہ غلط جگہ واقع ہوا ہے۔ تھوڑی سی بے آرامی ضرور ہے۔ مثلاً مطلع ہمہ وقت ابر آلود رہتا ہے۔ صبح اور شام میں تمیز نہیں ہوتی۔ اسی لیے لوگ A.M. اور P.M بتانے والے ڈائل کی گھڑیاں پہنتے ہیں۔ موسم ایسا جیسے کسی کے دل میں بغض بھرا ہو۔ گھر اتنے چھوٹے اور گرم کہ محسوس ہوتا ہے کہ کمرہ اوڑھے پڑے ہیں۔ پھر بقول ملک الشعرائے انگلستان لارکن یہ کیسی مجبوری کہ

Nowhere to go but [illegible]

روشن پہلو یہ کہ شائستگی، رواداری اور بردباری میں انگریزوں کا جواب نہیں۔ مذہب، سیاست اور سیکس پر کسی اور کیسی بھی محفل میں گفتگو کرنا خلافِ تہذیب اور انتہائی معیوب سمجھتے ہیں ـــــ سوائے پب (شراب خانہ) اور بار کے! گمبھیر اور نازک مسائل پر صرف نشے کی حالت میں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ بے حد خوش اطوار اور ہمدرد۔ کار والے اتنے خوش اخلاق کہ اکلوتے پیدل چلنے والے کو راستہ دینے کے لیے اپنی اور دوسروں کی راہ کھوٹی کرکے سارا ٹریفک روک دیتے ہیں۔ مرزا [illegible] سا کے جذباتی ٹھہرے، سرِ راہے اپنی اس توقیر سے اتنے متاثر ہوتے ہیں کہ بے تحاشا جی چاہتا ہے زیبرا لائن پر ہی کھڑے ہو کر پہلے سب کو جھک جھک کر فرداً فرداً کورنش بجا لائیں، پھر سڑک کراس کریں۔ مختصر یہ کہ کنجِ قفس میں اچھی گزرتی ہے:

قفس میں کوئی اذیت نہیں مجھے صیاد
بس ایک حشر بپا بال و پر میں رہتا ہے

کوئی لکھنے والا اپنے لوگوں، ہم عصر ادیبوں، ملکی ماحول و مسائل، لوک روایت اور کلچر سے کٹ کر کبھی کوئی زندہ اور تجربے کی دہکتی کٹھالی سے نکلا ہوا فن پارہ تخلیق نہیں کر سکتا۔ برطانیہ میں رہنے والے ایشیائیوں میں سو میں سے ننانوے ان خوب صورت درختوں کے نام نہیں بتا سکتے جو ان کے مکانوں کے سامنے نہ جانے کب سے کھڑے ہیں۔ (رہا سواں آدمی، سو اس نے درختوں کو کبھی نوٹس ہی نہیں کیا) نہ ان رنگ برنگے پرندوں کے نام جو منہ اندھیرے اور شام ڈھلے چہچہاتے ہیں۔ اور [illegible] اس گرل فرینڈ کے بالوں کا شیڈ بتا سکتے ہیں جس کے ساتھ رات بھر بڑی روانی سے غلط انگریزی بولی ـــــ گولڈن آبرن، کاپر آبرن، ایش بلانڈ، چیسٹ نٹ براؤن، ہیزل براؤن، برگنڈی براؤن یا ـــــ کچھ معلوم نہیں ان کی خیرہ نگاہیں تو، جو کچھ بھی ہو خدا کی قسم لاجواب ہونٹ کے فلمی مقام پر آ کر ٹھہر جاتی ہیں۔ غیر ملک کی زندگی اور معاشرے کا مشاہدہ اور اس کے مسائل کی تفہیم اور گرفت اتنی سرسری اور سطحی ہوتی ہے کہ کبھی میوزک، آرٹ گیلری، تھیئٹر، نائٹ کلب، سوہو کی شب تاب گلیوں کے طواف، ایسٹ اینڈ میں ذلت آمیز "مگنگ" یا جیبرنگ کراس پہ گاہک کی منتظر شب زادیوں کی عنایاتِ عاجلہ سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ بہت تیر مارا تو برطانوی شہریت حاصل کرکے وہ رہی سہی عزت بھی گنوا دی جو ٹورسٹ یا مہمان مزدور کی حیثیت سے حاصل تھی یا بیک وقت برٹش پاسپورٹ اور "اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام" لینے کی غرض سے کسی انگریز عورت سے شادی

کرلی اور اپنے حسابوں سارے انگلستان کی ازار بندی رشتے سے مشکیں کس دیں۔ نک سک اور نسلی اعتبار سے انگریزوں کا "اسٹاک" بہت اچھا ہے۔ قد، کاٹھ، رنگ روپ اور تیکھے ترشے نقوش کے لحاظ سے ان کا شمار خوب صورتوں میں ہوتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ بدصورت انگریز عورت [illegible] (نایاب) ہے۔ بڑی مشکل سے نظر آتی ہے یعنی ہزار میں ایک۔ پاکستانی اور ہندوستانی اسی عورت سے شادی کرتا ہے۔ لیکن انگریز عورت کو حبالۂ نکاح میں لانے سے تو انگلستان فتح ہوتا ہے، نہ سمجھ میں آتا ہے بلکہ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، خود عورت بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ چناں چہ جلاوطن ادیب (خواہ اس نے بہتر تنخواہ اور بدتر سلوک کی خاطر خود کو ملک بدر کیا ہو یا ذاتی اور سیاسی مجبوری کے تحت آسودہ حال جلاوطنی اختیار کی) پھر پھر کر اسی چھوڑی ہوئی منزل اور گزری ہوئی زندگی کی تصویر کشی کرتا ہے، جسے مرورِ ایام، غربت اور فاصلے نے اب آؤٹ آف فوکس کر کے گلیمرائز بھی کر دیا ہے۔ جلاوطن وائٹ روسی ادیب اس کی بہترین مثال ہے۔ لندن میں مقیم یا آباد اردو والوں کا بھی کچھ ایسا ہی احوال ہوا۔

کوئی ان کی بزمِ جمال سے کب اٹھا خوشی سے کہاں اٹھا
جو کبھی اٹھا بھی اٹھائے سے تو اسی طرف نگراں اٹھا

لندن میں اس راندۂ زرگاہ پر کیا گزری اور کیسے کیسے باب ہائے خرد افروز وا ہوئے، یہ ایک الگ داستان ہے جس میں کچھ ایسے پردہ نشینوں کے نام آتے ہیں جو، صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔ اسے ان شاء اللہ جلد ایک علاحدہ کتاب کی شکل میں پیش کروں گا۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ "زرگزشت" کی اشاعت کے بعد ارادہ تھا کہ کوچۂ سود خوراں میں اپنی خواری کی داستان آخری باب میں جہاں ختم ہوئی ہے وہیں سے دوسری جلد کا آغاز کروں گا لیکن درمیان میں لندن، ایک اور بینک، ریڑھ کی ہڈی کی تکلیف اور "آبِ گم" آپڑے۔ کچھ اندیشہ ہائے دور دراز بھی ستانے لگے۔ مثلاً یہی کہ میرے ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز یہ نہ سمجھیں کہ بینکنگ کیریئر تو محض کیموفلاژ اور بہانہ تھا۔ دراصل یکم جنوری ۱۹۵۰ء یعنی ملازمت کے روزِ اول ہی سے میری نیت میں فتور تھا۔ محض مزاح نگاری اور خودنوشت کے لیے سوانح اکٹھے کرنے کی غرض سے فقیر اس حرام پیسے سے وابستہ ہوا (وہ بھی کیا زمانہ تھا جب حرام پیسے کی صرف ایک ہی شکل ہوا کرتی تھی — سود!) دوسری حوصلہ شکن الجھن جو "زرگزشت" حصۂ دوم کی تصنیف میں مانع ہوئی، یہ تھی کہ یہ اردو فکشن کا سنہری دور ہے۔ آج کل اردو میں بہترین فکشن لکھی جا رہی ہے — خودنوشت اور سفرناموں کی شکل میں! افسانے اور ناول ان کی گرد کو نہیں پہنچتے۔ افسوس، میرے یہاں سوانح کا اتنا [illegible] تا دمِ تحریر زندگی کا سب سے اہم واقعہ میری پیدائش ہے (بچپن کا سب سے زیادہ قابلِ ذکر واقعہ یہ تھا کہ بڑا ہو گیا) اور غالباً آپ بھی مجھ سے متفق ہوں گے کہ اس پر میں کوئی تین ایکٹ کا سنسنی خیز ڈراما نہیں لکھ سکتا۔ تیسرا سبب خامۂ خودبین و خود آرا کو روکے رکھنے کا یہ کہ اس اثنا میں لارڈ [illegible] کے تاثرات نظر سے گزرے۔ وہ ٹرینٹی کالج، آکسفورڈ کا پریزیڈنٹ اور بورڈ آف برٹش لائبریری کا چیئرمین ہے۔ [illegible] ادبی حلقوں میں عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا

اس کے ذاتی کتب خانے میں بیس ہزار سے زائد کتابیں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ میں خودنوشت سوانح عمری کو سوانح عمری کے ساتھ کبھی نہیں رکھتا۔ مزاح کی الماری میں رکھتا ہوں! عاجز اس کی ذہانت پر ہفتوں عش عش کرتا رہا کہ اس کی خودنوشت سوانح عمری زرگزشت پڑھے بغیر وہ زیرک اس نتیجے پر کیسے پہنچ گیا۔ ابھی اگلی ظرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں۔

اس مجموعے کے بیشتر کردار ماضی پرست، ماضی زدہ اور مردم گزیدہ ہیں۔ ان کا اصل مرض ناسٹلجیا ہے زمانی اور مکانی، انفرادی اور اجتماعی۔ جب انسان کو ماضی حال سے زیادہ پرکشش نظر آنے لگے اور مستقبل نظر آنا بند ہو جائے تو باور کرنا چاہیے کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ بڑھاپے کا جوانی لیوا حملہ کسی بھی عمر میں —— بالخصوص جوانی میں —— ہو سکتا ہے۔ اگر افیم یا ہیروئن دستیاب نہ ہو تو پھر اسے یادِ ماضی اور فینٹسی میں، جو تھکے ہاروں کی آخری پناہ گاہ ہے، ایک گونہ سرخوشی محسوس ہوتی ہے۔ جیسے کچھ حوصلہ مند اور جفاکش لوگ اپنے زورِ بازو سے اپنا مستقبل بناتے ہیں، اسی طرح وہ زورِ تخیل سے اپنا ماضی آپ بنا لیتا ہے۔ یادوں کا سرشور دریا دِ امروز میں بہتے بہتے خواب سراب کے آبِ گم میں اتر جاتا ہے۔ پھر اندر ہی اندر کہیں ابھرتی، گم ہوتی سوت ندیوں اور کہیں کاریزوں کی صورت، خیال بگولوں میں بوئی ہوئی کھیتی کو سینچتا رہتا ہے۔ اور کہیں اچانک کسی چٹان سے چشمۂ آبِ زندگانی بن کے پھوٹ نکلتا ہے۔

کبھی کبھی قومیں بھی اپنے اوپر ماضی کو مسلّط کر لیتی ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو ایشیائی ڈرامے کا اصل ولن ماضی ہے جو قوم جتنی پسماندہ اور پست حوصلہ ہو، اس کو اپنا ماضی، معکوس اقلیدسی تناسب (inverse geometrical ratio) میں اتنا ہی زیادہ درخشاں اور دہرائے جانے کے لائق نظر آتا ہے۔ ہر آزمائش اور ادبار و ابتلا کی گھڑی میں وہ اپنے ماضی کی جانب راجع ہوتی ہے اور ماضی بھی وہ نہیں کہ جو واقعتاً تھا، بلکہ وہ جو اس نے اپنی خواہش اور پسند کے مطابق از سرِ نو گھڑ کر آراستہ پیراستہ کیا ہے —— ماضی تمنائی۔ اس یاستان طرازی کے پس منظر میں مجروح انا کا طاؤسی رقص دیدنی ہوتا ہے کہ مور فقط اپنا ناچ ہی نہیں، اپنا جنگل بھی خود ہی پیدا کرتا ہے ناچتے ناچتے ایک طلسماتی لمحہ ایسا آتا ہے کہ سارا جنگل ناچنے لگتا ہے اور مور خاموش کھڑا دیکھتا رہ جاتا ہے۔

ناسٹلجیا اسی لمحے کی داستان ہے

شکست خوردہ انا اپنے لیے کہاں کہاں اور کیسی کیسی پناہیں تراشتی ہے، یہ اپنے اپنے ذوق، ظرف، تاب، ہمت اور طاقتِ فرار پر منحصر ہے —— تصوّف، تفلسف، مراقبہ، مزاحِ خراسیکس، ہیروئن، ویلیم، ماضی تمنائی، فینٹسی (خوابِ نیم روز) —— جس کو جو نشہ راس آ جائے۔ آرنلڈ نے ہار جانے والے مگر ہار نہ ماننے والے، دھیان دُھن میں لت پت مشرق کی ہار سہار کے بارے میں لکھا تھا:

The East bow'd low before the blast
In patient deep disdain

She let the legions thunder past
And plunged in thought again

اور اس انجذ و مراقبہ میں صدیاں بیت جاتی ہیں - سب سے زیادہ خواب آور اور گہرا نشہ جو انسان کو حاضر و موجود سے بے نیاز کر دیتا ہے، خود اپنے لہو میں کسی خواب یا خیال کے فشار و آمیزش سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ بے خودی میسر آجائے تو ہر عیب گوارا، سب کچھ پذیرا۔

ہر ازا شفتگی مجموعہ یک خواب ہو جائے

صاحبِ مراۃ الخیال سے روایت ہے کہ جب کفر و بد ہنگی کے الزام میں سرمد کو پابجولاں شہادت گاہ لے جایا گیا تو وہ تیغ بکف جلاد کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ اور گویا ہوا "فدائے تو شوم! بیا بیا کہ تو بہر صورتے می آئی من ترا خوب می شناسم" (۱) پھر یہ شعر پڑھا اور سر تلوار کے نیچے رکھ کر ابدی نیند سو گیا۔

شورے شد و از خوابِ عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شبِ فتنہ، غنودیم (۲)

قدیم زمانے میں چین میں دستور تھا کہ جس شخص کا مذاق اڑانا مقصود ہوتا، اس کی ناک پر سفیدی پوت دیتے تھے۔ پھر وہ دکھیا کتنی ہی گمبھیر بات کہتا، کلاؤن ہی لگتا تھا۔ کم و بیش یہی حشر مزاح نگار کا ہوتا ہے۔ وہ اپنی فولس کیپ (۳) اتار کر پھینک بھی دے تو لوگ اسے جھاڑ پونچھ کر دوبارہ پہنا دیتے ہیں۔ مجھے یہ تو علم نہیں کہ کوچۂ سود خواراں میں سر پہ دستار رہی یا نہیں تاہم آپ اس کتاب کا موضوع مزاج اور مغالقہ مختلف پائیں گے۔ موضوع اور تجربہ خود اپنا پیرایہ اور لہجہ متعین کرتے چلے جاتے ہیں۔ اقبال خدا کے حضور مسلمانوں کا شکوہ اپنے استاد فصیح الملک داغ دہلوی کی نخرے چوچلے کرتی زبان میں نہیں لکھ سکتے تھے۔ رسوا کی امراؤ جان ادا اور طوائفوں سے متعلق منٹو کے افسانوں کا ترجمہ اگر مولانا ابوالکلام آزاد کی جناتی زبان (۴) میں کر کے انگریں (طوائفوں کو) بالجبر سنایا جائے تو مجھے یقین ہے کہ ایک ہی صفحہ سن کر کان پکڑ لیں اور اپنے دھندے سے تائب ہو جائیں۔ وہ تو وہ، خود ہم اپنے طرز نگارش و معاش سے توبہ کر لیں کہ آج وہ، کل ہماری باری ہے۔ بہر کیف، اس بار موضوع، مواد اور مشاہدات سب قدرے مختلف تھے۔ سو وہی لکھا جو دیکھا۔ قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید۔

قصہ گو قلندر کو اپنی عیاری یا راست گفتاری کا کتنا ہی زعم ہو، اور اس نے اپنا سر کتنا ہی باریک کیوں نہ

---

(۱) مطلب یہ کہ میں تجھ پر قربان جاؤں۔ تو آ اور جلد آ کہ تو جس بھیس میں بھی آئے میں تجھے خوب پہچانتا ہوں۔
(۲) ایک شور پیدا ہوا اور ہم نے خوابِ عدم سے آنکھ کھولی۔ دیکھا کہ شبِ فتنہ ابھی باقی ہے تو ہم پھر سو گئے۔
(۳) فولس کیپ: کلاؤن یا مسخرے کی ٹوپی۔
(۴) اس کا ایک نمونہ "حویلی" کے باب سوم میں ملاحظہ فرمائیے۔

ترشوار لکھا ہو، بافندگانِ حرف و حکایت کی پرانی عادت ہے کہ کہانی کا تانا بانا بنتے بنتے اچانک اس کا رنگ روغ اور ذائقہ بدل دیتے ہیں۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کہانی کہتے کہتے خود کہانی کہنے والے کچھ ہو جاتا ہے۔ وہ پھر وہ نہیں رہتا کہ جو تھا سو کچھ ایسی ہی واردات اس نامہ سیاہ راقم السطور کے ساتھ ہوئی۔ وَاَنَّہٗ ھُوَ اَضْحَکَ وَاَبْکٰی(۵)

چنگ را گیرید از دستم کہ کار از دست رفت
نغمہ ام خوں گشت و از رگہائے ساز آید بروں (۶)

بحمد اللہ! میں اپنی طبعی اور ادبی عمر کی جس منزل میں ہوں وہاں انسان تحسین اور تنقیص دونوں سے اس درجہ مستغنی ہو جاتا ہے کہ ناکردہ خطاؤں تک کا اعتراف کرنے میں حجاب محسوس نہیں کرتا۔ چناں چہ اب مجھے "کسے کہ خنداں نہ شد از قبیلۂ ما نیست" پہ اصرار کے باوجود یہ اقرار کرنے میں خجالت محسوس نہیں ہوتی کہ میں طبعاً، اصولاً اور عادتاً یاس پسند اور بہت جلد شکست مان لینے والا آدمی ہوں۔ قنوطیت غالباً مزاح نگاروں کا مقدر ہے۔ مزاح نگاری کے باوا آدم ڈین سوفٹ پر دیوانگی کے دورے پڑتے تھے اور اس کی یاس پسندی کا یہ عالم تھا کہ اپنی پیدائش کو ایک المیہ سمجھتا تھا۔ چناں چہ اپنی سالگرہ کے دن بڑے التزام سے سیاہ ماتمی لباس پہنتا اور فاقہ کرتا تھا۔ مارک ٹوین پر بھی اخیر عمر میں کلبیت طاری ہو گئی تھی۔ مرزا کہتے ہیں کہ ان مشاہیرِ محترم سے تمہاری مماثلت بس اسی حد تک ہے۔ بہر حال قبل از وقت مایوس ہو جانے میں ایک فائدہ یہ دیکھا کہ ناکامی اور صدمے کا ڈنک اور ڈر پہلے ہی نکل جاتا ہے۔ بعض نامور پہلوانوں کے گھرانوں میں یہ رواج ہے کہ ہونہار لڑکے کے بزرگ اس کے کان بچپن میں ہی توڑ دیتے ہیں، تاکہ آگے چل کر کوئی ناہنجار مخالف پہلوان توڑنے کی کوشش کرے تو ذرا تکلیف نہ ہو۔ مزاح کو میں دفاعی میکنزم سمجھتا ہوں۔ یہ تلوار نہیں، اس شخص کا زرہ بکتر ہے جو شدید زخمی ہونے کے بعد اسے پہن لیتا ہے۔ زین بدھ ازم میں ہنسی کو گیان کا زینہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن سچ پوچھیے تو اونچ نیچ کا سچا گیان اس سے پیدا ہوتا ہے جب کھمبے پر چڑھنے کے بعد کوئی نیچے سے سیڑھی ہٹا لے۔ مگر ایک کہاوت یہ بھی سنی کہ بندر پیڑ کی پھننگ پہ سے زمین پہ گر پڑے تب بھی بندر ہی رہتا ہے۔

"حویلی" کی کہانی ایک متروکہ ڈھنڈار حویلی اور اس کے مغلوب الغضب مالک کے گرد گھومتی ہے۔ "ہکل ماسٹر کا خواب" ایک دُکھی گھوڑے، حجام اور منشی سے متعلق ہے۔ "شہر دو قصہ" ایک چھوٹے سے کمرے اور اس میں پچھتر سال گزار دینے والے سنکی آدمی کی کہانی۔ "دھیرج گنج کا پہلا یادگار مشاعرہ" میں ایک قدیم قصباتی

(۵) اور یہ کہ وہی ہنساتا ہے اور (وہی) رلاتا ہے۔ قرآن مجید۔ ۲۷ قال فما خطبکم۔ النجم ۵۳

(۶) میرے ہاتھ سے ... لو میرا کام تمام ہو چکا۔ میرا نغمہ خون ہو کر ساز کے تاروں سے بہہ نکلا ہے۔

اسکول اُور اس کے ایک ٹیچر اور بانی کے کیری کیچوڑ* پیش کیے گئے ہیں۔ اور "کار" "کابلی والا اور الہ دین بے چراغ" ایک
کھٹارا کار، ناخواندہ پٹھان آدھی اور شیخی خورے اور لباڑی ڈرائیور کا حکایتی طرز میں ایک طویل خاکہ ہے۔ ان میں جو کردار
مرکزی، ثانوی یا محض ضمنی حیثیت سے ابھرتے ہیں، وہ سب کے سب اصطلاحاً بہت "عام" اور سماجی رتبے کے لحاظ
سے بالکل "معمولی" ہیں۔ اسی لیے خاص التفات اور تامّل چاہتے ہیں۔ میں نے زندگی کو ایسے ہی لوگوں کے حوالے
سے دیکھا، سمجھا، پرکھا اور چاہا ہے۔ اسے اپنی بدنصیبی کہنا چاہیے کہ جن "بڑے" اور "کامیاب" لوگوں کو قریب
سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، انھیں بحیثیت انسان بالکل ادھورا، گرہ دار اور یک رُخا پایا۔ کسی دانا کا قول ہے کہ جس کثیر
تعداد میں قادرِ مطلق نے عام آدمی بنائے ہیں، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں بنانے میں اسے خاص لطف آتا
ہے ورنہ اتنے سارے کیوں بناتا اور قرن ہا قرن سے کیوں بناتا چلا جاتا۔ جب ہمیں بھی یہ اتنے ہی اچھے اور پیارے
لگنے لگیں تو جاننا چاہیے کہ ہم نے اپنے آپ کو پہچان لیا۔ یہ ایسے ہی عام انسانوں کا تذکرہ ہے۔ ان کی الف لیلہ
ایک ہزار راتوں میں بھی ختم نہیں ہو سکتی کہ، ہے ہر اک فردِ جہاں میں ورقِ ناخواندہ۔

ممکن ہے بعض طبائع پر جزئیات کی کثرت اور "پلاٹ" کا فقدان گراں گزرے۔ میں نے پہلے کسی اور ضمن میں
عرض کیا ہے کہ پلاٹ تو فلموں، ڈراموں، ناولوں اور سازشوں میں ہوتا ہے۔ ہمیں تو روزمرّہ کی زندگی میں دور دور اس
کا نشان نہیں ملا۔ رہی جزئیات نگاری اور باریک بینی تو اس میں فی نفسہ کوئی عیب نہیں۔ اور نہ خوبی۔ جزئیات اگر
محض خوردہ گیری پر مبنی نہیں اور سچّی اور جان دار ہیں تو اپنی کہانی اپنی کہانی آپ کہتی چلی جاتی ہیں۔ انھیں توڑ مروڑ کر افسانوی سانچے
میں ڈھالنے یا کسی آدرشی شکنجے میں کسنے کی ضرورت نہیں۔ . . . .
پروست نے ایک پورا ناول ایک ڈنر پارٹی کی تفصیل بیان کرنے میں لکھ دیا جو یادوں کے total recall (مکمل
بازآفرینی) کی بہترین مثال ہے۔(+) انگریزی کے عظیم ترین (بغیر پلاٹ کے) ناول Ulysses کی کہانی ۱۶ جون
۱۹۱۶ء کو صبح آٹھ بجے شروع ہو کر اسی دن ختم ہو جاتی ہے۔ یوجین اونیل کے ڈرامے Long Days Journey
into Night کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ہے۔ ان شاہکاروں کا حوالہ دینے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اگر میری
کچھ بات نہیں بنی تو یہ تکنیک کا قصور نہیں، سراسر میری کم سوادی) اور بے ہنری ہے کہ پیڑ گنتا رہ گیا، جنگل کا سماں نہ دکھا سکا۔

---

* کیری کیچوڑ (مسخ خاکے)

(+) ہم نے "یادوں کی برات" کا قصداً ذکر نہیں کیا۔ اس لیے کہ اس میں دولہا براتیوں کے کاندھے پہ سوار، انھیں چھوہاروں
سے مارتا، اپنی شہنائی آپ بجاتا جاتا ہے۔ آرسی مصحف کے دوران، آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر ہزار جان سے
فریفتہ ہو جاتا ہے۔ دُلہن کا چہرہ اسے نظر ہی نہیں آتا۔
اس کے بعض کرداروں کے نام اور کارنامے آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہیں۔

آبشارِ نیاگرا کی ہیبت اور بلندی کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے نیچے کھڑے ہو کر اوپر دیکھنا ضروری ہے۔ میں جتنی بار اوپر دیکھتا ہوں، کلاہِ پندار قدموں پر آن پڑتی ہے۔

یہاں ایک ادبی بدعت اور بد مذاقی کی وضاحت اور معذرت ضروری سمجھتا ہوں۔ فارسی مصرعوں اور اشعار کے معنی فٹ نوٹ یا قوسین میں دینے کی دو وجہیں ہیں۔ اولاً نئی نسل کے پڑھنے والوں کو ان کے معنی معلوم نہیں۔ دوم، خود مجھے بھی معلوم نہیں تھے۔ تفصیل اس اجمال پُرملال کی یہ کہ عاجز نے باقاعدہ فارسی صرف چار دن چوتھی جماعت میں پڑھی تھی اور "آمد نامہ" کی گردان سے اس قدر دہشت زدہ ہوا کہ ڈرائنگ لے لی۔ ہر چند کہ اس میں گھماؤ بھی تھے لیکن مقامات آہ و فغاں کہیں زیادہ نکلے۔ اس میں میری مہارت صراحی اور طوطا بنانے سے آگے نہ بڑھ پائی اور یہ دو اشیا ڈرائنگ میں اسپیشلائز کرنے سے پہلے بھی بالکل ویسی ہی بنا سکتا تھا۔ ڈرائنگ ماسٹر کہتا تھا کہ تم اپنا نام اتنی محبت اور محنت سے لکھتے ہو اور تمھاری *lettering* (حرف کشی) اتنی خوب صورت ہے کہ تمھیں فیل کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اگر تم اسکیچ کے نیچے یہ نہ لکھو کہ یہ انگور کی بیل ہے تو تمھیں گھڑونچی بنانے کے سو میں سے سو نمبر ملیں۔

تین کرم فرما ایسے ہیں جو بخوبی جانتے ہیں کہ میں فارسی سے نابلد ہوں۔ چنانچہ وہ اپنے خطوط اور گفتگو میں صرف فارسی اشعار سے میری چاند ماری کرتے ہیں۔ دس بارہ برس تو میں ستائشی حیرت، دوستانہ درگزر اور مؤدبانہ ناقہمی کے عالم میں یہ سب کچھ جھیلتا رہا۔ پھر اوسان درست ہوئے تو یہ وطیرہ اختیار کیا کہ اپنے جن احباب کے بارے میں مجھے بخوبی علم تھا کہ فارسی میں ان کی دست گاہ میرے برابر (یعنی صفر) ہے انھیں ان اشعار سے ڈھیر کرنے لگا۔ اس عمل سے میری توقیر اور رعب فارسی دانی میں دس گنا اضافہ اور لطفِ صحبت و مراسلت میں اسی قدر کمی واقع ہو گئی۔ اس کتاب میں فارسی کے جو اشعار یا مصرعے جہاں تہاں نظر آئیں وہ ان ہی تین کرم فرماؤں کے بے طلب عطایا میں سے ہیں۔ یہ ہیں درویش بے ریا و ریش برادرم منظور الٰہی شیخ (مصنف، درِ دلکشا اور سلسلۂ روز و شب) جو پرسشِ حال کے لیے بصرف کثیر لاہور سے لندن انٹرنیشنل کال بھی کریں تو پہلے علالت و عیادت سے متعلق فارسی اشعار سناتے ہیں۔ پھر میری فرمائش پر ان کا اردو ترجمہ و تشریح۔ اتنے میں وقت ختم ہو جاتا ہے اور آپریٹر لائن کاٹ دیتا ہے۔ دوسرے دن وہ مجھے معذرت اور فارسی اشعار سے لبریز خط لکھتے ہیں کہ معاف کیجیے، کل کا سارا وقت ترجمے میں ہی ضائع ہو گیا۔ میں نے ٹیلی فون دراصل یہ پوچھنے کے لیے کیا تھا کہ آپ کا آپریشن کس چیز کا ہوا تھا۔ اور اب طبیعت کیسی ہے۔ جب سے سنا ہے، بہت تردد ہے۔ وقت ضائع کرنے پر سعدی نے کیا خوب کہا ہے...... مگر ... نے اسی مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا واہ وا!.....

دوسرے کرم فرما ہیں ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب کہ جب بھی برٹش لائبریری جاتے ہیں، یک اسٹال سے ایک خوب صورت ... تصویری پوسٹ کارڈ خریدتے ہیں۔ پھر اس پر فیضی، بیدل یا طالب آملی کے شعر سے ... پوسٹ کر دیتے ہیں اور تیسرے ہیں حبیب لبیب و صاحبِ طرز ادیب محبی مختار مسعود جو ...

کے وسیع و عمیق علمی خلا کو پُر کرنے میں ربع صدی سے جُٹے ہوئے ہیں۔ اپنے دل پسند موضوعات پر گھنٹوں ہمارے آگے بین بجاتے اور مجبوراً خود ہی جھومتے رہتے ہیں۔ کئی بار ان سے پوچھا، حضورِ والا، آپ کو یہ کیسے پتا چل جاتا ہے کہ ہمیں یہ بات معلوم نہیں؟ مگر وہ کسرِ نفسی سے کام لیتے ہیں۔ خود ذرا کریڈٹ نہیں لیتے۔ بس آسمان کی طرف شہادت کی انگلی سے اشارہ کر دیتے ہیں اور اسی انگلی سے اپنا کان توبہ کے انداز میں پکڑ کر اگر بیٹھے ہوں تو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور کھڑے ہوں تو بیٹھ جاتے ہیں۔ انکسار و استغفار کے مخلوط اظہار کے لیے یہ ان کی ادائے خاص ہے، جس کے دوست دشمن سب قتیل ہیں۔

فارسی اشعار کے جو معنی آپ حواشی میں ملاحظہ فرمائیں گے، وہ ان ہی کرم فرماؤں سے پوچھ کر لکھ دیئے ہیں تاکہ سند رہے اور بھول جاؤں تو دوبارہ ان سے رجوع نہ کرنا پڑے۔ خصوصاً مختار مسعود صاحب سے کہ جب سے وہ آر۔ سی۔ ڈی کے سلسلے میں ترکی کے سرکاری پھیرے لگا آئے ہیں اور مزارِ پیرِ رومی کے نواح میں درویشوں کا والہانہ رقص بچشمِ حیراں دیکھ آئے ہیں، فارسی اشعار کا مطلب ہمیں ترکی کے حوالے سے سمجھانے لگے ہیں۔ یوں تو ہم اپنے ایک اور دیرینہ کرم فرما، پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم۔ اے، بی ٹی سے بھی رجوع کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ آسان شعر کو بھی اپنے علم کے زور اور وفور سے ناقابلِ فہم بنا دیتے ہیں۔

آسان زِ توجّہ تو مشکل
مشکل زِ تجاہل تو آسان (+)

سچ تو یہ ہے کہ فارسی شعر کی مار آج کل کے قاری سے سہی نہیں جاتی۔ بالخصوص اس وقت جب وہ بے محل بھی ہو۔ مولانا ابوالکلام آزاد تو نثر کا آرائشی فریم صرف اپنے پسندیدہ فارسی اشعار ٹانکنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے اشعار بے محل نہیں ہوتے، البتہ نثر بے محل ہوتی ہے۔ وہ اپنی نثر کا تمام تر ریشمی کوکون (کویا) اپنے گاڑھے گاڑھے لعابِ ذہن سے فارسی شعر کے گرد بنتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ ریشم حاصل کرنے کا زمانۂ قدیم سے ایک ہی طریقہ چلا آتا ہے۔ کوئے کو ریشم کے زندہ کیڑے سمیت کھولتے پانی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جب تک وہ مر نہ جائے ریشم ہاتھ نہیں لگتا۔

مرزا کہتے ہیں کہ کلامِ غالب کی سب سے بڑی مشکل اس کی شرحیں ہیں۔ وہ نہ ہوں تو غالب کا سمجھنا چنداں مشکل نہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا میں غالب واحد شاعر ہے جو سمجھ میں نہ آئے تو دگنا مزہ دیتا ہے۔

خدا ان تین عالموں کے درمیان اس فقیرِ پُرتقصیر کو سلامت بے کرامت رکھے۔ جب سے میری صحت خراب ہوئی ہے، ان کی طرف سے متردّد رہتا ہوں۔ کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد۔

(+) معذرت کے ساتھ "آسان" اور "مشکل" کی ترتیب الٹی کر دی ہے۔
تحریف کے بعد مطلب یہ کہ تیری توجہ سے تو آسان بات بھی مشکل بن جاتی ہے اور تجھ سے رجوع نہ کریں تو مشکل بات آسان

ایک دفعہ میں نے منظور الٰہی صاحب سے عرض کیا کہ آپ نے اپنی دونوں کتابوں میں فارسی کے نہایت خوب صورت اشعار نقل کیے ہیں۔ لیکن میری طرح، قارئین کی نئی نسل بھی فارسی سے نابلد ہے۔ یوں ہی شُد بُد اور اٹکل سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں تو مطلب فوت ہو جاتا ہے۔ اگر اگلے ایڈیشن میں بریکٹ میں ان کا مطلب اردو میں بیان کر دیں تو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

سوچ میں پڑ گئے۔ پھر آنکھیں بند کر کے، بند ہونٹوں سے اپنے دلآویز انداز میں مسکرائے۔ فرمایا مگر بھائی صاحب پھر مطلب فوت ہو جائے گا۔

اس پر مزاحاً کہنے لگے "تم نے اس کتاب میں ڈھیر سارے انگریزی الفاظ بے دھڑک (مرزا بے دھڑنگ کا یہی تلفظ کرتے ہیں جو ان کے منہ سے بھلا معلوم ہوتا ہے) استعمال کیے ہیں، ان پر بھی یہی نقرہ چست کیا جا سکتا ہے انگریز تو دوسری زبانوں کے الفاظ خاص موقعوں پر دانستہ اور مصلحتاً استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے کھانے پھیکے سیٹھے اور بدمزہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اعلیٰ ریستورانوں میں ان کے نام ہمیشہ فرنچ میں دیئے جاتے ہیں۔ فرنچ آج بھی شائستگی اور سوفسٹی کیشن کی زبان تصوّر کی جاتی ہے۔ لہٰذا انگریزوں کو کوئی آرٹسٹک یا ناشائستہ بات کہنی ہو تو جھٹ فرنچ فقرے کا گھونگھٹ نکال لیتے ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہوگا کہ سیمول پیپس (۱۷۰۳-۱۶۳۳) نے اپنی شہرۂ آفاق ڈائری (جس میں اس نے اپنی آوارگیوں اور شبینہ فتوحات کا حال بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے) شارٹ ہینڈ میں لکھی تھی تاکہ اس کے ملازم نہ پڑھ سکیں۔ جہاں کوئی ایسا نازک مقام آتا جسے انگریز اپنی روایتی کسر بیانی (understatement) سے کام لیتے ہوئے naughty کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں، تو وہ اس واردات کا اندراج فرنچ میں کرتا تھا۔ لیکن جہاں بات اتنی ناگفتنی ہو ——— جو اکثر ہوتی تھی کہ فرنچ زبان بھی ہمک اٹھے تو وہ اس رات کی بات کو بلاکم و کاست ہسپانوی زبان میں قلم بند کرتا تھا۔ گویا یہ ہوئی لسانی درجہ بندی باعتبارِ مدارجِ بوالہوسی۔ اب ذرا علوم کی طرف نگاہ کیجیے۔ انگریزوں نے درختوں اور پودوں کے نام اور بیشتر قانونی اصطلاحیں جوں کی توں لاطینی سے مستعار لی ہیں۔ دانائی کی باتیں وہ بالعموم یونانی زبان میں الٹے واوین کے اندر نقل کرتے ہیں تاکہ کوئی انگریز نہ سمجھ پائے۔ اوپیرا کے پکے گانوں کے لیے اٹالین اور فلسفہ کی ادق اصطلاحات کے لیے جرمن زبان کو ترجیح دے کر ناقابلِ فہم کو ناقابلِ برداشت بنا دیتے ہیں۔

اس طولانی تمہید کے بعد فرمایا "لیکن ہم انگریزی کے الفاظ صرف ان موقعوں پر استعمال کرتے ہیں جہاں ہمیں یقین ہو کہ اس مفہوم کو اردو میں کہیں بہتر طریقے سے ادا کیا جا سکتا ہے۔"

اس بر وقت تنبیہ کے باوجود آپ کو انگریزی الفاظ جابجا نظر آئیں گے۔ سبب یہ کہ یا تو مجھے ان کے اردو مترادفات معلوم نہیں۔ یا وہ کسی رواں دواں مکالمے کی بُنت میں پیوست ہیں بصورتِ دیگر بہت مانوس اور عام فہم ہونے کے علاوہ اتنے غلط تلفظ کے ساتھ بولے جاتے ہیں کہ اب انھیں اردو ہی سمجھنا چاہیے۔ کوئی انگریز انھیں پہچاننے یا اپنانے کے لیے تیار نہ ہوگا۔

"اسکول ماسٹر کا خواب" اور "دھیرج گنج کا پہلا یادگار مشاعرہ" پر محب و مشفق دیرینہ محمد عبدالجلیل صاحب نے بکمال لطف و توجہ نظرِ ثانی کی اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ جیسے نفاست پسند اور منکسر مزاج وہ خود تھے ویسے ہی دھیمے ان کے اعتراضات تھے جو انھوں نے میرے مسودے کے حاشیے پر اتنی ہلکی پنسل سے نوٹ کیے تھے کہ انگلی بھی پھیر دیں تو مٹ جائیں۔ کچھ ایسی غلطیوں کی نشان دہی بھی کی جن کی اصلاح پر خامۂ ہذیاں رقم کسی طور آمادہ نہ ہوتا تھا۔ مثلاً میں نے ایک ترش مکالمے کے دوران گجراتی سیٹھ سے کہلوایا تھا "ہم اس سالے لنگڑے گھوڑے کو کیا کریں گا؟" جمیل بھائی کی لکھنوی شائستگی اس کی متحمل نہ ہوئی۔ تادیباً پورا جملہ تو نہیں کاٹا، صرف سالے کو قلم زد کرکے اوپر برادرِ نسبتی لکھ دیا! پھر فرمایا کہ "حضرت، یہ ہک دک کیا ہوتا ہے؟ ہکا بکا لکھیے۔ ہمارے یہاں ہک دک نہیں بولا جاتا۔" عرض کیا "ہکا بکا میں صرف پھٹی پھٹی آنکھیں اور کھلا ہوا منہ نظر آتا ہے، جب کہ ہک دک میں ایسا لگتا ہے جیسے دل بھی دھک سے رہ گیا ہو۔" فرمایا "تو پھر سیدھے سبھاؤ دھک دھک کرنے لگا کیوں نہیں لکھتے؟ اور ہاں مجھے حیرت ہے کہ ایک جگہ آپ نے لوطی لکھا ہے! ذلت قلم ہی کہوں گا۔ معاف کیجیے۔ یہ لفظ آپ کے قلم کو زیب نہیں دیتا۔"

پوچھا "تو پھر آپ کے ہاں لوطی کو کیا کہتے ہیں؟"

فرمایا "کچھ نہیں کہتے۔"

میں زور سے ہنس دیا تو چونکے۔ دوسرے پہلو پر خیال گیا تو خود بھی دیر تک ہنستے رہے۔ رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگے "ایسا ہی ہے تو اس کی جگہ 'بدتمیز' لکھ دیجیے۔ تہذیب کا تقاضا یہی ہے۔" یہ سن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ اس لیے کہ میں نے یہ لفظ (بدتمیز) دوسرے ابواب میں تین چار جگہ ایسے لوگوں کے بارے میں استعمال کیا تھا جو صرف لغوی معنی میں بدتمیزی کے مرتکب ہوئے تھے۔ اس نئے مہذب مفہوم کے ساتھ تو وہ مجھ پر بہتان طرازی اور ازالۂ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ چلا سکتے تھے۔

کچھ دیر بعد کلف لگے ململ کے کرتے کی آستین الٹ کر مسودے کی ورق گردانی کرتے ہوئے بولے "دعاب خا سنگوٹیاں، آرا اور موچھنا شرفائے لکھنو نہیں بولتے۔" عرض کیا "میں نے اسی لیے لکھے ہیں۔" پھڑک اٹھے۔ کہنے لگے "بہت دیر بعد آپ نے ایک سمجھ داری کی بات کہی۔" پھر اس خوشی میں سگریٹ سلگاتے ہوئے بولے "گوشتاق صاحب یہ بوک کیا ہوتا ہے؟ ہم نے نہیں سنا۔" عرض کیا "جوان اور مست بکرا جس سے نسل کشی کے سلسلے میں رجوع کیا جاتا ہے۔ اس کے داڑھی ہوتی ہے اور جسم سے سخت بدبو آتی ہے۔ گوشت بھی بساندا اور ریشے دار۔" فرمایا "واللہ یہ لفظ ہی نہیں دیکھا۔ لفظ، مفہوم اور اس کے گوشت سے کراہت آتی ہے۔ مقئ ہے۔ آپ اس کی جگہ کوئی اور کم بدبودار جا استعمال نہیں کر سکتے؟ کراچی میں اس لفظ کو کون سمجھے گا۔" عرض کیا "وہی جو مقئی (قے آور) کو سمجھے گا۔ آپ تو غالب کے حافظ ہیں۔ آپ کو تو یہ لفظ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی ضد کا غالب نے عجیب سیاق و سباق میں ذکر کیا ہے۔ علائی کو اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ تم خصّی کے بکروں کے گوشت کے قلیے اڑا رہے ہوگے۔ لیکن بخدا میں تمھارے پلاؤ قلیے پر رشک نہیں ک

کھتیں یا نیر کی مصری کا ٹکڑا میسر نہ آیا ہو۔ جب یہ تصوّر کرتا ہوں کہ میرجان صاحب اس مصری کے ٹکڑے کو چبا رہے ہوں گے تو رشک سے اپنا کلیجہ چبانے لگتا ہوں۔ تحقیق طلب امر یہ کہ اس مصری کی ڈلی سے دراصل غالب کی کیا مراد تھی۔ محض مصری؟ سو وہ تو اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کی دلّی میں منوں دستیاب تھی۔ حیرت ہے محققین و شارحین کی طبع بدگمان ادھر نہیں گئی، حالاں کہ غالب نے مصری کے تلازمے کو عشق و عاشقی کے ضمن میں ایک دوسرے خط میں بھی استعمال کیا ہے"

فرمایا "بجا چھوڑ دیا حافظِ دیوان سمجھ کر۔ لیکن حضرت، یہ روہڑ کس زبان کا لفظ ہے؟ کریہہ الصّوت بالکل گنوارو لگتا ہے۔ کہیں راجستھانی ہے؟" عرض کیا "خود ہمیں بھی یہی شبہ ہوا تھا۔ لہٰذا ہم نے ماجد بھائی سے پوچھا . . . "

"کون ماجد بھائی؟"

ماجد علی صاحب۔ سابق سی ایس پی۔ لندن منتقل ہو گئے ہیں۔ چھوٹے بڑے، اپنے بیگانے، باس اور ماتحت ـــــ سب انھیں ماجد بھائی کہتے ہیں، سوائے ان کی بیگم، زہرا نگاہ کے۔ وہ انھیں ماجد چچا کہتی ہیں۔ ان سے رجوع کیا تو انھوں نے تصدیق کر دی کہ لحاف کی پرانی روئی کو، جسے غریب غربا ہاتھوں سے تُنک کے دوبارہ استعمال کرتے ہیں رُدہیڑ کہتے ہیں

یوں تو وہ حاجت کے لیے پیر و مرشد کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کا فرمایا ہوا ہمیشہ مستند ہی ہوتا ہے تاہم میں نے مزید تشفی کے لیے پوچھا "کیا بداؤں میں بھی بولا جاتا ہے؟" چہرے پر ایک بناوٹی خشونت اور لہجے میں خفیف سے مصنوعی لکنت پیدا کرتے ہوئے، جو مباحثے میں عصائے موسوی کا کام کرتی ہے، بولے "دیکھیے، ذاتی بے تکلفی اپنی جگہ، علمی مباحث اپنی جگہ، بدایوں کو بداؤں کہنے کا حق صرف بدایوں والوں کو پہنچتا ہے۔ مثلاً یوں سمجھیے کہ کل کلاں کو آپ مجھے ماجد بھائی کی بجائے ماجد چچا کہنے لگیں تو لندن پولیس مجھے پولی گیمی۔ (تعددِ ازدواج) میں دھر لے گی۔ آپ کا تو مزید کچھ نہیں بگڑے گا۔ بہرکیف، روہڑ صحیح ہے*۔ بداؤں میں تو پھیری والے گھر گھر صدا لگا کر روہڑ خریدتے تھے اور اس کے بدلے ریوڑیاں دیتے تھے جنھیں اندھے آپس میں بانٹ لیتے تھے" علمی تحقیق و تدقیق کا جذبہ اب مجھے اس مقام پہ لے آیا جہاں مزید سوال کرنا گویا اپنی دستارِ فضیلت سے خود فٹ بال کھیلنے کے مترادف تھا۔ ماجد بھائی کی بذلہ سنجی کے سامنے اچھے اچھے نہیں ٹھہر پاتے۔ راویِ غیبت بیاں کہتا ہے کہ ایک دفعہ ان کے باس (وزیر) کے دفتر کے سامنے کچھ دور پر لوگ عزّت مآب کے خلاف "ایوب خاں کا چمچہ! ایوب خاں کا چمچہ!" کے نعرے لگا رہے تھے۔ وزیرِ موصوف نے ماجد بھائی سے پوچھا "یہ لوگ کیوں شور مچا رہے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا "سر کٹلری کے بارے میں کچھ کہہ رہے ہیں"

جمیل صاحب اس طویل تشریح اور معتبر سند سے کچھ پسیجے۔ ناک سے سگریٹ کا دھواں خارج کرتے ہوئے بولے "اگر آپ کو صاف روئی سے الرجی ہے تو روہڑ بھی چلے گا۔ لیکن ایک بات ہے۔ متروکات آپ کو بہت "فیسی نیٹ" کرتے ہیں۔ خیر، مجھے تو اچھے لگتے ہیں۔ کس واسطے کہ مجھے انٹیک جمع کرنے کا شوق ہے۔ لیکن ممکن ہے پڑھنے والوں کو اتنے اچھے نہ لگیں۔ بریکٹ میں معنی لکھ دیجیے گا۔"

عرض کیا "مرزا اکثر طعنہ دیتے ہیں کہ تم ان معدودے چند لوگوں میں سے ہو جنھوں نے متروکہ جائداد کا کوئی کلیم داخل نہیں کیا۔ وجہ یہ کہ چلتے وقت تم اپنے ساتھ متروکات کا دفینہ کھود کر، سمو چا ڈھو کر پاکستان لے آئے۔ اتفاق برطرف، اگر ان میں سے ایک لفظ، جی ہاں، صرف ایک لفظ بھی دوبارہ رائج ہوگیا تو سمجھوں گا عمر بھر کی محنت سوارت ہوئی۔"

مجھے "پھر بھی!"

افسوس، جمیل صاحب صرف وہ الجواب دیکھ پائے تھے کہ ان کا بلاوا آگیا۔ اب ایسا نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس کہاں سے لاؤں جس کا اعتراض بھی نکتہ پروری، استعداد آفرینی اور دل آسائی سے خالی نہ تھا۔

آخر میں اپنی شریک (سوانح) حیات ادریس فاطمہ کا شکریہ بھی لازم ہے کہ انھوں نے اپنے تبسم سقم شناس سے بہت سی خامیوں کی نشان دہی کی۔ تاہم بے شمار سخن ہائے سوختنی اور غلطی ہائے مضامین بوجوہ باقی رہ گئے ہوں گی۔ وہ سارا مسودہ دیکھ چکیں تو میں نے کہا "راجستھانی لہجہ اور محاورہ کسی طرح میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ بہت دھوتا ہوں، یہ چنری کے رنگ چھٹائے نہیں چھوٹتے۔

Out, dammed spot! out, I say! [1]

حیرت ہے اس دفعہ تم نے زبان کی ایک غلطی نہیں نکالی!"

کہنے لگیں "پڑھائی ختم ہونے ... سے اس گھر ــــــ گردھی میں آگئی۔ تینتالیس برس ہوگئے۔ اب مجھے یاد نہیں کہ میری زبان کیا تھی؟ اور تمھاری ... ہے۔ اب تو جو سنتی ہوں سبھی درست معلوم ہوتا ہے۔

ایک دوسرے کی چھاپ، تلک سب چھین کر اپنا لینے اور دریائے سندھ اور ملادی کا ٹھنڈا میٹھا پانی پینے کے بعد تو یہی کچھ ہونا تھا اور کچھ ہوا، بہت خوب ہوا۔ فالحمد للہ رب العالمین۔

لندن

۱۶ اکتوبر ۱۹۸۹ء

---

[1] شیکسپیر۔ لیڈی میکبتھ، عالم خواب میں اپنے ہاتھ پر خون کا دھبہ دیکھ کر اسے چھڑانے کی کوشش کرتی ہے ... وہ ہے کہ کسی طرح چھوٹ کر نہیں دیتا۔

★★

قلمی معاونین

اپنی تخلیقات صاف اور خوش خط، روشنائی سے

صفحے کی ایک جانب

لکھ کر ارسال فرمائیں۔ مسودات پر اپنا پتہ ضرور لکھیں

نظر برنی (دہلی)

ناموں کا گورکھ دھندہ

آج کل ناموں کی دنیا میں ہوئی مٹی پلید — نام اور کردار میں ہونے لگا فرقِ شدید
نام ہے دھن راج لیکن تو دھنوں کے ہیں امام — نام نراہے مگر پیتے ہیں وہ ہر صبح و شام
نام سُکھ منگل ہے مگر گانے سے نفرت ہے انھیں — دھرم کے وہ داس ہیں رشوت سے الفت ہے انھیں
کالے کرتوتوں کا کیا ہے؟ نام تو ہے سنت رام — لاکھ ہوں سر پر بلائیں نام تو ہے مست رام
سر سے پا تک وہ ہیں بھونڈے نام ہے جن کا جمیل — جن کی صورت ریچھ جیسی وہ ہی کہلائے شکیل
نام ہے کپتان سنگھ جھاڑو لگاتے دیکھیے — ہے گھمنڈی نام لیکن سر جھکاتے دیکھیے
نام ہے رن بیر لیکن رن کبھی جھانکا نہیں — شیر سنگھ کہتے ہیں جس کو شیر تک دیکھا نہیں
نام تو ہے دیو لیکن چھپکلی کا جسم ہے — زور آور سنگھ کو دیکھو مینڈکی کی قسم ہے
نام جابر ہے تو کیا وہ دیکھنے میں ہیں شریف — اب ربیع کی فصل میں گھسنے لگی فصلِ خریف
نام ہے تارا وتی مکھڑے پہ کالی رات ہے — جس نے کاشی ہی نہ دیکھی ہو وہ کاشی ناتھ ہے
نام روشن ہے مگر آنکھوں کی بینائی نہیں — سیٹھ لکھپت کی گرہ میں ایک بھی پائی نہیں
نام تو سلطان ہے قرضے پہ کرتے ہیں گزر — چاند بی بی اتنی بھونڈی جیسے نالی کا گٹر
وہ فقیرا جس کی صورت سے نحوست آشکار — پاس اس کے ہیں ملیں، باغ کوٹھی اور کار
جس کے ماتا اور پتا نے نام رکھا ستیہ پال — پرورش پا کر ہوا وہ جھوٹ میں اہلِ کمال
ہے شگفتہ نام اس کا، رونا دھونا کام ہے — ایک کوڑی جو نہ چھوڑے اس کا حاتم نام ہے
نام جیوتی ہے مگر آنکھوں پہ چشمہ دیکھیے — آسماں والے کا یارو یہ کرشمہ دیکھیے
ہم کہاں تک نام کی اور کام کی چرچا کریں — یہ تو صدیوں کا چلن ہے اس کو کیا رویا کریں

آئیے اس قول پر کر دیجیے قصہ تمام
"با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام"

خامہ بگوش (کراچی)

وہ اپنی تعریف اس طرح کرتے ہیں جیسے کسی دوسرے کی برائی کر رہے ہیں

اگر کوئی ہمارے تین پسندیدہ شاعروں کے نام پوچھے، تو ہم رسوائی کے خوف سے بے نیاز ہو کر میر، غالب اور بشیر بدر کے نام لیں گے۔ میر و غالب کے نام تو تین کی تعداد پوری کرنے کے لیے ہیں، ورنہ اصل پسندیدہ شاعر ایک ہی ہے۔ میر و غالب کے نام اس لیے بھی نوکِ قلم پر آ گئے کہ ایک مرتبہ کسی انٹرویو لینے والے نے بشیر بدر سے سردار جعفری، مجروح سلطان پوری اور کیفی اعظمی کے بارے میں ان کی رائے پوچھی تو انھوں نے فرمایا کہ میرا معاملہ تو میر و غالب سے ہے، وہی میرے حریف ہیں اور میں انھیں اپنا حریف سمجھتا ہوں۔

بشیر بدر کی شاعری کی تعریف میں ہم سطور کے صفحے سیاہ کر سکتے ہیں، جن کی سیاہی کسی بھی گناہ گار کے نامۂ اعمال کی سیاہی سے مقابلہ کر سکتی ہے لیکن ان کی شاعری سے زیادہ جو چیز ہمیں پسند ہے، وہ مشاعروں میں کلام سنانے کا انداز ہے۔ بلا شبہ انھوں نے اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی ہے، مشاعرے میں وہ اپنی آواز کا جادو اس طرح [illegible] سامعین ان کے ایسے شعروں پر بھی داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں، جو اگر کوئی دوسرا شاعر سنائے تو [illegible] مستحق قرار پائے۔ شعروں کے ساتھ ساتھ بشیر بدر کو ان کی نثر پر بھی داد ملتی ہے۔ ہر شعر سے پہلے وہ [illegible] ضرور ارشاد فرماتے ہیں، جو کچھ اس قسم کا ہوتا ہے۔

"جو شعر میں سنانے جا رہا ہوں، اس پر اگر آپ نے داد نہ دی تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔"

"میں کتنی دور سے چل کر آپ کے شہر میں آیا ہوں، یقین ہے کہ مجھ مسافر کو آپ شجرِ داد کے سائے سے محروم [illegible]"

"میں اپنا کلام صرف سخن فہموں کو سناتا ہوں اور ان سے داد پاتا ہوں۔ آپ سخن فہم ہیں۔ اس لیے آپ کی داد میرے لیے سند کا درجہ رکھتی ہے۔"

"ذرا دیکھیے اس شعر میں میں نے کیسی نازک بات کہی ہے۔ یہ نازک بات نہیں، نازک شیشہ ہے، یہ شیشہ [illegible] خاموشی کے پتھر سے ٹوٹ جائے گا۔ اس لیے داد سے محروم نہ رکھیے گا۔"

ایک مرتبہ ہم نے ایک شاعر کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ بہت وسیع المطالعہ ہیں، کیوں کہ سارا سال مشاعرے پڑھتے رہتے ہیں، بشیر بدر بھی وسیع المطالعہ ہیں، لیکن ان کا مطالعہ مشاعروں تک محدود نہیں ہے۔ انھوں نے اردو اور خصوصاً جدید اردو غزل کا گہرا مطالعہ کیا ہے، ۱۹۴۷ء کے بعد کی غزل کے بارے میں ان کی ایک ضخیم تنقیدی و تحقیقی کتاب شائع ہو چکی ہے، جس میں کثرت سے ایسے شعر درج کیے گئے ہیں، جو جدید رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں ان میں زیادہ تعداد خود بشیر بدر کے شعروں کی ہے اور کتاب کے ضخیم ہونے کا سبب بھی یہی ہے۔

بشیر بدر کی ایک ادا یہ بھی ہمیں پسند ہے کہ وہ شعروں میں تعلّی سے کم کام لیتے ہیں، نثر میں خوب کھل کر دل کی باتیں بیان کرتے ہیں، اپنے بارے میں بلا خوف تردید ان کی رائے یہ ہے کہ وہ موجودہ عہد ہی کے نہیں، آنے والی نسلوں کے بھی بہت بڑے شاعر ہیں، انھوں نے اپنے مجموعۂ کلام "آمد" کے دیباچے میں صاف صاف لکھا ہے کہ۔ "آج کی غزل میں مجھ سے زیادہ مقبول اور محبوب شاعر بقید حیات نہیں۔ ہندوستان کی ۷۵ کروڑ آبادی، پاکستان کے ادبی مراکز، مغرب میں ٹورنٹو، شکاگو، نیویارک اور لندن تک کے اردو حلقوں میں کتنے لوگ مجھے پسند کرتے ہیں، اس کا اندازہ لگانا دشوار ہے لیکن یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جو اردو یا ہندی بول سکتا ہے، وہ میری غزل سے نہیں بچ سکتا۔ یہ میرا اترانا ہوگا اگر میں کہوں کہ ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ، دفتروں اور ہر جگہ یہ خطرہ موجود رہتا ہے کہ آٹوگراف لینے والے معصوم لڑکے اور لڑکیاں مجھے پہچان سکتے ہیں۔"

اس اقتباس کو پڑھ کر معصوم لڑکے لڑکیاں ہی نہیں عام لوگ بھی بخوبی پہچان لیں گے کہ بشیر بدر نے خود پرستی کی آخری حدوں کو چھو لیا ہے مگر ہماری رائے اس سے مختلف ہے۔ بشیر بدر خود پرستی کے مرض میں مبتلا نہیں ہیں۔ بلکہ خود شناسی کے درجے پر فائز ہیں، بلاشبہ موجودہ زمانے میں ان سے زیادہ مقبول اور محبوب شاعر بقید حیات نہیں ہے۔ (واضح رہے کہ بقید حیات ہونا بقید ہوش و حواس ہونے سے بالکل مختلف معاملہ ہے اور یہاں اس سے بحث نہیں ہے) یہ بھی درست ہے کہ جو شخص اردو یا ہندی بول سکتا ہے، وہ بشیر بدر کی غزل سے نہیں بچ سکتا، کیوں کہ اردو یا ہندی بولنا ایسا جرم نہیں ہے کہ آدمی سزا سے بچ جائے۔

بشیر بدر نے اپنی تعریف میں اتنا کچھ لکھا ہے کہ شاعری کی طرح نثر میں بھی وہ اپنے آپ کو دہرانے لگے ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر ان کی بیگم راحت بدر صاحبہ نے ان پر نثر لکھنے کی پابندی لگا دی ہے اور یہ شعبہ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ طے ہوا ہے کہ آئندہ بشیر بدر اپنی تعریف خود نہیں کریں گے۔ یہ فریضہ ان کی بیگم صاحبہ انجام دیں گی۔ بیگم صاحبہ نے نہایت شاندار طریقے سے اس کام کا آغاز کیا ہے۔ پچھلے دنوں بشیر بدر نے امریکہ میں مشاعرہ گردی کی تھی بیگم صاحبہ ساتھ تھیں۔ انھوں نے اس سفر کی دل چسپ روداد لکھی ہے، جو دہلی کے رسالے "بیسویں صدی" میں بالاقساط شائع ہو رہی ہے۔ اس وقت اس سفرنامے کی ابتدائی دو قسطیں ہمارے سامنے ہیں۔

بیگم صاحبہ نے سب سے پہلے اپنا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔ "عمر ۳۵ سال، لانبی پتلی ہونے کی وجہ سے اور

بھی کم گنتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے بی ایس سی کیا۔ اس کے بعد اردو غزل نے مجھے مار لیا۔ بھوپال یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے (فرسٹ کلاس) اور بی ایڈ بھی کر لیا۔ اب اردو ہی میں پی ایچ ڈی کر رہی ہوں۔"

اس کے بعد امریکہ کا ویزا حاصل کرنے کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ امریکی سفارت خانے میں بشیر بدر سے پوچھا گیا کہ آپ کی اور آپ کی بیوی کی عمر میں اٹھارہ برس کا فرق کیوں ہے۔ بشیر بدر نے اس کا یہ شاعرانہ جواب دیا۔ "اس میں میری خطا نہیں ہے۔ آپ یقین جانیے میں محبت اور حسن کا شاعر ہوں۔ میری شاعری سے اتنے بڑے ملک میں جو چند لڑکیاں واقعی سنجیدگی سے متاثر ہوئیں ان میں سب سے زیادہ عمر انھیں کی ہے۔" حیرت ہے کہ ۸۵ کروڑ کی آبادی میں بشیر بدر کی شاعری سے صرف چند لڑکیاں متاثر ہوئیں۔ خیر اس سے کیا فرق پڑتا ہے، بشیر بدر کے حریف مرزا غالب کی زندگی میں بھی ان کی مقبولیت کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں تھا۔

بیگم صاحبہ نے بشیر بدر کی شاعرانہ اور شخصی عظمت کے واقعات بیان کیے ہیں، ان میں سرفہرست یہ ہے کہ اٹلانٹا کے مشاعرے کا جو پوسٹر شائع ہوا تھا، اس میں بشیر بدر کا نام کلیم عاجز اور قتیل شفائی کے ناموں سے پہلے لکھا گیا تھا۔ یہ یقیناً بہت بڑا اعزاز ہے۔ اس پوسٹر کو محفوظ کرنے کے لیے کسی عجائب گھر میں رکھوا دینا چاہیے تاکہ سند رہے اور آئندہ زمانے میں اگر کوئی بشیر بدر کو ان کی شاعری کی وجہ سے عظیم شاعر نہ سمجھے تو اس پوسٹر کو بطور شہادت پیش کر کے اس کا منہ بند کر دینا چاہیے۔ بلکہ پوسٹر کو اس کے منہ پر ہی چپکا دینا چاہیے۔

بشیر بدر کی عظمت و مقبولیت کا ایک واقعہ بیگم صاحبہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوسرے آواز آئی، بدر صاحب رکیے اور ان سے ملیے۔ یہ آپ کی شاعری کی بارہ سال سے عاشق ہیں۔ یہ چنڈی گڑھ میں پہلی دفعہ آپ کی گرفتار ہوئیں۔ آپ نے شادی میں ذرا جلدی کر دی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ تیکھے تیور، کتابی شکل والی ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سکھ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بشیر بدر نے میرا تعارف کرایا۔ محبت سے گلے ملیں۔ مجھے فیض کی نظم "رقیب" یاد آئی۔"

بیگم صاحبہ نے بشیر بدر کی تعریف و توصیف تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا، بلکہ امریکہ کے مشاعروں میں برصغیر کے جو دوسرے شعرا شریک تھے، ان کی کردار کشی میں بھی کوئی تسمہ لگا رہنے نہیں دیا۔ مثلاً مذکورہ سکھ خاتون کے حوالے سے انھوں نے لکھا ہے کہ ندا فاضلی نے ان سے فون پر الٹی سیدھی باتیں کیں۔ دوسرے روز وہ خاتون ایک کرنیل جوان کو ساتھ لے کر آئیں تاکہ ندا فاضلی کی مزاج پرسی کی جاسکے۔ بشیر بدر نے جب یہ دیکھا کہ صورت حال تشویش ناک ہے تو وہ ندا فاضلی کو ساتھ لے کر موقع واردات سے غائب ہو گئے۔ یہ واقعہ بیان کر کے بیگم صاحبہ نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں۔ ایک طرف تو ندا فاضلی کو اخلاقی طور پر پس ماندہ ثابت کیا ہے اور دوسری طرف بشیر بدر کی اخلاقی عظمت کا نقش ثبت کیا ہے کہ انھوں نے ندا فاضلی کی جان بچائی۔ واضح رہے کہ سکھ خاتون کے ساتھ جو کرنیل جوان آیا تھا بقول بیگم صاحبہ ہاتھوں پاؤں کا جٹ پنجابی تھا۔

امریکہ کے مشاعروں میں کلیم عاجز اور قتیل شفائی کے سامنے شاید بشیر بدر کا چراغ جل نہیں سکا۔ اسی لیے بیگم صاحبہ نے ان دونوں کا ذکر نہایت مضحکہ خیز انداز میں کیا ہے۔ خصوصاً قتیل شفائی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا

اعروں میں وہ کچھ زیادہ ہی مقبول ہو گئے تھے۔ شراب کے حوالے سے قتیل شفائی کے متعلق بہت سی ایسی باتیں لکھی گئی ہیں، جو یا ہیں۔ مثلاً ایک موقع پر قتیل شفائی نے بیگم صاحبہ سے کہا: "ہماری قوم نہ پی کر تباہ ہو رہی ہے"۔ جو پیتے ہیں ذہین ہوتے ے شفائی ہرگز ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو پینے کے بعد بھی ویسا ہی رہے، جیسا وہ پینے سے پہلے

●●

مُنہ پھٹ (ناگپور)

غزل

گھر میں جو شانہ رکھو شادی کے بعد
ذہن کو ٹھنڈا رکھو شادی کے بعد

بے جا فرمائش نہ بیگم کر سکے
مال بس اتنا رکھو شادی کے بعد

جب ضرورت ہو پرا ٹھا تل سکو
اس قدر مسکا رکھو شادی کے بعد

کم سے کم جذبات قابو میں رہیں
گھر میں اک بوڑھا رکھو شادی کے بعد

خوش نما چہروں کو پڑھنا چھوڑ دو
دھیان بیوی کا رکھو شادی کے بعد

دال چاول، گوشت، سبزی کے لیے
ہاتھ میں جھولا رکھو شادی کے بعد

ساس سسرے سالی، سالے کے لیے
اپنا دل دریا رکھو شادی کے بعد

بیوی نافرمان ہو سکتی نہیں
ہاتھ میں ڈنڈا رکھو شادی کے بعد

نوجوانو! عرضِ منہ پھٹ ہے یہی
باپ سے رشتہ رکھو شادی کے بعد

نریندر لوتھر

قسط ۱۳ الف

ایک ملک دو تہوار

'رفلی' میں ہم نے ایڈگر ایلن پو (Edgar Allan Poe) کا گھر بھی دیکھا۔ پو ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوا تھا۔ دو تین سال کا تھا کہ اس کا باپ مر گیا۔ اسے ایلن نامی ایک شخص نے متبنیٰ لیا لیکن ان دونوں کی آپس میں بنی نہیں۔ پو نہایت آوارہ اوباش اور شرابی ثابت ہوا۔ اسی وجہ سے یونیورسٹی سے نکالا گیا۔ بعد میں وہ فوجی سکول میں داخل ہوا لیکن وہاں کے ڈسپلن کی تاب نہ لا کر خود ہی نکل آیا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اس کا پہلا دیوان شائع ہوا۔ یکے بعد دیگرے وہ دو رسالوں کا ایڈیٹر بنا۔ متعدد کہانیاں شائع کیں اور بہت شہرت حاصل کی۔ پھر اپنی نوجوان بیوی کی موت کے بعد اس نے خودکشی کی ناکام کوشش کی۔ اس کے بعد اس نے متعدد معاشقے بھی کیے۔ ۱۸۴۹ء میں وہ دوران سفر شراب میں دھت غشی کی حالت میں پایا گیا اور اسی حالت میں دنیا سے کوچ کر گیا

'پو' انگریزی کا بہت بڑا شاعر اور افسانہ نگار رہا ہے۔ کئی امریکی نقاد اُسے امریکہ کے منفرد لب و لہجے کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔ اس کو جاسوسی کہانی کا موجد مانا جاتا ہے۔ اس کی زندگی میں جتنی بے قاعدگی اور بے اعتدالی تھی اس کے فن میں اتنی ہی کاریگری اور عرق ریزی کا ثبوت ملتا ہے۔ ایسے فن کاروں کی زندگی سے کوئی سبق اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ نوجوانوں کو صرف ان کے فن سے آشنا کروانا چاہیے۔ ان کی زندگی کے حالات نہیں بتانے چاہئیں کیونکہ اس سے ان کے کیرکٹر اور ان کے مستقبل پر نقصان دہ اثر پڑنے کا خطرہ ہے۔ زندگی اور فن کی آپسی بے تُکے پن کی ایسی مثالوں ہی سے جینیس genius کے روایتی تصور کو تقویت ملتی ہے ایسے جینیس کا پیدا ہونا خوش قسمتی کی بات ہے۔ لیکن کسی دوسرے کے گھر میں! ہمارے خیال میں جس گھر میں جینیس پیدا ہو اس میں دو نارمل بچے بھی پیدا ہونے چاہئیں۔ تاکہ وہ جینیس کو زندہ رہنے میں اس کو سہارا دے سکیں۔

'پو' کا گھر اب ایک قومی یادگار بنا دیا گیا ہے۔ ہم وہاں گئے لیکن اس سے مل نہ پائے (یاد رہے کہ وہ ۱۸۴۹ء میں مر چکا تھا) افسوس ہوا۔ وہاں ایک نوجوان عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ ہم نے اسے پرسہ دیا۔ وہ مسکرا دی۔ اگر 'پو' زندہ ہوتا تو یہ نظارہ دیکھ کر یقیناً اس کی روح کو دکھ ہوتا کہ ایک ہندوستانی پرسہ دے رہا ہے اور ایک امریکن مسکرا رہی ہے۔

اس عورت نے ہمیں بتایا کہ زندگی بھر 'پو' کو گھر نصیب نہیں ہوا اور نہ ہی کسی کو یقینی طور پر یہ معلوم ہے کہ وہ کہا

رہتا تھا۔ ہمارے ہاں 'ویر چکر' وغیرہ بھی اسی طرح دیے جاتے ہیں یعنی مرنے کے بعد تاکہ دوسرے فوجیوں کے دل میں بھی جان پر کھیل جانے کی خواہش پیدا ہو۔ ہاں تو جب یہ ثابت ہو گیا کہ 'پو' واقعی مر گیا ہے تو امریکی حکومت نے ایک گھر اس کے نام کر دیا اور پھر سی۔ آئی۔ اے۔ کو ہدایت دی کہ وہ عوام کو یہ باور کرائے کہ پو کا گھر یہی تھا۔ جاسوسی افسانہ نگاری کے موجد کے ساتھ عملی مذاق کی یہ ایک اچھی مثال ہے۔

ہم ابھی 'فلی' میں ہی تھے کہ امریکہ بلکہ ساری دنیا پر کرسمس نازل ہوئی۔ یہ تہوار دنیا کے سب تہواروں کو مات کرتا ہے۔ دیوالی کو عید سے ضرب دے کر اس میں سے فساد منفی کر لیں تو حاصل کرسمس کا تہوار ہوگا۔ یہ تہوار۔ سال کا نقطۂ عروج ہے۔ اس کی شمعِ سحر کی آخری جھلملاہٹ ہے۔ لوگ سال بھر اپنی چھٹیاں، اپنے پیسے، اپنی صحت بچاتے رہتے ہیں تاکہ سب کچھ کرسمس کی ایک شام کی نذر کر سکیں۔ اس تہوار کے موقع پہ ملک کو، شہروں کو بازاروں کو، دکانوں کو گھروں کو، بیوی بچوں کو، کتوں اور بلیوں کو خوب سجایا جاتا ہے۔ ہفتوں بلکہ مہینوں پہلے ہی سے اس تہوار کی آمد آمد شروع ہوتی ہے اور جب آتا ہے تو خرچ خرچ! پرانی چیزیں گھر سے نکال کر پھینک دی جاتی ہیں، نئی چیزیں لائی جاتی ہیں۔ نئی شادیاں رچائی جاتی ہیں۔ بڑے بڑے درختوں کی ٹہنیاں کاٹ کر ان کو کرسمس کے درخت کا لقب دے کر گھر میں لگایا جاتا ہے اور پھر ان کو خوب سجایا جاتا ہے۔ اس تہوار پر اپنے پرایوں کو تحفے دیے جاتے ہیں۔ بالغ لوگ تو راست تحفہ بازی کر لیتے ہیں لیکن بچوں کے لیے ایک بوڑھے 'سانتا کلاز' کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ کئی بار تو گھر کے کسی فرد کو سانٹا کلاز بننا پڑتا ہے۔

سروج ہمیں کرسمس اپنے بھائی کے گھر لے گئی۔ اس نے ایک امریکی عورت سے شادی کی ہوئی ہے اور بڑا خوش حال ہے۔ خود بھی پورا امریکن بن گیا ہے۔ اس گھر میں باقاعدہ کرسمس منائی گئی اور اس موقع پر ہم نے بھی اپنا بہترین سوٹ پہنا، ایک ہاتھ سے تحفے دیے اور دوسرے ہاتھ سے لیے اور ایک ہی منہ سے مبارک اور شکریہ کہہ کر بے شمار لوگوں کے بوسے لیے اور دیے۔ امریکہ میں یہ رواج ہے کہ جس دکان سے تحفے خریدے گئے، اسی دکان میں واپس بھی کیے جا سکتے ہیں۔ کئی لوگ تحفے پسند نہ آنے کی صورت میں اسے بیچ دیتے ہیں۔ کئی دکانیں ایسے تحفوں کو سستے داموں بیچنے کے لیے خصوصی 'سیل' لگاتی ہیں۔ بیشتر لوگ اپنی ضرورت کی چیزیں اسی طرح سستے داموں پہ خرید لیتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو دکان دار تحفوں کے ساتھ ایک پرچی لگا دیتے ہیں۔ . . . . کہ پسند نہ آنے کی صورت میں یہ تحفہ اسی قیمت کی کسی اور چیز کے ساتھ بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ تحفہ پسند ہو یا نہ ہو، اس کی تعریف وہاں کے آدابِ سماج کے مطابق لازمی ہے۔ آج کل تعریف کے طریقے بھی بدل گئے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تعریف سوال کے ساتھ بھی کی جاتی ہے۔ ہم نے جس خاتون کو تحفہ دیا اس نے بظاہر فرطِ مسرت سے ہمیں پوچھا۔ کیا یہ شان دار نہیں ہے؟ [illegible]

[illegible] ہم نے قدرے جھینپ کر کہا: نہیں۔ یہ تو بڑی معمولی سی چیز ہے۔ اسے ہم نے ڈسکاؤنٹ

پوچھ رہا ہے۔" سروج نے ہمیں سمجھایا کہ ایسے سوال کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ صرف شکریہ یا 'خوش آمدید' پڑھی جا سکتی ہے۔

اب اگر کوئی شخص کسی چیز کے بارے میں ہماری رائے پوچھتا ہے تو ہم صرف شکریہ یا خوش آمدید ہی کہتے ہیں۔ اس سے بیگم کو خاص طور پر بہت کوفت ہوتی ہے کیوں کہ بعض ناپسندیدہ قسم کے اشخاص اس کو ہمارا دعوت نامہ تصور کر کے ہمارے گھر آن پہنچتے ہیں

کرسمس بڑا مزے دار تہوار ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں ہنری ینگ مین نے کہا ہے کہ کرسمس مجھے بہت پسند ہے۔ اس تہوار پر مجھے بہت سے تحفے ملتے ہیں اور میں ان کی ادلا بدلی کرنے کے لیے بے تاب ہوتا ہوں۔ بحیثیت مجموعی کرسمس سے بڑی تکان ہو جاتی ہے۔ امریکن کہاوت بالکل بجا ہے۔

"خوش آمدید کرسمس ۔ لیکن سال میں صرف ایک ہی بار۔"

'فلی' سے ہم نیو آرک گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو نیویارک کے قریب ہی ہے لیکن اس سے مختلف وہاں ہمارا ایک میرا بھائی رہتا ہے۔ اس کو ہندوستان چھوڑے ہوئے تیس سال ہو گئے تھے۔ اس دوران اس نے بہت ترقی کی تھی اور امریکن بن گیا تھا۔ مکان خریدے تھے۔ دوبار شادی کر لی تھی۔ میرے لحاظ سے وہ باعث رشک تھا۔ ہمارے پہنچنے پر اس کی بیوی نے ہمارے لیے ہندوستانی کھانا بنایا۔ ہمیں معلوم ہے کہ کسی بھی عورت کے لیے ہندوستانی کھانا بنانا کتنا مشکل کام ہے۔ چناں چہ ہم نے فوراً منع کیا کہ دوبارہ ایسی تکلیف نہ کی جائے پھر بھی ہم نے تنہائی میں اپنے بھائی سے پوچھ لیا کہ اگر وہ تیسری شادی کرنا چاہتا ہے تو ہم ہندوستانی کھانے پر مصر رہیں گے ورنہ فی الحال ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ اس نے کہا ابھی اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اگر کبھی ضرورت پڑی تو ہمیں خاص طور پر ہندوستان سے کرایہ دے کر بلوا بھیجے گا۔

اس کی صلاح پر ہم نیو آرک سے نیویارک تک بس پر گئے۔ اس طرح ہم نے ہر قسم کی ٹرانسپورٹ میں سفر کرنے کا تجربہ حاصل کیا۔

وہاں کا بس سٹیشن لکڑی کی ایک چھوٹی سی بلڈنگ تھی۔ کافی پھٹیچر قسم کی عمارت۔ قلی تو وہاں ملتے ہی نہیں۔ اتنی سکت نہیں تھی کہ اپنا سوٹ کیس اٹھا کر سامان رکھنے والی ریک پر رکھیں۔ اس لیے ہم نے اسے اپنے بازو والی خالی سیٹ پہ رکھ دیا۔ صبح کا سہانا وقت تھا۔ ابھی ایک ہی سٹاپ طے کیے ہوں گے کہ ایک امریکن نتھنے میں دھنت آیا اور ہمارے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا "سیٹ خالی کرو" حالاں کہ آزو بازو بہت سی سیٹیں خالی تھیں۔ ہم نے کہا کسی اور سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔ اس نے کہا کیا تم نے دو ٹکٹیں لی ہیں؟ اگر اس سوٹ کیس کی ٹکٹ نہیں لی تو اس کو سیٹ سے اٹھانا پڑے گا۔ ہم نے کہا کہ ہم سے سامان اٹھایا نہیں جا سکتا۔ اس جملے کا پہلے تو اس پر کوئی اثر نہ ہوا لیکن جب اسے نہ اٹھا سکنے کی وجہ بتائی گئی تو وہ قدرے جھینپ تو گیا مگر وہاں سے ٹلنے پر مائل نہیں تھا لیکن بڑبڑانے لگا۔ اصلاً سامان یہاں

نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر تم نہیں اٹھا سکتے تو میں تمہاری مدد کروں گا۔ یہ کہہ کر اس نے سوٹ کیس اٹھا کر ریک پر رکھ دیا اور خود لڑھک کر سیٹ پر سو گیا۔ جب بس نیویارک پہنچ گئی تو ہم نے اس کو جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ وہ اٹھا ہمارا سوٹ کیس اتار کر سیٹ پر رکھا اور پھر ہمارے ساتھ مصافحہ کر کے گویا ہوا۔

"میں اس لیے پیتا ہوں کہ یہ بھول سکوں کہ میں پیتا ہوں۔" ہم نے از راہ ہمدردی پوچھا۔

"اب کام پر کیسے جاؤ گے؟" "کام"۔ اس نے کہا۔ "پینے والے لوگوں کے لیے کام ایک لعنت ہے۔" یہ کہہ کر وہ ایک خبیث سی ہنسی ہنسا اور بس سے نکل گیا۔ پھر اچانک واپس آیا۔ ہمارا سوٹ کیس اٹھا کر بس سے باہر لے آیا اور فرش پر رکھ کر بائی کہہ کر جھومتا ہوا چلا گیا۔

اب ہم نیویارک میں وارد ہو چکے تھے۔ نیویارک یا کسی بھی شہر میں پہنچنے کے تین یا چار طریقے ہیں۔ جہاز سے، ہوائی جہاز سے، ٹرین سے، سڑک سے۔ یا پھر پیدائش کی بنا پر۔ پیدائش کے علاوہ خواہ کسی بھی طریقے سے پہنچیے تاثر تو وہی رہتا ہے۔ جس طرح بعض شہر اپنی بساط سے زیادہ پھیل جاتے ہیں، نیویارک کا بھی یہی حال ہے۔ چاروں طرف شہر ہی شہر، لوگ ہی لوگ۔ گنجان آبادی، رش، غوغا، غلاظت، بدبو، چوری، ڈکیتی، قتل، یہ سب چیزیں ہندوستان میں بھی کثرت سے دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ بے شک ہمیں اس کی عادت ہے لیکن پھر بھی یہ اتنی مرغوب نہیں کہ بیرونی سفر میں بھی ان کے بغیر گزارہ نہ ہو۔

نیویارک امریکہ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا شہر ہے یا پہلے کبھی تھا۔ وہ اس لیے بڑا شہر ہو سکتا ہے کہ امریکہ کی ہر چیز دنیا کی سب سے بڑی، اونچی، لمبی، موٹی یا گہری ہوتی ہے۔ یہ ماہروں اور استادوں کا شہر ہے۔ یہاں اناڑیوں کا گزر نہیں۔ یہاں تو سڑک بھی صرف اکسپرٹ ہی پار کر سکتے ہیں۔ امریکہ میں کار ضروری ہے لیکن نیویارک میں کار کی ضرورت نہیں اور نہ آداب اور شائستگی کی۔ یہ شہر چند سالوں تک امریکہ کی راج دھانی رہ چکا ہے۔ سب سے پہلی راج دھانی 'فلی' تھا، پھر نیویارک بنا اور اب واشنگٹن۔ دو سو سالوں میں تین تین راج دھانیاں بدلنا کوئی آسان کام نہیں لیکن امریکن سب مشکل کام کر دکھاتے ہیں۔ محمد تغلق کو ہندوستان کا دارالخلافہ دہلی سے دولت آباد بنانے کی صلاح بھی شاید امریکن ایکسپرٹوں نے دی تھی۔ اب نیویارک امریکہ کا دارالخلافہ نہیں رہا لیکن دنیا کا دارالخلافہ بن گیا ہے۔ کیوں کہ یو۔ این۔ او کا ہیڈ کوارٹر یہیں ہے۔ ویسے بھی نیویارک امریکہ اور دنیا کے بزنس اور آرٹ کا مرکز ہے۔ نیویارک کا نام چھوٹا اور درشن بڑے ہیں۔ یہاں بے آئینی، بدمعاشی اور غنڈہ گردی ایسی ہے کہ لوگ گلیوں اور بازاروں میں کار بھی پارک نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ یہاں کے غنڈے جو عام طور پر حبشی ہوتے ہیں کاروں کے شیشے توڑ کر چیزیں چوری کر لیتے ہیں۔ اگر کوئی چیز نہ ملے تو غصے میں کار کو نقصان پہنچا دیتے ہیں۔ ایک بار میرے بھائی نے ایک گھنٹہ صرف کار پارک کرنے کی محفوظ جگہ ڈھونڈنے میں لگایا۔

ایک پرانی چینی کہاوت ہے "ہزار میل کی مسافت ایک قدم سے شروع ہوتی ہے۔" امریکہ کی ایک نئی کہاوت یہ ہے کہ

ارمیں کا سفر نیویارک میں کار کو پارک کرنے کی جگہ ڈھونڈنے سے شروع ہوتا ہے ۔ اس طرح غنڈہ گردی اور چوری
اری میں بھی دنیا میں سب سے آگے ہے ۔ وہاں کے سنٹرل پارک میں دن دھاڑے ٹھگ لوگوں کو لوٹ لیتے ہیں یا
قتل بھی کر دیتے ہیں ۔ ہمارا میزبان جب ایک دن ہمیں وہاں لے جانے لگا تو ہم نے تشویش ظاہر کی ۔ اس نے
کوئی فکر کی بات نہیں ۔ سویرے آٹھ بجے، شام کے چار بجے اور رات کے بارہ بجے سنٹرل پارک مکمل طور پر محفوظ ہوتا
کیوں کہ ان اوقات میں وہاں کے ٹھگوں کی شفٹ بدلتی ہے ۔ سڑاند اور تعفن کا یہ حال ہے کہ ایک بار ایک ٹورسٹ
ندے نالے کے مین ہول کا ڈھکن اٹھا کر وہاں کھڑا ہو گیا تھا ۔ کسی نے پوچھا یہاں کیا کر رہے ہو تو اس نے کہا
تازہ ہوا میں سانس لینے کی کوشش کر رہا ہوں ۔ واقعی نیویارک امریکہ کا بیک وقت بہترین اور بدترین شہر ہے ہم
ے ہیں کہ اس شہر کو دیکھنے سے بہتر اس کا ذکر سن کر خوش ہونا زیادہ مناسب ہے ۔

نیویارک میں ہم بطور خاص "لبرٹی مجسمہ" دیکھنا چاہتے تھے ۔ لیکن سردیوں کی وجہ سے وہاں کی کشتیوں کی آمد و رفت
بند کر دی گئی تھی ۔ پھر ہم نے یہ بھی سنا کہ مرمت کے لیے اس مجسمے کی نمائش روک دی گئی ہے ۔ کسی کمیونسٹ
نے کہا تھا کہ امریکہ میں لبرٹی (بمعنی شخصی آزادی) تو صرف ایک مجسمہ ہے ورنہ حقیقت کچھ بھی نہیں ۔ سرمایہ داری
خلاف جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نیویارک کو دیکھ کر لکھا گیا ہے ۔ یہ مناسب نہیں کیوں کہ امریکہ میں نیویارک سے بھی بہتر
ہیں ۔ بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ نیویارک محض اس لیے بدنام ہے کہ وہ مغربی ساحل پر ہے ۔ یہی شہر مشرقی
ساحل پر ہوتا تو یقیناً دنیا کے بہترین شہروں میں شمار کیا جاتا ۔ ہم اس رائے سے متفق ہیں (بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ یہ
ری ہی اوریجنل رائے تھی جسے دوسرے دانشوروں نے اپنا لیا) مثال کے طور پر دیکھ لیجیے کہ مشرقی ساحل پر
ے فورنیا یا یل ۔ اے کتنے خوب صورت اور پاپولر شہر ہیں ۔ (باقی آئندہ)

محبوب مانبھومی

غزل

دیجیے دھمکی نہ مجھے روز اٹھا کر جھاڑو
راکھ کر دوں گا کسی روز جلا کر جھاڑو
اہلِ کلکتہ کو اب آیا صفائی کا خیال!
نوجواں نکلے ہیں بغلوں میں دبا کر جھاڑو
بھائی محبوب تری قبر پہ جھاڑو دینے
سونے کے تاروں کی لاؤں گا بنا کر جھاڑو
پیرومرشد نے مجھے دی ہے یہ بابرکت ہے
اس لیے رکھتا ہوں سینے سے لگا کر جھاڑو
یہی دن رات کا شکوہ ہے مری بیگم کو
ہوگئی BEND کمر روز لگا کر جھاڑو
ہائے کیوں کر نہ ہوا فلاس میں آٹا گیلا
سارے مہمان گئے گھر میں پھرا کر جھاڑو
مارے شوق سے ہم اُف نہ کریں گے توبہ
شاخِ گل کی کوئی نازک سی بنا کر جھاڑو
بھارتی ناری کو کمزور نہ سمجھیں صاحب!
کام تلوار کا لیتی ہے اٹھا کر جھاڑو
لوٹ کر پھر کبھی آتا نہیں اس کوچے میں
مُنہ چھپائے ہوئے جاتا ہے جو کھا کر جھاڑو
رات اک بھنگی کے گھر ہوگئی چوری محبوب
چور چمپت ہوئے اک ایک چُرا کر جھاڑو!

تمیز احمد پھکّڑ (مہول، فالول آباد)

غزل

تُو اگر عورت ہے تجھ کو روٹھ جانا چاہیے
مرد ہوں میں تو مجھے غصّہ دکھانا چاہیے
ہر تھوڑے پیٹ ولیمہ میں ہیں تحفے لازمی
دعوتیں دسویں کی یا جہلم کی کھانا چاہیے
بھول جاؤ گر سناتے وقت کچھ اشعار تم
یاد آ جائیں گے تھوڑا سر کھجانا چاہیے
سر سے اونچا ہو جو پانی تیرتے رہیے حضور
چلّو بھر پانی میں فوراً ڈوب جانا چاہیے
جب سے باہر جا کے وہ جھاڑو لگا کر آ گیا
اس کو رشتہ کے لیے اونچا گھرانا چاہیے
لُوٹ لو پرواز محفل شاعری کیسی بھی ہو
ہاں مگر غزلیں ترنم سے سُنانا چاہیے

تریّاں

(۱)
سخت سردی میں کوٹ بھی نہ ملا
جب کھڑا وہ ہوا الیکشن میں
اس کو بیوی کا ووٹ بھی نہ ملا

(۲)
کبھی گھر میں کبھی سرائے میں
وہ گلا پھاڑ کر سناتا ہے
اپنا دیوان ایک چائے میں

(۳)
سب کو اُلّو بنا رہا ہے محفل میں
کر کے منسوب میر و غالب سے
اپنی غزلیں سنا رہا محفل میں

پرویز یداللہ مہدی

(۱)

یہ ہے بمبئی میری جان

جلدی کا کام شیطان کا یا بمبئی والے کا

"افسانوں کی طرح شہروں کی بھی ایک شخصیت ہوتی ہے۔" یہ بات مشہور ترقی پسند نقاد ڈاکٹر احتشام حسین نے برسوں پہلے فرمائی تھی۔ اس میں اتنا اضافہ اور کر لیجیے کہ شخصیت کے علاوہ ہر شہر کا اپنا مخصوص مزاج بھی ہوتا ہے۔ کوئی گرم مزاج تو کوئی سرد، تو کوئی معتدل مزاج۔ اسی طرح کسی شہر کے نصیب میں راوی چین ہی چین، سکون ہی سکون لکھتا ہے تو کسی شہر کے حق میں بھاگ دوڑ، ہڑبونگ اور افراتفری۔ بمبئی کی تقدیر لکھتے وقت شاید کاتبِ تقدیر بڑی عجلت میں تھا۔

چنانچہ یہاں ہر شخص ہر وقت عجلت میں دکھائی دیتا ہے۔ عجلت میں سوتا ہے عجلت میں اٹھتا ہے۔ عجلت میں کھاتا ہے، عجلت میں پیتا ہے، عجلت میں ہنستا ہے عجلت میں روتا ہے۔ یہاں تک کہ پیار میں بھی عجلت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جو گرل فرینڈ یا بوائے فرینڈ یہاں کسی کے ہمراہ نظر آتے ہیں۔ وہی اگلے دن کسی اور کے ہم رکاب دکھائی دیتے ہیں۔ یوں بھی یہاں صرف وہی شخص کامیابی کی منزلیں سر کرتا ہے جو رکاب اور رکابی دونوں پلک جھپکتے بدلنے میں ماہر ہو۔ بمبئی والوں کی اس عجلت پسندی کو ہو سکتا ہے آپ مستقل مزاجی کی کمی پر محمول کریں، لیکن یقین کیجیے بات یہ نہیں ہے۔ بمبئی میں چوں کہ سوائے مزاج کے آدمی کی ہر چیز درست رہتی ہے اس لیے یہاں کے باشندوں سے مستقل مزاجی کی توقع کرنا سراسر زیادتی ہے۔ اصل میں گھر سے نکلتے ہی گھر واپس پہنچنے کی خواہش یہاں ہر شخص سے سارے کام عجلت میں کرواتی ہے۔ اس سے نوے فی صد لوگوں کے کام یہاں بننے سے پہلے ہی بگڑ جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ہم نے آج تک کسی بمبئی والے کو کام نہ بننے پر روتے بسورتے نہیں دیکھا۔ اپنی ناکامی پہ روتے وہ لوگ ہیں جو صرف اپنے کام سے کام رکھتے ہیں، جبکہ اہلیانِ بمبئی کی نظر میں کام کی حیثیت صرف ثانوی ہے اصل چیز ہے مصروفیت۔ لہٰذا یہاں ہر دوسرا شخص چوبیس گھنٹے مصروف دکھائی دیتا ہے، اب رہا پہلا شخص تو وہ ہر دوسرے شخص کی مصروفیت کو دیکھنے میں مصروف نظر آتا ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ مصروفیت کا ایسا مسلسل اور متواتر مظاہرہ ملک کے کسی اور شہر میں دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ ظاہر ہے کام میں مصروف ہونا کوئی بڑا کمال نہیں لیکن بنا کام کے اپنے آپ کو مصروف رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ اور یہ مشکل کام، بمبئی والے محض اپنی عجلت پسندی کے باعث ہنستے کھیلتے کر جاتے ہیں۔ البتہ اس عجلت پسندی کی وجہ سے یہاں لوگوں کو ایک دوسرے سے کھل کر ملنے کے مواقع کم کم ہی میسر آتے ہیں۔ دو قریبی دوست بھی یہاں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو انتہائی رواروی میں۔ کھڑے کھڑے دونوں یوں بولنے لگتے ہیں جیسے

سوار ہوتے ہیں، ایک کی ٹرین چھوٹ رہی ہوتی ہے تو دوسرے کی بس اور ٹرین دونوں ـــــ ایسے نفسانفسی کے عالم میں جس قسم کی مختصر مختصر گفتگو ان کے درمیان ہوتی ہے اس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے۔

پہلا دوست : یار آج پہلے ہی دفتر میں دیر ہوگئی، اگر چھ پانچ کی اندھیری ٹرین چھوٹ گئی تو اندھیر ہو جائے گا۔

دوسرا دوست ۔ میرا تو تیرے سے بُرا حال ہے یار اگر چھ پانچ کی بس پکڑ کر وی۔ ٹی نہیں پہنچا تو چھ بیس کی کلیان فاسٹ ٹرین میں گھسنے کی بھی جگہ نہیں ملے گی اور وی۔ٹی پر ہی میرا کلیان ہو جائے گا!

یہ غالباً جلد بازی اور بھاگ دوڑ ہی کا کرشمہ ہے کہ یہاں دوستی، خلوص، محبت، مروت، انسانیت، ہمدردی، رواداری، خیرسگالی، غرض یہ کہ ہر جذبہ گھڑی کی سوئیوں سے بندھا ہے۔ ہمدردی کے دو بول بھی گھڑی کی سوئیوں کے تابع ہیں۔ مروت کا وقتی مظاہرہ بھی گھڑی کی نقل و حرکت کا پابند ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ ہسپتالوں کے محدود اوقاتِ ملاقات کی طرح یہاں خلوص و محبت کے اظہار کے اوقات بھی مقرر ہیں۔ جہاں یہ جیسے ہی وقت ختم ہو جاتا ہے خلوص و محبت کے مظاہرے کو فی الفور "اسٹاپ" لگ جاتا ہے۔ بمبئی والا اگر کسی مجبوری کے تحت اپنی شناخت چھپانا بھی چاہے تو نہیں چھپا سکتا، محض گھڑی گھڑی گھڑی کی طرف دیکھنے کی عجلت کے نتیجے میں فوراً پہچان لیا جاتا ہے۔

عجلت پسندی و جلد بازی میں جہاں یہ خرابی ہے کہ یہ آدمی کو تا دیر خوش نہیں رہنے دیتی وہیں اس میں یہ خوبی ہے کہ یہ آدمی کو زیادہ دیر تک خوش نہیں رہنے دیتی وہیں اس میں یہ خوبی ہے کہ یہ آدمی کو زیادہ دیر تک افسردہ نہیں رہنے دیتی۔ ویسے بھی بمبئی میں فرصت کے رات دن کا اس قدر کال ہے کہ تصورِ جاناں کا تصور تک محال ہے۔ یہاں لوگوں کو ایک دوسرے کی خیریت پوچھنے کا بھی وقت نہیں ملتا کیونکہ حال چال دریافت کرنے میں جتنا وقت ضائع ہوتا ہے اتنے میں آدمی گھر کا آدھا راستہ طے کر لیتا ہے سچ پوچھیے تو وقت کی قدر کرنے میں بمبئی والے سے کوئی بازی نہیں لے جا سکتا۔ وقت کی قدر و قیمت کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی کہ یہاں اگر راستے میں کوئی بے کفن لاش بھی پڑی ہو تو لوگ اسے الانگ کر نکل جاتے ہیں۔ کوئی رک کر افسوس اس لیے نہیں کرتا کہ ہر بمبئی والا یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ جو پیدا ہوا ہے اسے ایک دن مرنا ضرور ہے البتہ اگر مرنے والا خدانخواستہ ٹریفک میں خلل کا باعث بن جائے تو پھر اس کی لاش پر تبصروں کے کوڑے برسانا ہر شخص اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ یہ تبصرے بیان تبصرے عموماً اس قسم کے ہوتے ہیں۔ سالے کو مرنے کا ہی تھا تو یہ ٹرین کے نیچے کاہے کو آیا۔ اس کے پیچھے والی ٹرین میں نہیں آ سکتا تھا کیا؟
" سالے کو ادھر ہی کے مرنے کو کون بولا ...؟ بمبئی کے آجو باجو اتنا بڑا سمندر پڑا ہے۔ کیا ادھر میں جا کے نہیں مر سکتا تھا۔ بیچ میں ٹرین کو لیٹ کر دیا!!

ان بے لاگ بلکہ سفاک تبصروں سے بظاہر ایسا لگتا ہے جیسے اہلیانِ بمبئی کا سلسلۂ نسب براہِ راست چنگیز اور ہلاکو سے ملتا ہے جبکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ بمبئی والے نہ تو سفاک ہیں نہ سنگ دل بلکہ ان کی سنگ دلی اصل میں وقت کی تنگ دلی کا نتیجہ ہے، جس کے ہاتھوں یہ بے چارے خود اس قدر مجبور ہیں کہ ایک ایک منٹ ایک ایک سکنڈ کا حساب رکھتے ہیں۔ بعض اصحاب کی مصروفیات کا یہ عالم ہوتا ہے کہ غیر تو غیر ان کے اپنے بیوی بچے تک ان سے دو گھڑی چین سے بات کرنے

کوترس جاتے ہیں بلکہ انھیں بھی غیروں کی طرح ان مصروف اصحاب سے پیشگی اپائنٹمنٹ لینا پڑتا ہے ۔ مصروفیت کے ایسے دھواں دھار ماحول میں اگر آپ کو کوئی شخص کسی ایک جگہ پانچ منٹ سے زیادہ بلا مصرف کھڑا ہوا یا بیٹھا ہوا نظر آجائے تو سمجھ لیجیے کہ وہ یا تو معذور ہے یا مسافر۔!!

قصہ کوتاہ یہ کہ بمبئی میں حرکت کرنے والی ہر شئے پیمانے کی طرح چوبیس گھنٹے گردش میں رہتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جو یہاں کی زندگی کی رفتار بہت تیز ہے بلکہ اتنی تیز ہے کہ اکثر زندگی آگے نکل جاتی ہے اور آدمی پیچھے رہ جاتا ہے۔!!

غزلیں — شاطر گورکھپوری

جو مرغ اڑاتے تھے دکاں عشق کی کھولے — وہ بیچتے ہیں سڑکوں پہ اب بیٹھ کے چھولے
کب تک نہ کریں گے نگہ لطف، ادھر آپ — کب تک مجھے دیتے رہیں گے یونہی جھکولے
بہلا دیا دے کر انھیں امیدوں کی قلفی — جب پھوٹ پڑے آئے میرے دل کے پھپھولے
دستورِ محبت میں وفادار وہی ہے — پیہم جو چپت کھائے مگر آنکھ نہ کھولے
اے تشنہ لبو! ساقیِ میخانہ سے ہشیار — جُل دے کے کہیں جام میں افیون نہ گھولے
شاطر بخدا ہوتے ہیں وہ اتنے ہی سفاک — جتنے ہی حسین دیکھنے میں ہوتے ہیں بھولے

○

محبت کا کرتے ہیں اظہار ہنس کر — وہ اُلّو بناتے ہیں ہر بار ہنس کر
ملاقات ہوتی ہے جب اتفاقاً — وہ کہتا ہے مجھ کو چڑی مار ہنس کر
اگر آپ کہہ دیں، تو میں پھاند جاؤں — ابھی زندگانی کی دیوار ہنس کر
رقیبوں نے ایسی بگاڑی ہے عادت — وہ لیتے ہیں مجھ سے بھی بیگار ہنس کر
یہ سمجھو نہ آنے کا سگنل ملا ہے — کریں جب وہ آنے کا اقرار ہنس کر
میں روتا ہوں کیسے چکاؤں گا قرضہ — مناتے ہیں گھر والے تہوار ہنس کر
سناتا رہا میں سرِ بزم رو رو — وہ سنتے رہے میرے اشعار ہنس کر

کہاں تم، کہاں ان کی بکواس شاطر
مگر ہو گیا میں گنہگار ہنس کر

غزل

سوپر نزلی

آدمی مفلسی سے ڈرتا ہے — اس لیے شاعری سے ڈرتا ہے
باربر بھی ہماری بستی کا — آپ کی سرجری سے ڈرتا ہے
دل کا کیا ہے کہ سیٹ رہتا ہے — سر مگر عاشقی سے ڈرتا ہے
کیا ملا سائنس کی ترقی سے — آدمی آدمی سے ڈرتا ہے
لاکھ شوہر ہو سورما لیکن — وائف کی بیوگی سے ڈرتا ہے
بھاگے گا چھوڑ کر غزل چھیڑو — شیر بھی شاعری سے ڈرتا ہے
صاحبِ اقتدار کیوں نوپر — قوم کی یونٹی سے ڈرتا ہے

امجد علی فیض
(گلبرگہ)

منظور داخل وقار خارج

میں انھیں برسوں سے پڑھتا آرہا ہوں۔ لیکن پرسوں سے یعنی یہی کوئی پانچ سات برس سے جانتا ہوں۔ اب جان کر پچھتا رہا ہوں کہ کاش نہ جانتا ہوتو بہتر تھا۔ کیوں کہ ان کی ذات میں چند ایسی خوبیاں پائی جاتی ہیں کہ جان کر بھی انجان بننے کو جی چاہتا ہے لیکن قلم کا تقاضا ہے کہ جان کر انجان بننا ٹھیک نہیں، جو کچھ جانتا ہے لکھ۔ لہٰذا رقم طراز ہوں۔

ایک روز میرے دوست بھاگے ہوئے میرے قریب آئے اور ہانپتے ہوئے کہنے لگے۔ یار! تمھیں خبر ہے ایک مہینہ بیت گیا۔ لیکن منظور وقار کسی رسالے یا اخبار میں نہیں چھپے۔ لگتا ہے اردو ادب پر برا وقت آنے والا ہے“

میں نے کہا تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ ایک مہینے کا عرصہ گزرا ہوا اور منظور وقار کہیں نہ چھپے ہوں ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کیوں کہ ہوائیں چلتے چلتے تھک جائیں گی۔ سورج کچھ لمحے سستالے گا لیکن منظور وقار کا قلم کبھی نہ رکے گا۔ وہ چھپتے آئے ہیں چھپتے ہیں چھپتے رہیں گے“ کہنے لگے یقین نہ آئے تو چل کر دیکھ لو۔ وہ قریب ہی کسی رسالے میں چھپے اپنے مضمون کو دوستوں میں دکھلا کر کہہ رہے ہوں گے۔ کم بختوں نے ایک مہینہ بعد اس مضمون کو شائع کیا ہے۔

تو یہ ہیں منظور وقار جن کا زود نویسی میں کوئی ثانی نہیں بے تکان لکھتے ہیں۔ گمان غالب ہے کہ ان کے ہاتھ ہی میں نہیں بلکہ ہر انگلی میں ایک قلم پوشیدہ ہے یہ جس رفتار سے لکھتے ہیں اس سے کہیں زیادہ کی رفتار سے چھپتے ہیں [illegible] بیان ہے جب تک ان کی تخلیق دو چار اخباروں یا رسالوں میں شائع نہیں ہوتی اس وقت تک انھیں نیند نہیں آتی۔ ہر طرف ان کی زود نویسی کا چرچہ ہے اور یہ اس قدر لوگوں پہ طاری ہے کہ اگر ایک ہفتہ یہ کسی اخبار یا رسالے میں نظر نہ آئیں تو ادبی حلقوں میں افواہیں گشت کرتی ہیں۔

ہر کوئی ان کی تلاش میں نکل جاتا۔ کوئی دفتر تو کوئی گھر، کوئی ان کے سسرال تو کوئی تھانہ میں ان کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے چلا جاتا اور کوئی اس فکر میں لگا رہتا ... کہ اخباروں میں تشہیر کروادی جائے۔

”منظور تم کہاں ہو چلے آؤ۔ تم سے کوئی بازپرس نہیں ہوگی تمھاری تخلیقات کو سر آنکھوں پر ہی نہیں باعون [illegible] پلکوں پر سجالیا جائے گا۔ تمھارے یوں اچانک چلے جانے سے تمھارے قارئین بے حد ملول اور تمھاری بیگم بے [illegible]

خوشی میں ہیں نام جہاں کہیں بھی ہوں فوراً پہنچ آئیں۔ اگر کسی صاحب کو تلاش ہو تو بہت مہربانی ہوگی مطلع کریں یا پھر خود انہیں ساتھ لائیں۔ آمد و رفت خرچ کے علاوہ انہیں ایک تجریدی افسانہ بطور انعام پیش کیا جائے گا۔"

ابھی یہ سب باتیں ہوتی چلی جاتی ہیں کہ منظور وقار سامنے والی گلی سے اس رسالے کے ساتھ برآمد ہوتے ہیں جس میں ان کی تخلیق چھپی ہوتی ہے۔

بنیادی طور پر وہ کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ لیکن مزاح نگاری کا پرچم ان کے ہاتھ میں۔ خاکہ نگاری ان کی جیب میں۔ کالم نگاری ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل۔ الغرض نثری ادب کی تمام اصناف پہ طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ ان میں یہ کس قدر کامیاب رہے ہیں یہ فیصلہ میں ناقدین پر چھوڑتا ہوں۔

ان سے جب بھی میری ملاقات ہوتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ان سے نہیں بلکہ ان کے افسانے سے مل رہا ہوں۔ ویسے میری پہلی ملاقات بھی کچھ ایسے ماحول میں ہوئی تھی کہ میں انہیں ایک افسانہ ہی سمجھنے لگا۔ جدید افسانہ، سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

ایک دفعہ مجھے اپنے دوست کے ساتھ دفتری کام کی غرض سے گورنمنٹ کالج جانا پڑا۔ وہاں کا ماحول ایک عجیب و غریب منظر پیش کر رہا تھا۔ گورنمنٹ کالج کی پرانی عمارت ڈھا دی گئی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے ہماری پرانی یادیں جو گورنمنٹ کالج کی اس عمارت سے وابستہ تھیں۔ ملبے تلے دب گئیں۔

میرے دوست نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "دیکھئے یہ وہی کمرہ ہے جو ہر روز منظور وقار کو جھیلنے برداشت کرتا ہے۔" کمرے کے در و دیوار بھی اس بات کی چغلی کھا رہے تھے کہ یہ واقعی ایک ادیب کو برداشت کر رہے ہیں۔

کمرے کے اندر پہنچے تو کئی ایک بے سے معذور کرسیاں جن پر بیٹھنے والے پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ اپنا ایک پیر کرسی میں لگا کر بیٹھے ورنہ دوسرا پیر تو تلے اور میز بھی ایسی کہ ہاتھ رکھو تو سات منٹ تک ہلتی رہے اور اٹھا لو تو بائیس منٹ تک لرزتی رہے بلکہ قوت پر پہنچے۔ منشی جی پر ہم سے جو اُن کا تعلق ہے اس کا کام ہلا دینا نہیں بلکہ ہوا کا رخ بتانا ہے۔ ایسے ماحول میں اردو کا ادیب خیالوں میں گھرا، خیالوں میں کھویا۔ کاغذات الٹ پلٹ رہا ہے جو ہمیں دیکھتے ہی اٹھ جاتا ہے، ہم آداب عرض کرتے ہیں وہ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیتا ہے۔ اور ایک ٹوٹی پھوٹی کرسی کی طرف اشارہ کر کے ہمیں بیٹھنے کے لیے کہتا ہے۔ میرے دوست اس کرسی میں اپنا ایک پیر لگا کر بیٹھ جاتے ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ افسانے حقیقت میں کس طرح بدلتے ہیں۔

درمیانہ قد، گندمی رنگ، سلیقے سے چپکے ہوئے بال، چہرے پر مرتب اعضاء میں ناک بڑی خاص اتنی اونچی کہ چلتے ہیں اگر اسے کوئی دیکھے تو یوں لگے جیسے ان سے دو قدم آگے چل رہی ہے۔

سادگی، انکساری اور کفایت شعاری ان کی طبیعت کا خاصا، شہر کی تقریباً ہر تنظیم سے یہ وابستہ اور اردو د

اردو والوں سے ان کا رشتہ ہے۔ میں ادب کے معاملے میں محض عمل کے قائل نہیں۔ وہ واردات کے کسی پہر کہیں بھی شرفِ ملاقات بخشیں گے، کچھ سنیں گے، کچھ سنائیں گے، کچھ ہنسیں گے، کچھ ہنسائیں گے اور چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔ میں نے ان چند برسوں میں ان کے ساتھ رہ کر یہ جانا کہ ان کے مزاج کو سمجھنا، خرگوش پکڑنے کے برابر ہے پکڑنے جاؤ تو پھدک جاتے اور کبھی ہاتھ نہ آتے۔

کبھی نہیں آتا ملال کہ میں نے انھیں کئی بار غصہ دلانے کی کوشش کی لیکن ہر بار مایوسی کا بلکہ اپنا غصہ دیکھنا پڑا۔ ایک دن میں دفتر میں بیٹھا تھا کہ اچانک اطلاع ملی منظور وقار روشن ہوٹل پر پائے جاتے ہیں اور شدید غصے میں نہ جانے کیا کیا کہہ رہے ہیں، برسوں کی آرزو لمحوں میں پوری ہوتی نظر آئی اور میں ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر جائے واردات پہنچا تو پتہ چلا کہ بادل گرجے اور برس بھی گئے۔ اب ہواؤں میں خنکی پائی جاتی ہے البتہ کہیں کہیں بجلیاں چمک رہی تھیں۔

ان کی مہمان نوازی بھی سادہ تکلفات سے عاری، گھر میں جو کچھ بھی ہو جیسا بھی ہو مہمان کے آگے پیش کر کے طمانیت محسوس کرتے ہیں۔

روزمرہ کے معمولات میں انھوں نے ایک ایسے میزان کا انتخاب کیا ہے جس کے ایک پلڑے میں ادب، دوسرے میں زندگی ہے اس نظم و ضبط کے ساتھ ان دونوں پلڑوں کا توازن برقرار رکھے ہوئے آپ ہیں نہ کبھی ادب کا پلڑا کمزور ہو جاتا ہے اور نہ ہی کبھی زندگی کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے۔

ممتاز دانشور جناب سید مجیب الرحمن نے قلم کاروں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا "آپ لوگ شاہکار کی تلاش میں نہ رہیں بلکہ تخلیقی عمل کو جاری رکھیں، شاہکار تخلیق تو اپنے آپ جنم لے گی"۔ شاید منظور وقار نے بھی اس رائے سے اتفاق کر لیا ہے کیوں کہ یہ بھی لکھ رہے ہیں اور صرف لکھ رہے ہیں۔ شاہکار تخلیق کی انہیں کوئی فکر نہیں لیکن میرا دعویٰ ہے کہ ایک دن ضرور ان کے قلم سے شاہکار تخلیق جنم لے گی۔ ایسی تخلیق جس کی گونج برسوں سنائی دے گی۔ ▫

[یہ خاکہ منظور وقار کی اولین تصنیف "ہنسنا منع ہے" کی رسم اجرا منعقدہ ۸ر جولائی ۹۰ء کو پڑھا گیا]

رؤف پاریکھ (کراچی)

ذکر تین مزاحیہ کتابوں کا

۱۹۸۹ء کا سال اس لحاظ سے بہت خوش کن ہے کہ اس سال ابن انشار، شفیق الرحمٰن، سید ضمیر جعفری، محمد خالد اختر اور صدیق سالک جیسے مزاح نگاروں کی نئی کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ ابن انشا کی کتاب "نگری نگری پھرا مسافر" اور صدیق سالک کی کتاب "سلیوٹ" ان کی پس مرگ Posthumous کتابوں میں شامل ہیں۔ محمد خالد اختر کی ایک نئی کتاب قارئین کو ۱۹۸۹ء میں پڑھنے کو ملی یعنی مکاتیب خضر" ضمیر جعفری کی دو پرانی کتابوں" مافی الضمیر" اور ضمیریات" کے نئے ایڈیشنوں کے علاوہ ان کی دو نئی کتابیں" کالے گورے سپاہی" اور" ضمیر ظرافت" بھی منظرِ عام پر آئیں۔ شفیق الرحمٰن نے" دریچے" کی صورت میں قارئین کی دل بستگی کا سامان کیا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ بھارت کے چوٹی کے مزاح نگاروں یعنی یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کی کتابوں سے منتخب تحریروں کے مجموعے (علی الترتیب) "زیرِ غور" اور "قطع کلام" کے نام سے شائع ہوتے ہیں۔ نیز بعض نسبتاً کم معروف مزاح نگاروں مثلاً مظفر بخاری کی کتابیں بھی چھپی ہیں۔

ایسے میں جب کہ ملک کا سیاسی افق غبار آلود ہے اور لوگ حوصلے کے لیے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں، مزاحیہ کتابوں کی فراوانی ایک خوش آئند علامت ہے کیوں کہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قوم ابھی ہنسنا نہیں بھولی اور جو قوم دگرگوں حالات میں ہنس سکتی ہے اس کی حوصلہ مندی میں کسے کلام ہو سکتا ہے ویسے بھی مشتاق احمد یوسفی صاحب کہہ چکے ہیں کہ حسِ مزاح ہی دراصل انسان کی چھٹی حس ہے۔ اگر یہ حس پاس ہو تو انسان ہر مشکل سے ہنستا کھیلتا نکل آتا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے ایک واقعہ کہیں نقل کیا ہے جس سے انگریزوں کی ہمہ وقت بیدار رہنے والی حسِ مزاح اور ہمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ دوسری جنگِ عظیم میں جب فرانس اور بعض دیگر ممالک پر جرمنوں کا قبضہ ہو گیا اور جرمن طیارے لندن پر دن رات بمباری کر رہے تھے تو لندن کی تباہ شدہ عمارات کے ملبے اور اٹھتے ہوئے دھوئیں میں سے دو انگریز برآمد ہوئے۔ ایک نے سگار سلگایا اور بولا "چیئرز! اب ہم فائنل میں پہنچ گئے ہیں۔"

آج ان تازہ بہ تازہ نو بہ نو مزاحیہ کتابوں میں سے تین کا تعارف مقصود ہے۔

مکاتیبِ خضر

یہ خطوطِ غالب کی طرز پر لکھے ہوئے طنزیہ خطوط کا مجموعہ ہے۔ یہ خطوط محمد خالد اختر نے معروف اور غیر معروف لوگوں کے نام ۱۹۷۰ء سے لے کر ۱۹۸۰ء تک لکھے تھے یہ خطوط پہلے "افکار" اور بعض دیگر ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں ان خطوط کو تحریف Parody کہنے کی بجائے Burlesque کہنا غالباً موزوں تر ہوگا۔

محمد خالد اختر ہمارے کہنہ مشق طنز نگاروں میں شامل ہیں۔ ان کی دیگر کتابوں میں "کھویا ہوا افق" "بیس سو گیارہ (۲۰۱۱ء)" "چاکی واڑہ میں وصال" "دو سفر" اور "چچا عبدالباقی" شامل ہیں۔

"مکاتیبِ خضر" میں ایک خاص بات یہ محسوس ہوتی ہے کہ اس میں خالد کا اسلوب ایک حیرت انگیز تبدیلی سے دوچار رہا ہے۔ ان کی پہلی کتاب "بیس سو گیارہ (۲۰۱۱ء)" میں بالخصوص اور بعد کی کتابوں میں بالعموم ان کے اسلوب پر انگریزی کی گہری چھاپ محسوس ہوتی ہے یہ انگریزی ادب سے ان کے والہانہ لگاؤ کا نتیجہ ہے۔ بعض اوقات وہ انگریزی تراکیب اور محاورات کے لفظی ترجمے کر دیتے ہیں۔ لیکن "مکاتیبِ خضر" چوں کہ غالب کے خطوط کے انداز پہ لکھے گئے خط ہیں لہٰذا لامحالہ انھیں ایسی زبان لکھنی پڑی جو نہ صرف غالب کے مخصوص انداز میں ہو بلکہ انگریزی کے بعض ناگزیر الفاظ بھی اگر اس میں آئیں تو اسی انداز اور تلفظ میں جس انداز میں غالب انھیں برتتے تھے (مثلاً غالب نے سیکریٹری کو سکتر لکھا)

خالد اپنی زبان اور اسلوب میں تو قابلِ تعریف تبدیلی کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن ہو بہو غالب کی سی اردو لکھنے میں انھیں خاص کامیابی نہیں ہوئی ہے اگرچہ بعض خطوط یا بعض خطوط کے کچھ پیرے ضرور غالب سے محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن غالب کا اسلوب درحقیقت صحیح معنوں میں ناقابلِ تقلید ہے خالد ہی کی طرح کچھ اور لوگ پہلے بھی اس انداز کو برتنے کی کوشش کر چکے ہیں جن میں انشا اور انور سدید "غالب کے نئے خطوط" سر فہرست ہیں لیکن خالد ہی کی طرح ان سب کو جزوی کامیابی ہوئی ہے۔ خاص طور پر جب خالد جذباتی ہو جاتے ہیں تو ان کا اسلوب غالب سے قطعی مختلف ہو جاتا ہے۔ "ایک چھوٹے لڑکے یعقوب کے نام" خط اس کی بہترین مثال ہے۔ ایسی ہی بعض دیگر مثالیں موجود ہیں۔

دوسری بات جو غالب اور خالد کے اسلوب میں خطِ امتیاز کھینچتی ہے وہ یہ ہے کہ غالب بنیادی طور پر مزاح نگار تھے جبکہ خالد اصلاً طنز نگار ہیں۔ غالب اگر طنز بھی کرتے ہیں تو شگفتگی کے ساتھ۔ ان کا مزاج تلخی اور تمسخر سے قطعی پاک ہے۔ لیکن خالد سیاسی اور سماجی مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے فطرتاً طنز کر جاتے ہیں۔ . . . ایک مخصوص سیاسی اور معاشی نقطۂ نظر کا حامل ہونے اور ان مسائل پر کڑھنے کی وجہ سے اس کی تلخ اندیشی Cynicism خالد کو غالب سے قطعی الگ کر دیتی ہے۔ غالب دکھوں پر مسکراتے ہیں خالد رنجیدہ ہو کر طنز کرنے لگتے ہیں۔

لیکن "مکاتیبِ خضر" اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے اردو کے طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں یادگار ثابت ہوگی مثلاً خالد نے بعض سیاسی اور سماجی مسائل پر اپنے مخصوص انداز اور مخصوص نظریات کے تحت روشنی ڈالی ہے اور ان کے

بعض بیلوں کی پیٹھ پہ بیٹھے ہوتے گہرے اور بھرپور طنز کیے ہیں بعض خطوط مثلاً مولانا مودودی کے نام اور ذوالفقار علی بھٹو کے نام ۔ ۔ ۔ وغیرہ اپنی دل چسپی، معنویت اور لطف کے لیے خاص طور پر زندۂ جاوید رہیں گے۔ "مکاتیب خضر" میں محمد خالد اختر کا فن نئی بلندیوں کو چھوتا نظر آتا ہے انھوں نے اپنے ریکارڈ کو بہتر بنایا ہے اس کتاب نے محمد خالد اختر کی طنز نگار کی حیثیت کو مزید مستحکم کر دیا ہے۔

دریچے

شفیق الرحمن کی نئی کتاب "دریچے" اور ان کی آخری کتاب "دجلہ" میں نو سال کا فصل ہے۔ "دجلہ" شفیق الرحمن کے مخصوص انداز کی حامل تھی جبکہ دریچے ذرا مختلف انداز لیے ہوئے ہے اگرچہ اس میں بھی کئی مضامین میں شفیق الرحمن نے حسب معمول خالص مزاح اور بذلہ سنجی سے کام لیا ہے اور کہیں کہیں ان کی خاص انداز کی رومانیت بھی جھلکتی ہے (مثلاً مضمون "فارس کے بت" میں) "دریچے" میں ان کے چٹکلے، لطیفے اور جملے بازی بھی ہے لیکن اس میں دو نئی اور مختلف باتیں محسوس ہوتی ہیں جو شفیق الرحمن کی گزشتہ کتابوں یعنی شگوفے، لہریں، حماقتیں، مزید حماقتیں، کرنیں، پچھتاوے اور مد و جزر سے ہٹ کر ہیں۔

ایک تو ان کے ہاں لفظی مزاح اور طنز بڑھ گیا ہے گو ان کی گزشتہ کتابوں میں بھی طنز تھا لیکن بہت کم اور یہ طنز بالعموم شگفتہ تھا۔ لفظی مزاح ان کے ہاں تھا لیکن اعتدال کے ساتھ "دریچے" میں دونوں پہلے سے بڑھ کر ہیں خاص طور پر اس کے مضمون "استفسارات و جوابات" میں۔

دوسری مختلف بات یہ ہے کہ اس کتاب میں شفیق الرحمن کے دو شخصی خاکے نما تنقیدی مضامین شامل ہیں جن میں انھوں نے ضمیر جعفری، انشاء اور فکر تونسوی کی شخصیت اور فن پر ہلکے پھلکے انداز میں روشنی ڈالی ہے یہ "مختلف" اس لیے لگتا ہے کہ شفیق الرحمن نے پہلی بار اس قسم کے مضامین لکھے ہیں فکر تونسوی پر لکھا گیا یہ مضمون جو "تناظر" بمبئی اور "ادب لطیف" لاہور میں بھی چھپ چکا ہے غالباً اس کتاب کا بہترین مضمون ہے اس کی بے ساختگی، برجستگی، شگفتگی اور نقادوں اور محققوں پر کیا گیا شگفتہ طنز قابلِ داد ہیں۔

"اس کتاب میں شامل "عکسِ تقدیر" ایک کافی پرانا مضمون ہے جو شفیق الرحمن کے کسی اور مجموعے میں شامل نہیں یہ مضمون تیس پینتیس سال قبل "افکار" میں چھپا تھا۔ "کام چور بھوت" اور "افواہیں" میں شفیق الرحمن کا مخصوص انداز موجود ہے جو ان کے دیگر مجموعوں کی یاد دلاتا ہے۔

اس کتاب میں شامل مضامین کا اگر کڑا انتخاب کیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا کیوں کہ موجودہ صورت میں اسے دیکھ کر شفیق الرحمن کے فن میں نکھار کی بجائے زوال کا احساس ہوتا ہے۔ "دجلہ" میں انھوں نے اگر اپنے معیار کو بڑھایا نہیں تھا تو اسے گرنے بھی نہیں دیا تھا، لیکن "دریچے" پڑھ کر شاید شفیق الرحمن کے بہت سے مداحوں کو مایوسی ہو۔

نگری نگری پھرا مسافر

مندرجہ بالا سطور میں جو بات شفیق الرحمٰن کے لیے دریچے کے حوالے سے کہی گئی ہے ابنِ انشاء کے بارے میں بھی "نگری نگری پھرا مسافر" پڑھ کر کہی جاسکتی ہے۔ ابنِ انشاء کا شمار ہمارے ان صاحبِ طرز مزاح نگاروں میں ہونا چاہیے جن کا سا لکھنا بہت سوں کی آرزو ہے۔ انشاء جی نے اردو مزاح کو "چلتے ہو تو چین کو چلیے" "اردو کی آخری کتاب" "آوارہ گرد کی ڈائری" "دنیا گول ہے" "ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں" اور "خمارِ گندم" جیسی شگفتہ کتابیں دی ہیں لیکن "نگری نگری پھرا مسافر" میں ہمارا یہ بے مثل مزاح نگار زود نویسی اور بسیار نویسی کی وجہ سے تھکن یا یکسانیت کا شکار نظر آتا ہے۔

اگرچہ اس سفرنامے میں انشاء کا مخصوص انداز، ان کی مخصوص زبان و تراکیب، چلتے چلتے ہمارے معاشرے کی خامیوں پر چوٹ کرنے اور پاکستان کو بہتر بنانے کی آرزو حسبِ معمول ابھی کچھ موجود ہے لیکن ان کی شگفتگی اور بذلہ سنجی میں وہ توانائی نظر نہیں آتی جو ان کا خاصہ تھی۔

اس کتاب میں جاپان، روس اور لندن کی مسافرت کا احوال ہے۔ یہ سفر انھوں نے اپنی وفات سے چند سال پیشتر کیے تھے۔ آخری ایام میں بسلسلۂ ملازمت اور علاج لندن میں مقیم ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لندن سے متعلق سفر کا احوال سفرنامہ کم اور کالم زیادہ لگتا ہے بلکہ بعض کالم بھی اس کتاب میں شامل کر دیئے گئے ہیں غالباً اس لیے کہ قیامِ لندن کے دوران لکھے گئے تھے۔ بہتر ہوتا کہ ان کو انشاء جی کے کالموں کے زیرِ طبع دوسرے مجموعے میں شامل کیا جاتا۔

ان کتابوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد خالد کا گراف اوپر جا رہا ہے جبکہ شفیق الرحمٰن اور ابنِ انشاء کا گراف نیچے آیا ہے

منظور وقار کی کتاب "ہنسا منع ہے" کی رسم اجرا

گلبرگہ ۸ر جولائی ۱۹۹۰ء ممتاز ادیب و نقاد ڈاکٹر طیب انصاری (صدر انجمن ترقی پسند مصنفین گلبرگہ) نے تخلیق کاروں پر زور دیا کہ وہ زندگی کی صالح قدروں کا تحفظ کریں اور اپنے تخلیقی عمل کو با مقصد بنائیں۔ ڈاکٹر طیب انصاری نئی نسل کے ممتاز مزاح نگار و افسانہ نگار جناب منظور وقار کی اولین تصنیف "ہنسا منع ہے" کی تقریب رسم رونمائی کے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ رسم اجرا کا جلسہ انجمن ترقی پسند مصنفین گلبرگہ کی جانب سے ۸ر جولائی ۹۰ کو گلبرگہ میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر انصاری نے کہا کہ 'ہنسا منع ہے' کے مضامین میں اس قدر طنز و مزاح ہے کہ قاری ہنستے ہنستے آنسو بہانے لگتا ہے اور یہی وہ فن ہے جو منظور وقار کو دیگر مزاح نگاروں میں منفرد بناتا ہے۔ "ہنسا منع ہے" کی رسم رونمائی انجام دینے کے بعد پروفیسر جے۔ راما (پرنسپل گورنمنٹ کالج گلبرگہ) نے اپنے خطاب میں کہا کہ گورنمنٹ کالج گلبرگہ علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔ منظور وقار اسی مرکز کی پیداوار ہیں۔ ممتاز مزاح نگار محترمہ ڈاکٹر حبیب ضیا (ریڈر جامعہ عثمانیہ) نے منظور وقار کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا زندگی کے حقائق کو مزاح کا روپ دینا مشکل ترین کام ہے۔ منظور وقار اس فن کو خوب جانتے ہیں۔ ان کی کتاب "ہنسا منع ہے" کے مضامین اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ زندگی سے وابستہ مختلف مسائل پر منظور وقار کی ضرب بہت کا ... ہے۔ ممتاز قانون داں محترم عبدالرحیم آمند نے اس بات پر اظہار مسرت کیا کہ اردو زبان کے تخلیق کاروں میں نوجوان طبقہ آگے بڑھ رہا ہے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو منوا رہا ہے۔ جناب جلیل تنویر (معتمد عمومی) نے منظور وقار کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ وہ شہر کے واحد قلم کار ہیں جو بہت زیادہ لکھنے اور چھپنے پر ایقان رکھتے ہیں۔

منظور وقار کی ادبی عمر زیادہ نہیں مگر انھوں نے اس قدر لکھا کہ اس کا یقین نہیں کیا جا سکتا۔ ممتاز شاعرہ و نقاد محترمہ صغریٰ عالم نے اپنے مقالے میں منظور وقار کی کتاب "ہنسا منع ہے" کا تنقیدی جائزہ لیا۔ جناب عزیز اللہ سرمست (مدیر روزنامہ بہمنی نیوز) نے اپنی تقریر میں کہا منظور وقار بے پناہ تخلیقی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ ان کی تخلیقی صلاحیتیں قابل رشک ہیں۔ جواں سال مزاح نگار امجد علی فیض نے منظور وقار پر دلچسپ خاکہ پیش کیا۔

اس موقع پر منظور وقار نے اپنا مزاحیہ مضمون "دھڑا دھڑ علاج دواخانہ" سنا کر محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ ممتاز شعرا جناب محب کوثر اور جناب وقار ریاض نے اپنی تہنیتی نظموں میں منظور وقار کی فنی صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کیا۔ شہر کی مختلف ادبی اور تہذیبی تنظیموں نے منظور وقار کی بکثرت گل پوشی کی۔ چاند اکبر کے شکریے پر جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

(جلیل تنویر)

ماہنامہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۲۳
شمارہ ۹

ستمبر ۱۹۹۰ء

مدیر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت:
محمد حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم
طالب خوندمیری

مجلسِ مشاورت:
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
یوسف ناظم
مجتبیٰ حسین

خصوصی نمائندے:
بمبئی — فیاض صدیقی
ریاض — عابد معز
دوبئی — غلام محی الدین
آسٹریلیا — ایس ایم حسینی

کتابت: محمود سلیم، ایم اے رؤف

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد

فی پرچہ: ۵ روپے
زرِ سالانہ: ۵۵ روپے
لائبریریوں سے: ۶۰ روپے
بیرونی ممالک: ۱۸۰ روپے

ترسیلِ زر کا پتہ:

دفترِ شگوفہ، ۳۱۔ ٹیچرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
فون آفس: 557716 مکان: 521064

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

نریندر لوتھر

ایک ملک، دو تہوار

سفرنامۂ امریکہ ★ قسط ۱۳ ب

نیویارک میں ہم اپنے ایک سکھ دوست کے ہاں رہے۔ وہ وہاں انگریزی کا پروفیسر ہے۔ اس کی بیوی حساب کی پروفیسر ہے لیکن اس کے باوجود وہ ابھی ڈگریوں پر ڈگریاں لیے جارہی ہے۔ جن دنوں ہم وہاں تھے وہ کمپیوٹر کی ڈگری حاصل کرنے کی تیاری کررہی تھی۔ ہمارا دوست امرت بڑا عجیب قسم کا پروفیسر ہے۔ اُسے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ (عام طور پر پروفیسروں کو تو پڑھانے کا شوق بھی نہیں ہوتا۔) پڑھنے کے علاوہ اسے کتابوں کا بھی بہت شوق ہے۔ جو کتابیں وہ پڑھ نہیں سکتا خرید لیتا ہے۔ ہماری بھی یہی عادت ہے۔ جو کتاب ہم دوسروں کو پڑھوانا چاہتے ہیں وہ ہم خرید لیتے ہیں۔ کبھی کبھی، کوئی نہ کوئی شخص وہ کتاب اُدھار مانگ کر لے جاتا ہے۔ پھر وہ کتاب واپس نہیں آتی۔ ہم بھی دوسروں کی کتابوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ ذاتی لائبریریاں اسی طرح باہمی لین دین سے بنتی ہیں۔ ہمیں کتابیں ادھار دینے کا تو خاصا تجربہ ہے لیکن حیرانی صرف ایک بار ہوئی، جب ہمارا ایک دوست ہم سے بہت ساری کتابیں ادھار لینے کے بعد ایک دن ایک بک شیلف اُدھار مانگنے آن پہنچا۔ کتابوں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ کلاسک کتاب وہ ہوتی ہے جس کی سب لوگ تعریف تو کرتے ہیں لیکن پڑھتا کوئی نہیں۔ امریکن مزاح نگار مینکن کا کہنا ہے کتابیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جنھیں کوئی پڑھتا نہیں اور دوسری وہ جنھیں پڑھنا نہیں چاہیئے۔ عموماً لوگ دو قسم کی کتابیں خریدتے ہیں۔ ایک پڑھنے کے لیے اور دوسری لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے۔ امرت کے پاس کئی کتابیں تھیں۔ ان میں سے کچھ کتابیں اُس نے ہمارے گلے باندھنے کی کوشش کی جو اس کے پاس بغرض ریویو آئی تھیں۔ جب ہم نے اس سے ان کے بارے میں اس کی رائے پوچھی تو اُس نے کہا، بھئی مجھے پڑھنے کی فرصت تو نہیں ملی۔ میں نے تو ریویو لکھ دیا۔ تم چاہتے ہو تو ریویو ہی پڑھ لو۔ ہم نے بھی یہ طریقہ بہتر سمجھا۔ بجائے کتابوں کا بوجھ اُٹھانے کے ان کے ریویو کی کاپیاں لے کر پڑھ ڈالیں۔ تو اُس سے امرت کا کتابوں کی نکاسی کا مسئلہ جوں کا توں رہا۔ شاید اگلی بار وہ کسی اور ہندوستانی دوست

کو پھیلا دو غلاکر اپنی اسکیم میں کامیاب ہوسکے۔ بیگم بھی کتابیں خریدنے کے خلاف تھیں کہ اس سے خواہ مخواہ پیسے خرچ ہوتے ہیں اور سامان کا بوجھ بڑھتا ہے لیکن اس کے باوجود ہم نیویارک میں ایک دُکان پر گئے جو پرانی کتابوں کی دنیا کی سب سے بڑی دُکان ہے۔ یہ کئی منزلہ دکان ہے اور یہاں کتابیں لائبریری سسٹم پر رکھی جاتی ہیں۔ اس کے شیلفوں کی لمبائی ۸ میل ہے۔ اس دکان سے جس کا نام سٹرینڈ STRAND ہے۔ واقعی ہمیں ایسی نایاب کتابیں ملیں جنھیں ہم اپنی پیدائش سے پہلے سے ڈھونڈتے چلے آرہے تھے بلکہ مستقبل کے کئی مورخ بھی اُن کتابوں کی تلاش میں سرگرداں ہوں گے۔ اس دکان پر جاکر واقعی ہمارا جنم سپھل ہوگیا۔

پروفیسر امرت سنگھ کے ساتھ مل کر ہم نے اپنی کچھ نظموں کا جو اُسے پسند آئیں انگریزی میں ترجمہ کیا۔ پھر اُس کی تجویز پر بغرضِ اشاعت انھیں وہیں چھوڑ آئے۔ وہاں ہم کسی اہم شخصیت سے نہیں ملے۔ ہم نے کوئی تھیٹر بھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ ہم گریگوری منن کے اس قول سے باخبر تھے کہ نیویارک جانا اور تھیٹر نہ دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے ساری رات ایک عورت کے ساتھ گزار کر اس سے پیار نہ کرنا! —— ہاں وہاں کی یونیورسٹی دیکھی۔ کئی پروفیسروں سے ملے۔ نیویارک کی برف باری دیکھی، وہاں کے امیر لوگ دیکھے، غریبوں سے ملے۔ عمارتیں دیکھیں گاڑیوں کو ہاتھ لگایا لیکن ایک بار بھی ہمارے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ کاش ہم لوگ بھی نیویارک یا امریکہ میں آکر رہ سکیں۔

نیویارک میں ہم نے نیا سال منایا۔ امرت نے ایک ہندوستانی پروفیسر دوست کے ساتھ پروگرام بنایا کہ ہم سب شام کو اُس کے گھر جائیں گے اور نئے سال کا جشن منانے کے بعد رات وہیں گزاریں گے۔ ہم نے بڑے چاؤ سے اپنا کالا سوٹ پہن لیا کہ پتہ نہیں کس قسم کا ... ہوگا اور نہ جانے کتنے اور لوگ وہاں ہوں گے۔ وہاں پہنچے تو صاحبِ خانہ پاجامہ کرتا پہنے ہوئے تھے۔ اُن کی بوڑھی ماں نے پنجابی کھانا بنایا، ان کی ادھیڑ عمر کی بیوی نے ٹی۔ وی لگادیا اور صاحبِ خانہ خود شیمپین کی بوتل کھولنے میں مصروف ہوگئے۔

دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو لوگوں کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں اور دوسرے ایسا نہیں کرتے۔ ہم پہلے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے ہم جشن کے تعلق سے لوگوں کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک وہ جو خود جشن مناتے ہیں دوسرے وہ جو جشن منانے والوں کو دیکھ کر مطمئن ہوجاتے ہیں۔ اُس شام پہلی قسم کے تمام لوگ نیویارک کے ٹائم سکوئر میں پہنچے ہوئے تھے لیکن ہم صرف تماشائی تھے اور وہ بھی دُور کے درشن سے یعنی امریکن ٹی وی پر۔ ایسا لگتا تھا کہ ساری دُنیا ٹائم سکوئر میں اُمڈ آئی تھی لیکن ہم غیر وطن میں اپنے ہم وطنوں کے ساتھ نظر بند تھے۔ بڑی مشکل سے رات کے بارہ بجے ہم نے مناسب یہی سمجھا کہ یہ بات ہمارے میزبان اور اُن کے میزبان کے نوٹس میں نہ لائی جائے۔ لیکن ٹی۔ وی کا کام ہی ہے تشہیر کرنا۔ اِدھر ٹائم سکوئر کے گھڑیال نے ہماری عمر سے ایک سال اور کم کرنے کی منادی کی۔ اُدھر اس خوشی میں سب لوگوں نے ایک دوسرے سے بغلگیر ہونا شروع کردیا۔ عورتیں، عورتوں سے اور مرد، مردوں سے بغلگیر ہوئے۔ پھر خاوند، بیویوں سے بغلگیر ہوئے۔ پھر غیر مردوں نے غیر عورتوں کو ہاتھ جوڑ کر مُبارک باد دی۔ پارٹی بڑی کامیاب رہی۔ اِدھر نیا سال کمرے میں داخل ہوا۔ اُدھر ہم دوسرے دروازے سے نکل کر سونے والے کمرے میں چلے گئے۔

:

ہم ہر سال نئے ریزولیشن پاس کرتے ہیں اور جیسے ہی نیا سال شروع ہوتا ہے وہ پاش ہوجاتے ہیں۔ ہمارے گھر اور گلیوں میں بے شمار سالوں کے پاش پاش ہوئے ریزولیشن بکھرے پڑے ہیں لیکن اس سال ہم نے ایک ایسا عزم کیا جو جلدی ہی اپنی تکمیل تک پہنچ گیا۔ وہ ریزولیشن یہ تھا کہ آنے والے سال میں ہم اپنے ملک واپس چلے جائیں گے اور اس طرح

امریکہ کے لیے ویزا اِشو کرنے والے سب افسروں کے اس خدشے کو جھٹلائیں گے کہ امریکہ کا ویزا لینے والا ہر ہندوستانی مستقلاً بس جانے کے ارادے سے امریکہ جاتا ہے۔

دو دنوں کے بعد ہم نے نیویارک میں امریکہ کی آخری شاپنگ کی۔ امریکہ سے واپس ہونے والے [illegible] ان آخری رسوم کے لیے نیویارک میں دو تین ہندوستانی دکانیں مختص ہیں۔ ان کے مالکوں اور کارندوں کو [illegible] ہندوستانی کس قسم کی چیزیں خریدنا چاہتے ہیں۔ ہم ابھی دکان کے اندر داخل ہی ہوئے تھے کہ ایک شخص نے بڑے بے تکلفی سے ہمارا نام، ولدیت، شہر کا نام، ہمارا پیشہ، اور امریکہ آنے کی وجہ پوچھی۔ یہ معلومات حاصل کرتے ہی اُس نے دو تالیاں بجائیں تب آناً فاناً دو جمہوروں نے ایک وی۔سی۔آر، ایک بلا تار کا فون، ایک کیمرہ، عورتوں کے عطر اور سنگھار کا سامان اور چند مختلف قسم کے تحفے پیک کر دیئے۔ ہم اس سمارٹ نس پر مسکرائے اور ان سے پوچھا یہ سب چیزیں کیسے لے کر جائیں گے اُس نے ایک اور تالی بجائی۔ ایک سوٹ کیس بھی پیک ہوگیا۔ غالباً ان لوگوں نے کے۔آصف کی فلم 'مغل اعظم' میں اکسٹراز کے رول میں کام کیا ہوگا۔ تبھی تو وہ تالیوں کے کوڈ کو اس ہوشیاری سے سمجھتے تھے۔ ہم نے پھر دریافت کیا کہ ان سب چیزوں کی قیمت کیسے چکائیں گے۔ اب کی بار ایک مالک نما شخص آگے بڑھا۔ اُس نے نہایت ادب سے کہا۔ کوئی فکر نہیں آپ کے میزبان سے وصول کرلیں گے۔ ہم نے اپنے میزبان امرت کی طرف دیکھا۔ ایک دبی ہوئی شرمندہ مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر آگئی۔ واقعی یہ سودا تو بڑا سستا نکلا!

اب ہم سامان برداری کے قابل ہو چکے تھے۔ ہر لحاظ سے نارمل تھے۔ حجامتِ صحت بھی بار بار کر چکے تھے۔ سیر کافی ہو چکی تھی اب ہمارے دل میں ایک بار پھر کام کرنے کی خواہش پیدا ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ ہماری بیماری ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ پتہ نہیں ان پچھلے تین مہینوں میں وطنِ عزیز کی حالت کیا ہو گئی ہوگی۔ ہمارے دل میں ایک پرانا سویا ہوا جذبہ جاگ رہا تھا۔ عوام کی خدمت کا۔ "یہ کیا ہو رہا تھا؟ ہم عوام پر پھر اپنا تن اور من نچھاور کرنا چاہنے لگے تھے۔ دھن تو ہمارے پاس کبھی اتنا تھا ہی نہیں کہ اس کی تن اور من کے ساتھ ملاوٹ کر دیتے۔ ویسے ملاوٹ کی ہماری عادت ہی نہیں (اس موضوع پر ملاحظہ ہو ہمارا مضمون 'ملاوٹ') سچ بات تو یہ ہے کہ ہم دھن کے لیے ہی تن اور من کا استعمال کرتے ہیں اور پھر ابھی حال ہی میں ہم نے نئے دل کے ساتھ 'نئی دنیا' میں نئے سال کا ریزولیشن پاس کیا تھا۔

اسی ریزولیشن کے مطابق ہم نے اپنے گھوڑے کا رُخ اپنے ملک کی طرف موڑ دیا۔

★

جناب نریندر لوتھر کے سفر نامہ کی ۱۳ ویں (ب) قسط اس شمارے میں شائع کی جا رہی ہے آخری ـــ (۱۴ ویں) قسط "دنیا کا آخری ملک" کے زیرِ عنوان جنوری ۱۹۸۹ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اِس طرح سفر نامہ کا یہ سلسلہ ۱۳ ویں قسط پر ختم کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

رضا نقوی واہی
(پٹنہ)

دوڑ پیچھے کی طرف...

تیل کے چشموں پہ آدھمکی ہے فوجِ ابرہہ
اب نہ اُس کی واپسی کا بھول کر لے نام تو
اب نہ آئے گی بچانے کو ابابیلی سپاہ
لاکھ سر سے باندھ اپنے جامۂ احرام تو
لڑ رہے ہیں وہ تو خود اِک دوسرے سے سرد جنگ
اِن پرندوں سے نہ لے پائے گا کوئی کام تو
مشرقِ وسطیٰ صلیبی جنگ کے سائے میں ہے
اپنی غفلت کا نہ دے اغیار پہ الزام تو
ہے مثل مشہور جس کی لاٹھی اس کی بھینس ہے
اس مقولے کا کیا کر وِردِ صبح و شام تو
زد میں بندر بانٹ کی پیٹرول کا بھنڈار ہے
اور ترستا ہے کھڑا چشمے پہ تشنہ کام تو
عین ممکن ہے کہ پیدل ہی سفر کرنا پڑے
سوچ لے اس ناکہ بندی کا بُرا انجام تو
قبل اس کے، تو نہ واہی ہو کہیں بے دست و پا
چھوڑ موٹر کار، اور لے سائیکل سے کام تو
تاکہ جنگل ایج کی یادیں تر و تازہ رہیں
"دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو"

محبی، خوش رہیے۔ اگست کا شگوفہ ملا۔ حسبِ معمول، حصۂ نثر بہت اچھا ہے اور بعض نظمیں بھی خوب ہیں۔ جی خوش ہوا کہ حصۂ نظم میں خوشگوار تبدیلی آ رہی ہے۔ رشید سمیع جلیل کا "سہرا" بہت اچھا ہے انھیں مبارکباد دے دیجیے۔ ایک مشاعرہ ہونے والا ہے جس کا مصرعِ طرح یہ ہے

"دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو"

میں نے چند اشعار پر مشتمل ایک قطعہ اس زمین میں لکھا ہے موضوع ہے خلیج عرب پر جنگ کے منڈلاتے ہوئے بادل۔ بہت دنوں سے شاعری چھوٹی ہوئی ہے یہ موضوع نیا ہے اس لیے طبیعت اس جانب راغب ہو گئی

والسلام رضا نقوی واہی

ڈاکٹر محمود علی۔ سڈنی
آسٹریلیا

وارد ہونا مہاجرین کا ملک آسٹریلیا میں

سعودی عرب میں جب خاک چھانتے اور ریت پھانکتے تین سال ہو گئے اور سبزہ زاروں کو جی ترس گیا تو بیگم کی خدمت میں جو اُس وقت پاکستان میں تشریف فرما تھیں عرضداشت بھیجی ؎

چلتی ہیں تو سڈنی چلئے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات نئے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم بادو باراں ہے

جواب بصورتِ عتاب نازل ہوا "آپ کے پیروں میں تو سنیچر ہے۔ کسی جگہ پر قیام نہیں، صبح کہیں تو شام کہیں۔ لکھنؤ میں ولادت ہوئی۔ دارالعلوم ندوۃ میں چندے تعلیم پائی تھی کہ عالم طفلی میں ارضِ دکن کی راہ لی۔ وہاں پہنچے تو نیا شگوفہ کھلا اور پتہ چلا ؎

فانیؔ دکن میں آکے یہ عقدہ کھُلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دُور

تعلیم میں منہمک ہوئے۔ علمِ طب میں سند حاصل کی تو سر میں یورپ کا سودا سمایا۔ اُس وقت تو خیر یہ بہانہ تھا ؎

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

مُلکِ فرنگ کا کیا کہنا۔ خود اقبالؔ فرما گئے ہیں ؎

فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا
افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند

آپ کے حق میں شرابِ علم کا نشہ، حسینانِ فرنگ کی نشہ بار آنکھوں سے دو آتشہ ہوا۔ اقبالؔ کا تجربہ طاقِ نسیاں کی نذر کر دیا ؎

؎
میں نے اے اقبال یورپ میں اُسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستاں کے ماہ سیماؤں میں تھی۔

اور بقول اکبر ؎

موم کی پُتلیوں پر ایسی طبیعت پگھلی
چمنِ ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے

وہ تو کہئے کہ بزرگوں کی دُعائیں ساتھ تھیں کہ بس قدم لڑکھڑا کر رہ گئے۔ غارِ فرنگ میں گرنے کی نوبت نہیں آئی فارغ التحصیل ہوئے۔ شعبۂ امراضِ چشم میں اعلیٰ ترین سند حاصل کی لیکن عزتِ نفس کو گوارا نہ ہوا کہ اُس دیار میں غیر پسندیدہ مہمان اور دوسرے درجے کے شہری بنا کر رہیں۔ اس عرصے میں پاکستان وجود میں آچکا تھا۔ حکومتِ وقت نے قدر دانی دکھائی، اعلیٰ ملازمت کی پیش کش ہوئی تو بطورِ مہاجر کراچی وارد ہوئے۔ برصغیر کے کونے کونے سے مشاہیر، دانشور، شاعر اور ادیب اِس مملکت کی آبیاری کرنے پہنچ رہے تھے خوش نصیبی کہ ان سے اکتسابِ فیض اور لطفِ صحبت کی دولت نصیب ہوئی۔ زندگی کے چند بہترین سال وہاں گزرے۔

افسوس کہ سماں بدلا، فرزندِ زمین قسم کی ایک اور ہی نسل برسرِ اقتدار آئی۔ فلکِ کج رفتار کو کسی کی آسودہ خاطری کب بھاتی ہے، ملک دونیم ہوا، ہم سب کے دل فگار ہوئے، طبیعت پراگندہ ہوئی دل برداشتہ ہوا۔ خاطرِ احباب بھی خوش نہ آئی۔ سعودی عرب سے ملازمت کا بلاوا آیا تو عجیب تذبذب کا عالم تھا۔ ارضِ پاکستان کی کشش ہلکی ہو چلی تھی ؎

گل نے بہت کہا کہ چمن سے نہ جائیے
گلگشت کو جو آئیے آنکھوں پہ آئیے
میں بے دماغ کر کے تغافل چلا گیا!
وہ دل کہاں کہ ناز کسو کے اُٹھائیے

غرض سعودی عرب پہنچے۔ جس علاقے میں وارد ہوئے وہاں دیارِ حبیب کا تقدس اور روح پرور ماحول بالکل نہ تھا بلکہ ہر سمت چچا سام کا غلبہ پایا۔ ابھی تین سال نہ ہوئے تھے کہ آپ پہ پھر گھن چکر سوار ہوا ؎

مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

اس مرتبہ آسٹریلیا کی دُھن سوار ہوئی لیکن یہ نہ سوچا کہ یہ ملک دنیا کے کنارے، اللہ میاں کے پچھواڑے نہ جانے کہاں واقع ہے۔ اس ملک کا ذکر مکتب کے درسِ جغرافیہ میں پڑھا ضرور تھا کہ یہ اپنی نوعیت کا عجیب و غریب ملک ہے جس کا باوا آدم ہی نرالا ہے، جہاں کے شجر و حجر، درند و چرند، طیور و پرند اور پھول پات اپنی وضع کے انوکھے اور سارے جہاں سے نرالے ہیں۔ وہاں آدم آدم زاد تو ضرور ہوں گے لیکن گمان غالب ہے۔ بد ذات ہوں گے، ہمدم و دمساز تو ہرگز نہ ہوں گے۔ جہانیان جہاں گشت ہونے کا سودائے خام پھر کیوں سر میں سمایا ہے۔ آپ ضرور سدھاریں لیکن یہ بندی جہاں گردی

سے عاجز ہے، مجھے معاف کریں۔"

طیش کا جو یہ عالم دیکھا تو خود حاضر خدمت ہوا، صائب الرائے تجربہ کاروں کی سفارش بہم پہنچائی، افہام و تفہیم کی، منت و سماجت کی لیکن ایک نہیں کی، گر دان سناتی رہیں۔ ویسے تو میں بہت دھیمے مزاج کا آدمی ہوں لیکن بندہ بشر ہے کبھی نہ کبھی تھوڑا بہت غصہ آ ہی جاتا ہے۔ شعر کا پہلا مصرعہ خوب کڑک کر اور دوسرا بہت دھیمی زبان میں عرض کیا کہ حضور ؎

چمکے تو ہے سورج کی طرح حسن تمہارا
لیکن یہ سمجھ رکھیو کہ سورج بھی ڈھلے ہے

عالم سینہ پائی کیا کہوں۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ جمال میں جلال کا مظاہرہ ہوا۔ جبین صاف شکن آلود اور نگاہِ مہر قہر آلود ہوئی۔ بشرر بار نظروں سے عتاب ہوا کہ آپ تو محض طبیبِ چشم ہیں۔ نظر حکیمانہ، مزاج عاشقانہ اور محبت والہانہ رکھتے تو نہ گفتگو ناصحانہ ہوتی نہ انداز ناقدانہ ہوتا۔ دیکھئے اور سر دُھنئے کہ ابھی تابائی حسن شباب پر اور شباب نصف النہار پر ہے۔ یہ کیسی ہرزہ سرائی ہے

میں نے جو یہ بگڑے ہوئے تیور دیکھے تو مفر اور راہِ نجات غیر مشروط اعترافِ شکست اور فرار میں نظر آئی۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہمیشہ شوہروں کا مقسوم ہے ؎

کون سنتا ہے فغانِ درویش
قہر درویش بہ جانِ درویش

انداز، بیانِ بے زبانی کا ہوا، لہجہ خوشامدانہ ہو چلا اور پہلی بار اندازہ ہوا کہ عالم طیش میں رُعبِ حسن کچھ سوا ہو جاتا ہے نیاز مندانہ عرض کی کہ بے شک آپ کے حسن کی تاب کاری نیوٹران بم سے زیادہ ہے جو اپنے وسیع حلقۂ بربادی میں مرگِ ناگہاں کا حکم رکھتا ہے لیکن کلام میں اس قدر گرمی اور لہجے کی درشتی حسینانِ خوش اندام کی شان سے بعید ہے گو شمائل حسن کا نرم گو اور لہجے کا مہربان ہونا اس کے شایانِ شان ہے۔ اس طرح کی نیاز مندی سے گرمئ مزاج معتدل ہوئی اور از سرِ نو لطف و مہر کی ارزانی ہوئی۔

چونکہ صلح و آشتی میرا وطیرۂ خاندانی ہے اس لیے عاجزانہ عرض کی کہ آپ کی شفقت میرے لیے قرارِ جانی ہے۔ یہ سراسر میری نادانی اور ظاہر میری ہیچ مدانی ہے۔ میرا مقصد کھینچا تانی نہیں بلکہ صلح و صفائی کی سلسلہ جنبانی ہے۔ یہ محض آپ کی آنا کانی ہے۔ آپ خود چل کر ملاحظہ فرمالیں کہ وہاں نہ آفتِ جانی ہے نہ بلائے ناگہانی ہے بلکہ وہاں کی شام رنگیلی ہے تو صبح سہانی ہے۔

فرمایا کہ یہ طرزِ تقریر گو بے شک جانی پہچانی ہے کہ اس میں لکھنؤ کی شائستگی اور دریائے گومتی کی روانی ہے لیکن مجھے سخت حیرانی بلکہ پریشانی ہے کہ یہ کس طور کی نثر میں شاعری اور مبتذل قافیہ دانی ہے رفیقِ من! یہ طرزِ کہن و قدیم اور متروک زباندانی اور قصۂ چہار درویش کی سی کہانی ہے۔ عزیزوں اور دوستوں سے جدائی میرے لیے سوہانِ روح ہے جس سے میرے دل میں

غم واندوہِ تنہائی اور سوزشِ پنہانی ہے۔

غرض بعد از خرابیٔ بسیار سڈنی آسٹریلیا پہنچے تو اندیشہ ہائے دُور دراز یکسر غلط ثابت ہوتے لوگ دوست نواز نکلے اور ملک سرسبز و شاداب نکلا۔ ہر طرف صفائی ستھرائی کا اہتمام پایا۔ باغ و بہار ملک میں جگہ جگہ سبزہ زار، صحنِ چمن اور تختہ ہائے گل ملے۔

دیکھا کہ یہاں دولتِ حُسن کی ارزانی ہے، وجہ اطمینان یہ کہ یورپ سے کہیں کم عُریانی ہے زر و روزگار کی فراوانی ہے سُکون اور امن چین کی سُلطانی ہے۔ اظہار ضمیر اور قانون و انصاف کی حکمرانی ہے علم و حکمت اور فن کار کی قدر دانی ہے۔ لوگ بے فکرے ہیں اور آزاد طرزِ زندگانی ہے۔ سوچنے کا انداز یہ کہ من مانی کرو، لطفِ زندگی اٹھاؤ کہ زندگی فانی اور دولت آنی جانی ہے۔ مدرسوں میں تعلیم اور کھیل کود کا انتظام لاثانی ہے نہ نوکر نہ چاکر نہ وجودِ مہترانی ہے۔ قابلِ رشک صحتِ جسمانی تو قابلِ رحم حالتِ روحانی ہے۔ کچھ پُر وقار ملیح چہرے بھی نظر آئے۔ تعارف ہوا کہ یہ ہندوستانی ہیں وہ پاکستانی ہیں وطنِ مالوف کی نشانی ہیں۔

غریب الوطنی کا احساس کچھ کم ہوا لیکن پھر بھی ؎

وہ آم کے باغ اور ٹھنڈی ہوائیں سانولے چہرے گورے بدن
اُس دیس کی یادیں ڈستی ہیں جو دیس نہیں اب اپنا وطن

ان تمام حالات کے باوجود بیگم صاحبہ کی طبیعت اُکھڑی اُکھڑی رہی۔ ارشاد ہوا کہ اگرچہ دماغ میں اس ملک اور وطن کی کشمکش میں کھینچا تانی ہے تاہم دل میں بھاری پلّہ پاکستانی ہے۔ اب ہم نے قطعی طور پر دل میں ٹھانی ہے کہ التفاتِ دلِ دوستاں کا لطف اُٹھانے، قدمِ مادر پر سر جھکانے، اخوتِ برادرانِ خوش اوقات کی آزمائش کرنے کہ وہ بھی محبت، مہر میں کچے دھاگے سے بندھے کھینچے آتے ہیں کہ نہیں اس سال کے آخر میں عازمِ وطن ہوں۔

□□

شاہد عباسی
(الٰہ آباد)

قطعات

خدا کی بندی

خدا تو نہیں ہے وہ بندی خدا کی
نکالے ہیں جنت سے بندے خدا کے
شریف اور مومن میں ہے فرق اتنا
یہ ڈرتا ہے بیوی سے اور وہ خدا سے

—— (حضرت غالب سے معذرت کے ساتھ)

مآل اچھا ہے

ووٹ اچھا ہے نہ ووٹر کا خیال اچھا ہے
اپنے حصے میں جو آجائے وہ مال اچھا ہے
جیتنا ہم کو الیکشن ہے بہر طور حضور
"کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے"

سال اچھا ہے

کیوں پریشاں ہے تلاشی میں "فلائنگ اسکواڈ"
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے
شبھ گھڑی نقل کے کرنے کی بھی آجائے گی
"اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے"

خیال اچھا ہے

دیکھ کر ان کا مینی فیسٹو ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
ہم کو معلوم ہے وعدوں کی حقیقت لیکن
"ان کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے"

کمال اچھا ہے

مفت کی کہتے ہیں قاضی کو بھی ہوتی ہے حلال
"جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے"
ووٹ دیتا ہے کوئی ووٹ دلاتا ہے کوئی
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

نہال اچھا ہے

اک نئی پارٹی انصاف کی جنمی ہے میاں
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے
بادشاہوں کا نہیں جنتا کا سیوک ہے نثار
جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

میک اپ

ہم ٹکٹ لینے ہی والے تھے کہ گاڑی چل دی
گاڑی چھٹنے کا انھیں بھی ہے ملال اچھا ہے
فاصلہ کرتی ہے "میک اپ" ہو اگر گاڑی لیٹ
ان کو "میک اپ" نے کیا لیٹ کمال اچھا ہے

قطعات

ڈاکٹر انعام الحق جاوید
(لاہور)

ڈاکٹر

اک ڈاکٹر مریض کو سمجھا رہا تھا یوں
کرتا ہے آسان راہ دشوار کس لیے
پیسے نہ تھے علاج کے گر تیری جیب میں
پھر یہ بتا ہوا ہے تو بیمار کس لیے

شوہر

وہ شوہر جس کو گھر والی سے سچا پیار ہوتا ہے
سویرے سب سے پہلے نیند سے بیدار ہوتا ہے
وہ اُٹھتا ہے تو سیدھا ہی کچن میں جا نکلتا ہے
یہ اُٹھتی ہے تو اُس کا ناشتہ تیار ہوتا ہے

بیوی

خودکشی کرتے ہوئے دیکھا ہے جب بھی آپ کو
سامنے سکھیوں کے شرمندہ مجھے ہونا پڑا
گر رُلانا ہی مجھے مقصود ہے تو شوہرم
میں خوشی سے رو پڑوں گی جب کبھی رونا پڑا

ملازم

ملازم گھر پہ رکھ لیں آپ ہم دونوں کو صاحب جی
کہ ٹو اِن وَن ہیں ہم اُتریں گے پورے آزمانے پہ
میں باورچی ہوں فنِ شعر پہ ہے دسترس مجھ کو
یہ مالی ہے مگر پورا عبور اس کو ہے گانے پہ

شاعری

شاعری کو چھوڑ کر کچھ اور کرنا چاہیئے!
اس ارادے پہ عمل فی الفور کرنا چاہیئے!
غور و فکر اچھا ہے فطرت کے مناظر پہ مگر
گھر کے کاموں پر بھی قدرے غور کرنا چاہیئے!

عید

اوپر سے تو مہنگائی پہ تنقید کرے گا
اور قیمتیں کم رکھنے کی تائید کرے گا
اندر سے مگر ایک کی شئے پانچ میں دے کر
اس بار بھی "عیدو" ہی فقط عید کرے گا

تعلیم

کیوں پریشاں ہو زوالِ علم کے اسباب پہ
میں بتاتا ہوں تمہیں یہ آج کل کے چھوکرے
اپنے بستے میں کتابوں کی جگہ لاتے ہیں کیا
اک سیاست کا کریٹ اور عشق کے دو ٹوکرے

اسمٰعیل ظریف (حیدرآباد)

شاعرہ بیگم بھی ہے شوہر بھی شاعر ہے ظریف
بات اس جوڑے کی اک محفل میں کل اچھی لگی
پہلے بیگم نے سُنائی بعد شوہر نے غزل
ہم کو شوہر سے تو بیگم کی غزل اچھی لگی

جب سکندرآباد کے کٹّے پہ لے جاتا ہے دل
کیسے کیسے کارِ خیر کا کام کرواتا ہے دل
دل کے ہاتھوں آدمی بھی کس قدر مجبور ہے
چکنی صورت دیکھ کر اکثر پھسل جاتا ہے دل

رؤف پاریکھ (کراچی)

مفت مشورے!

کل کی ڈاک سے ہمیں کچھ خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں ہم سے کچھ مشورے طلب کئے گئے ہیں۔ پتہ نہیں کس طرح لوگوں کو ہماری عقل و فہم اور علم و دانش کا پتہ چل گیا۔ لیکن خیر! آج تو جواب دیئے دیتے ہیں ہے آئندہ سے مشورہ فیس لی جائے گی۔

بیگم اوٹ پٹانگ نے کراچی سے لکھا ہے کہ میرا دس سالہ بچہ بے تحاشہ جھوٹ بولتا ہے وعدہ خلافی میں بھی طاق ہوتا جارہا ہے۔ ابھی کہے گا ابھی مکر جائے گا۔ جرح کرو تو کہے گا میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میری یہ مراد تھی وغیرہ وغیرہ۔ سخت پریشان ہوں۔ کیا کروں۔ جلد جواب دیجئے۔

جواب: بیگم اوٹ پٹانگ! آپ کو پریشان ہونے کی بجائے خوش ہونا چاہیئے۔ آپ کا بیٹا بڑا ہوکر سیاستداں بنے گا اور ہماری سیاست کے اخلاق اور اصولوں پر پورا اترے گا۔ مبارک ہو۔ اسے مزید جھوٹ بولنے کی مشق کروایئے۔ ہو سکے تو بیان دینے اور تقریر کرنے کی بھی تربیت دیجئے۔ اس کام میں علاقے کے کونسلر سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔

مس میاؤں حیدرآباد سے لکھتی ہیں کہ میری پالتو بلی نے چھ دن سے کچھ نہیں کھایا۔ نہ بولتی ہے۔ نہ ہلتی ہے نہ جلتی ہے۔ کسی چوہے یا بلے کو دیکھ کر بھی اس کے دل میں کوئی ہلچل نہیں مچتی۔ تشخیص کیجیے۔

جواب: مس میاؤں! پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم جانوروں کے ڈاکٹر نہیں۔ بلکہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں پری میڈیکل انٹر سائنس سے ہی کالج سے بھگا کر انسانوں کا ڈاکٹر بننے سے بھی بال بال بچا لیا۔ ورنہ آج بے روزگار ڈاکٹروں کے مظاہروں میں ہمیں شرکت کرنی پڑتی اور آپ کے خط کا جواب بھی ہم نہ دے پاتے۔

آپ کی بلی کے کیس پر ہم نے چھ دن تک غور کیا۔ اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کو کچھ لاشعوری الجھنیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا بچپن ناخوشگوار اور ناسازگار حالات میں گزرا ہو۔ اسے احساسِ کمتری یا احساسِ محرومی ہو۔ تفصیلی معائنہ کر کے ہی کچھ بتایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے بلی کی تحلیل نفسی کرنی پڑے گی۔ ہاں ایک بات اور.... اگر بلی ہلتی جلتی بھی نہیں تو اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مر چکی ہے۔ دوسری بلی

پال لیجیے۔ مُردہ بلّی کی تحلیل نفسی بہت مہنگا اور پیچیدہ نفسیاتی عمل ہے۔

لاہور سے زبردست چوہدری صاحب نے انوکھی الجھن بتائی ہے۔ لکھتے ہیں کہ میں روز رات کو خواب میں فٹ بال کھیلتا ہوں۔ لیکن میری بیوی کو شکایت ہے کہ میں نیند میں لاتیں چلاتا ہوں اور اکثر اسے بھی لاتیں سہنا پڑتی ہیں۔ اس کا مطالبہ ہے کہ میں فوراً فٹ بال کھیلنا بند کر دوں۔ لیکن میرے لیے مشکل یہ ہے کہ میں خواب میں فٹ بال بہت اچھا کھیلتا ہوں اور روز کئی گول بھی کرتا ہوں۔ بلکہ کل تو ہماری ٹیم سیمی فائنل میں بھی پہنچ گئی ہے۔ بتائیے کیا کروں؟

جواب: بھائی جان! سیمی فائنل میں پہنچنا مبارک ہو۔ انشاء اللہ آپ فائنل بھی جیتیں گے۔ رہیں بھابی جان تو ان کا علاج یہ ہے کہ روز رات کو سوتے وقت اپنے پاس ہاکی اسٹک رکھ لیا کیجیے۔ اور خواب میں ہاکی کھیلنا شروع کر دیجیے۔ جلد ہی وہ آپ کے فٹ بال کھیلنے پر راضی ہو جائیں گی۔

کوئٹہ سے معصوم علی مجبور لکھتے ہیں میرا بچہ بہت بدمعاش ہے۔ پورے محلے میں اس کی دہشت ہے۔ غنڈہ ٹیکس وصول کرتا ہے۔ محلے والوں کی مرغیاں اور پھل اُٹھا کر لے جاتا ہے۔ کمزوروں کو مارتا پیٹتا ہے اور طاقتور کو سلام کرتا ہے۔ کیا کروں؟

جواب: پہلے تو آپ اپنا تخلص مجبور سے جابر کر لیں۔ پھر بچے کو پولیس میں بھرتی کرا دیں۔ انشاء اللہ کامیاب رہیگا۔

چھانگا مانگا سے مجنوں صحرائی لکھتے ہیں مجھے شاعری کرنے کا بہت شوق ہے اسی شوق کی وجہ سے بے روزگار اور فاقہ مست ہوں۔ شاعری سکھانے کی کسی کتاب کا نام بتائیے۔ نیز میں بحیثیت شاعر کیسے مشہور ہو سکتا ہوں؟

جواب: مجنوں صاحب! اس ملک کا ہر دوسرا پڑھا لکھا آدمی شاعر ہے۔ خدا کے لیے اس ملک اور شاعری پر رحم کیجیے۔ اور فوراً کاشت کاری شروع کر دیجیے۔ ویسے بھی کدوؤں کا موسم سر پر آ پہنچا ہے۔ اور امریکہ میں برف باری کی وجہ سے کدوؤں کے بھاؤ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان سے مذاکرات کرنے لگے ہیں۔ آپ کدو برآمد کیجیے۔ زرمبادلہ کمائیے۔ شاعری برآمد کر کے زرمبادلہ نہیں کمایا جا سکتا۔ (فیض احمد فیض کی بات اور ہے اور ان کی شاعری بھی خالی خولی برآمد ہوتی ہے زرمبادلہ نہیں ملا) آپ کی شاعری زیادہ سے زیادہ پولیس برآمد کر سکتی ہے۔ ایک بات اور لکھ لیجیے۔ خوبصورت آواز سخاوت اور شاعری سکھی نہیں جا سکتی۔ یہ قدرت کا عطیہ ہوتی ہے۔

کراچی سے گلبدن نرگسی لکھتی ہیں میں نے بہت قیمتی اور نایاب پودے، درخت اور بیلیں مشرق بعید، یورپ اور افریقہ سے منگوا کر اپنے دو ہزار گز کے پائیں باغ میں لگوائے تھے لیکن لاکھوں روپے کے یہ شاندار پودے چند ہفتوں میں مرجھا گئے۔ میرا خیال تھا کہ مجھے اس باغ پر آئندہ سال موسم بہار میں ہارٹیکلچرل سوسائٹی والے پہلا انعام دیں گے اور میں مسز گردیزی گھٹالا کو خوب جلا سکوں گی۔ ہائے اللہ اب کیا ہوگا۔؟

جواب: محترمہ آپ کو کس حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ کراچی کی واہیات آب و ہوا میں نایاب پودے اُگائیے۔ یہاں کے بے ہودہ موسم میں صرف کیکر، تھوہر اور دھریک چل ہی سکتے ہیں۔ ہو سکے تو اپنے دو ہزار گز کے پائیں

ہیں پودے لگا لیجیے۔ سبز گرڈ بٹہ گھٹا لا کو جلانے کے لیے آپ کوئی اور طریقہ استعمال کیجیے۔ مثلاً قیمتی ساڑیاں، مہنگے جھاڑ فانوس، نئی کاریں وغیرہ۔ جلانے کا آخری حربہ مٹی کا تیل ہے۔ لیکن جن فیشن ایبل بستیوں میں آپ رہتی ہیں مٹی کے تیل سے جلنا وہاں کی نوکرانیوں کی قسمت میں لکھا ہے اور وہ بھی اپنے نکھٹو شوہر کے ہاتھوں۔ (آپ کے شوہر یقیناً گھرداماد ہوں گے)۔

اور ہاں ہارٹیکلچرل سوسائٹی والوں کی باتوں میں نہ آئیں۔ ان کے چھ انچ قطر کے گلاب، اور گل داؤدی کیمیائی مادوں سے اگتے ہیں اور نمائش کے دو دن بعد کیمیکل کا اثر ختم ہوتے ہی غریبوں کے منہ کی طرح لٹک جاتے ہیں۔ آپ کا دو ہزار گز کا باغ کسی بہتر مصرف میں بھی آسکتا ہے۔ مثلاً جو لوگ فٹ پاتھوں پر سوتے ہیں وہ اس کی سرسبز گھاس پر لوٹیں لگا کر بہت خوش ہوں گے۔ اور اگر کچھ بھوکے اسے چرنے بھی لگیں تو کچھ عجیب نہ ہوگا۔ بھوک بڑی ظالم چیز ہے۔

کراچی سے سیٹھ علی بھائی ولی بھائی پسٹن جی انجن والے لکھتے ہیں مجھے کھانا ہضم نہیں ہوتا سانس اکھڑی اکھڑی رہتی ہے۔ صبح اسٹارٹ ہونے میں دشواری ہوتی ہے۔ ایک لیٹر چائے میں صرف چھ منٹ کام کرسکتا ہوں۔ اکثر پنکچر ہوجاتا ہوں۔ اوورہالنگ کے لیے یعنی میڈیکل چیک اپ کے لیے پچھلے سال لندن گیا تھا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کیا کروں؟

جواب: سیٹھ صاحب! معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بلیک کا پیسہ ہضم نہیں ہو رہا۔ پسٹن اور انجن کی ٹیکری جو آپ نے خود کھول رکھی ہے۔ لگوائیں۔ اور ہاں بلیک کا پیسہ یورپ جاکر ہضم نہیں ہوتا۔ بہت سے لوگ اس کے لیے ہر سال حج کرتے ہیں۔ آپ بھی آزما کر دیکھیے۔

قمر الزماں قمر
(رانچی)

سن رسیدہ عاشقوں کے لیے ریزرویشن

جب ریٹائرمنٹ کی تحریکوں نے اک انگڑائی لی!
عاشقوں کی صف پہ خوشیوں کی گھٹا چھانے لگی

جس قدر ناکام عاشق تھے وہ بلوائے گئے
نامراد عاشق بھی چشم غور میں لائے گئے

اک بڑی تعداد عاشق کی اکٹھا جب ہوئی
ایک اسّی سالہ عاشق نے یہ پھر تقریر کی

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
”خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں“

عمر کے بڑھتے تقاضوں کے سبب مجبور ہیں
فیضِ محبوباؤں سے ہم آج کوسوں دور ہیں

کس طرح دن رات کٹتے ہیں مرے بھائی نہ پوچھ
کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ

اس لیے اے دوستو! اتنا تو مل جل کر کرو
پاس اک تجویز کر کے بھیج دو سرکار کو

ہم بھی ہیں کمزور طبقہ سے بہت معذور ہیں
عشق پیشہ ہیں ازل سے دختِ رز سے دور ہیں

سن رسیدہ عاشقوں کے واسطے بھی کم سے کم
تیس فیصد ٹک کرو ریزرو دو دوشیزہ صنم

پھر نہ دل کو روئیں گے ہم اور نہ پیٹیں گے جگر
کیوں کہ اپنے ساتھ ہوگا رات دن چوچار دگر

غزل

حسینہ وہاج (کراچی)

قضا ہم کو یہاں لائی اِدھر کھڈا اُدھر کھائی
پہنچے گے کس طرح بھائی اِدھر کھڈا اُدھر کھائی

ہے لالو کھیت میں جھگڑا تو گولی مار میں پھڈا
بہن تو کس طرح آئی اِدھر کھڈا اُدھر کھائی

میں اُس کے حسن کی تعریف میں لکھوں تو کیا لکھوں
جب اس نے شکل دکھلائی اِدھر کھڈا اُدھر کھائی

کہیں ہے حسن کا چارا کہیں ہے جال زلفوں کا
بیچے گا کیسے سودائی اِدھر کھڈا اُدھر کھائی

وڈیروں کی حکومت ہے زمیں داروں کا ٹھیکہ ہے
کہاں جائے گی بھوجائی اِدھر کھڈا اُدھر کھائی

وہاں لیڈر کی رسّی ہے یہاں غنڈوں کی لاٹھی ہے
پرائی بھینس اپنائی اِدھر کھڈا اُدھر کھائی

صدر میں ایک عاشق ہے تو بندر روڈ پر دو ہیں
پڑوسن نے قسم کھائی اِدھر کھڈا اُدھر کھائی

گٹر کے منہ کھلے ہیں راہ میں برسات کا پانی
جبھی تو وہ نہیں آئی اِدھر کھڈا اُدھر کھائی

مخالف لیڈروں کو میرا لیڈر بھانپ لیتا ہے
ہے کتنی تیز بینائی اِدھر کھڈا اُدھر کھائی

کبھی ہڑتال کی آفت کبھی کرفیو کا خطرہ ہے
حسینہ یوں نہیں آئی اِدھر کھڈا اُدھر کھائی

منظور الامین

اونٹ

ایک پرانی عربی کہاوت ہے : تین چیزیں چھپائے نہیں چھپائے جاسکتیں : عشق، دھواں اور وہ شخص جو اونٹ پر سوار ہو، آج کی اِس ساعت میں ہم عشق کا ذکر نہیں کریں گے کیوں کہ عرصہ ہوا مرزا غالب اپنی آنے والی نسلوں کو یہ معتبر صلاح دے کر گزر گئے ہیں۔

کہتے ہیں : جس کو عشق خلل ہے دماغ کا، —— اب رہی دھوئیں کی بات تو یہ ایک ذکرِ فضول ہے!

البتہ اونٹ ایک زندہ حقیقت ہے —— تو آیئے اور سب سے پہلے یہ بتایئے کیا آپ نے اونٹ دیکھا بھی ہے ؟ تصویروں، فلموں اور چڑیا گھروں میں نہیں بلکہ بہ نفسِ نفیس، اگر نہ دیکھا ہو تو آپ کو بتادیں کہ اونٹ کا جغرافیہ صحرا ہے اور محلِ وقوع صحرائے کالاہاری سے صحرائے تھار تک —— یہ جانور کم ہوتا ہے اور ڈھانچہ زیادہ، صحرا کا درجۂ حرکت چاہے دوسو ڈگری سلسیس کیوں نہ ہو اونٹ کے جسم کے درجۂ حرارت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا، حرارت کے نقطۂ عروج پر بھی یہ صحرا میں خوش طبعی سے رواں دواں دکھائی دیتا ہے، اس درمیان اس کے ساربان کے جسم اور دماغ کا درجۂ حرارت کئی بلندیاں طے کر چکا ہوتا ہے۔

کیا آپ نے کبھی اونٹ کی سواری کی ہے ؟ ہم نے کی ہے ! جب کبھی ہماری زندگی جمود سے بھر جاتی ہے تو ہم اونٹ کی سواری کرنے لگ پڑتے ہیں اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ ہم نیچے ہی سے نیچے دیکھنے کی بجائے اونٹ پر سوار ہو کر ایک شاہانہ (STRATEGIC) مقام پر تخت نشین ہو کر عوام الناس کو نیچے دیکھتے ہیں یہ ضرور ہے کہ اس پوزیشن پر دیکھ کر عوام نیتا سمجھ کر یہ طعنہ دینے لگتے ہیں ؎

هم خاک نشیں تم سخن آرا ہو سرِ بام
پاس آؤ ذرا دور سے کیا بات کرو ہو!

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ سواری ہمیں ایک قسم کی ورزش لگتی ہے جس میں ڈنڈ، بیٹھک، ملکھم، یوگا، JOGGING سبھی کچھ ایک گولی (CAPSULE) کی شکل میں ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے حاصل ہو جاتے ہیں، اس ... سے جسم کی آنتوں، وریدوں، شریانوں وغیرہ کی قلبی صفائی ہوجایا کرتی ہے اور جناب ...

بعض شہروں میں جہاں پک نک اسپاٹ ہوتے ہیں وہاں بچوں کے لیے اونٹ کی سواری کا خاص انتظام بھی کیا جاتا ہے، ہم ایک ایسے ہی شہر میں رہتے ہیں جہاں ہمارے ایک دوست اپنے بچّے سے ضد کرکے اسے پارک میں لے جایا کرتے ہیں۔ یہ صاحب بچّے کو پارک کی اس دنیا کا خاموش تماشائی بنا کر بچّے کی جگہ خود پارک میں جھولا جھولتے ہیں۔ پھسلنے والے تختے سے خود پھسلتے ہیں اور پھر خود اکیلے اونٹ کی سواری کا لطف اٹھا کر اپنے بچے کو صحیح سلامت گھر واپس لے آتے ہیں۔

اونٹ کی دو نسلیں دُنیا میں رائج ہیں، ایک تو عربی النسل یک کوہان اور دوسری باختری چھوٹے پاؤں والی دو کوہان، اس کی تیسری نسل اب تک دریافت نہیں ہوسکی ہے۔

اونٹ کو صحرا کا جہاز کہا جاتا ہے لیکن یہ سفینہ ریت کے سمندر سے اٹھی بالو کی خشکی میں ڈوب کر نہیں رہ جاتا، یہ صحرائی ریت کے جھکڑ (SAND - DUNES) کا مقابلہ کرتا ہوا راہ طے کرتا ہی رہتا ہے، اس جہاز کا CAPTAIN IN-COMMAND ہوتا ہے ساربان، جو شتر کو شتر بے مہار نہیں ہونے دیتا جو ایک چابک دست سوار ہوتا ہے اونٹ کا پیٹ THREE-CHAMBERED STORE-HOUSE ہوا کرتا ہے۔ سفر کے آغاز میں یہ اپنے کوہان میں کئی گیلن پانی اسٹور کرکے آگے بڑھتا جاتا ہے اسے پندرہ پندرہ دن تک پانی کی حاجت نہیں ہوتی اس کے پیٹ کو عمرعیار کی زنبیل سمجھئے جس میں اور کئی چیزیں اسٹور کی جاسکتی ہیں۔ ان معنوں میں اونٹ کو حیوانوں میں جمع خور (HOARDER) کہہ سکتے ہیں۔

اونٹ کئی طرح کے رنگوں میں فراہم ہوتا ہے گہرے براؤن رنگ سے ہلکے کریم رنگ تک اس کے کئی شیڈ ملتے ہیں، پہلے زمانے میں کسی قبیلے کے سردار کی دولت کا اندازہ اونٹوں کی تعداد سے لیا جایا کرتا تھا۔ سوڈان جیسے ملکوں میں اونٹوں کی دوڑیں عام ہیں۔ اونٹ ایک سنجیدہ قسم کا جانور ہے، اس کی قناعت کا یہ حال ہے کہ RACES میں بازی لے جانے پر بھی اسے غرور نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک طرف آرام سے بیٹھ کر 'جگالی' کرنے لگتا ہے۔

جگالی اونٹ کا محبوب مشغلہ ہے، جگالی کرتے وقت یہ غم جاناں اور غم دوراں دونوں سے بے نیاز دکھائی دیتا ہے، اس موقع پر اونٹ جانور کم اور افلاطون زیادہ نظر آتا ہے، یہ خاموشی سے سقراط، کانٹ، ہیوم اور ہیگل کے فلسفوں پر غور کرتا ہے اور دل ہی دل میں ان کے غلط یا صحیح ہونے کے تعلق سے تضاد کرتا رہتا ہے۔

اونٹ منکسرالمزاج، حلیم الطبع اور مرنجان مرنج قسم کی مخلوق ہوتا ہے۔ یہ کسی کا دل دکھانا پسند نہیں کرتا، اس کے ماتھے پر کبھی بَل نہیں آتا، اس کی تیوری کبھی نہیں چڑھتی اس کا پارا کبھی اونچا نہیں جاتا، اسے تندخو نہیں کہا جاسکتا، یہ معتدل مزاج ہوتا ہے جنگوں سے اسے نفرت ہوتی ہے کیوں کہ یہ ایک امن پسند شخصیت ہے، یہ کسی کا دشمن نہیں بلکہ سب کا دوست ہوتا ہے، الغرض اونٹ کی پالیسی شہنشاہ اکبر کی مشہور پالیسی "صلح کل" سے پوری طرح میل کھاتی ہے، کوئی اونٹ آج تک کبھی تناؤ TENSION میں نہیں دیکھا گیا۔ TENSION پر تو آج کے انسان کا کاپی رائٹ ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب چلتا ہے تو اونٹ کس طرح آہستہ آہستہ چلتا ہے بلکہ نہ چلنا چاہے پھر بھی چلتا ہی رہتا ہے نسیم سحر کی طرح نرم گام!

احتجاج اور اعتراض تو اونٹ کی سرشت نہیں، یہ کبھی اسٹرائیک پر نہیں جاتا کیوں کہ یہ کسی ٹریڈ یونین کا ممبر نہیں ہوتا، ہاں کبھو کبھار کوئی ہلکی سی چیخ اس کے گلے سے ضرور نکل جاتی ہے اس چیخ کو آپ نغمۂ صحرائی بھی کہہ سکتے ہیں۔

اونٹ کو ہانکتے وقت صحرا میں شتر سوار حُدی گاتے ہیں ان نغموں میں ساربان اپنے اونٹوں کو ہدیۂ عقیدت پیش کرتے رہتے ہیں، کبھی تو اونٹ کو "دولتِ بیدار" اور کبھی "آہوئے تاتار" کے عنوان سے نوازتے ہیں اور کبھی اسے "کشتیٔ بے بادبان" کہہ کر پکارتے ہیں۔ ان نغموں کو سن کر اونٹ مست ہو کر تیز چلتا ہے پس معلوم ہوا کہ اونٹ موسیقی کا نباض ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں لگتا ہے کہ صحرائی ہونے کے باوجود اونٹ بڑا کلچرڈ اور مہذب جانور ہوتا ہے۔ اگر ہم اونٹ کو کسی CONCERT HALL میں لے جائیں تو یقین ہے کہ یہ ضرور خوش ہوگا، اس سنگیت سبھا میں اسے اس سے بحث نہیں ہوگی کہ موسیقی کلاسیکی ہے یا نیم کلاسیکی آیا استاد عبدالکریم خاں خیال بھیم پلاسی پیش کر رہے ہیں یا بیتھوون کی نوین سمفنی پیش کی جارہی ہے۔ طبلے پر ساڑھے سولہ ماترے کی سواری بج رہی ہے یا DRUM پر کوئی بلٹری دھن۔

اونٹ کے بارے میں یہ کہاوت جانی پہچانی ہے "اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی" سچ تو یہ ہے قبلہ کہ اونٹ جیسے عظیم الجثہ شاندار حیوان کے لیے ہمیں یہ 'تو' 'تیرا' 'تیری' 'رے' جیسے کم حیثیت اور غیر مہذب الفاظ پسند نہیں آتے۔ ان الفاظ سے تحقیر اور اہانت جھلکتی ہے۔ اس شریف جانور کو دیکھ کر کہاوت کو کچھ اس طرح مہذب الفاظ اور لہجے میں پھر سے مرتب کرنا چاہیئے: "اے شترِ بلند قامت! یہ تو فرمائیے آپ کے جسم کی ساخت اتنی پیچیدہ کیوں ہے؟"

اونٹ کو شاعر نے "شاہدِ رعنا" بھی کہا ہے، لیکن اس کے شتر غمزوں سے کسی کو کسی قسم کی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ واضح ہو کہ یہ ادائیں اور غمزے ہمارے آپ کے لیے نہیں ہوتے۔

اونٹ کی محمل بڑی حسین چیز مانی گئی ہے، شاعروں نے محمل کا ذکر اکثر پیار بھرے لفظوں میں کیا ہے، اتنے رومانی انداز میں کہ اونٹ جیسا مہمل (اونٹ ہمیں معاف کرے) جانور بھی محمل کی وجہ سے رومانی بن جاتا ہے، محمل دراصل وہ لبادہ ہوتا ہے جسے اونٹ پر کستے ہیں۔

اونٹ کو کچھ لوگ قلندر بھی کہتے ہیں اور ملنگ بھی، کیونکہ یہ صحرا میں کیکر اور ببول اور خار دار جھاڑیاں کھا کر گزارا کر لیتا ہے۔ اونٹ خاکساروں کا خاکسار ہے۔ بریانی، مرغ پلاؤ، بادام کا حلوہ، کشمیری وازوان سے اسے کوئی دلچسپی نہیں اس کے لیے تو گلوں سے خار بہتر ہیں جو دامن تھام لیتے ہیں!

ویسے اونٹ COMPETITION کا دلدادہ ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ آہستہ رَو ہوتا ہے کیوں کہ یہ جانتا ہے کہ اس دنیا میں بہت تیز چلنے سے کوئی فائدہ نہیں کیوں کہ ایسے لوگ گھٹنوں کے بل گر پڑتے ہیں۔ اگر کسی منزل تک پہنچنے میں اسے پانچ گھنٹے لگیں تو کیا ہوا دس گھنٹے لگ جائیں اس کی بلا سے، اونٹ سوچتا ہے اگر پانچ کی جگہ یہ چار ہی گھنٹے میں منزل تک پہنچ جائے تو اس بچے ہوئے ایک گھنٹے کا آخر کرے گا کیا؟ یہ سوال اس کے لیے بہت اہم ہوتا ہے اسی لیے یہ اس طرح کی کسی SILLY تجویز پر کبھی غور ہی نہیں کرتا۔

اکثر شہروں میں جہاں اونٹ کو بہت تیز رفتار سے لے جانا ہو تو اس کے ساتھ ایک گدھے کو بھگاتے ہیں اس گدھے کو کہتے ہیں "رخ" جب یہ گدھا تیز بھاگتا ہے تو اونٹ کو شرم آجاتی ہے ویسے اونٹ فطرتاً بڑا باحیا اور شرمیلا واقع ہوا ہے — تب یہ گدھے پر سبقت پانے کے لیے تیز بھاگنا شروع کر دیتا ہے اور اس طرح چالاک ساربان اونٹ کو زیادہ تیزی سے منزل پر پہنچا پاتا ہے۔

گدھے کو اونٹ کے ساتھ ہنکانے کی مثال پر یاد آیا کہ ایک بار ایک خاتون نے کلاس ٹیچر سے اپنے بچے کے بارے میں، جو نیا نیا اسکول میں داخل کرایا گیا تھا، یہ کہا:

"ہمارے منّے نے اگر کبھی کوئی مار کھانے والی حرکت کی تو آپ بلا تکلف اس کے پاس ہی بیٹھے ہوئے بچے کی پٹائی کر دیجیے گا منّا بہت سمجھ دار ہے وہ فوراً سنبھل جائے گا۔"

سنسکرت کے ایک پد میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح گدھے، اونٹ کے بیاہ میں شریک ہوتے ہیں اونٹ اور گدھے ایک دوسرے کی بہت تعریف کرتے ہیں (مانو انھوں نے کوئی انجمن توصیفِ باہمی (MUTUAL-APPRECIATION SOCIETY) کھول رکھی ہو)، اس کے بعد گدھے اور اونٹ مل کر نغمۂ شادمانی گاتے ہیں۔

اونٹ کو کبھی کبھار اپنے درازقد ہونے کا غرور بھی ہو جایا کرتا ہے لیکن ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ بھی تو پیدا کئے گئے ہیں۔ جب اونٹ کا دماغ اس طرح خراب ہونے لگتا ہے تو یکایک کوئی پہاڑ اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے، تب شترِ موصوف کو پتہ چلتا ہے کہ اس کی بلندی، بلندی ہی نہیں پستی بھی ہے جو کسی اور کی بلندی سے عبارت ہے، ویسے اونٹ کی بھی بلندی عبارت ہے کسی اور کی پستی سے اس بات کی بھی یہاں موزونیت ہے یعنی اونٹ کے منہ میں زیرا

کسی کی بے وقوفی اور حماقت کی ہنسی اڑانا ہو تو کہتے ہیں "وہ اتنا احمق اتنا بے وقوف ہے کہ اونٹ پر بھی بیٹھ کر کہیں جائے تو اسے کتا کاٹ لیتا ہے۔"

جرمن زبان کا ایک لفظ "LEBENSRAUM" دوسری جنگ عظیم کے وقت نازیوں نے اسے ایک نعرے کے طور پر استعمال کیا تھا جرمنی سے پڑوسی ملکوں کے الحاق کے لیے اسی طرح کا ایک لفظ انگریزی زبان میں بھی رائج ہے یعنی TOE-IN اس کی عمدہ مثال ایک عرب بدّو اور اس کے اونٹ کی ہے۔

ریگستان میں سفر کرتے ہوئے ایک بار ایک عرب بدّو کو ایک خنک رات میں بہت ٹھنڈ لگی۔ اس کے ساتھ اس کا اونٹ بھی تھا دور سے اسے ایک خیمہ اور اس کی روشنی نظر آئی وہ جلد ہی وہاں جا پہنچا، عرب بدّو نے منعم سے جو اس خیمے کا مالک تھا درخواست کی کہ صرف ایک رات کے لیے اسے اس کی اجازت دی جائے کہ وہ اپنے داہنے پاؤں کا انگوٹھا باہر سے گرم خیمے کے اندر داخل کر دے تاکہ اس کے جسم پر سردی کا اثر کچھ کم ہو جائے منعم نے اجازت دے دی اور کروٹ بدل کر سو گیا، بدّو نے پہلے تو انگوٹھا اندر رکھا اس کے بعد آہستہ آہستہ اپنے پورے جسم سمیت خیمے میں داخل ہو گیا بلکہ اپنے حزبِ ثالث کو بھی اندر لے آیا ـــــ اونٹ کی کھال موٹی ہوتی ہے۔ اس پوستین کے باوجود کہتے ہیں، اسے سردی ضرور لگتی ہے، سردی کے موسم میں ایک بار ایک اونٹ کو کچھ زیادہ ہی سردی محسوس ہوئی پاس ہی کوئی لکڑیاں جلا کر آگ تاپ رہا تھا۔ اونٹ وہاں جا پہنچا اور آگ تاپنے لگا، وہیں پاس میں ایک حاسد مکوڑے کو بھی بہت ٹھنڈ لگ رہی تھی جب اس نے اونٹ کو اس طرح آگ تاپتے دیکھا تو پروانہ وار آگ کے پاس جا پہنچا، اس سے کہیں زیادہ قریب جتنا کہ اونٹ تھا، کچھ دیر کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ اونٹ تو اپنی جگہ پر سالم جگالی کر رہا تھا لیکن مکوڑا آگ کے اتنے قریب جا چکا تھا کہ خاک بن گیا تھا، دور صحرا میں کوئی گا رہا تھا۔

حضرتِ مجنوں کا قشقہ اور ویرانے کی خاک
جل گئی ہے اس کو شاید تیرے دیوانے کی خاک!

ڈاکٹر سید حامد حسین
(بھوپال)

بجٹ تو آئے گا!

قسمت میں یہی تھا کہ اُس دن بنی کے، جی ہاں اُسی چلین کی بنی کے، بالمشافہ درشن ہوں، جس کے بارے میں بچپن سے لغت اور امتحان کے پرچوں میں پڑھتے چلے آرہے ہیں۔

اُس دن بابو چاندرام کے گھر پہنچنا غضب ہوگیا۔ اُن کی کھڑکی سے جس طرح دھوئیں کے بادل نکل رہے تھے اُس نے ہم کو سوچنے کا کوئی موقعہ نہیں دیا اور ہم دھڑ سے اُن کی بیٹھک میں جا پہنچے۔ بابو جی کرسی پر دھیان لگائے بیٹھے تھے۔ منہ میں ایک تین انچ کی کوئی عجیب سی چیز تھی جس کے ہزار سوراخوں پر وہ اپنی دس انگلیوں سے کسی ماہر بانسری نواز کی طرح دنیا کا کوئی ایسا انوکھا راگ چھیڑنے میں لگے تھے جس میں سے سُر کی جگہ دھواں نکلتا ہے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ تیزی سے اپنے منہ میں لگے اس جوالا مکھی کے فلیتے اور شرمندگی دونوں کو چھپانے کی کوشش میں ہمارے گلے سے لپٹ گئے۔

اس کے بعد ان کی لمبی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ سارا کرشمہ اُن کے اُس سگریٹ کا تھا جو انھوں نے دس سال قبل ۱۹۸۰ء میں سالانہ بجٹ آنے سے چند ماہ پہلے اپنی مصلحت اندیشی کا ثبوت دینے کے لیے خریدے تھے۔ بابو جی صارفین کے تحفظ کے سالہا سال سے سرگرم حمایتی ہیں اور ہر سال اِس سے قبل کہ دوکاندار بجٹ آنے سے پہلے سگریٹوں کا اسٹاک ایک ماہ کے لیے زیرِ زمین کردیں۔ بابو جی اُن کو مات دینے کی غرض سے پورے سال کے کوٹے کی سگریٹیں ایک ساتھ خرید لیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ہر سال سگریٹ نوشی کے بعد بھی کچھ پیکٹ بچے رہتے ہیں اور بابو جی کا عقیدہ ہے کہ نشہ اور نشہ کرنے والا جتنا پُرانا پڑتا جاتا ہے، اتنا ہی لطف زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اس وقت اُن کے پاس ایسے بہت سے سگریٹ ہیں جن میں لطف ہی لطف کی دولت ہے لیکن جسم کی شکل میں کاغذ زیادہ ہے یا سوراخ یہ طے کرنا مشکل ہے۔ ایسے ہی ایک سگریٹ سے وہ اِس وقت لطف لے رہے تھے۔

صبح صبح ان سگریٹوں کا لطف لینا بابو جی کا روز کا معمول ہے۔ اس سے وہ نہ صرف تمباکو اور تاریخ دونوں کا ایک ساتھ مزا لیتے ہیں بلکہ ایسا لگا بتایا جاتا ہے کہ اُن کے گھر سے مچھروں سے

لے کر چوہے تک پڑوسی محلوں میں بھاگ گئے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ سڑک کے اُس پار پیپل کے پیڑ پر بسیرا کرنے والے کوّے بھی سدھیانے کی خبر لینے چلے جاتے ہیں۔

گھر کے طوطے کی دوسری بات ہے۔ وہ پنجرے کی سلاخوں سے اُس وقت تک سر ٹکراتا رہتا ہے جب تک بابوجی کی بیٹھک میں دھوئیں کی گھٹا اُٹھ کر لطف کی بارش نہیں کرتی۔

بابوجی کو ہم نے یقین دلایا کہ ہم اُن کے جذبات کی قدر کرتے ہیں اور اپنا پائنچہ اُوپر سرکا کر گھٹنے کے نیچے اس زخم کا نشان بھی دکھلایا جو پانچ سال پہلے لگا تھا۔

اُس بار بجٹ کی وجہ سے ہماری زندگی کا توازن جب گڑبڑایا تو ہم نے پہلا فیصلہ یہ کیا کہ بچا ہوا ٹوتھ پیسٹ تو مہمانوں کے لیے بکس میں محفوظ کر دیں گے اور خاندان کے سب افراد آج سے نیم کی مسواک سے اپنے دانت صحت مند، چمکدار اور پائدار بنائیں گے۔

اُس دن صبح شہر کے پہلے پرندہ کی جنگل کی جانب پرواز کے ساتھ ہم بھی مسواک کی تلاش میں نکل پڑے۔ چھوٹے پیڑ، بڑے پیڑ، جھاڑیاں، کانٹے، لوکن والا، گل مہر، یوکلپٹس، پھل کی فکر سے آزاد، ترک و فنا کا پیغام دینے والے سارے ملکی اور غیر ملکی پیڑ دکھائی دیتے لیکن نیم کا ایک درخت بھی دُور دُور تک نہیں تھا۔ لیکن اپنے عزم کو برقرار رکھنا ہمارا قومی فریضہ تھا اور اسی یقین کی آگ اپنے سینہ میں لیے پہلے بڑھتے اور پھر گھسٹتے رہے اور ایک وقت ایسا آیا جب ہمیں بیٹھ جانا پڑا، پیچھے نظر ڈالی تو اپنی صحت بنانے والے نوجوان اور اپنے کتّوں کی صحت کی خاطر پریشان ادھیڑ لوگ کوئی پانچ کلو میٹر پیچھے چھوٹ چکے تھے۔ اور آگے ہمارے اور مایوسی کے اندھیرے غار کے درمیان صرف آدھے کلو میٹر کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

تب ہی کہانیوں میں ہوتا ہے، اچانک ہمیں سامنے ایک نیم کا درخت دکھائی دیا جیسے ابھی جڑ سمیت بہشت سے اُترا ہو۔ ہم نے اُسے نیچے سے اُوپر تک دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اس سے پہلے کہ بڑھاپا، تھکن یا نیا پتلون ہمارے پیر پکڑے، ہم نے دھیرے سے اپنی یاد کی صندوقچی کھولی ایک دھول سے اَٹا تمغہ نکالا، پھونک ماری، پیچھے لکھا تھا آموں کی چوری ۱۹۴۲ء۔ خون گرم کرنے کو یادوں کا یہ تازیانہ کافی تھا۔ اور چند لمحوں میں ہم نیم کی شاخ شاخ سے اپنے حوصلہ کا خراج وصول کر رہے تھے۔

کوئی پاؤ گھنٹے کے بعد ہماری چھ جیبوں اور دو مٹھیوں میں مسواکوں کی دولت سمیٹے ہم واپسی کے لیے تیار تھے۔ لیکن گھر کے چھ افراد اور مہینے کے ۳۱ دنوں کی ضرب تقسیم میں ہم یہ بھول گئے کہ نیم کے درخت پر سے اُترنے کے لیے سیڑھیاں نہیں ہوتیں۔

جب ہم کو ہوش آیا تو ہم نے اپنے کو عجیب حال میں پایا۔ پتہ نہیں پہلے خواب تھا یا اب خواب دیکھ رہے تھے۔ پھر جب نگاہوں کے سامنے منظر کچھ تھما تو دیکھا آس پاس سب ہماری طرح بندھے پڑے تھے۔ یا اللہ کیا سارا شہر ہماری طرح مسواک لینے نکل پڑا تھا۔ ہم بڑے اسپتال کے سرجیکل وارڈ میں تھے اور ہمیں یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ ہماری اہمیت اور ڈاکٹر کی ... کے وزن کا جو ساڑھے پانچ کلو گرام ہوتا ہے جو ہماری ٹانگ کو کھینچ کر لٹکا دیا گیا تھا۔

یہی وجہ ... [illegible]

پرویز یداللہ مہدی

(یہ ہے بامبے میری جان)

ہڑتال کی تال !!

یہ بات نہیں ہے کہ بمبئی میں ناگہانی بلاؤں اور آفتوں کا سلسلہ صرف مورچوں تک محدود ہے یہاں تو بقول شاعر ؎

آفتیں اور بھی ہیں موت کی آفت کے سوا

مثال کے طور پر، اہلیانِ بمبئی نے ملک کے دیگر عوام کے دوش بدوش "انقلاب زندہ باد" سے غریبی ہٹاؤ تک کا فاصلہ جس تال پر ناچتے ٹھمکتے ہوئے طے کیا ہے وہ تال عرفِ عام میں ہڑتال کہلاتی ہے۔ ہڑتال اگرچہ کھڑتال جھپ تال اور تین تال کی ہم قافیہ ہے لیکن کلاسیکل سُر تال کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں، تاہم اس کے شور شرابے والے سُر تال بھی ماند پڑجاتے ہیں۔ اگر اسے یوں الگ الگ پڑھا جائے۔ ہڑ۔ تال ۔ تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ تال، جو یقیناً ہڑبونگ کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آئی ہے مزید برآں، ہڑتال میں جو تال ہے اس کا تعلق "سُر" سے نہیں بلکہ "صُور" سے ہے، اور یہ ہڑتالی صُور، دراصل "صورِ اسرافیل" کا ٹریلر ہے۔ بمبئی میں جب بھی ہڑتال کا بے سرا تال بجتا ہے تو متاثرہ کارخانے، فیکٹری یا دفتر پہ سرکاری تالے، اور ہڑتالی ملازمین اور ان کے متعلقین کی روٹی کے لالے پڑجاتے ہیں۔

ہڑتال اصل میں ایک ایسا اڑیل ٹٹو ہے جس پہ ہڑتالی ملازمین کبھی اپنے آقاؤں کی بے جا ہٹ دھرمی سے مجبور ہوکر اور کبھی اپنی جا و بے جا مانگوں کو منوانے کی غرض سے مختصر سے نوٹس کے بعد اور کبھی کبھی بغیر نوٹس کے ہی سوار ہوجاتے ہیں، اور پھر یہ اڑیل ٹٹو، نہ خود آگے بڑھتا ہے نہ دوسروں کو راستہ دیتا ہے بیچارا انتظامیہ کبھی اسے پچکارتا ہے کہ چل میرے ٹٹو چل چل چل ۔ اور کبھی طرح طرح کے دباؤ ڈالتا ہے، لیکن یہ اڑیل ٹٹو کسی طور جھانسے میں نہیں آتا، گلے میں اٹکی پھانس کی طرح پھنسا رہتا ہے ۔!

اب آپ سے کیا چھپانا، ایک مرتبہ ہمیں بھی یونین کا ساتھ دینے کے لیے زبردستی اس اڑیل ٹٹو پر سوار ہونا پڑا، نتیجتاً آج بھی ہماری ریڑھ کی ہڈی میں وقفے وقفے سے درد کی ایک ایسی لہر اٹھتی ہے کہ ہم شاعری سے کورے ہونے کے باوجود خواجہ میر درد دہلوی کے "ڈپلی کیٹ" (DUPLICATE) نظر آتے ہیں۔ ویسے میر درد کے زمانے میں ہڑتالوں کا رواج شاید عام نہیں تھا ورنہ تخلص کی درد انگیزی کے باعث ہر ہڑتالی گروپ انھیں اپنا

لیڈر مزدور منتخب کرتا؛ اب جب کہ ایک شاعر کا ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو پھر بات اس وقت تک نہیں بنتی جب تک کہ مرزا غالبؔ کا نام نامی نہ لیا جائے گویا ؎

ذکر جب بھی چھڑا قیامت کا ؛ بات پہونچی تری جوانی تک

ویسے بھی بقول غالبؔ ؎

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اور غالبِ خستہ کے بغیر تو ادب کے تقریباً سارے ہی کام بند ہو جاتے ہیں۔ مرزا غالبؔ سے انجانے میں ایک ایسا معرکتہ الآراء شعر سرزد ہو گیا جسے ہر ہڑتالی گروپ عملی طور پر اپنائے ہوئے ہے، آپ بھی وہ شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

دَیر نہیں حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں ؛ بیٹھے ہیں رہ گذر پہ ہم، کوئی ہمیں اُٹھائے کیوں

دیش کے دیگر صوبوں اور شہروں کے تعلق سے تو ہم دعویٰ کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن جہاں تک بمبئی کی بات ہے، یہاں ہڑتال زندگی کے ہر شعبے میں اسی طرح لازم و ملزوم ہے جس طرح بینک میں جمع شدہ رقم پر سالانہ سُود یا گوالے کے دودھ میں پانی۔ یہاں ہڑتالیں اجتماعی بھی ہوتی ہیں اور انفرادی بھی، مرد بھی ان میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے ہیں اور خواتین بھی۔ یہاں کی ہر ہڑتال کے پیچھے مقصد ضرور ایک ہوتا ہے لیکن طریقۂ کار جُداگانہ ہوتا ہے، مثال کے طور پر جب کسی محبوبہ کو اپنی مانگیں منوانا ہوتی ہیں تو روایتی معشوق کی طرح نہ روٹھتی ہے، نہ آنسو بہاتی ہے نہ کٹی لیتی ہے بلکہ دھڑلے سے اس روسیاہ کی طرف ملتفت ہو جاتی ہے۔ جو عاشقوں کی اصطلاح میں رقیب کہلاتا ہے، اگر کہیں اتفاق سے رقیبِ روسیاہ موٹا اسامی ثابت ہوا تو محبوبۂ دغاباز اس سے شادی رچا کے خود چین کی بنسی بجاتی ہے اور عاشقِ نامراد کو بے چینی کا اکتارہ بجاتے ہوئے بستی بستی پربت، پربت، ڈھول بجا نکتے پھرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔!

بعض سادہ لوح اصحاب، ہڑتال کو ایک ایسا تیر بہدف حربہ تصوّر کرتے ہیں، جس سے چھوٹے بڑے تمام مسائل چٹکیوں میں حل ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہیں کہیں یہ "چمتکار" ہوتا ہو لیکن بمبئی میں تو ہم نے یہی دیکھا کہ اس سے جہاں ایک مسئلہ حل ہوتا ہے وہیں سینکڑوں نئے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں، گویا یہاں کی ہر، ہڑتال، سینکڑوں نئی ہڑتالوں کا پیش خیمہ ہوتی ہے!

اِن دنوں ہڑتال کو ایک نئی عرفیت سے پکارنے کا چلن خاصا عام ہو گیا ہے، یہ سکّہ بند عرفیت ہے "بند" ــــ ورنہ اب سے پہلے عرفیت کا رواج صرف ذی روحوں تک محدود تھا، جیسے نام ہوگا پیرزادہ سید امداد اللہ حسینی قادری، چشتی نقشبندی اور عرفیت چاند پاشا، ہڑتال کی یہ نئی عرفیت آئے دن "کام بند"، راستہ بند، آٹو بند، ٹیکسی بند، بمبئی بند، یہاں تک کہ بھارت بند کے بہانے عام آدمی کی بولتی بند کرتی رہتی ہے ان ہڑتالی بندوں کے کرتا دھرتا تو بند کے دن، گھر میں بند ہو کر، ویڈیو پر اپنی من پسند فلمیں دیکھتے مرغ و ماہی کے مزے لوٹتے ہیں لیکن جن مجبور بندوں کی زندگی کنواں کھود کر روز پانی نکالنے میں کٹتی ہے، اُن کا آنا جانا بند، چولہا بند، کھانا بند انتہا یہ کہ ایک دن لیے جینا تک بند ہو جاتا ہے۔ بند کا مارا ہر بھائی بند، صرف یہی سوچ کر گھر میں بند ہو جاتا ہے کہ ؎

ہڑتال رِ بند و مورچے اصل میں سارے ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی ان سے نجات پائے کیوں

ہڑتال چاہے کسی گریڈ، کسی پیمانے کی ہو، اس وقت تک اپنے کلائمکس کو نہیں پہونچتی جب تک کہ ان تینوں مدارج سے بخیر و خوبی نہیں گزر جاتی۔ دھارنا یہ لفظ دیگر دھرنا گھیراؤ اور پتھراؤ ——— صرف ہڑتال ہی کیوں، انسان کی زندگی خود، ان تینوں ہڑتالی مدارج سے عبارت ہے، یہ ہڑتالی سلسلہ عموماً مردانہ معقول کی رسم منگنی یعنی انگیجمنٹ (ENGAGEMENT) کی تقریب پر تخریب سے شروع ہوتا ہے جب سالیاں اس کے گھر مدپھارکر، دھرنا کا مظاہرہ کرتی ہیں پھر سہاگ رات کو بیوی چاہے شہری ہو یا گھاٹن، گھیراؤ کا ادگھاٹن کرتی ہے اور پھر پہلی اولاد کے ساتھ ہی باقاعدہ "پتھراؤ" کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اور وہ بے بھاؤ کی پڑتی ہے کہ میاں جی کو چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہے۔

دھارنا: ہڑتال کے پہلے درجے یعنی دھارنا میں ہڑتالی فرد یا گروہ دھرنا دے کر یوں قلندرانہ بے نیازی کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے کہ اس مصرعہ کی جیتی جاگتی تصویر معلوم ہوتا ہے ؎

بستر لگا دیا ہے ترے در کے سامنے

اتفاق سے جہاں ہم رہتے ہیں وہاں ایک ایسے ہی دھرنے باز سکونت پذیر ہیں جو ستر پوشی کے معاملہ میں خود تو کرتہ کھدر پسند ہیں لیکن ان کے بال بچوں کو کبھی کسی نے امپورٹیڈ ملبوسات سے نیچے اترتے نہیں دیکھا اس تضاد کے باوجود، موصوف کی لیڈری کسی متعدد وبا کی طرح روز افزوں پھل پھول رہی ہے اور اس کا سبب محض ان کی علت دھرنا بازی ہے۔ ایک دن ہم نے ان کے دھرنوں کے ریکارڈ پر غور کیا تو پتہ چلا کہ موصوف ہوش سنبھالنے کے بعد سے آج تک اتنے دھرنوں میں بہ نفسِ نفیس حصہ لے چکے ہیں کہ عمرِ عزیز کا لذیذ حصہ تو صرف بیٹھے بیٹھے ہی بیت گیا اور آگے بھی اس سلسلہ اٹھک بیٹھک کے رکنے کے دور دور تک آثار نہیں، حال ہی میں بستی کی ایک ایسی بزرگ ہستی نے جس کے ہاتھوں موصوف تولد ہوئے ہیں یہ سنسنی خیز انکشاف کیا کہ اس دھرنا ایکسپرٹ کو شکم مادر میں بھی قرار نہیں رہا، وہاں بھی موقع بے موقع دھارنا کا مظاہرہ کیا کرتے تھے، اور بوقت ولادت تو وہ سنسنی دوڑائی کہ دوا خانے کا سارا عملہ، بلکہ حکام بالا، یہاں تک کہ وائسرے بہادر بھی اپنے سارے پروگرام منسوخ کر کے، موصوف سے اس سرائے فانی میں قدم رنجہ فرمانے کی دست بستہ گزارش کرنے چلے آئے۔ وائسرے بہادر کی آمد پر موصوف ذرا سا پگھلے، یعنی بڑی منتوں سماجتوں کے بعد اس وعدے پر دنیا میں تشریف لانے کو تیار ہوئے کہ کبھی بہادر کے مطابق قوم کے یہاں سے نیک آبرو رخصت ہونے کے بعد جمہوری حکومت کے قائم ہوتے ہی انھیں ہر چناؤ لڑنے کا دستوری حق دیا جائے گا۔

موصوف چونکہ پیدائشی دھرنے باز ہیں اس لیے تمام پیشہ ور پارٹیاں انھیں اپنا گرو مانتی ہیں۔ اور ضرورت کے وقت اپنی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں تھما دیتی ہیں چنانچہ آج اگر موصوف اردو کی تائید میں کہیں دھرنا دیتے نظر آتے ہیں تو اگلے دن کہیں اور اردو کی مخالفت میں دھرنے پر بیٹھے دکھائی دیتے ہیں اصل میں موصوف فطرتاً مرغی کی طرح ہیں، جو انڈے سیتے وقت یہ نہیں دیکھتی کہ انڈے اس کے اپنے ہیں یا کسی اور کے، بس بنا بھید بھاؤ کے ان پر بیٹھ جاتی ہے۔ موصوف کی اس مرغی صفت فطرت اور دوغلی طبیعت سے ساری بستی چونکہ واقف ہے اس لیے جب بھی یہ کسی کے گھر بلا کی طرح نازل ہوتے ہیں صاحب خانہ

ان کی شانِ نزول کی وجہ جانے بغیر ہی کسی نہ کسی بہانے انھیں چلتا کر دیتا ہے کہ جانے کس وقت ان پر دھارنا کا موڈ طاری ہو جائے اور پھر حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے والی بات صادق آجائے۔

گھیراؤ: دھارنا کے بعد والا درجہ گھیراؤ کہلاتا ہے۔ اگر دھرنا بے سود ثابت ہو تو گھیراؤ پر عمل کیا جاتا ہے۔ دھرنوں میں ناپسندیدہ شخصیتوں کو صرف دور سے دھمکی دی جاتی ہے جبکہ گھیراؤ میں ناپسندیدہ شخص یا اس کے پیچھے یا منظورِ نظر کو راست نشانہ بنایا جاتا ہے، اس مرحلے میں کسی قدر تشدد کے مظاہرے کی بھی اجازت ہوتی ہے یعنی گھیراؤ کے سلسلہ میں مظاہرین کو اس بات کا دستوری حق یا یوں کہیئے ہڑتالی حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اگر چاہیں تو گھیراؤ شدہ ہستی سے ہنسی مذاق یا دھول دھپہ بھی کر سکتے ہیں۔ گھیراؤ سے عموماً مظاہرین کو کم اور گھیراؤ شدہ شخصیت کو زیادہ فائدہ پہنچتا ہے۔ یعنی گھیراؤ کا شکار شخص اگر مینجر ہوا تو گھیراؤ کے بعد جنرل مینجر بنا دیا جاتا ہے، اسی طرح رکنِ اسمبلی یا رکنِ پارلیمنٹ گھیراؤ کے بعد منسٹر ڈپٹی منسٹر بن جاتے ہیں۔ گھیراؤ کے ذکر پہ ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا، ایک مرتبہ کچھ غیر ملکی مندوبین کے اعزاز میں کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں عصرانہ ترتیب دیا گیا تھا جس میں ایک مشہور رقاصہ نے بطورِ نذرانہ اپنے فن سے زیادہ اپنے اعضائے رئیسہ دعربیہ کی جی کھول کر نمائش کی، اس شر انگیز رقص شر کے دوران ساقی رقاصاؤں کو اُسے بار بار اپنے گھیرے میں لیتا دیکھ کر سارے مندوبین گھبرا کر یہ کہتے ہوئے کھڑے ہوگئے کہ لیجئے یہاں بھی گھیراؤ شروع ہوگیا، بڑی مشکل سے انھیں سمجھا کر بٹھایا گیا کہ یہ گھیراؤ نہیں بلکہ رقص کا ایک انداز ہے، جواب میں ایک مندوب نے محققانہ لہجے میں فرمایا "گھیراؤ کا موجودہ طریقہ غالباً اسی رقص سے لیا گیا ہے۔"

پتھراؤ: جب کوئی ہڑتال دھارنا اور گھیراؤ کے آزمودہ حربوں کے آزادانہ استعمال کے بعد بھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوتی، تو پھر تیسرے ڈگری والا خطرناک حربہ آزمایا جاتا ہے۔ یعنی پتھراؤ کی بے ضابطہ کارروائی کی جاتی ہے۔ کہنے کو تو ہڑتال کا یہ تیسرا اور آخری درجہ پتھراؤ کہلاتا ہے لیکن اس میں فریقین کو پتھر کے علاوہ سوڈا واٹر کی بوتلوں، لاٹھیوں، چھروں، تلواروں اور بام بھالوں کے استعمال کی کھلی چھوٹ حاصل ہوتی ہے۔ اس درجے سے گزرنے کے بعد بھی اگر کوئی ہڑتال ناکام ہو جائے تو پھر ایسی ہڑتال تاریخ کی ناکام ترین ہڑتالوں میں شمار کی جاتی ہے لیکن جغرافیائی اعتبار سے ہر ہڑتال کامیاب ہوتی ہے کہ پتھراؤ کی زد میں آئی ہوئی عمارتوں کے ٹوٹے ہوئے شیشے جلا ہوا ملبہ اور زخمی انسانوں کے سروں اور بازوؤں کی پٹیاں ہر ناکام ہڑتال کی کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہوتی ہیں۔

خامہ بگوش (کراچی)

وہ نقّادوں کو قہرِ الٰہی سمجھتے ہیں

جو ادیبوں پر نازل کیا جاتا ہے!!

"نئے زمانے کی برہن" کے نام سے کشور ناہید کے بارے میں، جو کتاب چھپی ہے، اس میں شامل شہرت بخاری کا مضمون عجائب و غرائب کا مجموعہ ہے۔ اس مضمون کی کچھ جھلکیاں پچھلے ہفتے پیش کی گئی تھیں، کچھ اس وقت پیش کی جارہی ہیں۔

بخاری صاحب نے چھوٹے چھوٹے جملوں میں کشور ناہید کے بارے میں بڑی بڑی باتیں کہہ دی ہیں، مثلاً وہ "سنی" ہے مگر رقیق القلب ہے"۔ (ص ۳۹) ہمارا خیال تھا کہ محترمہ اپنے ہم مشربوں کی طرح سنگدل ہوں گی، لیکن خدا کا شکر ہے کہ انھوں نے شہرت بخاری کا اس حد تک اثر قبول کیا کہ ان میں رقیق القلبی کی صفت پیدا ہوگئی۔ معلوم نہیں، یہ اثر بخاری صاحب کی شخصیت کا ہے یا ان کے کلام کا؟ کلام ہی کا ہوگا کیونکہ اسے پڑھتے ہوئے کمزور دل لوگوں پر رقت طاری ہوجاتی ہے۔

بخاری صاحب نے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ "کشور ناہید اگرچہ بلند شہر کی رہنے والی ہیں، مگر زبان یوں چلتی ہے جیسے میرٹھ کی قینچی"۔ (ص ۵۰) اس سے شاید یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ رقیق القلب انسان، رقیق اللسان بھی ہوتا ہے۔

بخاری صاحب کے تمام چھوٹے چھوٹے جملے کشور ناہید کی "مدح" میں ہیں، لیکن بڑے بڑے جملے انھوں نے خود اپنی شان میں لکھے ہیں۔ مضمون کشور ناہید پر ہے، مگر اس کا انداز ایسا ہے جیسے موصوف خود اپنا خاکہ لکھ رہے ہوں۔ تمہید میں انھوں نے اپنے مزاج و کردار کا خوبصورت مرقع پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔ "لڑکیاں سب کو اچھی لگتی ہیں، مجھے بھی اچھی لگتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ میں بہت سی لڑکیاں دیکھنے کے تپ دق بلکہ سل میں مبتلا ہوں ۔ ۔ ۔ جب میں دیال سنگھ کالج (لاہور) میں داخل ہوا تو یہ کالج اس زمانے میں عجیب و غریب جگہ تھی۔ ایسی پیاری پیاری شکلیں میں نے اس سے پہلے بھلا کہاں دیکھی تھیں ۔ ۔ ۔ کالج

تو بس اس اعتبار سے اندر کا اکھاڑا تھا کہ ایک سے ایک پری پیکر، ایک سے ایک پُرکشش لباس میرے ہوش و حواس باختہ رہتے تھے، لڑکیاں کلاس میں اگلی نشستوں پر بیٹھتی تھیں۔ میری ہمیشہ کوشش ہوتی تھی کہ میں ان سے پچھلی نشست حاصل کروں۔ اگر کبھی کامیاب ہو جاتا تو ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی پوری ذات اپنی ناک میں جمع کر لیتا اور اندر کی طرف لمبے لمبے سانس کھینچتا رہتا تھا تاکہ وہ اپنی خوشبو کے ساتھ میرے اندر اُتر جائیں۔۔۔ (ص ۳۲)۔

کوئی پوچھ سکتا ہے کہ کشور ناہید کا ان باتوں سے کیا تعلق ہے؟ جب لکھنے والے نے یہ باتیں کسی سے پوچھ کر نہیں لکھیں تو پڑھنے والے کو کچھ پوچھنے کا حق کیسے ہو سکتا ہے؟

کشور ناہید کے منظر عام پر آنے سے پہلے کی شاعرات کا ذکر وہ ان لفظوں میں کرتے ہیں: "جو دو ایک شاعرات کسی بزم مشاعرہ میں اتفاق سے نظر بھی آتی تھیں تو وہ اتنی معمر اور ایسی بھدّی ہوتی تھیں کہ بات کرنا تو درکنار، نظر اٹھانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ دُور ہی سے بساند آنے لگتی تھی۔" (ص ۳۳)
گویا شاعرات کا معمر ہونا عیب ہے۔ استاد لاغر مراد آبادی نے شہرت بخاری کے اس قولِ برحق کو سُن کر فرمایا "جس معاشرے میں شعرا معمّر ہو کر بھی نابالغ رہ جائیں، وہاں خواتین کی شاعری کا معیار بھی یہی ہونا چاہیئے"۔

مذکورہ قولِ برحق کے فوراً بعد کشور ناہید کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے بخاری صاحب فرماتے ہیں ۔۔
"میرا اس کا تعلق بس ایک شاعر اور قاری کا رہا۔ شاعر کے ظاہر سے میں نے کوئی واسطہ نہ رکھا۔ مجھے شاعر کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا۔" (ص ۳۷) کہاں تو صرف چہرہ ہی دکھائی دیتا تھا اور کہاں سخن فہمی کا یہ عالم کہ چہرہ ہی غائب ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس بات کو صحیح سمجھا جائے اور کسے آرایشِ بیان۔

بخاری صاحب نے اپنے بارے میں بھی آرائشِ بیان سے خاصا کام لیا ہے۔ فرماتے ہیں: "میں کیسا شاعر ہوں، اِس کا فیصلہ تو لوگوں نے کر رکھا ہوگا، مگر میں خود قاری بھی تو ہوں اور اس حیثیت میں مجھے اپنی بہت سی غزلیں اچھی لگتی ہیں۔" (ص ۳۷) ہم یہ تو نہیں کہیں گے کہ موصوف قاری بھی اچھے نہیں، یہ ضرور عرض کریں گے کہ اچھا قاری بننے کے لیے کبھی کبھی دوسرے شاعروں کا کلام بھی پڑھ لینا چاہیئے تاکہ آپ اس فیصلہ سے اتفاق کر سکیں، جو لوگوں نے آپ کی شاعری کے بارے میں کر رکھا ہے۔

اپنے بارے میں اُنھوں نے یہ بھی فرمایا ہے: "میں شہرت بخاری کو اپنے زمانے کے چند اچھے شاعروں میں سے ایک سمجھتا ہوں۔" (ص ۳۷) یہاں بخاری صاحب نے قدرے انکسار سے کام لیا ہے۔ زمانے کی قید انھوں نے خواہ مخواہ لگا دی۔ شاعر اگر اچھا ہوتا ہے تو اپنے زمانے ہی میں نہیں، ہر زمانے میں اچھا ہوتا ہے۔ شہرت بخاری بھی ہر زمانے کے اچھے شاعر ہیں بشرطیکہ ہر زمانے میں وہ اپنے قاری بھی خود ہی ہوں۔
ایک جگہ بخاری صاحب نے بتایا ہے کہ جب ان کی بیاض گم ہو گئی تھی، تو دو روز تک نہ کھانا کھا سکے تھے نہ سو سکے تھے، مگر یہ نہیں بتایا کہ جس شخص کو یہ گم شدہ بیاض ملی تھی، اسے کتنے دنوں تک نہ بھوک لگی نہ نیند آئی۔

بخاری صاحب نے اپنی شاعری کے تذکرے کے ساتھ ساتھ ایسی گھریلو باتوں کا بھی ذکر کیا ہے جنھیں

غیر شاعر برسرِ عام بیان نہیں کرتے۔ مثلاً ایک جگہ وہ لکھتے ہیں: "مجھے ابھی خاصی خوش فہمی رہی ہے کہ میں اپنی بیوی کو کچھ کچھ اچھا بھی لگتا ہوں۔ اور وہ مجھے کچھ کچھ پیار بھی کرتی ہے۔ مگر میرے کان بہرے ہو جائیں، جو میں نے اس سے ایک لفظ بھی اس سلسلے میں سنا ہو۔ میں نے ہزاروں مرتبہ اس کے حسن و جمال کے قصیدے پڑھے، لاکھوں مرتبہ اپنے عشق کا اعلان کیا، اس نے کبھی کسی قسم کے ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ اور میں بار ہا بجھ بجھ گیا، لیکن اسے کوئی پرواہ نہیں۔ شروع شروع میں میں نے اسے بہت کریدا کہ میرے لیے اس کے دل میں کیا جگہ ہے۔ وہ پردوں پہ پانی نہیں پڑنے دیتی۔ سوچا ذرا وضاحت سے سوال کیا جائے۔ پوچھا: نہیں میری قسم بتاؤ، میں تمہیں اچھا لگتا ہوں؟ جواب ملا: جو اچھا ہوتا ہے وہ اچھا لگتا بھی ہے، آئینہ دیکھ لو اور فیصلہ کر لو۔ اب میں آئینہ دیکھتا ہوں تو اللہ ہی اللہ۔ چپ کا چپ رہ گیا۔" (ص ۳۶)

کاش بخاری صاحب یہ بھی بتا دیتے کہ کون چپ کا چپ رہ گیا، وہ خود یا آئینہ؟

بخاری صاحب نے ایک جگہ فرمایا ہے: "میں کشور ناہید کو اس قدر نزدیک سے نہیں جانتا، جتنا جاننے کا حق ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے بلکہ یہ اعتراض بھی ہو سکتا ہے کہ جب میں کسی کو اتنا نہیں جانتا، جتنا جاننے کا حق ہے تو پھر مجھے کیا تکلیف ہے کہ میں اس پہ لکھ رہا ہوں۔ اس کا جواب واقعی میرے پاس نہیں۔" (ص ۴۳)

اس کا جواب مضمون کے قاری کے پاس ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ نے مضمون کشور ناہید کے بارے میں کہاں لکھا ہے، خود اپنی ذاتِ گرامی کو موضوع بنایا ہے۔ ہاں کہیں کہیں خالی جگہوں کو پُر کرنے کے لیے کشور ناہید کا ذکر بھی کر دیا ہے تاکہ زیرِ نظر کتاب میں مضمون کی شمولیت بے جواز نہ ٹھہرے۔

بخاری صاحب نے نقادوں کی بھی خوب خبر لی ہے اور ساتھ میں ان ادیبوں شاعروں پر بھی لعنت ملامت کی ہے جو نقادوں سے اپنے بارے میں مضامین لکھواتے ہیں۔ فرماتے ہیں: "میں ذاتی طور پر تنقید کو ایک بانجھ عورت سے زیادہ نہیں سمجھتا، جو تواتر کے ساتھ بچوں کی پیدائش، ان کی نشو و نما اور تعلیم و تربیت پر گفتگو کرتی ہے، یہ ایک غیر تخلیقی عمل ہے۔ نقادوں کو میں ایک قہرِ الٰہی سمجھتا ہوں جو ادیبوں پر نازل کیا جاتا ہے... نقادوں کی اہمیت ان ادیبوں اور شاعروں کے باعث ادب میں بنتی ہے، جو لولے ہو جاتے ہیں اور بغیر کسی بیساکھی کے قدم نہیں اٹھا سکتے۔" (ص ۳۵)

ہماری رائے میں بخاری صاحب کو نقادوں کے لیے اتنی سخت زبان استعمال نہیں کرنی چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے نقادوں نے بخاری صاحب کی شاعری کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا، مگر یہ اتنا بڑا جرم نہیں ہے کہ اس کی بناء پر انھیں قہرِ الٰہی سمجھا جائے۔ شاعروں اور ادیبوں کو بھی اس وجہ سے مطعون نہیں کرنا چاہیے کہ وہ نقادوں سے اپنے بارے میں مضمون لکھواتے ہیں۔ تیسرے درجہ کا ادب تخلیق کر کے اول درجہ کی تنقید لکھوانا کوئی برائی نہیں ہے۔ برائی تو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب شاعر خود اپنے قلم سے اپنی تعریف کرے اور یہ کہیں کہ ہمیں اپنی بہت سی غزلیں اچھی لگتی ہیں۔

ہم معذرت خواہ ہیں کہ باقر مہدی اور شہرت بخاری کے مضامین کا ذکر اتنا طویل ہو گیا کہ دوسرے مضامین کے ذکر کرنے کی گنجائش نہیں رہی۔ خصوصاً محمد علی صدیقی کا مضمون بھی تفصیلی مطالعے کا مستحق ہے، جس کا عنوان ہے "غیر ذاتی ذاتیت کی شاعری"۔ یہ مضمون [illegible] کہیں کہ اسکے شروع ہی میں کہہ دیا گیا کہ صاحبِ مضمون [illegible]

خالد عرفان

منظوم خاکہ

ضیاء الحق قاسمی



ضیاء الحق قاسمی

ضیاء الحق ہے اِس کا نام۔ اور یہ قاسمی بھی ہے
فقط شاعر نہیں تھوڑا بہت تو آدمی بھی ہے

لطیفہ گو ہے، شاعر ہے، مقرّر ہے، اڈیٹر ہے
نہ بیٹھے پانچواں کوئی یہ گاڑی فور سیٹر ہے

ابھی تک گرم اس کی نوجوانی کا جو ہیٹر ہے
نہ جانے تیل اس انجن میں باقی کتنے لیٹر ہے

یہ اک ایسا سخنور ہے، یہ اک ایسا صحافی ہے
کہ جس کے چند ہی لفظوں کے بعد اللہ شافی ہے

یہ شاعر قول کا پکّا ہے اور وعدے کا سچّا ہے
مگر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ امرود کچّا ہے

صحافت اس کی لونڈی ہے رسالہ اس کا بچّہ ہے
ظرافت نے جنم جس سے لیا ہے یہ وہ زچّہ ہے

غزل بھی لکھ رہا ہے اور ظرافت کی سپر بھی ہے
بظاہر مرد ہے لیکن اِدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے

یہ شامل ہو گیا پہلے ظریفوں کی سواری میں
پھر اس کے بعد گھس آیا صفِ کالم نگاری میں

یہ کالم جانتا ہے جو بھی اس کالم کا کالم ہے
جہاں چھپتا ہے یہ اتنی جگہ کا ناک میں دم ہے

ہر ایک سے رابطہ اس کا، عجب پی آر رکھتا ہے
یہ اپنے سینکڑوں دشمن بھی سرحد پار رکھتا ہے

بنا دو کمپیئر اس کو تو ویرانے میں آ جائے
کوئی دشمن بھی مر جائے تو دفنانے میں آ جائے

منافق تو نہیں رازِ حقیقت کھول دیتا ہے
یہ جو محسوس کرتا ہے وہ منہ پر بول دیتا ہے

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

احمد جمال پاشا — یادیں باتیں

احمد جمال پاشا دوست آدمی تھے اور دوستی کو ترفع اور اونچائی کی طرف لے جانے کا ہنر جانتے تھے۔ وہ طنز و مزاح نگار تھے لیکن محض ہنسنے ہنسانے پر بس نہیں کرتے تھے بلکہ اصلاح احوال کا کوئی نہ کوئی پہلو پیش نظر رکھ کر علمی و ادبی خدمت انجام دینے کا جذبہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام زندگی تخلیقی سفر کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہے۔ ہمدردانہ لہجے میں رنگا رنگ واقعات کے نشیب و فراز سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیتے رہے۔ بے جوڑ اور ناخوشگوار پہلوؤں سے آگاہ کرتے رہے۔ ہمارے شعور کی پختگی کو اجاگر کرتے رہے اور زندگی کے بے ڈھنگے پن کی عکاسی میں تفنن کو راہ دیتے رہے۔ ان کے یہاں تجربات وسیع تھے اور ان کا مشاہدہ گہرا تھا۔ اس مشاہدہ میں نفسیاتی پہلو زیادہ ہوتا تھا۔

سوچ، سچائی اور دانائی کے اس شخص احمد جمال پاشا سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ نئے افق کی تلاش میں بہت آگے نکل چکے تھے اور زندگی کے نشیب و فراز، افسردہ واقعات اور کرب و لذت کی منزلوں سے خود کو خوش دلی سے گزار کر بے نیازانہ کیفیت کے عادی ہو چکے تھے۔ لکھنؤ کو خیرباد کہہ کر سیوان آ بسے تھے۔ انھوں نے مجھے مطلع کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"میرا نیا پتہ نوٹ کرلیں۔ اب یہیں رہنا ہے۔ کالج میں پڑھاؤں گا اور خسر محترم کے انتقال کے بعد زمین جائیداد کی جو ذمہ داری آگئی ہے اس کی دیکھ بھال کروں گا۔ بیگم آداب کہتی ہیں۔"

احمد جمال پاشا کی سرشت میں فراخ دلی تھی اور طبیعت میں فیاضی تھی۔ اس کا ذاتی تجربہ پہلے ۱۹۷۷ء میں پٹنہ میں ہوا تھا جب ہم دو دن تک ساتھ ساتھ رہے تھے۔ طنز و مزاح نگاروں کی کانفرنس میں شرکت کے لیے دور دور سے قلم کار حضرات آئے تھے اور ہم اکٹھے بیٹھ کر ذاتی مسائل اور مطالعاتی بصیرت کی باتیں کرتے رہے تھے۔ لیکن لطف تب آیا تھا جب بانکی پور کلب پٹنہ میں ہماری دعوتیں تھیں اور ڈاکٹر قمر رئیس، مجتبیٰ حسین، سہیل عظیم آبادی، شکیل اختر، مصطفیٰ کمال، احمد جمال پاشا، بدر جمال اور مناظر عاشق ہرگانوی ایک گوشے میں بیٹھ گئے تھے۔ ہم ہر طرح کی باتیں کر رہے تھے۔

سہیل عظیم آبادی گفتگو میں حصہ نہیں لے رہے تھے۔ آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔ شکیلہ اختر نے انھیں مخاطب کرکے کہا "آپ بہت سوتے ہیں؟"

"سوتا نہیں ہوں بلکہ میں سنی مسلمان ہوں اس لیے صرف سنتا ہوں۔" سہیل عظیم آبادی نے بے حد سادگی سے جواب دیا تھا۔

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے احمد جمال پاشا نے اس گوشے کو زعفران زار بنا دیا تھا ہم مسکرا رہے تھے اور ہنس رہے تھے اور دوسرے لوگ دور سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ بعض پھلجھڑیاں اب بھی ذہن کے حافظے میں محفوظ ہیں۔ احمد جمال پاشا نے مرغ کی آواز کی صفت بیان کرتے ہوئے کہا تھا:

"مرغ کی جسامت کے لحاظ سے اس کی آواز کم از کم سوگنا زیادہ ہوتی ہے۔"

"اور گھوڑے کی آواز کے بارے میں کیا خیال ہے؟" ماہنامہ "شگوفہ" حیدرآباد کے مدیر مصطفیٰ کمال نے پوچھا تھا۔

"اگر گھوڑے کی آواز بھی اسی تناسب سے بنائی گئی ہوتی تو تاریخی جنگوں میں توپ چلانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔" احمد جمال پاشا کا جواب تھا۔

"مرغ اذان بھی دیتا ہے۔" شکیلہ اختر نے پوچھا تھا۔

"اپنے رب کی حمد و ثنا کرتا ہے۔" سہیل عظیم آبادی گویا ہوئے تھے۔

"نہیں! اگر یہ جانور اتنا عبادت گزار ہے تو مولوی صاحبان اسے اتنے شوق سے کیوں کھاتے ہیں؟"

احمد جمال پاشا کے اس جواب پر سب لاجواب ہوگئے تھے۔

احمد جمال پاشاہ سے جب میری پہلی ملاقات ہوئی تھی تو کرتا پائجامہ میں نظر آئے تھے۔ روزانہ شیو کرنے کے عادی تھے۔ سرخ و سفید رنگت کی وجہ سے چہرہ زیادہ صاف و شفاف دکھائی دیتا تھا۔

دوسری ملاقات میں سفاری سوٹ میں اور اس کے بعد شرٹ پینٹ میں انھیں دیکھا تھا۔ پٹنہ میں عموماً وہ تلسی ہوٹل (کونارک ہوٹل) میں ٹھہرا کرتے تھے۔ ایک بار پتہ چلا کہ پاشا صاحب پٹنہ ہی میں ہیں، میں کسی ذاتی کام سے پٹنہ گیا تھا۔ جب ہوٹل پہنچا تو وہ کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے لیکن چہرے پر داڑھی دیکھ کر میں چونک پڑا تھا۔

"یہ تبدیلی . . . ." میری انگلی اٹھی ہی تھی وہ بول پڑے۔

"حج سے واپسی کے بعد رکھ لی ہے۔"

خشخشی اور مہندی لگی داڑھی میں وہ عجیب سے نظر آرہے تھے وہ پورٹ فولیو دباتے ہوئے مسہری پر بیٹھ گئے تھے اور مجھے کرسی پر بٹھا کر باتیں شروع کردی تھیں۔ لیکن میرا ذہن ان کے حلیے میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ ان کا لکھا ہوا آل احمد سرور پر خاکہ لگا ہوں میں گڈمڈ ہونے لگا۔

سرور صاحب کے یہاں جو چیز پائی جاتی ہے اسے شخصیت کے جادو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس جادو کی کشش سے دراصل پڑھائی لکھائی کم اور ترقی زیادہ ہونے لگی۔ جس بغل میں کتابیں دبی ہوتی تھیں

ں میں فائلیں آگئیں اور ہاتھ نے تنبیہہ الغافلین کی جگہ پورٹ فولیو سنبھال لی۔ بس اب اس دفتر سے کرسی
تر اس میٹنگ سے اس میٹنگ۔ [illegible]
تھ میں حاکم، خود حاکم وقت۔ غرض انسان کو بگڑتے دیر نہیں لگتی۔"

میں نے ذہن کو ان کی باتوں کی طرف موڑنا چاہا۔ وہ بتا رہے تھے "دو دن سے یہاں ہوں۔
بڑی میں کام ہے۔ خدا بخش لائبریری سے استفادہ کرنا ہے۔ طنز و مزاح پر کچھ اہم کام کر رہا ہوں
پنچ تنتر" کے تحقیقی ایڈیشن کی تیاری میں بھی لگا ہوا ہوں۔ سنسکرت ادب پر مسلمان قلم کاروں کے
سانات رہے ہیں۔ ان کا اجاگر ہونا ضروری ہے۔ یہ کام میرے ہاتھوں ہو جاتے تو سمجھوں گا، بڑا کام
نام دیا ہے۔ اس کتاب کے نئے ایڈیشن کے لیے اردو انگریزی اور فارسی کے نسخوں سے مدد لے
رہا ہوں۔ ۔ ۔"

میرا ذہن ان کی باتوں کی گہرائی سے ان کی شخصیت کو کریدنے لگا۔ اور ابن فرید پر ان کا ایک
لہ بے طرح یاد آنے لگا:

"اگر آپ ان کو دیکھیں تو فلسفہ، ادب، اسلام اور داڑھی کا مرکب نظر آئیں گے۔ باہر سے قدیم
ر سے جدید۔ دیکھنے میں مولانا لیکن اصلیت میں بڑے باغ و بہار ۔ ۔ ۔"

احمد جمال پاشا کی شخصیت میں طنز، محبت، ظرافت، خلوص، شرافت اور بذلہ سنجی کا امتزاج
ا۔ ویسے انھوں نے طنز و مزاح کے ذریعہ ساری زندگی دوسروں کو ہنسانے میں جینے کا احساس دلاتے
ں گزاری۔ مگر ان کے یہاں کھوکھلا پن نہیں ملتا بلکہ جمہوری سماج کے اقدار، نشانات کی بصیرت ملتی
ہے اور اپنی عظمت کو برقرار رکھنے والا اعلیٰ قرینے کا طنز و مزاح ملتا ہے۔

لیکن چہرے مہرے پہ ہی کیوں جائیے۔ آج کل تو 'ملاوٹ' میں چاندی ہے۔ لوگ پکڑے جاتے
ں، سزائیں پاتے ہیں اور چھوٹ آنے کے بعد پھر دودھ میں پانی اور آٹے میں کھریا ملاتے ہیں۔ جب
ہم اس معاملہ میں اس قدر بے قصور ہیں کہ فوٹو کھنچوانے سے پہلے میک اپ تک نہیں کرتے۔ اگر
ٹو بناتے وقت فوٹوگرافر ایک آدھ برش لگا کر ہمارے چہرے کے داغ دھبے دور کر دیتے ہیں تو
وٹ کا گناہ اس کے نامۂ اعمال میں جاتا ہے۔" [آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے]

"کہتے ہیں ڈھونڈنے سے خدا مل جاتا ہے۔ ضرور مل جاتا ہے۔ لیکن لاکھ تلاش کے بعد مکان
ہیں مل سکتا۔ اسی چکر میں یہ طے کر کے نکلے کہ یا مکان تلاش کر لیں گے ورنہ خود ہی لاپتہ ہو جائیں گے
ن ہوا یہ کہ نہ مکان مل سکا اور نہ خود جیتے جی لا مکان ہو سکے۔ لیکن ہر مکان کو خالی سمجھ کر اس پر لپکنے
چکر میں کئی بار پولیس کے ہتھے چڑھتے چڑھتے ضرور بچے۔ جب ہم کسی خالی مکان میں تالا لگا دیکھتے
اس خیال کے تحت اس کا چکر لگانے لگتے کہ یہ ضرور خالی ہوگا۔ جس سے پاس پڑوس والوں کو
ب ہونے لگتا کہ کہیں ان کا ارادہ قفل شکنی تو نہیں؟ ۔۔۔ لیکن یہاں قفل شکنی تو کجا، کسی کی دل شکنی کو منہ
[illegible]

"شام کی خبروں پر گرفتار ہونے والوں کی جو فہرست سنائی گئی تھی اس میں خاصی تعداد ان بزرگوں کی ہے جنھوں نے ادب کے منصب اپنے دوستوں، رشتہ داروں اور ہم وطنوں میں تقسیم کرکے حق داروں کو ان کے حق سے محروم کر دیا تھا۔ یہ سب اب فوجی حراست میں ہیں۔ ان کی ضمانتیں نامنظور کر دی گئی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اپنی تحریروں کی تردید بھی شائع کرنے پر ان کی سزاؤں میں تخفیف کر دی جائے۔ مگر ان لوگوں کی سزاؤں میں کمی نہیں کی جائے گی جنھوں نے خود لکھ کر اپنے خاندان کے لوگوں کو شاعر و ادیب بنانے کی وقتی کوششیں کی تھیں۔" [ادب میں مارشل لا]

ایک ملاقات میں پاشا صاحب پوچھنے لگے "آپ کا رسالہ 'کوہسار' نہیں مل رہا ہے۔ اگر نکل رہا ہے ضرور بھیجئے۔ اس میں آپ خوب ہنگامہ آرائی دیتے ہیں"

مجھے یاد آیا، جنوری ۱۹۷۹ء میں جب میں نے ہزاری باغ سے "کوہسار" کا پہلا شمارہ نکالا تو اس کا خوب چرچا ہوا۔ لوگوں نے بہت پسند کیا۔ پہلا شمارہ پڑھ کر احمد جمال پاشا نے "سہرے کا ڈیمانسٹریشن" بھیجتے ہوئے مجھے لکھا تھا:

"کوہسار پر دلی مبارکباد قبول کیجئے۔ اس میں آپ کے شخصی جوہر بہت نمایاں ہیں۔ ایک مزاحیہ 'سہرا' کوہسار کے لیے بھیج رہا ہوں۔ یہ اردو میں میری ایجاد ہے"

'کوہسار' کے دوسرے شمارے میں جب یہ 'سہرا' چھپا تو اسے پسند کرنے والوں میں پہلا خط ذکی انور کا آیا تھا۔ جمشید پور میں ۱۱ اپریل ۱۹۷۹ء سے فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گیا تھا اور ذکی انور قتل کر دیے گئے تھے۔ ویسے [illegible] سے ہی تھا۔ اور اسی روز سے ذکی انور بھوک ہڑتال پر بیٹھ چکے تھے لیکن اس سے ایک رات [illegible]۔ [illegible] ۱۹۷۹ء [illegible] 'کوہسار' کی رسید اور اپنی آخری کہانی "پہلا دن" مجھے بھیجی [illegible] انور) کے ساتھ انھوں نے لکھا تھا:

"کوہسار کا دوسرا شمارہ ملا۔ خوشی کم ہوئی، حیرت زیادہ۔ مان لیا کہ تم میں ایک لگن ہے۔ یہ جذبہ زندہ رہ جائے تو یقیناً یہ ایک خوشی کی بات رہے گی۔ یہ پرچہ تم نے سلیقے سے نکالا ہے۔ "دش کنیا" اور "بالشتیے" اچھی کہانیاں ہیں۔ مباحثہ میں مظفر حنفی کا پلا بہت بھاری ہے۔ جگن ناتھ آزاد صاحب نے بہت اختصار سے بہت اچھی بات کہی ہے۔ [illegible] نے تمہارے لیے لکھا یہ بہت بڑی بات ہے ویسے وہ [illegible] میں مشہور ہیں۔ اچھی چیز دی ہے انھوں نے مزا آگیا"

"سہرے کا ڈیمانسٹریشن" چونکہ اپنی نوعیت کا پہلا مضمون تھا اور اس کی ایجاد کا سہرا احمد جمال پاشا کے سر بندھتا ہے اس لیے اس کی پذیرائی خوب ہوئی۔ 'کوہسار' کا جنوری ۷۹ء کا پہلا شمارہ ملنے کے بعد پاشا صاحب نے ۲۶ جنوری ۱۹۷۹ء کو اسے خاص 'کوہسار' کے لیے لکھا تھا۔ یہ 'سہرا' کتنا مزہ دار ہے ذرا آپ بھی چکھ لیں:

"باراتیوں اور صراتیوں! اس وقت آپ کے سامنے جو صاحب، بارات کے دولہا بنے جھک جھک کر آپ کو سلام کر رہے ہیں، جن کے نکاح کے چھوہارے ابھی ابھی آپ نے لوٹے ہیں اور جو سہرے میں

سلسل شرمائے دلہنوں کو مات دینے میں مصروف ہیں، یہی حسین وجمیل دولہا خود بہ نفسِ نفیس آفاق احمد صاحب بی ایس سی ہیں۔ میرے دوست ہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو کم از کم تین پشتوں تک تو میں خود ان کا فیملی فرینڈ ہوں۔ انوار احمد صاحب سے ہماری دوستی، اسرار احمد میرے بے تکلف دوست، ان کے صاحبزادے ندیم میرے دوست۔ اب رہے میاں نوشہ تو ہمارے کالج کے ساتھی ٹھہرے۔ پچھلے کئی سال سے یہ حضرت اپنی شادی جیسے عظیم مسئلے پر مجھ سے خفیہ صلاح و مشورے کرتے آئے ہیں۔ چونکہ آدمی بدن ہی نہیں دل کے بھی چور ہیں اس لیے جب بھی ان سے کوئی ایسی ویسی پوچھی تو بس یہ لڑکیوں کی طرح شرما کر رہ گئے۔ نہ ان کو پان سگریٹ کا شوق نہ چائے کا، نہ کھینی کا، نہ جہیز کا، نہ یہ مہر کے نام سے بھاگتے ہیں، نہ آسمان کی پری چاہتے ہیں، نہ کسی سے مرعوب ہوتے ہیں نہ متاثر۔ بس ایک فکر ضرور تھی کہ "ہائے ہائے اب تو شاگردوں تک کی شادیاں ہوتی جاتی ہیں۔ آخر کب تک یونہی شرافت سے اکیلے سنیما دیکھا کروں گا؟"

حال ہی میں ایک دن خود اپنے منہ سے بولے "بھئی ایک جگہ چلنا ہے۔" پوچھا۔ "کہاں؟" بولے "۲۶ر جنوری کو صبح بارات میں"۔ یہ بات انہوں نے بہت سے سکتوں اور جھٹکوں کے ساتھ کہی۔ مگر دونوں کان لال ہوگئے ۔۔۔ چھیڑتے ہوئے پوچھا۔ "آخر کس شاگرد کی شادی میں لے جاؤ گے؟" جھینپتے ہوئے ایک پرچہ پر کچھ لکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ لکھا تھا۔ "میری"۔۔ یقین تو نہیں آیا مگر دل رکھنے کے لیے وعدہ کرلیا۔ پھر بولے "شام کو اسرار بھائی آپ کے پاس آئیں گے!"

شام کو ڈاکٹر اسرار احمد، ڈاکٹر قربان حیدر کے ساتھ جو کہ لازم و ملزوم ہیں اس نادری حکم کے ساتھ نازل ہوئے "آپ کو آفاق میاں کا نثری سہرا لکھنا ہے۔ بارات بہن بارہ شریف جائے گی۔ رضی الحق صاحب کے دولت کدے پر ان کی صاحبزادی صالحہ خاتون سے عقد ہوگا۔ خبردار سہرے میں کسی کا نام رہنے نہ پائے۔ شکیل، شاہد، حامد، شہاب کے نام سہرے میں ضرور آئیں۔ بچے ہیں ورنہ ان کے دل ٹوٹ جائیں گے ہاں میرے بہنوئی ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب کا نام بھی لے آنا ورنہ وہ روٹھ جائیں گے"۔

میں نے پوچھا "وہی بہن بارہ شریف جہاں ہمارے وحید چچا اور ہمارے ساتھی راشد امام صاحب اور ہمارے دوست انور بہن باردی صاحب رہتے ہیں؟"۔

بولے "ہاں! وہی، مگر صبح ہی آجانا"۔

میں نے کہا "بھئی دیر ہوجائے گی۔ قومی جھنڈے کو سلامی دینے کے بعد ہی آسکوں گا"۔

دوسرے دن نوشۂ مظلوم خود بہ نفسِ نفیس تشریف لائے اور بولے "جمال بھائی جیسے جیسے شادی کے دن قریب آتے جاتے ہیں، میری نروس نیس بڑھتی جاتی ہے"۔

میں نے کہا "ہدایت نامہ خاوند پڑھو"۔ اس کے بعد "بہادر دولہا عرف کامیاب شوہر یعنی رہنمائے شوہری باتصویر" جیسی مشہور زمانہ کتاب ان کو دی"۔

احمد جمال پاشاہ سے ایک بار خدا بخش لائبریری میں ملاقات ہوئی۔ وہ ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے

پاس بیٹھے ہوتے تھے۔ میں جب گیا تو مسز بیدار اور شائستہ خان بھی آگئیں۔ باتیں ہونے لگیں۔ اسی بیچ مسز بیدار، پاشا صاحب کے لیے چائے لے آئیں۔ میں نے کہا "شکر کا چکر یہاں بھی تو نہیں؟" سبھی چونک پڑے۔ شائستہ خان نے پوچھا "مناظر بھائی، یہ شکر کا چکر کیا ہے؟"

میں نے احمد جمال پاشا کی طرف دیکھا، وہ مسکرانے لگے، تب میں نے بتایا، یہ ان کا طنزیہ ہے جس میں بعض تلخ حقیقتیں بھی نظر آتی ہیں۔ مکالمہ میں مضمر یہ حقیقت دیکھئے:

"صبح صبح گڑ کی چائے پلانے کے بعد والد صاحب نے راشن کارڈ اور دام دیتے ہوئے ہم سے کہا "بیٹا! شکر لانے کی کوشش کرو۔"

کپڑا لے کر میں شکر لانے کے لیے چلا تو والدہ صاحبہ نے پکارا "ٹھہرو امام ضامن تو بندھوا لو۔"

بھابی بولیں "ہاں اور نہیں تو کیا، دن کا کھانا بھی کھالو اور رات کا ساتھ لیتے جاؤ۔"

دادی میاں نے پکار کر والدہ سے کہا "ارے بہو، اس غریب کا دودھ تو بخش دو۔"

بھائی صاحب بولے "دیکھو ساتھ میں بستر لیتے جاؤ اور کچھ دام بھی رکھ لو۔ نہ جانے کیا ضرورت پڑ جائے۔"

زندگی گزارنے کی روش کے اس بکھراؤ کو احمد جمال پاشا اپنے مشاہدہ سے، عمیق تجربہ سے جداگانہ انداز میں پیش کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ وہ روز مرہ کے واقعات کو عام فہم اور سلیس زبان میں بیان کرتے تھے۔ انشائیہ ہو، پیروڈیاں ہوں، طنزیہ ہو، خاکے ہوں ہر جگہ تخلیقی آگہی سے انھوں نے کام لیا اور کامیاب رہے۔

میری ان سے آخری ملاقات سبزی باغ پٹنہ کے فٹ پاتھ پر ہوئی تھی۔ بہت بجھے بجھے سے نظر آرہے تھے۔ میں نے اپنا نام بتا کر ان سے ملاقات کی تو میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے، پھر بولے "اب ایسا بھی کیا تکلف۔"

پھر ہم آہستہ آہستہ رحمانیہ کی طرف بڑھنے لگے۔ میں نے پوچھا "ان دنوں آپ کہیں نظر نہیں آرہے ہیں۔ انشائیہ پر آپ کا ایک مضمون ادھر پاکستان کے کسی رسالے میں نظر آیا ہے اور دو ایک کتابوں میں لوگوں نے اس کا حوالہ بھی دیا ہے۔ ویسے کوئی نہ کوئی پروجیکٹ تو زیرِ قلم ہوگا ہی؟"

وہ مسکرائے "کچھ کتابیں تکمیل کی منزل طے کر رہی ہیں ویسے لکھنے کی طرف اب طبیعت مائل نہیں ہوتی۔ ہاں پڑھنے میں جی لگ رہا ہے۔ لیکن اب گوشہ نشین ہو گیا ہوں۔ خطوں کے جواب دینے کی بھی خواہش نہیں ہوتی ہے۔" زندگی کے سارے حوالے دراصل انسانوں ہی کے حوالے سے سامنے آتے ہیں! احمد جمال پاشا کی شخصیت کے پیکر کے نکات مختلف تھے، چلتے پھرتے تھے اور نفسیاتی پہلو لیے ہوتے تھے۔ متین، سنجیدہ پُر مزاح، فن کی نئی پہچان کے ساتھ اور زندگی کی نئی معنویت کی تلاش کا حوالہ بن کر! اپنی منزل ہر کوئی پا لیتا ہے لیکن یاد رکھنے کے لیے رنگ برنگے پھول چھوڑ جاتا ہے۔ احمد جمال پاشا کو آج یاد کرنے بیٹھا ہوں تو خوشبو کے مختلف گھیرے میں خود اپنی سرگوشیاں سن رہا ہوں!! ▲▼

مُشتاقیات

مرتبہ: حبیب ضیا (پاکستان)

آبِ گُم

آبِ گم کے سلسلے میں اردو مرکز لندن میں ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں جناب مشتاق احمد یوسفی نے اپنی نئی کتاب "آبِ گم" میں سے منتخب اقتباسات سنائے، ہم نے بی بی سی (لندن) کی اردو نشریات کے توسط سے اس پروگرام کو ریکارڈ کر کے آپ تک پہنچانے کا اہتمام کیا ہے۔ دیکھئے یوسفی صاحب کی زبان کہاں کہاں گل کھلا رہی ہے

اناؤنسر۔ مشتاق احمد یوسفی اردو مزاح نگاروں کے سرخیل مانے جاتے ہیں۔ ان کی ظرافت ایسی مثالی ظرافت ہے جو ان کے اعلیٰ ظرف کی بدولت نہ تمسخر سے میلی ہوتی ہے نہ تضحیک میں جھلکتی ہے۔ بلکہ بقول مجنوں گورکھپوری کے "ویسی ہی فطری ہے جیسے چینی گلاب کا سکون بخش رنگ اور اس کی فرحت آفریں مہک"۔ چراغ تلے، خاکم بدہن اور زرگزشت کے بعد اب "آبِ گم" ان کی نئی کتاب ہے اس کی اشاعت کے موقع پر گزشتہ جمعہ کو لندن کے اردو مرکز کے زیرِ اہتمام مشتاق احمد یوسفی کے ساتھ ایک شام منائی گئی۔ صدارت اس کی تھرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن کے سربراہ الطاف گوہر نے کی۔ یہ تقریب نہ تو اس کتاب کی رونمائی تھی اور نہ یہ تقریب اجراء تھی بلکہ ایک لحاظ سے یہ مشتاق احمد یوسفی کی الوداعی تقریب تھی جو کئی سال تک لندن میں قیام کے بعد اب پاکستان لوٹ رہے ہیں۔ آبِ گم کے بارے میں الطاف گوہر نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

الطاف گوہر۔۔ "میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ کتاب پڑھنے سے پہلے صرف اس کے حاشیے پڑھیں چونکہ "حاشیہ نگاری" میں یوسفی صاحب نے جو کمال حاصل کیا ہے وہ میرے خیال میں اس سے پہلے کسی اور کے مفسر کو نصیب نہیں ہوا ہے بڑی تحقیق کے ساتھ یہ حاشیہ لکھتے ہیں۔

" جس محبت سے یوسفی صاحب نے اپنے ملک کے حالات کا اور جو کچھ وہاں ہو رہا ہے جس قسم کے کردار ہیں وہاں پر اور جو ان کی زندگی ہے جس طرح اس کا ذکر کیا ہے وہ آپ ان سے سنیئے گا مجھے ان سے صرف یہ اختلاف ہے کہ انھوں نے ایک کردار ہے ان کا پٹھان جو آخریں کہانی کے

آخر میرا طبعی موت مرجاتا ہے میرے پٹھان بہت سے دوست ہیں میرا کوئی پٹھان دوست طبعی موت نہیں مرا (بے ساختہ قہقہے) وہ اس چیز کو بہت معیوب سمجھتا ہے۔

اناؤنسر "الطاف گوہر نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ مشتاق احمد یوسفی آبِ گم میں جنس کے معاملہ میں اپنی دوسری کتابوں سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی نے آبِ گم کے بعض اقتباسات سُنانے سے پہلے الطاف گوہر کی اس بات کا یوں جواب دیا۔

مشتاق احمد یوسفی "جہاں تک SEX والی بات کا تعلق ہے (قہقہے) تو اس سلسلے میں یہ عرض کردوں گا کہ ہم ابھی تک وکٹورین عہد سے آگے نہیں بڑھے جب میز کے پایوں پر بھی غلاف چڑھا دیا جاتا تھا۔ (قہقہے) کہ ننگے پائے دیکھنے کی اس زمانے کے لوگوں میں تاب نہیں تھی۔ بہت ہوا تو ٹامس ہارڈی تک آجاتے ہیں اس کے بعد مغرب میں جو کچھ لکھا گیا اس کا ہم نوٹس لینے کے قائل نہیں کوئی سا ناولسٹ اٹھا لیجئے جیمس جوئس ہو، ہنیٹی ہو، جس ہو گولڈ برگ ہو، گلسے ہاکس ہو آپ SEX کو اس میں کشش کا مرکزی اور کلیدی موضوع پائیں گے۔۔ میرے ہاں ایسا نہیں۔ دراصل ہمارے ہاں ایک کنفیوژن ہے جنس کو ہم SEX سے کنفیوز کر دیتے ہیں بائلوجی ہماری واقفیت کا یہ عالم ہے کہ ہم آج بھی صدقِ دل سے یہ سمجھتے ہیں کہ بچے محض بزرگوں کی دعاؤں سے پیدا ہوتے ہیں اور والدین کا اس میں کوئی دخل نہیں۔

(زوردار اور مسلسل قہقہے اور پھر مسلسل "تالیاں بھی) مختصراً یہ عرض کرتا چلوں کہ اس صدی کی سب سے بڑی دریافت جانداروں [illegible] کہ انسان کے جسم کی دریافت ہے کہ انسان نے روح کے مقابلے میں اپنے جسم [illegible] کے تقاضوں کا اعتراف پہلی مرتبہ جب موضوع چھڑ ہی گیا ہے الطاف صاحب تو آپ ہی کے نصف ہم نام مولانا الطاف حسین حالی رحمۃ اللہ علیہ مصنف مسدس مدوجزرِ اسلام کا ایک شعر سُن لیجئے پُرانی چال کے آدمی تھے۔

یارب طلب وصل ہو یا ہو طرب وصل
یارب طلب وصل ہو یا ہو طلب وصل
(مصرعہ کو دہراتے ہوئے طرب کی جگہ طلب کہہ کر فوراً تصحیح کرلی)
جس دن کہ یہ دونوں نہ ہوں وہ دن نہ دکھانا　(واہ واہ کا شور)

حضرات! جس خاکے تا کہانی یا کہانی نما خاکے سے میں اقتباسات آپ کو سنانے چلا ہوں خلاصہ میں بیان کئے دیتا ہوں تاکہ اقتباسات بے ربط نہ معلوم ہوں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ بشارت نے گھوڑے تانگے سے پیچھا چھڑانے کے بعد کار خریدنے کی ٹھانی اور ایک آنجہانی انگریز افسر کی نوجوان بیوہ سے اس کی یہ سیکنڈ ہینڈ کار خریدلی جو بالکل کھٹارہ بھی تھی۔ آئے دن کی مرمت سے تنگ آکر انہوں نے اس کا باڈی کٹوا کر لکڑی ڈھونے کی ویگن میں تبدیل کروایا۔ خلیفہ نے جو پہلے ان کا تانگہ چلا چکا تھا خود کو ڈرائیور مقرر کرلیا۔ ایک دن یہ کار راستے میں اوور لوڈنگ کے سبب فیل ہوگئی اور خلیفہ آدھا مال ایک مسجد کے زینے پر ڈال کر چلا گیا۔ واپس آیا تو مال غائب۔ بشارت نے چوری کی رپٹ تھانے میں لکھوانی چاہی مگر S.H.O. نے

بقیہ لکڑی بھی ضبط کرلی اس لیئے کہ اس کا زیرِ تعمیر مکان لکڑی کے بغیر عرصے سے نامکمل کھڑا تھا یہ لکڑی پشاور کے ایک آڑھتی حاجی اورنگ زیب خان کی معرفت کراچی آئی تھی ۔ اور دا غدار ہونے کے سبب بِک نہیں رہی تھی جب ایک سال تک رقم دبی رہی تو خان صاحب خود اس کی وصولی کے لیے کراچی تشریف لائے ۔ بقیہ قصہ جہاں تہاں سے سماعت فرمائیے ۔

"اب بغیر سواری کے گزر نہیں ہو سکتی تھی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کونسی سواری موزوں رہے گی ٹیکسی ابھی عام نہیں ہوتی تھی ۔ اس زمانے میں ٹیکسی صرف خاص خاص موقعوں پر کراچی میں استعمال ہوتی تھی مثلاً ہارٹ اٹیک کے مریضوں کو اسپتال لیجانے اغوا کرنے (قہقہے مسلسل اور زور دار) ڈاکہ ڈالنے (قہقہے) اور پولیس کو مفت لفٹ دینے کے لیے (ہلکے قہقہے) اُوپر جو ہم نے کہا کہ مریضوں کو ٹیکسی میں ڈال کر اسپتال لے جاتے تھے تو فقط یہ معلوم کرنے کے لیے کہ زندہ ہے یا مرگیا ! (قہقہے) کیوں کہ اس زمانے میں بھی جناح اور سول اسپتال میں صرف ان ہی مریضوں کو داخلہ ملتا تھا جو ابتدائی علاج کروا کے اپنی حالت اتنی غیر (نشریاتی انقطاع کے باعث تعطل رہا لہٰذا ہم اِتنا حصہ کتاب سے لکھ رہے ہیں) کرلیں کہ اِسی ڈاکٹر کے توسط سے اسپتال میں آخری منزل آسان کرنے کے لیے داخلہ مل سکے ۔ ہم اسپتال میں مرنے کے خلاف نہیں ۔ ویسے تو مرنے کے لیے کوئی بھی جگہ ناموزوں نہیں لیکن پرائیویٹ اسپتال اور کلینک میں مرنے کا سب سے بڑا (تعطل ختم) فائدہ یہ ہے کہ مرحوم کی جائداد جمع جتھا اور بینک بیلنس کے بٹوارے پر پسماندگان میں خون خرابہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ سب ڈاکٹروں کے حصے میں آجاتا ہے (قہقہے)

افسوس شاہجہاں کے عہد میں پرائیویٹ اسپتال نہ تھے وہ ان میں داخلہ لے لیتا تو قلعہ آگرہ میں اتنی طویل مدت تک اسیر رہنے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جینے سے صاف بچ جاتا اور اس کے چاروں بیٹے تخت نشینی کی جنگ میں ایک دوسرے کا سر قلم کرنے کے جتن میں سارے ہندوستان میں آنکھ مچولی کھیلتے نہ پھرتے ۔ کیوں کہ فساد کی جڑ یعنی سلطنت و خزانہ بلوں کی ادائگی میں نہایت پُرامن طریقہ سے جائز وارثوں یعنی ڈاکٹروں کو منتقل ہوجاتا (قہقہے) "بلکہ انتقال اقتدار کے لیے فرسودہ ایشیائی رسم یعنی بادشاہ کے انتقال کی ضرورت بھی نہ رہتی (قہقہے) اِس لیے کہ جیتے جی تو ہمارے یہاں ہر حکمران انتقال اقتدار کو اپنا ذاتی انتقال سمجھتا ہے"۔

(پہلے قہقہے پھر زوردار اور مسلسل تالیاں) ۔

ا ناؤنسر" مشتاق احمد یوسفی کے ہاں نستالجیہ" پرانے وطن یا ماضی کی یاد کا تھیم بڑا نمایاں ہے خود انہوں نے کراچی کے حوالے سے نستالجیہ کو سنگین حقیقت کے رنگوں کے آئینے میں یوں خوبصورتی سے پیش کیا ہے" ۔

مشتاق احمد یوسفی" میں تو جب بھی کراچی آتا ہوں حیران پریشان رہتا ہوں ۔ جس سے ملو جس سے پوچھو کراچی سے کچھ نہ کچھ گِلہ ضرور رکھتا ہے ۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا جو اپنے شہر پر فخر کرتا ہو ۔ اس کے دو سبب ہیں پہلا تو یہ کہ یہاں فخر کے لائق کوئی چیز نہیں دوسرا یہ کہ . . . .

دوسرا سبب بتانے کے لیے انہوں نے اپنی انگشت شہادت ابھی سوئے فلک بلند کی ہی تھی کہ مرزا عبدالودود بیگ" بیچ میں کود پڑے ۔ کہنے لگے "صاحب دوسرا سبب یہ کہ مہاجر، پنجابی، سندھی، بلوچ پٹھان . . .

... سب اپنے رب کا فضل تلاش کرنے کے لیے یہاں آکر آباد ہوئے۔ کڑی دھوپ پڑرہی تھی سب کے سروں پر کراچی نے مادرِ مہرباں کی طرح اپنی پھٹی پرانی چادر کا سائبان تان دیا۔ ان پر بھی جو بسر کرنے کے لیے فقط ٹھیا ٹھکانا مانگتے تھے پھر پسرتے چلے گئے لیکن سب شاکی سب آزردہ خاطر سب برہم۔ مہاجر ہی کو لیجیے۔ دلّی لکھنؤ بمبئی بارہ بنکی جونا گڑھ۔ حدیہ کہ اجاڑ جھنجھنوں (جے پور۔ راقم الحروف کی طرف اشارہ) کو یاد کرکے آہیں بھرتا ہے۔ اسے یہ احساس نہیں کہ جنھیں یاد کرکے وہ خود پر دائمی رقت طاری کیے رہتا ہے وہ چھوڑا ہوا شہر نہیں بلکہ اس کی روٹھی جوانی ہے جو لوٹ کر نہیں آ سکتی۔ ارے صاحب اصل رونا جغرافیہ کا نہیں جوانی اور بیتے سمے کا ہے جو آبِ حیاتِ امروز میں زہر گھول دیتا ہے۔ پنجابی جنھیں سب سے پہلے سرسیّد احمد خاں نے "زندہ دلانِ پنجاب" کا لقب دیا تھا جنّت میں پہنچ کر بھی "لہور لہور اے" پکاریں گے۔ "تیں رِیساں شہر لہور دیاں"۔ انھیں کراچی ذرا نہیں بھاتا وہ سندھ کے چٹخارے دار کیلے چیکو اور پپیتے میں ملتان کے آم اور منٹگمری کے مالٹے کا مزہ نہ پاکر سچ مچ اداس ہو جاتے ہیں۔ فرنٹیئر کا گل زمان خان چوکیدار شیر شاہ کالونی کے جونگڑہ (جونگڑہ (پشتو) جھونپڑی۔ جھگی) میں اپنے وطن کے کوہ و دشت و دریا مانگتا ہے۔

"کوئی نہیں جو اُٹھا لائے گھر میں صحرا کو"

وہ صبح دلّی کی نہاری کھاتا ہے۔ سہ پہر کو سیٹھ کی کوٹھی کے ایک اوجھل کونے میں اپنے مکئی کے بے موسم پودے کو بڑے لاڈ سے پانی دیتا ہے۔

پردے وطن پہ ہر چا غم دی ماپہ پردی وطن کرلی دی گلونہ

مطلب یہ کہ یوں تو پردیس میں ہر شخص غمگین ہوتا ہے مگر مجھے دیکھو کہ میں نے پرائی زمین میں اپنے وطن کے پھول کھلا دیئے ہیں۔ وہ دن بھر پشتو لہجے میں بمبئیا اردو بولنے کے بعد شام کو ٹرانزسسٹر پر پشتو گانوں سے دل پشوری کرتا ہے اور رات کو پشاور ریلوے اسٹیشن کو آنکھوں میں بھرکے سڑک کے کنارے جھگی میں سو جاتا ہے۔ سڑک پر رات بھر پٹاخے چھوڑتی موٹر سائیکل رکشائیں اور دھڑ دھڑاتے ٹرک گزرتے رہتے ہیں۔ پر اسے خواب میں ڈھول سرنا اور رباب اور گھڑے پر ٹپّے سنائی دیتے ہیں۔ اِدھر کوئٹہ اور زیارت سے آیا ہوا بلوچ کراچی کا نیلا سمندر دیکھتا ہے اور بلوچستان کے سنگلاخ پہاڑوں اور ان پر دُنبوں کو یاد کرکے آبدیدہ ہو جاتا ہے جن کے وہ بڑے خستہ سیخ کباب بنا سکتا تھا۔ اب رہا پرانا سندھی، تو وہ غریب اس زمانے کو یاد کرکے آہیں بھرتا ہے جب یہ چادروں حضرات کراچی تشریف نہیں لائے تھے۔

قلمی معاونین

براہِ کرم مسودہ خوش خط۔ صفحے کے ایک جانب لکھ کر ارسال فرمائیں

مسودات پر اپنا پتہ ضرور لکھیں!

ذہانت علی بیگ

(حیدرآباد)

امجد باغی

اُردو کا بابا آ مٹے

حیدرآباد کی نصف صدی کی سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی پر ایک بھرپور نظر دوڑائی جائے تو ہر صاحب فکر و صاحب نظر یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہے گا کہ ان شعبہ ہائے حیات میں اتنی تیز رفتار تبدیلیاں وجود میں آئیں کہ عدم اور وجود کا احساس بھی نہیں رہا۔ وقت تیزی سے بھاگ رہا ہے اور وقت کی اس تیز رفتار دوڑ میں ہم حیدرآبادی، کس حد تک ساتھ ہیں یہ کوئی نہیں جانتا۔ زمانے نے ترقی کی ہے اور کر رہا ہے، لیکن آج بھی میرے اس شہر دلپذیر میں کئی پیٹ ہیں جو شکم سیری کے معنی و مفہوم سے ناآشنا ہیں۔ کئی زندہ جسم ہیں جو صحت و تندرستی کے الفاظ سے مانوس نہیں ہیں لیکن انھیں فخر سے حیات آفریں کہا جاتا ہے۔ کئی گھر ہیں جہاں چراغ نہیں ہیں پھر بھی ہم اس شہر کو شہرِ نگاراں کہتے ہیں۔ رکشہ رانوں کی کثرت ہماری غربت کی منہ بولتی تصویر ہے جن کے لاغر و نحیف جسم، صرف سانس کے رشتہ کی وجہ سے "جسم انسانی" کہلائے جاتے ہیں، ورنہ جسم و جاں میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ پھر بھی ہماری زندہ دلی کے شہرہ چار دانگ عالم میں ہے۔ غربت و امارت اور دُکھ اور سکھ کے تضادات کے باوجود محنت و محبت کے میل سے ایک ایسا شہر وجود میں آیا جس کو ساری دنیا میں شہرت حاصل ہوگئی۔ دکھ سکھ کی اِن فضاؤں میں پیدا ہونے والے پیار و محبت، تہذیب و ثقافت، خلوص و ملنساری اور انکساری کے جذبوں سے سرشار حیدرآبادیوں نے اپنے پیٹ کی ناآسودگیوں اور مشکلات و مصائب کی آلودگیوں کے باوجود اس شہر کو شہر آبرو بنایا، اس کی جگمگاتی حسین شہری بستیوں میں اپنی زندگی کے تاریک گوشوں کو گم کردیا اور اپنے حیدرآبادی ہونے پر فخر و انبساط کا اظہار کیا۔ اِس شہر کو اپنے لوگوں پر فخر ہے اور لوگوں کو اپنے شہر پر ناز

اِس شہر میں چہروں پر مسکراہٹیں بکھیرے ہوئے لاتعداد چہرے ایسے ہیں، جنھوں نے اپنی مشکلات اور رنج و غم کو کئی پردوں میں چھپاکر دوسروں کا دُکھ درد دور کرنا ہی اپنا مقصدِ حیات بنالیا۔ اپنے پیٹ کی آگ کو چھپاکر دوسروں کی بھوک مٹائی اور دوسروں کے زخموں کو مندمل کرنے کے لیے اپنے زخموں کو ہرا رکھا۔ اِن چہروں میں ایک نمایاں چہرہ امجد باغی کا ہے۔ انتہائی بلند و بالا ذہنیت کے حامل اس پست قد انسان کا خلوص اِتنا دراز ہے کہ، دراز قامت اور بلند و بالا شخصیتوں کو شرم آجائے۔ قامت درازی کوئی معیار نہیں ہے

لہ قامتِ ذہنی، انسان کو جانچنے کی کسوٹی ہے اور اس کسوٹی پر امجد باغی کھرا اُترتا ہے۔ اس موقع پر
ن برصغیر کے طنز و مزاح کے عظیم شاعر دلاور فگار کا ایک شعر نذر کرنا چاہوں گا جو کئی دیوانوں پر بھاری ہے
ر نام نہاد ڈگریاں رکھنے والوں اور پڑھے لکھے جاہلوں کے لیے ہے۔ انھوں نے کہا ہے:

ناپ کر دیکھا تو قد میں کچھ درازی آ گئی
تول کر دیکھا تو ہر انسان آدھا رہ گیا

امجد باغی کئی دہائیوں سے دراز قامتوں کو اسی طرح شرمندہ کرتے آ رہے ہیں میں اس قابل تو نہیں ہوں کہ ان کے بارے میں لب کشائی کروں، کیونکہ میں تو ان لوگوں میں ہوں جو محاورۃً نہیں بلکہ عملاً ان کی گود میں کھیل چکے ہیں۔ اس کے باوجود امجد بھائی نے ہمیشہ ہمت افزائی کی، عزت دی اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

امجد بھائی کو لال رنگ سے بہت پیار ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ لال رنگ، خون کے قطرے ان کے جسم میں بہہ رہا ہے۔ لیکن لال رنگ سے انسیت کے باوجود امجد بھائی کو سڑکوں پر بہتا لال رنگ پسند نہیں ہے۔ وہ سُرخ پرچم تلے اپنی زندگی کے محور پر قائم تو ہیں مگر، کسی پرچم کو سرخ خون میں رنگا دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ ہمارے اس پیارے شہر کو جب کسی کی نظر لگ جاتی ہے تو امجد بھائی کی نظر بدل جاتی ہے۔ جب بھائی، بھائی کو آنکھیں دکھاتا ہے تو امجد بھائی کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ جب دلوں میں زنگ بھر جاتا ہے، تو امجد بھائی کا دل بھر آتا ہے۔ اور پھر وہ دلوں پر چڑھے زنگ کو دُور کرنے کی سعیِ پیہم میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

محنت کشوں کی حق تلفی کا مسئلہ ہو تو امجد بھائی پیش پیش، اردو کی حق تلفی ہو تو امجد بھائی پیش پیش بلکہ حق کی بھی حق تلفی ہو تو امجد بھائی پیش پیش۔ جلوس، ہڑتال کیمپوں میں امجد بھائی سرگرم جلوس و جلسے میں امجد بھائی متحرک اور مظاہروں میں امجد بھائی سب سے آگے۔ زندگی میں انھوں نے کبھی پیچھے رہنا پسند نہیں کیا۔ ہاں مگر جب صلہ و ستائش کا مرحلہ آتا ہے تو وہ خود پیچھے ہو کر دوسروں کو آگے بڑھا دیتے ہیں بس اس ایک معاملہ میں امجد بھائی، ہمیشہ پیچھے رہے یا پیچھے کر دیے گئے۔ امجد بھائی چونکہ اُردو کے سوشل ورکر ہیں اس لیے اُردو ہی کی طرح صرف دل پذیر اور دل خوش کن نعرے ان کے بارے میں سُنے جاتے رہے۔ اگر امجد بھائی خدانخواستہ اردو کے سوشل ورکر نہ ہوتے تو آج ان کے دامن میں کئی سمان، کئی ایوارڈ، کئی شالیں، کئی اعزازات اور کئی تمغے ہوتے۔ ہم اردو والوں میں یہی تو ایک "خوبی" ہے کہ نہ ہم آگے بڑھتے ہیں نہ کسی کو آگے بڑھاتے ہیں اور نہ کسی کو آگے بڑھتا دیکھ سکتے ہیں یہی ہمارا "امتیاز" اور خاص وصف ہے جس کی وجہ سے ہم ہمیشہ دوسروں سے "ممتاز" رہے۔ میں اپنے اس دعوے کی دلیل بھی پیش کر سکتا ہوں۔ ماضی کی تاریخ کو چھوڑیئے، حالیہ عرصہ میں جن عظیم سوشل ورکروں کے نام اُبھرے ہیں ان میں بابا آمٹے اور سندر لال جی بہوگنا جیسی عظیم شخصیتوں کے نام سرِفہرست ہیں۔ آپ یہ بتایئے کہ کیا اُردو میں کوئی بابا آمٹے اور سُندر لال بہوگنا کو ہم نے پیدا کیا؟ ایسے کئی نام اردو میں بھی ہیں لیکن

ہم انہیں پیدا ہونے سے پہلے ہی گلا گھونٹ کر ختم کر دیتے ہیں۔ میں قومی سطح پر اُردو ادیبوں اور شاعروں کی مافیا ٹولی یا اپنے ہی شہر کی ایک نئی مافیا ٹولی کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ اسی شہر نگاراں کی بے حسی کے بارے میں عرض کر رہا ہوں۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔

امجد بھائی کو جب سے دیکھا ان کے پاؤں میں چکر دیکھا، ان کو اپنے لیے نہیں، ہمیشہ دوسروں کے لیے سرگرداں بلکہ سر پھوڑتے دیکھا۔ کہتے ہیں کہ انسان چونکہ ہوا، مٹی، پانی اور آگ کا مرکب ہے اس لیے اس میں یہ چاروں خصوصیات جمع ہیں اور یہ تینوں خصوصیتیں تضاد رکھتی ہیں۔ آگ کی یہ خاصیت ہے کہ وہ علو کا مزاج رکھتی ہے یعنی ہمیشہ بلندی کی طرف پرواز کرتی ہے۔ مٹی ہمیشہ پستی کی طرف مائل رہتی ہے اور پانی میں یہ خاصیت پائی جاتی ہے کہ پانی جس برتن میں جائے اسی میں اسی کے انداز میں اسی کے مزاج میں سما جائے، ڈھل جائے۔ ہوا ہر جگہ موجود۔ بچوں میں، نوجوانوں میں، بوڑھوں میں، ہم عمروں میں امجد بھائی ہی امجد بھائی ہیں۔

میری اس بات اور مشاہدہ کی تصدیق آپ بھی کریں گے کہ امجد بھائی کی جبینِ نیاز پر کبھی شکن نہیں آئی۔ یہ صفت تو ولیوں اور صوفیا کی ہے۔ امجد بھائی نے کبھی کسی کے سامنے اپنے دامن کو نہیں کھولا بلکہ زندگی بھر دوسروں کے دامن کو سیتے رہے۔ انڈین نیوز اور عوامی نیوز ایجنسی کے تنگ و تاریک کمرے میں جہاں خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر خبر رسانی کا کام کیا جاتا تھا۔ امجد بھائی اور جہاندار افسر دنیا جہاں کے مسائل کو حل کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ مربی و مشفق اور عظیم صحافی محترم امن علی مرزا، یہاں کی خلوتوں اور جلوتوں کے راہ نما تھے۔ اور آج بھی ایرانی ہوٹل کی چائے اور فاتح بسکٹ کا وہ ذائقہ زبان پر ہے۔ جو امجد بھائی اور جہاندار افسر ہم کو بطور لنچ پیش کیا کرتے تھے (وہ بلا مبالغہ انمول) اشیاء خورد و نوش کی قسم کھائی جا سکتی ہے کہ آج کرشنا، دیرانے، ہوٹل، بہارہ اور اوڑان کے ڈنر و لنچ میں وہ بات نہیں جو امجد بھائی اور افسر بھائی کی چائے و فاتح بسکٹ میں تھی۔ بعض افراد ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا دوسرے افراد کے بغیر تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ امجد بھائی کا تصوّر آتے ہی، جہاندار افسر، کامریڈ اکبر صدیقی مرحوم، مولوی کامریڈ فیاض الدین صابری اور کامریڈ جلیل بھائی مرحوم کی صورتیں بھی ذہن کے پردہ پر ابھر آتی ہیں۔ خوشی اور غم کے موقع پر یہ سب سکھ دکھ کے ساتھی ہیں اور یقیناً یہ ایک نعمت ہے ورنہ احمد فراز نے تو یہ کہا ہے کہ

وہ جو راستے تھے وفا کے تھے یہ جو منزلیں ہیں سزا کی ہیں
میرا ہمسفر کوئی اور تھا میرا ہم نشیں کوئی اور ہے

لیکن امجد بھائی کے "ہمسفر کوئی اور" اور "ہم نشیں کوئی اور" نہیں ہیں بلکہ سب ایک ہی ہیں "ہم سفر و ہم نشیں"۔

میں دراصل چاہتا تھا کہ امجد بھائی کی حیات بلکہ شخصیت اور خدمات یا کارناموں پر ایم فل کے لیے مقالہ لکھوں لیکن مجھے بتایا گیا کہ اس کے لیے ایم اے کرنا ضروری ہوتا ہے اور ایم اے بننے کے لیے گریجویشن کی تکمیل لازمی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے لیے بھی میٹرک کی شرط بلکہ لزوم ہے۔ چنانچہ میں نے ارادہ ترک کر دیا۔ میں پہلے تو رو دیا پھر ہنس دیا۔ پہلے کیوں رویا بعد میں کیوں ہنسا؟ اس عقدہ کا حل راوی یہ بیان کرتا ہے کہ رویا اس لیے تھا کہ کاش میٹرک کر لیا ہوتا لیکن میٹرک کے لیے مڈل اسکول بھی جانا پڑتا ہے

اس لیے رو دیا۔ پھر ہنسا اس لیے کہ ایم اے بننے سے تو بہتر ہے کہ آدمی "ایم ایل اے" بن جائے۔ یہ بہت آسان ہے اس میں ڈگری کی کوئی شرط نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ الیکشن جیتنے کے لیے بہم یعنی ہر پانہ سے تربیت حاصل کرنی ہوتی ہے کیوں کہ آج کل ہمارے ملک کی انتخابی ڈگری کے لیے وہاں پڑھائی اور "فزی کو چنگ" ہو رہی ہے۔ ایم ایل اے بننے کے لیے کسی اوپن یا کلوز یونیورسٹی کو جانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ آج کل یونیورسٹیوں کو بھی ایم ایل اے کے پاس چل کر آنا پڑتا ہے۔ امجد بھائی بھی کسی اوپن یا کلوز یونیورسٹی کے محتاج یا مرہونِ منت نہیں ہیں بلکہ وہ خود چلتی پھرتی یونیورسٹی ہیں، اور ان کی ذات والا صفات بجائے خود ایک مکمل نصاب ہے۔ جس میں سیاسیات، معاشیات، فلسفہ، تاریخ و جغرافیہ، سبھی شامل ہے علاوہ "مرحوم" اخلاقیات بھی ان کے نصاب میں داخل ہے، جس کا جنازہ آج ہم چالیس سال سے اپنے کندھوں پر اٹھائے پھر رہے ہیں۔ اس اخلاقیات کی بے گور و کفن لاش کو ابھی دفن نہیں کیا گیا کیونکہ وقفہ وقفہ سے کسی نہ کسی ہوشمند کو اس کی یاد آجاتی ہے تو وہ کہہ جاتا ہے کہ اس لاش کو زندہ کرو اور سے کوئی عیسیٰ مسیح اُٹھے اور اس میں روح ڈال دے۔ بہرحال اخلاقیات و اخلاص کی بیماری امجد بھائی میں موجود ہے بلکہ بہت زیادہ موجود ہے۔ اس لیے تو تشہیر کے میدان میں قدم رکھتے ہی نقصان اُٹھا رہے ہیں۔ کسی نے کہہ دیا "امجد بھائی ابھی کاروبار ٹھیک نہیں آپ بعد میں آکر بل لیجائیے، تو امجد بھائی اپنے مرض اخلاقیات کے زیر اثر اس سے کہتے ہیں "کوئی بات نہیں، کیا کچھ اور اشتہار دینا ہے؟" امجد بھائی میں اخلاق کے جراثیم اتنے زیادہ سرایت کر گئے ہیں کہ وہ اُس دکان کے سامنے سے نہیں گزرتے جس کا بل انھیں ں بلا، تاکہ دکاندار کو شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ امجد بھائی نے نیوز ایجنسی بھی چلائی، ہفتہ وار بھی نکالا اور ی شان سے نکالا۔ اس وقت ہفتہ واروں کی "آبادی" اتنی نہیں تھی اس کے باوجود امجد بھائی نے ں اپنی زبان سے خود کو جرنلسٹ نہیں کہا۔ امجد بھائی میں ایک اور خرابی ہے اور یہ کہ وہ کسی کو بُرا بھلا ں کہتے۔ اپنے کٹر مخالف کے بارے میں بھی وہ ایک لفظ اس کے خلاف نہیں نکالتے! اسی خرابی نے ان کو ی نقاد یا دانشور بننے نہیں دیا۔ میں نے امجد بھائی کو بابا آمٹے اِس لیے کہا ہے کہ وہ بابا آمٹے کی طرح گلی گھومتے ہیں، نگر نگر پھر کر لوگوں کے دُکھ درد بانٹتے ہیں۔ خوشی و غم کے ساجھے دار ہیں لیکن اردو بابا آمٹے اس لیے کہا کہ انھیں کوئی سنمان پیش نہیں کیا گیا۔ لفظ "اردو" آجانے سے آدمی ہر قسم کی مراعات وق، اعزازات و اسناد سے بے نیاز یا محروم ہو جاتا ہے یا کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح امجد بھائی بھی بے نیاز ـــــ امجد بھائی کی عمر کے بارے میں شاید کسی کو معلوم نہیں ہے۔ اس میں اختلاف رائے کی کافی گنجائش۔ وہ تو خیر میرے بزرگ ہیں، البتہ جب موجودہ عشرت محل میں جو کسی زمانہ میں مغلپورہ مڈل اسکول کہلاتا امجد بھائی کی شادی ہوئی تو، میں بھی اپنے والدین کے ساتھ گیا تھا اور میری عمر کا اندازہ اس ن کیا ہوگا؟ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ہم دولہا میاں کے پاس کھڑے تھے تو اُن کے بے تکلف ں سنے جوان کو گھیرے ہوئے تھے یہ کہا تھا کہ "بابا بچوں کا یہاں کام نہیں ہے، زنانہ میں جاؤ" جب ہم زنانہ ہن کے کمرہ میں گئے تو وہاں خواتین نے کہا کہ یہاں مرد بچوں کا کام نہیں ہے مردانہ میں جاؤ۔ بلکہ اسی

تت کا تو ایک واقعہ ایسا ذہن نشین ہوگیا کہ آج بھی بھلایا نہیں جاتا۔ دلہن والوں کے کوئی بزرگ امجد بھائی د مبارک باد دینے آئے تھے لیکن فوری واپس ہوگئے تھے کہ" ارے معاف کرنا یہاں شائد عقیقہ کی گلپوشی ورہی ہے" افسر بھائی سے جب عمر کے سلسلے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے بھی لاعلمی بلکہ بے خبری کا لہار کیا، البتہ انھوں نے اتنا کہا کہ" امجد بھائی بھی میرے بزرگ ہیں اور والد صاحب کہتے تھے کہ مجد بھائی ان کے بچپن میں آم خرید نے پنج محلہ آیا کرتے تھے۔ مولوی فیاض الدین صابری شائد کسی سے کہہ رہے تھے کہ وہ امجد بھائی کو اس زمانہ سے اسی حالت میں دیکھ رہے ہیں جبکہ حیدرآباد ب ابھی موٹر نہیں آئی تھی۔ بہرحال امجد بھائی جیسی شخصیت اور ان کے جذبۂ ایثار و خلوص کو دیکھ ، دُعا بے ساختہ زبان پر آجاتی ہے کہ خُدا انھیں حیات خضر عطا کرے کہ یہ صدیوں تک لوگوں ی رہنمائی کرتے رہیں، تاریک زندگیوں میں شمعیں جلاتے رہیں اور ہم اُن کی شخصیت کے سائے سائے چلتے رہیں۔ آمین۔

غزلیں

آدھی غزل (روحِ غالب سے معذرت کے ساتھ)

چکرؔ نظام آبادی

شیخ مجنوں ہوا دیوانہ ہوا
"لے کے دل، دل ستاں روانہ ہوا"

آج کا ہے اپائنٹمنٹ اُن کا
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

بیویاں دو ہی ہیں مری پھر بھی
"حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"

بے حسی دیکھئے تو سالے کی
"گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا"

تھی کمائی سعودی کی پھر بھی
میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

اپنا چکر چلائیے چکرؔ
"آج غالب غزل سرا نہ ہوا"

رفیع احمد
(مالیگاؤں)

دِیا نہ جائے گا اُلفت کا امتحاں ہم سے
کہا ہے اُس نے پکڑنے کو مُرغیاں ہم سے

اضافہ گرچہ ہے تنخواہ میں ہُوا لیکن
گرانی آج بھی کرتی ہے شوخیاں ہم سے

نہ مل سکی ہمیں سروس کسی بھی دفتر میں
نظر چُراتی ہیں اب ساری ڈوکریاں ہم سے

گھڑی میں اپنے مقدر کی جب بجے بارہ
میاؤں کرنے لگیں اپنی بلّیاں ہم سے

سبق پڑھا ہی نہیں ہم نے جی حضوری کا
اسی لیے ہیں خفا ساری کرسیاں ہم سے

ہمارے آگے تو شیطاں بھی پانی بھرتا ہے
رفیعؔ کہتی ہیں پیپر کی سُرخیاں ہم سے

تمیز احمد پرواز
مدھول (نظام آباد)

رُخ سے اٹھا نقاب غزل کہہ رہا ہوں میں
نازل نہ کر عتاب غزل کہہ رہا ہوں میں

غالب غزل سرا تھے صدارت میں میری کل
دیکھا جو ایسا خواب غزل کہہ رہا ہوں میں

ہمت کی داد دیجیے کہ شادی شدہ ہوں میں
وہ مستقل عذاب، غزل کہہ رہا ہوں میں

اُس زُلف کی گھٹاؤں میں بجلی چمک گئی
جھٹ سے لگا خضاب غزل کہہ رہا ہوں میں

پروازؔ ڈرتے ڈرتے جو بھیجا تھا ایک خط
مثبت ملا جواب غزل کہہ رہا ہوں میں

مسدھو کوکیچے

مترجم: محمد اسد اللہ، ورود

آنا کتوں کا ہمارے گاؤں میں!

مراٹھی سے ترجمہ

میں گذشتہ جنم میں یقیناً کتا رہا ہوگا۔ بعضوں کو تو اس زندگی میں بھی نظر آتا ہوں۔ گزشتہ جنم کے متعلق میرا یہ کہنا "بو" کے حوالے سے ہے۔ یہ شے جہاں کہیں ہو مجھے فوراً محسوس ہو جاتی ہے۔ کہیں آگ لگ جائے تو میں ابتدائی مہک پاکر بھانپ لیتا ہوں۔ جب کہ گاؤں والوں کو اس وقت اطلاع ہوتی ہے جب آگ بھڑکنے لگتی ہے۔ مجھے ہر شئے کی ہلکی ہلکی خوشبو تک محسوس ہو جاتی ہے۔ یہ خوبی میرے حق میں رحمت نہیں زحمت ہے کیونکہ آج کل قوتِ شامہ کی موت عام ہے اسی لیے لوگوں کو کھلے گٹر پریشان نہیں کرتے۔ روز مرہ کی اس بو میری ناک میں دم کر دیتی ہے۔ میونسپلٹی کے کوڑے دان کو ناک نہیں ہوتی۔ اسی لیے کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی کا فون پہنچے بغیر وہ آگ تک پہنچا ہو۔

میرے پچھلے جنم کی اصلیت سے ہمارے ضلع کا پولیس محکمہ بے خبر ہے اسی لیے ایک گڑبڑ ہوگئی۔ پولیس کے ہاں کتوں کا ایک گروپ آیا۔ پولیس کے پہنچنے تک بو پراگندہ ہو جاتی ہے اس لیے کتوں کو اب مستقل طور پر پال رکھا جائے گا۔ ڈی ایس پی سے زیادہ ان کتوں کی آؤ بھگت ہوتی اس موقع پر منائی گئی ایک تقریب کا دعوت نامہ مجھے بھی ملا۔ اسی کی دستیابی کی خبر دینے کے لیے میں ڈی ایس پی صاحب کے آفس میں حاضر ہوا اور اپنے گزشتہ جنم کے متعلق انھیں مفصل معلومات بہم پہنچائیں۔ انھوں نے اپنے چہرے کو یقین اور شک کے اظہار سے مکمل طور پر دامن کش رکھتے ہوئے گھنٹی بجاکر چپراسی کے ذریعے کتوں کے نگراں مسٹر دائیما کو بلوایا۔ اس اطلاع کے بعد کہ میں بھی کبھی کتا تھا۔ وہ مسکرا کر کہنے لگے VERY GLAD TO SEE YOU گزشتہ سولہ سالوں میں کتوں کی صحبت اس قدر راس ہو چکی تھی کہ کسی کتے ہی سے مل کر انھیں خوشی ہو سکتی تھی۔

گفتگو کی سہولت کے لیے میں نے م۔ی۔د صاحب سے کہا "آپ نے ابھی چپراسی کو جو اشارہ کیا، غالباً چائے کے لیے تھا، ابھی آدھا منٹ پہلے، مجھے چائے کی مہک محسوس ہو چکی ہے، آپ نے پہلے

چائے ہی سے نمٹ لیں بقیہ باتیں ہوتی رہیں گی۔" چنانچہ اس ناک کے اعزاز میں نہ منگوائی ہوئی چائے ڈی ایس پی صاحب کو پلانی پڑی مگر انہوں نے یہ کہہ کر طنز کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا کہ "چائے تو میں منگوانے ہی والا تھا۔"

"لیکن جناب بات دراصل یہ ہے کہ میرے لیے منگوائی گئی چائے کی مہک پہلے ہی محسوس ہو جاتی ہے۔ یوں تو چائے کی مہک عام آدمی محسوس کر سکتا ہے اور نہیں بھی کر سکتا۔ مگر پولس عوام کو چائے پیش کرے گی بھلا اس پر کس کی ناک کو یقین آئے گا؟"

ڈی ایس پی صاحب اس بات پر ہنس گئے اس کی مہک مجھے آچکی تھی ورنہ پولس کو بدنام کرنے والا لطیفہ میں نے سنایا ہی نہ ہوتا۔

باتوں باتوں میں مسٹر دائیما نے انکشاف کیا کہ "جہاز، بم اور دیگر فنون کی طرح کتوں کے متعلق علوم بھی یورپ والوں نے ہماری پرانی اور مذہبی کتابوں ہی سے اخذ کیے ہیں۔" میں نے سوچا دیگر چوریوں کی طرح کیوں نہ ہم مغربی اقوام کی چوریوں کا سراغ بھی کتوں ہی کے ذریعہ لگائیں۔ یہ جاننے کے لیے کہ ہمارے ہاں مارکسزم چین سے آیا ہے یا روس سے ہر دو ممالک میں کتے چھوڑے جانے چاہئیں۔

بات سے بات نکل ہی گئی ہے تو یہ بھی بتا دوں کہ ایک مرتبہ میں نے ایک بہت ہی شاندار قسم کی نظم لکھی، میرا ایک دوست اسے دیکھتے ہی غصے سے اکھڑ گیا کہنے لگا "تم نے یہ نظم چرائی ہے"۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ بالآخر پولس کے ذریعے تفتیش کرنا طے ہوا۔ میری نظمیں سنگھا کر پولس نے کتا چھوڑ دیا۔ پہلے تو کتا میرے دوست کے گھر جا کر الماریاں سونگھنے لگا لیکن وہاں زیادہ دیر نہ رکا اور بے تحاشا بھاگنے لگا اور آخر سٹی لائبریری میں گھس گیا۔ اور الماریوں کے قریب نظموں کے خانے میں "ابھن تکا رام کی گاتھا" کے پاس جا کر زور زور سے بھونکنے لگا۔ اس کے بعد میرا دوست ہر کسی سے کہتا پھرتا ہے۔ "میری نظمیں تکا رام نے چرائی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل سٹی لائبریری میں کتوں کا داخلہ بند ہے ورنہ اس شہر کے کئی شاعروں کی چوری پکڑی جاتی۔ میں نے ایک مرتبہ ایک کتے کو مطبوعہ کاغذ سنگھایا بازار سے مٹھائی باندھ کر لائے گئے اس کاغذ پر سماج واد سے متعلق ایک مضمون تھا۔ ان خیالات کی اصل کا پتہ لگانے کی غرض سے میں نے کتے کا تعاقب کیا۔ کتا بھولو حلوائی کی دوکان کے گرد چکر لگانے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں بھولو حلوائی کو آڑے ہاتھوں لیتا کتا عظیم حقائق کا عرفان ہونے کا [illegible] کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ میں تجسس کا مارا اس کے پیچھے ہو لیا۔ اب کی بار کتا قاسم کی دوکان پہنچا قاسم ہمارا پرمننٹ قصائی ہے۔ کتا وہاں تازہ ہڈیوں کی مزاج پرسی میں مشغول ہو گیا اور سماج واد پر مضمون کہاں سے آیا۔ یہ سوال ایک معمہ بنا رہا۔

مجھے مختلف قسم کی مہک اکثر یکساں محسوس ہوتی ہے، البتہ پولس کے کتے اس تضاد سے بخوبی واقف ہیں اسی لیے وہ حقیقی چور پکڑ لاتے ہیں ایک بار میں نے ایک جگہ کی بو سونگھی وہاں ایک چوری ہوئی ہوئی تھی۔ نتھو تتھو کی نوٹوں کی چوری، نوٹوں کا رنگ و روپ الگ الگ نہیں ہوتا لیکن ان کی بو مختلف قسم

کی ہوتی ہے۔ میں الماری کی بو سونگھ کر راستے پر لگ گیا اور گشت کرتے ہوئے پولیس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ پولیس والے نے میرے متعلق پوچھا۔ میں نے اسے بتایا کر پونہ سے کتوں کا گروپ آنے میں ابھی دیر ہے لہٰذا وقتی طور پر اس کام کے لیے میرا تقرر کیا گیا ہے۔ پولیس والا بولا ــــ "لگتا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوتی ہے چوری کے وقت میں وہاں نہیں تھا، میں تو راجہ پیٹھ میں سو رہا تھا دیشا منڈ صاحب سے مجھے پتہ چلا"۔ میں نے کہا ــــ "یہ تم مجھے کہہ رہے ہو کیا پیچھا کرتے ہوئے کتے کو بھی تم اسی طرح سمجھاتے ہو!"

"ارے بھئی! مگر کتے بھی کبھی بھی اُلٹے سیدھے کو پکڑ نہیں لیتے کچھ بھی ہو آخر کو وہ کتے ہیں"۔ پولیس والے کو اس کے سینیئر نے ڈانٹا ــــ "ارے! کیوں بحث کرتا ہے آخر یہ اپنے تھانیدار صاحب کے ۔ ۔ ۔ ۔" اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ نہ جانے میرے متعلق وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ تھانیدار کا کتا یا دوست؟ چنانچہ وہ اپنے سینیئر کے کہنے پر مجھے ہوٹل لے گیا اور چائے پلوائی البتہ بل ادا کرتے وقت اس کے چہرے پر کچھ اس قسم کے تاثرات تھے گویا کہہ رہا ہو "کتے نے مجھ سے چائے تو نہ طلب کی ہوتی۔ THIS IS A DIFFERENCE BETWEEN A DOG AND MAN

چائے پیتے ہوئے وہ مجھے سمجھا رہا تھا کہ "اپن چوری جیسا گندہ کام کرتے ہی نہیں"۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک چوری کی بو دوسری چوری سے میل نہ کھاتی ہوگی کیا واقعی چوریوں کی انفرادی بو ہوتی ہے یا محض بکواس ہے اگر واقعی ایسا ہے تو کتوں کو بجائے چوروں کے چوریوں کی بو سنگھائی جانی چاہیئے۔

چوریاں بو سے عاری ہوں تب بھی چوروں کی بو ہوتی ہے یہ بات آخر کہاں تک صحیح ہے اس صورت میں کتے، چوروں ہی کی طرح کام چور مڈل کلاس ملازمین کو بھی ڈھونڈ نکالتے ایسی طرح جھوٹے وعدے کر کے ووٹر کو دھوکہ دینے والے لیڈر، مردوں کو دھوکہ دینے والی بیویاں یا بیویوں کو چکمہ دے کر محبوباؤں کی طرف دوڑتے شوہر ــــ کتے ان تمام کو ڈھونڈ نکالتے۔ البتہ اس میں ایک مشکل ضرور ہے مثلاً شوہر نامدار کے کاندھے پر دستیاب ہونے والا بال اگر کوئی شکی عورت کسی کتے کو سونگھا دے تو بجائے اس کے کہ کتا کسی عورت کے دراز گیسوؤں کا تعاقب کرے ممکن ہے وہ ایک آدھ وگ "WIG" کی دوکان کی طرف پولیس کی رہنمائی کرے۔

مسٹر دلیپ کا خیال ہے کہ ہمیں بیرونی ملک کے کتوں کی بجائے دیسی کتے سدھانا چاہیئے۔ میں ان سے متفق ہوں کیوں کہ ہمارے ملک میں کتوں کی کمی نہیں، دوسرے یہ کہ یہ کتے ہمارے اپنے ہی ہیں۔ انھیں اپنے پرائے کا احساس تو ہے۔ وہ ہم سے غداری نہیں کریں گے خاص طور پر ــــ مزدوروں کا استحصال یعنی چوری، کام نہ کر کے تنخواہ لینا یعنی ڈکیتی وغیرہ وغیرہ متعلق سمجھانے والے غیر ملکی کتوں کی ہمیں بالکل ضرورت نہیں ـ!!


خود مختاری سے
آزادی کی طرف
43 برس پہلے ہم نے غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزادی حاصل کی
ہماری جمہوریت کی جڑیں مضبوط نہیں ہو جاتیں۔
آزادی کی طرف ہمارے قدم بڑھتے ہی رہیں گے

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

جلد ۲۳
شمارہ ۱۰

اکتوبر ۱۹۹۰ء

کتابت: محمد غالب۔ محمود سلیم

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد۔۲

فی پرچہ: ۵ روپے
زرِ سالانہ: ۵۵ روپے
لائبریریوں سے: ۶۰ روپے
بیرونی ممالک سے: ۱۸۰ روپے

ترسیلِ زر کا پتہ:
شگوفہ، ۱۳ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
فون آفس: 557716 مکان: 52106

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

پھُورن (منظومات)

مجتبیٰ حسین

مُنیر احمد شیخ کی یادیں ــــــ

پاکستان کے نامور ادیب مُنیر احمد شیخ کا ۲۸ مئی کو کراچی میں انتقال ہوگیا ــــ ۵۸ سالہ مُنیر احمد شیخ کا پاکستان فارن سروس سے تعلق تھا اور پاکستانی سفارت خانہ دہلی کے پریس کونسلر کی حیثیت سے ہندوستان میں انھیں بڑی شہرت حاصل ہوئی تھی۔ چند سال قبل زندہ دلانِ حیدرآباد کی سالانہ کانفرنس میں بھی شرکت کرچکے تھے۔ (ادارہ)

ٹھیک دو سال پہلے یہی جون کا مہینہ تھا۔ اِسلام آباد کے ہوائی اڈّے پر مُنیر احمد شیخ میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی مُنیر کے چہرے پر مسرّت کی ایک عجیب سی لہر دوڑ گئی۔ میں پاس آیا تو وہ مجھ سے بے ساختہ بغل گیر ہوگئے۔ ایک منٹ، دو منٹ، تین منٹ۔ جب چار منٹ بیت گئے اور اُن کی بغل گیری ختم نہیں ہوئی تو میں نے کہا ــــ "مُنیر صاحب! یہ بغل گیری ہو رہی ہے یا بغل خوری!" مُنیر نے آدھی بغل گیری ختم کی اور میرے دونوں بازوؤں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر میرے سامنے کھڑے ہوگئے اور مجھے یُوں دیکھنے لگے جیسے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ بولے "یار! کئی برس بعد ملے ہو دوست، اتنے لمبے عرصہ بعد ملیں تو سوچو کتنا عجیب سا لگتا ہے۔ پھر بڑی دیر تک میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں تھامے رکھا۔ دہلی کے احباب کا حال پوچھنے لگے۔ مُنیر کی یہ خاص عادت تھی کہ جب کوئی عزیز دوست ملتا تو وہ اس سے لپٹ جاتے۔ گلے میں باہیں ڈالے رہتے۔ ہاتھوں کو تھامے رکھتے۔ خلوص اور محبت کے اظہار کے لیے وہ انسانی لمس کو بے حد ضروری سمجھتے تھے۔ انسانوں کے ساتھ ہی نہیں عمارتوں اور دیگر اشیاء کے ساتھ بھی ان کا یہی رویّہ تھا۔ آٹھ نو برس پہلے وہ حیدرآباد آئے تھے اور میں نے انھیں دُور سے چارمینار دکھلانے کی کوشش کی تو وہ چارمینار کے اِس رسمی دیدار کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ موٹر سے اُتر کر چارمینار کے پاس گئے۔ اُس کے چاروں میناروں کو اپنے ہاتھوں سے یُوں چھونے لگے جیسے اس عمارت کا حصّہ بننے کی کوشش کر رہے ہوں۔

میں نے پوچھا "مُنیر صاحب یہ کیا ہو رہا ہے؟"

بولے "یار! کچھ نہیں چارمینار سے 'جپی' ڈال رہا ہوں۔"

[redacted]

بعد میں اُنھوں نے گولکنڈہ کے قلعہ، مکہ مسجد اور عثمانیہ یونیورسٹی سے بھی جھپی ڈالی۔

میں دو دن اِسلام آباد میں رہا۔ مُنیر نے اسلام آباد کے چپّے چپّے کی سَیر کرائی۔ مگر مَیں نے محسوس کیا کہ جب میں اسلام آباد کی سَیر کر رہا تھا تو مُنیر میرے ساتھ موجود ہونے کے باوجود دہلی کی سَیر کر رہے تھے کیوں کہ وہ ہر لمحہ دہلی کے احباب کا حال مجھ سے پوچھتے جاتے تھے۔ مَیں کراچی کی ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے پاکستان گیا تھا۔ مُنیر کو اخباروں سے جب میرے پاکستان آنے کی اطلاع ملی تو اُنھوں نے کسی نہ کسی طرح اُس جگہ کا فون نمبر معلوم کیا جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ پھر اسلام آباد سے ہر روز مجھے فون کرنے لگے کہ اگر تم کراچی سے ہندوستان واپس چلے گئے تو یہ اچھا نہیں ہوگا۔ تمہیں اسلام آباد آنا ہوگا اور مجھے بالآخر اسلام آباد جانا پڑا۔ مُنیر کی محبّت میں ضد کا عنصر بھی شامل ہوتا تھا اگرچہ کچھ عرصہ پہلے ہی مُنیر کی بائی پاس سرجری ہوئی تھی لیکن وہ ہر طرح چاق وچوبند دکھائی دیتے تھے۔ شام کو اپنے گھر پر ایک ادبی محفل بھی رکھی جس میں اسلام آباد کے اُن سارے ادیبوں اور شاعروں کو مدعو کیا جنھیں دیکھنے کی تمنّا عرصہ سے دل میں پل رہی تھی۔ محفل کے بعد میں اور مُنیر رات دیر گئے تک مشترکہ دوستوں کے بارے میں گپ لڑاتے رہے ان کے گھر ڈیکوریشن کی ایسی کئی چیزیں سجی ہوئی تھیں جن کا تعلق ہندوستان سے تھا۔ رات کو میرے سونے کا بندوبست پہلی منزل کے ایک کمرہ میں کیا گیا۔ جب میں نے بتّی بجھائی تو میرے کمرے کی ایک کھڑکی سے اُن کے ڈرائنگ روم کا وہ حصّہ نظر آگیا جو دن میں مجھے نظر نہیں آیا تھا۔ ڈرائنگ رُوم میں ہلکی ہلکی سی روشنی جل رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک گھوڑے کی پینٹنگ دیوار پر لگی ہوئی ہے۔ مَیں بڑے غور سے اس گھوڑے کو دیکھتا رہا۔ یُوں لگا جیسے اس گھوڑے کو میں نے پہلے کہیں دیکھا ہے — اس گھوڑے کی وجہ سے مجھے بڑی دیر تک نیند نہیں آئی۔ صبح صبح مُنیر نے مجھے نیند سے جگایا۔ پوچھا "رات آرام سے نیند آئی یا نہیں؟" میں نے کہا "مُنیر صاحب! یہ جو سامنے گھوڑے کی تصویر لگی ہوئی ہے اس کی وجہ سے نیند نہیں آئی۔ ایسا لگتا ہے اس گھوڑے سے پہلے کہیں ملاقات ہو چکی ہے۔ سوچتا رہا کہ اس سے کہاں ملاقات ہوئی ہے۔ کہیں یہ گھوڑا ہندوستانی تو نہیں ہے؟"

مُنیر نے ہنس کر کہا "میاں! یہ گھوڑا نہ صرف ہندوستانی ہے بلکہ حیدرآبادی بھی ہے۔"

تب مجھے احساس ہوا کہ گھوڑے کی یہ پینٹنگ میرے حیدرآبادی آرٹسٹ دوست عزیز کی بنائی ہوئی ہے۔

میں نے کہا "مجھے عزیز کے بنائے گھوڑے بہت پسند ہیں۔ آپ کو یہ گھوڑا کیسا لگا؟"

بولے "ہر آرٹسٹ کے اندر ایک گھوڑا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "مگر مجھے تو اس گھوڑے کے اندر آرٹسٹ نظر آرہا ہے۔"

بولے "بات ایک ہی ہے۔ جب تک گھوڑے میں آرٹسٹ اور آرٹسٹ میں گھوڑا شامل نہ ہو تب تک بات نہیں بنتی۔"

دو دن بعد میں اسلام آباد سے کراچی واپس جانے لگا تو مُنیر نے بھرپور وداعی جھپّی ڈالی۔ اُس وقت مُنیر کی آنکھوں کے کناروں پہ پانی کی ایک ہلکی سی لکیر بن گئی تھی۔ اسے نہ جانے کیا کہتے ہیں۔ مُنیر نے کہا "یار! سارے احباب کو سلام کہنا۔ ایک ایک کو میری طرف سے پُوچھنا۔ یار! بہت جی کرتا ہے، دہلی آنے کو، مگر کیا کریں۔"

اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ جس دن میں پاکستان سے ہندوستان واپس آیا اسی دن قبلہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سے میری ملاقات ہوگئی۔ میں نے مُنیر کا سلام ان تک پہنچانے کے بعد اپنی طرف سے کہا "کنور صاحب! مُنیر ہندوستان آنے کے لیے

بہت بے چین ہیں کوئی صورت ایسی نکالئے کہ وہ آجائیں۔"

بیدی صاحب بولے "تم نے بہت ٹھیک وقت پہ یاد دلایا۔ غالب سمینار کی تیاری کمیٹی کی میٹنگ کل ہونے والی ہے۔ ہم منیر کو اس سمینار میں بُلالیتے ہیں۔"

اور ۱۹۸۸ء کے دسمبر میں منیر اس سمینار میں شرکت کے لیے دہلی آئے۔ پھر ہم نے انھیں اُردو اکاڈمی کی طرف سے منعقد ہونے والی طنز و مزاح کانفرنس میں روک لیا۔ منیر آٹھ دس دنوں تک دہلی میں رہے۔ اتنے خوش تھے کہ اس خوشی کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ طنز و مزاح کی کانفرنس میں اُنھوں نے ایک باغ و بہار خطبۂ صدارت بھی پڑھا تھا جسے اب تک لوگ یاد کرتے ہیں۔

منیر دوستوں کے رسیا تھے اور وہ دوستوں کی زندگی ہی جیتے تھے۔ محبت کا دریا اُن کے دل میں ہمیشہ ٹھاٹھیں مارتا رہتا تھا۔ دوستوں کو اپنی طرف سے جو کچھ محسوس کرنا ہوتا تھا اُسے تک وہ خود محسوس کرلیتے تھے۔ چار پانچ سال پہلے لندن میں اُن کی بائی پاس سرجری ہوئی تھی۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ اُن کی خیریت کس سے معلوم کی جائے۔ آپریشن کے دس بارہ دن بعد لندن سے ہندوستان آنے والے ایک دوست کے ذریعہ مجھ تک یہ اطلاع بھجوائی کہ اُن کا آپریشن کامیاب ہوگیا ہے اور یہ کہ ہم لوگ اُن کی طرف سے پریشان نہ ہوں۔ منیر کھلے دماغ کے آدمی تھے۔ ادب، آرٹ، کلچر، موسیقی اور رقص سب کے لیے اُن کا دل مچلتا تھا۔ ہندوستانی موسیقی کے تو وہ دلدادہ تھے۔ دہلی کی ہر تہذیبی اور ادبی محفل میں وہ موجود ہوتے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ غالباً ۱۹۷۸ء میں میرے دوست شرد دت کے گھر پر اُن سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اُس رات شرد کے گھر پر دہلی کے کئی ادیب، شاعر اور آرٹسٹ جمع تھے۔ منیر احمد شیخ کسی دوست کے ہمراہ اس محفل میں اچانک چلے آئے تھے۔ پتہ چلا کہ پاکستانی سفارت گھر میں پریس کونسلر بن کر آئے ہیں۔ منیر کی کہانیاں اور اُن کے مضامین میری نظر سے گذر چکے تھے اور میری مزاحیہ تحریروں سے وہ پہلے ہی سے واقف تھے۔ بہت گرم جوشی سے ملے۔

محفل کے بعد جانے لگے تو مجھ سے بولے "بھئی! اس محفل میں تو دہلی کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی کریم (CREAM) موجود ہے۔" اور میں نے کہا "منیر صاحب! یہ نہ صرف کریم ہے بلکہ آئس کریم بھی ہے۔" اس جملہ پہ منیر نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اور مجھ سے لپٹ گئے۔

میں خط لکھنے کے معاملے میں بہت کاہل واقع ہوا ہوں۔ منیر اس بات کو جانتے تھے۔ اسی لیے اپنے طور پہ اپنے بارے میں اور مشترکہ دوستوں کے بارے میں کسی نہ کسی ذریعہ سے اطلاعیں پہنچاتے رہتے تھے۔ ان کے انتقال سے دو دن پہلے "اخبارِ نو" کے دفتر سے میرے پاس فون آیا۔ مجھے بتایا گیا کہ منیر صاحب کا اُن کے پاس خط آیا ہے جس میں مجھے یہ اطلاع دینے کے لیے کہا گیا ہے کہ میرے اور اُن کے مشترک دوست منصور قیصر کا راولپنڈی میں انتقال ہوگیا۔ دوسرے دن ایک اور صاحب کے ذریعہ مجھے یہی اطلاع ملی۔ بعد میں راجکماری اندرا سنگھ نے بتایا کہ ان کے پاس بھی منیر کا خط آیا تھا جس میں مجھے یہ اطلاع پہنچانے کے لیے کہا گیا تھا۔ دو دن بعد جب میں نے خود منیر احمد شیخ کے انتقال کی خبر اخبار میں پڑھی تو سکتہ سا طاری ہوگیا۔ صدیوں سے انسان اس دنیا میں آتے اور جاتے رہے ہیں۔ مگر کسی کسی کا جانا دل کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ منیر جیسے لوگ موجود ہوں تو انسانیت بہت بھلی لگتی ہے۔ وہ اس ملک کے شہری نہیں تھے لیکن منیر جیسے لوگ دُنیا کے کسی بھی ملک میں موجود رہیں۔ انسانیت کے لیے ایک اثاثہ ہوتے ہیں۔ ایک مخلص اور بے لوث دوست کہیں بھی ہو اپنا ہی لگتا ہے۔ منیر کی موت سے اُردو ایک اچھے انشائیہ نگار سے اور انسانیت ایک اچھے انسان سے محروم ہوگئی۔ اور ہم ایک پیارے دوست سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔

۸۸

کیا کیا جائے

مفلس فاروقی
(اکولہ)

اگر ہو پیٹ میں اینٹھن تو کیا کیا جائے
پکا ہو مُرغ کا سالن تو کیا کیا جائے

لڑاتے آئے ہیں اَب تک جو میرؔ کنکوے
وہ لڑ رہے ہوں الیکشن تو کیا کیا جائے

پھٹی پڑی ہوں جو نعروں کے شور سے سڑکیں
گلی گلی جو ہو بھاشن تو کیا کیا جائے

تمہارے وصل کی اُمّید جس کھنڈر میں تھی
وہاں ملے جو رحیمن تو کیا کیا جائے

طلب کی بات کروں اس سے سوچتا ہوں مگر
ہو اس کے ہاتھ میں بیلن تو کیا کیا جائے

ترے لیے تھی مجھے حور کی تلاش مگر
تجھے پسند ہو بھنگن تو کیا کیا جائے

سنبھالے رکھی ہے یہ جان ہم نے جس کے لیے
وہی ہو جان کا دشمن تو کیا کیا جائے

جو رنگ روپ میں عیدی امین ہو اس کو
ملے جو چاند سی دلہن تو کیا کیا جائے

اُمید وار ہوں مسٹر، مسز دونوں جہاں
مسز کا ہو جو سلیکشن تو کیا کیا جائے

وہ جس نے رام کا بہروپ دھار رکھا ہے
پسِ نقاب ہو راون تو کیا کیا جائے

اگر ہوں چار چھ دشمن تو کوئی بات نہیں
زمانے بھر سے ہو اَن بَن تو کیا کیا جائے

پرانے لوگ سمجھتے ہیں جس کو عُریانی
وہی ہو آج کا فیشن تو کیا کیا جائے

تعلقات ہیں اس سے مگر لگاؤ نہیں
ذرا ہے لُوز کنکشن تو کیا کیا جائے

ہمارے نالہ و ماتم پہ کھلکھلا کے اگر
کوئی ہنسے پسِ چلمن تو کیا کیا جائے

اِدھر کہ نیند کے غلبے سے بند ہوں آنکھیں
اُدھر کھنکتے ہوں کنگن تو کیا کیا جائے

ہمارے دل میں تو خواہش ہے روشن آرا کی
نصیب میں ہو نصیبن تو کیا کیا جائے

سبھی پلیٹیں لبالب ہوں اور اے مفلسؔ
مری پلیٹ میں کھرچن تو کیا کیا جائے

پاگلؔ عادل آبادی

بڑھاؤ نہ ٹینشن وغیرہ وغیرہ
وہ لے لے گی بیلن وغیرہ وغیرہ

سُنا ہے کہ شاگرد ہیں سب تمہارے
امیتابھ بچّن وغیرہ وغیرہ

لگا مانگنے شان سے اِک بھکاری
دو مرغی کا سالن وغیرہ وغیرہ

خدا جانے کب گھر سے جائیں گے یارو
میرے سمدھی سمدھن وغیرہ وغیرہ

بڑھا اور بی پی یہ پرہیز سُن کر
غذائے مرغّن وغیرہ وغیرہ

ملازم ہے بیوی تو شوہر نکھٹّو
ہے اوپر سے سوکن وغیرہ وغیرہ

مشتاق احمد یوسفی

حویلی

وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں .

یادش بخیر! میں نے ۱۹۴۵ء میں جب قبلہ کو پہلے پہل دیکھا تو اُن کا حلیہ ایسا ہو گیا تھا جیسا اب میرا ہے۔ لیکن ذکر ہمارے یارِ طرح دار بشارت علی فاروقی کے خُسر کا ہے، لہٰذا تعارف کچھ انہی کی زبان سے اچھا معلوم ہوگا۔ ہم نے بارہا سُنا، آپ بھی سنیے:

"وہ ہمیشہ سے میرے کچھ نہ کچھ لگتے تھے۔ جس زمانے میں میرے خُسر نہیں بنے تھے تو پھوپھا ہوا کرتے تھے۔ اور پھوپھا بننے سے پہلے میں انھیں چچا حضور کہا کرتا تھا۔ اس سے پہلے بھی یقیناً وہ کچھ اور لگتے ہوں گے، مگر اس وقت میں نے بولنا شروع نہیں کیا تھا۔ ہمارے ہاں مرادآباد اور کانپور میں رشتے ناتے اُبلی ہوئی سویوں کی طرح اُلجھے اور پیچ در پیچ گتھے ہوتے ہیں۔ ایسا جلالی، ایسا مغلوب الغضب آدمی زندگی میں نہیں دیکھا۔ بابے ان کا انتقال ہوا تو میری عمر آدھی اِدھر آدھی اُدھر، چالیس کے لگ بھگ تو ہوگی۔ لیکن صاحب! جیسی دہشت اِن کی آنکھیں دیکھ کر بچپن میں ہوتی تھی، ویسی ہی نہ صرف ان کے آخری دم تک رہی، بلکہ میرے آخری دَم تک بھی رہے گی۔ بڑی بڑی آنکھیں اپنے ساکٹ سے نکلی پڑتی تھیں۔ لال سُرخ۔ ایسی ویسی؟ بالکل خونِ کبوتر! لگتا تھا بڑی بڑی پُتلیوں کے گرد لال ڈوروں سے ابھی خون کے فوارے چھوٹنے لگیں گے اور میرا منہ خونم خون ہو جائے گا۔ ہر وقت غصے میں بھرے رہتے تھے۔ جانے کیوں۔ گالی ان کا تکیہ کلام تھی۔ اور جو رنگ تقریر کا تھا وہی تحریر کا۔ رکھ ہاتھ نکلتا ہے دھواں مغزِ قلم سے۔ ظاہر ہے کچھ ایسے لوگوں سے بھی پالا پڑتا تھا جنھیں بوجوہ گالی نہیں دے سکتے تھے۔ ایسے موقعوں پر زبان سے تو کچھ نہ کہتے، لیکن چہرے پر ایسا ایکسپریشن لاتے کہ قدِ آدم گالی نظر آنے۔ کس کی شامت آئی تھی کہ ان کی کسی بھی رائے سے اختلاف کرتا۔ اختلاف تو درکنار، اگر کوئی شخص محض ڈر کے مارے ان کی رائے سے اتفاق کر لیتا تو فوراً اپنی رائے تبدیل کر کے اُلٹے اُس کے سر ہو جاتے۔

ارے صاحب! بات اور گفتگو تو بعد کی بات ہے، بعض اوقات محض سلام سے مشتعل ہو جاتے تھے! آپ کچھ بھی کہیں، کیسی ہی سچی اور سامنے کی بات کہیں، وہ اس کی تردید ضرور کریں گے۔ کسی کی رائے سے

اتفاق کرنے میں اپنی سبکی سمجھتے تھے۔ اِن کا ہر جملہ 'نہیں' سے شروع ہوتا تھا۔ ایک دن کانپور میں کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ آج بڑی سردی ہے، بولے 'نہیں۔ کل اس سے زیادہ پڑے گی' وہ چچا سے پھوپا بنے اور پھوپا سے خسرُ الحذر، لیکن مجھے آخر وقت تک نگاہ اُٹھاکر بات کرنے کی جسارت نہ ہوئی۔ نکاح کے وقت وہ قاضی کے پہلو میں بیٹھے تھے۔ قاضی نے مجھ سے پوچھا، قبول ہے؟ اُن کے سامنے منہ سے ہاں کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بس اپنی ٹھوڑی سے دو مودبانہ ٹھونگیں ماردیں جنھیں قاضی اور قبلہ نے رشتہ مناکحت کے لیے ناکافی سمجھا۔ قبلہ کڑک کر بولے 'لونڈے! بولتا کیوں نہیں؟' ڈانٹ سے میں نروس ہوگیا۔ ابھی قاضی کا سوال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ میں نے 'جی ہاں!' قبول ہے کہہ دیا۔ آواز یکلخت اتنے زور سے نکلی کہ میں خود چونک پڑا۔ قاضی اچھل کر سہرے میں گھس گیا۔ حاضرین کھلکھلا کے ہنسنے لگے۔ اب قبلہ اِس پر بھنّار ہے ہیں کہ اِتنے زور کی 'ہاں' سے بیٹی والوں کی ہیٹی ہوتی ہے۔ بس تمام عمر ان کا یہی حال رہا۔ اور تمام عمر میں کربِ قرابت داری و قربتِ قہری دونوں میں مبتلا رہا۔

"حالانکہ اکلوتی بیٹی، بلکہ اکلوتی اولاد تھی۔ اور بیوی کو شادی کے بڑے ارمان تھے، لیکن قبلہ نے مایوں کے دن عین اُس وقت جب میرا رنگ نکھارنے کے لیے اُبٹن مَلا جارہا تھا، کہلا بھیجا کہ دولہا میری موجودگی میں اپنا منہ سہرے سے باہر نہیں نکالے گا۔ دو سو قدم پہلے سواری سے اُتر جائے گا اور پیدل چل کر عقدگاہ تک آئے گا۔ عقدگاہ اُنھوں نے اس طرح کہا جیسے اپنے بعض صاحب قتل گاہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ قبلہ کی دہشت دل میں ایسی بیٹھ گئی تھی کہ مجھے تو عروسی چھپرکھٹ بھی پھانسی گھاٹ لگ رہا تھا۔ اُنھوں نے یہ شرط بھی لگائی کہ براتی پلاؤ زردہ ٹھونسنے کے بعد یہ ہرگز نہیں کہیں گے کہ گوشت کم ڈالا اور شکر ڈیوڑھی نہیں پڑی۔ خوب سمجھ لو، میری حویلی کے سامنے بینڈ باجا ہرگز نہیں بجے گا۔ اور تمہیں رنڈی نچوانی ہے تو OVER MY DEAD BODY اپنے کوٹھے پر نچواؤ۔

"کسی زمانے میں راجپوتوں اور عربوں میں لڑکی کی پیدائش نحوست اور قہرِ الٰہی کی نشانی تصور کی جاتی تھی۔ ان کی غیرت یہ کیسے گوارہ کرسکتی تھی کہ ان کے گھر برات چڑھے۔ داماد کے خوف سے وہ نوزائیدہ لڑکی کو زندہ گاڑ آتے تھے۔ قبلہ اس وحشیانہ رسم کے خلاف تھے۔ وہ داماد کو زندہ گاڑ دینے کے حق میں تھے۔

"چہرے، چال اور تیور سے کوتوال شہر لگتے تھے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ بانس منڈی میں ان کی عمارتی لکڑی کی ایک معمولی سی دُکان ہے۔ نکلتا ہوا قد۔ چلتے تو قد، سینہ اور آنکھیں، تینوں بیک وقت نکال کر چلتے تھے۔ ارے صاحب! کیا پوچھتے ہیں۔ اول تو ان کے چہرے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، اور کبھی جی کڑا کر کے دیکھ بھی لیا تو بس لال بھبوکا آنکھیں ہی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد۔ رنگ گندمی، آپ جیسا، جسے آپ اس گندم جیسا بتاتے ہیں جسے کھاتے ہی حضرت آدم، بیک بینی و دوگوش جنت سے نکال دیے گئے۔ جب دیکھو جھلّاتے تنتناتے رہتے۔ مزاج، زبان اور ہاتھ کسی پہ قابو نہ تھا۔ دائمی طیش سے لرزہ براندام رہنے کے سبب اینٹ، پتھر، لاٹھی، گولی، گالی کسی کا بھی نشانہ ٹھیک نہیں لگتا تھا۔ کبھی کبھی مونچھیں جنھیں گالی دینے سے پہلے اور بعد میں تاؤ دیتے۔ آخری زمانے میں بھوؤں کو بھی بل دینے لگے۔ گٹھا ہوا کسرتی بدن ململ کے کُرتے سے جھلکتا تھا۔ چُنی ہوئی آستین اور اس سے بھی مہین چُنی ہوئی

دوپلی ٹوپی۔ گرمیوں میں خس کا عطر لگاتے۔ کیکری کی سلائی کا چوڑی دار پاجامہ۔ چوڑیوں کی یہ کثرت کہ پاجامہ نظر نہیں آتا تھا۔ دھوبی انگلی پر نہیں سکھاتا تھا۔ علیحدہ بانس پر دستانے کی طرح چڑھا دیتا تھا۔ آپ رات کے دو بجے بھی دروازہ کھٹکھٹا کر بلائیں تو چوڑی دار ہی میں برآمد ہوں گے۔

واللہ! میں تو تصور کرنے کی بھی جرأت نہیں کرسکتا کہ دائی نے انھیں چوڑی دار کے بغیر دیکھا ہوگا۔ بھری بھری پنڈلیوں پر خوب کھبتا تھا۔ ہاتھ کے بنے ریشمی ازار بند میں چابیوں کا گچھا جھنجھناتا رہتا۔ جو تالے برسوں پہلے بیکار ہوگئے تھے ان کی چابیاں بھی اس گچھے میں محفوظ تھیں۔ حد یہ کہ اس تانبے کی بھی چابی تھی جو پانچ سال پہلے چوری ہوگیا تھا۔ محلے میں اس چوری کا برسوں چرچا رہا، اس لیے کہ چور صرف تالا، پہرہ دینے والا کتا اور دادان کا شجرۂ نسب چرا کر لے گیا تھا۔ فرماتے تھے کہ اتنی ذلیل چوری صرف کوئی جدی پشتی رشتہ دار ہی کرسکتا ہے۔ آخری زمانے میں یہ ازار بندی گچھا بہت وزنی ہوگیا تھا اور موقع بے موقع فلمی گیت کے بازو بند کی طرح کھل کھل جاتا۔ کبھی جھک کر گرم جوشی سے مصافحہ کرتے تو دوسرے ہاتھ سے ازار بند تھامتے۔ مئی جون میں ٹمپریچر ۱۱۶ ہوجاتا اور منہ پر لو کے تھپیڑے پڑنے لگتے تو پاجامے سے ایئر کنڈیشنگ کرلیتے۔ مطلب یہ کہ چوڑیوں کو گھٹنوں گھٹنوں پانی میں بھگو کر، سر پر انگوچھا ڈالے، تربوز کھاتے۔ خس خانہ و برفاب کہاں سے لاتے۔ اس کے محتاج بھی نہ تھے۔ کتنی ہی گرمی پڑے، دکان بند نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے، میاں! یہ تو بزنس، پیٹ کا دھندا ہے۔ جب چمڑے کی جھونپڑی (پیٹ) میں آگ لگ رہی ہو تو کیا گرمی کیا سردی۔ لیکن ایسے میں کوئی شامت کا مارا گاہک آنکلے تو برا بھلا کہہ کے بھگا دیتے تھے۔ اس کے باوجود وہ کھنچا کھنچا دوبارہ انہی کے پاس آتا تھا۔ اس لیے کہ جیسی عمدہ لکڑی وہ بیچتے تھے، ویسی سارے کانپور میں کہیں نہیں ملتی تھی۔ فرماتے تھے، داغی لکڑی بندے نے آج تک نہیں بیچی۔ لکڑی اور داغ دار؟ داغ تو دو ہی چیزوں پہ سجتا ہے۔ دل اور جوانی۔

لفظ کے لچھن اور بازاری پان: "تمباکو، قوام، خربوزے اور کڑھے ہوئے کرتے لکھنؤ سے منگواتے اور تالے علیگڑھ سے منگواتے تھے۔ علاوہ سوہن اور ڈپٹی نذیر احمد والے محاورے دلی سے۔ دانت گرنے کے بعد صرف محاوروں پر گزارہ تھا۔ گالیاں البتہ مقامی بلکہ خانہ ساز دیتے تھے جن میں سلاست و روانی پائی جاتی تھی۔ طبع زاد لیکن بلاغت سے خالی۔ بس جغرافیہ سا کھینچ دیتے تھے۔ سلیم شاہی جوتیاں اور چنری آپ کے جے پور سے منگواتے تھے۔ صاحب! آپ کا راجستھان بھی خوب تھا۔ کیا کیا سوغاتیں گنوائی تھیں اس دن آپ نے؟ . . . . . کھانڈ، سانڈ، بھانڈ اور رانڈ۔ اور یہ بھی خوب رہی کہ مارواڑیوں کو جس چیز پر بھی پیار آتا ہے اس کے نام میں ٹھ، ڈ اور ڑ لگا دیتے ہیں۔ مگر یہ بات آپ نے عجیب بتائی کہ راجستھان میں رانڈ سے مراد خوبصورت عورت ہوتی ہے۔ مارواڑی زبان میں بیچاری کی بیوہ کے لیے بھی کوئی لفظ ہے کہ نہیں؟ یا سبھی خوبصورت "نور" علیٰ نور بلکہ "حور" علیٰ حور ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ سوسوا سو سال قبل تک رنڈی سے مراد صرف عورت ہوتی تھی۔ جب سے مردوں کی نیتیں خراب ہوئیں، اس لفظ کے لچھن بھی بگڑ گئے۔ صاحب! راجستھان کے تین طرفہ تحفوں کے تو ہم بھی قائل اور گھائل ہیں۔ میرا باقی مہدی حسن اور ریشماں)۔

"ہاں تو کہہ یہ رہا تھا کہ باہر نکلتے تو ہاتھ میں پان کی ڈبیا اٹھائے رہتا۔ بازار کا پان ہرگز نہیں کھاتے تھے۔ کہتے تھے، بازاری پان صرف رنڈوے، تماشبین اور بمبئی والے کھاتے ہیں۔ صاحب [illegible] نفاست اور پرہیز میں نے انہی سے سیکھا۔ ڈبیا چاندی کی۔ منقش۔ بھاری۔ ٹھوس۔ اس میں جگہ جگہ ڈینٹ نظر آتے تھے جو انسانی سروں سے تصادم کے باعث پڑے تھے۔ طیش میں اکثر پانوں بھری ڈبیا پھینک مارتے۔ بڑی دیر تک تو یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ مضروب کے سر اور چہرے سے خون نکل رہا ہے یا بکھرے پانوں کی لالی نے غلط جگہ رنگ جمایا ہے۔ بٹوے خاص طور سے آپ کی جائے پیدائش، ریاست ٹونک سے منگواتے تھے۔ کہتے تھے کہ وہاں کے بٹوے ایسے ڈورے ڈالتے ہیں کہ اک ذرا گھنڈی کو جھوٹوں ہاتھ لگا دو تو بٹوہ آپ ہی آپ مصاحبوں کی باچھوں کی طرح کھلتا چلا جاتا ہے۔ گٹکا بھوپال سے آتا تھا۔ لیکن خود نہیں کھاتے تھے۔ فرماتے تھے، میٹھا پان، ٹھمری، گٹکا اور ناول۔ یہ سب نابالغوں کے شغل ہیں۔ شاعری سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ردیف قافیے سے آزاد شاعری سے بطور خاص چڑتے تھے۔ یوں بھی بقول شخصے، آزاد شاعری کی مثال ایسی ہے جیسے بغیر نیٹ کے ٹینس کھیلنا۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ اردو فارسی کے جتنے بھی اشعار لکڑی، آگ، دھوئیں، ہیکڑی، لڑ مرنے، ناکامی اور خواری سے متعلق ہیں سب یاد کر رکھے تھے۔ صورتِ حال کبھی قابو سے باہر ہو جاتی تو شعر سے اس کا دفعیہ فرماتے۔ آخری زمانے میں عزلت گزیں اور مردم بیزار ہو گئے تھے اور صرف دشمنوں کے جنازے کو کندھا دینے کے لیے باہر نکلتے تھے۔ خود کو کاسنی اور بیوی کو موتیا رنگ پسند تھا۔ شیروانی ہمیشہ موتیا رنگ کے ٹسر کی پہنی۔"

واہ کیا بات کورے برتن کی!

بشارت کی زبانی تعارف ختم ہوا۔ اب کچھ میری، کچھ ان کی زبانی سنیے اور رہی سہی، زبانِ خلق سے، جسے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔

کانپور میں پہلے بانس منڈی اور پھر کوپر گنج میں قبلہ کی عمارتی لکڑی کی دکان تھی۔ اسی کو آپ ان کا حیلۂ معاش اور وسیلۂ مردم آزاری کہہ سکتے ہیں۔ تھوڑی بہت جلانے کی لکڑی بھی رکھتے تھے مگر اسے کبھی لکڑی نہیں کہا۔ سوختہ یا ہیزم سوختنی کہتے تھے۔ ان کی دکان کو کبھی کوئی ناآشنائے مزاج ٹال کہہ دیتا تو دوسیری لے کر دوڑتے۔ جوانی میں پنسیری لے کر دوڑتے تھے۔ تمام عمر پتھر کے باٹ استعمال کیے۔ فرماتے تھے، لوہے کے فرنگی باٹ بھاری اور بے برکت ہوتے ہیں۔ پتھر کے باٹ کو بازوؤں میں بھر کے، سینے سے لگا کے اٹھانا پڑتا ہے! عمال تو دور رہے، کبھی کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ ان کے پتھر کے باٹوں کو تلوا کر دیکھ لے۔ کس کی شامت آئی تھی کہ ان کی دی ہوئی رقم یا لوٹائی ہوئی ریزگاری کو گن کر دیکھے۔ اس زمانے میں، یعنی اس صدی کی تیسری دہائی میں عمارتی لکڑی کی کھپت بہت کم تھی۔ سال اور چیڑ کا رواج عام تھا۔ بہت ہوا تو چوکھٹ اور دروازے شیشم کے بنوا لیے۔ ساگوان تو صرف امراء رؤسا کی ڈائننگ ٹیبل اور گوروں کے تابوت میں استعمال ہوتی تھی۔ فرنیچر ہوتا ہی کہاں تھا۔ بھلے گھروں میں فرنیچر کے ذیل میں صرف چارپائی آتی تھی۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، ان دنوں کرسی صرف [illegible] پائی جاتی تھی۔ اوّل، [illegible] حکیم، وید، ہومیوپیتھ، پیر، فقیر اور سیانوں سے مایوس ہو کر [illegible] کو وہ جگہ [illegible] اسے عکس کوپ لگا کر دیکھتا کہ مریض اور موت کے درمیان [illegible] دواؤں اور تعویذ گنڈوں سے کس حد تک پر کیا

ہے۔ اس زمانے کا دستور تھا کہ جس گھر میں سوسمی یا ہین لکڑی کی پٹاریوں میں روئی میں رکھے ہوئے پانچ انگور آئیں، یا سولا ہیٹ پہنے ڈاکٹر آئے [اور اس کے آگے آگے ہٹو بچو کرتا ہوا تیمار دارِ خصوصی اس کا چمڑے کا بیگ اُٹھائے] تو اڑوس پڑوس والے جلدی جلدی کھانا کھاکر خود کو تعزیت اور کندھا دینے کے لیے تیار کر لیتے تھے۔ در حقیقت ڈاکٹر کو صرف اس مرحلے پر بلاکر اس کرسی پر بٹھایا جاتا تھا جب وہ صورتِ حال پیدا ہو جائے جس میں دو ہزار سال پہلے لوگ حضرت عیسیٰؑ کو آزمانے تھے۔ کرسی کے استعمال کا دوسرا اور آخری موقع ہمارے یہاں ختنوں پر آتا تھا جب لڑکے کو دولہا کی طرح سجا بنا اور مٹی کا کھلونا ہاتھ میں دے کر اس کرسی پر بٹھا دیا جاتا تھا۔ اس جلادی کرسی کو دیکھ کر اچھے اچھوں کی گھگھی بندھ جاتی تھی۔ عزیزوں میں اس مقصد کے لیے نئے ماٹ یا نئی وضع کے کورے مٹکے کو اُلٹا کر کے سرخ کپڑا ڈال دیتے تھے۔

(کورے مٹکے کا ذکر آیا تو نوکِ قلم پر بے اختیار نظیر اکبرآبادی کا شعر آرہا ہے جسے نقل کیے بغیر رہا نہیں جاتا:

تازگی دل کی اور تری تن کی!
واہ کیا بات کورے برتن کی!

نظیر اکبرآبادی کی کیا بات ہے۔ کوئی سی نظم اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ انھیں جہاں کہیں قدرت کی کاریگری یا خدا کی شان نظر آجاتی ہے وہیں پاسے قُبال پہ سر بسجود ہو کر ثنائے سراپا میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ پنہاری کے سر پر کورا مٹکا دیکھا تو ردیف قافیے کی کاٹی اوٹ سے کر سارے سراپا کو نظروں سے کھوند ڈالا۔ پھر تو اُس کا جوبن کچھ اور بھی مٹکا" اس میں وہ اپنے دل بھر قافیے کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ جہاں جہاں وہ لے جائیں جاؤ سے جاتے ہیں۔ حد یہ کہ گھڑونچی اور اُٹھان دیکھ کر صبر و قرار و قافیہ ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے۔ دل میں خیالات فاسد پیدا ہونے لگتے ہیں۔

کوری ٹھلیا یہ دیکھ کر لوٹا:
دل لگا کر کے کچھ کھرا کھوٹا!

اس میں بچارے (ٹونٹی دار؟) لوٹے کا بظاہر صرف اتنا تصور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کے معشوق سے مشابہت رکھتا ہے۔)

چارپائی: سچ تو یہ ہے کہ جہاں چارپائی ہو وہاں کسی فرنیچر کی ضرورت، نہ گنجائش، نہ تُک۔ انگلستان کا موسم اگر اتنا ذلیل نہ ہوتا اور انگریزوں نے بروقت چارپائی ایجاد کرلی ہوتی تو نہ صرف یہ کہ وہ موجودہ فرنیچر کی کھکھیڑ سے بچ جاتے، بلکہ پھر آرام دہ چارپائی چھوڑ کر کالونیز بنانے کی خاطر، گھر سے باہر نکلنے کو بھی اِن کا دل نہ چاہتا۔" اور وہ ورکڈ" سورج بھی ان کی سلطنت پر ایک صدی تک ہمہ وقت چمکتے رہنے کی ڈیوٹی سے بچ جاتا۔ اور کم از کم آج کل کے حالات میں اوانٹی کھٹوانٹی لے کر پڑ رہنے کے لیے ان کے گھر میں کوئی ڈھنگ کی چیز تو ہوتی۔ ہم نے ایک دن پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے، بی ٹی سے کہا کہ بقول آپ کے، انگریز تمام ایجادات کے موجد ہیں۔ آسائش پسند، بے حد پراکٹیکل لوگ ہیں۔ حیرت ہے چارپائی استعمال نہیں کرتے! بولے "ادوان کسنے سے جان چراتے ہیں!" راقم الحروف کے خیال میں، ایک بنیادی فرق ذہن میں ضرور رکھنا چاہیے۔ وہ یہ کہ یورپ میں فرنیچر صرف بیٹھنے کے لیے ہوتا ہے، جب کہ ہم کسی ایسی چیز پر بیٹھتے ہی

نہیں جس پر بیٹھ سکیں۔ مثال میں دری، گدیلے، قالین، جاجم، چاندنی، چارپائی، کوچ، پار اور مہلوت سے دلدار کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ ایک چیز ہمارے ہاں البتہ ایسی تھی جسے صرف بیٹھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اسے حکمرانوں کا تخت کہتے تھے۔ لیکن جب انھیں اسی پر لٹکا کر اور پھر لٹا کر نہلا دیا جاتا تو یہ تختہ کہلاتا تھا اور اس عمل کو تختہ الٹنا کہتے تھے۔

اسٹیشن لکڑ منڈی اور بازارِ حسن میں بجوک :

مقصد اس تمہید غیر دل پذیر کا یہ کہ جہاں چارپائی کا چلن ہو وہاں فرنیچر کی بزنس پنپ نہیں سکتی۔ اب اسے چوب عمارتی کہیئے یا ہیزم غیر سوختنی، دھندا اس کا بھی ہمیشہ مندا ہی رہتا تھا کہ دکانوں کی تعداد گاہکوں سے زیادہ تھی۔ لہذا کوئی شخص ایسا نظر آجائے جو حلیے اور چال ڈھال سے ذرا بھی گاہک معلوم ہو تو لکڑ منڈی کے دوکاندار اس پر ٹوٹ پڑتے۔ بیشتر گاہک گرد و نواح کے دیہاتی ہوتے جو زندگی میں پہلی اور آخری بار لکڑی خریدنے کانپور آتے تھے۔ ان بیچاروں کا لکڑی سے، دو ہی مرتبہ سابقہ پڑتا تھا۔ ایک اپنا گھر بناتے وقت۔ دوسرے اپنا کریاکرم کرواتے سمے۔ قیام پاکستان سے پہلے جن پڑھنے والوں نے دلی یا لاہور کے ریلوے اسٹیشن کا نقشہ دیکھا ہے، وہ اس کی چھینا جھپٹی کا بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں ۱۹۴۵ء میں ہم نے دیکھا کہ دلی سے لاہور آنے والی ٹرین کے رکتے ہی جیسے ہی مسافر نے اپنے جسم کا کوئی حصہ دروازے یا کھڑکی سے باہر نکالا قلی نے اسی کو مضبوطی سے پکڑ کر سالم مسافر کو ہتھیلی پر رکھا اور ہوا میں ادھر اٹھالیا۔ اور اٹھا کر پلیٹ فارم پر کسی صراحی یا چلم پہ بٹھا دیا۔ لیکن جو مسافر دوسرے مسافروں کے دھکے سے خود بہ خود ڈبے سے باہر نکل پڑے، ان کا حشر ویسا ہی ہوا جیسا اردو کی کسی نئی نویلی کتاب کا نقادوں کے ہاتھ ہوتا ہے۔ جو چیز جتنی بھی جس کے ہاتھ لگی، سر پر رکھ کر رفو ہوگیا۔ دوسرے مرحلے میں مسافروں پر ہوٹلوں کے دلال اور ایجنٹ ٹوٹ پڑتے۔ سفید ڈرل کا کوٹ پتلون، سفید قمیص، سفید رومال، سفید کینوس کے جوتے، سفید موزے سفید دانت۔ اس کے باوجود محمد حسین آزاد کے الفاظ میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔ ان کی ہر چیز سفید اور اجلی ہوتی، سوائے چہرے کے۔ ہنستے تو معلوم ہوتا تو ہنس رہا ہے۔ یہ مسافر پر اس طرح گرتے جیسے انگلستان میں رگبی کی گیند اور ایک دوسرے پر کھلاڑی گرتے ہیں۔ ان کی ساری تگ و دو کا مقصد خود کچھ حاصل کرنا نہیں، بلکہ دوسروں کو حاصل کرنے سے باز رکھنا ہوتا تھا۔ مسلمان دلال ترکی ٹوپی سے پہچانے جاتے۔ وہ دلی اور یوپی سے آنے والے مسلمان مسافروں کو ٹونٹی دار لوٹے، مستورات، کثرتِ اطفال اور قیمے پراٹھے کے بھبکے سے فوراً پہچان لیتے اور "السلام علیکم BROTHER IN ISLAM" کہہ کر لپٹ جاتے۔ مسلمان مسافروں کے ساتھ صرف مسلمان دلال ہی دھینگا‌ـ‌مشتی کرسکتے تھے۔ جس دلال کا ہاتھ مسافر کے کپڑوں کے مضبوط ترین حصے پر پڑتا وہی اسے گھسیٹتا ہوا باہر لے آتا۔ جن کا ہاتھ لباس کے کمزور یا بوسیدہ حصوں پر پڑتا، وہ بعد میں ان کو بطور دستی رومال استعمال کرتے۔ نیم ملبوس مسافر قدم قدم پر اپنی ستر کشائی کرواتا، اسٹیشن کے باہر قدم رکھتا تو لاتعداد پہلوان جنھوں نے اکھاڑے کو ناکافی محسوس کر کے تانگہ چلانے کا پیشہ اختیار کر لیا تھا خود کو اس پر چھوڑ دیتے۔ اگر مسافر کے تن پر کوئی چیتھڑا اتفاقاً بچ رہا تو اسے بھی نوچ کر تانگے کی پچھلی سیٹ پر راجہ اندر کی کھڑاؤں کی طرح سجا دیتے۔ اگر کسی کے بوڑھی دار کے کریڈٹ کا

سرا تانگے والے کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ غریب گرہ پہ ہاتھ رکھے اسی میں بندھا چلا آتا۔ کوئی مسافر کا دامن آگے سے کھینچتا۔ کوئی پیچھے سے زلیخائی کرتا۔ آخری راونڈ میں ایک تگڑا سا تانگے والا سواری کا دایاں ہاتھ اور دوسرا مسٹنڈا اس کا بایاں ہاتھ پکڑ کے TUG OF WAR کھیلنے لگتے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہر دو فریقین اپنے اپنے حصے کی ران اور دست اکھیڑ کر لے جائیں، ایک تیسرا پھرتیلا تانگے والا ٹانگوں کے چرے ہوئے میلٹے کے نیچے بیٹھ کر مسافر کو یکلخت اپنے کندھوں پر اٹھا لیتا اور اپنے تانگے میں جوت کر ہوا ہو جاتا۔

کم و بیش یہی نقشہ کوپرگنج کی لکڑ منڈی کا ہوا کرتا تھا جس کے قلب میں قبلہ کی دکان تھی۔ گودام بالعموم دکان سے ملحق، عقب میں ہوتے تھے۔ گاہک پکڑنے کے لیے قبلہ اور دو تین چڑچڑ یار دکانداروں نے یہ کیا کہ دکانوں کے باہر سڑک پر لکڑی کے موٹے چھوٹے کیبن بنا لیے۔ قبلہ کا کیبن مسند تکیے، حقے، اگالدان اور اسپرنگ سے کھلنے والے چاقو سے آراستہ تھا۔ کیبن گویا ایک لونج کا مچان تھا جہاں سے گاہک کو مار گراتے تھے۔ پھر اسے چمکار پچکار کر اندر لے جایا جاتا جہاں کوشش یہ ہوتی تھی کہ خالی ہاتھ اور بھری جیب واپس نہ جانے پائے۔ جیسے ہی کوئی شخص جو بیوپاری سے گاہک لگتا، سامنے سے گزرتا تو دور و نزدیک کے دکاندار اسے ہاتھ کے اشارے سے یا آواز دے کر بلاتے "مہاراج! مہاراج"! ان مہاراجوں کو دوسرے دکانداروں کے پنجے سے چھڑانے اور خود گھسیٹ کر اپنے کچھار میں لے جانے کے دوران اکثر ان کی پگڑیاں کھل کر پیروں میں الجھ جاتیں۔ اس سلسلے میں آپس میں اتنے جھگڑے اور ہاتھا پائی ہو چکی تھی کہ منڈی کے تمام بیوپاریوں نے پنچایتی فیصلہ کیا کہ گاہک کو صرف وہی دکاندار آواز دے کر بلائے گا جس کی دکان کے سامنے سے وہ گزر رہا ہو۔ لیکن جیسے ہی وہ کسی دوسرے دکاندار کے حلقۂ تشدد میں داخل ہوگا تو اسے کوئی اور دکاندار ہرگز آواز نہ دے گا۔ اس کے باوجود چھینا جھپٹی اور کشتم پچھاڑ بڑھتی ہی گئی تو ہر دکان کے آگے چونے سے حد بندی کی لائن کھینچ دی گئی۔ اس سے یہ فرق پڑا کہ کشتی بند ہو گئی۔ کبڈی ہونے لگی۔ بعض دکانداروں نے مارپیٹ، گاہکوں کا ہانکا کرنے اور انھیں ڈنڈا ڈولی کر کے اندر لانے کے لیے بگڑے پہلوان اور شہر کے چھٹے ہوئے شہدے اور مسٹنڈے پارٹ ٹائم ملازم رکھ لیے تھے۔ کساد بازاری اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ یہ لوگ دن میں لکڑ منڈی میں گاہکوں کو ڈرا دھمکا کر ناقص اور کنڈم مال خریدوانے اور رات کو یہی فریضہ بازارِ حسن میں انجام دیتے۔ بہت سی طوائفوں نے اپنی آبرو کو ہر شب زیادہ سے زیادہ غیر محفوظ رکھنے کی غرض سے ان کو بطور "پمپ" ملازم رکھ چھوڑا تھا۔ قبلہ نے اس قسم کا کوئی غنڈا یا بدکردار پہلوان ملازم نہیں رکھا کہ انھیں اپنے زورِ بازو پہ پورا بھروسا تھا۔ لیکن اوروں کی طرح مال کی چرائی کٹائی میں مارکٹائی کا خرچہ بھی شامل کر لیتے تھے۔

آلاتِ اخراجِ خون: جونک، سینگی، لاٹھی: ہر وقت طیش کا عالم طاری رہتا تھا۔ سونے سے پہلے ایسا موڈ بنا کر لیٹتے کہ آنکھ کھلتے ہی غصہ کرنے میں آسانی ہو۔ پیشانی کے تین بل سوتے میں بھی نہیں مٹتے تھے۔ غصے کی سب سے خالص قسم وہ ہوتی ہے جو کسی اشتعال کی محتاج نہ ہو یا کسی بہت ہی معمولی سی بات پر آ جائے۔ غصے کے آخر ہوتے ہوتے یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ آیا کس بات پر تھا۔ بیوی ان کو روزہ نہیں رکھنے دیتی تھیں۔ غالباً ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے۔ ایک دن عشا کی نماز کے بعد گڑگڑا گڑگڑا کر اپنی دیرینہ پریشانیاں دفع ہونے کی دعائیں مانگ رہے تھے کہ ایک تازہ

پریشانی کا خیال آتے ہی ایک دم جلال آگیا۔ دعا ہی میں کہنے لگے کہ تو نے میری پرانی پریشانیاں ہی کون سی رفع کر دیں جو اب یہ نئی پریشانی دُور کرے گا۔ اس رات مُصلا تہ کرنے کے بعد پھر کبھی نماز نہیں پڑھی۔

ان کے غصّے پر یاد آیا کہ اس زمانے میں کن میلئے ملوں بازاروں میں پھیری لگاتے تھے۔ کان کا میل نکالنے پر ہی کیا موقوف۔ دنیا جہاں کے کام گھر بیٹھے ہو جاتے تھے۔ سبزی، گوشت اور سودا سلف کی خریداری، حجامت، تعلیم، زچگی، پیڑھی، کھاٹ کھٹولے کی . . . . یہاں تک کہ خود اپنی مرمت بھی اب گھر بیٹھے ہو جاتی۔ بیبیوں کے ناخن نہرنی سے کاٹنے اور پیٹھ ملنے کے لیے نائنیں گھر آتی تھیں۔ کپڑے بھی مغلانیاں گھر آکر سیتی تھیں تاکہ نامحرم ان کو ناپ تک کی ہوا نہ لگے۔ حالانکہ اس زمانے کی زنانہ پوشاک کے جو نمونے ہماری نظر سے گزرے ہیں وہ ایسے ہوتے تھے کہ کسی بھی لیڈر کیس کا ناپ لے کر سئے جا سکتے تھے۔ غرض کہ سب کام گھر ہی میں ہو جاتے۔ حد یہ کہ موت تک گھر میں واقع ہوتی تھی۔ اس کے لیے باہر جا کر کسی ٹرک سے اپنی روح قبض کرانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ فسادِ خون سے کسی کے بار بار پھوڑے پھنسی نکلیں، یا دماغ میں خیالات فاسدہ کا ہجوم دن دھاڑے بھی رہنے لگے تو گھر پر ہی فصد کھول دی جاتی تھی۔ فاضل و فاسد خون نکالنے کی غرض سے اپنا سر پھڑوانے یا پھوڑنے کے لیے کسی سیاسی جلسے میں جانے یا حکومت کے خلاف مظاہرہ کر کے لاٹھی کھانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس زمانہ میں آلۂ اخراج خون کے طور پر استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ جونک اور سینگی* لگانے والی کنجریاں روز پھیری لگاتی تھیں۔ اگر اس زمانے کے کسی حکیم کا ہاتھ آج کل کے نوجوانوں کی نبض پر پڑ جائے تو کوئی نوجوان ایسا نہ بچے جس کے جہاں تہاں سینگی لگی نظر نہ آئے۔ رہے ہم جیسے آج کل کے بزرگ کہ

کی جس سے بات اس کو ہدایت ضرور کی

تو کوئی بزرگ ایسا نہ بچے گا جس کی زبان پر حکیم صاحبان جونک نہ لگوا دیں۔

ہر واقعہ یہ بیان کو نے چلے تھے کہ گرمیوں کے دن تھے۔ قبلہ ادلے کا قورمہ اور خربوزہ تناول فرما کر کیبن میں قیلولہ کر رہے تھے کہ اچانک کن میلئے نے کیبن کے دروازے پر بڑے زور سے آواز لگائی "کان کا میل!" خدا جانے میٹھی نیند سو رہے تھے یا کوئی بہت ہی حسین خواب دیکھ رہے تھے جس میں گاہک ان سے منگنے داموں دھڑا دھڑ لکڑی خرید رہے تھے، ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ایک دفعہ تو دہل گئے۔ چق کے پاس پڑی ہوئی لکڑی اٹھا کر اس کے پیچھے ہو لیئے۔ کیلئے کی یہ جرأت کہ ان کے کان سے فقط ایک گز دور بلکہ پاس ایسے گستاخانہ طریقے سے چیخے۔ یہ کہنا تو درست نہ ہوگا کہ آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے یہ۔ اس لیے کہ قبلہ غصے میں ایسے بھرے ہوئے تھے کہ کبھی کبھی اس سے آگے بھی نکل جاتے۔ سڑک پر کچھ دور بھاگنے کے بعد کن میلیا گلیوں میں نکل گیا اور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ مگر قبلہ محض اپنی چھٹی حس کی بتائی ہوئی سمت میں دوڑتے رہے اور یہ وہ سمت تھی جس طرف کوئی شخص جس کے پانچوں حواس سلامت ہوں، یہ جارحانہ انداز میں لکڑی لاٹھی گھماتا ہرگز نہ

---

* سینگی درد یا فسادِ خون کے مقام پر ہلکا سا شگاف لگایا جاتا تھا پھر سوراخ کیے ہوئے سینگ کو بڑے دہانے کو اس پر رکھ کر اور سوراخ والے سرے کو منہ سے لگا کر سارا فاسد و غیر فاسد خون کھینچ لیا جاتا تھا۔ اس عمل کو یونانی طب کی اصطلاح میں سینگی لگانا اور اردو شاعری میں قافیہ کہتے ہیں۔

جاتا کہ یہ تھانے کی طرف جاتی تھی۔ اس وحشیانہ دوڑ میں قبلہ کی لکڑی اور کین میلنے کا پگڑ جس کے ہر پیچ میں اس نے میل نکالنے کے اوزار اُڑس رکھے تھے۔ زمین پر گر گیا۔ اس میں سے ایک ڈبیا بھی نکلی جس میں اس نے کان کا میل جمع کر رکھا تھا۔ نظر بچا کر اُسی میں سے تولہ بھر میل نکال کر دکھا دیتا کہ دیکھو، یہ تمہارے کان سے نکلا ہے۔ کبھی کے کان سے گوبر کے بھنگے برآمد کر کے کہتا کہ تمہارے کان میں جو بھن بھن تن تن کی آوازیں آرہی تھیں وہ انھیں کی تھیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ وہ کان کی بھول بھلیوں میں اِتنی دُور تک سہج سہج سلائی ڈالتا چلا جاتا کہ محسوس ہوتا ابھی کان کے راستے آنتیں بھی نکال کر ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ قبلہ نے اس پگڑ کو بلّی پر چڑھا کر بلّی اپنی کیبن کے سامنے اس طرح گاڑ دی جس طرح اگلے وقتوں میں کوئی بے صبرا ولی عہد، یا وہ نہ ہو تو پھر کوئی دشمن بادشاہ سلامت کا سر کاٹ کر نیزے پہ بہرِ خاص و عام کی اطلاع کے لیے بلند کر دیتا تھا۔ اِس کی دہشت ایسی بیٹھی کہ دکان کے سامنے سے بڑھئی، کھٹ بُنے، سینگی لگانے والیوں اور سحری کے لیے جگانے والوں نے بھی نکلنا چھوڑ دیا۔ ملحقہ مسجد کا کریہہ الصوت مؤذن بھی عقب والی سے آنے جانے لگا۔

کالنسی کی لُٹیا، بالی عُمریا اور جُگّی

قبلہ اپنا مال انتہائی توجہ، محنت اور محبت سے دکھاتے تھے۔ محبت کا اضافہ ہم نے اس لیے کیا کہ وہ گاہک کو تو بِھڑکی نظر سے دیکھتے، مگر اپنی لکڑی پر محبت سے ہاتھ پھیرتے رہتے۔ کوئی ساگوان کا تختہ ایسا نہیں تھا جس کے ریشوں کے ابرار رگوں (VEINS) کا طغریٰ، اگر وہ چاہیں تو یادداشت سے کاغذ پر نہ بنا سکتے ہوں۔ لکڑ منڈی میں وہ واحد دکاندار تھے جو گاہک کا پاپا اور ہر شہتیر اور بلّی کا شجرۂ نسب ازبر کرا دیتے تھے۔ ان کا اپنا شجرۂ نسب بلّی سے بھی زیادہ لمبا تھا۔ اس پر اپنے جدّ اعلیٰ کو ٹانگ رکھا تھا۔ ایک بلّی کی قامتِ زیبا کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہتے، سوا اُنتالیس فٹ لمبی ہے! گونڈہ کی ہے۔ افسوس! اصغر گونڈوی کے غوغائے شاعری نے گونڈہ کی بلّیوں کی شہرت کا بیڑا غرق کر دیا۔ لاکھ کہو، اب کسی کو یقین ہی نہیں آتا کہ گونڈے کی اصل وجہ شہرت خوبصورت بلّیاں تھیں۔ اصغر گونڈوی سے پہلے ایسی سیدھی، بے گانٹھ بلّی ملتی تھی کہ چالیس فٹ اونچے سرے پر سے چھلّا چھوڑو تو بے روک، سیدھا نیچے جھول سے آکے ٹھہرتا تھا۔ ان کے ہاں کا ہر شہتیر اصیل اور خاندانی تھا۔ بیشتر تو خالص مغل یا روہیل کھنڈ کے پٹھان معلوم ہوتے تھے کہ ہر آئے گئے کے کپڑے پھاڑتے اور خود شکل سے چِرتے تھے۔ کبھی قبلہ کونے میں پڑے ہوئے گرم و سرد و سیلاب چشیدہ SEASONED تختے کی طرف اتنے ادب و احترام سے اشارہ کرتے گویا ابھی ابھی جودی پہاڑ کی ترائی سے کشتیِ نوح میں سے اکھاڑ کر بطورِ خاص ایک "دانہ" آپ کے APPROVAL کے لیے لے آئے ہیں۔ کبھی برمی ساگوان کے "لٹھے" پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے، میاں! ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے! بچّہ ہے۔ بہت سے بہت اسّی سال۔ ڈیڑھ ڈیڑھ سو سال کا ساگوان اراودی کے جنگلوں میں آندھی طوفان میں بالکل کھڑی کا استادہ رہتا ہے۔ لیکن صاحب! ہے بلا کا سینہ زور، یہ سیکڑوں بارشوں اور سات دریاؤں کا پانی پی پی کے یہاں پہنچا ہے۔ اور اس لٹھے پر تو مگرمچھ نے پیشاب بھی کیا ہے۔ (انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) یہ جو کنول نین ٹھپّہ نظر آرہا ہے، اُس پر۔ مگرمچھ جس لکڑی پر موت دے اس کو حشر تک نہ دیمک لگ سکتی ہے، نہ آگ! اس پر خواجہ عبدالمجید جو منشیانہ ڈیسک کے لیے لکڑی خریدنے آئے تھے، پوچھ بیٹھے "کیا مگرمچھ بجلی کے کھمبے کے

بجائے درخت پر . . .“ وہ جملہ مکمل نہ کر پائے تھے کہ قبلہ تنک کر بولے ”جی نہیں! مگر مجھ تو سہیل اہلِ اسلام کی زنجیر سے بندھے ہوئے ٹین کے گلاس سے پانی پی کے، سڑک پر ٹہل ٹہل کے استنجا سکھاتے ہیں۔ آپ کے والد ماجد کی طرح۔ آیا خیال شریف میں؟

بس چوبیس گھنٹے مزاج کی کچھ ایسی ہی جوالا مکھی کیفیت رہتی تھی۔ ایک دفعہ حاجی محمد اسحاق مرچے والے کچھ شیشم خریدنے آئے۔ قبلہ یوں تو ہر لکڑی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے، لیکن شیشم پر سچ مچ فریفتہ تھے۔ اکثر فرماتے ”تختِ طاؤس میں شاہ جہاں نے شیشم ہی لگوائی تھی۔ شیشم کے گن گاہک اور قدردان تو قبر میں جا سوئے۔ مگر کیا بات ہے شیشم کی! جتنا استعمال کرو اتنے ہی جوہر کھلتے ہیں۔ شیشم کی جس چارپائی پہ میں پیدا ہوا، اسی پر دادا میاں کی ولادت ہوئی تھی۔“ اپنے حسنِ تولد و توارد کو قبلہ چارپائی اور دادا جان دونوں کے لیے باعثِ سعادت و افتخار سمجھتے تھے۔ حاجی محمد اسحاق بولے ”یہ لکڑی تو صاف معلوم نہیں ہوتی۔“ قبلہ نہ جانے کتنے برسوں بعد مسکرائے۔ حاجی صاحب کی داڑھی کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا ”یہ بات ہم نے شیشم کی لکڑی، ساگون کی کٹیا، بالی عمریا اور چنگی داڑھی میں ہی دیکھی کہ جتنا ہاتھ پھیرو اتنی ہی چمکتی ہے۔ اعلیٰ ذات کی شیشم کی پہچان یہ کہ آرا، رندہ، برما سب کھنڈے (کند) اور ہاتھ شل ہو جائیں۔ یہ چیڑ تھوڑا ہی ہے کہ ایک ذرا کیل ٹھونکو تو الف سے لے کر بے تک چر جائے۔ پر ایک بات ہے۔ تازہ کٹی ہوئی چیڑ سے بن پھاگن کا ایک آبشار پھوٹ پڑتا ہے۔ لگتا ہے اس میں نہایا جا رہا ہوں۔ جس دن کارخانے میں چیڑ کی کٹائی ہونے والی ہو، اس دن میں عطر لگا کر نہیں آتا۔“

قبلہ کا موڈ بدلا تو حاجی محمد اسحاق کی ہمت بندھی۔ کہنے لگے، یہ شیشم تو واقعی اعلیٰ درجہ کی معلوم ہوتی ہے، مگر سیزنڈ نہیں لگتی۔ قبلہ کے آگ ہی تو لگ گئی۔ فرمایا ”سیزنڈ! کتنے فاقوں میں سیکھا ہے یہ لفظ؟ اگر فقط سیزنڈ ہی چاہیے تو سب سے زیادہ سیزنڈ سامنے والی مسجد کے غسلِ میت کا تختہ ہے۔ بڑا پانی پیا ہے اس نے۔ لاؤں؟ اسی پر لٹا دوں گا۔“

سائی کے ساتھ عزتِ سادات بھی گئی:

یوں تو ان کی زندگی ڈیل کارنیگی کے ہر اصول کی اوّل تا آخر نہایت کامیاب خلاف ورزی تھی، لیکن بزنس میں انھوں نے اپنے ہتھکنڈے الگ ایجاد کیے تھے۔ گاہک سے جب تک یہ نہ کہلوالیں کہ لکڑی پسند ہے، اس کی قیمت اشارتاً بھی نہیں بتاتے تھے۔ وہ پوچھتا بھی تو صاف ٹال جاتے ”آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آپ کو لکڑی پسند ہے۔ لے جائیے۔ گھر کی بات ہے۔“ یک جب قطعی طور پر لکڑی پسند کر لیتا تو قبلہ قیمت بتائے بغیر، ہاتھ پھیلا کر بیعانہ طلب کرتے۔ سستا سماں تھا۔ وہ دونی یا چونی کی سائی پیش کرتا جو اس سودے کے لیے کافی ہوتی۔ اشارے سے دھتکارتے ہوئے کہتے، چاندی دکھاؤ (یعنی کم از کم ایک کلدار روپیہ نکالو) وہ بیچارا شرما شرما کر ایک روپیہ نکالتا جو اس زمانہ میں پندرہ سیر گیہوں یا سیر بھر اصلی گھی کے برابر ہوتا تھا۔ قبلہ روپیہ لے کر اپنی ہتھیلی پر اس طرح رکھے رہتے کہ اسے تسلی کے لیے نظر تو آتا رہے، مگر جھپٹا مار سکے ہتھیلی کو اپنے زیادہ قریب بھی نہ لاتے، مبادا سودا پٹنے سے پہلے ہی گاہک بدک جائے۔ کچھ دیر بعد خود بخود کہتے ”مبارک ہو! سودا پکا ہو گیا!“ پھر قیمت بتاتے جسے سن کر وہ ہکا بکا رہ جاتا۔ وہ قیمت پر حجت کرتا تو کہتے ”عجب

ہو: ساتی دے کے پھرتے ہو۔ ابھی روپیہ دے کے سودا پٹایا گیا ہے۔ ابھی تو اس میں سے تمہارے
کی کمائی بھی نہیں گئی اور ابھی پھر گئے۔ اچھا کہدو کہ یہ روپیہ تمہارا نہیں ہے۔ کہو، کہو" قیمت ناپ
رایسی بتاتے کہ کانیاں سے کانیاں گاہک [illegible] جاتے اور یہ فیصلہ نہ کرسکے کہ پیشگی دو دینے میں
ہ نقصان ہے یا اس بھاؤ لکڑی خریدنے میں۔

دورانِ حجت کتنی ہی گرما گرمی بلکہ ہاتھا پائی [illegible] اپنی ہتھیلی کو چت ہی رکھتے مٹھی کبھی بند
کرتے تھے تاکہ بے آبرو ہوتے ہوتے گاہک کو [illegible] ہے کہ کم از کم ساتی تو محفوظ ہے۔ ان کے
ے میں ایک قصہ مشہور تھا کہ ایک سرپھرے گاہک سے جھگڑا ہوا تو دھوبی پاٹ کا داؤں لگا کر زمین
ے مارا اور چھاتی پر چڑھ کے بیٹھ گئے۔ لیکن اس لوز میں بھی اپنی ہتھیلی جس پر روپیہ رکھا تھا، چت ہی رکھی
سے یہ بدگمانی نہ ہو کر روپیہ ہتھیانا چاہتے ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ جیسی بے داغ اور اعلیٰ لکڑی
یتے تھے، ویسی بقول ان کے "ملتیں باغ بہشت میں شاخ طوبیٰ سے کبھی دستیاب نہ ہوگی۔ داغی لکڑی بیدے
ح تک نہیں بیچی۔ سو سال بعد بھی دیمک لگ جائے تو پورے دام واپس کردوں گا"۔ بات دراصل یہ
وہ اپنے اصول کے پکے تھے۔ مطلب یہ کہ تمام عمر اونچی دکان، صحیح مال، غلط دام" پر سختی سے کاربند رہے۔
ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے فیشن ایبل اسٹور "ہیرڈز" کا دعویٰ ہے کہ ہمارے یہاں سوئی سے لیکر
ک دستیاب ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ قیمت بھی دونوں کی ایک ہی ہوتی ہے! ہیرڈز اگر لکڑی
ا تو بخدا ایسی ہی اور ان ہی داموں بیچتا۔

(باقی آئندہ) (آب گم سے) ۸۷

"لندن شہر میں"

فارغ بہاری
کلکتہ

تضمین بر غزل بخش لائل پوری 'لندن'

راہ فکر و فن ہوئی ہموار، لندن شہر میں   شاعروں کی جب ہوئی بھرمار لندن شہر میں
جس زباں کی اپنے گھر میں کچھ پذیرائی نہیں   پیار کرتے ہیں اُسے اغیار لندن شہر میں
جم کے لڑتے تھے وطن میں نام پہ مذہب کے جو   ہیں وہ ہندو، مسلم و سِکھ یار لندن شہر میں
بیچتے تھے فارسی پڑھ کے بھی جو مٹی کا تیل   ہو گئے اِس پار سے اُس پار لندن شہر میں
گاؤں میں وہ شخص جو کھیتا رہا سوکھے میں ناؤ   "ہو گیا اُس کا بھی بیڑا پار لندن شہر میں"
اب برائے خدمتِ اُردو زباں آٹھوں پہر   افتخار عارف گھمائیں کار لندن شہر میں
حضرتِ فارغ بہاری کو لگا جب سے بخار   فکر و فن کا ہو گیا آزار لندن شہر میں
ہم کریں گے حضرتِ عاشور کے گھر میں قیام   گرم ہے اُن کا ابھی بازار لندن شہر میں
زلفِ سیمیں مہوشوں کی مثلِ تارِ عنکبوت   دے رہی ہے دعوتِ دیدار لندن شہر میں
نیم عریاں مہ جبینانِ فرنگی کی بہار!   ہر طرف موسم ہے خوشبودار لندن شہر میں
اہلیہ کہنے لگیں خاوند کو بھی یو شٹ اپ   زوجیت کا دیکھئے معیار لندن شہر میں
سُوتیٹی ہے نام بیٹی کا سکینہ اب کہاں   یہ مسلمانوں کے ہیں افکار لندن شہر میں
دیکھئے جاوید بھی، جاوید سے ڈیوڈ ہوئے   "نام کہلاتا ہے اب شار لندن شہر میں
خط لکھا ہے بخش نے اعجاز کو یو کم ہیئر   کاش فارغ کا بھی ہوتا یار لندن شہر میں

غزل

رؤف رحیم
حیدرآباد

گا گا کے اپنی غزلیں سُناتے رہیں گے ہم   اپنے گلے کی داد ہی پاتے رہیں گے ہم
لت پڑ گئی ہے ہم کو ترنم کی دوستو   اپنے پڑوسیوں کو جگاتے رہیں گے ہم
ناگن عجب نہیں ہو کسی بھینس میں نہاں   بھینسوں کے آگے بین بجاتے رہیں گے ہم
گھاٹا بجٹ میں ہے تو گرانی بڑھائیے   سرکار کا ہے قرض چکاتے رہیں گے ہم
جدت کی کھاد فکر کو ہو جائے گر نصیب   گملوں میں آفتاب اُگاتے رہیں گے ہم
ہوتا ہے جس میں صرف کروٹوں کا ہیر پھیر   ایسے مجسموں کو بٹھاتے رہیں گے ہم
پہلی کے روز روٹھنا تم کو ضرور ہے   تنخواہ دے کے اپنی مناتے رہیں گے ہم
اندھوں میں کانے راجا بنیں گے رحیم اب   افلاسیوں میں دال گلاتے رہیں گے ہم

رؤف پاریکھ
(کراچی)

رہنمائے کراچی

تعارف :- کراچی کو عروس البلاد یعنی شہروں کی دلہن کہا جاتا ہے اس بات پر سارے شہری بھی پشیمان ہوتے ہیں اور کراچی بھی پریشان ہوتا ہے۔ پریشان تو خیر کراچی ہر وقت نظر آتا ہے کبھی بجلی نہ ہونے سے کبھی کرفیو ہونے سے، کبھی پانی کی پائپ لائن پھٹنے سے اور کبھی ٹرانسپورٹ نہ ہونے سے حکومت بیگم اس پر الگ شبہ کرتی ہے غرض کراچی کیلئے اچھا خاصا شوہر ہے مگر ہر وقت بولایا بولایا سا نظر آتا ہے۔

کراچی پاکستان کا سب سے بڑا مشہور شہر ہے یہ کسی زمانے میں دارالحکومت بھی ہوا کرتا تھا۔ پھر دارالحکومت بڑی افراتفری کے عالم میں بذریعہ ٹرین اسلام آباد لے جایا گیا (اگرچہ اسلام پھر بھی نہیں آیا صرف شہر آباد ہو گیا) جلدی جلدی میں حکومت تو کراچی سے اسلام آباد چلی گئی لیکن دار کراچی میں ہی رہ گیا اور آج تک یہیں پڑا ہوا ہے۔

محلِ وقوع :- کراچی کے مشرق میں خشک سالی، مغرب میں گرمی، شمال میں سرد مہری اور جنوب میں بدنظمی واقع ہیں یہ ۲۔۳ درجے طول عرب اور اتنے ہی درجے موج بلا پر واقع ہونے کی کوششوں میں مصروف ہے۔

تاریخ :- بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کراچی ماہی گیروں کے کسی سردار کلاچی کے نام پر آباد ہوا تھا جو بگڑتے بگڑتے کرانچی اور پھر کراچی ہو گیا ویسے بعض لوگ ابھی تک کراچی کے نام سے نون غنہ نکالنے کی زحمت نہیں کرتے اور اسے کرانچی ہی کہتے ہیں جبکہ کچھ لوگ اس میں کاف کے نیچے زیر لگا کر اسے کراچی بنا دیتے ہیں اس طرح زیر اور زبر ہونے سے کراچی پہلے ہی کرچی کرچی ہو چکا ہے۔ کراچی کا ماضی مرحوم، حال محروم اور مستقبل معدوم ہے۔

آب و ہوا :- بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ کے ڈی اے* کے وجود میں آنے سے قبل کراچی میں آب بھی ہوتا تھا اور ہوا بھی مگر جب کراچی میں کے ڈی اے نے آب سپلائی کرنا شروع کیا تو لوگوں کی ہوا بند ہو گئی اور لوگ آپے سے باہر ہو گئے۔ اب کے ڈی اے باری باری آب اور ہوا مہیا کرتا ہے۔ یہ دونوں وقفے وقفے سے نلوں میں سے نکلتے ہیں۔

★ کے ڈی اے :- کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی۔ لیکن بعض لوگ اسے کراچی ڈگنگ اتھارٹی (KARACHI DIGGING AUTHORITY) بھی کہتے ہیں کیونکہ اس نے سارے شہر کی سڑکوں کو پائپ لائن ڈالنے کی غرض سے کھود ڈالا ہے۔

ویسے کراچی کی آب وہوا بڑی عجیب و غریب ہے بلکہ عجیب کم ہے غریب زیادہ ہے۔ یہاں کی سردی، گرمی اور برسات کا دارومدار قریبی خطوں کی موسمی تبدیلیوں اور تغیرات پر ہوتا ہے۔ کراچی والے سردی کوئٹہ سے اور گرمی سندھ سے منگواتے ہیں۔ بارش کے لیے خلیج بنگال میں ہوا کا دباؤ کم ہونے کا انتظار کرنا پڑتا ہے گرچہ اس انتظار میں خون کا دباؤ [illegible] ہو جاتا ہے۔ یہاں اکثر سردیوں میں گرمیاں، گرمیوں میں سرگرمیاں اور بہار میں خزاں دیکھی جاتی ہے کئی سال پہلے یہاں بارش بھی دیکھی گئی تھی۔ لوگوں نے اس کی تصویریں اتار لی تھیں اور آج تک چھوٹے بچوں کو دکھاتے ہیں کہ دیکھو میاں! ایسی ہوتی ہے بارش۔ بہار اور پھولوں کے لیے انگریزی کے رسالے درآمد کیے جاتے ہیں اور لوگ باگ ان میں سبزہ اور پھول دیکھ کر پھولے نہیں سماتے۔ پھول کی طرح کھل اٹھتے ہیں۔ یہاں درختوں کا رنگ ایسا [illegible] ہے کہ لوگ مٹیالے اور بھورے رنگوں کو سبز سمجھتے ہیں۔ زندگی میں کبھی سبز رنگ دیکھ لیں تو ہرا ہرا سو جھنے لگتا ہے۔

طبعی حالات: کراچی کے ایک سرے پر سمندر ہے اس کی مدد سے محکمہ موسمیات والے شہر میں نمی میں اضافہ [illegible] ہیں دوسرے سرے پر شمالی کراچی اور اورنگی کی پہاڑیاں ہیں جو پولیس والوں کے لیے کوہ پیمائی کے کام آتی ہیں۔ ایک [illegible] کے پھلوں کے باغات اور سبزیوں کے کھیت ہیں جو دور سے ہرے ہرے نظر آتے ہیں یہاں کے امرود کتو [illegible] مشہور ہیں۔

[illegible] میں کسی زمانے میں دریائے ملیر اور دریائے کورنگی بہا کرتے تھے۔ [illegible] تو اب ٹھیکدار ریتی اور بجری ٹرک بھر بھر کر لے جاتے ہیں اور دریائے کورنگی خاصا [illegible] ہونے والی برسات میں گندہ پانی جمع رکھنے کے کام آ رہا ہے۔ ایک برسات کا پانی پانچ سال کے لیے کافی ہوتا ہے۔

شہر کا باقی تمام علاقہ صحرا ہے۔ [illegible] اس صحرا کو چٹیل میدان میں تبدیل کر دیتی ہے سرکاری محکمے سڑکوں پر کھدائی [illegible] چٹیل میدان کو سطح مرتفع میں تبدیل کرنے میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں۔ اس طرح [illegible] موٹی سڑکیں سطح مرتفع پوٹھوہار کی یاد دلاتی ہیں اور اسلام آباد سے دوری کا غم مٹ جاتا ہے۔ بارش سے یہ سطح مرتفع جھیلوں اور ندی نالوں کی صورت اختیار [illegible] سرکاری محکمے یہ پانی پائپ لائنوں کے ذریعہ شہریوں کو فراہم کر کے ٹھیکوں کا بیچ ڈال لیتے ہیں اور سالہا سال ترقیاتی فنڈ کی حا[illegible] کرتے ہیں۔ اس طرح اس شہر کے باشندوں کو ہر طرح کے طبعی حالات میسر ہیں۔

دلچسپی کے مقامات:- باغات: کراچی کے مشہور ترین باغات سبز باغ کہلاتے ہیں۔ لیکن یہ صرف خاص خاص موقعوں پر دکھائے جاتے ہیں مثلاً الیکشن وغیرہ اس کے علاوہ یہاں ایک ہل پارک بھی ہے جس میں ہل تو موجود ہے پارک نہیں ہے۔ صرف مٹی اور پتھر رہ گئے ہیں بلدیہ سوچ رہی ہے کہ اگلے سال ترقیاتی فنڈ سے کچھ رقم ٹھیکیداروں سے بچا کر یہاں صرف کی جائے۔

عجائب گھر:- تمام سرکاری دفاتر عجائب گھر کا کام دیتے ہیں۔ ان میں ہر طرح کی نایاب اور نادر چیزیں پائی جاتی ہیں۔ عملہ، عمارت، فرنیچر، غرضیکہ ہر چیز عجوبہ ہے ہر فائل اور ہر کاغذ ایک قدیم اور قیمتی دستاویز ہے۔ اسی لیے انہیں محفوظ رکھا جاتا ہے یعنی کر خراب نہیں کرتے

کھیل کے میدان:- تمام سڑکیں کھیل کے میدان ہیں۔ غیر ملکی سیاحوں کو یہاں کوئی کھیل کھیلنے سے گریز کرنا چاہیے کیونکہ [illegible]

والے غیر ملکیوں کا بھی خیال نہیں کرتے ۔

تفریح گاہیں :۔ صوبائی اسمبلی کسٹم ہاؤس اور چڑیا گھر۔

تاریخی مقامات :۔ کراچی کی تاریخ خود غائب ہے لہٰذا یہاں تاریخی مقامات بھی نہیں ہیں۔ بیس پچیس سال قبل تعمیر ہونے والی عمارتوں کو لوگ قدیم آثار سمجھ کر خوش ہو لیتے ہیں۔ مثلاً محکمۂ انکم ٹیکس کی عمارت۔ کراچی کے بعض لوگوں نے مطالبہ کیا ہے کہ لاہور کی طرح ہمیں بھی تاریخی مقامات دیئے جائیں۔ بعض تنظیموں نے کراچی کو تاریخی مقامات سے محروم رکھنے اور تمام تاریخی مقامات لاہور میں تعمیر کرنے پر مغل بادشاہوں اور دیگر حکمرانوں پر صوبائی تعصب اور جانب داری کا الزام لگایا ہے۔ البتہ مورخین اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ شاید وہ بھی متعصب تھے۔

دیگر قابل دید مقامات :۔ بعض حضرات سمیع طوبیٰ طارق روڈ اور مزار قائداعظم پر بھی تفریح کی غرض سے جاتے ہیں۔ لیکن سیاحوں کو چاہیے کہ وہ اس کی بجائے کوئی پنجابی فلم دیکھ لیں۔ تفریح کی تفریح اور علاج کا علاج اگرچہ اس کتاب کے مصنف نے پوری زندگی کوئی پنجابی فلم نہیں دیکھی۔ اور اسے یہ اعتراف ہے کہ زندگی اکارت گئی ہے لیکن معتبر راویوں کے مطابق سستی کو دور کرتی ہے۔ جسم میں چستی دوڑاتی ہے۔ اور بھوک کھل کر لگاتی ہے۔ بہرے حضرات نے پنجابی فلم کو ثقل سماعت کے لیے بھی مفید پایا ہے۔ البتہ بہرہ اپنا سینما ہال سے نکل کر عود کر آتا ہے بلکہ اچھی سماعت والے بھی فلم دیکھنے کے گھنٹے دو گھنٹے بعد تک کچھ نہیں سن سکتے۔

امیر سیاحوں کی تفریح کے لیے کراچی جم خانہ بھی موجود ہے۔ لیکن اسے کتابت کی غلطی سے کراچی حم خانہ بھی لکھا گیا ہے تشریح سیاح پرہیز کریں۔ شہزادہ محبوب زمانہ عالم بھی کراچی کے مشہور قابل دید تفریح مقامات میں سے ہیں۔

کھیل اور تہوار :۔ بسوں کو آگ لگانا کراچی کا مقبول ترین کھیل ہے۔ چند لوگ ایک بس کو آگ لگاتے ہیں اور سارا شہر گھنٹوں محظوظ رہتا ہے۔ اس کے علاوہ پولیس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنا بھی بہت مقبول ہے۔ مقامی تہواروں میں ... یہ تہوار وقفے وقفے سے ہر مہینے منایا جاتا ہے اور ... دنوں بلکہ ہفتوں جاری رہتا ہے۔

ذرائع آمد و رفت :۔ کراچی میں دو ذرائع آمد و رفت بے حد تیز رفتار ہیں۔ آناً فاناً شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ افواہ اور سنسنی ہیں۔ اس کے علاوہ پیلا شیطان یعنی منی بس بھی تیز رفتار اور باوفا سواری ہے۔

ہوٹل :۔ قیام کے لیے سرکاری مہمان خانہ موجود ہے جس میں طعام کا بھی معقول بندوبست ہے۔ البتہ ... آنے والے سیاح اس میں قیام کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ویسے سستا بلکہ مفت قیام سرکاری ... میں مہیا کیا جاتا ہے۔ سرکاری افسر اسی میں ٹھہرتے ہیں۔

ریستوران : سرکاری طعام خانوں میں رشوت بڑے شوق سے کھائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں کا خاص تحفہ کراچی حلوہ اور سوہن حلوہ ہے جو کراچی کے سوا پورے ملک میں مشہور ہے۔ کراچی میں اسے کوئی نہیں کھاتا۔ بسوں کا دھواں بھی تناول کیجیے اس کا ذائقہ عمر بھر یاد رہے گا۔

اوپیرا اور کنسرٹ : کراچی کے باشندوں کی میوزک کی تمام ضروریات رکشوں سے پوری ہو جاتی ہیں۔ یہ آدھی رات کو بھی

بالکل مفت موسیقی فراہم کرتے ہیں لہٰذا اوپیرا اور کنسرٹ جیسی چیزیں یہاں پنپ نہیں سکتیں۔

سوونیئر: کراچی کی خاص پیداواروں اور تحفوں میں مچھر، ڈائجسٹ، جانور گاڑیوں سے حاصل ہونے والی لید، اجتماعی جلسے، جلوس کے لیے پوسٹر اور بینر اور دیواروں پر لکھے گئے نعرے شامل ہیں۔ مرغ چھولے یہاں کی گھریلو صنعت ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی یادگار لے جائیے اور ڈرائنگ روم میں سجائیے۔

ہمیں یقین ہے کہ آپ کا قیام کراچی میں ناخوش گوار گزرے گا اور آپ ہر سال اپنی تعطیلات کا ستیاناس کرنے یہاں ضرور آئیں گے اور کسٹم میں مشرقی کے روایتی تکلفات اور سرکاری اداروں میں مہمان نوازی کی گرم جوشی بلکہ گرماگرمی کو محسوس کریں گے (یہ تجربہ آپ کے ناقابلِ فراموش ہوگا اور آپ ساری عمر اپنے آپ کو کوستے رہیں گے) ہم دیدہ و دل فرشِ راہ کیے آپ کے منتظر ہیں (انا للہ وانا الیہ راجعون)

وجاہت علی سندیلوی

بدلتے پیمانے

لوگ کہتے ہیں کہ زندگی کے طور طریقے بدل گئے ہیں۔ ضرور بدل گئے ہوں گے اور برابر بدل ہی رہے ہوں گے۔ اور چوں کہ اُن کی تبدیلی ہم سے پوچھ کر نہیں کی جاتی لہٰذا ہم اکثر اس سے بے خبر بھی رہتے ہیں۔ دُنیا میں نہیں معلوم کتنی چیزیں اور باتیں روزانہ بدلتی رہتی ہیں اور اُن کے متعلق ہماری کوئی مرضی اور خوشی نہیں پوچھی جاتی۔ اور پھر پوچھی بھی کیوں جائے؟ آخر ہم بقلم خود ہیں بھی کیا! نہ ودھایک' نہ کوئی لٹھ مار دادا' نہ کپتان پولیس' نہ بس کنڈکٹر' نہ لیکھ پال' نہ کسی نیتا کے چمچے' بقول شخصے نہ خاں میں نہ خاں کے اونٹوں میں۔ ہم بیچارے کسی کا کیا بنا یا بگاڑ سکتے ہیں! ہم تو ایک عام شہری ہیں جو اپنی بعض مجبوریوں اور معذوریوں کے باعث نیک اور شریف بننے پر قانع ہیں اور اپنی عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ۔

؎ تم بھی چلو اُدھر کو زمانہ جدھر چلے

یہ مجبوریاں اور معذوریاں کیا ہیں اب ہم انھیں کیا گنوائیں۔ بہت سے تلخ تجربوں کے تذکرے جن میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں، سُنا کر آپ کی کیوں سمع خراشی کریں ـــــ اس کارِ خیر کے لیے ہمارے پاس دوسرے اور زیادہ موثر حربے موجود ہیں۔ ہم یہاں اپنے ایک دوست کا مقولہ پیش کر دینے پر اکتفا کر رہے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ یہ 'عقل مندان را اشارہ کافی است' والی غلط فہمی اس موقعے پر کسی کھوٹے سکے کی طرح ضرور چل جائے گی۔

ہمارے یہ دوست جو پستہ قد بھی تھے اور موٹے بھی، بہت زیادہ خوش اخلاق واقع ہوئے تھے۔ وہ اپنے ہاتھوں کی پہونچ تک والے ہر شخص سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے اور دوسروں کی باتوں پر ضرورت سے زیادہ بلا ضرورت ہنستے اور قہقہہ لگاتے۔ ایک روز میں نے اُن کی اس خوش اخلاقی کا ذکر چھیڑ دیا۔ آبدیدہ ہو کر سسکیوں کے درمیان "میاں قدرت نے میرے ساتھ بڑی بے رحمی کا مذاق کیا ہے۔ میرا قد اور جسم دیکھو! نہ مار سکتا ہوں نہ بھاگ سکتا ہوں۔ خوش اخلاق نہ بنوں تو کیا آپ کے جیسے سرکش محلّے میں اپنی شامت بلواؤں پھر تھوڑی دیر کے بعد اپنے اوپر کچھ قابو پاتے ہوئے بولے آپ کے سر کی قسم اگر میں بھی آپ کی طرح لمبا اور سڈول ہوتا تو ان نابنجاروں سے آج خواہ مخواہ پنجہ ملاتا ہوں اُن کو کان پکڑ کر اپنے سامنے سے ہٹوا دیتا اور اگر ذرا بھی چیں چپڑ کرتے تو گھونسے مار مار کر اُن کا بھرکس نکال دیتا"۔

بھیڑ، بھیڑیے کی نہیں، بھیڑیا بھیڑ کی کھال پہنے تھا۔ ع۔ "جس کو قطرہ نہ سمجھتے وہ سمندر نکلا۔"

ہمارے دوست قدرت اللہ ہم کو اکثر کیا بارہا نصیحت بلکہ وصیت کرتے رہتے ہیں کہ برخوردار اشریر اور پاجی سے نہیں ہمیشہ نیک اور شریف نظر آنے والے آدمی سے ہوشیار اور چوکنا رہو۔ بوفورس کی دہانہ پھاڑ کے مقابلے آنا خوف نہ کھاؤ جتنا کہ اُس گھاس کے ڈھیر سے جس کے اندر بم چھپے ہونے کا امکان ہو" اور پھر اپنے اس نادر نظریے کی توضیح اور تشریح میں وہ طرح طرح سے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے "میاں! شریر اور پاجی تو وہی ہے جو دکھائی دیتا ہے یعنی شریر اور پاجی۔ بجلی کے کھمبے کی تختی کی طرح اس کے ماتھے پر دور سے چشم بصیرت پڑھ لیتی ہے خطرہ ہوشیار۔ وہ تو ایک کھلے ہوئے مرکھنے بیل کی طرح ہے۔ سب جانتے ہیں کہ جو اُس کے پاس جانے لگا اُس کو وہ سینگ مارے گا۔

اب اگر اس کے باوجود آپ اپنی حماقت سے اُس کی زد میں آ جاتے ہیں تو خدا لگتی کہیے گا کہ قصور اُس کا ہے یا خود آپ کا؟ دیکھیے جو میں عرض کر رہا ہوں اپنی بجا غالب فرما گئے ہیں۔ مجھے وہ ایسا لگتا ہے جیسے یہیں کہیں چھپے بیٹھے میری اور آپ کی گفتگو سن رہے ہوں ؎

"ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی ٭ جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں"

قدرت اللہ ایک روز شام کو مذکورہ بالا قسم کی گفتگو کر گئے تھے دوسرے روز سویرے آئے تو انہوں نے اپنے اُسی راگ کو ایک دوسرے ساز پر بالکل نئے انداز سے چھیڑ دیا "برخوردار اشریر اور پاجی تو ایک کھلی کتاب ہوتا ہے جیسا تم ہو اور وہاں! ہاں ہم بھی ہیں یعنی جو اندر ہیں وہی باہر ہیں لیکن ظاہر میں دکھائی دینے والا نیک اور شریف آدمی ایک طرح سے اپنے چہرے پر نقاب ڈالے ہوتا ہے۔ اُس پر ایک ملمع چڑھا ہوتا ہے وہ ہوتا کچھ اور دکھائی کچھ اور دیتا ہے اور آپ کو کیا خبر کہ وہ اندر سے ہے کیا؟ اور اُس کی حقیقی شکل کتنی بھیانک اور مکروہ ہے وہ خوب کان کھول کر سن لیجیے کہ ایک مغربی دانشور کا مقولہ ہے ایک انجانے فرشتے کے ساتھ جنّت جانے سے بہتر ہے کہ آپ کسی جانے پہچانے شیطان کے ساتھ جہنم چلے جائیں"

ہم نے ایک سیاسی مسئلے کو ایک روحانی مسئلہ بنتے دیکھا تو بڑی سعادت مندی سے عرض کیا "اسی لیے تو ہم نے اُس مہم کے لیے آپ کا ہاتھ پکڑا ہے"

خود نہ کچھ سمجھے نہ سمجھنے کی کوشش کی اور بدستور ہماری عاقبت سنوارنے کی کوشش میں منہمک رہے اُن کا اصرار تھا کہ دیکھنے میں جو شخص نیک اور شریف نظر آئے اُسے ہمیشہ مشتبہ نظروں سے دیکھو۔ اُسے تھپکنے کا فائدہ کبھی نہ دو اور باقاعدہ سراغ رساں بن کر پتا لگاؤ کہ وہ کیوں اپنے آپ کو نیک اور شریف ظاہر کرنا چاہتا ہے اس کی کہاں کمزوری ہے اور اس کے کردار کے کن کن گوشوں میں پانی مرتا ہے۔ اور پھر قدرت اللہ اپنے محبوب اور مرغوب مشغلے کردار کشی پر اُتر آئے۔ انھوں نے محلے بھر کے جانے مانے لوگوں کے کرداروں کا پوسٹ مارٹم کرنا شروع کر دیا جو کئی نشستوں میں مختلف عنوانوں سے جاری رہا اور ہم اور دوسرے حاضرین نہ صرف خاموشی سے سنتے رہے بلکہ ڈرتے رہے کہ دیکھیں ہماری باری کب آتی ہے اور ان اناڑی کے ہاتھوں کی اس بندوق کا رُخ ہماری طرف کب پھر جاتا ہے کیوں کہ بدقسمتی سے

لوگ کم از کم خود تو اپنے آپ کو نیک اور شریف ہی سمجھتے!

قدرت اللہ یوں تو رسمی طور سے اچھے خاصے پڑھے لکھے آدمی تھے۔ یعنی یونیورسٹی کی کئی ڈگریاں فریم کی ہوئی اُن کے کمرے میں آویزاں تھیں مگر شاید اس وجہ سے کہ وہ کسی بھی نوعیت سے سود لینے کے سخت سے مخالف تھے لہٰذا انھوں نے مجبوراً طوعاً و کرہاً جو کچھ کورس کی کتابوں میں پڑھا تھا اُس میں اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں بھی کسی اضافے کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔ وہ عموماً ہر بات کو ایک رخ سے دیکھنے کی کوشش کرتے۔ اُن کی ذہنی لغت میں کالا اور سفید کے علاوہ بیچ کے کسی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود اُن کی ہر بات سبحان تیری قدرت 'ہلدی مرچ' اور رکھ قسم کی نہیں ہوا کرتی اور خواہ حُسنِ اتفاق ہی کیوں نہ ہو اُس میں کبھی کبھی مغز اور وزن بھی نکل آتا۔

ع۔ ڈھونڈنے والوں کو دُنیا بھی نئی دیتے ہیں۔

قدرت اللہ کی وہ باتیں جو جذبات کی رو میں وہ ایک دم سے بک جاتے ہمارے لیے تیز بارش کا چھینٹا ثابت ہوتیں یعنی آیا اور بہہ گیا اور تھوڑی سی کیچڑ چھوڑ گیا لیکن جو باتیں وہ رفتہ رفتہ اور اٹھتے بیٹھتے بارہا کہتے کبھی براہ راست اور کبھی اشارتاً کنایتاً وہ ہمارے ذہن پر وہی کام کرتا جو شبنم چمن میں پھولوں اور پتیوں میں رنگ و بو پیدا کرنے کے لیے کرتی ہے ؎

ذرا سی بوندِ شبنم کی کہہ سکتی ہے کیا باقی ۔۔۔ ابھی رنگ و بو ہے رونقِ گلزار ہے ساقی

اُن کی باتیں تو ہم بھول جاتے لیکن کچھ عرصے کے بعد بہت عجیب سے اُن کے اثرات غیر شعوری طور سے اپنے دل و دماغ میں اُبھرتے محسوس کرتے جیسے چمن شاداب ہے شبنم نہیں ہے۔ انھوں نے نیک اور شریف آدمیوں کے خلاف جو ایک طرح "ہلا بول" رکھا تھا اُس نے ہمیں بھی خواہ مخواہ اپنے ہی دل میں اپنے تنکا کے مصداق بڑا خود حساس بنا دیا تھا۔ ہم نے اپنی نیکی اور شرافت کا ذرا تنقیدی جائزہ لیا تو ہم پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ ہمارے اس ایک بھلے آدمی دکھائی پڑنے کی کوشش میں ہماری نیک نفسی سے کہیں زیادہ ہماری بزدلی' دنیا سازی اور ابن الوقتی کا ہاتھ ہے ورنہ ہمارے جیسے بظاہر نستعلیق انسانوں میں بھی شرارت اور پاجی پن کے جراثیم کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ ہماری جلد پر رینگتے نظر نہیں آتے بلکہ اُس کی کئی تہوں کے نیچے سوتے مگر موقع کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

قدرت اللہ آٹھ دس روز کے لیے اپنے آم کے باغوں کی فصلیں بیچنے اپنے گاؤں چلے گئے تھے۔ لوٹ کر آئے تو بہت کچھ دائرۂ اعتدال میں نظر آئے۔ ایک روز سویرے حسبِ معمول میرے سامنے بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ دفعتاً مجھ سے پوچھ بیٹھے "تم نے جوش ملیح آبادی صاحب کی یادوں کی برات میں اُن کے معاشقے پڑھے ہیں؟"

"کیا یہ سوال آج کے اخبار کی کسی خبر سے متعلق ہے؟" میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔

قہقہہ لگاتے ہوئے بولے "خط آیا حال معلوم ہوا۔ تم نے پڑھے ہیں ۔۔۔ مزے لے لے کر پڑھے ہیں اور شاید سبھی مقامات پر سوائے اس مقام کے جہاں جوش صاحب رسّے سے باندھ کر کنوئیں میں ڈول کی طرح لٹکائے گئے تھے تمہارے دل میں اس تمنّا نے بھی انگڑائی لی ہوگی کہ کاش کہ وہاں موقع واردات پر جوش صاحب کے بجائے تم ہوتے!"

" جب آپ اتنے بڑے غیب داں واقع ہوئے ہیں کہ میرے بتائے بغیر میرے دل کی ہر تمنا سے آپ واقف ہیں تو پھر کسی سال جواب کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔" میں نے کچھ تیکھے لہجے میں لکھا۔

میری بات سے کوئی تاثر لیے بغیر قدرت اللہ نے بڑے جوش سے کہا "میاں! اگر ایک شخص اپنی آپ بیتی لکھ رہا ہے تو اس میں اس کو اپنے معاشقوں کے ذکر کرنے کا پورا حق ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا" دسامنے رکھی ہوئی میز پر گھونسہ مار کے" کہ یہ صرف حق نہیں بلکہ فرض ہے۔ ایک طرف تو آپ بیتی میں سچ اور سوائے سچ کے کچھ نہیں کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور جب کھرا سچ پیش کیا جاتا ہے تو عریانیت کے بہانے اس کی بخیہ اُدھیڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔"

پنڈت گرجا شنکر دیکھیت جو اس درمیان آگئے تھے بولے "میاں قدرت اللہ جوش صاحب اپنی جنسی فتوحات بیان کرنے پر اتنے مورد الزام نہیں ٹھہرائے گئے جتنا کہ اس پر کہ انھوں نے اس سلسلے میں مبالغہ آرائی بہت کی۔"

قدرت اللہ کچھ لمحے پنڈت جی کو مسکراتے ہوئے تاکتے رہے پھر ہنستے ہوئے بولے " مبالغہ آرائی کا ثبوت آپ کی جیب میں ہے۔ پنڈت جی! مبالغہ آرائی کا الزام بھی رشک و حسد کی ایک بگڑی ہوئی تصویر ہے۔ اچھا صاحب! ان کہا کہ جوش نے جھوٹ بولا کیوں؟ اپنی آپ بیتی کو دلچسپ بنانے کے لیے نیک اور پارسا لوگوں کو منھ چڑانے کے لیے اپنی قوت مردانگی کا ڈھنڈھورا پیٹنے کے لیے وغیرہ وغیرہ لیکن اُس نے کہیں آپ سے اپنے نیک اور شریف ہونے کے سرٹیفکیٹ لینے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اُس کے جھوٹ میں دل آزادی اُس کی شیخی میں مکاری اور اُس کی شوخیوں میں ریاکاری کا کوئی ادنا سا بھی شائبہ نہیں ملے گا"

" نہیں ملے گا تو ہماری بلا سے لیکن آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں جو سراپا عرض مدعا بنے اپنے عالم تقریر کی تفسیر بنے ہوئے ہیں۔" پنڈت جی نے منھ بناتے ہوئے کہا۔

" جو کہنا چاہتا ہوں اُس کے سننے کی تاب ہو تو سنیے" قدرت اللہ اپنی کرسی پر اکڑوں بیٹھ گئے "دو کل رات ایک نقہ بزرگ کی خود نوشت پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اُن کا ہر کام خدا کے فضل سے . . . ہوتا تھا۔ اسکول گئے تو پاجی اور بدمعاش لڑکوں اور ساتھیوں سے سابقہ پڑا لیکن خدا کے فضل سے اُن کے دامن عصمت پر گندگی کی ایک چھینٹ نہ آئی۔ کالج پہونچے تو شیطان کے ورغلانے سے بدعقیدہ ہو گئے لیکن پھر خدا کے فضل سے راہ راست پر آگئے اور اس طرح توبہ اور استغفار کی راکھ سے اپنے جذبات ایمانی اور واردات روحانی کو چمکا کر پیش کرنے کے بہت سے مواقع ہاتھ آگئے۔ اور پھر حالات کی مجبوری سے بیچارے کو دوسری شادی کرنا پڑی۔ شرعی مہر پر چند مہینے عدل کے ساتھ دونوں بیویوں کے ساتھ فرائض زوجیت ادا کرنے کے بعد خدا کے فضل سے دوسری بیوی کو بڑے شرعی انداز میں طلاق دے دی یعنی جب وہ میکے گئی ہوئی تھیں تو بذریعہ ڈاک طلاق نامہ بذریعہ منی آرڈر مہر اور عدت کے دنوں کا نان نفقہ پائی پائی کا حساب کر کے بھیج دیا۔ اپنے آپ کو نیک اور شریف ظاہر کرنے کے لیے بیچارے کو سخن سازی کے کیسے کیسے سخت مراحل طے کرنا پڑے اور جوش کے سامنے کسی بچے کی معصوم شرارتیں معلوم ہوتی ہیں۔"

قدرت اللہ ابھی کچھ اور کہنے والے تھے کہ پنڈت جی یہ کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ "میاں قدرت اللہ ہم لکڑی کی تختیوں پر لکھوا لاؤ۔ "ہم نیک اور شریف نہیں ہیں" اور ہم لوگ انہیں اپنے گھروں کے دروازوں پر لٹکا لیں گے۔

ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی

ہم نے رسالہ جاری کیا

ہم سنکی مزاج آدمی ہیں، وقتاً فوقتاً سنک جاتے ہیں، کیوں کہ ہم خیر سے ادیب بھی ہیں لہٰذا کریلا وہ بھی نیم چڑھا والا معاملہ ہے۔ ویسے اپنے سنکی پن کے لیے نہ تو ہم شرمندہ ہیں نہ افسردہ۔ اس کی دو وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ ہم جانتے ہیں کہ بیشتر جینیس سنکی تھے دوسرے یہ کہ اس سنکی پن کی وجہ سے جانے انجانے ہم سے کوئی ڈھنگ کا کام سرزد ہو جاتا ہے۔ پچھلے دنوں ہم نے کہیں پڑھا کہ جب گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے اور جب شاعر یا ادیب کی شامت آتی ہے تو وہ اخبار یا رسالہ جاری کرتا ہے۔ اس کہاوت کے پہلے نصف حصے سے ہم نے اس بنا پر اتفاق کر لیا تھا کہ معاملہ گیدڑ اور شہر والوں کا تھا اور ہم شہر سے دیہات کے رہنے والے لیکن اس کہاوت کے دوسرے حصے سے ہم قطعی متفق نہیں تھے کیوں کہ اس میں ادیب پر یعنی خود ہم پر براہِ راست چوٹ کی گئی تھی اور بس ہم سنک گئے، ہم نے تہیہ کر لیا کہ اب چاہے کچھ بھی ہو ہم ایک عدد رسالہ نہ صرف یہ کہ جاری کریں گے بلکہ اسے باقاعدگی سے شائع کر کے قولِ مذکورہ کا منھ توڑ جواب دیں گے۔ ہم نے اپنے علمی و ادبی ماہنامہ کا اجراء بڑی دھوم دھام سے کیا۔ ہم خوش تھے کہ جس کام کا بیڑہ ہم نے اٹھایا ہے اس کی پہلی منزل بخوبی سر ہو گئی۔ ہمارا نیا نیا حوصلہ کچھ دوست احباب کا تعاون اور کچھ اہالیانِ شہر کی حوصلہ افزائی یکے بعد دیگرے تین شمارے چل نکلے۔ اس کے بعد معاملہ سرد پڑتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ لیکن ہم نے ہمت نہیں ہاری اور اپنا کام جاری رکھا۔ پانچواں شمارہ منظرِ عام پر آیا تو صاحبِ ذوق خریدار کنی کاٹنے لگے۔ چھٹے شمارے کی اشاعت پر پبلشر آنکھیں چرانے لگے۔ ساتواں شمارہ منظرِ عام پر آیا تو روزانہ ملنے جلنے والے دوست احباب بے تعلقی برتنے لگے۔ اس حوصلہ شکن ماحول کے باوجود ہم نے کچھ اور دم مارا اور آٹھواں شمارہ شائع کر دیا۔ اس شمارے کی کاپیاں چھپ کر گھر آئیں تو بیگم نے اپنی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جس کام کو بڑے بڑے سورما نہیں کر پائے اس کام کا بیڑا ہم نے کیوں اٹھا لیا ہے اور یہ کہ اس طرح ہم معاشی خودکشی کر رہے ہیں لیکن ہم نے بیگم کی ناراضگی کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ کیونکہ ہمارے ذہن میں کسی مفکر کا یہ قول محفوظ تھا کہ :

"Behind every successful man stands a woman telling him that he is wrong.

لیکن جب آٹھواں شمارہ لینے ایجنٹ ہمارے گھر نہیں آیا تو ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہ کر سکے کہ ہمارا رسالہ کچھ ضرورت سے زیادہ لگا اور اگر اسے سنبھالا نہیں گیا تو یہ منہ کے بل گر پڑے گا اور ہماری جگ ہنسائی ہو جائے گی۔ "کیا کیا جائے" "کہ ہمارا رسالہ چل نکلے" جب ہم نے اس نکتہ پر غور کیا تو یہ بنیادی بات ہمارے ذہن میں آئی کہ اگر ہم اپنے رسالے کو ڈائجسٹ میں تبدیل کر دیں تو ہماری ڈوبتی نیا تیر سکتی ہے۔ فی زمانہ زندگی کے ہر شعبے میں ملاوٹ کا دور دورہ ہے تو [illegible] علمی و ادبی رسالہ کیسے ہضم ہو سکتا ہے؟ انسان پر زندگی کا دباؤ بڑھ گیا ہے اس دباؤ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے کے لیے وہ ہلکی پھلکی چیزیں پسند کرنے لگا ہے مثلاً ہلکی پھلکی غذا، ہلکا پھلکا لباس، ہلکی پھلکی موسیقی اور ہلکی پھلکی تفریح [illegible] سے اسے ادب بھی ہلکا پھلکا چاہیے۔

ہم نے اپنے علمی و ادبی ماہنامے کو ڈائجسٹ میں تبدیل کر دیا۔ اب ہمارے ماہنامے میں [illegible] کرتا ہے۔ خواص کی ہم نے کوئی پروا نہیں کی تھی۔ آخر ان کی تعداد ہی کتنی ہے؟ اکثریت عام لوگوں کی ہے اور یہ اکثریت اتنی طاقت رکھتی ہے کہ کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کو کسی ملک کا سربراہ بنا دے۔ تو کیا ان کے بھروسے ہمارا ایک اردو ماہنامہ نہیں چل سکتا؟

اب جب ہم اپنے رسالے کا پہلا سالنامہ شائع کرنے کی تیاری میں ہیں۔ ہمیں اطمینان محسوس ہو رہا ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہمارا رسالہ چل نکلے گا۔ قارئین کے بے شمار خطوط سے ہمیں اندازہ ہوا کہ ہمارے رسالے کی کھپت میں "رو برو" کالم کا بڑا ہاتھ ہے جس کے تحت ہم قارئین کے سوالات کے جوابات دیتے ہیں۔ چند کرارے سوالات اور ان کے جوابات پیش خدمت ہیں۔ ملاحظہ کیجیے، محظوظ ہوئیے اور دعا کیجیے کہ ہمارا ڈائجسٹ اسی طرح باقاعدگی سے شائع ہوتا رہے:

سوال: ہوس پر اظہار خیال فرمائیے؟

جواب: ہوس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس کا معاملہ بینک کے چیک کی طرح ہے جس پر بڑی سے بڑی رقم کے ساتھ "only" لکھا جاتا ہے۔

سوال: آزاد نظم کیا ہے؟

جواب: دیوانے کے ہاتھ کا پتھر جو خود اس کے آ لگے۔

سوال: کوٹ پہننے کے فوائد بیان کیجیے؟

جواب: کچھ لڑکے اس کی لالچ میں شادی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اس کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بیوی [illegible] جانے والا حساب کیا جا سکتا ہے۔ اس کی موجودگی میں قمیص اور بنیان کو آرام دیا جا سکتا ہے۔ [illegible] ستی استعمال کی جا سکتی ہے۔

سوال: ہر مرد کو دوسرے کی بیوی کیوں اچھی لگتی ہے؟

جواب: کیوں کہ وہ دوسرے کی بیوی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی صورت حال ایسی بھی ہو جاتی ہے۔ امریکی مزاحیہ اداکار [illegible] کی بیوی نے شکایت کی۔ "شادی کے بعد سرد مہری برتتے ہو۔"

گروا یو مارکس نے جواب دیا "ڈارلنگ تمہیں یاد ہوگا میں نے پہلے ہی بتادیا تھا کہ شادی شدہ عورتوں سے مجھے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔"

سوال: ادب اور سیاست میں کیا فرق ہے؟

جواب: ادب میں بھی اب سیاست کا عمل دخل ہو گیا ہے، لیکن سیاست میں پہلے ہی کی طرح آج بھی کسی کا کوئی ادب اور لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ جیسی "ابن الوقت" ہیں۔

سوال: میرے HUSBAND پہلے مجھے پیار سے روزی کہتے تھے، کچھ دنوں سے NAUGHTY CAT کہنے لگے ہیں۔ ایسا کیوں؟

جواب: پتہ لگائیے وہ کون سی عورت ہے جسے آپ کے HUSBAND پیار سے NAUGHTY CAT کہتے ہیں۔

سوال: کیا شادی کرنا ضروری ہے؟

جواب: جی نہیں! مشہور ناول نگار میری کوریلی زندگی بھر کنواری رہی۔ اس کی کوئی سہیلی وجہ پوچھتی تو وہ جواب دیتی "میرے پاس تین پالتو جانور ہیں جو وہی کام کرتے ہیں جو شوہر کرے گا۔ میرے پاس ایک کتا ہے جو روزانہ صبح غراتا ہے، ایک طوطا ہے جو روزانہ قسمیں کھاتا ہے اور ایک بلا ہے جو ہر رات دیر سے گھر واپس آتی ہے۔"

سوال: "دن دونی رات چوگنی ترقی کرنا" اس کہاوت کی وضاحت کیجیے؟

جواب: ہماری نظر میں اس کہاوت کی صحت مشکوک ہے۔ رات میں چوگنی ترقی کیسے ہو سکتی ہے جب کہ اس وقت آدمی سوتا ہے۔ یہ کہاوت کسی چور، ڈاکو یا اسمگلر کی تخلیق کردہ معلوم ہوتی ہے کیوں کہ رات میں ہی لوگ کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں۔

سوال: میں پیار محبت کو زندگی کے لیے ضروری سمجھتی ہوں۔ کیا آپ بھی پیار محبت کے قائل ہیں؟

جواب: ہم نے قارئین سے کتنی بار کہا ہے کہ اپنی بات صاف صاف اور تفصیل سے لکھیں خط و کتابت پوشیدہ رکھی جائے گی

سوال: کیا بیوی شوہر سے بھی اپنی اصل عمر چھپاتی ہے؟؟؟

جواب: جی ہاں۔ وہ جانتی ہے کہ اس کی اصل عمر معلوم ہونے پر شوہر اپنی اصل تنخواہ چھپانے لگے گا۔

سوال: لڑکیاں گالوں پر غازہ کیوں لگاتی ہیں؟

جواب: مردوں کی توجہ چہرے پر مرکوز کرنے کے لیے اور لمبی چوٹی کے نقلی بالوں کی طرف سے دھیان ہٹانے کے لیے۔

سوال: عورت اور مرد میں کیا فرق ہے؟

جواب: مرد کسی بات پر عورت کی پٹائی کر دے تو عورت رو رو کر ہنگامہ کھڑا کر دیتی ہے، سارا محلہ جمع کر لیتی ہے۔ اگر مرد عورت

کے ہاتھوں پٹ جائے تو وہ ایسا کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ اس کے پاس سب کچھ خاموشی سے برداشت کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا (کہ دوبارہ نہ پٹ جائے)

سوال: میاں بیوی زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں تو بچے اور ساس سسر؟

جواب: بچے چین (CHAIN) ہیں جو دونوں پہیوں کا تال میل بنائے رکھتے ہیں۔ سسر اس گاڑی کا اگلا بریک ہے اور ساس پچھلا۔

سوال: کیا مرد کو شادی کے بعد عقل آجاتی ہے؟

جواب: جی ہاں، لیکن آہستہ آہستہ اسی لیے تو بعض بیویاں طلاق لے کر چھٹکارا حاصل کرلیتی ہیں کیوں کہ وہ عقل مند مرد پسند نہیں کرتیں۔

سوال: بیوٹی پارلر میں عموماً خوب صورت لڑکیاں ہی سنورنے جاتی ہیں، ایسا کیوں؟

جواب: ہمارے خیال میں اس کی دو وجوہات ہیں ایک تو اپنے سے زیادہ خوب صورت لڑکی سے مقابلہ آرائی کا شوق، دوسرے سیرت کی خوب صورتی کی کمی کو جسمانی خوب صورتی سے پورا کرنے کی خواہش اور ہاں، آپ کے سوال میں چھپے ہوئے اس خیال سے ہم قطعی متفق نہیں کہ لڑکیاں بدصورت بھی ہوا کرتی ہیں۔

سوال: جن چیزوں کے اشتہارات آپ اپنے رسالہ میں شائع کرتے ہیں وہ سب میں نے استعمال کی ہیں اور بڑے افسوس کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ وہ تمام چیزیں انتہائی گھٹیا ثابت ہوئی ہیں کیا یہ سراسر دھوکہ دہی نہیں ہے جس میں ان چیزوں کو بنانے والی کمپنیوں کے ساتھ ساتھ آپ خود بھی شامل ہیں؟

جواب: ہمیں اشتہار چھاپنے کے لیے پیسے ملتے ہیں ان چیزوں کو استعمال کرنے کے لیے نہیں۔ کسی چیز کے گھٹیا نکلنے کے معاملے میں ہم قطعی ذمے دار نہیں ہیں۔ کیا آپ نے پہلے صفحہ پر شائع شدہ یہ عبارت کبھی نہیں پڑھی کہ "رسالے میں شائع شدہ مواد سے مدیر کا اتفاق ضروری نہیں ہے۔"

پرویز یداللہ مہدی

یہ ہے بامبے میری جان

اگر مجنوں میاں ہڑتال کرتے

تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ مجنوں، فرہاد، مہیوال اور رانجھا جیسے تاریخی عاشق جن کا وجود، جغرافیائی اعتبار سے آج بھی قیاس ہی کے اردگرد منڈلاتا نظر آتا ہے، ہڑتال جیسے کارآمد گُر سے واقف نہیں تھے۔ ہو سکتا ہے ان کے زمانے میں ہڑتال کا موجودہ تصور، بلکہ . . . . پھر سے کوئی تصور ہی نہ رہا ہو ورنہ یہ بیچارے یوں تاشا دو نامراد، دنیا سے سدھار کر بہت سارے ہندوستانی فلم کہانیوں کو جن میں سے بیشتر "پٹی" بننے کی بھی اہل نہیں، کر دیتی" نہ بناتے ——— ذرا تصور کیجیے، لیلیٰ کے ظالم باپ کے انکار پر میاں مجنوں بجائے صحرا نوردی کے، قصرِ لیلیٰ کے روبرو "دھرنا" دے کر بیٹھ جاتے اور پھر اس کے سنگ دل باپ کا "گھیراؤ" کر کے اس کا مرنا جینا عذاب کر دیتے اس پر بھی اگر ظالم کا دل موم نہ ہوتا تو پتھراؤ کر کے قصرِ لیلیٰ کی اینٹ سے اینٹ، پتھر سے پتھر اور کانچ سے کانچ بجا دیتے۔ نتیجہ ان ہڑتالی مارچ کا یہ ہوتا کہ لیلیٰ مجنوں کی شادی خانہ آبادی ہو جاتی۔ دونوں دھڑا دھڑ بچے پیدا کرتے اور لیلیٰ کے اباجان اپنے نواسے، نواسیوں کو گود لیوں کھلاتے، جھلاتے، نہلاتے دھلاتے، یوں اپنی باقی عمر بتاتے، بقول شاعر

اگر مجنوں میاں ہڑتال کرتے   تو پھر لیلیٰ کے ابّا آہ بھرتے!

سچ پوچھیے تو ہڑتال کو واقعی جس زمانے میں معرضِ وجود میں آنا چاہیے تھا وہ دراصل بیتا ہوا زمانہ تھا، کیوں کہ اس زمانے میں عشق و عاشقی کا سلسلہ مکتب ہی سے شروع ہو جاتا تھا بلکہ عشق" بہ حیثیت لازمی مضمون کے نصاب میں شامل ہوا کرتا تھا۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے فلم لیلیٰ مجنوں کے اولین ایڈیشن میں مکتب کا ایک منظر دکھایا گیا تھا۔ جہاں لیلیٰ مجنوں دونوں ہی ایک ہی جماعت میں پڑھتے ہیں بلکہ پڑھتے کم اور ایک دوسرے کو گھورتے زیادہ ہیں عمر کے اعتبار سے اگرچہ ابھی نابالغ ہیں لیکن محبت کی آگ چوں کہ پیدائشی ہے اس لیے ماشاءاللہ ذہنی طور پر پیدائشی بالغ ہیں۔ جب مولوی صاحب جو مولانا اسمٰعیل میرٹھی مرحوم کے ڈپلی کیٹ معلوم ہوتے ہیں کسی غلطی پر میاں مجنوں کے بید لگاتے ہیں تو نشانات لیلیٰ کی نازک ہتھیلی پر ابھر آتے ہیں جنھیں دیکھ کر تمام فلم بین یعنی جملہ حاضرین و ناظرین، خصوصاً خواتین آج بھی دھاڑیں مار مار کر روتی ہیں ——— خیر یہ سب اگلے وقتوں کی باتیں ہیں، فرشتوں کے قصے ہیں، جبکہ دورِ حاضر اس قدر برق رفتار ہے کہ یار لوگوں کو بیوی سے بھی عشق کرنے کی فرصت نہیں ملتی ویسے بیوی سے عشق کرنا ایک ایسی حماقت ہے جو کم از کم

...ی صحیح الدماغ آدمی سے سرزد نہیں ہو سکتی بلکہ اپنی بیوی سے عشق کرنا ایسا ہی ہے جیسے اپنی جیب خود ہی صاف کر لینا یا اپنے ہی
...یں دیوا ربچاند کر داخل ہونا" تاہم "بمبئی" کے اونچے طبقے کی ترقی یافتہ سوسائٹی میں بیوی سے عشق کرنا فیشن میں ضرور داخل
...، لیکن شرط یہ ہے کہ بیوی اپنی نہ ہو! اس مخرب اخلاق فیشن کے خلاف کسی نہ کسی گوشے سے کوئی احتجاج بلند ہوتا ہے، نہ موجہ
...ہے، نہ ہڑتال کی دھمکی سنائی دیتی ہے بلکہ مشہور قسم کے ہڑتالیے بے شرمی کے یہ مظاہرے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی یوں انجان
بن جاتے ہیں گویا:

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا!!

ایک ہڑتال

۱ آدمی بنیادی طور پر بھوک پیاس کا غلام ہے اور بھوک پیاس بھی کوئی ایسی ویسی نہیں، طرح طرح کی، قسم قسم کی جیسے پیٹ
بھوک، دولت کی بھوک، عزت کی بھوک، نام و نمود کی بھوک، شہرت کی بھوک، شہوت کی بھوک، وغیرہ وغیرہ، تاہم پیٹ
بھوک دیگر تمام بھوکوں پر ہمیشہ سے غالب رہی ہے اس لیے کہا جاتا ہے کہ جب پیٹ بھرا ہو تو آدمی کو بھری بھری سوجھتی ہے
پیٹ کی بھوک مٹتے ہی دوسری تمام بھوکیں انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتی ہیں گویا تمام بھوکیں پیٹ کی بھوک کی تابع و محکوم ہوتی
تب ہی تو دکن میں یہ کہاوت مشہور ہے کہ "پیٹ میں پڑا دانہ، تو بھائی ہوا اُتانا" (اُتانا یعنی اترانا کسی کو خاطر میں نہ لانا)!
پیٹ کی بھوک چوں کہ سارے فساد کی اصل جڑ ہوتی ہے۔ اس لیے اگر "ام الفساد" کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ اس
اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ بھوک کی بھٹی میں سلگنے والا اشرف المخلوق جانے ان جانے ایسی حرکتیں
بیٹھتا ہے جو صرف جانوروں، بالخصوص درندوں اور گدھوں والی ہے، سرزد ہوتی ہیں جیسے ہونکنا، جھپٹنا، نوچنا، کاٹنا، چیرنا
نا وغیرہ گویا بھوک کی بھٹی اچھے خاصے دوپائے کو چوپائے میں بدل کر رکھ دیتی ہے۔ نتیجتاً بھوکا آدمی نہ دین کا رہتا ہے نہ دنیا کا
... کا منکر ہو جاتا ہے۔ تب ہی تو کہا جاتا ہے کہ بھوکے بھجن نہ ہووے گوپالا۔ اسی لیے بھوکے آدمی سے سبھی کو ہمدردی ہوتی
۔ دنیا کا ہر دھرم، ہر مذہب، بھوکے کو بھر پیٹ کھانا کھلانے کی پُرزور تلقین کرتا ہے۔
انسان کی روزمرہ زندگی میں بھوک کی اہمیت کو دیکھ کر ہی غالباً انجمنِ ہڑتال کے ذہن میں پہلے پہل بھوک ہڑتال کا خیال
ہوگا۔ اس کی فی الفور تاثیر کا اندازہ محض اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہڑتال پر بیٹھے ہوئے شخص واحد کی بھوک پیاس،
...روں کی بھوک پیاس پر اس قدر اثر انداز ہوتی ہے کہ لوگ باگ بنا سوچے سمجھے اپنی تمام تر ہمدردیاں متاثرہ شخص کے دامن میں
ساری گالیاں متعلقہ انتظامیہ کی جھولی میں جھونک دیتے ہیں۔ بھوک ہڑتال سے جہاں بہت سارے متنازعہ مسائل حل ہوتے
ہیں، شخص مذکورہ کی نا مُرادی کا مسئلہ بھی اپنے آپ حل ہو جاتا ہے چناں چہ مو خرالذکر جمتکار نے ڈائٹنگ کے شائقین کو اس قدر
...ر کیا کہ بمبئی کے سارے پیٹ بھرے چربی زدہ لوگ بھوک ہڑتال کا بہانہ ڈھونڈنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں بھوک
ال کی تاثیر بھی بڑی حد تک کم ہو گئی اور لوگوں کی ہمدردی اور گالیوں کے اسٹاک کی ترتیب بھی اُلٹ گئی۔!!

غلام جیلانی
(حیدرآباد)

ہندباد کا پہلا اور آخری سفر

(پہلی قسط)

یہ بھی محض اتفاق تھا کہ سندباد جہازی کے ساتویں سفر سننے کے بعد اور شکم سیر ہو کر دستر خوان سے اٹھنے کے بعد، جب سندباد نے ہندباد کو محل سرا کے پیش دالان کے اجلے فرش پر دعوتِ استراحت دی تو حقے کا ایک ایک کش ہی لگا پائے تھے کہ سندباد اور ہندباد اپنے اپنے گاؤ تکیوں سے ٹیک لگا کر دونوں ایسی گہری نیند کی آغوش میں چلے گئے کہ کچھ پتہ نہ چلا کتنا عرصہ کتنی صدیاں بیت گئیں۔ راوی کا کہنا ہے کہ جب وہ بیدار ہوئے تو سارا زمانہ، ملک و شہر، ساری دنیا بلکہ آسمان تک بدلا ہوا تھا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ بیسویں صدی کا چل چلاؤ ہے۔ دونوں حیران حیران رہ گئے اور اپنی اپنی انگلیاں دانتوں میں دبا لیں۔ پھر یکایک دم سے تڑپ کر چیخ اٹھے اور دو زانو ہو بیٹھے۔

ہندباد بولا: "یا پیر و مرشد، آپ کے پاس تو مال و دولت، محل، نوکر چاکر، موٹریں، فرج، ٹی وی بلکہ ایئر کنڈیشنڈ یا سب ضرورت کی ہر چیز موجود ہے اور یہ ساری دولت آپ نے سات سفر کر کے، جان جوکھم میں ڈال کر کمائی ہے اور یہ کہ اس کمائی کا ثبوت بھی انکم ٹیکس والوں کو بتانے کے لیے موجود ہے مگر میں اب کیا کروں ——— ! میں غربت سے تنگ آچکا ہوں۔ زمانہ بھی بدل چکا ہے ——— مجھے کوئی راہ سمجھائیے کہ پلک جھپکتے میں امیر بن جاؤں اور آپ کی طرح بے فکری کی زندگی گزار سکوں۔"

"سفر پر نکل جاؤ۔"

"ایں ——— ؟ مگر اب تو ساری دنیا، سارے ملک، ایک ایک جزیرہ دریافت ہو چکا ہے۔ میں کس سمت میں، کس ملک یا جزیرے کی دریافت کے لیے جاؤں؟"

"دریافت کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔" سندباد نے بڑے اعتماد سے کہا ——— "تم نہیں جانتے ہندباد، دنیا کا جغرافیہ بدل چکا ہے۔ پرانے ملک غائب ہو چکے ہیں اور نئے ملک پیدا ہو گئے ہیں۔"

ہندباد کی دلچسپی بڑھی ——— "کیا آپ کو کسی نئے ملک کا پتہ معلوم ہے؟"

سندباد نے جواب دیا ——— "ہاں۔ یہاں سے جانب شمال ایک ایسا ہی نیا ملک ہے جہاں کی سیاحت تمہاری کایا پلٹ کر دے گی اور تمہاری صحت، افلاس بلکہ معلومات عامہ، ہر چیز کا علاج کر دے ——— وہاں کے

لگ یہاں والے بلکہ نیک ہیں۔"

ہندباد خوشی سے بے چین ہوا تھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا ——— "اے آقائے نیک اطوار، ناچیز اجازت چاہتا ہے تاکہ فوراً کوچ کی تیاری کرے۔ زادِ راہ اور جہاز کی فکر کرے ...... کتنے دن کا سفر ہوگا؟"

سندباد نے مسکرا کر ہندباد کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھینچ کر بٹھا لیا ——— "اے عزیزِ من - یہ سفر اب چشمِ زدن میں ہو جائے گا اور سمندر سے نہیں، تمھیں ہوا میں اڑ کر جانا ہوگا۔"

"لیکن وہ عقاب جس کی پیٹھ پر بیٹھ کر آپ اس جزیرے سے واپس آئے تھے ...... چوتھے سفر میں نہیں پانچویں ...... نہیں نہیں شاید چھٹا سفر تھا۔ خیر چھوڑیئے - وہ عقاب تو اب آپ کے پاس نہیں ہے۔"

سندباد بولا" اب اس عقاب سے ہزاروں گنا بڑے پرندوں کے ذریعے سفر کیا جاتا ہے اور اس کی پیٹھ پر نہیں، بلکہ پیٹ کے اندر بیٹھ کر ...... تم ان باتوں کی فکر نہ کرو۔ اب تمھارے اس سفر کا سارا انتظام، چٹکی بجاتے میں ٹراویل ایجنسی کرے گی۔"

اور سندباد نے چٹکی کی بجائے تالی بجا کر خادم کے ذریعے ٹیلی فون منگوایا اور منٹوں میں ہندباد کے ہوائی سفر کا انتظام کر لیا۔ ہندباد محوِ مسرت بلکہ غرقِ حیرت ہو رہا تھا کہ سندباد نے بچا لیا۔

"لو یہ تھیلی کمر سے باندھ لو۔ اس میں اس ملک، بلکہ دنیا کے سارے نئے پرانے ملکوں کی کرنسیاں ہیں۔ اب میرے کسی کام کی نہیں رہیں۔ تم جی کھول کر خرچ کرو اور خوب عیش و تفریح کرو۔ تھیلی کی کرنسی جوں کی توں رہے گی! یہ تھیلی میں نے بحرِ ظلمات کے ایک وحشی جزیرے کے خطرناک غار میں پائی تھی۔"

اور جب دوسرے دن ہندباد جمبو جیٹ کی آرام دہ سیٹ پر بیٹھا اس پراسرار نئے ملک کی جانب پرواز کر رہا تھا، تو ایئر ہوسٹس کی دل نواز مسکراہٹ نے اس کی سیاحت کے تجسس کو اور بڑھا دیا۔

اس کے برابر کی سیٹوں پر دو تنومند آدمی بیٹھے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی اسی ملک کو جا رہے تھے۔ جب سب کے سامنے کے سامنے بھی لنچ کی کشتیاں آئیں تو ان کی تہی دامنی دیکھ کر دونوں نے بڑی مایوس لیکن ملتجی نظروں سے لانے والی حسینہ کی طرف دیکھا اور جانے کیا سرگوشی کی لیکن ہندباد نے دیکھا کہ ان کے سامنے کی کشتی خالی ہوتے ہی، دوسری کشتی آ جاتی، تیسری کشتی کے بعد انھوں نے پانی اور چائے پی کر ڈکاریں لیں۔ پھر خدا کا شکر ادا کیا ——— تب ہندباد کو یاد آیا کہ اس کے سامنے کی کشتی تو رکھی ہے۔

ہندباد کو بڑا تعجب ہوا جب واقعی چشمِ زدن میں ہوائی جہاز کے اندر اعلان ہوا کہ وہ منزلِ مقصود پر پہنچ چکے ہیں۔ یہ بڑا اور تاریخی شہر تھا جو ملک کے شمالی حصے میں واقع تھا۔

ہندباد بھی اپنے ساتھی مسافروں کے ساتھ ایئرپورٹ سے باہر نکل آیا۔ اسے حیرت ہوئی کہ باہر آنے سے پہلے کسی جگہ کسی نے روپے طلب نہیں کیے۔ ورنہ اس کے اکثر ساتھی وہاں کے لوگوں کو روپے دے رہے تھے۔ شاید اس ملک میں انعام و اکرام کا رواج زیادہ عام ہے، اس نے سوچا اور یہ بھی کہ یہاں دولت کی کمی نہیں ہے۔ ہندباد کو بڑی طمانیت ہوئی۔

باہر اس کے انتظار میں ہوٹل کی موٹر کھڑی تھی، جہاں اسے ٹھہرنا تھا۔ ساتھ ہی ہوٹل کا گائیڈ بھی تھا۔ علی۔ علی ہندباد کو بہت پسند آیا بلکہ اتنا پسند آیا کہ بعد میں اپنے پورے ملک کی سیاحت کے دوران بھی اسے ساتھ رکھا۔ دونوں میں دوستی اور ذہنی رفاقت بڑی تیزی سے پیدا ہو گئی تھی۔

جب ان کی موٹر شہر کی مختلف سڑکوں سے گزر رہی تھی تو ہندباد نے دیکھا کہ بازار کی ہر تیسری چوتھی دکان پر کھانا تیار ہو رہا تھا۔ بڑے بڑے بگونوں میں سے بھاپ کے ساتھ بھنے ہوئے گوشت کی بے قرار کر دینے والی خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ دکانوں پر کچھ اس طرح لکھا ہوا تھا: سستا گوشت، سستا مرغ۔ کباب۔ قورمہ۔ کڑھائی گوشت، بڑا تکہ، چھوٹا تکہ، صرف تکہ، بالٹی گوشت، بالٹی مرغ، مستی خان، مسٹر یم گاودی . . .

علی نے ہندباد کے استعجاب کو بھانپ کر جلدی سے بتایا کہ آخری دو نام دراصل دکان کے آگے دیوار پر لکھے ہوئے فلموں کے اشتہار ہیں، جو بورڈ کی سیدھ میں آ گئے ہیں۔ گوشت کی کوئی ڈشیں نہیں ہیں۔

ہوٹل پہنچتے پہنچتے ہندباد نے محسوس کر لیا کہ اس ملک میں ماکولات کی بھی کمی نہیں ہے۔ اور اس کی طمانیت میں اور اضافہ ہوا۔

خود ہوٹل بڑا شاندار تھا۔ ہندباد کے کمرے میں عیش و آرام کی ہر چیز موجود تھی۔

"کیا یہاں کی تمام ہوٹلیں ایسی ہی آرام دہ ہوتی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ فائیو اسٹار ہوٹل ہے۔ دوسری کم تر درجے کی اور سستی ہوتی ہیں۔"

"فائیو اسٹار!" ہندباد کی سمجھ میں نہیں آیا۔ "صرف فائیو اسٹار کیوں؟ سکس یا سیون کیوں نہیں؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم ——" علی بولا "کبھی سوچا ہی نہیں۔"

شام کو تازہ دم ہو کر ہندباد علی کے ساتھ شہر کی سیر کو نکلا تو سب سے پہلے اس نے موٹر میں بجنے والے مغربی موسیقی کے کیسٹ کو بند کروا دیا۔ جس پر ڈرائیور نے پلٹ کر اسے دیکھا بھی۔ تعجب سے، یا غصے سے، پتہ نہیں۔

بعد میں ہندباد کو پتہ چلا کہ اس ملک میں ٹرانسپورٹ بسوں، ویگنوں، اور ایرکنڈیشنڈ کوچوں میں سفر کرنے والوں کو گانوں کے کیسٹس لازماً سننے پڑتے ہیں بلکہ گاڑی کے انجن سے پہلے ٹیپ اسٹارٹ ہو جاتا ہے اور جو گانے بجتے ہیں، نوے فی صدی دوسرے ملکوں کے ہوتے ہیں اور اتنی اونچی آواز میں کہ کان پھٹنے لگیں۔ ہندباد نے ایک دفعہ پوچھا تھا —— "آخر اس ملک کی موسیقی کیوں نہیں سنائی جاتی؟ یہاں بھی تو ایک سے ایک بڑے آرٹسٹ، نامور استاد، غزل گو اور کلاسیکل دونوں کے ماہرین پیدا ہوتے ہیں، بلکہ بقید حیات ہیں . . . . . . ان کے فن اور اسٹائل کو دوسرے ملک اپنا رہے ہیں . . . . . پھر . . . . . ؟"

"آپ سمجھے نہیں۔ آپ نے یہاں، اس ملک میں بنی ہوئی کتنی چیزیں دیکھی ہیں؟ —— دیکھی ہے کوئی چیز؟ —— موٹر، فریج، گھڑی، جوتے، کپڑے . . . . دل، دماغ . . . . . ؟ —— تو پھر موسیقی پر کیوں

اعتراض ہے آپ کو؟"

"لیکن مغرب زدہ موسیقی کون پسند کرتا ہوگا؟"

"کوئی بھی نہیں۔" علی نے اطمینان سے جواب دیا ــــ ٹھہریے۔ اتنے حیران ہونے کی کیا بات ہے [illegible] فیشن
نمائش، اور پوزیشن بھی کوئی چیز ہے۔ اب اتنے سارے لوگ، جن میں خاصی تعداد خواتین کی ہوتی ہے [illegible] پولس
کے ڈنڈے کھاتے ہوئے دن دن بھر دھوپ میں بیٹھ کر کرکٹ کا میچ نہیں دیکھتے ہیں بس ــــ

بہت دنوں بعد، ملک کی تفصیلی سیاحت کر چکنے کے بعد، سندباد پر عقدہ کھلا کہ مسافروں [illegible] پر یہ ظلم
کیوں کیا جاتا ہے۔ یہاں ریل کا رواج بہت کم ہے ملک کی بڑی آبادی لاریوں یا آرام دہ کوچوں میں سفر کرتی ہے۔ دن
یا کوچ میں سوار ہوتے ہی مسافر کو سب سے پہلے کسی نمایاں جگہ کچھ اس طرح کے فقرے لکھے نظر آتے ہیں ــــ

"سفر شروع کرنے سے پہلے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لو۔ ہوسکتا ہے یہ تمہارا آخری سفر ہو۔"

"نہ انجن کی خوبی، نہ ڈرائیور کا کمال ہے ۔ چلی جارہی ہے خدا کے سہارے"

"اللہ نگہبان" ــ "اللہ بیلی" ــــ "موت کو یاد رکھو" ــــ "خدا حافظ" ۔ وغیرہ

اوورٹیک کرنے والی لاری کے پیچھے لکھا ہوتا ہے:ــــ

"مولا اپنا رکھوالا ــــ جلنے والے کا منہ کالا"

"حسد نہ کر ــ محنت کر"

ایک مرتبہ آٹو رکشا میں بیٹھتے ہی سندباد کی نظر چھت کے قریب اس شعر پر پڑی:

موت کے منہ میں بیٹھ کر خوشیاں منانے والو
حافظ خدا تمہارا رکشا میں جانے والو

(اس کو پڑھتے ہی سندباد نیچے اتر آیا تھا۔ رکشا میں بیٹھنے کی تمنا دل ہی میں رہ گئی۔

سندباد نے نوٹ کیا تھا کہ وہاں ہائی وے پر ہر گاڑی کی اوسط رفتار [illegible] ہوتی ہے۔
مسافر دم سادھے بیٹھتے ہیں۔ اکثر کی آنکھیں بند رہتی ہیں۔ شیطان کے کانوں کی نوعیت سے ڈرائیور [illegible] رکھنا
چاہتا ہے اور خود کو بھی نیند سے دور رکھتا ہے اور یہی باتیں جب سندباد نے علی کو بتائیں تو وہ دم بخود [illegible]
ہو کر دوبارہ سانس لیا تو کہنے لگا ــــ

"یہ نکتہ تو اس ملک میں رہتے ہوئے بھی میرے دماغ میں نہیں آیا تھا!"

لیکن علی کی بات پر سندباد کو مطلق حیرت نہیں ہوئی۔ ایسے بہت سے نکتے تھے جو وہاں کے دماغوں کی سمجھ سے بالا
تھے، اور بالائی نکتوں کو جو چند سمجھنے والے تھے ان کے اطراف عقیدت مندوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔

سندباد کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ شہر میں بلکہ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں مسجدوں کی کثرت ہے۔ ایک دفعہ

راستے میں اس نے دیکھا کہ دس بارہ گھروں کی چھوٹی سی آبادی ہے مگر مسجد ہے اور اس کے لمبے مینار پر چاروں سمتوں میں چار بڑے بڑے لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے ہیں۔ مذہب کے ساتھ اس جوشِ عقیدت کو دیکھ کر ہندباد خوشی سے پھولا نہیں سمایا۔ اور شاید ابھی اور پھولتا، لیکن معاً سڑک کے کنارے ایک بورڈ دیکھ کر اس پر رقت طاری ہوگئی۔ لکھا تھا "نماز پڑھو اس سے پہلے کہ تمھاری نماز پڑھائی جائے"۔ اور اس کے نیچے جنازے کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

ایک دن ہندباد کو علی کے ساتھ ایک نسبتاً چھوٹے سے شہر میں جانا پڑا۔ وہاں اسے سندباد کا دیا ہوا خط کسی پتے پر پہنچانا تھا۔ اس ملک میں دستور دیکھا کہ باہر سے آنے جانے والے کو ڈھیر سارے خط شخصی طور پر، ان کے پتے تلاش کرکے پہنچانے پڑتے ہیں حالاں کہ اس ملک میں خال خال ڈاک خانے اور لیٹر بکس بھی پائے جاتے ہیں۔

تو جب سندباد کا خط منزلِ مقصود پر پہنچا چکا تو شام ہو چلی تھی۔ علی نے بتایا کہ اس کے بھائی کا مکان اسی شہر میں ایک صاف ستھری جگہ واقع ہے۔ رات کی رات وہیں قیام کرکے صبح روانہ ہو جائیں گے۔ ہندباد نے اس تجویز کو بغیر کسی رسمی پس و پیش کے، فوراً ہزار جان بلکہ لاکھ جان سے قبول کرلیا۔ سیر و سیاحت ہی تو اس کے سفر کا مقصد تھا۔ ——— تو صاحبو۔ ہندباد علی کے بھائی کے یہاں ٹھہر گیا۔ نہادھو کر . . . آئے۔ کپڑے بدلے اور تازہ دم ہو کر چائے کا پہلا گھونٹ لیا ہی تھا کہ —— یکایک کہیں قریب ہی ایک لاؤڈ اسپیکر نہایت کرخت آواز میں پوری شدّت کے ساتھ بلبلا اٹھا۔ ہندباد کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ کر گر گئی۔ چونک کر دیکھا تو علی نے بتایا کہ مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔ ہندباد فوراً مودّبانہ کھڑا ہو گیا اور چہرے پر عقیدت کے آثار طاری کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔ لیکن دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ خدا اس موذن کو توفیق دے کہ جلد سے جلد اپنی اذان پوری کرے۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر سخت پریشانی ہوئی کہ جیسے ہی یہ اذان ختم ہوئی، کہیں سے اتنے ہی زور سے ایک دوسری اذان شروع ہوگئی اور اس کے ختم کرنے میں پہلے موذن سے زیادہ وقت لیا۔ جب اس کے بعد تیسری اذان شروع ہوئی تو علی بھی غسل کرکے آچکا تھا۔ ہندباد کا چہرہ دیکھ کر معاملہ بھانپ لیا۔ مسکرا کر کہنے لگا —— بس اس کے بعد ایک اذان اور باقی ہے . . . . . . بات یہ ہے کہ یہاں چاروں سمت، چار مسجدیں ہیں۔ مختلف مسلک کے نمازیوں کے لیے ہر مسلک کا نام مسجد کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے"۔

حیرت میں غلطاں و پیچاں، ہندباد نے یکبارگی سر جھٹک دیا اور علی کی امامت کرتے ہوئے نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ ان کی نماز ختم ہوگئی —— مگر لاؤڈ اسپیکر چپ نہیں ہوئے۔ کہیں نماز سنائی جا رہی تھی اور کہیں وعظ اور تھوڑی دیر بعد صرف وعظوں کے طوفان ایک دوسرے سے الجھ کر رہ گئے۔ —— غضب ناک لہجوں کی کرختگی میں بیٹھے ہوئے گلوں سے نکلنے والے زخمی الفاظ میدانِ جنگ کا سماں پیش کر رہے تھے۔ ہندباد ان سرخ آنکھوں، پھیلے ہوئے نتھنوں اور پھولے ہوئے گالوں کا تصوّر کر رہا تھا جو شدّت جذبات میں تھوک کے فوّارے اڑا رہے، الفاظ کے ان پتھروں کو لاؤڈ اسپیکروں میں سے لڑھکا رہے تھے۔ ایک دوسرے پر حملے ہو رہے تھے۔ باقاعدہ ڈائلاگ چل رہے تھے۔

ہندباد حیران و ششدر رہ گیا۔ اس کے لیے یہ نیا تجربہ تھا —— اس سے کسی نے کہا تھا کہ "مولوی" کے ہاتھ

میں مانگ رہے تھے ۔۔۔ خدا کی پناہ!

رات کو اس شہر کی گشت میں بھی ہندباد کو ایسی دکانیں ہر جگہ نظر آئیں جہاں بکرے اور دیگیں چڑھی ہوئی تھیں اور لوگ دکانوں کے اندر اور باہر بیٹھے یا کھڑے گوشت کھا رہے تھے۔

جب ہندباد اور علی گھر واپس لوٹے تو عشا کی اذانیں ہو چکی تھیں۔ نماز پڑھ کر دونوں نے کھانا کھایا۔ ہندباد نے صرف چپاتی اور دال پر اکتفا کیا۔ علی اس کی طبیعت اور عادتوں سے واقف ہو چکا تھا، اس لیے مسکرا کر چپ رہا ۔۔۔ "جناب، میری جگہ کوئی اور ہوتا تو آپ سے تعجب کے ساتھ پوچھتا ۔۔۔ کیسے آدمی ہو، اناج سے اناج کھاتے ہو؟!"

قہوے کے بعد سگریٹ پیتے ہوئے علی نے کہا ۔۔۔ "جناب ہندباد ۔۔۔ ہمارے یہاں ایسے عالم اور جید علما بھی موجود رہے ہیں کہ دین و مذہب، فلسفہ اور تصوّف میں ان کی فضیلت اور اہمیت کو ساری دنیا مانتی ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کہیں آپ ہمارے ملک کے بارے میں غلط رائے نہ قائم کر لیں۔"

ہندباد نے جواب دیا ۔۔۔ "نہیں میں ایسا نہیں کروں گا۔ کیوں کہ یہ حال تو ہمارے ملک میں بھی ہے۔ بس انیس بیس کا فرق ہے۔"

رات کے شاید دو بجے کا عمل تھا کہ ایک بندوق چلنے کی گرج دار آواز سے ہندباد چونک اٹھا۔ نیند کی نرم آغوش سے اچھل پڑا۔ ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک اور بندوق چھوٹی جیسے بالکل کان کے پاس۔ ساتھ ہی لوڈ اسپیکر چیخ اٹھا
"صاحبان۔ سلام علیکم۔ مبارک ہو۔ ۔ ۔ ۔ مسلمانو، رمضان کا چاند ہو گیا، ابھی ابھی خبر ملی ہے ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ماہ رمضان المبارک، شروع ہونے کی خوش خبری مبارک ہو ۔۔۔"

ہندباد نے مڑ کر دیکھا تو برابر کے پلنگ سے علی بولا ۔۔۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے! رمضان کا چاند تو کل نکلنے والا ہے ۔۔۔!"

"۔۔۔ اور برادران اسلام۔ اب رات کافی جا چکی ہے۔ سونے کا وقت باقی نہیں رہا۔ سحری کا انتظام شروع کرو ۔ ۔ ۔ ۔ چولھے سلگاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اٹھو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

۔۔۔ اور ہندباد جو نیند کی گولی کھا کر سویا تھا، پھر آہستہ آہستہ نیند کی باہوں میں واپس چلا گیا۔ کانوں میں آنے والی آواز جیسے کنویں میں ڈوبتی چلی گئی ۔۔۔ بے ربط ۔ ۔ ۔ ۔ بے ہنگم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عجیب سے جملے تیر رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔
"اب کھانا شروع کر دیجیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب جلدی کیجیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وقت کم ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بس آخری نوالہ لیجیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جلدی کیجیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سحری کا وقت ختم ہو رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بس ایک منٹ باقی ہے۔ اب اٹھ جائیے ۔ ۔ ۔ بیٹھ جائیے، لیٹ جائیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دفع ہو جائیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فنا ہو جائیے۔"

اور صبح جب وہ بیدار ہوا تو نو بج چکے تھے۔ ان آوازوں کی گشت پر خود ہی مسکرا اٹھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لاحول ولا، کیا کیا خرافات اختراع کر لیں دماغ نے ۔۔۔ لیکن کہیں ایک لاؤڈ اسپیکر میں اب بھی تقریر ہو رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ دور سے۔

"رمضان میں فجر کی نماز کے بعد وعظ ہوتا ہے ——— یا یوں کہیے کہ وعظوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ———" علی بھایا "اب کچھ دیر میں ختم ہو جائے گا۔"

ہندباد نہا دھو کر ناشتے کی میز پر بیٹھا تو یاد آیا کہ رمضان شروع ہو گیا ہے۔ علی، جس نے ناشتہ شروع ہی کیا تھا، مسکرا کر دیکھنے لگا۔ یکایک لاؤڈ اسپیکر سے گرج دار آواز ابھری ——— "حضرات متوجہ ہوں۔ کل چاند نہیں ہوا ہے۔ اطلاع غلط تھی۔ لہٰذا روزہ توڑ دو ——— ابھی اسی وقت۔" ——— کھٹ سے لاؤڈ اسپیکر بند۔

علی کی مسکراہٹ ہندباد کی حیرانی دیکھ کر پھیلتی چلی گئی۔ چہرے کے حدود اربعہ سے باہر ہوا چاہتی تھی کہ ایک دوسرا لاؤڈ اسپیکر دوسری سمت سے بیدار ہو اٹھا ——— گرج میں، طنز سے بھرپور ایک زہریلا تیر چھوٹا ——— "حاضرین ——— ہم نے پہلے ہی آگاہ کیا تھا آپ ان کی باتوں میں کبھی نہ آئیے۔" اور پھر کھٹ سے وہ بھی لاؤڈ اسپیکر بند۔

علی کی مسکراہٹ اب قہقہہ بن گئی اور چہرہ چھوڑ کر کمرے کی ایک دیوار سے دوسری تک پھیل گئی۔ ہندباد ہندباد بے چارہ، حق دق، بحرِ استعجاب میں غوطے کھا رہا تھا۔ میز پر سامنے رکھا ہوا کھانا بھول گیا!

دوسرے دن سے رمضان کا آغاز یقینی تھا۔ علی نے بتایا کہ ان کے ایک عزیز ہیں۔ رمضان شروع ہوتے ہی دفتر وفتر چھوڑ کر دور شمال میں ایک پہاڑی مقام پہ چلے جاتے ہیں، جہاں ان کے ایک دوست کا ہوٹل ہے۔ سارا مہینہ وہیں گزارتے ہیں۔ موسم ٹھنڈا، روزے چھوٹے، اور روزہ افطار و سحر شاندار۔ ۔ ۔ ۔"

ہندباد مسکرا دیا۔ "گویا رمضان کا مہینہ ان کے لیے ۔ ۔ ۔ ۔ ہر روز روزِ عید ۔ ۔ ۔ ۔ مگر ان کی نوکری؟"

"اجی نوکری کا کیا ہے۔ وہ چلتی رہتی ہے۔ رخصت بھی لینے کی ضرورت نہیں پڑی کبھی ان کو۔ ۔ ۔ آپ اتنے حیران کیوں ہو رہے ہیں! ابھی تو آپ کی سیاحت شروع ہوئی ہے۔ اب یہی دیکھیے ——— یہ جو میرے بھائی ہیں، جن کے یہاں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں ریلوے میں ملازم ہیں۔ پچیس سال کی سروس ہو گئی ہے۔ پچھلے دس سال سے اندرونی علاقوں میں جانے کہاں کہاں ان کے ٹرانسفر ہوتے رہے، مگر وہ یہیں رہے، یہاں ان کی زمینیں ہیں، کاروبار ہیں ——— نہایت نیک دل اور لوگوں میں ہر دل عزیز ہیں ——— خدا ترس مشہور ہیں۔ ہر مہینے کی دوسری تاریخ کو ہیڈ آفس جا کر تنخواہ لے آتے ہیں۔ ان دس برسوں میں ان کے چار پروموشن بھی ہو گئے۔ بھولے اتنے ہیں کہ انھیں اپنا موجودہ عہدہ پوسٹنگ کی جگہ اور تنخواہ بھی نہیں معلوم ——— آپ حیران ہو رہے ہیں؟!"

——— ہندباد نے حیران ہونا چھوڑ دیا اور اسی روز علی کے ساتھ ملک کے دیگر مقامات کی سیاحت کے لیے نکل گیا۔

رمضان کے احترام میں کھانے پینے کی تمام دکانیں اور ہوٹلیں بند دیکھ کر ہندباد کو بڑی خوشی ہوئی (حالاں کہ خود کو پریشانیوں میں مبتلا ہونا پڑا) ایک دن اخبار میں پڑھا کہ کسی جگہ پولیس نے آٹھ روزہ خوروں کو پکڑ کر سڑک پر مرغا بنا دیا۔ پھر انھیں لے جا کر مسجد میں چار گھنٹے تک مولویوں کی تقریریں سنوائیں۔ روزہ داروں کے ساتھ افطار میں شریک کروایا اور دوسرے دن روزے کا وعدہ لے کر گھر جانے دیا!

ہندباد کے چہرے سے خوشی رفو چکر ہوگئی۔ اپنے سیر و سیاحت کے پروگرام میں روحانیت کے تجربے کی خواہش کا کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔ پہلے تھا سے روزہ خور کی اصطلاح پر بڑا رنج ہوا۔ یہ کیا بات ہوئی! ...... جیسے گوشت خور، آدم خور۔ بھلا روزہ بھی کوئی ماکولاتی شے ہے جو...... ؟ اس سے روزہ چور کہیں بہتر ہے اور دوسرے یہ کہ دوران سفر کہیں سخت بھوک لگے تو کیا ہوگا ---- ؟

"خدا نے ہر مشکل کا حل بھی رکھا ہے" علی بولا "گھبرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔"

ایسے وقت آسان نسخہ یہ ہے کہ قریب ترین ریلوے اسٹیشن چلے جاؤ کہ حالت سفر میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے۔ صرف پلیٹ فارم کا ٹکٹ خریدنا پڑے گا۔"

اور اپنے بیان کی تصدیق کے لیے (یا شاید اسے بھوک ستا رہی تھی) اسی وقت ہندباد کو ساتھ لے کر [illegible] پر چلا گیا۔ وہاں ہندباد کو بڑا دلچسپ منظر نظر آیا۔ پلیٹ فارموں پر جگہ جگہ مختلف قسم کے کھانے تیار ہو رہے تھے۔ لوگوں کی بھیڑ ہے (آفس آورز میں) حالانکہ وہ کسی پلیٹ فارم پر کسی ٹرین کے آنے یا جانے کا وقت نہیں تھا۔ بہت سے لوگ تو بینچوں پر دراز سو رہے تھے۔

ہندباد اور علی بھی ایک اسٹال کے پاس چلے گئے۔ اسٹال والا بولا ---- "آپ جی بھر کر کھائیے پیجیے تو بھی کوئی نہ پولیس چیک کرے گی، اور صرف پلیٹ فارم ٹکٹ پر آنے والوں کو [illegible] جائے گی۔"

علی نے ہندباد کو دیکھا اور ہندباد نے علی کو اور جیسے یہ ضروری بات ذہن میں نوٹ کر کے پھر کھانے میں مشغول ہو گئے۔

(باقی آئندہ)

غزلیں

عبدالحفیظ لقب عمران
(امراوتی)

بس گیا جب سے وہ خیالوں میں
عمر گزری ہے ایڑے چالوں میں

اُلٹی بہنے لگی ہے گنگا آج
گورے شرما رہے ہیں کالوں میں

جب سے چسکا لگا ہے مچھلی کا
لُطف آتا نہیں نوالوں میں

مجھ سے آنکھیں ملا کے بات کریں
اتنی ہمت نہیں ہے سالوں میں

وہ اندھیروں میں کیا شریف بنیں
جرم کرتے ہیں جو اُجالوں میں

وصل کی ساری گھڑیاں بیت گئیں
کچھ جوابوں میں کچھ سوالوں میں

شیخ کی بھی اٹک گئی ہے نظر
گنگلے جیسے اس کے گالوں میں

جب نہیں ملتا ہوگا اُس کو قرار
کھوتی ہوگی مرے خیالوں میں

جل کے عاشق نے بددُعا دی اُسے
جُوئیں پڑ جائیں تیرے بالوں میں

حیثیت بھول کر لقب عمران
جا کے بیٹھا ہے باکمالوں میں!۔

مرزا کھونچ (بہار)

بادشاہی چھن گئی فرمان باقی رہ گیا
خود فریبی کے لیے سامان باقی رہ گیا

ایکتا کی آندھیاں اب اس طرح چلنے لگیں
جل گیا سارا نگر شمشان باقی رہ گیا

کاش ہو جائے کوئی تخلیق سو پرسنٹ مری
مرتے مرتے بس یہی ارمان باقی رہ گیا

مُفت کی اُس تیل مالش کا کرشمہ دیکھئے
سر پہ اب چٹیل نما میدان باقی رہ گیا

کرلیا ہے ہم نے چربہ میرؔ، مومنؔ، دردؔ کا
بس چچا غالبؔ کا اک دیوان باقی رہ گیا

چائے پانی کے بنا ہی اُٹھ گیا محفل سے آج
دوستوں پر کھونچؔ کا احسان باقی رہ گیا

سراج نرملی

قرض جتنا ملے، لے لیا کیجئے
بھول کر بھی نہ ہرگز ادا کیجئے

قسمیں کھانے لگے ہے گناہی کی جو
سب سے پہلے اُسی پہ شُبہ کیجئے

متقی میرے جیسے نہیں ہیں سب
ایسے کھل کر نہ سب سے [illegible] کیجئے

بیئر بوٹل کے پیسے جو ڈیو ہیں سراجؔ
آپ ابھی اور اسی وقت ادا کیجئے

SUE Z BEER L

تشطیراتِ مختار

مختار یوسفی
(مالیگاؤں۔ مہاراشٹرا)

دیکھا جو کہیں گرم نظر بزم عدو میں
وہ ڈانٹ گئے مجھ کو برابر سے نکل کر
(حسرت موہانی)

"دیکھا جو کہیں گرم نظر بزم عدو میں"
چچوں نے انھیں داد یہ دی داد اُچھل کر
موجودگی میری نہ گوارا ہوئی لیکن
"وہ ڈانٹ گئے مجھ کو برابر سے نکل کر"

○

شاعر سے بڑا دیکھا نہیں کوئی ہنر مند
اوروں کے بھی شعروں کے لگا لیتا ہے پیوند
(شاطر حیدرآبادی)

"شاعر سے بڑا دیکھا نہیں کوئی ہنر مند"
منٹوں ہی میں کر لیتا ہے مجمع کو وہ پابند
دنیا اُسے کہتی ہے ادب کا ہے رفو گر
"اوروں کے بھی شعروں کے لگا لیتا ہے پیوند"

○

یہ خبر میں نے پڑھی کل شام کے اخبار میں
ہیل والی سینڈل نے جیت لی جوتے سے جنگ
(ہرفن لکھنوی)

"یہ خبر میں نے پڑھی کل شام کے اخبار میں"
جس کو پڑھ کر [illegible] گی ہوئی دل کی [illegible]
شرم سے گردا [illegible] ایک مرد
"ہیل والی سینڈل نے جیت لی جوتے سے جنگ"

ہم نے شادی کی دُعا مانگی تھی اِک بار فقط
آج تک کرتے ہیں اُس اپنی دُعا سے توبہ
(خسروی)

"ہم نے شادی کی دُعا مانگی تھی اِک بار فقط"
اُس نے ہوتے ہی نکاح کر لی حیا سے توبہ
ہم کو بیگم بھی ملی ایسی کہ ہے ناک میں دم
"آج تک کرتے ہیں اُس اپنی دُعا سے توبہ"

○

اِک عدد بچے کا خرچہ سات سو کے آس پاس
اور اُستانی کی ٹوٹل سیلری دو سو پچاس
(سرفراز شاہد)

"اِک عدد بچے کا خرچہ سات سو کے آس پاس"
کیوں نہ ہو مغموم شوہر اور نجیبہ ہو ساس
اب بھکاری بھی ہزاروں میں کمانے لگ گیا
"اور اُستانی کی ٹوٹل سیلری دو سو پچاس"

○

کم نہیں کچھ یہ نوازش بھی مرے سرکار کی
ایک بیوی اور پھر بچے بھی دو سینکشن ہوئے
(افسوس اکولوی)

"[illegible] کچھ یہ نوازش بھی مرے سرکار کی"
جس کو سن کر خوش بہت ہی حضرتِ محسن ہوئے
[illegible] بھلا تھا ہر حکومت کے طفیل
"ایک بیوی اور پھر بچے بھی دو سینکشن ہوئے"

عباس متقی (حیدرآباد)

وہ جنھیں مغنی تبسم کہتے ہیں

جامعہ عثمانیہ کو اس بات پر بھی فخر حاصل ہے کہ یہاں کے لکچرر، ریڈر اور پروفیسر اپنے ناموں کے ذریعے اپنی جنس
کو پوشیدہ رکھنے میں پوری طرح کامیاب رہتے ہیں۔ چناں چہ ایک مدت تک ہم ڈاکٹر اشرف رفیع اور ڈاکٹر رفیع رؤف کو مرد
اور ڈاکٹر مغنی تبسم کو خاتون سمجھتے تھے لیکن جب جامعہ ہذا میں داخلہ لیا تو معلوم ہوا کہ اشرف رفیع اور رفیع رؤف منجملہ خواتین
ہیں اور مغنی تبسم کوئی حضرت ہیں۔

ڈاکٹر مغنی تبسم کو جب ہم نے پہلی دفعہ دیکھا تو ان کی قامت سے علم و فن اور شکل و شباہت سے ان کی عمر کا
ندازہ کرنے لگے اور پوری طرح ناکام رہے۔ قامت قیامت بھلے ہی نہ ہو لیکن قیامت علم قیامت سے کم نہیں۔ بہ پیش
ہرے کے پیچھے ایک نہایت تجربہ کار استاد، ادیب، شاعر اور تنقید نگار کو پایا۔ ایم۔ اے کے زمانے میں وہ ہمیں تنقید
ڑھاتے تھے۔ موصوف نے جو ہمیں پڑھایا ہے کسی صورت بھلایا نہیں جا سکتا۔ ۱۹۸۲ء کا یہ بیچ بڑا مردم خیز ثابت ہوا
ہاں چہ اس دور کا ایک طالب علم جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ کی صف میں شامل ہے۔ ہمارے بیچ میں قسیم الدین نسیم جو بعد میں
ریس ہوئے، ظہیر الزماں منیر اور تاتار خاں کے نام شوہدین کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں جو اپنے ادبا اپنے اساتذہ کے نام روشن
ر رہے ہیں۔ ہمیں پڑھانے والوں میں رفیعہ سلطانہ، مغنی تبسم، سید محمود قادری، صفدر علی بیگ، اختر سلطانہ خاں، اشرف
یع، محمد علی اثر جیسے بااثر اساتذہ تھے . . . . ہم تقریباً سبھوں سے ہل گئے
رسب ہم سے کھل گئے تھے لیکن ڈاکٹر مغنی تمام ہمیں ایسا قفل نظر آئے جس کی چابی کہیں کھو گئی ہو۔ ہم لاکھ چاہتے کہ حضرت
ے بے تکلف ہوں لیکن کیا مجال جو سرحد تکلف پار کر سکیں۔ ہم غالب تو تھے نہیں کہ ان سے کہتے:

ہم سے کھل جاؤ بہ وقت مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن

ری طبیعت میں بیباں، ادعائے اتفاق جہل بھی بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ لیکن جب ڈاکٹر صاحب کلاس میں حاضر ہوتے ہیں
پ نہیں بلکہ اژدھا سونگھ جاتا۔ ساری کلاس شہر خموشاں کا منظر پیش کرتی اور ہم مرحومین کا نظارہ۔ ہم کچھ بولنا چاہتے لیکن
ا نہ پاتے۔ کسی شرارت سے دوچار ہونا چاہتے لیکن تدبیر قبول ہو جاتی۔ دو ایک دفعہ ہم نے انھیں صدق دل سے استاد

سمجھ کر جھینپنا یا ایک سیاہ چشمے سے گھورتی ہوئی آنکھوں کی تاب نہ لاسکا اور خود کو مطلقہ خاتون کی طرح یا مرد مجذون کی طرح مجبور پایا۔ ہم سب اپنے اساتذہ سے باضابطہ گفتگو کرتے جو بحث کی حدوں کو چھوتی تا کہ صحیح نتائج تک ہماری یا پھر ہمارے اساتذہ کی رہنمائی ہوسکے لیکن مغنی صاحب کے لکچر میں ہم حیدرآبادی شائستہ بہوؤں کی طرح خاموش گویا ساس کا لکچر سنا کرتے۔

ڈاکٹر صاحب کا لکچر علمی اعتبار سے نہایت پُرمغز ہوتا، اگرچہ بے شمار مقامات پر خاموشی کے خود ساختہ شگاف نمودار ہوتے اور کافی کھلتے لیکن کیا کرتے ہر لکچرار اپنے نیچر سے مجبور ہے۔ درمیان میں سوال کرنے کی آزادی ضرور تھی لیکن ہندوستان کی آزادی کی طرح ہم غریبوں کو اس سے فائدہ کم ہی ہوتا۔ بعض وقت تو ایسا معلوم ہوتا گویا موصوف سو گئے ہیں اور بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا گویا وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہے ہیں۔ سیاہ شیشوں سے جھانک کر دیکھنا اور تصدیق بے خوابی و خواب تک پہنچنا ہمارے بس کا روگ نہیں تھا۔ اس کے لیے تو کوئی آنکھوں میں اترنے والا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں ارسطو اور افلاطون کو اس قدر پڑھایا ہے کہ اگر وہ ہمیں کہیں نظر آجائیں تو ہمیں پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ وہ ان حضرات بے بدل کو اس والہانہ انداز سے پڑھاتے کہ ہمیں شک گزرنے لگتا کہ کہیں ان سے موصوف کے قریبی تعلقات نہ رہے ہوں۔

"ارسطو سے ایلیٹ تک" وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جو ہمارے لیے عالم آرا ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب اس کتاب کے ذریعے دنیا بھر کے فلسفے سے ہمیں آگاہ کرتے۔ یاد رہے کہ ابتدائی صفحات کی تشریح کرتے ہوئے جس بات کا اثبات کیا تھا آگے کے صفحات میں عین اس کی نفی ہو جاتی۔ شاید فلسفہ اسی کو کہتے ہیں۔

مغنی صاحب کو ہم نے سال میں دو چار دفعہ واقعی تبسم فرماتے ہوئے ضرور دیکھا ہے مگر وہ بھی اس قدر کہ باچھیں مکمل پھیلنے بھی نہیں پاتیں کہ سنگ کی طرح سکڑ جاتیں۔ یوں تو ہمارے دل میں بھی ہزاروں خواہشیں ہیں جن کے سبب بقول شاذ جینے کی رسم ادا کر رہے ہیں۔ ان خواہشات میں یہ بھی ایک خواہش ہے کہ ڈاکٹر مغنی تبسم کو ایک فلک شگاف نہ سہی لب شگاف قہقہہ لگاتے دیکھیں اور اس کے لیے ہماری آرزو ہے کہ کبھی ڈاکٹر صاحب کو چارلی چپلن کی "ماڈرن ٹائمز" دکھائیں اور ہم انھیں گھورتے بیٹھیں تاکہ پردۂ سیمیں کے منظر پر وہ بے ساختہ بلکہ بے تحاشہ قہقہہ لگادیں اور ہماری مراد بر آئے یا پھر ان کے آگے شوکت تھانوی کے "داماد" کو پیش کر دیں۔ اور اگر کچھ نہیں تو انھیں ابن خان کے شاہکار کا مشاہدہ کروائیں اور انتظار قہقہہ میں بدستور رخ تبسم پر نظریں جمائے بیٹھے رہیں شاید کسی بے ربط مکالمے پر وہ طنزاً ہی سہی قہقہہ لگادیں اور ہم فلاح کو پہنچیں۔ "سوال تک لڑکیوں کے تجربات ہیں یہ تمام کاروائیاں انھیں صرف اسم بامسمیٰ بنانے تک معاون ثابت ہونگی۔

یوں تو ہم نے بہت سارے لکچررس، ڈاکٹرس اور پروفیسرس کو قواعد و اصول کا پابند دیکھا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کے اصول ہمالیہ جیسے اونچے پائے گئے۔ وہ اپنے اصول پر پابندی کے لیے بالکل اسی طرح مجبور ہیں

جس طرح ہم روزانہ پابندی سے جب ہم ایم فل کر رہے تھے اور تحقیق کے لیے حیدرآباد کے کتب خانوں سے پالا پڑتا تھا۔ موپیڈ کے خراب ہونے پر بس میں آوارہ گردی کرنے لگے اور جب اس کے بڑھتے ہوئے کرائے نے بے بس کر دیا تو خیال آیا کیوں نہ بس پاس نکال لیا جائے تاکہ ریسرچ اسکالر ہونے کا کم از کم یہ فائدہ تو حاصل کر لیا جائے۔ اس خیال کو لیے ہوئے ہم ڈاکٹر صاحب کے اجلاس پر پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت بھی صدر شعبہ تھے جس طرح آج ہیں۔ عینک کے دبیز سیاہ شیشوں سے ہمیں حسب معمول گھورا۔ ہم نے مدعائے حاضری بیان کیا۔ کہنے لگے بس پاس کی سہولت ان لوگوں کے لیے ہے جو ایم۔ اے کر رہے ہیں اور کالج کو آتے ہیں۔ ریسرچ اسکالرس کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ اس دو ٹوک کھری کھری بلکہ اکھڑی اکھڑی گفتگو پر ہم قدرے چیں بہ جبیں اور قدرے خشمگیں ہو گئے اور دل ہی دل میں بڑبڑاتے ہوئے خارج از اجلاس ہو گئے مگر بعد میں احساس ہوا کہ موصوف نے جو کچھ کیا وہ قطعی بجا، درست اور لائق تحسین تھا ورنہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض لوگ نوجوانی میں ریسرچ اسکالر ہوئے تو اسی دم چھلے کو بڑھاپے تک قائم رکھا اور مرتے دم تک اپنے سدا بہار ریسرچ اسکالر ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا اگر ایسے بس پاس کی سہولت مہیا ہوتی تو ٹرانسپورٹ کارپوریشن کا کتنا خسارہ ہوتا۔

استاذ محترم نے اپنی زندگی میں بے شمار صدمے جھیلے ہیں لیکن ایک آہنی چٹان کی طرح ایستادہ ہیں کوئی افسردگی کے آثار نہیں۔

کسی الم کا شائبہ نہیں کہیں غم کی تحریریں نہیں۔ جب عمل و سوچ درجۂ کمال کو پہنچتے ہیں تو ایمان کامل ہو جاتا ہے۔ اور ہر فعل میں حکمت خداوندی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ شادی و غم کے اثرات اضافی چیز ہو جاتے ہیں۔ دل شاد و قلب ناشاد ایک ہی شیشے کے دو رخ متصور ہونے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے مزاج میں جو صلابت پائی جاتی ہے۔ وہ ایسے ہی اندوہ ناک لمحوں میں ہویدا ہوئی۔ دوسرا کوئی ہوتا تو ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاتا

ڈاکٹر صاحب ایک جفاکش انسان ہیں۔ موصوف نے اپنی محنت اور خداداد صلاحیت کی بنا علوم متداولہ کے خزانے حاصل کیے ہیں۔ ہم نے انھیں جب، جہاں دیکھا ہے غرق مطالعہ دیکھا ہے۔ اگر ہم غلطی پر نہیں ہیں تو "کتاب" موصوف کی کمزوری قرار دی جا سکتی ہے لیکن ہم ہرگز یہ نہیں چاہیں گے کہ ڈاکٹر صاحب کے بے تکلف احباب "کتاب" کے قوافی پر بھی غور فرمائیں۔ درس و تدریس میں ڈاکٹر صاحب کو ملکہ حاصل ہے۔ فلسفہ، ادب خواہ مشرقی ہو یا مغربی ہر دو پر یکساں عبور حاصل ہے۔ وہ وہ نکات سامنے لاتے ہیں کہ سننے والے غرق ادراک ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ جب "حلقہ" کی جانب سے محفل رنگ شباب کا اہتمام کیا گیا تھا موصوف نے فیض کے ایک شعر کی تشریح بورڈ پر کچھ اس انداز سے کی، جو ہمیں یقین ہے، خود فیض بھی اپنے شعر کی لسانی تنقید اور تاثراتی تنقید کے اس فیض سے ہرگز واقف نہیں تھے۔ اگر فیض زندہ ہوتے تو ڈاکٹر صاحب کی فیض رساں تشریح پر ضرور عش عش کر اٹھتے۔

ڈاکٹر غیاث متین نے ایک دن ہم سے کہا تھا کہ "ڈاکٹر صاحب نے کبھی کسی کی غیبت نہیں کی ہے" یہ جملہ دوسروں کے لیے کوئی اہمیت کا حامل نہ ہو لیکن ہمارے لیے اس قدر اہم ہے کہ ہم کافی دیر تک اس جملے کی گہرائی پر غور کرتے رہے۔

آدمی کے کردار کی اعلیٰ ترین نشانی یہ ہے کہ وہ کسی کے نیاب میں غیر پسندیدہ بات نہ کرے لیکن افسوس کہ اس گناہ سے لوگ خانقاہوں تک محفوظ نہیں۔ تعجب ہے لوگ دوسری شادی کو عیب سمجھتے ہیں جس کی حلت نص قطعی سے ہویدا ہے اور غیبت کو عیب نہیں سمجھتے جس کی حرمت حکم صریح سے ثابت ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا کلام ہم نے غور سے سنا اور بہت غور سے پڑھا ہے اور اس کلام کے وسیلے سے آدمی اور اس کی آواز تک پہنچنے کی کامل کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے کلام میں خود ان کا رنگ آشکارا ہے جسے فلسفہ کہا جا سکتا ہے لیکن ایسی تجربات چونکانے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ موصوف نے یک سطری نظم کہہ کر گویا شاعری کے میدان کو کافی حد تک وسیع کر دیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اُردو کے علاوہ فارسی سے بھی ایم۔اے کیا ہے اور فارسی پر بھی خاصی دسترس رکھتے ہیں لیکن روایت ہے کہ روایت کے خلاف ان کی ریاضی بھی بہت اچھی ہے۔ چناں چہ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب وہ ہمیں اچھے نمبرات دے کر ہماری ہمت افزائی کیا کرتے تھے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جن صاحبان زندہ دلان نے ہمیں نمبرات دینے میں ہندوستانی فراخی سے کام لیا ہے ان کی ریاضی اچھی نہیں۔

ڈاکٹر صاحب جب کسی میں بے پناہ صلاحیت اور عظیم لیاقت پاتے ہیں تو اس ہستی کو ترقی میں دل و دماغ سے کوشاں ہو جاتے ہیں اور اگر کوہ قاف میں بھی اس کے اسباب پوشیدہ ہوں تو بھی ڈھونڈ نکالنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے لیکن ایسا شاذ ہی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب وظیفہ پر سبکدوش ہو رہے ہیں۔ لیکن منہ، چہرہ، بشرہ پہ وہی تازگی وہی تابندگی ہویدا ہے۔ لوگ جا مخدوش نہیں کرتے ان کا روپ کے دیپ گمان کہتے ہیں۔ یہ شاید بہتر غذا، بروقت دواؤں اور پُراثر دعاؤں کا نتیجہ ہے۔

ایک دن کسی استاد نے ایک استادوں کے استاد سے شکایت کی کہ کیا بات ہے جو ڈاکٹر صاحب اس درجے تیزی واقع ہوئے ہیں۔ استادوں کے استاد نے جواب دیا چوں کہ ڈاکٹر صاحب نے فانی پر کام کیا ہے اس لیے فنائیت کے احساسات نے ڈاکٹر صاحب کو حد درجے متین بنا ڈالا ہے۔ استاد یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہنے لگے اگر یہ بات ہوتی تو دکن کے بے شمار اسکالرس واقعی صوفی منش ہو جاتے اور بجائے تحقیق کے تعلیل میں مصروف دکھائی دیتے اور ان کی عقلیں برقعوں سے بھی آزاد ہو جاتیں۔

خوش لباسی ڈاکٹر صاحب کے خاصے کی چیز ہے۔ گھر ہو یا کالج، محفل ہو یا بازار، تقریب تہنیت ہو یا دعوت، خاموشی ہر مقام پہ وہ جامہ زیبی میں اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہیں۔ کیا مجال جو استری کی سل ٹوٹے یا کوئی جھری برآمد ہو۔ تعجب ہے وہ اہل قلم ہیں لیکن روشنائی کا کوئی معمولی دھبہ بھی موصوف سے منسوب ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہر پیرہن میں سوٹ کا ایسا خیال رکھتے ہیں جیسے کہنہ مشق شاعر ردیف اور قافیہ کی مناسبت سے اوزان کا لحاظ رکھتے ہیں اور خدا کی قدرت ہے کہ جناب کو ہر پیرہن سوٹ کرتا بھی ہے۔ ورنہ کتنے خوش پوش ایسے

بھی جنھیں سوٹ کبھی سوٹ نہیں کرتا۔ ہم نے ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب کو بہتر سوٹ میں ملبوس دیکھا۔ ہم نے خیال کیا کہ یا تو ڈاکٹر صاحب کسی کے ولیمے میں تشریف لے جارہے ہیں یا ولیمے سے تشریف لے آرہے ہیں۔ ویسے یہ گمان بھی غالب ہو سکتا تھا کہ کہیں خود ڈاکٹر صاحب ہی کا .... ہم چوں کہ بے تکلف شاگرد نہیں اس لیے اس گمان کو غالب ہونے نہ دیا بعد میں پتہ چلا کہ بس یونہی روز کی طرح ..... گویا ڈاکٹر صاحب کے ہاں یہ تقریب "تمبر ملاقات" کی پابند نہیں

آج ڈاکٹر صاحب کا لمحہ لمحہ اردو ادب کی خدمت میں صرف ہو رہا ہے "سب رس" ہو یا "شعر و حکمت" تبصروں یا مقدمات، مجالس ہوں یا سمینارس ڈاکٹر صاحب نے دامے، درمے، سخنے ... آپ کو ... کے لیے وقف کر دیا ہے۔ موصوف کی ذات سے سارا جامعہ مستفید اور دنیائے ادب مستفیض ہو رہی ہے موصوف کی عظمت کے لیے یہ کیا کم ہے کہ ان کا کہا مستند اور ان کا لکھا اتھارٹی کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں دعا گو ہوں کہ خدا ان کی عمر و اقبال میں برکت دے اور ان کی جگہ پُر کرنے کے لیے اہل طلبا کو موقع عنایت فرمائے" تاکہ جامعہ عثمانیہ کی تابنا کی کسی دم کم نہ ہونے پائے۔ آمین۔

●●

شگوفہ کی ایک خصوصی اشاعت

ہندوستانی مزاح نمبر

قیمت :

۵۰ روپے

قلمی معاونین

اپنی تخلیقات صاف اور خوش خط روشنائی سے

صفحے کی ایک جانب

لکھ کر ارسال فرمائیں۔ مسودات پر اپنا پتہ ضرور لکھیں۔

ڈاکٹر حبیب ضیا
(حیدرآباد)

دکن میں طنز و مزاح اور اس کا ارتقاء

ایک سرسری جائزہ

طنز و مزاح کی تعریف مختلف نقادوں اور دانشوروں نے مختلف طور پر کی ہے۔ اسٹیفن لیکاک نے خالص مزاح کی تعریف یوں کی ہے کہ یہ زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا فنکارانہ اظہار ہو جائے۔ مزاح نگار زندگی کے مختلف شعبوں میں پائی جانے والی ناہمواریوں بے ترتیبیوں اور خصوصاً مضحکہ خیز کیفیتوں کو دیکھتا محسوس کرتا اور اس پر قلم اٹھا کر محظوظ ہوتا ہے۔ طنز نگار کو ان ناہمواریوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اس لیے وہ ان سے نفرت کرتا ہے۔ ظرافت کھلا مزاح ہے جس میں کسی پر چوٹ نہیں کی جاتی۔ طنز چبھتے ہوئے معنی رکھتا ہے اور اس کا مقصد دراصل حقیقت کی تلقین ہوتا ہے۔ طنز اور مزاح دونوں اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔ مزاح جہاں افسردگی زندگی کے دکھ درد سے دور کرتا ہے وہیں طنز ایسے وہ کی زندگی کی آئینہ داری کرتا ہے۔

دکن میں   زمیوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس سرزمین سے بے شمار بلند پایہ شاعر اور ادیب ابھرے   سے قبل یہاں جن شاعروں اور ادیبوں نے نام پیدا کیا ان میں نذیر دہقانی، [illegible] لطف فرحت، اللہ عیش، مکین کاظمی اور مرزا فلک بیگ قابل ذکر ہیں۔ حال ہی میں شکور بیگ کے مضامین و نقادیہ کا ایک مجموعہ چھپ کر منظر عام پر آیا ہے اس کے مرتب منظور احمد ہیں۔ دکن کے طنز و مزاح نگاروں میں چند مشہور ایسے بھی ہیں جن کا تعلق سرزمین دکن سے ہے لیکن اب وہ حیدرآباد سے دور رہ کر طنزیہ و مزاحیہ ادب کو مالا مال کر رہے ہیں اس سلسلے میں مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم اور پرویز یداللہ مہدی کے نام گنائے جا سکتے ہیں۔ ان سب کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی عالمی شہرت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

حیدرآباد کے چند طنز و مزاح نگار ایسے بھی ہیں جنھوں نے اس صنف کے علاوہ دوسری مقبول عام اصناف میں لکھ کر اردو زبان و ادب کی نہ صرف خدمت کی ہے بلکہ دکن کے سماجی اور تہذیبی ورثہ میں خاطر خواہ اضافہ بھی کیا ہے کئی شاعروں اور ادیبوں پر ہند و پاک کی مختلف یونیورسٹیوں سے طلبا و طالبات نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے مقالے لکھے ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں دکن کے شاعروں اور ادیبوں کا مقام ادب میں متعین کیا جا سکتا ہے۔

طنز و مزاح کے فروغ میں جن اصحاب نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان میں بھارت چند کھنہ، رشید قریشی، نریندر لوتھر

فاطمہ عبدالغفور کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان سب کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ دکن کے طنز و مزاح نگار ادیبوں کی ایک طویل فہرست ہے جو ملک اور بیرون ملک ادبی جلسوں میں مضامین سناتے رہے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو سے ان کے مضامین نشر کئے جاتے ہیں اور ہندوپاک کے مشہور رسالوں میں مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ان میں مسیح انجم، صبا حسین، ارشد علی خان، عاتق شاہ، رحیم الدین، رشید الدین، عباس متقی، لئیق صلاح اور حبیب ضیا، عابد معز اور کئی ادیب قابل ذکر ہیں۔ اظہر افسر نے طنز و مزاح سے بھر پور مقصدی ڈرامے لکھ کر اپنا مقام بنایا ہے۔ نفیسہ ساجدہ، جیلانی بانو، فاطمہ عالم علی خان اور رشید موسوی نے بھی بلند پایہ مضامین اور انشائیے لکھے ہیں۔ ان کے لکھنے کا سلسلہ جاری رہتا تو وہ یقیناً طنزیہ و مزاحیہ ادب میں مزید اضافے کا باعث ہوتے۔

نثر کے علاوہ نظم کی مختلف اصناف میں حیدرآباد کے شعرا طنزیہ مزاحیہ شہ پارے پیش کئے ہیں۔ برق آشیانوی نے نثر اور نظم دونوں میں لکھا ہے۔ سرزمین دکن کو اس بات پر فوقیت ہے کہ یہاں سے کئی ایسے شہرہ آفاق شاعر ابھرے جن پر بجا طور پر فخر کیا جاسکتا ہے۔ سرپٹ حیدرآبادی، اشرف خوندمیری، سرور ڈنڈا، اسماعیل ظریف، طالب خوندمیری، صفت اللہ، رؤف رحیم، پاگل عادل آبادی، اقبال ہاشمی، رشید عبدالسمیع جلیل خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ ان شعرا میں طالب خوندمیری، حمایت اللہ اور مصطفیٰ علی بیگ نے ہندو پاک کے علاوہ دوسرے بیرونی ممالک میں بھی اپنی شہرت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ حمایت اللہ اور مصطفیٰ علی بیگ نہ صرف اچھے شاعر ہیں بلکہ طنز و مزاح سے بھر پور مقصدی خاکے پیش کرنے میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ بہر حال دکن میں طنز و مزاح نگار ادیبوں اور شاعروں کا ایک بہت بڑا قافلہ ہے جو گزشتہ کئی برسوں سے ہنسنے ہنسانے کے علاوہ اصلاحی اور مقصدی ادب کی تخلیق میں لگا ہوا ہے۔ طنزیہ و مزاحیہ خاکوں اور ڈراموں کی پیش کشی میں بھی حیدرآباد کے فنکاروں نے اپنا لوہا منوا لیا ہے ان میں خصوصیت سے ادرک کے پنجے کے خالق بین خان کے علاوہ محمد سلیمان، دولت رام اور مسعود علی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ صحافت، ریڈیو اور ٹی وی نے دکن میں طنز و مزاح کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس مشکل صنف میں لکھنے والوں کی ادبی تخلیقات کی عظمت یوں تسلیم کی جاسکتی ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں اس کا مقصد جیسا کہ میں نے کہا ہے صرف ہنسنا ہنسانا یا کسی پر کیچڑ اچھالنا نہیں بلکہ بامقصد ادب کی پیش کشی ان کا نصب العین ہے اس کا ثبوت اس طرح ملتا ہے کہ ان فنکاروں نے ہندوستان سے باہر بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ ایسی ادبی کہ دکن میں رہنے والے بھی اپنے دکنی ہونے پر فخر کرنے لگے۔

یہاں ادب لکھنے والوں کے موضوعات لامحدود ہیں۔ سماج میں نمودار ہونے والی مختلف برائیوں اور خامیوں کو دور کرنے کے لیے انھوں نے بہت ہی خوش اسلوبی سے طنز کے تیر برسائے ہیں۔ جیسے جوڑ شادی، جہیز اور جوڑے کی رقم کی لعنت، حصول تعلیم کے فوائد، جہالت کے نقصانات، غریبوں اور محنت کشوں کا استحصال اور مختلف نوعیت کی ناانصافیاں ان کے موضوع رہے ہیں۔ دکن میں طنز و مزاح کی رفتار کو تیز کرنے میں یہاں کے شائستہ اور اعلیٰ ادبی ذوق رکھنے والے عوام کے علاوہ دو ادارے پورے طور پر شامل اور ذمہ دار ہیں۔ ایک انجمن زندہ دلان حیدرآباد دوسرے شگوفہ

مصطفیٰ کمال جو اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں ۔

زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ تقاریب کی اہمیت اور افادیت سے ہر کوئی واقف ہے۔ ان تقاریب میں طنز و مزاح سے بھرپور مضامین سنائے جاتے اور شاندار پیمانے پر مشاعرے کا انعقاد عمل میں آتا ہے۔ مشاعرے میں ہزاروں کی تعداد میں سامعین شریک ہوتے ہیں اور سنجیدہ مشاعروں کے برخلاف بیرونی شعراء کے ساتھ دکن کے شاعروں کو بھی دلچسپی سے سنتے اور داد و تحسین سے نوازتے ہیں ۔

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کی ادارت میں نکلنے والا ماہنامہ شگوفہ بھی دکن میں طنز و مزاح کی نشوونما اور اس کے ارتقا میں اہم حصہ ادا کر رہا ہے ۔ اس رسالے میں چھپ کر فنکاروں کو لکھنے کا حوصلہ ملتا ہے ۔ ایسے طنزیہ مزاحیہ ادب کی خاموش خدمت کا نام دیا جا سکتا ہے ۔

مختصر یہ کہ دکن میں طنز و مزاح اور اس کے ارتقا کے سرسری جائزے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہاں کے مزاح نگار ادیب اور شاعر اپنے مخصوص اور منفرد اسلوب کی وجہ سے اپنی شناخت رکھتے ہیں اور ادب میں اپنا مقام بنا چکے ہیں ۔ گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں دکن میں طنزیہ مزاحیہ نظم و نثر کی جو کتابیں منظر عام پر آئی ہیں سارے ہندوستان میں اُن کی نظیر نہیں ملتی ۔ ان تخلیقات پر ہندوستان کی مختلف اکیڈیمیوں نے گراں قدر ایوارڈ عطا کئے ۔ چند مشہور ادیبوں کی کتابوں کے ترجمے دوسری زبانوں میں ہوئے ہیں نیز ان کے ایڈیشن بیرون ملک بھی شائع ہو رہے ہیں ۔

●●

تبصرہ نگار
سلیم عابدی
(محبوب نگر)

بال کی کھال (تبصرہ)

منظور وقار کی کتاب
"ہنسا منع ہے"

ملک کے ممتاز مزاحیہ شاعر سلیمان خطیب کی سرزمین سے خطیب کے بعد ایک نوجوان قلمکار طنز کے نشتر تیز کرتا ہوا، مزاح کی گدگدی لیئے ہوئے سرزمینِ گلبرگہ کی ادبی اُفق پہ اُبھر کر ہندوستان کی وسعتوں میں اپنے پر پھیلانے کی سعی کر رہا ہے۔ یہ نوجوان ذہین بھی ہے اور زود نویس بھی۔

زیرِ نظر مزاحیہ مضامین کے مجموعہ میں تیرہ مضامین شامل ہیں جو (۱۲۸) صفحات پر محیط ہیں۔ ابتداء میں ہند و پاک کے ممتاز مزاح نگار جناب یوسف ناظم کے علاوہ ڈاکٹر طیب انصاری، احمد جلیس، عزیز اللہ سرمست نے منظور وقار کے فن کے بارے میں اپنی آراء کا اظہار فرمایا ہے۔

منظور وقار نے اپنے مزاحیہ مضامین کے مجموعہ کے لیے جو نام تجویز کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے انھیں اپنی تحریروں میں مزاح کے تناسب کے شدید ہونے کا کامل یقین ہوگیا ہے۔ جناب یوسف ناظم نے "حرفِ سند" میں اس امر کی جانب لطیف اشارہ بھی فرمایا ہے۔

"ہنسا خطرناک ہے خود منظور وقار نے اس بات کی احتیاط کی ہے کہ آپ ہنس ہنس کر درد شکم میں مبتلا نہ ہوں۔"

منظور وقار کی مزاح نگاری کے بعد فن کے بارے میں ڈاکٹر طیب انصاری کی تحریر کردہ دو تین سطور کو درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

"جب میں منظور وقار کے بارے میں سوچتا ہوں تو یہ مجھے اقدار کی بنیاد پر قدیم اور مسائل کی بنیاد پر جدید نسل کے آدمی لگتے ہیں۔ ہر تخلیق کار کی طرح ان کے اندر بوڑھا برگد موجود ہے اور نئی شاخ بھی۔"

منظور وقار کو ان کے پہلے مجموعہ میں شامل مضامین کے آئینے میں سمجھنے یا پہچاننے کی سعی کی جائے تو ممکن ہے مضامین بآسانی سمجھ آجائیں اور منظور وقار رہ جائیں۔ اور اگر منظور وقار کے مضامین پڑھے جائیں تو ہمارے معاشرے کی سیر ہوجائے گی۔ وہی معاشرہ جس سے ہمارے تجربات، مشاہدات اور ذہنی اذیتوں کا

[illegible] داشتہ ہے [illegible] حقیقتوں کا ادراک [illegible] نہیں ہوتا بلکہ حقیقتوں [illegible]
[illegible] سطحوں پر [illegible] چونکا دینے والے فنی اور فکری اور رویّے کی [illegible]
[illegible] کا تجربہ [illegible] ہے قوت مشاہدہ بھی شدید ہے لیکن [illegible]
[illegible] یہ اپنے فنی سفر کے عبوری دور کو بڑی سرعت کے ساتھ پاٹنا چاہتے [illegible]
ان کے شعور [illegible] کا احاطہ تو کیا ہے لیکن ان پر گرفت کچھ زیادہ ابھی [illegible]
فن [illegible] نگاری کے میدان میں [illegible] کی جرأت کرنا بجائے خود ایک کمال [illegible]
[illegible] ادب [illegible] میں [illegible] کی شرط کے ساتھ مزاح نگار کے [illegible] آیا ہے۔

[illegible] زبان و بیان اور پیرایۂ اظہار کی سطح پر فکر تونسوی [illegible]
[illegible] نظر آتے ہیں [illegible] کے لب و لہجہ کی سادگی و [illegible]
[illegible] کرتی ہے [illegible] کی سادگی [illegible]
[illegible] فن مزید [illegible] سفر کی گنجائش رکھتا ہے۔

[illegible] مزاح سے زیادہ طنز کی [illegible] غالب [illegible]
[illegible] سے [illegible]
[illegible] سے جانے نہیں دیتے۔

[illegible] کی کمی [illegible] گیا ہے جن [illegible]
[illegible] مثلاً ایک [illegible] شاعر کا خط [illegible]
[illegible] کی ڈائری" جیسے مضامین سے اندازہ [illegible]
[illegible] سماجی کرداروں اور بعض [illegible]
[illegible] قوت مشاہدہ کے ساتھ ساتھ ان کی سماجی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے [illegible]
[illegible] بخش سکتے [illegible]
[illegible] قاری کو اپنے ساتھ [illegible]
[illegible] خود [illegible] گم ہو جاتے [illegible]
[illegible] جب کہ [illegible] گر تو بُرا مانے [illegible]
[illegible]
[illegible] اپنے فن کی [illegible]
[illegible] کر دیتے ہیں [illegible] شخص کو اپنے [illegible]
[illegible] مول لینے کا [illegible]
[illegible] اپنے [illegible] ذکر کرنے سے ذہنی تسکین ہوتی ہے اس [illegible]
[illegible] آتے ہیں [illegible] کچھ [illegible] میرے [illegible]

مجموعہ انتساب سے منظور وقار اُفق ادب پر کوئی سورج تو نہیں ہیں لیکن اس دنیا جہاں ادب اور معیشت میں ایک کشمکش سی ہے ایک مخلص ادیب کا اضافہ یقیناً مسرت کی بات ہیں اردو زبان کے قاری کے لیے مژدۂ جانفزا ہے۔ خصوصاً مزاحیہ ادب تو آج کی مشینی زندگی میں مسکن کا حکم رکھتا ہے میں منظور وقار کو تمام اردو قارئین کی جانب سے خوش آمدید کہتا ہوں۔

منظور وقار کی اس کتاب کو بہت اچھا پبلی کیشنز بخشی حویلی نے دوشنبہ بلڈنگ گلبرگہ نے شائع کیا ہے اس میں جزوی مالی اعانت اُردو اکیڈیمی کرناٹک کی بھی شامل ہے۔ دس روپے قیمت کی (۱۲۸) صفحات پر مشتمل ایک مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہر ایک کے لیے سستا ہے خریدنے کی ترجیح دے سکتا ہے۔

دوسرے کے خط

(مراسلے)

مکرمی۔ السلام علیکم

گذشتہ شمارے میں مشتاق یوسفی صاحب کی کتاب "آبِ گم" کا پیش لفظ پڑھ کر لطف آگیا۔ وہ میرے قریبی فیاض دوست ہیں میں اس دوستی کے توسط سے نہیں بلکہ حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ یہ واقعی طنز و مزاح کا "عہدِ یوسفی" ہے۔ ان کی تحریر میں طنز و مزاح کی جو چاشنی اور لطف ہے وہ ان کی باتوں میں ہے۔

آپ کے آسٹریلیا کے نمائندے مسعود حسینی صاحب نے مجھے مشورہ دی کہ میں ایک مضمون آپ کی خدمت میں بھیجوں شاید پسند آئے، ویسے میں زیادہ تر سائنسی مضامین لکھتا ہوں۔ اردو کے کسی رسالے میں سائنسی مضامین نہیں چھپتے اس لیے اردو داں طبقہ جدید سائنسی معلومات سے نابلد رہتا ہے۔

ڈاکٹر محمود علی، NSW (آسٹریلیا)

مکرمی ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ شگوفے کا خاص نمبر حیدرآباد میں نظر نواز ہوا تھا۔ رسید کی تاخیر پر معذرت خواہ ہوں۔ آپ کی محنت و استقامت قابلِ داد ہے۔ یہاں تو ضیاء الحق صاحب کم ہمت کھول بیٹھے اور خالد عرفان صاحب تو بقول کسے:

اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہو گئے

عنایت علی خاں

(حیدرآباد سندھ)

محترم ڈاکٹر مصطفیٰ کمال صاحب!

السلام علیکم۔ ستمبر کا شگوفہ نظر نواز ہوا۔ محترم واہی صاحب کی نظم نما ہزل "دوڑ پیچھے کی طرف" بہت خوب ہے۔ حصّۂ نثر بھی کافی اچھا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ خالد عرفان کا منظوم خاکہ "ضیاء الحق قاسمی" شاد عباسی اور ڈاکٹر انعام الحق جاوید کے قطعات پسند آئے۔

مختار یوسفی

مالیگاؤں

محترم مصطفیٰ کمال صاحب

اگست ۹۰ء کا شمارہ نظر نواز ہوتے ہی مسرت انگیز ثابت ہوا کیونکہ اس شمارے میں میری شخصیت (جو غیر اہم ہے) پر برادرم امجد علی فیض کا لکھا ہوا خاکہ اور میری کتاب "ہنسنا منع ہے" (امید ہے کہ بعض ناقدین "ہنسنا منع ہے" کی ہدایت کے باوجود کتاب میں خامیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہنس پڑیں گے) کی رسم اجرا کے جلسے کی رپورٹ شامل ہے۔ قلم کار کو اپنے بارے میں کسی اخبار یا رسالے (خصوصاً شگوفہ جیسے معیاری پرچے) میں چھپا ہوا مواد دیکھ کر یقیناً خوشی ہوتی ہے

اس شمارے میں 'مالِ مفت' بہت کم ہے صرف ابراہیم یوسف صاحب کے خیال میں اور برادر عابد معز کے تکیہ پر ہی تکیہ کیا گیا ہے۔ جہاں تک خامہ بگوش کی تحریر کا سوال ہے ایک ایک جملہ گدگداتا ہے اور تیر کی طرح قلب و جگر میں دھنستا چلا جاتا ہے۔

اگر مجھ جیسا لڑکھڑاتا مزاح نگار خامہ بگوش کی تحریروں کا مستقل مطالعہ کرتا ہے تو بہت جلد طنز و مزاح کا سلیقہ سیکھ کر چلتا مزاح نگار کہلائے گا۔

منظور وقار (گلبرگہ)

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۲۳

شمارہ ۱۱

نومبر ۱۹۹۰ء

ایڈیٹر:

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

مجلس مشاورت:

بھارت چند کھنہ

نریندر لوتھر

یوسف ناظم

مجتبیٰ حسین

خصوصی نمائندے:

بمبئی ـــــ فیاض احمد فیضی

ریاض ـــــ عابد معز

دوبئی ـــــ غلام نجم الدین

آسٹریلیا ـــــ ایس۔ ایم حسینی

کتابت: محمد غالب، محمود سلیم، محمد مجاہد

سرورق: طالب خوندمیری

فی پرچہ: ۵ روپے

زر سالانہ: ۵۵ روپے

لائبریریوں سے: ۶۰ روپے

بیرونی ممالک سے: ۱۸۰ روپے

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد

دائرہ پریس چھتہ بازار ۔ پراسسنگ

ترسیلِ زر کا پتہ:

شگوفہ ۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز۔ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

فون آفس: 557716، مکان: 521064

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

چورن ((منظومات)

مال مسروقہ (ڈائجسٹ)

مال مفت (انشائیے)

سفر نامہ

قاضی جی دبلے (کالم بمبئی)

شہر کے حالات کی وجہ سے شگوفہ کسی قدر تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ دسمبر کے شمارے کی اشاعت مقررہ تاریخ پر عمل میں آئے گی اور جنوری میں حسب روایت سالنامہ اہتمام کے ساتھ شائع ہوگا۔ نومبر ۹۰ء میں منعقد ہونے والی زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ تقریبات بھی ملتوی کر دی گئیں۔ البتہ ۱۹ ر تا ۲۴ ر فروری ۱۹۹۱ء ورلڈ ہیومر سوسائٹی کے زیر اہتمام عالمی مزاح کانفرنس کا انعقاد عمل میں آئے گا۔ اس کانفرنس کے تعلق سے تفصیلات کا آئندہ شمارہ میں اعلان کیا جائے گا۔ — مدیر

رضا نقوی واہی

"دھمکیاں کیا مجھے اے شام بلا دیتی ہے"

بزمِ کوثر مجھے ہر ماہ سزا دیتی ہے
مصرعِ طرح کی زنجیر پہنا دیتی ہے

یہ غزل گوئی بھی اعصاب کی بیماری ہے
لوریاں دے کے جو ذہنوں کو سلا دیتی ہے

اک ذرا ملتی ہے شاعر کی اَنا کو تسکین
داد و تحسین کے سوا اور یہ کیا دیتی ہے

زحمتِ قافیہ پیمائی سے واقف نہیں کون
اچھے اچھوں کو یہ دیوانہ بنا دیتی ہے

جب اُلجھ جاتی ہے شعروں میں قوافی سے ردیف
شاعرِ خستہ کے چھکّے ہی چھڑا دیتی ہے

شترگربہ کسی مصرع میں در آتا ہے کبھی
شستِ بندش کبھی چشمک کو ہوا دیتی ہے

کبھی ایطائے جلی اور خفی کی اُلجھن
کبھی ترسیل کی ناکامی سزا دیتی ہے

کبھی ایہام کا پیچ اور کبھی تجنیس کی گانٹھ
کبھی تقطیع غلط ہو کے دغا دیتی ہے

ہے کوئی شعر کبھی لفظی تنافر کا شکار
کبھی تعقید چھری فن پہ چلا دیتی ہے

کبھی ابہام کی تہ ذہن کو جھٹکے دے کر
ابسٹریکٹ آرٹ کی تصویر دکھا دیتی ہے

یہ غزل گوئی بھی کچھ تیرے ستم سے نہیں کم
"دھمکیاں کیا مجھے اے شام بلا دیتی ہے"

○

سید ضمیر جعفری
(کراچی۔ پاکستان)

ضمیریات

صاحبِ عزّت ہے اپنے شہر میں
پاس جن کے جتنا زر ہے، زور ہے

لیکن اُن کو جاننے پر یہ کھلا
مستحقِ عزّت کا کوئی اور ہے

چہروں کے گلاب دہک اُٹھے
آنکھوں میں سحر ہو جاتی ہے

لڑکی کالج میں آتے ہی
اک جادوگر ہو جاتی ہے

اقبال ہاشمی حیدرآباد

غزل

الٰہی مجھے تو نظر سے بچالے
وہ گِننے کو بیٹھا ہے میرے نوالے

مساجد کے چندے ہیں تیرے حوالے
تو جی بھر کے ان سے منافع کمالے

خدا کو مکاں کی ضرورت نہیں ہے
دھڑلے سے اپنا مکاں تو بنالے

ابھی مکابچوں کی لگیں گی قطاریں
دکانِ توہّم اگر تو سنبھالے

تری حکمتوں کے بھی ڈنکے بجیں گے
اگر تُو بھی لقماںؔ سے ڈانڈے ملالے

ترے پاؤں چومے گی مُردار دُنیا
سیاست میں اپنے قدم تو جمالے

اگر تجھ کو طوفاں اٹھانے کی ضد ہے
تو چائے کی پیالی میں طوفاں اٹھالے

ادب میں ترا نام روشن رہے گا
اگر تو بھی گھوڑے پہ سورج اگالے

تجھے لوگ اُستاد کہنے لگیں گے
چبائے ہوئے لفظ تو بھی چبالے

لجاجت سے لیتا ہے وہ قرض لیکن
تقاضا کروں تو وہ دیدے نکالے

کہاں ہاشمیؔ چابیاں اُس نے رکھ دیں
لبوں پہ لگا کر علی گڑھ کے تالے ■■

رؤف رحیم
حیدرآباد۔

کرفیو نامہ

وہ پڑی اب کی مار کرفیو میں
اُٹھ نہ پایا میں یار کرفیو میں

نقد لینے کو پیسے گت ہی نہ تھے
کون دیتا اُدھار کرفیو میں

بن گیا تھا مرے گلے کا طوق
مُفلسی کا حِصار کرفیو میں

ہم تھے گوشہ نشیں وہ بے پردہ
یُوں ہوئے کاروبار کرفیو میں

بڑبڑانے لگا تھا شعر پہ شعر
چڑھ گیا تھا بخار کرفیو میں

کاٹتے ہیں امیر وقت اپنا
دیکھ کے وی سی آر کرفیو میں

تاجروں کی تو عید ہوتی ہے
کرتے ہیں دو کے چار کرفیو میں

چغلیاں سب کی کرتے گزرے ہیں
اپنے لیل و نہار کرفیو میں

سڑکیں سنسان چیخیں کتوں کی
اور پولس کی کار کرفیو میں

ہم حماقت سے روز پیتے تھے
بیڑی جیسے سگار کرفیو میں

ایک لقمہ بھی ایک نعمت تھا
جو بھی ملتا ادھار کرفیو میں

شاعروں کا ہوا رِتیا پانچہ
ہو نہ پائے وہ چار کرفیو میں

دم دِلاسوں سے سب کا پیٹ بھرا
مِل نہ پائی پگار کرفیو میں

چند کرتے ہیں سب بھگتے ہیں
قہرِ پروردگار کرفیو میں

شاعری کا نہیں ہے وقت رحیمؔ
اللہ اللہ، پکار کرفیو میں

مشتاق احمد یوسفی
(پاکستان)

(دوسری قسط)

حویلی

یہ چھوڑ کر آئے ہیں

کانپور سے ہجرت کر کے کراچی آئے تو دنیا ہی اور تھی۔ اجنبی ماحول۔ بیروزگاری بے گھری اس پر مستزاد۔ اپنی آبائی حویلی کے دس بارہ فوٹو مختلف زاویوں سے کھچوا لائے تھے۔ "ذرا یہ سائیڈ پوز دیکھئے۔ اور یہ شاٹ تو کمال کا ہے"۔ ہر آئے گئے کو فوٹو دکھا کر کہتے "یہ چھوڑ کر آئے ہیں"۔ جن دفتروں میں مکان کے الاٹ منٹ کی درخواستیں دی تھیں ان کے بڑے افسروں کو بھی کٹہرے کے اس پار سے تصویری ثبوتِ استحقاق دکھاتے: "یہ چھوڑ کر آئے ہیں"۔ واسکٹ اور شیروانی کی جیب میں اور کچھ ہو یا نہ ہو، حویلی کا فوٹو ضرور ہوتا تھا۔ یہ در حقیقت ان کا وزٹنگ کارڈ تھا۔ کراچی کے فلیٹوں کو کبھی ماچس کی ڈبیاں، کبھی دڑبے، کبھی کابک کہتے۔ لیکن جب تین مہینے جوتیاں چٹخانے کے باوجود ایک کابک میں بھی سر چھپانے کو جگہ نہ ملی تو آنکھیں کھلیں۔ احباب نے سمجھایا "فلیٹ ایک گھنٹے میں مل سکتا ہے۔ کسٹوڈین کی ہتھیلی پر پیسہ رکھو اور جس فلیٹ کی چابی چاہو لے لو"۔ مگر قبلہ تو اپنی ہتھیلی پر پیسہ رکھوانے کے عادی تھے، وہ کہاں مانتے۔ مہینوں فلیٹ الاٹ کروانے کے سلسلے میں جوتے پیاسے، پریشان حال سرکاری دفتروں کے چکر کاٹتے رہے۔ زندگی بھر کسی کے مہمان نہ رہے تھے۔ اب بیٹی داماد کے ہاں مہمان رہنے کا عذاب بھی سہا۔

اب کیا ہوئے گا؟

انسان جب کسی گھلا دینے والے کرب یا آزمائش سے گزرتا ہے تو ایک ایک ساعت ایک ایک برس بن جاتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے:

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

بیٹی کے گھر ٹکڑے توڑنے یا اس پر بار بننے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کانپور میں کبھی اس کے ہاں کھڑے کھڑے ایک گلاس پانی بھی پیتے تو ہاتھ پر پانچ دس روپے رکھ دیتے۔ لیکن اب ہ صبح سر جھکائے ناشتہ کر کے نکلتے تو دن بھر خاک چھان کر مغرب سے ذرا پہلے لوٹتے۔ کھانے کے وقت کہہ دیتے کہ ایرانی ہوٹل میں کھا آیا ہوں۔ جوتے انھوں نے ہمیشہ رحیم بخش جفت ساز سے بنوائے۔ اس لیے کہ اس کے بنائے ہوئے

جوتے چرچراتے بہت تھے۔ ان جوتوں کے تلّے اب اتنے گھس گئے تھے کہ چرچرانے کے لائق نہ رہے۔ پیروں میں ٹھیکیں پڑ گئیں۔ شیروانیاں ڈھیلی ہو گئیں۔ بیمار بیوی رات کو درد سے کراہ بھی نہیں سکتی تھی کہ سمدھیانے والوں کی نیند خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ ململ کے کرتوں کی لکھنوی کڑھائی میل میں چھپ گئی چُنٹیں نکلنے کے بعد آستینیں انگلیوں سے ایک ایک بالشت نیچے لٹکی رہتیں۔ خضابی مونچھوں کا بَل تو نہیں گیا، لیکن صرف بَل کھائی ہوئی نوکیں سیاہ رہ گئیں۔ چار چار دن نہانے کو پانی نہ ملتا۔ موتیا کا عطر لگائے تین مہینے ہو گئے۔

بیوی گھبرا کر بڑے بھولپن سے منافاتی لہجے میں کہتیں "اب کیا ہوئے گا؟" ہوگا کے بجائے ہوئے گا ان کے منہ سے بہت پیارا لگتا تھا۔ اس ایک فقرے میں وہ اپنی ساری سراسیمگی، معصومیت، بے بسی اور مخاطب کے علم نجوم اور اس کی بے طلب مدد پر بھروسا...... سبھی کچھ سمو دیتی تھیں۔ قبلہ اس کے جواب میں ہمیشہ بڑے اعتماد اور تمکنت سے "دیکھتے ہیں" کہہ کر ان کی تشفی کر دیتے تھے۔

یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام

سو گلی گلی خاک پھانکنے اور دفتر دفتر دھکے کھانے کے بعد قبلہ کے قلبِ حزیں پر کچھ القا ہوا۔ وہ یہ کہ قاعدے قانون داناؤں اور جابروں نے کمزور دل والوں کو قابو میں رکھنے کے لیے بنائے ہیں۔ جو شخص ہاتھی کی لگام ہی تلاش کرتا رہ جائے وہ کبھی اس پر چڑھ نہیں سکتا۔ جام اس کا ہے جو بڑھ کر خود ساقی کو جام و مینا سمیت اٹھا لے۔ بالفاظِ دیگر جو بڑھ کر تالا توڑ ڈالے، مکان اُسی کا ہو گیا۔ کانپور سے چلے تو اپنی جمع جتھا، شجرہ، اسپرنگ سے کھلنے والا چاقو، اختری بائی فیض آبادی کے تین ریکارڈ، مراد آبادی حقّے اور حاجی کے سبز کیریمہ اسٹینڈ کے علاوہ اپنی دکان کا تالا بھی ڈھو کر لے آئے تھے۔ علیگڑھ سے خاص طور پر بنوا کر منگوایا تھا۔ تین سیر سے کم نہ ہوگا۔ مذکورہ بالا القا کے بعد برنس روڈ پر ایک اعلیٰ درجہ کا فلیٹ اپنے لیے پسند فرمایا۔ ماربل کی ٹائلز، سمندری ہوا کے رُخ کھلنے والی کھڑکیاں جن میں رنگین شیشے لگے تھے۔ دروازے کے زنگ آلود تالے پر اپنے علیگ تالے کی ایک ہی ضرب سے فلیٹ میں اپنی آبادکاری بلامنتِ سرکار کر لی۔ گویا پروفیسر قاضی عبدالقدوس کے الفاظ میں، اول الذکر کو ثانی الذکر پر مار کر آخر الذکر کا قبضہ لے لیا۔ تختی دوبارہ پینٹ کروا کے لگا دی۔ اس سے پہلے اس پر "کسٹوڈین متروکہ املاک" کا نام لکھا تھا۔ قبلہ عالمِ جلال میں اسے وہیں سے کیلوں سمیت اکھاڑ لائے تھے۔ تختی پر نام کے آگے مضطر کانپوری بھی لکھوا دیا۔ پرانے واقف کاروں نے پوچھا "آپ شاعر کب سے ہو گئے؟" فرمایا "میں نے آج تک کسی شاعر پر دیوانی مقدمہ چلتے نہیں دیکھا۔ نہ ڈگری، قرقی ہوتے دیکھی!"

فلیٹ پر قابض ہونے کے کوئی چار ماہ بعد قبلہ اپنے جوڑی دار کا گھٹنا رفو کر رہے تھے کہ کسی نے بڑے گستاخانہ انداز سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مطلب یہ کہ نام کی تختی کو پھٹ پھٹایا۔ جیسے ہی انھوں نے ہڑبڑا کر دروازہ کھولا، آنے والے نے خود کا تعارف اس طرح کرایا گویا اپنے عہدے کی چڑاس ان کے منہ پر اٹھا کے دے ماری: "افسر، محکمہ کسٹوڈین، الویکوی پراپرٹی"۔ پھر ڈپٹ کر کہا "بڑے میاں! فلیٹ کا الاٹ منٹ آرڈر دکھاؤ" قبلہ نے واسکٹ کی جیب سے حویلی کا فوٹو نکال کر دکھایا "یہ چھوڑ کر آئے ہیں"! اس نے فوٹو کا نوٹس نہ لیتے ہوئے قدرے درشتی سے کہا "بڑے میاں! سنا نہیں؟ الاٹ منٹ آرڈر دکھاؤ"۔ قبلہ نے بڑی رسان سے اپنے بائیں پیر کا سلیم شاہی جوتا اتارا، اور اتنی ہی رسان سے کہ اس کو گمان تک نہ ہوا

کیا کرنے والے ہیں، اس کے منہ پہ مارتے ہوئے بولے "یہ ہے یادوں کا الاٹ منٹ آرڈر! کاربن کاپی بھی ملاحظہ فرمایئے گا؟" اس نے اب تک، یعنی تادمِ تذلیل، رشوت ہی رشوت کھائی تھی، جوتے نہیں کھائے تھے پھر کبھی ادھر کا رُخ نہیں کیا۔

جس حویلی میں تھا ہمارا گھر

قبلہ نے بڑے جتن سے لی مارکیٹ میں ایک چھوٹی سی لکڑی کی دوکان کا ڈول ڈالا۔ بیوی کے جہیز کے زیور اور دیسی اسکاٹ کی بندوق اونے پونے بیچ ڈالی۔ کچھ مال اُدھار خریدا۔ ابھی دکان ٹھیک سے جمی بھی نہ تھی کہ ایک انکم ٹیکس انسپکٹر آ نکلا۔ کھاتے، رجسٹریشن، روکڑ بہی اور رسید بک طلب کیں۔ دوسرے دن قبلہ ہم سے کہنے لگے "مشتاق میاں! سُنا آپ نے؟ بارہ سال جوتیاں چٹخاتا، دفتروں میں اپنی اوقات خراب کرواتا پھرا، کسی نے پلٹ کر نہ پوچھا کہ بھیا کون ہو! اب دل لگی دیکھئے، کل ایک انکم ٹیکس کا تیس مار خاں دندناتا آیا۔ لقّہ کبوتر کی طرح سینہ پھلائے۔ میں نے سالے کو یہ دکھا دی "یہ چھوڑ کر آئے ہیں"۔ چندرا کر پوچھنے لگا "یہ کیا ہے"؟ ہم نے کہا "ہمارے ہاں اسے محل سرا کہتے ہیں"۔

سچ جھوٹ کا حال مرزا جانیں کہ انھیں سے روایت ہے کہ اس محل سرا کا ایک بڑا فوٹو فریم کروا کے اپنے فلیٹ کی کاغذی سی دیوار میں کیل ٹھونک رہے تھے کہ دیوار کے اس پار والے پڑوسی نے آ کر درخواست کی کہ ذرا کیل ایک فٹ اُوپر ٹھونکیں تاکہ دوسرے سرے پر میں اپنی شیروانی لٹکا سکوں۔ دروازہ زور سے کھولنے اور بند کرنے کی دھمک سے اس زنگیائی کیل پر ساری محل سرا پنڈولم کی طرح جھولتی رہتی تھی۔ گھر میں کوئی ملنے والا یا نئی دلہن بھی آئی تو اسے بھی دکھلاتے "یہ چھوڑ کر آئے ہیں"۔

اس حویلی کا فوٹو ہم نے بھی بارہا دیکھا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کیمرے کو موتیا نظر آنے لگا ہے لیکن کیمرے کے ضعفِ بصارت کو قبلہ اپنے زورِ بیان سے دُور کر دیتے تھے۔ یوں بھی ماضی ہر شے کے گرد ایک رُومانی ہالہ کھینچ دیتا ہے۔ گزارا ہوا درد بھی سہانا لگتا ہے۔ آدمی کا جب سب کچھ چھن جائے تو وہ یا تو مست ملنگ ہو جاتا ہے یا کسی فینٹیسی لینڈ میں پناہ لیتا ہے۔

نہ ہو اگر یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

شجرہ اور حویلی بھی ایک ایسی ہی جائے اماں تھی۔ ممکن ہے بے ادب نگاہوں کو یہ تصویر میں ڈھنڈار دکھلائی دے، لیکن جب قبلہ اس کی تعمیراتی نزاکتوں کی تشریح فرماتے تو اس کے آگے تاج محل بالکل سیدھا سپاٹ گنوار و گھرونda معلوم ہوتا۔ مثلاً دوسری منزل پہ ایک دروازہ نظر آتا تھا جس کی چوکھٹ اور کواڑ جھڑ چکے تھے۔ قبلہ اسے فرانسیسی دریچہ بتاتے تھے۔ اگر یہاں واقعی کوئی ولایتی دریچہ تھا تو یقیناً یہ وہی دریچہ ہوگا جس میں جڑے ہوئے آئینۂ جہاں نما کو توڑ کر ساری کی ساری ایسٹ انڈیا کمپنی آنکھوں میں اپنے جوتوں کی دھول جھونکتی گزر گئی۔ ڈیوڑھی میں داخل ہونے کا جسے کواڑ پھاٹک تھا وہ دراصل شاہ جہانی محراب تھی۔ اس کے اوپر ایک ٹوٹا ہوا چھجا تھا جس پہ سر دست ایک چیل قیلولہ کر رہی تھی۔ یہ راجپوتی جھروکے کی باقیات بتائی جاتی تھیں، جن کے عقب میں ان کے دادا کے وقتوں میں پرانی قالینوں پہ آدھا مغلیائی طرز کی قوالی ہوتی تھی۔ پچھلے پہر جب نیند کے غلبے سے غلافی آنکھیں بند ہونے لگتیں تو وقفے وقفے سے نقرئی گلاب پاشوں سے حضارِ محفل پر عرقِ گلاب معطر چھڑکا جاتا۔ فرش اور دیواریں

قالینوں سے ڈھکی رہتی تھیں۔ فرماتے تھے کہ "جتنے پھول غلیچے پہ تھے وہ تے ہی باہر بغیچے میں تھے"۔ یہاں اطالوی مخمل کے سارچوبی زیر انداز پر گنگاجمنی منقش اگالدان رکھے رہتے تھے، جن میں چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی گلوریاں کی پیک جب تھوکی جاتی تو بلّوریں گلے میں اُترتی چڑھتی صاف نظر آتی، جیسے تھرمامیٹر میں پارا۔

وہ تراکوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

قبلہ کبھی ترنگ میں آتے تو اپنے اکلوتے بے تکلّف دوست رئیس احمد قدوائی سے فرماتے کہ جوانی میں مئی جون کی ٹیک دوپہریا میں ایک حسین دوشیزہ کا کوٹھوں کوٹھوں ننگے پاؤں ان کی حویلی کی تپتی چھت پر آنا، اب تک (مع ڈائلاگ) یاد ہے۔ یہ بات مرزا کی سمجھ میں آج تک نہ آئی۔ اس لیے کہ ان کی حویلی سہ منزلہ تھی، جب کہ دائیں بائیں پڑوس کے دونوں مکان ایک ایک منزلہ تھے۔ حسین دوشیزہ اگر ننگے پیر ہو اور زیورِ حیا اتارنے کے لیے اتاؤلی بھی ہو تب بھی یہ کرتب ممکن نہیں، تاوقتیکہ حسینہ ان کے عشق میں دوشیزہ ہونے کے علاوہ دولخت بھی نہ ہو جائے۔

پلکھن

فوٹو میں حویلی کے سامنے ایک چھتنار پلکھن* اُداس کھڑی تھی۔ اس کا تخم ان کے جدّ اعلیٰ سمندِ سیاہ زانو پر سوار، کارچوبی کام کے چغے میں چھپا کر قحط کے زمانے میں دمشق سے لائے تھے۔ قبلہ کے قول کے مطابق، ان کے پر دادا کے ابّا جان کہا کرتے تھے کہ "بے سروسامانی کے عالم میں یہ ننگِ خلائق، ننگِ اسلاف، ننگِ وطن ...... ننگے سر، ننگے پیر، گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر، ننگی تلوار ہاتھ میں لیے ..... خیبر کے سنگلاخ ننگے پہاڑوں کو پھلانگتا، واردِ ہندوستان ہوا"۔ جو تصویر وہ فخریہ کھینچتے تھے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس وقت بزرگوار کے پاس سترپوشی کے لیے گھوڑے کی دُم کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جائداد، محل سرا، خدّام، مال و متاع ...... سب کچھ وہیں چھوڑ آئے۔ البتہ اثاث البیت کا سب سے قیمتی حصّہ یعنی شجرۂ نسب اور پلکھن کا تخم ساتھ لے آئے۔ گھوڑا جو انہی کی طرح نجیب الطرفین اور وطنِ مالوف سے بیزار تھا، تخم اور شجرے کے بوجھ سے رانوں تلے سے نکلا پڑ رہا تھا۔

شجرے کی ہر شاخ پہ نابغہ بیٹھا تھا

زندگی کی دھوپ جب کڑی ہوئی اور پیروں تلے سے زمین جائداد نکل گئی تو آئندہ نسلوں نے اسی شجر اور شجرے کے سائے تلے بسرام کیا۔ قبلہ کو اپنے بزرگوں کی ذہانت و فطانت پر بڑا ناز تھا۔ ان کا ہر بزرگ نادرۂ روزگار تھا، اور ان کے شجرے کی ہر شاخ پہ ایک نابغہ بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

امپورٹڈ بزرگ اور یونانی ناک

وہ زمانے اور تھے، شرافت اور نجابت کے معیار بھی مختلف تھے۔ جب تک بزرگ اصلی امپورٹڈ یعنی ماوراء النہری اور خیبر کے اُس پار سے آئے ہوئے نہ ہوں، کوئی ہندوستانی مسلمان خود کو عزّت دار اور نجیب نہیں گردانتا تھا۔ غالب کو تو شیخی

---

*پلکھن: جن پڑھنے والوں نے یہ درخت نہیں دیکھا، وہ اس کی تصویر قرۃ العین حیدر کے "کارِ جہاں دراز ہے" میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ ہم نے بھی اس درخت کا فوٹو ہی دیکھا ہے۔ یہاں ہمارے پاس جتنے لغات ہیں ان میں یہ لفظ نہیں ہے۔ تذکیر و تانیث کا بھی علم نہیں۔ لیکن جس پیار اور للک سے اس کا ذکر کیا گیا اس پر ہم نے قیاس کیا کہ مؤنث ہی ہوگا۔

بگھارنے کے لیے اپنا (فرضی) استاد ملا عبدالصمد تک ایران سے امپورٹ کرنا پڑا۔ قبلہ کے بزرگوں نے جب بے روزگاری اور عسرت سے تنگ آکر وطن چھوڑا تو آنکھیں نم اور دل گداختہ تھے۔ بار بار اپنا دستِ افسوس زانوئے اسپ پر مارتے اور ایک راوی شیوہ بیان کے بقول، ایک دوسرے کی داڑھی پر ہاتھ پھیر کے استغفراللہ! استغفراللہ کہتے۔ تا نہ ولایت جس سے ملے، اپنے حسنِ اخلاق سے اس کا دل جیت لیا۔

پہلے جاں، پھر جانِ جاں، پھر جانِ جاناں ہو گئے

پھر یہ پیارے لوگ تبدریج

پہلے خاں، پھر خانخاں، پھر خانخاناں ہو گئے

حویلی کے آرکی ٹیکچر کی طرح قبلہ کے امراض بھی شاہانہ ہوتے تھے۔ بچپن میں دائیں رخسار پر غالباً آموں کی فصل میں پھنسی نکلی تھی جس کا داغ ہنوز باقی تھا۔ فرماتے تھے، جس سال میرے یہ اورنگ زیبی پھوڑا نکلا، اسی سال بلکہ اسی ہفتے ملکہ وکٹوریہ رانڈ ہوئی ساٹھ کے پیٹے میں آئے تو شاہجہانی حبس بول میں مبتلا ہو گئے۔ فرماتے تھے کہ غالب مغل بچہ تھا۔ ستم پیشہ ڈومنی کو اپنے زہرِ عشق سے مار ڈالا۔ مگر خود اسی، گویا کہ میرے والے عارضے میں مرا۔ ایک خط میں مرقوم ہے کہ جرعہ جرعہ پیتا ہوں اور قطرہ قطرہ خارج کرتا ہوں۔ دمے کا دورہ ذرا تھمتا تو قبلہ بڑے فخر سے فرماتے کہ فیضی کو بھی یہی مرض لاحق تھا۔ اس نے ایک قطعہ میں کہا ہے کہ دو عالم میرے سینے میں سما گئے، مگر آدھا سانس کسی طور نہیں سما رہا! اپنے والد مرحوم کے بارے میں فرماتے تھے کہ راج روگ یعنی اکبری سنگرہنی میں انتقال فرمایا۔ مراد اس سے آنتوں کی ٹی بی تھی۔ مرض تو مرض، قبلہ کی ناک تک اپنی نہیں تھی۔ یونانی بتاتے تھے۔

مژدہ" از غیب بروں آید و کارے بکند

قبلہ کو دو غم تھے۔ پہلے غم کا ذکر بعد میں آئے گا کہ وہ جانگسل تھا۔ دوسرا غم دراصل اتنا ان کا اپنا نہیں جتنا بیوی کا تھا جو بیٹے کی تمنا میں گھل رہی تھیں۔ اس غریب نے بڑی منتیں مانیں۔ قبلہ کو شربت میں نقش گھول گھول کر پلائے۔ ان کے تکیے کے نیچے تعویذ رکھے۔ چھپ چھپ کر مزاروں پر چادریں چڑھائیں۔ ہمارے ہاں لوگ جب زندوں سے مایوس ہو جاتے ہیں تو ایک ہی آس باقی رہ جاتی ہے۔

مژدہ از غیب بروں آید و کارے بکند

پچاس میل کے دائرے میں کوئی مزار ایسا نہ بچا جس کے سرہانے کھڑے ہو کر وہ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر نہ روئی ہوں کہ اہلِ قبر کے پسماندگان بھی تدفین کے وقت یوں نہ روئے ہوں گے۔ اس زمانے کے اہل القبور صاحبِ کرامات ہوں یا نہ ہوں، کم از کم قبر کے اندر ضرور ہوتے تھے۔ آج کل جیسا حال نہیں تھا کہ مزار اگر خالی از میت ہے تو غنیمت جانیے، ورنہ اللہ جانے اندر کیا دفن ہے جس کا اس دھوم سے عرس شریف منایا جا رہا ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ کراچی کے اخباروں میں ایسے اشتہار نہ دیکھتے ہوں کہ آج فلاں آستانہ عالیہ پر چادر شریف چڑھائی جا رہی ہے۔ پانچ بجے گاگر شریف، جلوس کی شکل میں لے جائی جائے گی۔ پھر اس سے مزار شریف کو غسل شریف دیا جائے گا۔ بعد نمازِ مغرب لنگر شریف تقسیم ہوگا۔ ہم نے بعض نو دریافت بزرگوں کے نو تعمیر مزاروں کے ضمن میں شریف پر تاکیداً اتنا زور دیکھا ہے کہ دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھنے لگتے ہیں۔ ہم نہ ضعیف الاعتقاد ہیں نہ دہلی

لیکن کراچی کے ایک مزار کے بارے میں، جو ہمارے سامنے پُر ہوا ہے، ہم بالاعلان یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں اس سے متعلق ہر چیز شریف ہے، سوائے صاحبِ مزار کے۔

خیر، یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا جو روانی میں پھیل کر پورا پیرا بن گیا۔ عرض یہ کرنا تھا کہ قبلہ خود کو کسی زندہ پیر سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ انھیں جب یہ پتا چلا کہ بیوی اولادِ نرینہ کی منت مانگنے چوری چھپے تا محرم معلیٰ کے مزاروں پر جانے لگی ہیں تو بہت خفا ہوئے۔ وہ جب بہت خفا ہوتے تو کھانا چھوڑ دیتے تھے۔ حلوائی کی دکان سے ربڑی، موتی چور کے لڈو اور کچوری لا کر کھا لیتے۔ دوسرے دن بیوی کاسنی رنگ کا دوپٹہ اوڑھ لیتیں اور ان کے پسندیدہ کھانے یعنی دو پیازہ، ڈیوڑھی شکر والا زردہ اور بہت تیز مرچوں کے ماش کے دہی بڑے کھلا کر انھیں منا لیتیں۔ قبلہ انہی مرغوبات پر اپنے ایرانی اور عربی النسل بزرگوں کی نیاز دلواتے۔ البتہ ان کے دہی بڑوں میں مرچیں برائے نام ڈلواتے۔ مزاروں پر حاضری قدغن بڑھا۔ بیوی بہت روئیں دھوئیں تو قبلہ کچھ پگھلے۔ مزاروں پر جانے کی اجازت دے دی، مگر اس شرط پر کہ مزار کا "مکین" ذات کا کمبوہ نہ ہو۔ کمبوہ مرد اور غزل گو شاعر سے پردہ لازم ہے، خواہ وہ مُردہ ہی کیوں نہ ہو۔ میں ان کے رگ و ریشے سے واقف ہوں۔" ان کے دشمنوں سے روایت ہے کہ قبلہ خود بھی جوانی میں شاعر اور ننھیال کی طرف سے کمبوہ تھے۔ اکثر فرماتے "رگِ کمبوہ جنبے دارد"

کٹ کھنے بلاؤ کے گلے میں گھنٹی

رفتہ رفتہ بیوی کو صبر آگیا۔ ایک بیٹی تھی۔ قبلہ کو وہ عزیز سے عزیز تر ہوتی گئی۔ انھیں اس حد تک صبر آگیا کہ اکثر فرماتے، خدا بڑا رحیم و کریم ہے۔ اس نے بڑا فضل کیا کہ بیٹا نہ دیا۔ اگر مجھ پر پڑتا تو تمام عمر خوار ہوتا۔ اور اگر نہ پڑتا تو نا خلف کو عاق کر دیتا۔

سیانی بیٹی، کتنی بھی چہیتی ہو، ماں باپ کی چھاتی پر پہاڑ ہوتی ہے۔ لڑکی ضرورتِ رشتہ کی اشتہاری اصطلاحوں کے مطابق، قبول صورت، سلیقہ شعار، خوش اطوار، امور خانہ داری سے بخوبی واقف۔ لیکن کس کی شامت آئی تھی کہ قبلہ کی بیٹی کا پیام دے۔ ہمیں آتشِ نمرود میں کودنے کا ذاتی تجربہ تو نہیں، لیکن وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ آتشِ نمرود میں بے خطر کود لے سے کہیں زیادہ خطرناک کام نمرود کے شجرہ نسب میں کود پڑنا ہے۔ جیسا ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، قبلہ ہمارے دوست بشارت کے پھوپا، چچا اور اللہ جانے کیا کیا لگتے تھے۔ کان اور کمان دونوں اعتبار سے ٹیڑھی بھی تھے۔ بشارت کے والد بھی رشتے کے حق میں تھے، لیکن رقعہ بھیجنے سے صاف انکار کر دیا کہ بھو کے بغیر بھی گزارا ہو سکتا ہے، لیکن ناک اور ٹانگ کے بغیر تو شخصیت نامکمل سی معلوم ہوگی۔ بشارت نے ریل کی پٹڑی سے خود کو بندھوا کر بڑی لائن کے انجن سے اپنی خودکشی کروانے کی دھمکی دی۔ رسیوں سے بندھوانے کی شرط خود اِس لیے لگا دی کہ عین وقت پر اُٹھ کر بھاگ نہ جائیں۔ لیکن ان کے والد نے صاف کہہ دیا کہ اس کٹ کھنے بلاؤ کے گلے میں تمہیں گھنٹی ڈالو۔

قبلہ "بدمغ" بدلحاظ، منہ پھٹ مشہور ہی نہیں، تھے بھی، وہ دل سے ۔۔۔۔۔ بلکہ بے دلی سے بھی ۔۔۔۔ کسی کی عزت نہیں کرتے تھے۔ دوسرے کو حقیر سمجھنے کا کچھ نہ کچھ جواز ضرور نکال لیتے۔ مثلاً اگر کسی کی عمر ان سے ایک مہینہ بھی کم ہوتو اسے لونڈا کہتے اور اگر ایک سال زیادہ ہو تو بُڑھو!

ب دس ۵ اور چار نقطے۔ بشارت نے اِن دنوں بی اے کا امتحان دیا تھا اور پاس ہونے کا امکان”

بقول ان کے ففٹی ففٹی تھا۔ ففٹی ففٹی اتنے زور، فخر اور وثوق سے کہتے تھے گویا اپنی کانٹا تول نصفا نصف نااتفاقی سے مستحق کو کوری آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ فرصت ہی فرصت تھی۔ کیرم اور کوٹ پیس کھیلتے۔ بُدھوں کو بلاتے اور ان سے ایسے سوال کرتے کہ زندوں کو حیا آتی۔ کبھی دن بھر بیٹھے نظیر اکبر آبادی کے کلیات میں وہ نقطے والے بلینک پُر کرتے رہتے جو منشی نول کشور پریس نے بہ تقاضائے تہذیب و تعزیراتِ ہند خالی چھوڑ دیے تھے۔ گفتگو میں ہر جملے کے بعد شعر کا "ٹھیکا" لگاتے۔ افسانہ نویسی کی مشق و مشقت بھی جاری تھی۔ نیاز فتح پوری کی اطلسی فقرہ طرازی اور ابوالکلام کی جھومتی جھامتی گج گامنی نثر کی چھاپ، ایک انہی پر موقوف نہیں، اچھے اچھوں کی طرزِ تحریر پر تھی۔ بعضوں پر ماتھے کے جھومر کی مانند۔ کچھ پر دھوبی کے نشان کی طرح۔ اور کچھ پر اس طرح جیسے انگریز ملاح اپنی محبوباؤں کی تصویریں جسم پر گُدوا لیتے ہیں۔ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔ کسی کی محتاجی نہیں۔ اردو نثر ان زمانے میں فیل پا میں مبتلا تھی۔ اس میں کچھ اِفاقہ ہوا تو معجونِ فلک سیر کھا کر ٹیگوری ادب پاروں کے اڑن غالیچے پر سوار ہو گئی۔ بشارت کے ایک افسانے کا کلائمکس کچھ اس طرح تھا:

"انجم آراء کی حسن آفرینیوں، سحر انگیزیوں اور حشر سامانیوں سے شام جاں معطر تھا۔ وہ لغزیدہ لغزیدہ قدموں سے آگے بڑھی اور فرطِ حیا سے اپنی اطلسی باہوں کو اپنی ہی دُزدیدہ آنکھوں پر رکھا۔ سلیم نے انجم آرا کے دستِ حنائی کو اپنے آہنی ہاتھ میں لے کر پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس کا ہیرا تراشی کلائی اور ساقِ بلوریں کو دیکھا اور گلنار سے لبوں پر .... حیا نقطے ثبت کر دیے۔" اس زمانے میں لفظ "بوسہ" فحش سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا اس کی جگہ نقطے لگا دیے جاتے تھے۔ بشارت گن گن کر اتنے ہی نقطے لگاتے جن کی اجازت اس وقت کے حالات یا ہیروئن نے دی ہو۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں انجمن ترقی اردو کے رسالے میں ایک مضمون چھپا تھا۔ اس میں جہاں جہاں لفظ بوسہ آیا، وہاں مولوی عبدالحق نے بربنائے تہذیب اس کے ہجے یعنی ب و س ہ چھاپ کر الٹا اس کی لذت و طوالت میں اضافہ فرما دیا۔ یہاں ہمیں ان کا یا اپنے حبیب لبیب کی طرزِ نگارش کا مذاق اڑانا مقصود نہیں۔ ہر زمانے کا اپنا اسلوب اور آہنگ ہوتا ہے۔ لفظ کبھی انگرکھا، کبھی عبا و عمامہ، کبھی ڈِنر جیکٹ یا ٹکسیڈو، کبھی پیر میں پائل یا بیڑی پہنے نظر آتے ہیں۔ اور کبھی کوئی مداری اپنی ناموسی ڈگڈگی بجاتا ہے تو لفظوں کے سیدھے سدھائے بندر ناچنے لگتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنا سنِ پیدائش اس طرح بتاتے ہیں:

"یہ غریب الدیار، عہد نا آشنائے عصر، بیگانۂ خویش، نمک پروردۂ ریش، خرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد مدعو بابی الکلام ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستی عدم سے اس عدمِ ہستی میں وارد ہوا اور تہمتِ حیات سے متہم۔"

اب لوگ اس طرح نہیں لکھتے۔ اس طرح پیدا بھی نہیں ہوتے۔ اتنی خجالت، طوالت و اذیت تو آج کل سیزیرین پیدائش میں بھی نہیں ہوتی۔

کوہِ آتش فشاں میں چھلانگ

بالآخر ایک سہانی صبح بشارت نے بقلم خود رقعہ لکھا اور رجسٹری سے بھجوا دیا حالانکہ مکتوب الیہ کے مکان کی دیوار ملی ہوئی تھی۔ رقعہ ۲۴ صفحات اور کم بیش پچاس اشعار پر مشتمل تھا جن میں سے آدھے اپنے اور آدھے عندلیب شادانی کے تھے جن سے قبلہ کے بالواسطہ مراسم تھے۔ اس زمانے میں رقعے زعفران سے لکھے جاتے تھے، لیکن اس رقعے کے لیے تو زعفران کا ایک کھیت بھی ناکافی

ہوتا۔ لہٰذا صرف القاب و آداب زعفران سے اور بقیہ مضمون سرخ روشنائی سے ڈیڑھ کے موٹے نب سے لکھا۔ جن حصوں پر بطورِ خاص توجہ دلانی مقصود تھی انہیں نیلی روشنائی سے باریک حروف میں لکھا۔ جملہ اگرچہ گستاخانہ لیکن لہجہ برابر فدویانہ اور مضمون بے حد خوشامدانہ تھا۔ قبلہ کے حسنِ اخلاق، شفقت، خوش خوئی، خوش معاملگی، صلہ رحمی، نرم گفتاری، مردانہ وجاہت ۔ ۔ ۔ مختصر یہ کہ ہر اس خوبی کی جی کھول کر تعریف کی جس کا شائبہ تک قبلہ کے کردار میں نہ تھا۔ ساتھ ساتھ قبلہ کے دشمنوں کی تمام و کمال ڈٹ کر برائی کی۔ ان کی تعداد اتنی تھی کہ ۲۳ صفحات کے کوزے میں بند کر کے کھول کرنا انہی کا کام تھا۔ بشارت نے جی کڑا کر کے یہ تو لکھ دیا کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں، لیکن اس وضاحت کی ہمت نہ پڑی کہ کس سے۔ مضمون بے ربط و ژولیدہ سہی لیکن قبلہ اپنے حسنِ سیرت اور دشمنوں کی حرمزدگیوں کے بیان سے بہت خوش ہوئے۔ اس سے پہلے ان کو کسی نے وجیہہ بھی نہیں کہا تھا۔ دو دفعہ پڑھ کر اپنے منشی کو پکڑا دیا کہ تم ہی پڑھ کر بتاؤ صاحبزادے کس سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ اوصاف تو میرے بیان کیے ہیں۔

قبلہ دیر تک اپنے مبیّنہ اوصافِ حمیدہ پر دل ہی دل میں اترایا کیے۔ گلیشیر تھا کہ پگھلا جا رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے، منشی جی سے گویا ہوئے، بعضے بعضے بے استادے شاعر کے اشعار میں کبھی کبھی الف گرتا ہے۔ اس کے اشعار میں تو الف سے لے کر ے تک سارے حروفِ تہجی ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے ہیں۔ جیسے عیدگاہ میں نمازی ایک دوسرے کی کمر پر رکوع و سجود کر رہے ہوں۔

بشارت کی جراتِ رندانہ کی کہانی جس نے سنی ششدر رہ گیا۔ خیال تھا کہ کوہِ آتش فشاں پھٹ پڑے گا قبلہ نے اگر از راہِ ترحم سارے خاندان کو قتل نہیں کیا تو کم از کم ہر ایک کی ٹانگیں ضرور توڑ دیں گے۔ یہ سب کچھ نہیں ہوا۔ قبلہ نے بشارت کو اپنی غلامی میں قبول کر لیا۔

ہوں لائقِ تعزیر یہ الزام غلط ہے

قبلہ کی ہیبت سب کے دلوں پر بیٹھی تھی، بجز دائیں جانب والے دکاندار کے۔ وہ قنوج کا رہنے والا، نہایت خودسر، ہتھ چھٹ بدمعاملہ اور بدزبان آدمی تھا۔ عمر میں قبلہ سے بیس سال کم ہوگا۔ یعنی جوان اور سرکش۔ چند سال پہلے تک اکھاڑے میں باقاعدہ زور کرتا تھا۔ پہلوان سیٹھ کہلاتا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ایک گاہک قبلہ کی سرحد میں ۳/۴ داخل ہو چکا تھا کہ پہلوان سیٹھ اسے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اپنی دکان میں لے گیا اور قبلہ "مہاراج! مہاراج!" پکارتے ہی رہ گئے۔ کچھ دیر بعد وہ اس کی دکان میں گھس کر گاہک کو چھڑا کر لانے کی کوشش کر رہے تھے کہ پہلوان سیٹھ نے ان کو وہ گالی دی جو وہ خود سب کو دیا کرتے تھے۔

پھر کیا تھا۔ قبلہ نے اپنے اسلحہ خانۂ خاص یعنی چارپائی سے پٹی نکالی اور ننگے پیر دوڑتے ہوئے اس کی دکان میں دوبارہ داخل ہوئے۔ گاہک نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی اور اولین غفلت میں اپنا دانت تڑوا کر مصالحتی کارروائی سے ریٹائر ہو گیا۔ دریدہ دہن پہلوان سیٹھ دکان چھوڑ کر بگٹٹ بھاگا۔ قبلہ اس کے پیچھے سرپٹ۔ تھوڑی دور جا کر اس کا پاؤں ریل کی پٹری میں الجھا اور وہ منہ کے بل گرا۔ قبلہ نے جا لیا۔ پوری طاقت سے ایسا وار کیا کہ پٹی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ معلوم نہیں اس سے چوٹ آئی یا ریل کی پٹری پر گرنے سے۔ وہ دیر تک بے ہوش پڑا رہا۔ اس کے گرد خون کی تلیا سی بن گئی۔

پہلوان سیٹھ کی ٹانگ کے MULTIPLE فریکچر میں گنگرین ہوگیا اور ٹانگ کاٹ دی گئی۔ فوجداری مقدمہ بن گیا۔ اس نے پولیس کو خوب پیسہ کھلایا۔ اور پولیس نے دیرینہ عداوت کی بناء پر قبلہ کا اقدامِ قتل میں چالان پیش کردیا۔ تعزیراتِ ہند کی اور بہت سے دفعات بھی لگادیں۔ لمبی چوڑی فردِ جرم سن کر قبلہ فرمانے لگے کہ ٹانگ کا نہیں، تعزیراتِ ہند کا ملٹی پل فریکچر ہوا ہے۔ پولیس گرفتار کرکے لے جانے لگی تو بیوی نے پوچھا "اب کیا ہوئے گا"؟ کندھے اُچکاتے ہوئے بولے "دیکھیں گے"! عدالت مجسٹریٹی میں بیچ بچاؤ کرنے والے گاہک کا دانت اور آلۂ قتل یعنی چارپائی مع خون پلائی ہوئی پٹی کے بطور EXHIBITS پیش ہوئے۔ مقدمہ سیشن سپرد ہوگیا۔ قبلہ کچھ عرصے ریمانڈ پر جوڈیشل حوالات میں رہے تھے۔ اب جیل میں باقاعدہ خونیوں، ڈاکوؤں، جیب کتروں اور عادی مجرموں کے ساتھ رہنا پڑا۔ تین چار مُٹھ بھیڑوں کے بعد وہ بھی قبلہ کو اپنا چچا کہنے اور ماننے لگے۔

ان کی طرف سے، یعنی بحیثیت وکیل صفائی، کانپور کے ایک لائق بیرسٹر مصطفےٰ رضا قزلباش نے پیروی کی۔ مگر وکیل اور موکل کا کبھی ایک نکتے پر بھی اتفاقِ رائے نہ ہو سکا۔ مثلاً قبلہ بضد تھے کہ میں حلف اٹھا کر یہ بیان دوں گا کہ مضروب نے اپنی ولدیت غلط لکھوائی ہے۔ اس کی صورت اپنے باپ سے نہیں، باپ کے ایک اوباش دوست سے ملتی ہے۔ بیرسٹر موصوف یہ موقف اختیار کرنا چاہتے تھے کہ چوٹ ریل کی پٹڑی پر گرنے سے آئی ہے نہ کہ ملزم کی مبینہ ضرب سے۔ اُدھر قبلہ کمرۂ عدالت میں فلمی بیرسٹروں کی طرح ٹہل ٹہل کر اور کٹہرے کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر یہ اعلان کرنا چاہتے تھے کہ میں سپاہی بچہ ہوں۔ دکانداری میرے لیے کبھی ذریعۂ عزت نہیں رہی۔ بلکہ عرصۂ دراز سے ذریعۂ آمدنی بھی نہیں رہی۔ ٹانگ پر وار کرنا ہماری شانِ سپہ گری اور شیوۂ مردانگی کی توہین ہے۔ میں تو دراصل اس کا سر پاش پاش کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اگر مجھے سزا دینی ہی ضروری ہے تو ٹانگ توڑنے کی نہیں، غلط نشانے کی دیجئے۔ ہول لائقِ تعزیر یہ الزام غلط ہے۔

ایامِ اسیری اور جوتوں کا "بلڈ ٹیسٹ"

عدالت میں فوجداری مقدمہ چل رہا تھا۔ قرائن کہتے تھے کہ سزا ہو جائے گی اور خاصی لمبی۔ گھر میں ہر پیشی کے دن رونا پیٹنا مچتا۔ اعزہ اور احباب اپنی جگہ پریشان اور سراسیمہ کہ ذرا سی بات پر تو یہ نوبت آگئی۔ پولیس انھیں ہتھکڑی پہنائے سارے شہر کا چکر دلا کر عدالت میں پیش کرتی اور پہلوان سیٹھ سے حق الخدمت وصول کرتی۔ بھولی بھالی بیوی کو یقین نہیں آتا تھا۔ ایک ایک سے پوچھتیں "بھیا! کیا سچ مچ کی ہتھکڑی پہنائی تھی؟" عدالت کے اندر اور باہر قبلہ کے تمام دشمن یعنی سارے شہر کا ہجوم ہوتا۔ سارے خاندان کی ناک کٹ گئی۔ مگر قبلہ نے کبھی منہ پر تولیہ اور ہتھکڑی پر رومال نہیں ڈالا۔ گشت کے دوران مونچھوں پر تاؤ دیتے تو ہتھکڑی چھن چھن چھن چھن کرتی۔ رمضان آئے تو کسی نے مشورہ دیا کہ نماز روزہ شروع کر دیجئے۔ اپنے کان پور کے* مولانا حسرت موہانی تو روزے میں چکی بھی پیستے تھے۔ قبلہ نے بڑی حقارت سے جواب دیا "لاحول ولاقوۃ! میں شاعر تھوڑا ہی ہوں۔ یہ نام ہوگا غمِ روزگار سہہ نہ سکا۔"

بیوی نے کئی مرتبہ پوچھا "اب کیا ہوئے گا؟"

ہر بار ایک ہی جواب ملا "دیکھ لیں گے"۔

کان ہی پور کے کانپور والے اکثر "کانپور کے" کہنے کے بجائے "کان ہی پور کے" کہتے ہیں!

طیش کے عالم میں جو بات منہ سے نکل جائے یا جو حرکت سرزد ہو جائے، اس پر انھیں کبھی نادم ہوتے نہیں دیکھا۔ فرماتے تھے کہ آدمی کے اصل کردار کی جھلک تو طیش کے کوندے میں ہی دکھائی دیتی ہے چنانچہ اپنی کسی کرتوت یعنی اصل کردار پر پشیماں یا پریشان ہونے کو مردوں کی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔
ایک دن ان کا بھتیجا شام کو جیل میں کھانا اور جوئیں مارنے کی دوا دے گیا۔ دوا کے اشتہار میں لکھا تھا کہ اس کے ملنے سے جوئیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ پھر انھیں آسانی سے پکڑ کر مارا جا سکتا ہے۔ جوں اور لیکھ مارنے کی مروجہ ترکیب بھی درج تھی۔ یعنی جوں کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر رکھو اور دائیں انگوٹھے کے ناخن سے چٹ سے کچل دو۔ اگر جوں کے پیٹ سے کالا یا گہرا عنابی خون نکلے تو فوراً ہماری دوا "اکسیر جالینوس" مصفی خون پی کر اپنا خون صاف کیجیے۔ پرچے میں یہ ہدایت بھی تھی کہ دوا کا کورس اس وقت تک جاری رکھیے جب تک کہ جوں کے پیٹ سے صاف شدہ سرخ خون نہ نکلنے لگے۔ قبلہ نے جنگلے کے اس طرف سے اشارے سے بھتیجے کو کہا کہ اپنا کان میرے منہ کے قریب لاؤ۔ پھر اس سے کہا کہ برخوردار! زندگی کا بھروسا نہیں۔ دنیا، اس جیل سمیت، سرائے فانی ہے۔ غور سے سنو۔ یہ میرا حکم بھی ہے اور وصیت بھی۔ لوہے کی الماری میں دو ہزار روپے آڑے وقت کے لیے ردی اخبار علا کے نیچے چھپا آیا تھا۔ یہ رقم نکال کر الن (شہر کا نامی غنڈہ) کو دے دینا۔ اپنی چچی کو میری طرف سے دلاسا دینا۔ الن کو میری دعا کہنا اور یہ کہنا کہ ان چھوں کی ایسی ٹھکائی کرے کہ گھر والے صورت نہ پہچان سکیں۔ یہ کہہ کر اخبار کا ایک مسلا ہوا پرزہ بھتیجے کو تھما دیا، جس کے حاشیہ پر ان چھ گواہان استغاثہ کے نام درج تھے، جن کو پٹوانے کا انھوں نے جیل میں اسی وقت منصوبہ بنایا تھا جب ایسی ہی حرکت پر انہیں آج کل میں سزا ہونے والی تھی۔
ایک دفعہ اتوار کو ان کا بھتیجا جیل میں ملاقات کو آیا اور ان سے کہا کہ جیلر تک بآسانی سفارش پہنچائی جا سکتی ہے۔ اگر آپ کا جی کسی خاص کھانے مثلاً زردہ یا دہی بڑے، شوق کی مثنوی، سگرٹ یا مہوے کے پان کو چاہے تو چوری چھپے ہفتے میں کم از کم ایک بار آسانی سے پہنچایا جا سکتا ہے۔ چچی نے تاکید سے کہا ہے عید نزدیک آ رہی ہے۔ رو رو کر آنکھیں سجالی ہیں۔
قبلہ نے جیل کے کھدر کے نیکر پر دوڑتا ہوا کھٹمل پکڑتے ہوئے کہا، مجھے قطعی کسی چیز کی حاجت نہیں۔ اگلی دفعہ آؤ تو سراج فوٹو گرافر سے حویلی کا فوٹو کھنچوا کے لے آنا۔ کئی مہینے ہو گئے دیکھے ہوئے۔ جدھر تمہاری چچی کی چق ہے، اس رخ سے کھینچے تو اچھی آئے گی۔
سزا ہو گئی۔ ڈیڑھ سال قید بامشقت۔ فیصلہ سنا۔ سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ گویا آسمان سے پوچھ رہے ہوں تو دیکھ رہا ہے! یہ کیا ہو رہا ہے؟ "HOWS THAT" پولیس نے ہتھکڑی ڈالی۔ قبلہ نے کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ جیل جاتے وقت بیوی کو کہلا بھیجا کہ آج میرے جدِ اعلیٰ کی روح پر فتوح کتنی مسرور ہو گی کہ تمہارا خوش نصیب ہی ہو تم کہ تمہارا دولہا [جی ہاں! یہی لفظ استعمال کیا تھا] مردوں کا زیور پہنے جیل جا رہا ہے۔ مہندی کی مانگ نکوا کر گھر میں آپ دو رکعت نماز شکرانے کی پڑھنا۔ بھتیجے کو تاکید کی کہ حویلی کی مرمت کراتے رہنا۔ اپنی چچی کا خیال رکھنا۔ ان سے کہنا، یہ دن بھی گزر جائیں گے۔ دل بھاری نہ کریں اور جمعہ کو کاسنی دوپٹا اوڑھنا نہ چھوڑیں۔
بیوی نے پچھوایا، اب کیا ہوگا؟ جواب ملا، دیکھا جائے گا۔ [illegible]

منظور الامین
(حیدرآباد)

شیر کی ہنسی

نومبر کے مہینے میں وادیٔ کشمیر میں سورج کی چاندنی دن بھر چھٹکی رہتی ہے مگر اس میں تمازت نہیں ہوتی فضا میں خنکی ہوتی ہے جو آہستہ آہستہ رگ و پے میں سرایت کرتی جاتی ہے۔ کشمیر میں لوگ کہتے ہیں برف سے پہلے کی دھوپ شیر کی ہنسی ہے بالکل اسی طرح جیسے شیر اپنے سامنے زندہ بھیڑ یا بکری کو دیکھ کر ہنستا رہتا ہے، اس غریب جانور کو اس بات کا علم ہوتا ہے کہ یہ ہنسی ہنسی نہیں بلکہ ہز مجسٹی اس کی بے بسی کا مذاق اڑا رہے ہیں کیوں کہ وہ معصوم یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ اعلیٰ حضرت کسی بھی وقت اپنی ہنسی ختم کر کے اپنے لنچ یا ڈنر کا آغاز کر سکتے ہیں اسی لیے تو کسی نے یہ مشورہ دیا ہے کہ کتے کے بھونکنے سے بھی ڈرتے رہو کیوں کہ کیا پتہ کس وقت وہ بھونکنا ختم کر دے اور کاٹنا شروع کر دے،

کہتے ہیں بھیڑ یا بکری پر شیر کی ہنسی سے ایک سکتہ سا طاری ہو جاتا ہے اسی طرح وہ لوگ جو اس موسم میں برف کے اس علاقے میں رہتے ہیں، جانتے ہیں کہ یہ دھوپ، مانگے کی دھوپ ہے عارضی ہے کیونکہ سردی تیز ہونے پر دھوپ تو ہو جائے گی غائب اور ہو جائیں گے حاضر بادلوں کے بستر سے اور پھر برف! لہٰذا اس دھوپ کو ہمدرد اور غم گسار نہیں مانا جا سکتا،

ذرا آپ ہماری زبان کے صوتی لب و لہجے پر غور فرمائیے، ابھی ابھی ہم نے ایک خونخوار جانور کا ذکر کیا جسے شیر کہتے ہیں، شیر سہ حرفی لفظ ہے جو تین حرفوں کا مرکب ہے یعنی ش، ی اور ر، قریب قریب اسی صوتی آہنگ کا ایک لفظ ہماری زبان میں اور بھی ہے شعر، اس کے ہجے تو الگ ہیں لیکن عام بول چال میں اس کا تلفظ لگ بھگ وہی ہے، شعر بھی تین حرفی لفظ ہے جو ش ع اور ر کا مرکب ہے، اکثر ہم اس لفظ کے درمیانی حرف ع کو اس کے پورے مخرج اور اپنے گلے کی پوری توانائی اور شدت کے ساتھ ادا کرتے ہیں، اس مضمون کو پڑھتے ہوئے کوشش کیجیے کہ لفظ شعر بولتے ہوئے اس کے درمیانی حرف ع کو آپ بھی اسی مخرج اور توانائی کے ساتھ ادا کریں جس کی اہل زبان آپ سے امید رکھ سکتے ہیں۔

جملہ معترضہ کے طور پر ہمیں یاد آیا، اسی طرح کے ایک تشدید یا یوں کہیے شدت پسند ایک دن ایک حلوائی کی دکان پہ گئے اور پورے کھرج کے ساتھ اس سے پوچھا "کیوں بھئی کیا تمہارے پاس شیرہ (شعرہ) ہے؟" حلوائی نے جواب دیا "جناب ہمارے پاس شیرہ ہے تو لیکن، اتنا گاڑھا نہیں۔"

خیر تو ذکر ہو رہا تھا شعر کا اور شیر کا اور بھیڑ کا اور بھیڑ کے گلے کا، گلے کے ساتھ بات آ پہنچی شعر و سخن کے دائرے

تک اور یہ بھی حسن اتفاق ہی ہے کہ شاعر بلکہ یہ کہیے متشاعر کے شعر میں سکتہ ہوا کرتا ہے کچھ ایسے :

سکتہ تھا ایک شاعرِ اعظم کے شعر میں — یہ دیکھ کر تو میں بھی تعجب میں پڑ گیا
پوچھی جو اس کی وجہ تو کہنے لگے جناب ، سردی بہت شدید تھی مصرع سکڑ گیا

اس میں کیا شک ہے کہ وادیٔ کشمیر میں یا اسی طرح کے برفانی علاقوں میں ٹھنڈ سے چیزیں تو کیا انسان تک سکڑ جاتے ہیں۔ جب ٹمپریچر منفی میں چلا جاتا ہے تو بس پھر درجۂ حرارت گرتا ہی چلا جاتا ہے ، اس کو درجۂ حرارت نہیں ہمارے خیال میں درجۂ عداوت کہنا چاہیے مبالغہ ہی سہی لیکن لوگ کہتے ہیں جب شدید سردی ہوتی ہے تو الفاظ تک جم جاتے ہیں۔

الفاظ جم جانے پر یاد آیا دو نوجوان اپنے اپنے داداؤں (بمبئی والا دادا نہیں بلکہ اصلی دادا) کے کارہائے نمایاں پر گفتگو کر رہے تھے ایک نے مصرع طرح عرض کیا "بھیا" ، ہمارے دادا کی کیا بات ہے ، ان کے پاس اتنا بڑا بانس تھا کہ وہ اس سے بادلوں میں چھید کر دیتے تھے اور تب آسمان سے موسلا دھار بارش ہونے لگتی تھی" دوسرے جوان نے اس پر گرہ لگائی" ہمارے دادا کشمیر میں رہتے تھے ، جب برفوں کے موسم میں وہ کسی سے بات کرتے تھے تو الفاظ ان کے منہ سے نکلتے ہی جم جایا کرتے تھے۔ جب لوگ موم بتی جلا کر ان الفاظ کو پگھلاتے تب سننے والا دادا کی بات کو سن پاتا تھا"

اس سچویشن پر غور فرمائیے کہ کسی ایسے ہی علاقے میں جہاں شدید برف باری ہو رہی ہو اگر کسی عاشق نے اپنی محبوبہ سے کہا "مجھے تم سے محبت ہے" اور یہ الفاظ جم گئے تو محبوبہ کو اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا جب تک THAW شروع ہو یعنی برف پگھلے تب کہیں یہ الفاظ اس کے کانوں کو گرمیٔ محبت پہنچائیں گے یعنی کئی مہینوں کے بعد ، کیا آج کے راکٹ AGE کی لڑکی محبت کے الفاظ سننے کے لیے مہینوں انتظار کی شدت سہنا پسند کرے گی ؟ شاید نہیں ! اور اب جب کہ موسم کی بات چل ہی نکلی ہے تو ذرا سا آئیے ہم آپ کو بتائیں کہ ادھر ہمارے گھر کا مطلع کیسے اور کیوں ابر آلود بلکہ برف آسا ہو رہا ہے ؛

ویسے تو بیوی سے ہمارے تعلقات عام طور پر خوش گوار رہا کیے ہیں لیکن کبھی کبھار مقطع میں سخن گسترانہ بات آ ہی جاتی ہے تب بادل گھر آتے ہیں اور گھر کے اندر ہی طوفان امڈ آتا ہے اور ایک قسم کی سرد جنگ شروع ہو جاتی ہے ،

بزرگو اور دوستو! یہ سرد جنگ بھی عجیب چیز ہوتی ہے ، ویسے جنگ ایک "نامعقول شے" ہے جو انسانوں نے مسئلوں کو حل کرنے کے لیے ایجاد کی ہے۔ لیکن جنگ خود ایک مسئلہ ہے بھلا یہ کیا مسئلوں کا حل کرے گی۔ بہر حال پھر بھی لوگ انفرادی اور اجتماعی ، دونوں طور پر لڑتے ہیں ، ایک دوسرے کو نوچتے پھاڑتے ہیں ، تو پیں داغتے ہیں ، لاکھوں مر جاتے اور پھر صلح نامہ مرتب ہوتا ہے ، ریڈیو اور ٹیلی وژن پر گانے بجتے ہیں ؛ بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر! تو آئیے ہم آپ کو بتائیں سرد جنگ نے اس خاکسار کے گھر کی کنڈلی کیسے اور کیوں کھٹکھٹائی ، غریب خانے کے مطلع پر بادل کیسے چھا گئے یعنی وہ سخن گسترانہ واقعہ کیا ہوا ؟ تو سنیے وہ سرگزشت ؛

ہوا یہ کہ —— اور اس کی ذمہ داری سراسر ہمارے سر ہے —— صبح صبح ہم شیو SHAVE کر رہے تھے —— شیو کے لیے ہم عام طور پر استرا استعمال کرتے ہیں —— ہم اس مردانہ کام میں مشغول تھے اور ہمارا زنانہ اس

اوقت ہمارے سامنے ہی برآمدے میں چاقو سے لیمو چھیل رہا تھا۔ اتنے میں پڑوس کے پنڈت جی کا چھوٹا پتر ہمارے گھر میں داخل ہوا، پنڈت جی یونیورسٹی میں ہندی پڑھاتے ہیں اور حال ہی میں وہ ہمارے پڑوس میں رہنے آئے ہیں۔ ان کا ورتھ کا بیٹا ہندی اور انگریزی فرفر بولتا ہے بلکہ فرفری بھاشا بھی خوب بولتا ہے، فرفری بھاشا وہ بھاشا ہے جس کے ہر لفظ میں ــــ بلکہ کئی دفعہ ایک ہی لفظ میں دوبار ــــ 'ف' کا حرف جوڑ دیا جاتا ہے، مثال کے طور پر اگر کہنا ہو "تم پاگل تو نہیں ہو گئے" اور اگر پنڈت جی کے اس سپتر سے کہیں کہ بیٹے ذرا اس فقرے کو تم فرفری بھاشا میں کہہ سناؤ تو وہ اس جملے کو فوراً یوں ادا کردے گا:

تُفَم پَفا گَفَل تَفو نَفیں ہَفو گَفئے

بڑا مزا آتا ہے پنڈت جی کے اس ہونہار بروا کا' اس گپت یعنی خفیہ بولی کو سن کر، خیر تو یہ صاحبزادے گھر میں آئے اس کے بعد ہمارے اور ان کے بیچ جو ڈائیلاگ ہوئے اسے ہم قوم تک پہنچا دینا چاہیں گے:

پنڈت جی کا پتر: نمسکار چاچا جی۔

ہم: نمسکار بیٹے، کہو ٹھیک ہو؟

پنڈت جی کا پتر: دیا ہے آپ کی چاچا جی ــــ ہم یوں آئے ہیں کہ پتا جی نے پوچھا ہے کیا آپ کے پاس استری ہے؟

ہم: ہاں بیٹا ہے ــــ (بیوی کی طرف اشارہ کرکے) وہ بیٹھی ہے سامنے برآمدے میں۔

پنڈت جی کا پتر: (جھینپ کر) شما کریں چاچا جی وہ نہیں۔ ہمارے پتا جی نے تو اس استری کے بارے میں پوچھا ہے جو شاک (SHOEK) دیتی ہے'

ہم: ارے بیٹا وہی ہے، ذرا ہاتھ لگا کے تو دیکھ!

انگریزی بھاشا میں کہتے ہیں ارے فلاں صاحب کا گھر WALKING DISTANCE پر ہے یا وہ STONE THROWING DISTANCE پر رہتے ہیں' اسی طرح ایک چیز ہوتی ہے HEARING DISTANCE تو ہماری بیوی بس انھیں تین دوریوں کی نزدیکی پر تھیں کہ بڑے اور بچے کے بیچ جو شاہی درد ڈائیلاگ ابھی ابھی ہوا وہ بیوی نے حرف بہ حرف سنا، ان مکالموں کو سن کر انھوں نے پہلے تو ہمیں قدرے مسکراہٹ، پھر ذرا سی لگاوٹ اور اس کے فوراً بعد سارے بدن کی تھرتھراہٹ کے ساتھ دیکھا' اس تھرتھراہٹ یا کپکپاہٹ میں ہمیں ان کے غصے کی آہٹ بھی سنائی دی اس ایک ظالم نظر کو دیکھ کر ہمیں اچانک خیال آیا کہ ہم کوئی یوسف تو نہیں اور نہ بیوی زنانِ مصر میں سے ہیں کہ ہمیں بس ایک نظر دیکھ کر چاقو سے لیمو کاٹنے کی جگہ اپنی انگلی کاٹ لیں۔

ان کی مسکراہٹ نے تو ہمارا دل موہ لیا تھا لیکن اس کے بعد ان کی لگاوٹ تو شیر کی ہنسی تھی کیوں اس کے فوراً بعد ہی ان کے چہرے کا جغرافیہ بدلا، ساتھ ہی انھوں نے پہلو بدلا اور اس طرح ان کے محل وقوع میں بھی تبدیلی آگئی۔ غصہ

کے شدید آثار سارے بدن کی تھرتھراہٹ کی شکل میں نمودار ہوئے جیسے بادل گرجنے کو ہوں واضح ہو کہ یہ جنگ سے پہلے کے بادل تھے، دوسرے لفظوں میں یہ سرد جنگ کا آغاز تھا، اس مقام پر ذرا دیر سانس لے کر آئیے ہم آپ کو بتائیں کہ گھر کی سرد جنگ میں ہوتا کیا ہے اور ہمارے ساتھ یہی کچھ ہوتا بھی ہے۔

بیوی اپنے تمام نسوانی ہتھیاروں کا استعمال آزادی سے کرتی ہیں اور بے چارہ شوہر
غنیم وقت کے حملے سے اس کو خوف آتا ہے۔۔
وہ کاغذ کے سپاہی کاٹ کر لشکر بناتا ہے

بے وقوف شاعر اپنی محبوبہ کو دعا دیتے ہیں کہ چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ، مگر ہماری بیوی کی آنکھوں سے ایسے موقعوں پر کسی طرح کی چنگاریاں نکلنے لگتی ہیں جیسے دیوالی کے موقع پر انار چھوٹتے ہوں، حسین پیشانی پر پے در پے لہریں بلکہ شکنیں نمودار ہوتی ہیں، ابروئے جانانہ خنجر بن جاتا ہے، دراز پلکیں سکڑ جاتی ہیں۔ دونوں لب ایک دوسرے سے چپک جاتے ہیں کہ کھولے نہیں کھلتے، زبان ویسے تو خاموش رہتی ہے لیکن نادر الفاظ اندر ہی اندر تشتے رہتے ہیں ایسے الفاظ جن کا سننا ایک مرد کی انا کو ٹھیس پہنچا سکتا ہے، دماغ میں طوفان اٹھنے لگتے ہیں۔ قیافے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوالا مکھی اندر ہی اندر ابل رہا ہے، شیر کی دھاڑ اندر ہی اندر صورت پذیر ہو رہی ہے، ان سے معذرت کے ساتھ ہم کہنا چاہیں گے کہ ایسے اوقات میں وہ ہمیں کچھ کچھ SPHINX سے مشابہ نظر آتی ہیں جس کا بدن مثل شیر کے اور چہرہ مثل عورت کے ہوتا ہے، اگر ایسے موقع پر کچھ پوچھنے کی کوشش کی جائے تو بس سناٹے کی ایک گونج سنائی دیتی ہے، تب یہ خاکسار صرف اس شعر کی گردان کرتا نظر آ سکتا ہے:

وہ مرے دل کی دھڑک سے بھی نہ برہم ہو جائے
ایسے طوفان میں اسے پیار کروں یا نہ کروں

اور جب یہ طوفان پھوٹ پڑتا ہے تو لگتا ہے جیسے ٹین کی چھت پر اولے گر رہے ہوں۔

بہرحال اس وقت غلطی ہماری ہی تھی کیوں کہ ہنسی ہنسی ہی میں ہم نے انھیں سرد جنگ پر مجبور کر دیا تھا، اب ذرا اس سرد جنگ کا منظر نامہ (SCENARIO) ملاحظہ فرمائیں:

بیوی ہمارے سامنے تھیں ہم ان کے سامنے تھے یعنی دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ بیوی کے ہاتھ میں چاقو تھا، ہمارے ہاتھ میں استرا تھا یعنی دو ہتھیار بند ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ آج کی جنگ کی اصطلاح میں HIGH INTENSITY WAR کی نہیں بلکہ LOW INTENSITY CONFLICT کی سچویشن تھی، ہم نے اکثر دیکھا اور محسوس کیا ہے کہ ہم بیوی سے بات کرتے ہوئے انھیں کسی نہ کسی بات پر غصہ دلا دیا کرتے ہیں نادانستہ طور پر اور پھر اس طرح کی سچویشن سے ہمارے لیے نپٹنا مشکل ہو جاتا ہے ہماری اس طرح کی

حرکت کی مثال چوڑی دار پیجامے کی سی ہے جسے پہننا تو نسبتاً آسان ہوتا ہے لیکن جبریں بے جا لگانا مشکل ہوا کرتا ہے اس واقعے کے بعد ہم نے طے کیا کہ :

(الف) جب کبھی بیوی چاقو لے کر لیمو کاٹنے بیٹھیں گی ہم اس وقت استرے کر شیو ہرگز نہیں کریں گے۔

(ب) جب کبھی پڑوس کے پنڈت جی کا پُتر گھر میں آئے گا تو اس سے پہلے کہ وہ سوال کرے ہم کپڑے پہ استری کرنے والی اس کے ہاتھ میں تھما کر فرفری بجا نے کے اس ماہر کا منہ بند کر دیا کریں گے۔

اس پر بھی اگر کبھی مقطع میں سخن گسترانہ بات آ ہی جائے تو اعترافِ شکست کر کے چند ہی لمحوں کے بعد ہم بیوی کے سامنے سفید جھنڈا اٹھائے پہنچ جایا کریں گے اور ہم ایسا کیوں نہ کریں جب کہ :

آں پر تو گنہ گار کا سب حال عیاں ہے!

غزل

پاگل عادل آبادی

بھنگ کا کھا کر پکوڑا رات کے بارہ بجے
اُس نے دروازہ جھنجھوڑا رات کے بارہ بجے

بھوتنی کا رول اک دن اُس نے ناٹک میں کیا
بھوت اُس کے پیچھے دوڑا رات کے بارہ بجے

سائیکل پنکچر تھی لیکن اُس کو بٹھا کر ہم ڈبل
اُس کو اُس کے میکے چھوڑا رات کے بارہ بجے

بیوی بچے چھوڑ کر بس ہیرو بننے کے لیے
بمبئی بھاگا بھگوڑا رات کے بارہ بجے

شہر میں ہے کرفیو ہڑتال پر ہیں ڈاکٹر
کس سمے سر اُس نے پھوڑا رات کے بارہ بجے

صبح چندی کا مجھے مُرغا کھلایا شوخ نے
پیٹ میں اُٹھا مروڑا رات کے بارہ بجے

آج کل تو دن میں بھی پڑتے ہیں ڈاکے بے دھڑک
کیوں کھُلا دروازہ چھوڑا رات کے بارہ بجے

توبہ توبہ اُس کے کوچے میں نہ جاؤں گا کبھی
مجھ کو کتوں نے بھنبھوڑا رات کے بارہ بجے

○

خوش دل خانپوری
بلند شہر، یوپی

غالب سے دو دو ہاتھ

گڑ شکر دال ڈالڈا کیا ہے
لکڑیاں، تیل کوئلہ کیا ہے
اُن کا بازار میں پتا کیا ہے
چھوڑ بے کار ڈھونڈنا کیا ہے
'دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے'

لیڈروں جیسی شان رکھتا ہوں
روٹی کپڑا مکان رکھتا ہوں
کار بھی عالی شان رکھتا ہوں
اِس پہ دل بھی جوان رکھتا ہوں
'میں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے'

اب شکایت بھی اُن سے ہے بے کار
کون سُنتا ہے، کون ہے غم خوار
ہیں حکومت میں جن کے رشتے دار
اُن کی مُٹھی میں ہے آج کل سرکار
'ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے'

جن کا تاریخ میں نہیں تھا وجود
بن کے بیٹھے ہیں آج وہ نمرود
قوم کا مال کھا گئے مردود
سُن غریبوں کی اے مرے معبود
'جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے'

انصاری رفیع احمد (مالیگاؤں)

غریبی ہٹائیے

(ایک الکشنی تقریر)

پیارے بھائیو اور بہنو! [میرے ووٹرو]

پہچانا آپ لوگوں نے مجھے؟ میں . . . . وہی آپ کا پرانا خادم، ایک بار پھر آپ لوگوں کی سیوا کرنے حاضر ہوا ہوں۔ کچھ یاد آیا آپ لوگوں کو؟ آج سے ٹھیک پانچ سال پہلے اسی جگہ کھڑے ہو کر میں نے آپ لوگوں سے کچھ وعدے کیئے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ اگر آپ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے بچے دودھ کی گنگا میں نہائیں، شہد کی جمنا میں غوطے لگائیں، ہر غریب کے پاس بنگلہ ہو، ہر فقیر ٹی وی کا مالک بن جائے، ڈالڈا کے بھاؤ میں اصلی گھی بِلنے لگے۔ ہر بیکار "باکار" ہو جائے تو الکشن میں مجھے ووٹ دینا ہوگا۔ میں نے غریبی ہٹانے کا دعویٰ بھی کیا تھا۔ آپ لوگوں نے مجھے ووٹ دیئے۔ آپ کی دعاؤں نے مجھے منسٹر بنایا۔ میں نے ٹی وی پر آپ لوگوں کا شکریہ بھی ادا کیا تھا۔ آپ کی بستی میں شاید ٹی وی بہت کم ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں، آج نہیں تو کل ضرور ہر گھر میں ٹی وی لگ جائیں گے۔ جنتا کی چنتا کرنا تو میں اپنا دھرم سمجھتا ہوں۔

پیارے بھائیو! میں یہاں آیا تو مجھے ایسا بتایا گیا کہ آپ مجھ سے کچھ ناراض ہیں۔ آپ کو شکایت ہے کہ الکشن میں چن کر پارلیمنٹ میں جانے کے بعد آپ لوگوں کو بھول گیا۔ پانچ سال میں ایک مرتبہ بھی آپ کو اس رُخِ روشن کا درشن نہیں ہوا ــــــــ آپ کی ناراضگی درست ہے۔ آپ کو مجھ پر خفا ہونے کا حق ہے۔ (مگر یہ شاطر چھینکنے کا نہیں) آدمی اسی سے ناراض ہوتا ہے جس کو دل و جان سے اپنا سمجھتا ہے میں تو آپ کا اپنا ہی ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ منسٹر بننے کے بعد آدمی کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ اس کے کاندھوں پر سارے دیش کی ذمہ داری آجاتی ہے۔ اسے دن رات مختلف مسائل گھیرے رہتے ہیں۔ ایک مسئلہ حل نہیں ہوتا کہ دوسرا سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہاں تو ہر ہندوستانی ایک مسئلہ ہے۔ میں حکومت کے سامنے تجویز رکھوں گا کہ وہ مسائل کی صحیح تعداد معلوم کرنے کے لیے ایک مسائل شماری کمیشن مقرر

کرے۔ اس کام میں لاکھوں روپیہ بھی صرف ہوجائیں تو کوئی پرواہ نہیں۔ (کہاں اپنی جیب سے خرچ ہوتا) منتریوں کو معلوم تو ہو جائے گا کہ انھیں کتنے مسائل کو چاروں شانے چت کرنا ہے۔ جنتا کی چنتا کرنا تو ہمارا فرض ہے۔ (آپ امریکہ کیوں گئے تھے؟۔ ایک آواز)

بھائیو! میں امریکہ گیا تھا۔ ضرور گیا تھا۔ (بچپن سے امریکہ دیکھنے کی آرزو تھی)۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے مجھے امریکہ جانا پڑا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ گرمی کا موسم تھا۔ آپ لوگوں کا دُکھ درد دُور کرنے کے لیے ایک میٹنگ لینی تھی۔ اس دیش سے غریبی کیسے ہٹائی جائے، اس نازک مسئلے پر اپنے دماغ کی ٹارچ سے روشنی ڈالنی تھی۔ دہلی کی گرمی سے تو آپ واقف ہوں گے۔ لہٰذا طے یہ پایا کشمیر کی حسین وادیوں میں بیٹھ کر جنتا کی چنتا کو دُور کیا جائے۔ چنانچہ میں بھی کشمیر گیا۔ کشمیر کی سرد ہوا سے مجھے زکام ہوگیا۔ ناک سے گنگا جمنا بہنے لگی۔ اس دریا پہ بند باندھنے میں یہاں کے ڈاکٹر ناکام ہو گئے تو مجھے مجبوراً امریکہ جانا پڑا۔ منتری قوم کا سب سے بڑا خادم ہوتا ہے۔ اس کی زندگی ساری قوم کی زندگی ہوتی ہے۔ وہاں علاج پہ چار پانچ لاکھ روپے خرچ ہوئے۔ (جو آپ ہی کے جیبے تھے ہمارے نہیں) بہرحال جنتا کی چنتا کرنا میں اپنا دھرم سمجھتا ہوں۔

پیارے بھائیو! کل مجھے ایک خط ملا۔ خط میں کیا لکھا تھا؟ خط میں لکھا تھا کہ مُفلسوں کا خُدا ہی حافظ ہے۔ غریبی کب دُور ہوگی؟ خط کا مقصد یہی ہے کہ غریبی دُور نہیں ہوئی۔ پانچ سال پہلے جو غریب تھے، اب فقیر ہو گئے اور امیر، وزیر بن گئے۔ میں نے غریبی ہٹانے کا وعدہ ضرور کیا تھا۔ آج بھی کرتا ہوں۔ لیکن میرے پاس الہ دین کا چراغ نہیں ہے کہ غریبی کو منٹوں میں دُور کر دوں۔ آج الہ دین کے چراغ کا جن بھی آجائے تو ان کروڑوں غریبوں کو دیکھ کر ہندوستان چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔ حاتم طائی، جس کی سخاوت کا دنیا میں ڈنکا بجتا ہے، ہماری جگہ ہوتو کب کا لودو گیارہ ہوگیا ہوتا۔ غریبی ہٹانا کوئی رس گلہ کھانا نہیں ہے کہ منہ میں رکھا اور ہضم کر گئے۔ میں جادو گر نہیں ہوں کہ جادو کی چھڑی ہندوستان پر گھماؤں اور یہاں سے غریبی دُور ہو جائے۔

بھائیو! آپ دل میں سوچ رہے ہوں گے جب غریبی ہٹانا تقریباً ناممکن ہے تو میں اس کو ہٹانے کا دعویٰ کیوں کرتا ہوں؟ غریبی ہٹانے کا نعرہ کیوں لگاتا ہوں؟ بات دراصل یہ ہے کہ بھارت ایک غریب دیش ہے۔ یہاں غریبوں کی اکثریت ہے۔ انھیں کے پاس ووٹوں کی دولت ہے۔ اس کی اہمیت وہ نہیں سمجھتے۔ یہی دولت حاصل کرنے کے لیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خیر یہ سب سیاسی مسئلے ہیں۔ آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ آپ کا کام صرف ووٹ دینا ہے، آپ دیتے رہیئے۔ ہمارا کام غریبی ہٹانا ہے، ہم ہٹاتے رہیں گے!

پیارے دیش واسیو! غریبی ہٹے گی۔ ضرور ہٹے گی۔ ہم نے انگریزوں کو دیش سے ہٹا دیا تو یہ غریبی کس کھیت کی مولی ہے؟ لیکن اس کام میں برسوں لگ جائیں گے۔ میری ہی مثال لیجئے۔ مجھے اپنی غریبی ہٹانے میں دس سال لگ گئے۔ آپ کی دُعا سے میں دوبارہ پارلیمنٹ میں گیا۔ منسٹر بننا پہلے غریب تھا، آپ کے ووٹوں نے کروڑپتی بنادیا۔ آج میرے تین بنگلے ہیں۔ دو کاریں ہیں، دہلی

میں چار فائیو اسٹار ہوٹلیں ہیں۔ اورنگ آباد میں کاغذ کا کارخانہ ہے۔ میں نے اتنی دولت کمائی کہ رکھنے کے لیے یہاں کی بنکوں میں جگہ نہیں تھی۔ مجبوراً مجھے سوئٹزر لینڈ کی بنک کا احسان مند ہونا پڑا میرے ناکارہ اور نکمّے بیٹے آج مختلف کمپنیوں کے مینیجر بنے بیٹھے ہیں۔ میرے جتنے بھی بھائی، بھتیجے سالے، اور داماد ہیں سب کو ملازمت سے لگا دیا۔ یہ سب آپ کی مہربانی ہے۔ اسی لیے جنتا کی چِنتا کرنا میں اپنا دھرم سمجھتا ہوں۔

پیارے بھائیو! میں آپ کو بھولا نہیں ہوں۔ آپ کی غریبی اور بے کاری دیکھ کر مجھے رات کو نیند نہیں آتی۔ میں نے حکومت کے سامنے تجویز رکھی ہے کہ یہاں سے دہلی تک ریلوے لائن بچھائی جائے اس کام میں ہزاروں مزدور درکار ہوں گے۔ ہزاروں افراد کو کام ملے گا۔ ہمارے دیش میں ایک بڑی تعداد تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی ہے۔ نوکری کی تلاش میں ان کی ہزاروں چپلیں گھِس کر بے کار ہوگئیں۔ اسی لیے بازار میں چپلوں کا بھاؤ بھی بڑھتا جارہا ہے۔ اُن کو بھی یہاں کام ملے گا۔ میں آپ کے بچوں کو بھی کام سے لگا دوں گا۔ دفتروں میں جب بھی چپراسیوں کی ضرورت ہوگی انھیں ضرور یاد کروں گا۔ دوسروں سے بیس پچیس ہزار لیتا ہوں۔ آپ جیسے غریبوں سے صرف دس ہزار لوں گا۔ جو غریبوں سے ہمدردی نہیں کرتا وہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں۔ غریبی سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب بھی غریبی یا بے کاری کا دکھ ستائے تو ٹی وی دیکھ کر اپنا دل بہلا لیتے۔ سرکار آپ کو روٹی، روزی نہیں دے سکی تو کیا ہوا؟ ٹی وی تو دے سکتی ہے۔ جنتا کی چنتا کرنا ایک حکومت کا اولین فرض ہے۔ جے ہند!

▲▼

غالب ثانی (حیدرآباد)

جبرۂ نیم باز میں

ایک بڑے بزرگ کی کل میں گیا نیاز میں
دھوم مچی تھی کس قدر کہتا ہوں اس کو راز میں

عمدہ بہت طعام کی دعوتِ خاص و عام تھی
ہر کوئی اس نیاز میں محو تھا کبر و ناز میں

گرچہ ہر ایک گوشت کا ذائقہ تھا جدا جدا
بات کہ جو بڑے میں تھی مرغ میں تھی نہ قاز میں

گھور رہے تھے غزنوی ہاتھوں میں اک عصا لیے
اور تڑپ رہے تھے مرغ جبرۂ نیم باز میں

فربہ بدن تھے شیخ و شاب منہ میں تھے اُن کے تیز دانت
گرنی کی طرح پستے تھے مرغ سب اُن کے جاز میں

خواجہ سرا کی طرح تھیں اس میں سدا سہاگنیں
جوڑے بہن کے ہاتھ میں محو تھیں کبر و ناز میں

بندۂ تیز دانت تھے کام و دہن کے پہلواں
پہلے ہی راؤنڈ میں خلاص گوشت ہوا نیاز میں

بیرے جو لا رہے تھے ڈش لیتے تھے وہ اُچک اُچک
اتری نہ ڈش نشیب میں لٹتی گئی فراز میں

دیر سے جنگ کا سماں دیکھ رہا تھا میزباں
اُس نے بلائے پہلواں تھے جو وہاں نیاز میں

آ کے جو پہلوانوں نے ہانک لگائی چیخ کر
سب کی دُمیں وہیں دبیں ایک صدائے باز میں

حالتِ قوم دیکھ کے غالبِ خستہ رو پڑا
اٹھتا ہے درد آج بھی میرے دلِ گداز میں

غزل

شاہد عدیلی (حیدرآباد)

بیٹے کی جو عادت ہے رنگ اپنا دکھا دے گی
یا سیٹھ بنا دے گی یا چھکلے لگا دے گی

گھر دیر سے لوٹوں تو بیوی یہ سزا دے گی
جلاب کی اک گولی سالن میں ملا دے گی

رشوت جسے کہتے ہیں اس کے بھی ہیں دو پہلو
لوگے تو پھنسا دے گی دوگے تو چھڑا دے گی

ماں باپ جو بیٹی کو دیں گے نہ جہیز اچھا
مارے گا اسے شوہر یا ساس جلا دے گی

زر اور زمیں سے بھی مخدوش بہت زن ہے
یہ بھائی کو بھائی سے آپس میں لڑا دے گی

کیا ایک نہیں کافی کیوں چار کی خواہش ہے
یہ چار کے کندھوں پر لے شیخ چڑھا دے گی

دیکھا نہ کرو سب کو اک آنکھ سے تم شاہد
ورنہ یہ بری عادت کانا ہی بنا دے گی

شکیل صادق (مالیگاؤں)

پڑھے لکھا تو تبصرہ کیسا؟

جب آپ کی زندگی تختۂ سیاہ کے سینے کو بوسہ دے کر ٹوٹ کر گر جانے والے چاک کی طرح محسوس ہو اور اس المیے کا اندیشہ ہو کہ اہلِ علم کے قدموں تلے روند دیے جاؤ گے تو قلم اٹھائیے اور کسی کتاب پر تبصرہ لکھ ڈالیے۔ کوئی مضائقہ نہیں اگر آپ میدانِ ادب کے کچے کھلاڑی ہوں۔ تبصرہ نگاری کی سب سے بڑی قابلیت تو آپ میں پہلے ہی سے موجود ہے۔ اس فن کے لیے فنکار پر دو شرائط واجب ہوتی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ فنکار کو ادب کے بارے میں "سب کچھ" معلوم ہو۔ دوسرے یہ کہ کچھ نہ معلوم ہو۔ اگر آپ میں اول الذکر خوبی ہے تو آپ قابلِ رحم ہیں اور اگر آپ میں ثانی الذکر خوبی ہے تو قارئین قابلِ رحم ہیں اور تبصرہ نگاری میں صفِ اول میں آپ کے لیے ایک جگہ خالی ہے۔ دراصل یہ جگہ ہمیشہ خالی رہتی ہے کیوں کہ ہر اہلِ قلم کو اسی جگہ پُر کیا جاتا ہے۔ ہر ایک یہی سوچتا ہے کہ یہ میری ہی جگہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ جگہ خالی تھی، خالی ہے اور خالی رہے گی۔ مایوسی کفر ہے ادبی دنیا میں زندہ رہنے کے لیے یہ تصوّر ہی کافی ہے کہ آپ صفِ اول کے فنکار ہیں۔ ادب میں دوسری تیسری صف نہیں پائی جاتی!

لیکن تبصرہ نگاری کس طرح شروع کی جائے۔ دراصل "شروع" کرنے میں ارسطو ہمیشہ آڑے آتا ہے۔ آپ بھی اسی ادھیڑ بُن میں ہوں گے کہ شروعات اچھی ہو تو کام نصف مکمل ہو جاتا ہے شاید یہ ارسطو کی خود فریبی تھی۔ آسان سی بات ہے۔ ہر شادی، دوستی اور نوکری کی شروعات اچھی ہی ہوتی ہے اگر ارسطو کے اس قول کو صحیح مان لیا جائے تو طلاق، دشمنی اور بے روزگاری کو کن خانوں میں رکھا جائے؟ دراصل شروعات ہوتی نہیں۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ تقلید ہے۔ آپ کو تبصرہ نگاری میں پہلا قدم نہیں رکھنا ہے بلکہ جو بھی قدم رکھنا ہے وہ دوسرا قدم ہی ہے۔

سب سے پہلے آپ اردو ادب کی اس کتاب کا انتخاب کیجئے جسے ادب کا سمندر قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ ایسی کتاب ساحلِ ادب پر کوشش کیے بغیر مل جائے گی۔ اس کتاب کا سرورق ضرور ہوگا اور اگر نہ بھی ہو تو اسے "دیدہ زیب" لکھیے۔ کتاب کا عنوان آپ کو ایک طویل مضمون لکھنا دے گا۔ عنوان کے متعلق یہ ضرور لکھیے کہ اس کے علاوہ اگر کوئی دوسرا عنوان ہوتا تو کتاب ادھوری رہ جاتی۔ کیوں کہ یہ عنوان علامتی ہے

جس کے سینے میں معنیٰ و مفہوم کے کئی سمندر ٹھاٹھیں مار رہے ہیں۔

اگلے صفحے پر مصنف کی اکلوتی تصویر ہوگی جس میں صرف مصنف کا ہی چہرہ ہوتا ہے۔ اس تصویر میں مصنف کی بیوی بچے یا دوست احباب نہیں ہوتے تاکہ میدانِ حشر میں مصنف کے علاوہ دوسرے بے گناہ اور معصوم لوگ نہ پکڑے جائیں کتاب لکھنے کا عمل وہ واحد عمل ہے جس میں نیک و بد، جزا و سزا کا اکیلا حقدار صرف مصنف ہی ہوتا ہے۔ تصویر پر تبصرہ مت لکھیے۔ البتہ مضمون ضرور اٹھائیے۔ مثلاً اکلوتی تصویر سے تنہائی، بے باکی، دلیری، جہاد وغیرہ۔ الجھے ہوئے بالوں سے سیاہی تاریکی، دہشت اگر بال نہ ہوں تو صحرا کا مضمون باندھیے۔ چوڑی پیشانی کو ناپ لیجیے تاکہ اندازہ ہوسکے کہ اس پیشانی پر کتنے چاند اور سورج چھپائے جاسکتے ہیں۔ تھوڑا نیچے اتر کر آنکھوں کی گہرائی ناپ لیجیے تاکہ سنجیدگی اور متانت کے سمندر ان میں سموئے جاسکیں۔ مضامین پر تبصرہ کرتے وقت ان تمام الفاظ کو مصنف کی شخصیت سے وابستہ کرتے ہوئے یہ ثابت کیجیے کہ مصنف بنے بنائے مصنف نہیں ہیں بلکہ پیدائشی مصنف ہیں اور ان کی تحریر ان کی ہمہ گیر شخصیت کے عین مطابق ہے۔

اب اس صفحے پر آیئے جس پر "انتساب" لکھا ہوتا ہے آپ کی شکار کتاب بھی کسی نہ کسی بے چارے کے نام منسوب ہوگی۔ کتاب کے انتساب پر تبصرہ لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھیے کہ مصنف منسوب شخصیت کو محترم سمجھتا ہے۔ احترام لازم ہے۔ مصنف کی وسیع النظری، وسیع القلبی، منکسر المزاجی اور اسی قبیل کی تمام خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے فوراً ورق الٹ دیجیے۔

اگلے صفحے پر فہرست ہوگی۔ فہرست میں جتنے مضامین ہوں گے اتنے ہی "پیراگراف" آپ کو پڑھنے ہوں گے گوکہ یہ آپ پر سراسر ظلم ہے لیکن "کتاب میں سر دیا ہے تو پیراگراف کا کیا ڈر"۔

ہر مضمون کا آخری پیراگراف سرسری طور پر پڑھنا ہے۔ اس صفحے پر اپنی تمام تر قوتِ برداشت کو جمع کیجیے اسے صبر سے تقسیم کیجیے مجبوری کے سوا کچھ نہیں بچے گا لہٰذا اسے اپنی ادبی مجبوری سمجھیے اور پہلے مضمون کے آخری پیراگراف پر سوار ہوجائیے۔

یہاں آپ کو ایک مسئلہ درپیش ہوسکتا ہے گھبرایئے نہیں مسائل سے بھری اس دنیا میں حل کی بھی کمی نہیں۔ ہمارے سیاسی لیڈروں کو دیکھیے یہ سیاست کے دلدل میں بھی خوبی سے تیرتے ہیں۔ آپ تو ادبی سمندر میں غوطہ زن ہیں۔ چند قیمتی موتیوں سے بھی ادبی مالا بنائی جاسکتی ہے۔ آپ یقیناً پریشان ہوں گے کہ مضمون پر تبصرہ نگاری کس طرح کریں! اب آپ شادی کرنے سے بھی زیادہ سہل کام کرنے جارہے ہیں۔ شادی کرنے میں اوقات و مقام خموشی و کلام کے انتخاب میں دشواریوں کا پیدا ہونا قرینِ قیاس ہے۔ لیکن تبصرہ نگاری میں دشواریوں کا پیدا ہونا ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔ یہ دشواریاں قارئین کے حصے میں آتی ہیں۔

تبصرہ نگاری میں اس بات کو ملحوظ رکھیے کہ اندازِ بیان عامیانہ ہو۔ بلکہ ایسا ہو کہ خود آپ بھی سمجھنے سے قاصر ہوں۔ زبان اتنی فصیح و بلیغ استعمال کیجیے کہ کوئی نہ سمجھے کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ جب آپ کا تبصرہ ناقابلِ فہم محسوس ہوگا تو اہلِ علم اسے افہام و تفہیم کی انتہا تصور کریں گے۔ ناقابلِ فہم تبصرہ نگاری کے لیے آپ کو چند چیختے چنگھاڑتے الفاظ کی فہرست ترتیب دینی ہوگی۔ ایسے الفاظ ان مبصرین کے تبصروں میں ملیں گے جو صفِ اول میں آپ کی جگہ سنبھالے بیٹھے ہیں۔ اس لیے چند کتابوں سے چیختے چنگھاڑتے الفاظ بلا اجازت ہتھیا لیجیے کیونکہ

کسی کو بھی اس بات کا دعویٰ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے کہ یہ الفاظ ان کی ذاتی جائیداد ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہی آپ کرنے جا رہے ہیں۔ آپ مندرجہ ذیل آسان الفاظ کی خدمات بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

بغاوت، صداقت، عقیدت، بناوٹ، فنکارانہ بصیرت، جذبات، تاثرات، رفعت، تکمیلیت احتجاج، انحراف، وسعت، برگشتہ، شکستہ، جلال، جمال، پائمال وغیرہ وغیرہ۔ [وغیرہ وغیرہ کو بھی استعمال کیا جاسکتا ہے]۔ ان الفاظ کو دائیں بائیں، اوپر نیچے استعمال کیجیے۔ آپ کو جو جملے یاد ہوں ان جملوں میں فعل، فاعل اور مفعول کی جگہ ان الفاظ کو استعمال کیجیے۔

مثلاً :۔ راموکا بیل آرام کرنے کے خلاف ہے۔

تبدیلیوں کے بعد آپ کا جملہ اس طرح ہو جاتا ہے :

مصنف کی فنکارانہ بصیرت شکستہ روایات کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے۔ آپ کا دوسرا جملہ اس طرح ہے۔ "یوم جمہوریہ کے موقع پر نئے وزیراعظم نے لال قلعے سے عوام سے پہلا جمہوری خطاب کیا"۔ اس جملے کے تمام الفاظ کی جگہ ادبی الفاظ استعمال کیجیے۔ آپ کا جملہ اس طرح ہو جائے گا۔ "صداقت و عقیدت کی رفعت پر قدآور مصنف نے شعورِ زیست کی آنکھوں سے رموزِ حیات کا آخری پردہ چاک کیا"

اسی طرح تبصرہ جاری رکھیئے جہاں آپ کی عقل کام نہ کرے تو اُلٹے چلئے یعنی ہر جملے کو آخر سے شروع کیجیے۔ مثلاً : "رموزِ حیات کا آخری پردہ قدآور مصنف کی شعوری آنکھوں میں رفعتِ صداقت و عقیدت کی پردہ شکن تصویر دیکھتا ہے"۔ اسی طرح ہر چند جملوں کے بعد "ملاحظہ ہو" کا ٹکڑا لگا کر مصنف کے مضمون کا آخری پیراگراف تحریر کر دیں۔ آپ کا تبصرہ چیختے چنگھاڑتے دریا کی طرح رواں دواں رہے گا۔ مصنف کے بیس مضامین کے بیس پیراگراف اور آپ کے زبردست تبصرہ کے بیس پیراگراف۔ اس طرح کل ملا کر چالیس پیراگراف کا تبصرہ تیار ہوتا ہے۔ اب آپ اسے گرجتا ہوا چالیسہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

دورانِ تبصرہ اس بات کو ضرور ملحوظ رکھیے کہ زبان ناقابلِ فہم ہو۔ مصنف کو کبھی عرش پر لے جائیے، کبھی فرش پر بکھرا دیجیے۔ کبھی ایسے سمندر میں ڈبوئیے تو کبھی دشت و صحرا کی سیر کروائیے۔ جگہ جگہ ان کی چوڑی پیشانی پر چاند اور سورج چمکتا رہے۔ ان کی آنکھوں میں معنی و مفہوم کے سمندر اُنڈیلتے رہیئے۔ لیکن اس طرح کہ نہ قاری کچھ پائے نہ مصنف کی عقل میں سمائے۔ اور نہ آپ ہی سمجھ پائیں کہ آپ کیا اور کیسے تبصرہ کر رہے ہیں۔ یہ بات بھولیئے کہ آپ کو صفِ اول کی ہمیشہ خالی رہنے والی جگہ پر پہنچنا ہے۔ یہ دراصل ایسا راز ہے جو ہر کسی پر فاش ہے پھر بھی راز ہے۔ یادداشت پر زور ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہمیں بھی کہیں پہنچنا ہے۔ لیکن وہاں پہنچنے کے لیے ہمیں ادبی سفر نہیں کرنا ہے کہ جیسے تیسے پہنچ جائیں۔ یہ انسانی سفر ہے۔ انسان کے ذریعہ ہے اور انسانیت کے لیے ہے۔ ذرا اس مقام کا تعین بھی کر لیجیے۔ جہاں ہم سب کو پہنچنا ہے۔ راستہ بالکل سیدھا ہے۔ اس سفر میں ہم سب کا مصنف خود جانتا ہے۔ وہ سب کچھ جاننے والا ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں، کیسے کر رہے ہیں، کیوں کر رہے ہیں؟

اس طرح آپ کا تبصرہ مکمل ہوتا ہے اہلِ علم آپ کو ادب کی اسی پہلی صف میں لا کھڑا کریں گے جو خالی تھی، خالی ہے اور خالی رہے گی تبصرہ نگاری میں یہ مت سمجھ لیجیے کہ اس پہلی صف کے علاوہ بھی ایک اور "پہلی صف" ہے جو آپ کا، ہم سب کا انتظار کر رہی ہے۔ ■□

مشتاق شاد
(ریاض)

پھر اب اس گلی کا ادھر لے کے آ گیا
جو بھی گیا وہ خاک بہ سر لے کے آ گیا

تھے اس کے پاس قتل کے سارے ہی انتظام
دم دے گئی چھری تو تبر لے کے آ گیا

میں نے کہا کہ لائیو کچھ سیب سنگترے
وہ ٹوکرے میں باسی ثمر لے کے آ گیا

استاد کو تو صرف چھڑی مل سکی مگر
شاگرد کسرتی تھا شجر لے کے آ گیا

سکہ گھسا ہوا جو دھرا اس کے ہاتھ پر
اندھا فقیر تیرِ نظر لے کے آ گیا

پہلے تو اس نے مفت پٹانے کی بات کی
زن ہاتھ سے چلی تو وہ زر لے کے آ گیا

سب مل کے میری عقل کا ماتم کرو کہ میں
قاتل کو آج اپنے ہی گھر لے کے آ گیا

شادی کے دفتروں میں تھا رش اس قدر کہ شاد
ناری نہ مل سکی تو میں نر لے کے آ گیا

وہ ایسا پھول ہے، تنہا جو لگتا ہے چمن پورا
تصور میں سماتا ہی نہیں اس کا بدن پورا

خدا جانے اب اس کی نازکی کا بوجھ کتنا ہے
اگر وہ مجھ میں شامل ہو تو ہو جاتا ہے ٹن پورا

غنیمت ہے اسے بس مسکرانے ہی کا فن آیا
نہ جانے کیا نہ ہو جاتا جو کھلتا وہ دہن پورا

اکیلی سینکڑوں سیٹوں پہ بھاری ہے وہ محبوبہ
اسمبلی میں جو آ جائے تو کورم ہو چھن پورا

عمل تقسیم کا کرتی رہی وہ میری ہر شے پہ
اب اس کے عشق میں باقی نہ من پورا نہ تن پورا

سجاتا تھا میں اس کی مانگ اکثر چاند تاروں سے
ستارے رہ گئے آدھے تو کب باقی ہے چمن پورا

خدا نے اتنی برکت دی ہے گھر آباد کرنے میں
کہ میرے گھر کا کمرہ بن گیا میرا وطن پورا

ہم اپنی ذات میں اک دوسرے کا عکس ہیں اے شاد
میں لگتا ہوں میاں پوری وہ لگتی ہے دلہن پورا

غلام جیلانی (حیدرآباد)

(آخری قسط)

ہنبادکا پہلا اور آخری سفر

رمضان کے مہینے کا بیشتر حصہ ہنبادنے مسلسل سفراور سیر و سیاحت میں گزارا۔ ریگستانوں کی خاک چھانی۔ لو کے تھپیڑوں میں دشت نوردی کی۔ لیکن ہنباد۔۔۔ دل ہی دل میں اس ملک خداداد کے جیالوں کی کڑی محنت دیکھ کر خوش بھی تھا کہ انھوں نے ریگ زاروں کی گود میں ہرے بھرے کھیت اور باغ کھڑے کردیئے ہیں۔ مغلک السحابی کہیں نہیں تھی۔

جب عید کی آمد آمد ہوئی تو ہنبادنے کہا۔ "چلو علی" ملک کے سب سے بڑے شہر چلیں عید کی رونق وہیں دیکھیں اور جب وہ سب سے بڑے شہر پہنچ گئے، تو علی بولا۔

"صاحب من۔ یہاں چاند پہلے دن کبھی نظر نہیں آتا۔"

"میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"مطلب یہ ہے کہ عید ایک دن نہیں بلکہ دو دن اور کبھی کبھی تین دن تک جاری رہتی ہے۔"

"کیا واہی تباہی بک رہے ہو! میں نے تو سنا ہے تمھارے یہاں چاند دیکھنے کی کمیٹی بنی ہے ——— رویت کمیٹی ——!"

"وہی تو اصل مسئلہ ہے۔ چاند پہلے ہی دن نظر آجاتے تو پھر اس کمیٹی کی ضرورت کہاں باقی رہتی ہے۔؟"

"مگر آپ کا ملک اتنا پھیلا ہوا ہے'۔۔۔۔۔ اتنا بڑا ہے، شمال سے جنوب اور۔۔۔۔۔" "آپ سمجھتے نہیں ہند آقائے من"۔ علی بات کاٹ کر بولا ——— "ایک چیز ہوتی ہے' مرکزی رویت ہلال کمیٹی۔ اس میں ملک کے ہر کونے کے بڑے بڑے جید علما اور مولوی صاحبان کو ایک ہی جگہ بلا لیا جاتا ہے۔ یہ بہاری نیک اور بزرگ ہستیاں ہوتی ہیں جن میں سے کو بوجہ کبر سنی کے عینک سے بھی چاند نظر نہیں آسکتا۔ یہ اور بات ہے کہ جس جگہ کمیٹی کا اجلاس ہوتا ہے وہاں پہلے دن کبھی چاند نہیں نکلتا۔"

"عجیب باتیں کرتے ہو ——— علی بابا! چاند کو تو کوئی بھی دیکھ لے اور گواہی دے دے۔"

"قبلہ ہنباد۔ آپ بڑے بھولے ہیں۔ اگر ایسا موقعہ آجائے کہ چاند کا نظر آنا یقینی ہو تو بھی اس کو کئی دن سے متنازعہ بنا دیا جاتا ہے تاکہ اجلاس ایک دن پہلے ہی شروع ہوجائے۔"

"لیکن اس سے حاصل کیا ہوتا ہے؟"

"یہ راز کی باتیں ہیں، کبھی گوشۂ تنہائی میں عرض کروں گا ــــــ اور پیر و مرشد، آپ تو مجھ سے کہیں زیادہ زیرک ہیں، ایک دن آپ خود سمجھ جائیں گے۔"

اور جب اسی رات ٹی وی پر ہر آدھے گھنٹے سے اعلان ہوتا رہا کہ ــــــ ناظرین و سامعین ۔ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کا اجلاس ابھی جاری ہے تو ہندباد پھر ایک بار سوچ میں ڈوب گیا۔ یہ رویت ہلال کمیٹی کے اجلاس کے جاری رہنے کا کیا مطلب ہے؟ کیا چاند پر یا نظام شمسی یا نظام کائنات پر کوئی سیمینار ہو رہا ہے ــــــ ــــــ جہاں ملک کے ہر کونے سے آئے ہوئے مولوی (عالم بھی شاید موجود ہوں) اپنے اپنے مقالے پڑھ رہے ہیں۔

خدا خدا کرکے دو تین گھنٹے بعد، رات گئے اعلان ہوا کہ بالآخر چاند نہیں ہوا تو ہندباد نے سوچ کے ساگر سے سر اٹھا کر علی کی طرف دیکھا جو اطمینان سے مسکرا رہا تھا...... فاتح کی مسکراہٹ ۔ ادھر ٹی وی پر وہ شاندار کمرہ بتایا جا رہا تھا جو شہر کی شاید سب سے اونچی عمارت کی ایک بالائی منزل پر واقع تھا اور جہاں کمیٹی کا اجلاس ہو رہا تھا۔

دوسرے دن عجیب عالم تھا۔ روزہ داروں اور روزہ خوروں میں بحثیں ہوتی رہیں۔ مسجدوں میں بھی، بازاروں اور گھروں میں بھی ــــــ کئی اللہ کے بندوں نے عید بھی منائی۔

خیر صاحب ــ دوسرے دن تو عید بہر حال ہونی ہی تھی اور ہوئی۔ بکرے ذبح ہوئے ۔ عید الفطر میں بھی بھنے ہوئے گوشت کی خوشبوئیں مہکیں ۔ ہندباد کو یاد آیا، اس کے ملک میں تو شیر اور شیر خورمے کا رواج تھا۔

عید کی نماز کا بھی اس نے عجیب منظر دیکھا۔ محلّے کی جامع مسجد کے علاوہ جگہ جگہ شامیانوں میں الگ الگ نمازیں پڑھائی جا رہی تھیں۔ علی نے بتایا کہ یہ سب مختلف مسلکوں کے گروہ ہیں۔

عید کے دوسرے دن اخبار میں چھپنے والی یہ چند سرخیاں ہندباد نے تراش کر محفوظ کر لیں کہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے ۔ ایک سرخی تھی ......

"مولوی نے روزہ رکھ کر نماز عید پڑھا دی"

دوسری تھی ـ "مسجد کے امام کے ہاتھوں مسجد کے امام کا قتل"

دونوں اسی مسجد میں وقتاً فوقتاً نمازیں پڑھاتے تھے ۔ عید کے دن ایک امام صاحب اس بات سے رنجیدہ ہو گئے کہ دوسرے امام صاحب نے ان کے آنے سے پہلے نماز عید پڑھا دی اور انھیں قتل کر دیا۔

ایک اور شہر میں بھی عید کی نماز کی امامت پر یہی جھگڑا ہوا۔ ایک مولوی صاحب نے نماز عید ختم کی ہی تھی کہ دوسرے مولوی صاحب اپنے گروہ کے ساتھ پہنچ گئے۔ نمازیوں میں بھگدڑ مچ گئی ۔ مار پیٹ ہوئی ۔ خون خرابہ ہوا ۔ پولس کیس بن گیا۔ ایک مولوی صاحب اپنے حامیوں کے ساتھ روپوش ہو گئے۔

ایک اور خبر تھی ــــــ "عید کی شب اسی شہر کی غریب اور کم آمدنی والی عورتوں نے میک اپ اور بیوٹی کے سامان

خریدنے پر دو کروڑ روپے خرچ کیے۔ خواتین کے بالوں کے فیشن سنٹر اور بیوٹی پارلرز صبح تک کھلے رہتے ہیں"

ان تمام باتوں سے ہندباد بڑا رنجیدہ ہو گیا۔ فوراً علی بولا —

" آقائے من دل کو ملول مت کیجیے کہ اس میں رنجیدہ ہونا بھی بڑا خطرناک ہے۔ . . . . . آپ نے ابھی پڑھا نہیں کہ وہ امام مسجد . . . . . ؟"

" ہاں، ہاں۔ پڑھا ہے۔" ہاتھ کے اشارے سے چپ کراتے ہوئے ہندباد بولا —— مگر ہم اس ملک کی فیشن پرستی پر دو دو، . . . . . بلکہ چار چار آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتے۔

علی کے پیش کیے ہوئے رومال سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے ہندباد نے کلام جاری رکھا —— " تم نے اس وقت نہیں دیکھا؟ جب ہم اسے کسی فلائنگ کوچ میں سفر کر رہے تھے تو ہم سے اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی خواتین تھوڑی تھوڑی دیر سے بیوٹی کٹ کھول کر اپنا میک اپ درست کرتی رہیں اور سفر کے ختم پر دو سالہ بچی کو بھی لپ اسٹک کے بغیر نہیں چھوڑا —— تمھیں یاد نہیں؟

یاد تو ہے میرے آقا —— لیکن اس دن وہ حسینائیں ہم سے اگلی ہی سیٹ پر بیٹھی تھیں اور ان سے اٹھنے والے پرفیوم کے پہلے ہی بھبکے نے مجھے ایسا مدہوش کر دیا تھا کہ سفر کے ختم پر آپ کے جگانے پر ہی چونک کر اٹھا تھا —— اور آپ کا علم اس امر پر جانتا ہے، محترم آقا کہ ہماری خواتین اس راہ پر بہت آگے چلی گئی ہیں . . . . . ہماری دلہنیں گھروں کی بجائے بیوٹی پارلروں سے شادی خانے پہنچتی ہیں . . . . . اور ہماری مائیں . . . اور ہماری بہنیں . . . . . . لیکن جلدی سے ہندباد نے علی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

کیا کر رہے ہو؟ تمھارے سامنے کوئی مائیکروفون نہیں ہے!"

علی شرمسار ہو کر چپ ہو گیا۔

" بہتر یہی ہے کہ ہم اپنی سیاحت پر پھر سے روانہ ہو جائیں۔ اور میں چاہتا ہوں اس مرتبہ نئے مناظر، نئے تجربوں سے گزروں۔

" تو پھر پیر و مرشد —— ایک ہی طریقہ ہے۔ اب ہم ٹرین سے سفر کریں گے"

" ٹرین سے؟ —— مگر تم نے تو کہا تھا . . . . . ؟"

" ہاں۔ میں نے منع کیا تھا مگر اب نئے تجربوں کے لیے یہی ایک راستہ ہے . . . . . لہٰذا ہم کل ہی یہاں سے " برق رو" کے ذریعہ روانہ ہو جائیں گے۔

" برق رو —— ؟"

" یہاں کی ٹرینیں بہت تیز چلتی ہیں۔ باہر کے نت نئے انجن لگائے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ ٹرینوں کے چلنے کے بعد کبھی کبھی ملازمین پیچھے ہی چھوٹ جاتے ہیں —— اور یہی وجہ ہے کہ کئی ایکسپریس ٹرینوں کے ڈبے، تا محنت اور خطرہ

انجنیروں وغیرہ سے بے نیاز کیے جاتے ہیں ـــــــ" ہندباد نے گھبرانا شروع ہی کیا تھا کہ علی نے روک دیا۔
"گھبرائیے نہیں۔ ہم جس ٹرین میں سفر کریں گے، وہ بہت آرام دہ اور محفوظ ہوگی۔"

اور دوسرے دن ان کی ٹرین واقعی بہت تیز بھی تھی اور آرام دہ بھی۔ علی نے بتایا کہ جس ڈبے میں وہ سفر کر رہے تھے، وہ ایرکنڈیشنڈ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مشین خراب ہونے سے کام نہیں کر رہی ہے۔ پھر بھی محض یہ جان کر کہ ڈبہ اصولاً ایرکنڈیشنڈ ہے ہندباد کو بڑا اسکونِ قلب نصیب ہوا اور گرمی کا احساس بھی کم ہونے لگا۔ پیر پھیلا کر دراز ہونے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ سیٹ کا گدا پھٹا ہوا ہے اور بجلی کا ایک پنکھا کام نہیں کر رہا ہے۔ برتھ کے سرہانے پڑھنے والی ہیڈلائٹ سرے سے ندارد ہے۔ کیبن کا دروازہ پوری طرح بند نہیں ہونے پاتا۔

ہندباد نے آنکھیں بند کرلیں اور کوشش کرکے کچھ ہی دیر میں ایرکنڈیشنڈ نیند میں ڈوب گیا۔

اور جب آنکھ کھلی تو ریل غراتے پھرتی اُڑی جا رہی تھی۔ دھول کے بادلوں کے ساتھ اسٹیشنوں کو بھی یکے بعد دیگرے پیچھے چھوڑتی جا رہی تھی۔ خاموشی کو توڑتے ہوئے ہندباد نے پوچھا:

"علی ــ ایک بات بتاؤ۔ بڑے سے بڑے شہر کے اسٹیشن پر بھی پلیٹ فارموں کی اونچائی اتنی کم کیوں ہے ــــ جیسے کسی چھوٹے سے گاؤں کے اسٹیشن کی ؟!"

قبلہ۔ آپ کا مشاہدہ بالکل درست ہے۔ ہمارے ملک کے سارے اسٹیشن، سارے پلیٹ فارم، ریلوے لائینیں، سگنل، کیبن روم ـــــــ ہر چیز اسی حالت میں محفوظ رکھی گئی ہے جس میں کہ انھوں نے جنم لیا تھا۔ یہ اصولِ تحفظِ آثارِ قدیمہ کے عین مطابق ہے۔

بہت دیر دونوں چپ بیٹھے رہے۔ بالآخر ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی۔ ہندباد نیچے اتر کر ٹہلنے لگا اور ساتھ ہی اپنی معلومات میں بیش بہا اضافہ بھی کرنے لگا۔

لوگ ڈبوں میں کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ سامان کی بہتات سے دروازوں کو کھولنا بھی مشکل تھا۔ ایک جگہ بہت چیخ پکار ہو رہی تھی۔ قریب جانے پر پتہ چلا کہ تین چار آدمی ٹائلٹ کے اندر بیٹھے ہیں اور اندر سے دروازہ لاک کیا ہوا ہے۔ ایک بیچارہ حاجت کا مارا دروازہ پیٹے جا رہا ہے۔ حالت دگرگوں ہوتی جا رہی ہے۔۔۔ ہندباد جلدی سے ہٹ آیا۔ کیا معلوم کام کیا ہو!

ہندباد نے علی سے پوچھا ـــــــ "تم نے تو کہا تھا اس ٹرین کے کسی بھی درجے میں بغیر ریزرویشن کے ٹکٹ نہیں ملتا؟"
"کہا تھا۔ آپ کسی سے بھی پوچھ لیجیے۔"
"تو پھر ہر ڈبے میں یہ بھیڑ کیسی؟"
"آپ اتنے جہاں دیدہ ہونے پر بھی۔۔۔۔ بہت سی باتیں نہیں جانتے گستاخی معاف۔ جناب ٹکٹ لینا، اور سفر کرنا دو مختلف علاحدہ علاحدہ امور ہیں ــــــ"

کھسیانہ سا ہو کر ہندباد چپ ہو گیا۔ واقعی اتنی معمولی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی! ــــ

"مگر کیا ٹی ٹی آئی ریل میں نہیں ہوتا؟" ــــ ہندباد نے ابھی ہار نہیں مانی تھی۔

"وہ بھی ہوتا ہے" انور علی نے ہندباد کو ایسی معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھا کہ وہ ہار مان کر چپ ہو گیا۔

ٹرین پھر فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی۔ رات ہو چکی تھی اور ڈائننگ کار سے منگوایا ہوا ڈنر کھا کر علی بولا ــــ

"قائے محترم ہندباد۔ ہمارے ملک کی ریلویز کا نظام ہمیشہ سے خسارے میں چل رہا ہے بلکہ میں تو سوچتا ہوں کہ نظام اور ریلویز دونوں بالکل کس طرح چل رہے ہیں!"

کیا مطلب؟ ہندباد بولا۔

"اب میں کیسے سمجھاؤں آپ کو .... اچھا اب یہی میرے بھانجے کی مثال لے لیجیے"

"بھانجے کی؟"

"ہاں۔ ابھی ابھی ریلوے میں آفیسر کی ٹریننگ ختم کی ہے۔ کوارٹر بھی ملا ہوا ہے۔ لیکن ہے نرا گدھا۔"

"نرا گدھا۔!"

"بلکہ اسے گدھا کہنا گدھے کی توہین ہے۔ جھوٹی ڈگری ہے اس کے پاس۔ نہ ٹھیک سے لکھنا جانتا ہے نہ پڑھنا، مگر وظیفے کے ساتھ ٹریننگ پا کر افسر بن بیٹھا۔" میں نے کبھی اسے دورے پر جاتے ہوئے نہیں دیکھا مگر ہر مہینے تین چار ٹی۔اے بلز برابر کلیم (claim) کرتا رہتا ہے۔ بہت جلد اس کا پروموشن بھی ہونے والا ہے۔"

ہندباد نے برتھ پر لیٹے لیٹے کہا۔ "علی۔ بس کرو۔ آج کے لیے اتنا کافی ہے۔ اب سو جاؤ۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔"

صبح ساڑھے سات بجے ایک بڑے سے جنکشن پر پہنچے۔ ہاتھ منہ دھویا۔ ناشتہ کیا۔ ٹرین دیر تک رکی رہی۔ دونوں پلیٹ فارم پر اتر کر ٹہلنے لگے۔ پلیٹ فارم سارے کا سارا چھوٹے بڑے اسٹالس سے اٹا پڑا تھا۔ مسافروں کے چلنے، ریل میں سے اترنے یا چڑھنے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ ہندباد چشمِ حیرت بنا اس منظر کو دیکھ رہا تھا کہ علی نے تاڑ لیا۔ بولا:

"آقائی پلیٹ فارم پر لگے اس 'بازار' کو دیکھ کر آپ پریشان نہ ہوں۔ ہمارے ملک کی ریلویز کے عہدہ داروں کو مسافروں کے آرام کا بڑا خیال ہے۔ اسی لیے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ پلیٹ فارم پر ہی مسافروں کی ضرورت کی ہر چیز مہیا کر دی جائے۔ پلیٹ فارمس پر ان متحرک بازاروں کے لیے عوام ریلوے عہدہ داروں کے بڑے ممنون ہیں۔"

ٹرین پلیٹ فارم نمبر (۳) پر ٹھہری ہوئی تھی۔ جہاں ایک اچھی خاصی گنجائش کی مسجد تعمیر شدہ تھی۔ لاؤڈ اسپیکر سے آواز آ رہی تھی:

"مسلمانو .... اس اسٹیشن کی مسجد کی تعمیر اور توسیع کے لیے چندہ دیتے جاؤ۔"

(حالاں کہ مسجد تیار تھی اور توسیع کے لیے پلیٹ فارم پر کوئی گنجائش نہیں تھی) اس نیک کام کے لیے اللہ تمہیں جزائے خیر دے گا۔ موت و حیات کی کسے خبر ہے! .... کیا معلوم جہاں کے لیے تم روانہ ہوئے ہو وہاں پہنچ بھی پاؤ گے یا نہیں!

—— آدمی کو مرنے کے لیے بہانہ چاہیے۔ بلکہ بغیر بہانہ بھی ہم نے مرتے دیکھے ہیں۔ لیکن .... اس مسجد کے لیے چندہ دے جاؤ تو سیدھے جنت میں جاؤ گے ....

ہندباد علی کا ہاتھ پکڑ کر ڈبے میں جا بیٹھا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اور جب کھولیں تو ریل ہرے بھرے کھیتوں میں سے جا رہی تھی۔ ہر طرف سبزہ، تیار فصلیں — نہروں کا پانی جی خوش ہو گیا۔

کوئی گھنٹہ بھر بعد ایک جنکشن آیا۔ ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ رکی۔ اور ٹرین کی چھت میں سے بجلی کا ایک بلب نکل کر ہندباد کی گود میں آن پڑا۔ ہندباد نے اسے احتیاط سے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ یہاں اتر کر دونوں کو ایک دوسری ٹرین لینی تھی جو ملک کے اندرونی حصّوں میں لے جاتی تھی۔ پلیٹ فارم پر انھیں ایک ریلوے گارڈ آتا ہوا دکھائی دیا۔

ہندباد اس کے قریب آیا اور جیب سے بلب نکال کر اسے دیا۔

"یہ کیا ہے۔"

"یہ بلب ہے"

"بلب ہے؟"

"جی ٹرین کے لیمپ سے نکل کر آگرا ہے۔

"تو پھر؟"

"آپ اسے رکھ لیجیے"

"کیوں بھئی اس کا کیا کروں گا؟" اور گارڈ پان چباتا ہوا ایک کولڈ ڈرنک کے اسٹال کی طرف چل دیا۔ اسٹیشن پر بھیڑ بھاڑ کم تھی اور صفائی بھی اچھی تھی۔ ہندباد کو مسرت بھی ہوئی اور حیرت بھی۔

ٹرین چھوٹنے کا وقت ہو چکا تھا۔ بلکہ کافی دیر ہو گئی تھی مگر ٹرین ویسی ہی کھڑی تھی۔ مقررہ وقت تھا ساڑھے دس بجے اب ساڑھے گیارہ ہو رہے تھے۔ ہندباد نے نیچے اتر کر ایک سفید وردی والے ریلوے افسر سے پوچھا، جو پلیٹ فارم پر درخت کے نیچے چبوترے پر بیٹھا مونگ پھلی کھا رہا تھا —— "کیوں جناب یہ ریل کب چلے گی؟"

جب وقت ہو جائے گا —— اور مونگ پھلی کھانے لگا۔

"وقت تو کبھی کا ہو چکا جناب۔"

"نہیں ابھی نہیں ہوا۔"

"پھر کب ہوگا؟"

"بس جب انجن لگ جائے گا۔" .... وہی بے اعتنائی۔

انجن کب لگے گا؟" —— ہندباد نے پیچھا نہیں چھوڑا۔

——— وہ بگڑ گیا۔ گردن موڑ کر ایک لمحے کے لیے ہندباد کو دیکھا۔ پھر پلٹ کر اسی لاپروائی سے جواب دیا ———

"جب ڈرائیور آجائے گا۔"

اس سے پہلے کہ ہندباد اور کچھ پوچھ پاتے، علی اس کا ہاتھ پکڑ کر لے آیا اور دونوں ڈبے میں جا بیٹھے۔

پتہ نہیں کب ڈرائیور آیا۔ کب انجن لگا، بہر حال گاڑی جا رہی تھی۔ حسب معمول دھول بھی اُڑ رہی تھی — لہلہاتے کھیتوں کے ساتھ ہی جانے کہاں سے ریت کے بنجر ٹیلے بھی چلے آتے اور ان پر اگی ہوئی نکیلی جھاڑیوں سے ہو کر گرم لُو کے تھپیڑے اور بھی خاردار بن جاتے۔ چھوٹی چھوٹی آبادیاں بھی آرہی تھیں۔ پیلی مٹی سے لپے کچے کوٹھے یا کچی اینٹوں کی دیواروں سے بنے مکان ....

ہندباد، آقائے من۔ یہ مت خیال کرنا کہ ہمارے گاؤں ابھی پس ماندہ ہیں۔ یہ کچے کوٹھے دراصل یہاں کے سخت موسم سے بچاؤ کے لیے ہیں .... گرمی ہو یا سردی۔

"میں جانتا ہوں ——— پیارے علی۔"

پتہ نہیں دن کا کون سا پہر تھا، یکایک آسمان پر سیاہی سی چھانے لگی۔ ہوا تیز ہونے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف ریت کے بگولے اٹھنے لگے۔ ہوا کی رفتار بلا کی تیز ہو گئی اور ریل کے اندر ہر طرف ریت ہی ریت پھیلنے لگی۔ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا، اور ہاتھ کو ہاتھ کیا پاؤں بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

علی نے سمجھایا ——— "یہ کالی آندھی ہے۔ اس کے علاوہ ایک پیلی آندھی بھی آتی ہے اور...!"

ہندباد گھبرا کر بولا "بس یہی کافی ہے اور رہنے دو۔ اسی سے دم گھٹا جا رہا ہے۔"

"خاطر جمع رکھیے۔ اس آندھی کے بعد ہی بارش بھی ہو گی اور گرمی جاتی رہے گی .... آپ دیکھتے جائیے۔" علی بولا۔

اور واقعی بارش بھی ہوئی اور شدّت کی گرمی کے بجائے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نمی پھیلا رہے تھے اور ان کے اثر میں دونوں گہری نیند سو رہے تھے۔ دن کب کا جا چکا تھا۔ رات بھی آدھی ہو چکی تھی .... یکایک ہندباد کی آنکھ کھل گئی۔ ٹرین رکی ہوئی تھی اور ہندباد کو لگا جیسے بڑی دیر سے رکی کھڑی ہے۔ نیچے اتر کر دیکھا کوئی چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ تاریکی میں ڈوبا ہوا۔ ویران سا۔

ہندباد ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں ٹہلنے لگا .... ٹہلتا رہا۔ جب ٹرین کے آگے بڑھنے کے کوئی آثار نہ پائے تو اسٹیشن ماسٹر کو تلاش کر کے وجہ پوچھی۔ پتہ چلا کہ آگے آندھی کی شدت سے ٹیلی گراف کے کھمبے گر گئے ہیں۔ اگلے اسٹیشن سے ربط ٹوٹ گیا ہے اور لائن کلیئر کے بغیر ریل نہیں جا سکتی۔

"پھر اب ——— ؟" ہندباد گھبرا گیا۔

"گھبرائیے مت۔ انجن خود گیا ہے اگلے اسٹیشن، لائن کلیئر لانے۔

کون سا انجن ؟

"آپ کی گاڑی کا ـــــ دیکھا نہیں آپ نے ..... انجن کہاں ہے ؟"

اور سندباد نے پلٹ کر غور سے دیکھا تو اندھیرے میں پتہ چلا کہ ڈبّوں کو چھوڑ چھاڑ ان کا انجن سچ مچ غائب ہے۔ ایک لمحے کے لیے سن سے رہ گیا

سراسیمگی کے عالم میں علی کو جا کر جگایا اور ساری روئیداد سنائی ۔

خدا پہ بھروسہ رکھیے ۔ انجن ضرور واپس آئے گا ۔ علی بولا ۔

اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ واپس بھی آگیا ۔ اور وفادار دوست کی طرح منتظر ڈبوں کو ساتھ لے کر آگے روانہ ہو گیا ۔

سندباد سوچنے لگا ، علی نے سچ کہا تھا ۔ نئے تجربوں کے لیے ریل میں سفر کرنا بہتر ہے ۔

سندباد کی خواہش پر علی نے اپنے معزز مہمان کو ملک کے اندرونی حصوں میں گھمایا ـــــ بنجر میدانوں میں پہاڑوں کے دامن میں بل کھاتی ہوئی سڑکوں پر ، اور ان کی ڈھلانوں پہ بسے ہوئے دیہات ہیں ـــ ایک گھاٹی میں ان کی موٹر سڑک پر ، بھیڑوں ، بکریوں کے ریوڑ میں پھنس گئی ۔ دھول صاف ہوئی تو سامنے تین چار گھوڑے سوار راستہ روکے کھڑے تھے ۔ منہ پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے ، ہاتھوں میں بندوقیں اور جسم پر کارتوسوں کے بیلٹ کراس بنائے ہوئے تھے ۔ سندباد نے خوف سے علی کا بازو تھام لیا ۔

خوف ناک مونچھوں اور بے ہنگم ڈیل ڈول والا ایک سوار آگے آیا ـــ اشارے سے ڈرائیور اور سندباد اور علی ، سب کو نیچے اتار دیا ۔

اس کے ایک ساتھی نے آکر سب کی جیبوں کی جھڑتی لی ، موٹر کے اندر ، باہر ڈکی میں جھانک کر دیکھا اور جو کچھ ملا ، اس کے سامنے پیش کر دیا ۔ مونچھوں والے نے حقارت سے کہا ـــ

یہ کیا ہے ؟ ـــــ تم لوگ موٹر میں پھر رہے ہو ، تو اپنے ساتھ کچھ قیمتی سامان ، یا زیادہ نقدی بھی نہیں رکھتے ؟ ! . ! . . . . . کون فقیر قسمت ہو تم لوگ ؟

"ـــــ ہم لوگ سیاح ہیں ـــ" علی آہستہ سے بولا ۔

"تو کیا سیاح لوگ خالی ہاتھ پھرا کرتے ہیں ؟ ـــــ" وہ پھر گرجا ۔

"ہم آئندہ ایسا نہیں کریں گے ـــ سردار ـــ"

مگر ہم اس وقت کی بات کر رہے ہیں مردود ـــــ جانتے ہو ، ڈاکوؤں کی الیکشن میں میں صدارت کا امیدوار ہوں ـــ نام دینے کے بعد میں نے یہ پہلی واردات کی تھی اور تمہارے پاس سے کیا ملا ؟ ـــــ صرف دس یا دو ہزار ! . . . . . اب میں اپنے ووٹروں کو کیا منہ بتاؤں گا ؟ ـــــ

ڈاکو یونین؟ ——— کیا آپ کے یہاں ......" مگر حیرت و استعجاب میں ڈوبا' ہندباد اپنا جملہ پورا نہ کرسکا؟

"ابے ——— کیا تو اخبار نہیں پڑھتا؟ جانتا نہیں۔ اس ڈیموکریسی کے دور میں ہماری یونین بھی کب کی بن چکی ؟ ——— سالانہ انتخابات ہوتے ہیں۔ ہمارے علاقہ داری صدر، سکریٹری ...... مگر تو تو نرا جاہل ہے ...... تجھے کچھ بھی نہیں ملا ——— بھاگ جا یہاں سے اور یہ بھی ساتھ لے جا۔"..... فقط کہیں کا ——— اور تینوں کے پرس ہندباد کے چہرے پہ مارے۔

اور جب دھول کے بادل میں ان کے گھوڑے سڑک پر نظروں سے غائب ہو گئے، تو سب کی جان میں جان آئی ——— یہ یکلخت کھلا کہ وہ کیسے قیمتی مشاہدے سے گزرا ہے۔ علی کی رفاقت سے ہندباد کو کئی فائدے پہنچے۔ سیاحت کا پراجیکٹ بخوبی پورا ہوا اور سفر میں اس کی صحبت سے محفوظ بھی ہوا۔ ورنہ اس انوکھے ملک میں جانے اس کا کیا حشر ہوتا۔

جب روانگی کا وقت آیا اور ایرپورٹ پر ہندباد اور علی زار و قطار روتے ہوئے پانچویں بار بغل گیر ہوئے، تو انھیں احساس ہوا کہ سارے لوگ انھیں حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ علی نے آنسو پونچھے۔ گلا صاف کیا۔

"ہندباد ——— میرے آقا۔ بتائیے میرے ملک کی سیاحت آپ کو کیسی لگی؟

"بہت اچھی۔"

اور ہمارا ملک؟"

"بہت اچھا...... صرف یہاں دھول اور مکھیاں زیادہ ہیں۔

"اور ہمارے یہاں کے لوگ۔"

"بہت اچھے۔ بہت پیارے..... نیک اور خدا ترس مگر عزیزم علی ——— ایک بات ہے جو میری سمجھ میں نہیں آئی!"

"وہ کون سی بات ہے آقائے محترم، ہندباد...... کہہ ڈالیے" علی نے کہا۔

"بات یہ ہے کہ میں نے تمھارے یہاں صرف دو طرح کے لوگ دیکھے ہیں...... ایک تو وہ جو نہایت ذہین اور عقل مند ہیں...... چوٹی کے عالم، سائنس داں، ادیب اور آرٹسٹ؛..... آج کل شاید انٹلکچول کا لفظ ہر جگہ ایسے ہی لوگوں کے لیے استعمال ہو رہا ہے ——— تو میں کہہ رہا تھا' تمھارے انٹلکچول بھی چوٹی کے ہیں'..... مگر.....

"مگر کیا ——— آقا؟"

"خال خال ہی پائے جاتے ہیں...... بہت کم...... کہیں کہیں....."

"اور دوسری طرح کے لوگ ———؟" علی نے پوچھا۔

"ایک دم نیچے ——— میرا مطلب ہے' ایسے کہ ان کے ساتھ دو منٹ سے زیادہ بات نہیں کی جاسکتی۔ جیسے سیڑھی کے بالکل نچلے ڈنڈے پر آ گئے ہوں!"

"مگر اس نچلے ڈنڈے اور اس چوٹی کے ڈنڈے کے درمیان ——— ؟"

"یہی تو میں سوچتا ہوں! . . . . . سارے سفر میں سوچتا رہا ہوں —— وہ درمیانی ڈنڈا کہاں گیا؟ —— خلا کیسا؟ —— کیا تم نے کبھی سوچا ہے؟

—— نہیں سوچا ہوگا۔ یہاں بہت کم لوگوں کو سوچنے کی عادت ہے۔"

علی چپ رہا۔ سندباد بولتا گیا —— "اچھا، تم سوچنا، سوچتے رہنا! . . . . تلاش کرنا، وہ درمیانی طبقہ . . . میرا میرا مطلب ہے درمیانی ڈنڈا اسیڑھی کا کہاں گم ہوگیا؟ —— اور جب مل جائے تو مجھے ضرور مطلع کرنا۔ میری الجھن بھی دور ہوگی۔

اس کے بعد دونوں نے پھر ایک بار، اس مرتبہ آخری بار بغل گیر ہوکر اور ایک دوسرے کے گالوں پر بوسہ دے کر، ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔

اور پھر تیز تیز قدموں سے سندباد اس عظیم پرندے کی طرف روانہ ہوگیا، جہاں کی حسینہ کی دل نواز مسکراہٹ اس کے ذہن میں تازہ ہوتی جارہی تھی ——

●●

پرویز یداللہ مہدی

یہ ہے بامبے میری جان

قلم بند ہڑتال

ایک مرتبہ سرکاری ملازمین کے اس معتوب طبقے نے جو عرف عام میں کلریکل اسٹاف کہلاتا ہے ہڑتال کے ضمن میں بڑی
ہی جدت کا مظاہرہ کیا۔ اپنی کسی مانگ کے ٹھکرائے جانے پر، دفتروں کا بائیکاٹ کرنے کی بجائے قلم کو سیل بند کرکے اپنی اپنی
میں ڈپازٹ کردیا۔ تاریخ میں یہ ہڑتال "قلم بند ہڑتال" کے نام سے یاد کی جاتی ہے بدقسمتی سے انہی دنوں والد صاحب کے وظیفے
کارروائی کے سلسلے میں مطلوبہ دفتر جانے کا اتفاق ہوا جہاں دو چار مرتبہ پہلے بھی جاچکے تھے اس لیے متعلقہ کلرک سے نہ صرف علیک
سلیک ہو چکی تھی بلکہ بفضل تعالیٰ خیریت سے رہ کر آپ کی اور آپ کے اہل و عیال کی خیریت نیک مطلوب ہے تک مراسم بڑھ
گئے تھے۔ لیکن اس مرتبہ تیور ہی نرالے تھے، کام کی رفتار اس قدر بے ڈھنگی بھی ہوسکتی ہے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ ہمیں دیکھتے
ہی متعلقہ کلرک نے نمائشی مسکراہٹ کا مظاہرہ کیا۔ پھر کوٹ کی جیب میں سے اپنی مخصوص ٹو۔ ان ون (TWO-IN-ONE)
والی چونے اور تمباکو کی ڈبیہ نکالی، ہم نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ انھوں نے چونے کی ڈبیہ کا ڈھکن کھولا، چونا نکالنے
لیے اس میں پوری قوت سے انگلی گھمائی لیکن چونا سوکھا ہوا تھا کسی طرح ٹس سے مس نہیں ہوا۔ دانت پیس کر بولے۔ سالا
چونا بھی افسر لوگوں کا مافک اڑی بازی کرتا ہے، پانی کا چھینٹا مار کے سالے کو ابھی ڈھیلا کرتا میں"۔ اتنا کہہ کر کھڑے ہوگئے اور
اپنے میل خوردہ، جو دھوری کوٹ کے سارے بٹن جو وہ کرسی پر براجمان ہونے سے پہلے ہمیشہ کھول دیا کرتے تھے ایک ایک
کرکے بند کیے، پھر میز پر سے ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھی اور ہمیں یکسر نظر انداز کرکے چونے میں پانی ملانے کی مہم پر روانہ ہوگئے اور پھر جانے
کہاں کہاں کی سیر کرکے پورے پندرہ منٹ بعد لوٹے اور حسب عادت دانت پیس کر بولے۔ سالا اکھی بمبئی میں ادھر
اُدھر لائین آفس کے باتھ روم میں راشن کی لائین کے مافک لمبا کھڑا تھا کہہ کر حسب معمول ٹوپی اتار کر میز پر رکھی پھر کوٹ کے
بٹن کھولے۔ اس سارے عمل کے دوران ہم بڑی بے چینی سے ان کے کرسی سنبھالنے کا انتظار کرتے رہے۔ چناں چہ جیسے
ہی وہ بیٹھے ہم نے کچھ کہنے کے لیے دوبارہ صرف منہ ہی کھولا تھا کہ موصوف نے اپنی ٹو۔ ان۔ ون ڈبیا کے دوسرے حصے کا
ڈھکن کھولا، جس میں عموماً تمباکو کا اسٹاک رکھا کرتے تھے، اسے ہماری بدقسمتی کہیے کہ اس وقت تمباکو کا منی گودام "تمباکو
سے تہی" کر رہا تھا، لہٰذا بجلی کی سی پھرتی سے دوبارہ کھڑے ہو کر بڑبڑانے لگے۔ وہ سالا قرار دیسکتی کا گھا بیکر ڈیم،
تمباکو ہوائی کردیتا، آج اپن بھی اس کو بتانے گا، قرار میں اپن بھی اس سے کمتی نہیں ہے!" موصوف کی بڑبڑاہٹ کے

ے اپنا وقت اور ان کی محنت بچانے کے لیے پہلے ان کی ٹوپی میز سے اٹھا کر ان کے سر پر رکھی، پھر کوٹ کے جلد بٹن لگاتے، پھر
ر سیکشن سے ان کے کامیاب و کامران' لوٹنے کی دعا کے ساتھ انھیں رخصت کیا۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد تمباکو کی تیز بو نے ان کی فتح مندانہ واپسی کا اعلان کیا، موصوف نہ صرف گوہر مقصود حاصل کر کے لوٹے تھے
ا وہ گوہر مقصود کو اپنی بائیں ہتھیلی پر رکھے، داہنے ہاتھ کے انگوٹھے سے رگڑ بھی رہے تھے، ہم پر نظر پڑتے ہی کنکھے لہجے میں بولے
بھی تک پارسی کا مانک ادھر میں کھڑا ہے۔۔۔ ارے بابا! تم سمجھتا کیکو نئیں، آج تم غلط ٹیم کے اوپر آگیا یونین والا کلرک لوگ
قلم کے اوپر روک لگایا، ابھی ہم بھی قلم نہیں چلا سکتا۔۔۔!" اس مضحکہ خیز وضاحت پر ہم انگشت بدنداں رہ گئے، کلرک
حضرات کا قلم پہلے کون سا چلتا تھا جو اس پر روک لگائی گئی، سچ پوچھیے تو ہمیں یہ ہڑتال بے تکی معلوم ہوئی، جن کا قلم پہلے
بند ہو ان کی قلم بند ہڑتال چہ معنی دارد۔ اس سے پہلے کہ ہم منہ سے کچھ پھوٹتے، موصوف خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائے۔
گورمنٹ بھی کچھ سمجھنے کو تیار نئیں، اتنی کمتی پگار اور اتنی جاستی مہنگائی میں سالا آدمی خود بھی نئیں چل سکتا، کرمچاری لوگ کا قلم کیسا
چلے گا۔" پھر راست ہم سے مخاطب ہوئے "تم کو ادھر میں دیکھ کر ہم کو تکلیف ہوتا، کاہے کو بولے گا تو، تم بہت دھکا کھاتا، ابھی
تم کو ایک صلاح دیتا، روز روز اخبار دیکھنے کا، ٹی وی کے اوپر سماچار سننے کا، پھر جو دن ہمارا مہنگائی الاونس بڑھنے کا خوش خبر
ملیں گا، بن راس ادھر میں آجانے کا۔۔۔ کیا۔۔۔؟"

یہ قیمتی ٹپ ہمارے کانوں میں ٹپکا کر، موصوف نے اپنے ہاتھوں تیار کردہ نسخہ عرف خود ساختہ مرکب، جس کے عناصر ترتیب
تمباکو، چونے اور میل کی برابر برابر مقدار شامل تھی فوراً اپنی داڑھ میں دبا کر منہ بند کر لیا۔ قلم تو پہلے ہی بند تھا، اب منہ بھی بند
یا جو اس بات کا کھلا سگنل تھا کہ اب ہم چپ چاپ وہاں سے روانگی ڈال میں۔ ایک بار پھر ہم باول ناخواستہ لوٹ آئے،
ا اس مرتبہ ہمیں یہ احساس ضرور ہو گیا کہ والد صاحب کے وظیفہ کی کارروائی اس وقت تک متعلقہ کلرک مہاشے کی میز
آگے نہیں بڑھ سکتی جب تک کہ خود انھیں وظیفہ نہیں ہو جاتا۔۔۔!

اس کے علاوہ قلم بند ہڑتال کے توسط سے ہم پر یہ عقدہ بھی کھلا کہ دور حاضر میں ہڑتال کرنے کے لیے کسی خاص وجہ تسمیہ
ضرورت نہیں، صرف بہانہ چاہیے۔ پڑوس میں کسی کے ہاں مرغن پکوان بنے ہوں اور آپ کے پیٹ میں بلکہ برتن بھانڈوں میں بھی
ہے دوڑ رہے ہوں، یا کسی پڑوسی کے ہاں اس بار پھر لڑکا تولد ہوا ہو، جبکہ آپ نہ صرف پوری پانچ عدد لڑکیوں کے بلا شرکت
ے باپ ہیں بلکہ مزید پانچ عدد لڑکیوں کے باپ بننے کے آثار ہوں، ہر دو صورتوں میں پڑوسی کے خلاف 'دھرنا، گھیراؤ، پتھراؤ'
ا ہیے کہ تمام ہڑتالی حربوں کا استعمال کر سکتے ہیں؛ جمہور کے راج اور تیمور کے راج میں یہی تو فرق ہے تیمور کے راج میں صرف تیمور لنگ
یہ حق حاصل تھا کہ وہ جس پر چاہتا قہر تیموری نازل کر دیتا تھا، جبکہ جمہور کے راج میں ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے!!!

قلمی معاونین اپنی تحقیقات صاف اور خوش خط روشنائی سے صفحے کی ایک جانب لکھ کر
ارسال فرمائیں۔ مسودات پر اپنا پتہ ضرور لکھیں

بابو آر کے (اچل پور شہر)

چھٹیوں کی چھٹی

بچوں نے امتحانات ختم ہوتے ہی سیر سپاٹے کے لیے باہر جانے کی ضد کی ہم نے وعدے دلاسے دے کر ٹال مٹول کی اور چھٹیوں کے پندرہ دن کسی طرح گزار دیئے پھر ان کے نتائج آ گئے ہم نے امتحانات میں ان کی خراب کارکردگی پر ڈانٹ ڈپٹ کی، صلواتیں سنائیں۔ بچے ہمارا سامنا کرتے ہوئے کترانے لگے اور یہی ہم چاہتے بھی تھے چھٹیوں میں سیر سپاٹے کی فرمائش سے پیچھا چھڑانے کا اس سے کارگر نسخہ دوسرا نہ تھا۔

ابھی ہم بچوں کے محاذ سے کامیاب و کامران لوٹے ہی تھے کہ بیگم نے وہ رن ڈالا کہ ؎

نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن

ولیں چلنا ہوگا۔ ہم نے آنکھیں پھاڑ کر منہ کھول دیا اور چہرے کو سوالیہ نشان میں بدل کر پوچھا کہاں ؟ وہ بولیں ... بمبئی۔ میری خالہ زاد بہن کی شادی میں، ہم نے کہا ریلوں بسوں کے کرائے ایسے کہاں رہے کہ انھیں ادا کر کے شادی بیاہ میں شریک ہوا جائے۔ جواب میں بیگم نے شادی کا رقعہ ہماری جانب بڑھا دیا۔ ... یہ دیکھو کل ہی ڈاک سے آیا ہے ہم نے رقعہ کو ہاتھ میں لیا تھا کہ خون کھول اٹھا' شادی والوں کا کیا ہے؟ دو پیسے کا رقعہ چھپوالیا اور سولی پہ ہمیں ٹانگ دیا۔ وہ تو دعوت دے کر بے فکر ہو گئے اور رقعہ پاتے ہی ہم بے چین۔ کہیں سے بھی کسی طرح بھی ایڈجسٹ کرو اپنا بجٹ فیل کرو اور شادی میں شریک ہونے بمبئی جاؤ۔ اگر شادی میں شریک نہیں ہوئے تو بیگم کے طعنے زندگی بھر پیچھا نہ چھوڑیں اور سسرال والوں میں اپنی سبکی الگ۔ ہم پریشان سے اٹھے بیگم بولیں، یوں ہو کے خفا ... کدھر؟ ہم نے بمشکل چپل پہنتے ہوئے کہا بینک جاتے ہیں۔ یہ سنتے ہی بیگم اچھل پڑیں' ہائیں! آپ نے بینک میں پیسہ رکھا اور بتایا تک نہیں؟ ہم نے کہا بینک میں پیسہ وہ لوگ رکھتے ہیں جن کی ہوائیں چور اچکی اور گرہ کٹ ہوتی ہیں ۔ بیگم خوش ہو گئیں .. تو پھر آپ بینک جا کر کیا کریں گے ؟ ہم نے انھیں سمجھایا۔ پانچ بچے اور ہم دو۔ یعنی پوری ناسری اور تال تمبو کو ساتھ لیکر بمبئی جانا اور وہاں تحفہ وغیرہ خریدنا۔ اس طرح شادی کا بجٹ خاصہ خرچیلا ہے۔ دیکھیں حکومت بدلا ہے۔ شہریوں کو آسانیاں فراہم کرنے کے وعدے بھی بہت کئے تھے شاید

ریلوں اور بسوں کے کرایوں میں اضافہ کے ساتھ ہی مسافروں کو سفر میں راحت پہونچانے کے لیے مالی تعاون کا بھی کچھ بندوبست ہوا ہو چنانچہ ہم نے مختلف بنکوں کے نام درخواستیں مع رقعہ کے روانہ کر دیں۔ ہم نے درخواست میں کھلے طور پہ یہ واضح کیا کہ ہم دو میاں بیوی اور پانچ بچوں پہ مشتمل ہماری فیملی ہے۔ ہم اپنی تنخواہ میں شادی کا رقعہ آنے سے پہلے اور ریلوں، بسوں کے کرائے میں اضافہ سے پہلے تک اچھی طرح گزر بسر کر رہے تھے لیکن رقعہ ملنے اور کرائے بڑھنے کے بعد ہم اس پوزیشن میں نہیں کہ باہر گاؤں جا کر شادی میں شریک ہو سکیں۔ اگر ہم شادی میں شریک نہ ہوئے تو بیگم مائیکہ میں جا کر بیٹھ جانے اور خلع لے کر ہماری زندگی میں خلاء لانے کی دھمکیاں دیتی ہیں۔ اس لیے مائی باپ، ماں باپ، آپ ہماری پریشانیوں پر نظر کرتے ہوئے ہمارے لیے بنک سے ٹراویلنگ لون کا بندوبست کر دیں اور ہماری ازدواجی زندگی کی لٹیا کو ڈوبنے سے بچا لیں۔ اس قسم کی درخواستیں ارسال کرنے کے علاوہ بالمشافہ ہم بنک منیجروں سے بھی ملے۔ ابتداء ہم نے سنٹرل بینک سے کی چونکہ ہم سنٹرل بینک کا تعلق خاص سنٹر (مرکز) سے سمجھتے تھے اس لیے اسٹیٹ بینک کو ہم نے منہ نہ لگایا۔ ہم منیجر صاحب کے چیمبر میں داخل ہوئے۔ منیجر صاحب بولے، بیٹھ جائیے ہم بیٹھ گئے۔ کہیئے کیسے اور کیوں پدھارے؟ ہم نے کہا حکومت بدلی ہے۔ وہ بولے ہمیں خبر ہے۔ ہم نے کہا پھر تو بینکوں کی پالیسیاں بھی بدلی ہوں گی۔ وہ بے نیازی سے بولے ... آپ کو اس سے کیا؟ ہم نے اپنی درخواست کی کاپی مع رقعہ ان کے سامنے رکھ دی۔ وہ بولے یہ کیا ہے؟ ہم نے خوش ہو کر کہا ہمیں شادی کا بلاوا ہے۔ بولے شوق سے جائیے روکتا کون ہے؟ ہم نے کہا محکمۂ ریلوے روکتا ہے! وہ بولے ریل کو مارو گولی، بس سے چلے جاؤ۔ ہم نے جواب دیا اسٹیٹ ٹرانسپورٹ بھی روکتا ہے۔ وہ بولے پھر جاتے کیوں ہو مت جاؤ۔ ہم نے کہا ہمارا گھر اجڑ جائے گا۔ انھوں نے دریافت کیا گھر بسا کب تھا؟! ہم نے کہا جب ہماری دنیا اُجڑی تھی۔ اب منیجر صاحب (جو صورت سے بھلے ہی راون تھے) رام ہوتے دکھائی دینے لگے .. تو تمہیں ٹراویلنگ لون چاہیئے۔ ہم نے باچھیں کھول دیں .. جی ہاں جی ہاں .. آپ نے ٹھیک پہچانا۔ اس کے بعد منیجر صاحب نے ہمیں سمجھایا دیکھو ابھی تک حکومت کی جانب سے ہمیں ایسا کوئی سرکلر نہیں ملا ہے .. آپ اطمینان رکھیئے جب کبھی ایسا ہوگا ہم سب سے پہلے آپ کو یاد کریں گے۔

ہم نے کہا ... پھر تو فی الحال یہ شادی ملتوی کروانی ہوگی۔ وہ بولے خط لکھ کر مطلع کر دو۔ ہم نے کہا محکمۂ ڈاک بھی تو ڈاکے ڈالنے لگا ہے۔ ان لینڈ لیٹر پچھتر پیسے کا ہوگیا اور لفافہ کی قیمت ایک روپیہ یعنی یہ بھی پک پاکٹنگ ہی ہوئی! منیجر صاحب بولے ... پھر کیا کرو گے؟ ہم نے کہا کبوتر پالیں گے ... ہم جانے کے لیے اُٹھے۔ وہ بولے کیوں کہاں؟ ہم نے کہا جاتے ہیں انھوں نے ہمیں یاد دلایا .. دیکھو بھولنا مت۔ ایک کبوتر ہمارے لیے بھی بھجوا دینا اور منیجر صاحب۔ کبوتر جا جا جا .. کبوتر جا لہک لہک کر گانے لگے۔

دوسرے دن ہم صبح اسٹیٹ بنک منیجر کے گھر روانہ ہوئے ہم نے بصورت رشوت سنگتروں کا ایک پٹارہ اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ منیجر سے سلام کے بعد کلام کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے ہم نے پٹارہ منیجر صاحب کے اتنا سامنے رکھ دیا کہ انھیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ وہ کہنے لگے، ہمارے بنک میں اس قسم کے تمام

SUBOECTS بالکل CLOSE ہیں ہم نے پٹارے کو منیجر صاحب کے سامنے مزید بڑھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ دہاڑے خبردار، اب پٹارے کو ہاتھ بھی لگایا تو ۔۔۔ پولیس کو فون کر دوں گا! یہ کہہ کر انھوں نے ریسیور اٹھالیا۔ ہماری اس تو تو ۔۔ میں میں کو سن کر منیجر صاحب کی بیگم رسوئی گھر سے بھاگی بھاگی آئیں۔ انھوں نے ہم سے دریافت کیا پٹارے میں کیا ہے؟ ہم نے کہا اس میں سنگترے ہیں بھابی جی ہم پہ ترس کھا کر بھابی جی نے کہا، لے لیجئے نا، یہ سنتے ہی منیجر صاحب چلّائے ۔۔۔ اری کم بخت تو نہیں جانتی، ۔۔۔ اب وہ دن نہیں رہے ۔۔۔ سارے گھر کے پرخچے، میرے تیرے اور سب بچوں کے چیتھڑے اڑ جائیں گے۔ ہاتھ پاؤں سینہ دھڑ سمیٹنے والا کوئی نہ ہوگا۔ اس پٹارے میں سنگترے نہیں بم ہیں اور یہ مجھے خطرناک آتنک وادی لگتا ہے۔ آتنک واد کا نام سنتے ہی منیجر صاحب سے زیادہ ہم گھبرا گئے ہم نے ہاتھ جوڑ کر کہا صاحب، ہم آتنک واد نہیں بلکہ باراتی ہیں ہمیں بال بچوں کو لے کر سالی کی شادی میں ابھی جانا ہے۔ ہم نے انھیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: یہ صحیح ہے کہ جب سے پنجاب اور کشمیر میں آتنک کے دروازے کھلے ہیں تب سے بند چیزیں کھولنا بند ہوگیا ہے پھر بھی آپ ہمارا یقین کریں اور یہ پٹارہ کھول کر دیکھ لیں۔ منیجر صاحب کانپتی آواز میں بولے اسے ہم نہیں پولیس کھولے گی اور پھر نمبر ملا کر انھوں نے پولیس کو مطلع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے منیجر کے گھر کے پاس ایک مجمع لگ گیا۔ چاروں طرف آتنک وادی کے چرچے شروع ہوگئے۔ پولیس اسپیشل اسکواڈ کو ساتھ لے کر دوڑی بھاگی آئی۔ پٹارے کو احتیاط سے اور ہمیں بد احتیاطی سے اپنے قبضہ میں کیا اور تھانے لے گئی۔

اس دن ہمیں معلوم ہوا کہ پنجاب اور کشمیر کے آتنک واد سے شہریوں کو فائدے بھی بہت پہنچ رہے ہیں۔ بے دریغ رشوتیں کھانے والے آفیسروں کو تحفے تحائف میں دستی بم اور ٹائم بم کی دہشت نے لرزا دیا ہے۔ اسی آتنک واد کی وجہ سے وہ رشوتیں لیتے ہوئے گھبرانے لگے ہیں۔ اسی آتنک واد کی وجہ سے لوگوں میں ایمانداری اور شر سیان ستیہ وادی کی لہری آ چلی ہے۔ آپ سرراہ کہیں بھی اٹیچی، سوٹ کیس، ٹرانسسٹر ریڈیو یا ٹفن بھول جائیے آپ کو وہ چیزیں جوں کی توں حالت میں مل جائیں گی۔ رام راجیہ کے لکشن آتنک واد میں دکھائی دینے لگے ہیں اور یہی دیکھ دیکھ کر ہم تو پھولوں نہیں سماتے۔ ہم تو خوش ہیں کہ آتنک واد کی وجہ سے رشوت خوری اور چوری جیسی برائیاں ہمارے سماج سے ختم ہونے لگی ہیں۔ آگے آگے دیکھئے اس شر سے خیر کے اور کون کون سے پہلو نکلتے ہیں۔۔!

انیس سلطانہ
(بھوپال)

اگر صفر نہ ہوتا

بتائیے تو بھلا نو تک گنتی لکھنے کے بعد پھر ایک سے شروع کرتے۔ کام تو چل ہی جاتا تھا۔ اب بھی دیکھیے نانی اماں کو آج تک بیس کی گنتی آتی ہے اور ایک بیسی دو دو بیسی کر کے کام چلاتی ہیں مگر یہ ہم اور یہ ہماری حساب دانی ــــ!!

اہلِ ہند بڑے فخر سے کہتے ہیں، زیرو ہماری ایجاد ہے کبھی کبھی عرب والے بھی زیرو کا سہرا اپنے سر باندھتے ہیں، لیکن ہمیں یہ زیرو پھوٹی آنکھ نہیں بھاتا۔ خاص کر اس وقت جب کند ذہن اور کوڑھ مغز بچوں کو حساب سکھانا پڑ جاتے۔

اچھے بھلے دوسرے تمام مضامین میں فر فر اپنا سبق یاد کرنے والے بچے، حساب کے میدان میں نہ جانے کیوں اٹکنے اور لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ اکثر تو سر کے بل گرتے ہیں اور بعض تو صرف صفائی کے نمبروں پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

ابھی تک ہم اسکول میں ہی بچوں کو اردو پڑھاتے تھے، اس لیے ہماری سمجھ میں یہ بالکل نہیں آیا تھا کہ آخر حساب میں دشوار کیا ہے؟ روزِ حساب سے ڈرنا اور بات ہے ــــ!!

مگر اللہ کا کرنا یوں ہوا کہ قومی دھارے میں بہنے کے لیے بلکہ بہانے کے لیے ہمیں کچھ ان پڑھ لوگوں کو پڑھا لکھا ثابت کرنا تھا۔

سو پہلا وار ہم نے گھر کی نوکرانی پر کیا۔ وہ بھی ایسی گھنوں کی پوری کہ نہ جانے کیسے ہم اسے پڑھانے بیٹھے اور تھوڑی دیر بعد اس کی بیٹی کو پڑھا رہے ہوتے۔

خیر ہم نے اسی کو غنیمت سمجھا اور آج کا طالب عالم کل کا ناگرک ہونے والا ہے، یہ سوچ کر اپنے خلوص میں کمی نہ آنے دی۔

بچی بھی وہ کہ اسکول جاتی ہے۔ ہم نے سوچا غریب کا مستقبل سنور جائے گا اگر ہم ذرا سی محنت کر لیں اپنے حساب ہماری نیت میں کھوٹ نہ تھا مگر وہ بھی اپنے قول کی پابند تھی۔

اعداد کا شمار کرنے، جمع نے گھٹانے میں لڑکی خاصی ذہین نظر آتی تھی۔ چھوٹا موٹا سودا سلف منگواؤ تو کبھی حساب میں غلطی نہ کرتی۔ اب کیا تھا، ایسا ذہین طالب علم خدا کی دین سمجھ کر ہم شکرِ نعمت بجا لائے اور اس کی ذہنی تربیت میں جی جان سے لگ گئے۔

ایک اور دو کا جوڑ وہ ہمیشہ تین ہی بتاتی مگر جب ایک میں زیرو جوڑا جاتا تو دس ہو جاتا۔ ذات کر اگر ایک کا ایک ہی
ہتا تو پانچ اور زیرو کا جوڑ ہمیشہ پچاس ہی ہوتا۔

یہ بات اس کے گلے سے کسی طرح نہ اترتی۔

زیرو سے ضرب کرنے کا مسئلہ اور بھی ٹیڑھا تھا۔ اچھا بھلا نو بے چارہ سر جھکائے کھڑا ہے۔ عددوں میں قائم
ب سے بڑا کہ یہ زیرو کا آ تا اور اپنے ضرب سے اسے بھی زیرو کر دیتا۔

زیرو کا سلوک بھی ہر عدد کے ساتھ یکساں نہیں ہے۔ کسی کو ضرب سے زیر کیا اور کسی کو تقسیم سے نابود کر دیا اور
ی لیے شاعر نے کہا ہے:

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

ں کے لیے تو ایک ضرب ہی کافی ہے۔

ہم نے سوچا شاید گھٹانے میں زیرو کچھ مصالحت کرے۔ بہت سمجھایا دیکھو اگر دو میں سے زیرو گھٹائیں تو دو ہی بچا
اسے یہ الجھن کہ آخر گھٹانے کی ضرورت ہی کیا ہے! یہ تو کنجوس کا مال ہو گیا کہ تالے سے لگا لگا کر روٹی کھائی۔
جن بوتو آتی رہی۔ گھی بدستور بند رہا۔ جب ہم نے بہت ڈرایا دھمکایا اور شام کا کھانا بند کر دیا تو ناچار اس نے روتے
روتے اقرار کر لیا کہ اچھا دو بچے۔

جیسے پولیس والے مار مار کر بے گناہ سے بھی گناہ کا اقرار کرا لیتے ہیں۔ ہم نے اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے
ازہ روٹی پر گھی لگا کر کھانے کو دیا کہ محض تالے سے روٹی لگانے والی بات سچ ثابت نہ ہو جائے۔

مگر ابھی تو ہمیں اور بھی مہمات طے کرنا تھیں۔ لگاتار ایک ہفتہ سر کھپانے کے بعد جب چار میں زیرو جوڑنے پر
بالیس ہی ہوئے تو ہمیں کچھ عبرت ہوئی۔ یقیناً ہم پڑھانے میں کورے اور نہایت کوڑھ مغز ہیں۔

ایسی آسانی سے ہم ہار ماننے والے نہ تھے۔ پورے سباق سیاق کے ساتھ دہرائے گئے۔ ابھی جناب زیرو کے
کرشمے باقی تھے۔

زبانی حساب میں وہ آسانی سے بتا سکتی تھی کہ دس میں سے تین گھٹانے پر سات ہی بچتے ہیں۔ مجھے وہ نظم
یاد آئی جس میں ایک بچی اپنے مرنے والے بھائی بہنوں کی قبر کے پاس بیٹھی ہے اور مسافر کو جب اپنے کل بھائی بہنوں
کی تعداد بتاتی ہے تو چار ہونے کے باوجود بار بار کہتی ہے " وی آر سیون " ہم سات ہیں۔

زبانی حساب میں اسے اتنا پرفکٹ دیکھ کر ہمیں یقین ہو گیا کہ آج دہرائے ہوئے سبق اسے اچھی طرح یاد ہو گئے
سو ہم نے ذرا بڑے سوال حل کرانے کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ اور سو میں سے پندرہ گھٹانے کی بات آئی تو ہمیں دن میں
تارے نظر آنے لگے۔ ہم نہایت آسانی سے پہلے زیرو کو دس اور دو سرے کو نو کہتے اور پندرہ کو اس میں سے گھٹا

ویسے ہم آج تک کسی طرح یہ نہ سمجھ سکے کہ حاصل جمع اکائی دہائی کے بنیادی حقوق محفوظ رہتے ہیں۔ ہمیں تو اپنی طالبیت ہی خطرے میں نظر آرہی تھی۔ لیکن ہم ڈٹے ہوئے تھے۔

تینتیس فی صدی پہ پاس ہونے کی رسم بھی شاید اسی لیے روا رکھی جاتی ہے کہ یہ زیرو کسی کو مشکل سے ہی پار لگنے دیتا ہے۔ جس نے اس سے یاری کر لی اس کی نیا پار۔ چنانچہ وہ کلاس چڑھتی رہی۔

ابھی تو اعشاریہ کے سوالات بتانے تھے۔ ہم ہار ماننے ہی والے تھے کیوں کہ آج خود اعشاریہ کی افادیت ہماری سمجھ میں نہیں آئی، ہم اسے کیا سمجھاتے۔ اگر ہماری سمجھ میں کوئی بات آئی صرف اتنی کہ اعشاریہ کے سوال ایک طرح کی ہٹ دھرمی پر مبنی ہیں۔

دس کو تین سے تقسیم کیجیے۔ مقسوم الیہ بھی تین اور مزہ سے جو ایک بچے اسے اپنی گرہ میں رکھیے یا اعلان عام کر دیجیے۔ مگر نہیں صاحب وہ تو اعشاریہ لگا کر زیرو بھی بڑھائیں گے کوئی پوچھے تو سہی کہ آخر کیوں بڑھائیں گے۔ اور جتنی دیر چاہے جتنے زیرو چاہے بڑھاتے جائیے۔

سوال نہ ہوا یونائیٹڈ پریشر کوکر کا (ٹی وی پہ دکھلائے جانے والا) اشتہار ہو گیا۔ بھیس بدل بدل کر ہر زبان میں ایک ہی بات کہو مگر نتیجہ وہی رہے گا "ایک بچتا رہے گا۔"

اعشاریہ کا جوڑ گھٹانا اور بھی جان لیوا ثابت ہوا۔ یقینی بات ہے کہ زیرو سب سے چھوٹے ہندسے سے بھی چھوٹا ہے مگر مائنس زیرو نے تو اپنا دماغ بھی منجمد کر دیا۔ ٹی وی موصوفہ بڑی اشتیاق سے دیکھتی ہیں۔ کشمیر میں درجۂ حرارت مائنس چار چل رہا تھا۔ اتفاق کہیے کہ ہمارے نصیبوں کا کرشمہ گھٹانے کا سوال جو ہم سکھا رہے تھے، بلکہ سکھانا چاہ رہے تھے اس میں جواب مائنس چار ہی آیا، اس کی جغرافیہ کا قائل ہونا پڑا جب جواب میں ہم نے لکھا ہوا دیکھا کشمیر کا درجۂ حرارت اور نیچے تاریخ بھی دی ہوئی تھی۔

سوالوں میں بنیادی غلطی خود سوال کی عبارت لکھنے والے کی ہوتی ہے، جب وہ مائنس دو کو مائنس چار سے بڑا کہتے ہیں۔ اور ہم کسی طرح یہ باور نہیں کرا سکتے کہ منڈل کمیشن کی طرح ان غلطیوں کو بھی بغیر رد و بدل کے مان لینے میں ہی عافیت ہے۔ پھر بھلا زیرو میں سے مائنس چار کو بڑا کہہ کر مائنس دو کو بڑا کہنا بھی اس مشہور کہاوت کو یاد دلاتا ہے۔

جس دیش میں اس کی جیسی کہنا
اونٹ بلیا لے جائے تو ہاں جی ہاں جی کہنا

(ربلی)

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد ۲۳

شمارہ ۱۲

دسمبر ۱۹۹۰ء

ایڈیٹر:

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

خصوصی نمائندے:

بمبئی ——— فیاض احمد فیضی

ریاض ——— عابد معز

دہلی ——— غلام نجم الدین

آسٹریلیا ——— ایس۔ ایم حسینی

کتابت: محمد غالب، محمود سلیم، محمد مجاہد

طباعت: دائرہ الکٹرک پریس

چھتہ بازار۔ حیدرآباد

فی پرچہ: ۵ روپے

زر سالانہ: ۵۵ روپے

لائبریریوں سے: ۶۰ روپے

بیرونی ممالک سے: ۱۸۰ روپے

ترسیلِ زر کا پتہ:

شگوفہ:

۳۱۔ ٹیچرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

فون آفس: 557716 مکان: 521064

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مالِ مفت (انشائیے)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

قاضی جی دُبلے (کوائف بمبئی)

بال کی کھال (تبصرہ)

چُورن (منظومات)

ماہنامہ شگوفہ

کا آئندہ شمارہ

سالنامہ ہوگا۔

ملک کے تمام نامور طنز و مزاح نگاروں کی تخلیقات

★ اِنشائیے ★ خاکے ★ کارٹون ★ لطیفے ڈرامہ اور دیگر

بےشمار دلچسپیاں ★ خوبصورت سرِورق ★ ضخامت : عام شمارہ کی دوگنی
قیمت : آٹھ روپے

رؤف پاریکھ
(کراچی)

خطائے طلبہ گرفتن خطا است

گزشتہ ہفتے ہم بہت اداس رہے۔ خبر ہی ایسی دل دکھانے والی تھی۔ خبر کے مطابق اندرونِ سندھ مختلف امتحانی مراکز میں نقل پر پابندی کے خلاف طلبا نے احتجاج کیا اور اشتعال میں آکر پولیس پر پتھراؤ کیا۔ جواباً پولیس کو آنسو گیس استعمال کرنا پڑی۔ ہر صاحبِ دل اور صاحبِ اولاد اس خبر پر اداس ہوگا کیوں کہ طلبا کو نقل سے روکنا بڑا ظلم ہے اور طلبا میں ہمارے آپ کے بچے بھی شامل ہیں، پولیس نے بچوں پر بڑی زیادتی کی ہے۔ آخر ان کا جرم کیا تھا۔ صرف یہی نا کہ وہ نقل کرنا چاہتے تھے کوئی قتل کرنے تو نہیں چلے تھے۔

ذرا سی نقل پر پولیس کا کیا بگڑ جاتا۔ لڑکے پاس ہو جاتے آسمان تو نہیں ٹوٹ پڑتا۔ ویسے بھی نقل کرنا طلبا کا پیدائشی حق ہے۔

آخر پولیس والے یہ کیوں چاہتے ہیں کہ طلبا نقل نہ کریں فیل ہو جائیں۔ قابلیت پیدا نہ کریں۔ نقل کرنے سے آدمی پاس ہو جاتا ہے۔ قابلیت پیدا نہیں ہوتی تو نہ سہی قابلیت کا سرٹیفکیٹ ہی کافی ہے۔ شرحِ خواندگی بھی تو بڑھانی ہے۔ قوم کے رہنما ہیں کہ قوم کو تعلیم یافتہ بنانے کی کوشش کر کے ہلکان ہوئے جا رہے ہیں تعلیم کی نئی نئی اسکیمیں بنا رہے ہیں اور یہ پولیس والے ان کے تمام کیے کرائے پر پانی پھیر دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ طلبا کو نقل کرنے دیجیے۔ یہ پاس ہو جائیں گے تو ملک میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔

ہم تو امتحان ہی کے خلاف ہیں۔ یہ پرچے حل کروانا، رٹے لگوانا اور امتحان لینا، یہ سب ظلم نہیں تو اور کیا ہے سیدھا سادا ہر سال طلبا کو ترقی دے دی جائے۔ اگلی کلاس میں بھیج دیا جائے اور سرٹیفکیٹ تھما دیا جائے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ آخر طلبا کے دماغ کا تیل نکلوا کر محکمۂ تعلیم کو کیا حاصل ہوگا۔ حد سے حد طلبا یہی سیکھیں گے کہ الجبرا میں لا برابر کچھ بھی ہو سکتا ہے اور سیاسیات میں مارشل لا کے برابر کچھ بھی نہیں ہو سکتا جمہوریت بھی نہیں چند اور مضامین مثلاً تاریخ حساب انگریزی اردو اور معاشیات وغیرہ کی کچھ موٹی موٹی باتیں لڑکے سیکھ لیں گے مثال کے طور پر تاریخ یہ بتائے گی کہ کس بادشاہ کو اچھے اچھے کام کرنے کا شوق تھا اور اس شوق کی تکمیل کے لیے اسے مجبوراً تخت پر قبضہ کرنا پڑا اور تخت پر قبضہ کرنے کے لیے کس کس بھائی کو کس طرح راستے سے ہٹانا پڑا۔ حساب انھیں سکھائے گا کہ

کاروبار میں دو اور دو پانچ کس طرح ہوتے ہیں۔ ملازمین کی تنخواہ تفریق کرکے دولت کیسے جمع کی جاتی ہے۔ انگریزی پڑھ کر انھیں یہ سمجھ میں آجائے گا کہ مغربی تہذیب ہماری تہذیب سے برتر ہے اور ہماری فلاح اسی میں ہے کہ ہم اسے اپنا لیں۔ اردو انھیں بتلائے گی مشکل زمین میں قافیے کس طرح نکالے جاتے ہیں۔ رہی تپتی زمینوں سے تیل اور معدنیات نکالنے کی بات سو

ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

معاشیات بھی کام کا مضمون ہے امیر باپوں کے بچوں کو یہ ضرور پڑھایا جاتا ہے تاکہ وہ انکم ٹیکس بچانے اور منافع میں اضافہ کرنے کے گر سیکھ سکیں۔

لیکن ان سب کے سیکھنے سے کیا فائدہ ہے؟ تاریخ سے آج تک کسی نے کیا سبق سیکھا ہے جو طلبا سیکھیں گے۔ رہے حساب اور معاشیات تو سرمایہ داروں کی اولاد کو یہ سارے گر پہلے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ مچھلی کے بچے کو تیرنا کون سکھائے۔ انگریزی اور اردو تو محض زبانیں ہیں اور زبان صرف چڑانے کے لیے ہوتی ہے یا گالیاں دینے کے لیے۔ کچھ لوگ اس کو چولہے گھر کی لونڈی سمجھتے ہیں لہٰذا زیادہ منہ نہیں لگاتے، خاص کر جو اہلِ زبان ہیں وہ اسے غیر اہلِ زبان لوگوں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں اور جب یہ ان کے قابو نہیں آتی تو خوش ہو کر ہنستے ہیں اور زبان دکھاتے ہیں کہ ایسی ہوتی ہے۔ تمھارے پاس بھلا کہاں؟ اور جو لوگ بے چارے اہلِ زبان نہیں ہوتے وہ خود کو بے زبان سمجھ کر خاموش رہتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ طلبا نے ان تمام مضامین پر عبور حاصل کر بھی لیا تو کیا تیر مار لیں گے؟ اور پھر انھیں نوکری حاصل کرنے کے لیے بھلا کون سی قابلیت درکار ہے؟ ماشاء اللہ سے چچا، ماموں، دولہا بھائی، ابا میاں، خالو، پھوپھا سب کی فوج ظفر موج اونچے نیچے عہدوں پر فائز ہے۔ آخر وہ کس دن کام آئے گی اور ان لوگوں نے جو پبلک ریلیشننگ کر رکھی ہے؟ وہ کس لیے ہے؟ قابلیت تو ملازمت حاصل کرنے کی متروکہ شرط ہے جن لوگوں کو ماموں سفارش علی خاں نوکری نہیں دلوا سکتے حکومت نے ان کی آسانی کے لیے کرنسی نوٹوں کی صورت میں تعویذ پہلے ہی چھپوا رکھے ہیں جو بڑے کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ کیوں نہ ہوں ان پہ بہت بڑے افسر کے دستخط جو ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم امتحانات کے سخت خلاف ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ زندگی کے سنہرے دور کی حسین شامیں الجبرا اور ریاضی کے خشک فارمولے رٹتے ہوئے گزار دی جائیں اور پھر اگر سارا وقت مطالعے کی نذر کر دیا جائے تو دی سی آرز کے ساتھ کب انصاف ہوگا اس کے علاوہ بھی طلبا کو بہت سے کام رہتے ہیں مثلاً نئے فیشنوں کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرنا نئی فلموں پر تبصرہ، موٹر سائیکلوں اور کاروں کے نئے ماڈل کا جائزہ قوم کی بہنوں اور بیٹیوں کو بحفاظت ان کے گھر تک پہنچانا وغیرہ۔ اب آپ ہی دل پر ہاتھ رکھ کر انصاف کیجیے کہ طلبا بے چارے پڑھائی پہ ضائع کرنے کے لیے وقت کہاں سے لائیں۔

ہماری تجویز ہے کہ جو طلبا اسکول، کالج یونیورسٹی میں نام درج کروا لیں انھیں کامیاب قرار دے دیا جائے اور سرٹیفکیٹ یا ڈگری ان کے گھر بھیج دی جائے کہ حضور ہم نے آپ کو داخلے کی جو زحمت دی تھی اس پر ہم شرمندہ ہیں۔ اس کی

تلافی کے لیے یہ ڈگری حاضر ہے گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ ہو سکتا ہے کہ محکمۂ تعلیم والے ہماری اس تجویز پر اعتراض کریں اور مطالبہ کریں کہ طلبا کو کم از کم سارا سال جماعت میں حاضر ہو کر لیکچر ضرور سننا چاہیے اول تو ہم نے عزیز طلبا کے جو مشاغل اوپر گنوائے ہیں وہ محکمۂ تعلیم کے کند ذہن افسروں کو قائل کر دینے کے لیے کافی ہیں (ظاہر ہے جو شخص طلبا کو لیکچر سننے کا کہے اس کی عقل میں ضرور فتور ہوگا) پھر کالج اور یونیورسٹی میں طلبا کا اجتماع ہمیشہ امن و امان اور سرکاری بسوں کے لیے خطرے کا باعث رہا ہے تاہم محکمۂ تعلیم طلبا کی حاضری پر اگر اصرار کرتا ہے تو ہم ایک متبادل تجویز پیش کرتے ہیں۔

متبادل تجویز ہے کہ طلبا کا ایک ہلکا پھلکا بے ضرر سا امتحان ضرور لیا جائے لیکن نقل کرنے کی پوری پوری آزادی ہو۔ کمرۂ امتحان میں نہ صرف کارتوس بلکہ پورا گولا بارود دلانے کی اجازت ہو۔ نقل کی حوصلہ افزائی کے لیے یہ شرط بھی رکھی جا سکتی ہے کہ نقل نہ کرنے والے امیدوار کو تین سال تک امتحان دینے کے لیے نااہل قرار دے دیا جائے (ایسے ہی نالائق لوگ معیارِ تعلیم کے لیے پستی کا سبب بنتے ہیں جو نقل نہ کر کے فیل ہو جاتے ہیں) پھر پرچے بہت ہی آسان ہوں۔ آج کل ہمارے ہاں طلبا پر ایک ظلم یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی مضمون میں پاس ہونے کے لیے تینتیس ۳۳ فی صد نمبر حاصل کرنے پڑتے ہیں۔ اگرچہ امریکہ اور دیگر پسماندہ ممالک میں یہ حد ساٹھ ۶۰ ستر ۷۰ فی صد تک ہوتی ہیں لیکن ہم خاصے ترقی یافتہ ہیں۔ ہمیں اتنے سخت معیار قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس پانچ ۵ فی صد نمبر حاصل کرنا کافی ہوگا۔ اور ہاں دس ۱۰ نمبر صفائی کے ہوں گے چناں چہ جو امیدوار کاپی بالکل کوری چھوڑ دے اسے صفائی کے دس ۱۰ نمبر دے دیے جائیں۔ ہم امیدواروں کو یہی مشورہ دیں گے کہ وہ سو ۱۰۰ نمبر کے پرچے میں کاپی صاف چھوڑ کر آ جائیں۔ آگے کی قسمت ہے۔ البتہ پروفیسر اللہ دتہ سے تعویذ لینا نہ بھولیں جو تین ہٹی کے پل کے نیچے عرصۂ دس سال سے لوگوں کو تعویذوں کے ذریعے ایم اے پاس کروا رہے ہیں۔ (اور خود مڈل فیل ہیں)

ہمارے خیال میں اتنی ہدایات محکمۂ تعلیم اور امیدواروں کے لیے کافی ہیں لیکن خطرہ یہ ہے کہ محکمۂ تعلیم کے افسران فرسودہ نظام کے تحت حاصل کرنے کی وجہ سے اس جدید ترین طریقۂ تعلیم کو سمجھ نہیں پائیں گے لہٰذا ان کی رہنمائی کے لیے ہم امتحانی پرچے نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

پرچہ برائے ایم۔ اے پریاضی

کل نمبر ۱۰۰

مطلوبہ نمبر ۵

کوئی ایک سوال حل کیجیے۔ وقت کی کوئی قید نہیں۔ نقل کی کھلی چھٹی ہے۔ صفائی کے دس نمبر ہیں (کاپی سادہ چھوڑنے والی ہدایت یاد رہے)

سوال ۱: دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟ تین، چار یا پانچ؟

سوال ۲: گنتی میں دس کے بعد کیا آتا ہے، گیارہ یا بارہ؟

سوال نمبر ۳ — ایک سرکاری افسر کی آمدنی میں سے کیا تفریق کیا جائے کہ حق حلال کی تنخواہ حاصل ہو؟

پرچہ برائے ایم اے اردو

(شرائط اور ہدایات وہی جو ریاضی کے پرچے میں دی گئی ہیں)

سوال نمبر ۱ اردو کے کسی ایک شاعر کا نام خوش خط لکھیے۔

سوال نمبر ۲ الف سے لے کر ج تک لکھیے۔

سوال نمبر ۳ اردو کی کسی کتاب کا نام لکھیے یا چھوڑیے رہنے دیجیے۔

ہمیں یقین ہے کہ یہ کڑا امتحان محکمہ تعلیم کے افسران کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہوگا۔ حالاں کہ اصولاً تو ہم کسی امتحان کے حق میں نہیں ہیں لیکن چوں کہ محکمے کو امتحان لینے کا ہوکا ہے لہذا ان کی تسلی کو یہ ضرور تھا۔ ہم انتظامیہ کو یقین دلاتے ہیں کہ اس قسم کے پرچے رکھے گئے تو طلبا کبھی ہنگامہ آرائی نہیں کریں گے اور نہ ہی انھیں نقل کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ لہذا آنسو گیس وغیرہ تک نوبت پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ملک کے لائق طلبا جو ہمیں بہت عزیز ہیں اور جن کے مستقبل کی ہمیں بہت فکر ہے انھیں ہم یہی کہیں گے کہ نقل ہمیشہ اس طرح کرنی چاہیے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کیوں کہ لوگ اپنی کم عقلی کی وجہ سے اعتراض کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر کوئی پریشانی امتحان میں پیش آئے تو تعویذ کی طرف رجوع کریں۔ دونوں قسم کے تعویذ، پروفیسر اللہ دتہ کے بھی اور سرکاری تعویذ بھی جن کا تذکرہ ہم نے پہلے کیا۔ البتہ ان سرکاری تعویذوں پر دستخط اور نمبر غور سے دیکھ لینا چاہیے۔ بعض جعلی پروفیسر جعلی سرکاری تعویذ بھی چھاپتے ہیں اور اس کا پولیس بہت بُرا مانتی ہے۔ پولیس کو راضی رکھنے کے لیے بھی اصلی سرکاری تعویذ درکار ہوتے ہیں۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو اور نقل کے لیے عقل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

ابراہیم یوسف
(بھوپال)

ہماری ہابی

عزیز محترم کا خیال تھا کہ ہماری زندگی بے رس اور بے مقصد ہے کیوں کہ فرصت کا وقت گزارنے کے لیے ہمارا کوئی مشغلہ یعنی ہابی نہیں ہے ہم نے کئی مرتبہ انھیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ ہمارا بھی ایک مشغلہ ہے۔ ہم اپنے فرصت کے اوقات میں منہ سے دھواں اڑانے میں گزارتے ہیں خواہ وہ سگار کا یا سگریٹ کا، بیڑی کا ہو یا حقہ کا۔ کبھی کبھی چلم کا دھواں بھی اڑا لیتے ہیں مگر وہ ہمارے اس مشغلے کو ہابی ماننے کو تیار نہیں تھے ان کا فرمانا تھا کہ منہ سے دھواں اڑانا ہماری اعصابی کمزوری ہے ہابی نہیں، اگر ہمیں دھواں اڑانے کو نہ ملے تو ہم پر جھلاہٹ کی کیفیت طاری ہو جائے گی اور ہم جھنجھلاہٹ کا شکار ہو جائیں گے جو صحت کے لیے بدفال ہے۔ ہابی کسی اعصابی کمزوری کو جنم نہیں دیتی بلکہ خوب سے خوب تر کے حصول کے لیے اکساتی اور انسان کو حریص سے حریص تر بناتی ہے۔ پھر فرمانے لگے اب ہم کو ہی دیکھو کبوتر بازی ہماری ہابی ہے۔ اچھے سے اچھا کبوتر حاصل کرنے کے لیے ہم کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ جہاں کسی کے اچھے کبوتر پر نظر پڑی ہمارے منہ میں پانی آیا اور پھر اسے حاصل کرنے کے لیے ہم سب کچھ کر گزرتے ہیں۔ یہاں تک کہ موقع ملتے پر اسے چرا بھی لیتے ہیں۔ "ھَل مِن مَزِید" ہمیشہ وردِ زبان رہتا ہے۔ ہماری بیگم کی ہابی مرغیاں پالنا ہے۔ ان کی سمجھداری اور سوجھ بوجھ کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ انھوں نے اپنی گرہ سے مرغی خریدنے پر ایک پیسہ خرچ نہیں کیا۔ اپنے میکے سے ایک مرغا جو ہماری دعوت کے لیے رکھا گیا تھا یہ کہہ کر لے آئی تھیں کہ ہم اپنے گھر پر ہی دعوت کھا لیں گے۔ یہ مرغا بڑا اسجیلا اور جوان تھا۔ جب سینہ تان کر شاہانہ چال سے گھر سے باہر نکلتا تو پاس پڑوس کی مرغیاں پروانہ وار اس کے گرد منڈلانے لگتیں۔ مرغا کسی قدر مغرور اور خود پسند تھا اپنے ان پرستاروں کے ساتھ لیا دیا سا رہتا اس کی ادائے بے نیازی سے مرغیاں اس قدر متاثر ہوئیں کہ اس کے ساتھ لگی ہوئی ہمارے گھر میں چلی آتی ہیں اور ہماری بیگم انھیں گھیر گھار کر ڈربے میں بند کر لیتی ہیں گویا اس مرغے کے ذریعے دوسروں کی مرغیوں پر ہاتھ کی صفائی دکھلانا ہماری بیگم کی ہابی ہے اس طرح لاتعداد مرغیاں جمع کر لی گئی ہیں اور بیگم کا مرغی خانہ باقاعدہ پولٹری فارم بن گیا ہے لیکن اب پڑوسیوں نے بھی صرف مرغے پال رکھے ہیں جو ہماری بیوی کی مرغیوں پر ڈورے ڈال کر اغوا کر لیے جاتے ہیں۔ بیگم اس نئی مصیبت سے بہت پریشان ہیں۔ کچھ دیر خاموش رہے پھر فرمایا کہ جب سے تم پنشن پر سبکدوش ہوئے ہو ہم دیکھ رہے ہیں کہ سست سست اور اداس اداس رہتے ہو اس لیے کہ تمھاری کوئی ہابی نہیں ہے۔ صبح صبح اخبار ضرور پڑھتے ہو مگر اردو کا جس میں

دس پندرہ منٹ سے زیادہ پڑھنے کا کچھ نہیں ہوتا اس کے بعد بیکاری تمہارا مقدر بن جاتی ہے اور بیکاری سے اکتاکر بلاوجہ بیوی سے الجھتے رہتے ہو یا بچوں پر چیختے چلاتے ہو وہ تمہاری چیخ پکار اس کان سے سنتے اور اس کان سے اڑا دیتے ہیں جس سے تم اور اداسی کا شکار ہو جاتے ہو۔ اس لیے چاق و چوبند اور صحت مند رہنے کے لیے کوئی ہابی ( ) اپنا لو۔

عزیز محترم کی بات کچھ جچتی ہوئی نظر آئی اور اس مسئلہ پر غور کرنا شروع کیا لیکن سوال یہ پیدا ہوا کہ اگر عزیز محترم کے مشورہ پر عمل کیا جائے تو کون سی ہابی (اردو ترجمہ علت) اپنے مزاج ... کے مطابق ہوگی اپنے عزیزوں، دوستوں، ملنے والوں اور شناساؤں کی ہابیوں پر نظر ڈالی۔ ہمارے ایک عزیز ہیں مشہور خان صاحب ان کی ہابی ہے قبرستانوں کی خاک چھان کر قبروں کے کتبوں کی عبارتیں جمع کرنا۔ اگر کسی نومولود قبر پر کتبہ نہیں ہوتا وہ سنگِ مزار پر اپنی طرف سے کوئی عبارت لکھ دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں مرحومین کے اعزا کئی مرتبہ ان کی پٹائی بھی کر چکے ہیں کہ انھوں نے جو عبارت لکھی تھی وہ مرحوم کے شایانِ شان نہیں تھی۔ پٹنے کٹنے کے بعد بھی وہ اس ہابی سے باز نہیں آتے ہابی جو ٹھہری۔ ابھی تک اپنی قبر کے سنگ مزار کے لیے عبارت تجویز نہیں کی ہے۔ موت سے بہت ڈرتے ہیں۔ ہمارے ایک کرم فرما ہیں عجائب عالم صاحب۔ ان کی ہابی ہے ہر سال دو سال میں دولہا بننا۔ شریف اس قدر ہیں کہ جب تک ایک بیوی سے چھٹکارا نہیں پا لیتے دوسری کے دولہا نہیں بنتے۔ شہر کی متعدد خواتین ان کے گزارہ سے پرورش پا رہی ہیں۔ کچھ نے تو دوسری شادیاں بھی کر لی ہیں مگر عجائب عالم صاحب نے ان کا گزارہ نہیں روکا ہے ان کا کہنا ہے کہ اگر انھوں نے گزارہ دینا بند کر دیا تو ان کی ساکھ گر جائے گی اور نئے سرے سے دولہا بننے میں دشواریاں پیدا ہوں گی۔ احباب میں وہ رحمت النسا کے نام سے مشہور ہو چکے ہیں۔ ایک اور کرم فرما ہیں نام تو کچھ اور ہے مگر خاں صاحب کے نام سے مشہور ہیں انتہائی دبلے پتلے اور منحنی ہیں خاں نما جسامت نام کو نہیں مگر ہیں خاں صاحب۔ ان کی ہابی فلم ایکٹریسوں کے فوٹو جمع کرنا ہے اگر نیم عریاں ہوں تو وہ ان کے لیے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ ہندوستانی اسکرین کی کوئی ایسی ایکٹریس نہیں ہے جس کے متعدد پوز ان کے کلکشن میں نہ ہوں خواہ اس کی یادیں بھی بھولی بسری کیوں نہ ہو گئی ہوں جب وہ ملاقات کرنے احباب کے گھر تشریف لے جاتے ہیں تو صاحب خانہ اس طرح چوکنا ہو جاتا ہے جیسے جواری پولیس کی آمد سے۔ اس لیے کہ کہیں وہ رسائل کی تصاویر پر ہاتھ صاف نہ کر دیں۔ خاں صاحب کا قول ہے کہ اپنی ہابی کی تکمیل کے لیے اخلاقیات کا پابند نہیں ہونا چاہیے ان کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اپنی ہابی پر گرہ سے ایک پیسہ خرچ نہیں کیا سب اللہ کی دین اور ہاتھ کی صفائی کا اثر ہے۔ غرض یہ کہ ہمارے عزیز و اقارب، دوست احباب کسی نہ کسی ہابی (علت) میں مبتلا ہیں۔ کوئی ڈاک کے ٹکٹ جمع کرتا ہے تو کوئی سکّے۔ کسی کی ہابی شہر میں تقسیم ہونے والے پوسٹر، ہینڈ بل اور پمفلٹ جمع کرنا ہے تو کسی کی ایسی ہی کوئی اور ہابی ـــــ اب جبکہ ہم نے اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا تو احساس کمتری کا احساس ہوا

کہ ہم نے کوئی ہابی کیوں نہ اپنائی کہ فخر سے سر اٹھا کر کہہ سکتے کہ یہ ہماری ہابی ہے۔ بہرحال اب یہ طے کرلیا کہ ہم کوئی نہ کوئی ہابی (علت) اپنا کر ہی دم لیں گے۔ لیکن ہم ایسی کوئی ہابی اپنانے کو تیار نہیں تھے جس میں جسمانی مشقت اٹھانا کرنا پڑے یا پیسہ خرچ ہو لیکن وہ جو کہا گیا ہے کہ ڈھونڈنے والے کو خدا بھی مل جاتا ہے ہمیں بھی گوہر مقصود ہاتھ آگیا اور وہ بھی عزیز محترم کی کرم فرمائی سے ہوا یوں کہ ایک روز عزیز محترم غریب خانہ پر تشریف لائے غصہ سے بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ آتے ہی گرجے "یہ چاندخاں انتہائی کمینہ اور بدذات ہے دنیا بھر کے ناجائز پیشوں سے وابستہ ہے۔ لڑکیاں انتہائی آوارہ ہیں دن رات محلے کے آوارہ اور لوفر لونڈے گھر میں گھسے رہتے ہیں اور بے غیرت چاند خاں کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی، چاندخاں عزیز محترم کا پڑوسی تھا۔ انتہائی صلح کل دیانت دار اور مذہبی آدمی مشہور تھا۔ عزیز محترم کی زبانی ایسے خیالات سن کر حیرت ہوئی۔ ہم نے دبی زبان میں کہا کہ اس کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ــــــ عزیز محترم بات کاٹ کر بولے میاں ہاتھی کے دانت کھانے اور دکھانے کے اور ہوتے ہیں۔ اور لوگ اس کے ظاہری لبادے کو دیکھتے ہیں۔ اس کے اندر کیا ہے یہ کسی کو نظر نہیں آتا۔ ارے میاں اب کیا بتائیں اس کی نانی کی خالہ نے ایک طوائف کے لونڈے سے شادی کرلی تھی بس اسی خون کا اثر ہے جو چاندخاں میں بول رہا ہے۔ ہم نے حیرانی سے عرض کیا کہ چاندخاں کی نانی کی خالہ اور چاندخاں کے خون کا کیا رشتہ ہے تو تنک کر بولے میاں ہمیں اور غصہ نہ دلاؤ بس جو کچھ ہم کہتے ہیں اسے مان لو بلاوجہ بحث کی ضرورت نہیں۔ داڑھی رکھ کر مولوی بننا چاہتا ہے۔ داڑھی دیکھی ہے بالکل بکرے کی طرح ہے اور نام چاندخاں۔ بھلا یہ کسی خاندانی آدمی کا نام ہو سکتا ہے۔ چاندخاں۔ لاحول ولا قوۃ۔ غرض یہ کہ عزیز محترم طرح طرح کی کمزوریاں چاندخاں کے کردار اور شخصیت کی بیان کرتے رہے۔ ہم جانتے تھے کہ عزیز محترم جو کچھ کمزوریاں بیان کر رہے ہیں ان میں سے زیادہ تر ان کے دماغ کی تخلیق ہیں اور اس کی لڑکیوں کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ سراسر بہتان تھا وہ بیچاریاں تو محض ثواب کی خاطر قرآن پڑھایا کرتی تھیں اور یہی چھوٹے چھوٹے بچے آیا جایا کرتے تھے جنھیں آوارہ اور لوفر قرار دے دیا تھا۔ ہم نے محسوس کیا کہ اس عیب جوئی سے عزیز محترم کے کسی جذبہ کی تسکین ہو رہی ہے۔ جانے کیوں ہمیں بھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ چاند خاں کے بارے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے سچ نہیں ہے لطف آرہا تھا۔ ممکن ہے کہ ہمارے بھی کسی جذبہ کی تسکین ہو رہی ہو جسے ہم سمجھ نہیں پارہے تھے۔

بہرحال عزیز محترم نے جو کچھ کہا وہ غصہ کے عالم میں تھا مگر ہمیں اس سے یہ فائدہ ہوا کہ کئی دن سے جس چیز کی تلاش میں سرگرداں تھے وہ ہاتھ لگ گئی۔ یعنی ہماری ہابی۔ جس میں نہ ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت تھی اور نہ پیسہ کا زیاں۔ نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے۔ بس احباب کی محفل جماؤ اور کسی کی غیبت شروع کر دو۔ فرصت کا وقت بھی اچھا گزرے گا اور عیب جوئی کی قوتیں بھی بیدار رہیں گی اور ذہن کا تخلیقی عمل تیز سے تیز تر ہوتا جائے گا۔ جب ہم نے غور کیا تو ہم پر انکشاف ہوا کہ غیبت کرنا بھی ایک

آرٹ ہے اگر غیبت سائنٹیفک طریقے پر کی جائے تو وقت گزاری کا مشغلہ تو بہر حال ہوگا ہی انا کی تسکین کا ذریعہ بھی ہوگا۔ اس سلسلے میں ہمیں بچپن کی سنی ہوئی کہانی یاد آئی جو ہماری نانی یا دادی نے ہمیں سنائی تھی۔ کہانی اس طرح تھی کہ سات بھائی جنگل میں سفر کر رہے تھے کہ دو ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کر دیا اور سارا اثاثہ لوٹ کر رفو چکر ہو گئے۔ ساتوں بھائی روتے پیٹتے پولیس اسٹیشن پہنچے اور رو رو کر اپنی مصیبت بیان کی۔ پولیس آفیسر نے پہلے تو انھیں حیرت سے دیکھا پھر سوال کیا جب ڈاکوؤں نے حملہ کیا تو تم نے کیا کیا اس پر انھوں نے جواب دیا "سات بھائی اکیلے دو کیلے اور دو ڈاکوؤں کا جھنڈ۔ ہم کیا کر سکتے تھے مگر ہم نے بھی اتنی گالیاں دیں کہ وہ اب تک مر گئے ہوں گے یا مر جائیں گے"۔ بس یہی حالت غیبت کرنے والے کی ہوتی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ جس کی غیبت کر رہا ہے اسے ادھ مرا تو کر دے گا اور اسی سے خوش ہو لیتا ہے۔

غیبت کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک غیظ و غضب کے عالم میں کی جاتی ہے جیسی عزیز محترم نے جاند خاں کی کی تھی۔ اسے انتقامی غیبت کہا جا سکتا ہے مگر یہ کوئی معیاری غیبت نہیں ہوتی کیونکہ اس میں انتقامی جذبہ شامل ہوتا ہے۔ معیاری غیبت وہ ہوتی ہے جو احباب اپنی بے تکلف محفل میں بیٹھ کر اپنے ہی کسی ساتھی کی کرتے ہیں جو ہماری ہابی ہے۔ اس میں سچائی کم اور زیب داستاں کے لیے بہت کچھ ہوتا ہے۔ اس میں ہر شخص حسب توفیق حصہ لے کر اس کے معیار کو بلند سے بلند تر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے تفریحی غیبت کہا جا سکتا ہے۔ ایک تیسری قسم کی غیبت اور ہوتی ہے جسے معصومانہ غیبت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ معصومانہ غیبت وہ ہوتی ہے جو بیوی اپنے شوہر کی کرتی ہے۔ خوشگوار زندگی کے ۳۰ ـ ۳۵ سال گزارنے کے بعد بیوی اپنی محبت کا اظہار شوہر کی غیبت کر کے کرتی ہیں اور شوہر کی عادتیں اس کی عدم موجودگی میں اس طرح بیان کرتی ہیں جیسے ان کا مذاق اڑا رہی ہوں اور جب دوسری عورتیں انھیں سن کر لطف لیتی ہیں تو بیوی کو ایک بڑی طمانیت کا احساس ہوتا ہے اور اس کے جذبہ محبت کی تسکین ہوتی ہے ـــــــ غیبت کرنا ایک آفاقی عمل ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کی، ایک گروہ دوسرے گروہ کی ایک پارٹی دوسری پارٹی کی، ایک لیڈر دوسرے لیڈر کی، ایک ادیب، ایک شاعر دوسرے ادیب اور شاعر کی برابر غیبت کرتا رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نے اپنی غیبت سے دوسرے کو ادھ مرا کر دیا ہے اور اس خیال ہی سے اس کا نفس موٹا ہو جاتا ہے۔

خیر یہ چند سطور تو بطور جملہ معترضہ کے تھیں۔ آمدم برسر مطلب۔ ہم نے غیبت کو اپنی ہابی کے طور پر اپنا لیا۔ اب ہم فخر سے سینہ تان کر اور سر اونچا کر کے کہتے ہیں کہ ہماری ہابی غیبت کرنا ہے اور جب عزیز محترم کو ہماری ہابی کا علم ہوا تو فرمایا۔ ہابی بری نہیں ہے عین شرفا کے مزاج کے مطابق ہے پھر ہمیں چند نصیحتیں بھی فرمائیں کہ غیروں کی کبھی غیبت نہ کرنا بلکہ ہمیشہ اپنوں کی کرنا کہ گھٹنا ہمیشہ پیٹ کی طرف جھکتا ہے

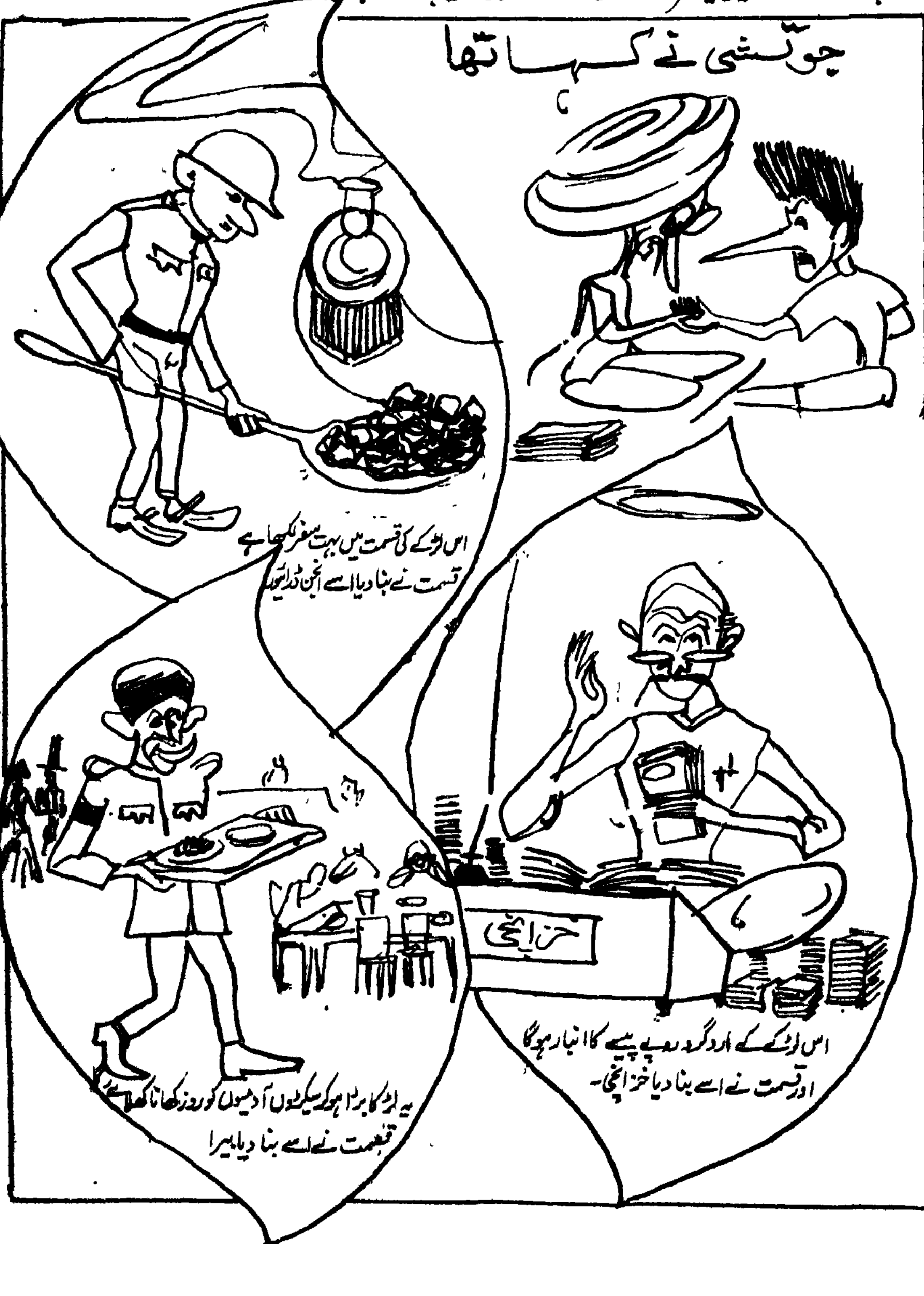
یاریوڑیاں پہلے اپنوں میں بانٹی جاتی ہیں اور خیرات بھی پہلے اعزا کا حصہ ہوتی ہے۔ غیبت کرتے وقت ہمیشہ خیال رکھنا کہ جس کی غیبت کر رہے ہو اس کی خوبیاں اس طرح پیش کی جائیں کہ وہ دھندلا جائیں اور ان کی صورت مسخ ہو جائے اس کے لیے بڑی ریاضت اور فنکاری کی ضرورت ہوگی۔ جسمانی عیوب کی پردہ پوشی کرنا کہ ان کا بیان کرنا غیبت نہیں ہے بلکہ جسمانی عیوب کو ہمیشہ کردار سے وابستہ کر دینا یعنی کانے کو کانا ہرگز نہ کہنا بلکہ یوں کہنا کہ اگر وہ کانا نہ ہوتا تو بڑا شریف آدمی ہوتا۔ اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا کہ غیبت کرتے وقت جس کی غیبت کر رہے ہیں اسے سب سے پہلے کم ظرف ثابت کرنے کی کوشش کرنا۔ لوگ دوسروں کی کم ظرفی میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں خواہ وہ خود کتنے ہی بڑے کم ظرف کیوں نہ ہوں۔ اپنی طرف سے کبھی کسی کی غیبت شروع نہ کرنا بلکہ ایسا ماحول پیدا کرنا کہ دوسرے اس کی غیبت شروع کریں تم صرف اس میں ٹکڑے جوڑتے رہنا اس سے تمہاری نیک نیتی مجروح نہیں ہوگی۔ اگر کوئی کسی کی غیبت کر رہا ہے تو اس کی مخالفت نہ کرنا بلکہ اس کا اور حوصلہ بڑھانا وغیرہ وغیرہ۔ غرض ہم عزیز محترم کی ہدایات سے لیس ہو کر اور خدا کا نام لے کر میدان غیبت میں کود پڑے۔

اول تو ہم نے خود غیبت کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر کافی غور کر لیا تھا اور پھر عزیز محترم کی ہدایات سے مسلح تھے اس لیے ہمیں یہ زعم تھا کہ ہم غیبت کے معاملے میں اپنا لوہا منوا کر احباب میں ایک امتیازی جگہ حاصل کر لیں گے لیکن جلد ہی ہمیں معلوم ہو گیا کہ اپنے احباب کے مقابلہ میں ابھی ہم طفل مکتب ہیں اور وہ سب عرصے سے غیبت کے میدان میں ایسے ایسے کمالات دکھلاتے رہے ہیں کہ ہم ان کی تہ تو کیا بالائی سطح کو بھی نہ چھو سکے ہیں۔ یہ نظیر بھائی ہیں بہت کم گو سنتے زیادہ اور بولتے کم ہیں کبھی کبھی کوئی جملہ بول دیتے ہیں ان کا یہ غیبتی جملہ بظاہر بڑا معصوم نظر آتا ہے لیکن جس کے لیے یہ جملہ کہا جائے وہ اس کی کردار کشی کا ضامن بن جاتا ہے اور کمال یہ ہے کہ لوگ انھیں دنیا میں جبرئیل کا نمائندہ تصور کرتے ہیں۔ یہ جمیل صاحب ہیں دوستوں کے گھروں کی ٹوہ لینا ان کی ہابی ہے اور پھر غیبت کرنا مشغلہ۔ آج ہی کی بات ہے دوستوں کی محفل سجی ہوئی تھی کہ تشریف لائے اور آتے ہی فرمایا "ظفر کے گھر سے آرہا ہوں۔ کھانے کی میز پر بے شمار جھوٹے برتن پڑے تھے جن پر مکھیاں بھنک رہی تھیں یہ پوچھنے پر کہ یہ فرعونی دسترخوان کس کے لیے سجایا گیا ہے تو کہنے لگا پرسوں کچھ بے تکلف دوست آگئے تھے ایک چھوٹی موٹی دعوت کا انتظام کر دیا تھا۔ یہ کم ظرف میز پر تب تک برتنوں کو پڑا رہنے دے گا جب تک اس کے سب ملنے والے اس سے واقف نہ ہو جائیں کہ اس نے حاتم کی قبر پر لات مار کر دعوت کی تھی۔ اس پر خلیق بولے ایک بات اور سننے میں آئی ہے کہ برتن دھونے اور گھر کی صفائی کرنے جو عورت آتی تھی اس پر ڈورے ڈال رہا تھا کہ بیوی کو اس کی بھنک پڑ گئی۔ بیوی نے عورت کو تو نو دو گیارہ کر دیا اور اسے برتن دھونے پر لگا دیا اس پر دونوں میں ان بن ہو گئی ہے بس برتن پڑے بھنکتے رہتے ہیں نہ یہ دھوتا ہے نہ وہ۔" اس پر جمیل صاحب نے

کہا آپ کی خبر بھی سچ ہو سکتی ہے بلاوجہ کی غیبت ہوتی ہے ورنہ ظفر ہے بڑا گھٹیا آدمی۔ مگر دعوت کی بات — کہ غفار بات کاٹ کر بولے :" جمیل صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں ظفر نے دعوت کا کہا اور آپ نے یقین کر لیا۔ ظفر اور کسی کی دعوت کرے ارے صاحب اللہ اللہ کرو۔ آپ کو معلوم ہے کہ ابھی دو چار دن پہلے کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ رشید نے قسمیں کھا کھا کر مجھے بتلایا تھا۔ رشید کو تو ہم سب جانتے ہیں کہ احباب کے گھروں پر ناشتہ یا کھانے کے وقت ہی جاتا ہے حسب عادت رات کے کھانے کے وقت ظفر کے یہاں پہنچ گیا۔ ظفر نے اتفاقاً پوچھ لیا کھانا کھاؤ گے رشید تو ان میں سے ہے کہ اللہ دے اور بندہ لے فوراً تیار ہو گیا۔ ظفر نے بلند آواز سے کہا بیگم دو روٹیاں زیادہ ڈال دینا رشید بھائی یہیں کھانا کھائیں گے۔ بیگم اندر سے دھاڑیں میں نے گھر کے لیے ہی کھانا نہیں پکایا ہے کسی رشید بھائی وشید بھائی کے لیے کہاں سے دو روٹیاں ڈالوں گی سر میں درد ہے۔ ظفر نے شرمندگی سے معذرت کر کے رشید کو بڑا مایوس کیا۔ اس پر جمیل صاحب بولے بھئی بات کچھ بھی ہو ہم نے میز پر جھوٹے برتنوں کا انبار ضرور دیکھا تھا۔ اس پر عزیز میاں بولے۔ اس کے پڑوس میں وقار صاحب رہتے ہیں ان کے گھر میں جگہ کی کمی ہے جب وہ کسی کی دعوت کرتے ہیں تو اس کی میز عاریتاً لے لیتے ہیں ظاہر ہے کہ معاوضہ میں ظفر اور اس کی بیوی کو بھی مدعو کرتے ہیں۔ انھوں نے دعوت کی ہو گی۔ دعوت کے بعد ظفر کی بیوی برتن دھو کر وقار صاحب کے گھر دے آتی ہے۔ اس پر ہم کچھ کہنے ہی والے تھے کہ ہمیں عزیز محترم کی ہدایت یاد آ گئی کہ اگر کسی کی غیبت ہو رہی ہو تو اس کی مخالفت ہرگز نہ کرنا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ ظفر نے آج ہی چند احباب کو لنچ پر بلایا تھا جس میں ہم بھی شامل تھے۔ ہم نے بھی ٹکڑا لگایا:" اس کی بیوی کو کھانا پکانے کی بالکل تمیز نہیں انتہائی بدمزہ کھانا پکاتی ہے۔" اس پر غیور میاں بولے "آپ بھی کمال کرتے ہو۔ اس کے یہاں کھانا پکتا ہی کہاں ہے جو اس کی بیوی کو تجربہ ہو۔ صبح شام غریبا کے ڈھابے سے چار روٹیاں اور آدھا پلیٹ دال لے آتا ہے۔ میاں بیوی اسی کو زہر مار کر لیتے ہیں۔ غریبا کو آج تک یہ حسرت ہے کہ ظفر میاں اس کے یہاں کا گوشت کھا کر دیکھیں مگر بیچارا غریبا یہ حسرت لیے ہی اس دنیا سے کوچ کر جائے گا۔ تف ہے اس کنجوسی پر۔" پھر خلیق کی طرف مخاطب ہو کر گویا ہوئے کہ آپ نے یہ کیا فرمایا کہ ظفر کسی عورت پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ ارے صاحب جو چار سال میں اپنی ذاتی بیوی سے ایک چیونٹیا کا بچہ پیدا نہ کر سکا وہ کسی اور عورت پر کیا ڈورے ڈالے گا۔ اب کہتا پھرتا ہے کہ پہلے بچے کا ابارشن ہو گیا تھا سسٹم میں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے علاج چل رہا ہے۔ لعنت ہے ایسی جوانی پر۔ ابھی یہ غیبت ہو ہی رہی تھی کہ ظفر آ گیا۔ عزیز میاں اسے دیکھ کر بولے ارے ظفر آؤ۔ کہاں رہتے ہو کب سے تمہارا انتظار ہو رہا تھا وغیرہ وغیرہ ——

ہماری محفل کی غیبت کا یہ ایک ادنیٰ نمونہ ہے پھر کبھی کچھ اور نمونے پیش کریں گے۔

بہر حال جب سے ہم نے غیبت کو بطور ہابی کے اپنایا ہے شہر میں ہم خود غیبت کا موضوع بن گئے ہیں ہر محفل میں ہماری غیبت کے دفتر کھلے ہوئے ہیں سب خدا کی دین ہے ورنہ ہم ایسے خوش قسمت کہاں کہ غیبت کا موضوع بنیں یہ شرف تو خوش قسمتوں کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ ●●



مفلس قارونی
(اکولہ)

سیاست کی کھیتی

کرم اتنا فرمائیے بندہ پرور — ستم سے نہ باز آئیے بندہ پرور
یہ ہیں ووٹ لے جائیے بندہ پرور — مگر نوٹ سرکائیے بندہ پرور
رعایا ہیں ہم آپ ہی کی غذا ہیں — ہمیں شوق سے کھائیے بندہ پرور
گراوٹ پہ اپنی رذالت پہ اپنی — ذرا بھی نہ شرمائیے بندہ پرور
کوئی شجرِ ممنوعہ تو ہم نہیں ہیں — ہمارے قریب آئیے بندہ پرور
تو طے ہے کہ بھارت کو بل بانٹ کھائیں — تو پھر ہاتھ ادھر لائیے بندہ پرور
جو ملہار گانے میں ہو کچھ قباحت — تو پھر بھیرویں گائیے بندہ پرور
جو اپنے ہیں اپنے ہی ہوتے ہیں آخر — پرایوں کو اپنائیے بندہ پرور
فسادات کی آگ بجھنے نہ پائے — اسے اور بھڑکائیے بندہ پرور
سیاست کی کھیتی ہے 'اک' اس میں بو کر — ہزاروں یہاں پائیے بندہ پرور
ہمیں دے کے وعدوں کے رنگیں کھلونے — ذرا اور بہلائیے بندہ پرور

اگر آپ کی بھوک اب بھی ہو باقی
تو مفلس کو کھا جائیے بندہ پرور

نہ یہ سیدھا نہ وہ سیدھا

پلیڈر ہو کر ہو لیڈر نہ یہ سیدھا نہ وہ سیدھا — جسے دیکھو وہ گھن چکر نہ یہ سیدھا نہ وہ سیدھا
کہیں تو سر ہے پیروں پر نہ یہ سیدھا نہ وہ سیدھا — کہیں پیروں تلے ہے سر نہ یہ سیدھا نہ وہ سیدھا
در و دیوار، چھپر جس کے آثارِ قدیمہ ہیں — وہ گھر ہے ہمارا گھر نہ یہ سیدھا نہ وہ سیدھا
خدا کے فضل سے بیٹے ہمارے چار ہیں لیکن — نہ یہ بہتر نہ وہ بہتر نہ یہ سیدھا نہ وہ سیدھا
نہ تو حلیئے سے لگتا ہے نہ فیشن ہی سے ظاہر ہے — پسر ہے یا کہ ہے دختر نہ یہ سیدھا نہ وہ سیدھا
یہاں بھی لیٹ جاتے ہو وہاں بھی لیٹ جاتے ہو — کبھی ہے گھر کبھی دفتر نہ یہ سیدھا نہ وہ سیدھا
کہیں یہ اُس پہ حاوی ہے کہیں وہ اس پہ حاوی ہے — کبھی بیوی، کبھی شوہر نہ یہ سیدھا نہ وہ سیدھا

تمہارے بھائی، بیگم! بس خدارا منہ نہ کھلواؤ
کوئی غنڈہ، کوئی لوفر، نہ یہ سیدھا نہ وہ سیدھا

پاگل پُران

ایک روز ایک نامہ نگار کو جو ہم سے تفصیلی انٹرویو لینے کے خواہش مند تھے ہم نے گھر کا پتہ بتایا' ناگپور روڈ پر میل کا جو پہلا پتھر ہے اُس سے دائیں طرف کا راستہ اختیار کیجیے ۔ ناک کی سیدھ میں چلتے جائیے۔ جب زیر تعمیر مکانات نظر آنے لگیں تو بائیں طرف کے مکانات پر نظر بلکہ کان رکھیے جس مکان سے کسی کے چیخنے چلانے' گانے اور ہنسنے کی مخلوط آوازیں سنائی دیں تو رُک جائیں۔ بس اُس مکان کے برابر والا مکان ہمارا ہے۔"

نامہ نگار گھبرا کر بولے کیا اس مکان میں کوئی شخص پاگل ہے؟ میں پاگلوں اور کتوں سے بے حد ڈرتا ہوں۔"

" حالانکہ ڈرنا صرف انسانوں سے چاہیے" ہم نے سنجیدگی سے کہا" پاگل اور کتے چھیڑے جانے ہی پر کاٹتے ہیں جبکہ انسان بلا وجہ بھی دوسروں پر بھونکتا اور کاٹ کھانے دوڑتا ہے ..... خیر ..... خیر .... آپ اطمینان رکھیں۔ ہمارے گھر کے آس پاس کوئی پاگل وجہ نہیں۔"

پھر یہ چیخنا چلانا' ہنسنا گانا کیا ہے؟" وہ حیرانی سے بولے۔

" ہماری پڑوسن بڑی باکمال خاتون ہیں ۔ ماشاءاللہ بلند آواز کی مالک ہیں اور خاوند بچوں اور ملازمہ پر گرجنے برسنے کی شائق ہیں۔ تمام دوپہر فل اسپیڈ پر ریڈیو چلا کر زنانہ' مردانہ دونوں آوازوں میں سُر ملا کر گایا کرتی ہیں ۔ خوش مزاج بھی بلا کی واقع ہوئی ہیں۔ ایسے بلند بانگ قہقہے لگاتی ہیں کہ بس پوچھیے نہیں۔ اُن کی گرج چمک اور چہک پر آپ ہی کی طرح اور لوگ بھی انہیں پاگل سمجھ لیتے ہیں۔"

بات چھوٹی سی ہے مگر غور کیا جائے تو کچھ ایسی چھوٹی بھی نہیں۔ اکثر ہم چند اوصاف یا خصوصیات کو بعض شخصیات کے ساتھ منسلک کر دیتے ہیں۔ ہوش مندوں کے ساتھ خاموشی اور پاگلوں کے ساتھ چیخ و پکار کو لازم و ملزوم کر دینا کہاں تک مناسب ہے؟ ہم نے اکثر مہذب انسانوں کو ذرا ذرا سی بات پر چیختے چلاتے دیکھا ہے تو پاگلوں کو نہایت شریفانہ اور سرگوشیانہ طریقے سے خود کلامی میں مصروف پایا ہے۔

پاگل پن ہوشمندی کی انتہا ہے۔ اپنا دفاع کرنے میں ناکامی' احتجاج نہ کر پانے کی بے بسی' ظلم و ستم کی انتہا خاموشی کو فروغ دیتی ہے مشاہدے میں بھی یہی آیا ہے کہ ایسے نازک وقت ان ہوشمندوں کو نہ چھیڑا جانا ہی دانشمندی کا تقاضہ ہے۔

ہم پر بذاتِ خود دو تین حادثے ایسے گذر چکے ہیں جن کی وجہ سے ہمارے اس خیال کو خاطر خواہ تقویت ملی ہے۔ اب ہم اپنے

محتاط ہو گئے ہیں کہ کبھی کسی سنجیدہ اور خاموش سے دکھائی دینے والے شخص سے بات کرنے میں پہل نہیں کرتے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے ہم اپنی آپا کے گھر گئے۔ وہ کسی پارٹی میں جانے کے لیے کمربستہ ملیں۔ ہمیں اصرار کر کے اپنے ساتھ لے گئیں۔ جن صاحب کے یہاں پارٹی تھی اُن کا ڈرائنگ روم نہایت کشادہ تھا۔ کمرہ کیا تھا اچھا خاصا ہال تھا لمبا چوڑا۔ کسی شو روم کی مانند آراستہ و پیراستہ دیواروں پر بڑی بڑی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ کٹی پارٹی میں آئی خواتین گروہ بنا کر مختلف کھیلوں میں مشغول ہو گئیں۔ ہم پینٹنگز کا جائزہ لینے لگے۔ ہال کے دوسرے سرے پر پہنچے تھے کہ اندر سے ایک خاتون برآمد ہوئیں انہوں نے نہایت بھونڈے طریقے سے میک اپ تھوپا ہوا تھا۔

وہ گھر کے اندر سے آئی تھیں۔ یقیناً ہی میزبانوں میں سے تھیں۔ ہمیں حیرت ہوئی۔ جو صاحبہ ابھی تک میزبانی کے فرائض انجام دے رہی تھیں وہ تو کسی بیوٹی پارلر سے میک اپ کروا کے آئی لگتی تھیں۔ لباس بھی ایسا انتخاب کیا تھا جیسے میزبانی نہ کرنی ہو کسی فیشن پریڈ میں حصّہ لینا ہو۔

ہم نے اپنی عادت کے مطابق مسکراتے ہوئے اُن پر توجّہ کی ...... ہلّو ... میں بیگم فلاں فلاں ...... بیگم ہارون کی گیسٹ ہوں۔"

انہوں نے ہمیں گھور کر دیکھا اور بولیں "موٹی!"

حیرت سے ہماری آنکھیں اُبل پڑیں۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر پھر اُن پر نظر ڈالی۔ وہ صد فیصد سنجیدہ نظر آ رہی تھیں۔ ہم نے رُخ دوسری طرف کر لیا۔ وہ گھوم کر ہمارے سامنے آ گئیں اور بولیں "موٹی، مٹی ..... اتنی موٹی کیوں ہو؟"

ہم سٹ پٹا گئے۔ تیزی سے چل کر آپا کے پاس پہنچ گئے۔ وہ خاتون وہاں بھی آ پہنچیں۔ ہماری طرف اشارہ کر کے بولیں۔
"موٹی ..... موٹی ...... موٹی ...."

چند لمحے تو کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ اُدھر ہمارا یہ حال تھا جیسے سرِ بازار جوتے پڑے ہوں۔ میزبان خاتون دوڑی دوڑی آئیں، "آپا اندر چلیے۔ فوراً اندر چلیے۔"

وہ ان کا ہاتھ جھٹک کر بولیں "چلتی ہوں۔ پہلے یہ بتاؤ" یہ اتنی موٹی کیوں ہے؟" "آپا! میں نے آپ سے کیا کہا تھا!" میزبان خاتون جھنجلا کر بولیں۔

"یاد ہے، سب یاد ہے۔ اچھے کپڑے پہنے تو ہیں۔ میک اپ بھی کیا ہے۔ سر جھاڑ، مُنہ پہاڑ تو نہیں آئی۔"

میزبان خاتون انہیں زبردستی اندر کھینچ لے گئیں مگر جاتے جاتے بھی دس مرتبہ وہ ہمیں موٹی کہہ گئیں۔

اب بتائیے کیا ہمارا یہ خیال غلط ہے کہ پاگل انتہا درجے کے مصلحت پسند ہوتے ہیں ورنہ کیا وجہ تھی کہ میزبان خاتون کی نند محترمہ سترہ ۱۷ خواتین میں سے ہمیں ہی ٹارگٹ بنائیں۔ وہاں پانچ ...... نہیں چار ..... چار ..... نہیں تو کم از کم دو ۲ خواتین یقیناً ہی ہم سے زیادہ صحت مند تھیں مگر وہ کٹی پارٹی کی باقاعدہ ممبر تھیں اور ہم بے چارے گیسٹ۔ جو آج تھے کل نہ ہوتے۔

ایک اور واقعہ سنئے ہم کسی شادی میں بارات کے ساتھ گئے۔ رات گیارہ بجے سے مہندی اور چوتھی کی رسمیں جو شروع ہوئیں

تو شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہوتی چلی گئیں۔ ہم اُکتا گئے۔ نیند بھگانے اور ٹھنڈی ہوا کا لطف لینے کے لیے گھومتے گھومتے مکان کے پچھواڑے جا نکلے۔ ایک چھوٹے سے کمرے کی کھڑکی میں ایک خاتون کا چہرہ نظر آیا وہ پکار کر بولیں "اے بچی! ذرا دروازہ تو کھولنا"۔

ہم نے سوچا کسی نے بے خیالی میں دروازہ مقفل کر دیا ہوگا۔ خود ہمارے گھر میں بچے اکثر کھیل کھیل میں باہر سے دروازے کی کنڈی لگا جاتے ہیں ...... ہم دروازے کی طرف بڑھے۔ قریب ہی ایک کیل سے چابی لٹکتی نظر آئی۔ نہایت سعادت مندی سے ہم نے دروازہ کھول دیا۔

دوسرے ہی لمحے ہم پر قیامت گزر گئی۔ خاتون نے لپک کر ہمارے بال پکڑ لیے اور دانت کچکچا کر دنا دن گھونسے برسانے لگیں۔ ہم نے بدحواس ہو کر چیخنا شروع کیا مگر مجال ہے جو اُن کے حلق سے ذرا بھی آواز نکلی ہو۔ نہایت اطمینان سے ہمارا بھرتہ بنائے جا رہی تھیں۔ قریب آدھا گھنٹہ حلق پھاڑنے کے بعد ڈھول کی آوازوں میں آواز سُنی گئی اور چند عورتوں اور مردوں نے آکر ہماری گلو خلاصی کی۔ بعد میں اُن لوگوں نے بتایا کہ اکثر کوئی نہ کوئی اسی طرح اُن کے ہاتھ لگ جاتا ہے اور وہ اگلا پچھلا سارا حساب بے باق کر لیتی ہیں۔

اب وہ لوگ ہم سے بار بار پوچھتے کہ آپ نے دروازہ کیوں کھولا؟ تو ہم خاموش رہ جاتے۔ کیا یہ کہہ دیتے کہ وہ ہمیں پاگل جیسی نہیں لگیں۔ اگر وہ پاگل نظر آتیں تو کیا ہم انہیں آزاد کرانے کی حماقت کرتے! خاصی معقولیت اور شریفانہ بلکہ خوشامدانہ انداز میں "اے بچی ذرا دروازہ کھولنا" کہہ کر انہوں نے دروازہ کھولنے کی درخواست کی تھی ہم سے۔

بچپن میں ہم کھیلوں سے کافی دور بھاگتے تھے۔ خصوصاً دوڑ میں ہم نے کبھی حصہ نہیں لیا۔ دال چولہے پر چڑھا کر بھول گئے ہوں اور جلنے کی بو آنے پر ہنڈیا اُتارنے سرپٹ دوڑے ہوں مگر ریس میں دوڑنے کا خیال ہمیں خواب میں بھی نہیں آیا۔ البتہ ایک موقع ضرور ایسا آیا کہ ایک پاگل کے ساتھ دوڑے۔ انعام تو خیر ملنا ہی نہیں تھا مگر اس روز اُس سے جیت نہ جاتے تو ہمارا سر تھا اور اس کا پتھر ...... نہ جانے کیا حال ہوتا سرِ عزیز کا۔

اُن دنوں ایک پاگل عورت کے بڑے چرچے تھے۔ آلو بونڈا اُس کی چڑ تھی۔ بچے چڑاتے تو پتھر لے کر مارنے دوڑتی۔ ایک روز چھوٹے بھائی کے ساتھ اسکول سے لوٹتے ہوئے ہم نے اس سے کہا "بابو! تم نے آلو بونڈا کو دیکھا ہے! اُسے آلو بونڈا کیوں کہتے ہیں؟ کیا وہ آلو بونڈے کی شکل کی ہے! مجھے اُس سے ملوا دینا"۔

بابو بوکھلا گیا۔ قبل اس کے کہ وہ ہمیں آلو بونڈہ کی تکرار سے روکتا پیچھے سے آتی آلو بونڈا نے ہمیں دوڑا لیا۔ ہم آگے وہ پیچھے... ہم سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے اور بخدا اسی روز پہلی مرتبہ ہم پر یہ راز کھلا کہ ہم دوڑ بھی سکتے ہیں۔

یہ آپ ہمیں اس طرح کیوں گھور رہے ہیں! نہیں دیکھئے ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم نے جو یہ پاگل بیان شروع کیا ہے تو بس یوں ہی تفریح کی خاطر ...... کیا کہا! ... ہم اتنے سالوں سے کہاں غائب تھے! ..... کیا جواب دیں اس کا کوئی موقع بھی تو ہو ..... ہمیں ایک اور پاگل کا قصہ یاد آ رہا ہے۔ آپ سننے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ نہ سنیں ..... ہم خود اپنے کو سناتے ہیں .....

ایک دفعہ کیا ہوا .... ●●

غزل

عالم تاجپوری
تاجپور ڈیہا (غازی پور)

غیر اُن سے فیض یاب ہوئے ہائے باپ رے
جل بھُن کے ہم کباب ہوئے ہائے باپ رے

تہذیب ایک مرگئی، اک زندہ ہوگئی
یُوں جلوے بے نقاب ہوئے ہائے باپ رے

فرمائشوں سے اُن کی بِکے بال بال ہم
مقروض بے حساب ہوئے ہائے باپ رے

ہم آفتاب سے ہوئے اک ذرّہ اور وہ
ذرّے ملے آفتاب ہوئے ہائے باپ رے

وہ دَور آگیا کہ مضامین سیکس بھی
اب داخلِ نصاب ہوئے ہائے باپ رے

ہر شہر ہر دیار میں ٹی۔وی کا ہے جنوں
دیوانے شیخ و شاب ہوئے ہائے باپ رے

اُن کی نگاہ لطف و کرم ہے رقیب پر
ہم موردِ عتاب ہوئے ہائے باپ رے

ہے کاسٹلی شراب تو عالم نہ پوچھئے
جامِ شراب خواب ہوئے ہائے باپ رے

قطعہ

دانا تھا ایک جھٹکے میں نادان ہوگیا
بگڑی سیاست ایسی کہ بے جان ہوگیا
داڑھی کو اب حقیر نظر سے نہ دیکھئے
داڑھی کا ہیرو دیش کا پردھان ہوگیا

غزل

چکّر نظام آبادی

نام اک بھونڈی سی صورت کا قمر رکھا گیا
پھر اُسے بیوی بناکر میرے گھر رکھا گیا

دیس میں ظالم کھُلے پھرتے ہیں آزادی کے ساتھ
اور مظلوموں کو لیکن باندھ کر رکھا گیا

لیڈروں میں کار بنگلے بٹ گئے ہیں دوستو
اور سارے عاشقوں کو دَر بدر رکھا گیا

جھاڑو برتن کے لیے رکھی گئی اِک خادمہ
نامہ پہنچانے کی خاطر نامہ بَر رکھا گیا

قوم کے قائد اسی جانب اُٹھاتے ہیں قدم
جس جگہ مرغِ مُسلّم بھُون کر رکھا گیا

قتل و خوں کی ابتدا تو اُن کے بھاشن سے ہوئی
اور پھر الزام سارا میرے سر رکھا گیا

روز پڑھتے ہیں گھروں میں لوگ فِلمی میگزین
اور قرآں کو اُٹھا کر طاق پر رکھا گیا

عاشقی کی ابتدا تو ان کی کھڑکی سے ہوئی
اور بدنامی کا چکّر میرے سَر رکھا گیا

مُشتاق احمد یوسفی (کراچی)

[تیسری قسط]

حویلی

ٹارزن کی واپسی

دو سال تک دکان میں تالا پڑا رہا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جیل سے چھوٹنے کے بعد چُپ چپاتے کہیں اور چلے جائیں گے۔ قبلہ جیل سے چھوٹے۔ ذرا جو بدلے ہوں۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی میں جوڑ نہیں تھے۔ جاپانی زبان میں کہاوت ہے کہ بندر درخت سے زمین پر گر پڑے، پھر بھی بندر ہی رہتا ہے۔ سو وہ بھی ٹارزن کی طرح ! AAUUAAUUUU U چنگھاڑتے جیل سے نکلے۔ سیدھے اپنے آبائی قبرستان گئے۔ والد کی قبر کی پائینتی کی خاک سر پر ڈالی۔ فاتحہ پڑھی اور کچھ سوچ کر مسکرا دیئے۔ دوسرے دن دکان کھولی۔ کیبن کے باہر ایک بلّی گاڑ کر اس پر ایک لکڑی کی ٹانگ بڑھئی سے بنوا کر لٹکا دی۔ صبح و شام اس کو رسّی سے کھینچ کر اس طرح چڑھاتے اور اُتارتے تھے جس طرح اس زمانے میں چھاؤنیوں میں یونین جیک چڑھایا اتارا جاتا تھا۔ جن دہندوں نے دو سال سے رقم دبا رکھی تھی انھیں یاد دہانی کے دھمکی آمیز خطوط لکھے۔ اور اپنے دستخطوں کے بعد بریکٹ میں (سزا یافتہ) لکھا۔ جیل جانے سے پہلے خطوط میں خود کو بڑے فخر سے "تنگ اسلاف" لکھا کرتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اس سے اتفاق کرے۔ اتفاق تو درکنار، مارے ڈر کے اختلاف بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب اپنے نام کے ساتھ تنگِ اسلاف کے بجائے "سزا یافتہ" اس طرح لکھنے لگے جیسے لوگ ڈگریاں یا خطاب لکھتے ہیں۔ قانون اور جیل سے ان کی جھجک نکل چکی تھی۔

تو قبلہ جیسے گئے تھے ویسے ہی جیل کاٹ کر واپس آ گئے۔ طنطنے اور آواز کے کڑکے میں ذرا فرق نہ آیا۔ اس اثناء میں اگر زمانہ بدل گیا تو اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ اب ان کی رائے میں قطعیت کے علاوہ تقطیعیت بھی پیدا ہو گئی۔ ان کا فرمایا ہوا مستند تو پہلے ہی تھا، اب مختتم بھی ہو گیا۔ سیاہ مخمل کی رامپوری ٹوپی اور زیادہ ترچھی ہو گئی۔ یعنی اتنی جھکا کر ٹیڑھی اوڑھنے لگے کہ دائیں آنکھ ٹھیک سے نہیں کھول سکتے تھے۔ اب کبھی بیوی گھبرا کے "اب کیا ہوئے گا" ؟ کہتیں تو وہ "دیکھتے ہیں" کے بجائے "دیکھ لیں گے" اور "دیکھتی جاؤ" کہنے لگے۔ پہلی کے دن نزدیک آئے تو داڑھی کے علاوہ کے بال بھی گچھے دار مونچھوں میں شامل کر لیے جواب اتنی گھنی ہو گئی تھیں کہ ایک ہاتھ سے پکڑ کر انھیں اُٹھاتے، تب کہیں دوسرے ہاتھ سے منہ میں لقمہ رکھ پاتے تھے۔ جیل ان کا کچھ نہ بگاڑ نہ سکی۔ فرماتے تھے "ہمیں تیسری بیرک میں ایک منشی فاضل پاس جعلیا ہے۔ فصاحت ریاضاں۔ [illegible]

میں تین سال کی کاٹ رہا ہے۔ بامشقت۔ پہلے شعلہ، اب حزیں تخلص کرتا ہے۔ بلا کا بسیار گو۔ چکی پیستے میں اپنی ہی تازہ غزل گاتا رہتا ہے۔ موٹا پیتا ہے اور پیٹتا ہے۔ اب یہ کوئی شاعری تو ہے نہیں۔ تس پر خود کو غالب سے کم نہیں سمجھتا۔ حالاں کہ مماثلت صرف اتنی ہے کہ دونوں نے جیل کی ہوا کھائی۔ خود کو روہیلہ بتاتا ہے۔ ہوگا۔ لگتا نہیں۔ قیدیوں سے بھی منہ چھپائے پھرتا ہے۔ اپنے بیٹے کو ہدایت کر رکھی ہے کہ میرے بارے میں کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ والد صاحب عارضی طور پر نقل مکانی کر گئے ہیں۔ جیل کو کبھی جیل نہیں کہتا۔ زنداں کہتا ہے۔ اور خود کو قیدی کے بجائے اسیر! ارے صاحب! غنیمت ہے جیلر کو عزیزِ مصر نہیں کہتا۔ اسے تو چکی کو آسیا کہنے میں بھی عار نہ ہوتی، مگر میں تو جانوں پاٹ لکی عربی معلوم نہیں۔ شاید وہ سمجھتا ہے کہ استفراغ اور اسہال کہنے سے قے دست تو بند نہیں ہوتے، بدبو جاتی رہتی ہے۔ ٹھیک ہی سمجھتا ہے۔ کس واسطے کہ اس کے باپ کا انتقال ہیضے میں ہوا تھا۔
ارے صاحب! میں یہاں کسی کی جیب کاٹ کے تھوڑا ہی آیا ہوں۔ شیر کو پنجرے میں قید کر دو، تب بھی شیر ہی رہتا ہے۔ گیدڑ کو کچھار میں آزاد چھوڑ دو، اور زیادہ گیدڑ ہو جائے گا۔ اب ہم ایسے بھی گئے گزرے نہیں کہ جیل کا گھٹنا (گھٹنوں تک نیکر) پہنتے ہی طبیعت میں سوز و گداز پیدا ہو جائے۔" بلکہ ہمیں تو قبلہ کی باتوں سے ایسا لگتا تھا کہ پھٹا ہوا کپڑا پہننے اور جیل میں قیام فرمانے کو سنتِ یوسفی سمجھتے ہیں۔ ان کے مزاج میں جو ٹیڑھ تھی وہ کچھ اور بڑھ گئی۔

"لبِ معشوق" اب کے دکان چلی اور ایسی چلی کہ اوروں ہی کو نہیں خود انھیں بھی حیرت ہوئی۔ دکان کے باہر اسی شکارگاہ یعنی کیبن میں اسی ٹھسّے سے گاؤ تکیے کی ٹیک لگا کر بیٹھتے۔ مگر زاویہ تیسر گیا تھا۔ پیروں کا رُخ اب فرش کی بہ نسبت آسمان کی طرف زیادہ تھا۔ جیل میں سکونت پذیر ہونے سے پہلے قبلہ گاہک کو ہاتھ کے ملتجیانہ اشارے سے بلایا کرتے تھے۔ اب صرف انگشتِ شہادت کے خفیف سے اشارے سے طلب کرنے لگے۔ انگلی کو اس طرح حرکت دیتے جیسے ڈالڈا ڈول پتنگ کو ٹھمکی دے کر اس کا قبلہ درست کر رہے ہوں۔ حقّے کی نَے میں اب ایک فٹ کا اضافہ کر لیا۔ حقّہ اب پیتے کم، گُڑگُڑاتے زیادہ تھے۔ بدبودار دھوئیں کا چھلّا اس طرح چھوڑتے کہ گاہک کی ناک میں نتھ کی طرح لٹک جاتا۔ اکثر فرماتے "واجد علی شاہ' جانِ عالم پیا تھے، جو خوبصورت نام رکھنے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے، حقّے کا کیسا پیارا نام رکھا تھا... لبِ معشوق! جو شخص کبھی حقّے کے پاس سے بھی گزرا ہے، وہ بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ جانِ عالم پیا کا پالا کیسے لبوں سے پڑا ہوگا۔ چنانچہ معزولی کے بعد وہ فقط حقّہ اپنے ہمراہ مٹیا برج لے گئے۔ پری خانے کے تمام معشوق لکھنؤ میں ہی چھوڑ گئے۔ اس لیے کہ معشوق کو نیچہ پکڑ کے گُڑگُڑایا نہیں جا سکتا۔

"بَلّی پہ لٹکا دوں گا" منشی دیا نرائن نگم کے رسالے "زمانہ" کے کاتب سے عرفی کا مشہور شعر احاطے کی دیوار پر ڈامر سے لکھوا دیا:

عرفی تو میندیش ز غوغائے رقیباں
آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدا را *

---

* مطلب یہ کہ عُرفی تو رقیبوں کے شور و غوغا کرنے سے اندیشے میں مبتلا نہ ہو۔ کتّوں کے بھونکنے سے گدا کا رزق کم نہیں ہوتا۔

ہیں اس شعر سے نسلی عصبیت اور جانبداری کی بو آتی ہے۔ کہتے اگر شعر کہہ سکتے تو دوسرا مصرع کچھ یوں ہوتا:

آوازِ گدا کم نہ کند رزقِ سگاں را *

کچھ دن بعد ان کا لنگڑا دشمن یعنی پہلوان سیٹھ دکان بڑھا کر کہیں اور چلا گیا۔ قبلہ بات بے بات ہر ایک کو دھمکی دینے لگے کہ سالے کو بلّی پہ لٹکا دوں گا۔ ہیبت کا یہ عالم کہ اشارہ تو بہت بعد کی بات ہے، قبلہ جس گاہک کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی دیکھ لیں، اسے کوئی دوسرا نہیں پاتا تھا۔ اگر وہ از خود دوسری دکان میں چلا بھی جائے تو دکاندار اسے لکڑی نہیں دکھاتا تھا۔ ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ سڑک پر یوں ہی کوئی راہ گیر منہ اٹھائے جا رہا تھا کہ قبلہ نے اسے انگلی سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ جس دکان کے سامنے سے وہ گزر رہا تھا، اس کا مالک اور منیم اسے گھسیٹتے ہوئے قبلہ کی دکان میں اندر دھکیل گئے۔ اس نے قبلہ سے روہانسا ہو کر کہا کہ میں تو مول گنج پتنگوں کے پیچ دیکھنے جا رہا تھا۔

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ شجر تو نہیں

پھر یکایک ان کا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ وہ کٹّر مسلم لیگی تھے۔ اِس کا اثر ان کی بزنس پر پڑا۔ پھر پاکستان بن گیا۔ انھوں نے اپنے نعرے کو حقیقت بنتے دیکھا۔ عزیز و اقارب، جن سے وہ تمام عمر لڑتے جھگڑتے اور نفرت کرتے رہے، ایک ایک کر کے پاکستان چلے گئے تو ایک جھٹکے کے ساتھ یہ انکشاف ہوا کہ وہ ان نفرتوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور جب اکلوتی بیٹی اور داماد بھی اپنی دکان بیچ کھوچ کے کراچی سدھارے تو انھوں نے بھی اپنے خیمے کی طنابیں کاٹ ڈالیں۔ دکان اونے پونے ایک دلال کے ہاتھ بیچی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ "بے نامی" سودا ہے۔ دلال کی آڑ میں دکان دراصل اسی لنگڑے پہلوان سیٹھ نے خرید کر ان کی ناک کاٹی ہے۔ خفیف سا شبہ تو قبلہ کو بھی ہوا تھا، مگر "اپنی بلا سے بُوم بسے یا ہُما رہے" والی صورتِ حال تھی۔ ایک ہی جھٹکے میں پڑ ِصیبوں کے رشتے ناتے ٹوٹ گئے اور قبلہ نے پرکھوں کی جنم بھوم چھوڑ کر اُن کے خوابوں کی سرزمین کا رخ کیا۔

ساری عمر شیش محل میں اپنی مور پنکھ انا کا ناچ دیکھتے دیکھتے، قبلہ ہجرت کر کے کراچی آئے تو نہ صرف زمین اجنبی لگی، بلکہ اپنے پیروں پر نظر پڑی تو وہ بھی کسی اور کے لگے۔ کھولنے کو تولی مارکٹ میں ہرچند رائے روڈ پر لشتم پشتم دکان کھول لی، مگر بات نہیں بنی۔ گجراتی میں مثل ہے کہ پُرانے مٹکے پر نیا منہ نہیں چڑھایا جا سکتا۔ آنے کو تو وہ ایک نئی سرسبز زمین میں آ گئے، مگر ان کی بوڑھی آنکھیں پلکھن کو ڈھونڈتی رہیں۔ پلکھن تو درکنار، انھیں تو کراچی میں نیم تک نظر نہ آیا۔ لوگ جسے نیم بتلاتے تھے وہ دراصل بکاین تھی جس کی نبولی کو لکھنؤ میں حکیم صاحب عالم پیچش اور بواسیر کے نسخوں میں لکھا کرتے تھے۔

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ شجر تو نہیں

کہاں کانپور کے دیہاتی گاہک، کہاں کراچی کے نخریلے ساگوان خریدنے والے۔ درحقیقت انھیں جس بات نے سب سے زیادہ تکلیف ہوئی وہ یہ تھی کہ یہاں اپنے قرب و جوار میں، یعنی اپنے سایۂ زحمت میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آیا جسے وہ بے وجہ و بے خطر گالی دے سکیں۔ ایک دن کہنے لگے "یہاں تو ڈھی

---

* گدا کی صدا سے کتّوں کا رزق کم نہیں ہوتا۔

آری کا کام زبان سے لیتا ہے۔ چار پانچ دن ہوئے۔ ایک دریدہ دہن بڑھئی آیا۔ اقبال مسیح نام تھا۔ میں نے کہا ابے! پرے ہٹ کر کھڑا ہو۔ کہنے لگا، حضرت عیسیٰ بھی تو ترکھان تھے۔ میں نے کہا، کیا کفر بکتا ہے؟ ابھی تجھے سولی پر لٹکا دوں گا۔ کہنے لگا، اوہ لوک دی ایہی کہندے سان! (وہ لوگ بھی حضرت عیسیٰ سے یہی کہتے تھے)۔!

میر تقی میر کراچی میں

پہلی نظر میں انھوں نے کراچی کو اور کراچی نے ان کو مسترد کر دیا۔ اٹھتے بیٹھتے کراچی پر کیڑے ڈالتے۔ شکایت کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا:

"حضت! یہ مچھر ہیں یا مگر مچھ؟ کراچی کا مچھر ڈی ڈی ٹی سے بھی نہیں مرتا۔ صرف قوالوں کی تالیوں سے مرتا ہے۔ یا غلطی سے کسی شاعر کو کاٹ لے تو باؤلا ہو کر بے اولاد مرتا ہے۔ نمرود مردود کی موت ناک میں مچھر گھسنے سے واقع ہوئی تھی۔ کراچی کے مچھروں کا شجرۂ نسب کئی نمرودوں کے واسطے سے اسی مچھر سے جا ملتا ہے۔ اور ذرا زبان تو ملاحظہ فرمائیے۔ میں نے پہلی مرتبہ ایک صاحب کو پٹنے والے کو پکارتے سنا تو میں سمجھا اپنے کتے کو بلا رہے ہیں۔ معلوم ہوا یہاں اپنے چپراسی کو پٹنے والا کہتے ہیں۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ پھڈا اور لفڑا ہوتا رہتا ہے۔ لڑکو تو کہتے ہیں، اردو میں اس صورتحال کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے۔ بھائی میرے! اردو میں یہ صورتحال بھی تو نہیں ہے بمبئی والے لفظ اور صورتِ حال دونوں اپنے ساتھ لائے ہیں۔ میر تقی میر اونٹ گاڑی میں منہ باندھے بیٹھے رہے۔ اپنے ہم سفر سے اس لیے بات نہ کی کہ "زبانِ غیر سے اپنی زباں بگڑتی ہے"۔ میر صاحب کراچی میں ہوتے تو بخدا ساری عمر منہ پر ڈھاٹا باندھے پھرتے، یہاں تک کہ ڈاکوؤں کا سا بھیس بنائے پھرنے پر کسی ڈکیتی میں دھر لیے جاتے۔ اماں! ٹونک والوں کو امرود کو صفری کہتے تو ہم نے بھی سنا تھا یہاں امرود کو جام کہتے ہیں۔ اور اس پر نمک مرچ کے بجائے 'صاحب' لگا دیں تو مراد نواب صاحب لسبیلہ ہوتے ہیں۔ اپنی طرف وکٹوریہ کا مطلب ملکہ وکٹوریہ ہوتا تھا۔ یہاں کسی ترکیب سے دس بارہ جنے ایک گھوڑے پر سواری کا ٹھٹھ لیں تو اسے وکٹوریہ کہتے ہیں۔ میں دو دن لاہور رکا تھا۔ وہاں دیکھا کہ جس بازار میں کوٹھوں سے منہ کالا کیا جاتا ہے، وہ ہیرا منڈی کہلاتی ہے! اب یہاں نیا فیشن چل پڑا ہے۔ گانے والے کو گلوکار اور لکھنے والے کو قلم کار کہنے لگے ہیں۔ میاں! ہمارے وقتوں میں تو صرف نیکوکار اور بدکار ہوا کرتے تھے۔ قلم اور گلے سے یہ کام نہیں لیا جاتا تھا۔

"میں نے لالو کھیت، بہار کالونی، چاکی واڑہ اور گولیمار کا چپہ چپہ دیکھا ہے۔ چودہ پندرہ لاکھ آدمی (اخبار والے اب آدمی کو آدمی کہتے سے شرماتے ہیں۔ افراد اور نفوس کہتے ہیں) ضرور رہتے ہوں گے لیکن کہیں کتابوں اور عطریات کی دکان نہ دیکھی۔ کاغذ تک کے پھول نظر نہ آئے۔ کانپور میں ہم جیسے شرفا کے گھروں میں کہیں نہ کہیں موتیا کی بیل ضرور چڑھی ہوتی تھی۔ حضور والا! یہاں موتیا صرف آنکھوں میں اترتا ہے! حد ہو گئی! کراچی میں نکھٹو، کروڑپتی سیٹھ ٹکڑی اس طرح تلواتا ہے گویا کمخواب کا پارچہ خرید رہا ہے۔ بکری دن میں دو وقت بکتی ہے اور برادہ خریدنے والے پچاس! میں نے برسوں اپلوں پر پکایا ہوا کھانا بھی کھایا ہے۔ لیکن برادے کی انگیٹھی پر جو کھانا پکے گا وہ صرف دوزخی مُردوں کے چالیسویں کے لیے مناسب ہے۔

"بھر پائے ایسی جرنس سے! مانا کہ روپیہ بہت کچھ ہوتا ہے، مگر سبھی کچھ تو نہیں۔ خدا کو حاجت روا کرنے والا، قاضی الحاجات کہا گیا ہے تسلیم۔ مگر جب یہ خود سب سے بڑی حاجت بن جائے تو وہ صرف موت سے

رفع ہوگی۔ میں نے تو زندگی میں ایسی کافی کھری لکڑی نہیں بیچی۔ نہ فروختنی، نہ سوختنی۔ بڑھئی کا یہ مجال کہ چھاتی پر چڑھ کے کمیشن مانگے۔ نہ دو تو مال کو گندے انڈے کی طرح قیامت تک سیتے رہو۔ ہائے! نہ ہوا کانپور۔ ابھولے سے سالے کی ناک اتار کر ہتھیلی پر رکھ دیتا کہ جا! اپنی جورو کو دین مہر میں دے دینا! واللہ! یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ سنتا ہوں یہاں کے بازارِ حسن نیپیئر روڈ اور جاپانی روڈ پہ شب زادیاں اپنے اپنے دریچوں میں لال بتیاں جلتے ہی خضاب چھاتیوں سے خوانچے لگا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ فلموں میں بھی اشرف المعلقات ہی کی نمائش ہوتی ہے۔ یہ تو وہی مثال ہوئی کہ اوچھے کے گھر تیتر، باہر باندھوں کہ بھیتر۔ جمہوریہ اسلامیہ کی سرکار بے سرو کار کچھ نہیں کہتی۔ لیکن کسی طوائف کو شادی بیاہ میں مجرے کے لیے بلانا ہو تو پہلے اس کی اطلاع تھانہ متعلقہ کو دینی پڑتی ہے! رنڈی کو پرمٹ راشن کارڈ پر ملتے ہم نے نہیں دیکھا۔ نقدِ عیش عند الطلب نہ ملا تو کس کام کا۔ درشنی منڈیوں میں درشنی ہنڈیوں کا کیا کام"۔

مرزا عبدالودود بیگ اس صورتِ حال کی کچھ اور ہی تاویل کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ طوائف کو تھانے سے NOC (نو آبجکشن سرٹیفکیٹ) اس لیے لینا پڑتا ہے کہ پولیس پوری طرح اطمینان کرلے کہ وہ اپنے دھندے پر ہی جارہی ہے۔ وعظ سننے یا سیاست میں حصّہ لینے نہیں جارہی۔

ایک دن قبلہ فرمانے لگے "ابھی کچھ دن ہوئے۔ کراچی کی ایک نامی گرامی طوائف کا گانا سننے کا اتفاق ہوا۔ اماں! اس کا تلفظ تو چال چلن سے بھی زیادہ خراب نکلا۔ ہائے! ایک زمانہ تھا کہ شرفا اپنے بچوں کو ادب آداب سیکھنے کے لیے چوک کی طوائفوں کے کوٹھوں پر بھیجتے تھے"!

اس باب میں بھی مرزا سوءِ ظن سے کام لیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ طوائفوں کے کوٹھوں پر تو اس لیے بھیجتے تھے کہ بزرگوں کی صحبت اور گھر کے ماحول سے بچے رہیں!

دوڑتا ہوا درخت

کراچی شہر انھیں کسی طور اور کسی طرف سے اچھا نہیں لگا۔ جھنجھلا کر بار بار کہتے "اماں! یہ شہر ہے یا جہنم؟" مرزا کسی دانے کے قول میں تصرفِ بے جا کرکے فرماتے ہیں کہ قبلہ اس دارالمحن سے کوچ فرمانے کے بعد اگر خدانخواستہ وہیں پہنچ گئے جس سے کراچی کو تشبیہ دیا کرتے تھے تو چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد یہی ارشاد ہوگا کہ ہم نے تو سوچا تھا کراچی چھوٹا سا جہنم ہے۔ جہنم تو بڑا سا کراچی نکلا!

ایک دفعہ ان کے ایک بے تکلف دوست نے ان سے کہا کہ "تمھیں معاشرے میں خرابیاں ہی خرابیاں نظر آتی ہیں تو بیٹھے بیٹھے ان پر کڑھنے کے بجائے ان کی اصلاح کی فکر کرو"!

ارشاد فرمایا "سنو! میں نے ایک زمانے میں پی ڈبلیو ڈی کے کام بھی کئے ہیں، مگر دوزخ کی ایئر کنڈیشنگ کا ٹھیکہ نہیں لے سکتا"۔

ان کے کاروباری حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے۔ بزنس نہ ہونے کے برابر تھی۔ ان کی دکان کی دیوار پر ایک تازہ وصلی آویزاں دیکھ کر ہمیں بڑا دکھ ہوا:

نہ پوچھ حال مرا، چوبِ خشکِ صحرا ہوں
لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا

ہم نے ان کا دل بڑھانے کے لیے کہا، آپ کو چوبِ خشک کون کہہ سکتا ہے؟ آپ کی جواں ہمتی اور مستعدی پر ہمیں تو رشک آتا ہے۔ خلافِ معمول مسکرائے۔ جب سے ڈینچرز ٹوٹے، منہ پہ رومال رکھ کر ہنسنے لگے تھے۔ کہنے لگے۔ "ہاں میاں! آپ جوان آدمی ہیں۔ اپنا تو یہ احوال ہوا کہ

"منفعل" ہو گئے قویٰ غالب!

اب عناصر میں "ابتذال" کہاں!

پھر منہ سے رومال ہٹاتے ہوئے کہا "برخوردار! میں وہ درخت ہوں جو ٹرین میں جاتے ہوئے مسافر کو دوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔"

میرے ہی من کا مجھ پر دھاوا

یوں وہ حتیٰ الامکان اپنے غصّے کو کم نہیں ہونے دیتے تھے۔ کہتے تھے میں ایسی جگہ ایک منٹ بھی نہیں رہنا چاہتا جہاں آدمی کسی پر غصّہ ہی نہ ہو سکے۔ اور جب انھیں ایسی ہی جگہ رہنا پڑا تو وہ زندگی میں پہلی بار اپنے آپ سے روٹھے۔ اب وہ آپ ہی آپ کڑھتے، اندر ہی اندر کھولتے، جلتے، سلگتے رہتے:

میرے ہی من کا مجھ پر دھاوا

میں ہی اگنی، میں ہی ایندھن

انہی کا قول ہے کہ یاد رکھو، غصّہ جتنا کم ہوگا، اس کی جگہ اداسی لیتی چلی جائے گی۔ اور یہ بڑی بزدلی کی بات ہے۔ بزدلی کے ایسے ہی اداس لمحوں میں اب انھیں اپنا آبائی گاؤں جہاں بچپن گزرا تھا، بے تحاشا یاد آنے لگتا۔

قبلہ کا ریڈیو اونچا سنتا تھا

دریا کے بہاؤ کے خلاف تیرنے میں تو خیر کوئی نقصان نہیں۔ ہمارا مطلب ہے، دریا کا نقصان نہیں۔ لیکن قبلہ تو سیکڑوں فٹ کی بلندی سے گرتے ہوئے آبشار نیاگرا پر تیر کر چڑھنا چاہتے تھے۔ یا یوں کہیے کہ تمام عمر نیچے اترنے والے ایس کے لیٹر سے اوپر چڑھنے کی کوشش کرتے رہے اور ایس کے لیٹر بنانے والے کو گالیاں دیتے رہے۔ ایک دن کہنے لگے "بشارت میاں! یہ تمہارا کراچی بھی عجب مردم ناشناس شہر ہے۔ نا خریداری کی تمیز۔ نہ خوردی کے آداب۔ نہ کسی کی بزرگی کا لحاظ لحاظ۔ میں جس زمانہ میں بشارت میاں کے ساتھ بہار کالونی میں رہتا تھا، ایک بیٹری سے چلنے والا ریڈیو خرید لیا تھا۔ اُس زمانہ میں ریڈیو میں کار کی بیٹری لگانی پڑتی تھی۔ بہار کالونی میں بجلی نہیں تھی۔ اس کا رکھنا اور چلانا ایک دردِ سر تھا۔ بشارت میاں روزانہ بیٹری اپنے کارخانے لے جاتے اور چارج ہونے کے لیے آرا مشین میں لگا دیتے۔ سات آٹھ گھنٹے میں اتنی چارج ہو جاتی تھی کہ بس ایک آدھ گھنٹے بی بی سی سن لیتا تھا۔ اس کے بعد ریڈیو سے آرا مشین کی آوازیں آنے لگتیں اور میں اُٹھ کر چلا آتا۔ گھر کے پچھواڑے ایک پچیس فٹ اونچی نہایت قیمتی، بے گانٹھ بلی گاڑ کر ایریل لگا رکھا تھا۔ اس کے باوجود وہ ریڈیو اونچا سنتا تھا۔ آئے دن پتنگ اُڑانے والے لونڈے میرے ایریل سے پیچ لڑاتے۔ مطلب یہ کہ اس میں پتنگ اُلجھا کر زور آزمائی کرتے۔ ڈور ٹوٹ جاتی، ایریل خراب ہو جاتا۔ ارے صاحب، ایریل کیا تھا، پتنگوں کا فضائی قبرستان تھا۔ اس پر یہ کٹی پتنگیں چوبیس گھنٹے اس طرح پھڑپھڑاتی رہتیں جیسے سڑک کے کنارے کسی توتیدہ پیر کے مزار پہ جھنڈیاں۔ پچیس فٹ کی اونچائی پر چڑھ کر ایریل دوبارہ لگانا، نہ لوٹے کیسا عذاب تھا۔ بس یوں سمجھئے سولی پہ اسلام کے

بی بی سی سنتا تھا۔ بہرحال جب بزنس روڈ کے فلیٹ میں منتقل ہونے لگا تو سوچا، وہاں تو بجلی ہے۔ چلو ریڈیو بیچتے چلیں۔ بشارت میاں بھی عاجز آگئے تھے۔ کہتے تھے۔ اس سے تو پتنگوں کی پھڑپھڑاہٹ براڈکاسٹ ہوتی رہتی ہے۔ ایک دُور کے پڑوسی سے ۲۵۰ روپے میں سودا پکّا ہو گیا۔ علی الصبح وہ نقد رقم لے آیا اور میں نے ریڈیو اس کے حوالے کر دیا۔ رات کو گیارہ بجے پھاٹک بند کرنے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ شخص اور اس کے بیل جیسی گردن والے دو بیٹے کُدال پھاوڑا لیے مزے سے ایریل کی بلّی اکھاڑ رہے ہیں۔ میں نے ڈپٹ کر پوچھا، یہ کیا ہو رہا ہے؟ سینہ زوری دیکھیے! کہتے ہیں، بڑے میاں! بلّی اکھاڑ رہے ہیں۔ ہماری ہے۔

"ڈھائی سو روپے میں ریڈیو بیچا ہے۔ بلّی سے کیا تعلق؟"

تعلق نہیں تو ہمارے ساتھ چلو اور ذرا بلّی کے بغیر بجا کے دکھا دو۔ یہ تو اس کی ACCESSORY ہے۔"

"نہ ہوا کانپور۔ سالے کی زبان گُدّی سے کھینچ لیتا۔ اور ان حرامی پلّوں کی بیل جیسی گردن ایک ہی وار میں بھُٹّا سی اُڑا دیتا۔ میں نے تو زندگی میں ایسا بد معاملہ، بے ایمان آدمی نہیں دیکھا۔ اس اثنا میں وہ نابکار بلّی اکھاڑ کے زمین پہ لٹال چکا تھا۔ ایک دفعہ جی میں تو آئی کہ اندر جا کر ۱۲ بور لے آؤں اور اسے بھی بلّی کے برابر لمبا لٹال دوں۔ پھر خیال آیا کہ بندوق کا لائسنس تو ختم ہو چکا ہے۔ اور کمینے کے منہ کیا لگنا۔ اس کی بے قصور بیوی رانڈ ہو جائے گی۔ وہ زیادہ قانون چھانٹنے لگا۔ تو میں نے کہا، جا، جا! تو کیا سمجھتا ہے؟ بلّی کی حقیقت کیا ہے۔ یہ دیکھ، یہ چھوڑ کے آئے ہیں۔"

قبلہ حویلی کی تصویر دکھاتے ہی رہ گئے اور وہ تینوں بلّی اٹھا کر لے گئے۔

معذور بیوی اور گشتی چلم

ان کی زندگی کا ایک پہلو ایسا تھا جس کا کسی نے ان کو اشارۃً بھی ذکر کرتے نہیں سنا ہم اس کی طرف ابتدائی حصے میں اشارہ کر چکے ہیں۔ ان کی شادی بڑے چاؤ چونچلے سے ہوئی تھی۔ بیوی بہت خوبصورت، نیک طینت اور سلیقہ شعار خاتون تھیں۔ شادی کے چند سال بعد ایک ایسا مرض لاحق ہوا کہ پہنچوں تک دونوں ہاتھوں سے معذور ہو گئیں۔ قریبی اعزہ بھی ملنے سے گریز کرنے لگے۔ روزمرہ کی ملاقاتیں، شادی غمی میں شرکت، سبھی سلسلے رفتہ رفتہ منقطع ہو گئے۔ گھر کا سارا کام نوکر اور مامائیں تو نہیں کر سکتیں۔ قبلہ نے جس محبت اور دل سوزی سے تمام عمر بے عذر خدمت اور دیکھ ریکھ کی، اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کی چوٹی بے گندھی اور دوپٹہ بے چنا ہو۔ یا جمعہ کو کاسنی رنگ کا نہ ہو۔ سال گزرتے چلے گئے وقت نے سر پہ کاسنی دوپٹے کے نیچے روئی کے گالے جما دیے، مگر ان کی توجہ اور پیار میں ذرا جو فرق آیا ہو۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ایثار و رفاقت کا یہ پیکر وہی مغلوب الغضب آدمی ہے جو گھر کے باہر ایک چلتی ہوئی تلوار ہے۔ زندگی بھر کا ساتھ ہو تو صبر اور سبھاؤ کی آزمائش کے ہزار مرحلے آتے ہیں، مگر انھوں نے اس معذور بی بی سے کبھی اونچی آواز میں بھی بات نہیں کی۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ ان کی جھلاہٹ اور غیظ غضب کی ابتداء اسی سانحۂ معذوری سے ہوئی۔ وہ بی بی تو مصلّے پر ایسی بیٹھیں کہ دنیا ہی میں جنت مل گئی۔ قبلہ کو نماز پڑھتے کسی نے نہیں دیکھا۔ لیکن زندگی بھر جیسی سچی محبت اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر جیسی بے عذر اور خاموش خدمت انھوں نے چالیس برس تک کی وہی ان کی عبادت و ریاضت، وہی ان کا ورد و وظیفہ اور وہی ان کی دعائے نیم شبی تھی۔ وہ بڑا بخشنہار ہے۔ شاید یہی ان کا

وسیلۂ بخشائش بن جائے۔

ایک دور ایسا بھی آیا کہ بیوی سے ان کی پریشانی نہ دیکھی گئی۔ خود کہا، کسی رانڈ بیوہ سے شادی کرلو۔ بولے ہاں! بھاگوان! کریں گے۔ کہیں دو گز زمین کا ایک ٹکڑا ہے جو نہ جانے کب سے ہماری برات کی راہ دیکھ رہا ہے۔ وہیں چار کاندھوں پر ڈولا اترے گا۔ بیوی! مٹی سدا سہاگن ہے۔ سو جائیں گے اک روز زمیں اوڑھ کے ہم بھی۔ بیوی کی آنکھ میں آنسو دیکھے تو بات کا رُخ پھیر دیا۔ وہ اپنی ساری ’ابیجری‘ لکڑی، حقے اور تمباکو سے کشید کرتے تھے۔ بولے، بیوی! یہ رانڈ بیوہ کی قید تم نے کیا سوچ کے لگائی؟ مانا کہ شیخ سعدی کہہ گئے ہیں، زن بیوہ مکن اگرچہ حور است۔ مگر تم نے شاید وہ پوربی مثل نہیں سنی: پہلے پیوے بھکوا۔ پھر پیوے نکوا۔ پیچھے پیوے چلم چاٹ۔ یعنی جو شخص پہلے حقہ پیتا ہے وہ بدھو ہے کہ دراصل وہ تو چلم سلگانے اور تاؤ پر لانے میں ہی جٹا رہتا ہے۔ تمباکو کا اصل مزہ تو دوسرے شخص کے حصے میں آتا ہے۔ اور جو آخر میں پیتا ہے وہ جلے ہوئے تمباکو سے خالی بھک بھک کرتا ہے۔

جدھر جائیں دہکتے جائیں

کراچی میں دکان تو پھر بھی تھوڑی بہت چلی مگر قبلہ بالکل نہیں چلے۔ زمانے کے تغیر اور گردش پر کس کا زور چلا ہے جو ان کا چلتا۔ حوادث کو روکا نہیں جا سکتا۔ ہاں، تہذیب حواس سے حوادث کا زور توڑا جا سکتا ہے۔ شخصیت میں پیچ پڑ جائیں تو دوسروں کے علاوہ خود کو بھی تکلیف دیتے ہیں۔ لیکن جب وہ نکلنے لگیں تو اور زیادہ اذیت ہوتی ہے۔ کراچی ہجرت کرنے کے بعد اکثر فرماتے کہ ڈیڑھ سال جیل میں رہ کر جو تبدیلی مجھ میں نہ آئی، وہ یہاں ایک ہفتے میں آگئی۔ یہاں تو بزنس کرنا ایسا ہے جیسے سنگھاڑے کے تالاب میں تیرنا۔ کانپور ہی کے چھٹے ہوئے چھاکٹے یہاں شیر بنے دندناتے پھرتے ہیں۔ اور اچھے اچھے شرفا ہیں کہ گیدڑ کی طرح دُم کٹوا کے بھٹ میں جا بیٹھے۔ ایسا بجوگ پڑا کہ

خود بہ خود ”بل“ میں ہے ہر شخص سمایا جاتا

جو دانا ہیں وہ اپنی دُمیں چھپائے بلوں میں گھسے بیٹھے ہیں۔ باہر نکلنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اس پر مرزا نے ہمارے کان میں کہا:

انیسؔ ”دُم“ کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ

ایک دوست نے اپنی آبرو جوکھم میں ڈال کر قبلہ سے کہا کہ گزرا ہوا زمانہ لوٹ کر نہیں آسکتا۔ حالات بدل گئے ہیں۔ آپ بھی خود کو بدلیے۔ مسکرائے۔ فرمایا، خربوزہ خود کو گول کرلے تب بھی تربوز نہیں بن سکتا۔

آخری گالی

کاروبار مندا بالکل ٹھنڈا۔ طبیعت زنگ رنگ۔ بے دلی کے عالم میں دن گزر رہے تھے۔ دکانداری اب ان کی مالی نہیں، نفسیاتی ضرورت تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دکان بند کردی تو گھر میں پڑے کیا کریں گے۔ پھر ایک دن یہ ہوا کہ ان کا نیا پٹھان ملازم زرین گل خان کئی گھنٹے دیر سے آیا۔ ہر چند غصے کو پینے کی کوشش کرتے لیکن پرانی عادت کہیں جاتی ہے۔ چند ماہ قبل انھوں نے ایک ساٹھ سالہ منشی آدھی تنخواہ پر رکھا تھا، جو گیروے رنگ کا ڈھیلا ڈھالا جبہ پہنے، ننگے سر زمین پر آلتی پالتی مارے حساب کتاب کرتا تھا۔ کرسی یا کسی بھی اونچی چیز پر بیٹھنا اس کے مسلک میں منع تھا۔ وارثی سلسلے کے کسی بزرگ سے بیعت تھا۔ فرض شناس، ایماندار۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ، زود رنج، کام میں چوپٹ۔ قبلہ نے طیش میں آکر ایکدن

اسے حرامخور کہہ دیا۔ سفید داڑھی کا لحاظ بھی نہ کیا۔ اس نے رسان سے کہا "بجا! حضور کے ہاں جو شے واز ملتی ہے وہی تو نفیر کھائے گا۔ سلام علیکم۔" یہ جا وہ جا۔ دوسرے دن سے منشی جی نے نوکری پر آنا اور قبلہ نے حرامخور کہنا چھوڑ دیا۔ لیکن حرام خور کے علاوہ اور بھی تو دل دکھانے والے بہتیرے لفظ ہیں۔ زرین گل خان کو سخت سست کہتے کہتے ان کے منہ سے روانی اور سرگرانی میں وہی گالی نکل گئی جو اچھے دنوں میں ان کا تکیہ کلام ہوا کرتی تھی۔ گالی کی بھیانک گونج درۂ آدم خیل کے پہاڑوں تک ٹھنٹھناتی پہنچی جہاں زرین گل کی بیوہ ماں رہتی تھی۔ وہ چھ سال کا تھا جب ماں نے بیوگی کی چادر اوڑھی تھی۔ بارہ سال کا ہوا تو اس نے وعدہ کیا تھا کہ ماں! میں اور بڑا ہو جاؤں تو کراچی میں نوکری کر کے تجھے پہلی تنخواہ سے بغیر پیوند کی چادر بھیجوں گا۔ اسے آج تک کسی نے یہ گالی نہیں دی تھی۔ جوان خون، غصیلا مزاج۔ پٹھان کی غیرت اور پختو کا سوال تھا۔ زرین گل خان نے ان کی ترچھی ٹوپی اتار کر پھینک دی اور چاقو تان کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا: "بڈھے! میرے سامنے سے ہٹ جا، نہیں تو ابھی تیرے پیٹ پھاڑ کے کلیجہ کچا چبا جاؤں گا۔ تیرا پلید مُردہ یہیں پہ لٹکا دوں گا۔"

ایک گاہک نے بڑھ کر چاقو چھینا۔ بڈھے نے جھک کر زمین سے اپنی مخملی ٹوپی اٹھائی اور گرد جھاڑے بغیر سر پر رکھ لی۔

کون کیسے ٹوٹتا ہے

دس پندرہ منٹ بعد وہ دکان میں تالا ڈال کر گھر چلے آئے اور بیوی سے کہہ دیا، اب ہم دکان نہیں جائیں گے۔ کچھ دیر بعد محلے کی مسجد سے عشاء کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ اور وہ دوسرے ہی اللہ اکبر پر وضو کر کے کوئی چالیس سال بعد نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو بیوی دھک سے رہ گئیں کہ خیر تو ہے۔ وہ خود بھی دھک سے رہ گئے، اس لیے کہ انھیں دو سورتوں کے علاوہ کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ وتر بھی ادھورے چھوڑ کر سلام پھیر لیا کہ یہ تک یاد نہیں آرہا تھا کہ دعائے قنوت کے ابتدائی الفاظ کیا ہیں۔

میں پاپن ایسی جلی کوئلہ بھئی نہ راکھ

انھیں اس رات نیند نہیں آئی۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی کہ ٹمبر مارکٹ کا ایک چوکیدار ہانپتا کانپتا آیا اور خبر دی کہ "صاحب جی! آپ کی دکان اور گودام میں آگ لگ گئی ہے۔ آگ بجھانے کے انجن تین بجے ہی آگئے تھے۔ سارا مال کوئلہ ہو گیا۔ صاحب جی! آگ کوئی آپ ہی آپ تھوڑی لگتی ہے۔" وہ جس وقت دکان پہنچے تو سرکاری اصطلاح میں آگ پر قابو پایا جا چکا تھا۔ جس میں فائر بریگیڈ کی مستعدی اور کارکردگی کے علاوہ اس کو بھی بڑا دخل تھا کہ اب جلنے کے لیے کچھ رہا نہیں تھا۔ شعلوں کی لپلپاتی دوشاخہ زبانیں کالی ہو چلی تھیں۔ البتہ چیڑ کے تختے ابھی تک دھڑ دھڑ جل رہے تھے۔ اور فضا دور دور تک ان کی تیز خوشبو کے آتشیں آبشار میں نہائی ہوئی تھی۔ مال جتنا تھا سب جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ صرف کونے میں ان کا چھوٹا سا دفتر بچا تھا۔ عرصہ ہوا، کانپور میں جب لالہ رمیش چندر نے ان سے کہا کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ گودام کی انشورنس پالیسی لے لو تو انھوں نے ململ کے کرتے کی چُنی ہوئی آستین اُلٹ کر اپنے بازو کی پھڑکتی ہوئی مچھلیاں دکھاتے ہوئے کہا تھا "یہ رہی یاروں کی انشورنس پالیسی!" پھر اپنے ڈنڈ تھپلا کر لالہ رمیش چندر سے کہا "ذرا چھو کر دیکھو!" لالہ جی نے اچنبھے سے

کہا "لوہا ہے! لوہا!" بولے "نہیں۔ فولاد کہو"۔

دکان کے سامنے خلقت کے ٹھٹ لگے تھے۔ ان کو لوگوں نے اس طرح راستہ دیا جیسے جنازے کو دیتے ہیں۔ ان کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ نہ لب پے سوال پہ کوئی لرزش۔ انھوں نے اپنے دفتر کا تالا کھولا۔ انکم ٹیکس کے حسابات اور گوشوارے بغل میں مارے اور گودام کے مغربی حصے میں جہاں چیڑ سے ابھی شعلے اور خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں، تیز تیز قدموں سے گئے۔ پہلے انکم ٹیکس کے کھاتے اور ان کے بعد چابیوں کا گچھا نذرِ آتش کیا۔ پھر آہستہ آہستہ، دائیں بائیں نظر اٹھائے بغیر، دوبارہ اپنے دفتر میں داخل ہوئے۔ حویلی کا فوٹو دیوار سے اتارا۔ رومال سے پونچھ کر بغل میں دبایا اور دکان جلتی چھوڑ کر گھر چلے آئے۔

بیوی نے پوچھا اب کیا ہوئے گا؟

انھوں نے سر جھکا لیا۔

(آبِ گم سے) ▲▽

پرویز یداللہ مہدی (بمبئی)

بیہ ہے بامبے میری جان

کیوں فاصلوں کی مار سے گھبرا نہ جائے دل

بمبئی صرف غافلوں، داقلوں، شاطروں، جابروں، جاہلوں، قابلوں، مظلوموں، ظالموں، مقتولوں اور قاتلوں ہی کا شہر نہیں فاصلوں کا بھی شہر ہے اور یہ فاصلے معاذاللہ طول شب فراق کی طرح اس قدر طول طویل ہیں کہ آدمی کی مختصر زندگی انھیں پاٹنے ہی میں کٹ جاتی ہے۔ آخری مغل تاجدار، بہادر شاہ ظفر نے عمر دراز کے نام پر حضرت انسان کی جھولی میں پڑنے والے "چار دنوں" کے اکاونٹ کی تفصیل اس طرح قلم بند کی ہے:

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

ماضی میں چوں کہ آبادی بھی کم تھی اور فاصلے بھی، اس لیے ضرورت کی ہر شے آدمی کو اپنے قرب و جوار ہی میں دستیاب ہوا کرتی تھی۔ بس دو چار قدم بڑھانے بلکہ کبھی کبھی تو صرف نظر اٹھانے ہی کی دیر ہوا کرتی، "مطلوبہ شے" خود بخود جھولی میں ٹپک جایا کرتی نتیجتاً ہر شخص اطمینان سے اپنی چار روزہ زندگی یا تو انتظار میں کاٹ دیتا یا آرزو میں جب کہ آج حالات یکسر مختلف ہیں۔ آبادی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی شدت اور ضروری اشیا کی قلت نے بڑے شہروں میں فاصلوں کی ایک فصیل کھڑی کردی جسے عبور کرنے میں ایک آدمی کو کم و بیش ویسی ہی مشکلات پیش آتی ہیں جیسی کہ عالم گیری افواج کو گولکنڈہ پر چڑھائی کے وقت پیش آئی تھیں۔ فاصلوں کی باڑھ میں محصور مہانگروں کی صف میں بمبئی چوں کہ سر فہرست ہے اس لیے یہاں کے نوے فی صد باشندوں کی چار روزہ عمر دراز نہ آرزو میں کٹتی ہے نہ انتظار میں صرف فاصلے ناپنے میں کٹ جاتی ہے۔

فاصلوں کی یہ طویل و عریض فصل عموماً مرحلہ وار یعنی قسطوں میں کاٹی جاتی ہے وہ بھی دن میں کم سے کم دو بار۔ پہلا مرحلہ غریب خانے سے نزدیکی ریلوے اسٹیشن تک، دوسرا نزدیکی ریلوے اسٹیشن سے مطلوبہ ریلوے اسٹیشن تک اور تیسرا مرحلہ ——— مطلوبہ ریلوے اسٹیشن سے مقام معاش یعنی دفتر، مل اور کارخانے تک اور پھر دن ڈھلتے ہی مرحلوں کی یہ چاکی "الٹی چلتی" ہے گویا یہاں کے ہر بے قرار شہری پر نوح ناروی کا یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے:

نارے سے چلے نوح تو آرے پہنچے
آرے سے چلے نوح تو نارے پہنچے

فاصلے ناپتے ناپتے عام شہریوں کے اعصاب اس قدر حساس ہو چکے ہیں کہ کسی کی زبان سے فاصلوں کا صرف ذکر سن کر ہی ان کے دل "بیٹھنے" اور جسدِ خاکی اس جہانِ فانی سے "اٹھنے" کی تیاری کرنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ہر شخص ہر وقت خاموشی کی زبان میں یہی کہتا دکھائی دیتا ہے :

کیوں فاصلوں کی مار سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں ٹرین کا پہیا نہیں ہوں میں

جیسے جیسے طے ہوا فاصلہ بڑھتا گیا!

کہتے ہیں ننانوے کا پھیر آدمی کی سمجھ بوجھ سلب کر کے اس کی بدھی بھرشٹ کر دیتا ہے لیکن فاصلوں کا پھیر اس سے بھی دو جوتے آگے بڑھ کر آدمی کا سارا رس کس نچوڑ لیتا ہے۔ پھر آدمی جو محض مشتِ غبار ہے گرد و غبار کی صورت بکھر جاتا ہے البتہ جو لوگ ذرا موٹی کھال کے مطلب سخت جان ہوتے ہیں وہ بکھرتے تو نہیں ہوا نکلے غبارے کی طرح ڈھیلے ضرور پڑ جاتے ہیں۔ یعنی موقعہ واردات پر بظاہر تو حاضر ہوتے ہیں لیکن دماغی طور پر غیر حاضر ہوتے ہیں۔

نتیجتاً غائب دماغی بے رس، بے کس آدمی کو بے بسی و بیکسی کے اس مقام پر پہنچا دیتی ہے جہاں موجود و لاموجود دونوں آپس میں اس بری طرح گڈ مڈ ہو جاتے ہیں کہ آدمی کو اپنے آپ پر بلکہ اطراف واکناف کے موجودات پر بھی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے! کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ابھی حال ہی کا ذکر ہے اندھیری ریلوے اسٹیشن پر اچانک ایک شناسا ٹکرا گئے۔ حال چال دریافت کرنے کے بعد ہم نے پوچھا کدھر کے ارادے ہیں۔

بولے ذرا بمبئی جا رہا ہوں۔!

اتنے میں ٹرین آگئی جیسے تیسے ہم سوار ہو گئے۔ سانتا کروز سے ایک اور واقف کار سوار ہوئے۔ دعا سلام کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بھی بمبئی تشریف لے جا رہے ہیں۔ پھر باندرہ پر ایک دور کے رشتے دار سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی منزلِ مقصود کا اتا پتا بتاتے، ہم نے خود ہی کہہ دیا۔ غالباً آپ بھی بمبئی ہی جا رہے ہیں۔

پھٹاک سے بولے۔ نہیں بھائی جان ابھی ایک گھنٹہ پہلے تو بمبئی سے آیا ہوں۔ فی الحال ماہم جا رہا ہوں۔!

سوال و جواب کے اس سلسلے سے بظاہر ایسا لگتا ہے جیسے اندھیری، سانتا کروز، باندرا، ماہم سبھی بمبئی سے دور بسے ہوئے الگ الگ شہر یا قصبات ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سارے ہی مقامات مضافات کی تعریف میں آتے ہیں اور بمبئی کے بلدی حدود میں آباد ہیں لیکن فاصلوں کے طولانی چکر نے بمبئی کو ایک ایسا چھلاوہ بنا دیا ہے کہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ بمبئی اصل میں ہے کہاں؟ آیا ہے بھی یا نہیں؟

چنانچہ ساکنانِ بمبئی روزانہ بمبئی کو تلاشنے کی مہم پر سر سے کفن باندھ کر نکلتے ہیں اور جب تھکے ہارے اپنے اپنے ٹھکانوں پر لوٹتے ہیں تو نہ سر سلامت رہتا ہے نہ کفن کیوں کہ بمبئی ایک سراب کے مانند اپنے اطراف طواف تو کرواتی ہے مگر ہاتھ کسی کے نہیں آتی۔!

محمد شاہ رنگیلا کے تعلق سے مشہور ہے کہ جس وقت نادر شاہ معہ اپنے لاؤ لشکر کے دلی پر حملے کی غرض سے آگے بڑھ رہا تھا وہ اپنے محل سرا میں رقص و سرور کی محفل سجائے داد عیش دینے میں مصروف تھا۔ چناں چہ جب اسے یہ دل دہلا دینے والی منحوس خبر سنائی گئی کہ عالی جاہ! نادر شاہ دلی کو کسی پالتو بلی کی طرح اپنے بس میں کرنے کے ناپاک ارادے سے آندھی، طوفان کی طرح دلی کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے تو جواب میں محمد شاہ نے انتہائی بے پرواہی سے کہا۔ "ہنوز دلی دور است" کچھ دیر بعد جب اُسے یہ خطرناک خبر سنائی گئی کہ نادر شاہ کی فوج نے دلی کا محاصرہ کر لیا، تب بھی اس نے یہی طرحی مصرعہ دہرایا: "ہنوز دلی دور است" انتہا یہ کہ جب یہ روح فرسا خبر اس کے گوش گزار کی گئی کہ نادر شاہ کی فوج دلی کے حدود میں داخل ہو گئی، تب بھی محمد شاہ کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کے منہ سے اس بار بھی مرغ کی ایک ٹانگ والی یہی تان نکلی ـــــ "ہنوز دلی دور است"

اس کے بعد دلی اور خود محمد شاہ رنگیلا کا جو حشر ہوا وہ تاریخ میں عبرت کے باب میں اس کی زبان سے بار بار نکلنے والا فارسی کلمہ اردو کی تمام با تصویر و بے تصویر لغات میں محاوروں کے باب میں محفوظ ہے ـــــ

البتہ ہمیں ذاتی طور پر اس محاورے سے شدید اختلاف ہے اور اس کی کئی وجوہات ہیں اول تو یہ کہ خود نادر شاہ نے اسی وقت دلی پر قبضہ کر کے مذکورہ محاورے کو جھٹلا دیا۔ پھر اس کے بعد، انگریز راج، عرف کمپنی بہادر نے اور بعد ازاں ملک کے شاطر سیاست داں نے دلی کے چپے چپے پر اپنی پارٹی کے پرچم لہرا کر یہ ثابت کر دیا کہ دلی کبھی بھی دور نہیں رہی ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں "دلی" کا جوڑ کسی طور مذکورہ محاورے میں فٹ نہیں بیٹھتا لہذا ہماری دانست میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے یعنی دلی کی جگہ اور کون سا شہر لے سکتا ہے۔ جواباً عرض ہے کہ ملک کے تمام مہانگروں میں صرف بمبئی ہی ایک ایسی مہانگری ہے جو محاورے کی اس انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ بیٹھتی ہے بلکہ اس محاورے کو پھر سے معنویت عطا کر سکتی ہے کیوں کہ جو بمبئی کبھی ہماشا کی دسترس میں ہوا کرتی تھی۔ اب فاصلوں اور دوریوں کے سبب خود بمبئی والوں کی دسترس سے دور ہو گئی ہے لہذا وقت اور حالات کے پیش نظر محاوروں کے محافظوں اور اہل زبان لغت نویسوں سے دست بستہ گزارش ہے کہ چھوٹی بڑی تمام لغات کی آئندہ اشاعتوں میں مذکورہ بالا محاورے میں ترمیم کر کے ہنوز دلی دور است کو ہنوز بمبئی دور است کر دیا جائے تو زبان و ادب کی بہت بڑی خدمت ہو گی!!!

●○

خوش دل خان پوری
(یوپی)

ایک کتا دوسرے کتے پہ دوڑا اور کہا ـ بھاگ ورنہ آدمی کی موت مارا جائے گا

ڈاکٹر مجید بیدار (اورنگ آباد)

دو غزلیں

○

وہ اس کا فعولن بھتیجا فعولن کیا کیا فعولن، تماشا فعولن
دیا اس فعولن نے دھکا فعولن لگا دل فعولن، کو جھٹکا فعولن
بشارت فعولن، ملی تھی فعولن کہ نائی فعولن نے تاکا فعولن
بچھونا چھن فعولن، پھٹا پھٹ فعولن ترا سر فعولن، بجے گا فعولن
حکیموں فعولن، کی کوشش فعولن کہ نکلا فعولن، جنازہ فعولن
پری حسنا فعولن، نہ دل پہ فعولن لگا اس فعولن، کو دھڑکا فعولن
سناتے فعولن، ہیں بیگم فعولن
نے مارا فعولن، ہے چانٹا فعولن

○

ہوئی گھر میں اڑچن[1] فعولن فعولن دلہا ہو کہ دلہن فعولن فعولن
نوازش سے بیگم کی حالت ہوئی یہ پھٹے سارے برتن فعولن فعولن
سکوں گھر کے کاموں سے بیوی کو دیتے وہ لائے ہیں سوکن فعولن فعولن
چکا چک ہوئی روشنی کیمرے کی یہ لیڈر کے درشن فعولن فعولن
وہ اسٹیج پر آکے بھرّایا ایسا کہ دے جیسے بھاشن فعولن فعولن
اگر اس کو انڈا کری نہ ملے تو وہ کھائے گا کھرچن فعولن فعولن
بھکاری ہے روٹی طلب کر کے دیکھو
منگائے گا سالن فعولن فعولن

[1] رکاوٹ

انیس سلطانہ
(بھوپال)

کرسی نامہ

بات چار سال کی ہو یا چار دن کی، بہرحال ابھی ماہ رمضان کو گیے دو چار ہی دن ہوئے تھے کہ لینے کے دینے پڑ گئے۔ ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ ہمارے محترم شوہر نامدار صاحب اچھے بھلے تھے کہ گھر میں ہی ٹھوکر لگی، لگی تو سنبھل نہ سکے۔ اٹھائیں تو کیسے اٹھائیں۔ ہم نے اور بچوں نے مل کر دہائیاں دیں۔ بڑی مشکل سے اٹھا پائے۔ ان کی ٹانگ میں فریکچر آ چکا تھا۔

اسپتال تو جانا ہی تھا بلکہ لے جائے گئے۔ رات بھر ان کی تکلیف دیکھی نہ جاتی تھی۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد ڈاکٹروں کو ترس آیا (ہمیں ایسا ہی لگا) اور ٹوٹی ہوئی ٹانگ میں پن لگا کر انھوں نے وزن لٹکا دیا۔ ہمارا دل بلبل اچھل رہا تھا، اس پر کوئی وزن نہ رکھ سکا۔ آنکھیں روزن ترزاں بنی رہیں، چار دن چار راتیں ہم بھی جاگتے رہے۔ مریض کو تو جاگنا ہی تھا۔ پاس پڑوس کے مریضوں اور ان کے تیمار داروں سے دوستی بھی کی، لیکن کھرے کھرے..... کہ بلا مبالغہ، پچاس پلنگوں والے وارڈ میں کل دس بنچیں تھیں جو اٹینڈنٹ حضرات کے لیے تھیں۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ ہم ادھر کھینچ کر لاتے، ادھر کوئی اور چھین لے جاتا۔ ہم نے بھی سر تسلیم خم کر دیا۔ انچارج ڈاکٹر سے تو خیر ہماری گاڑھی چھننے لگی۔ آدمی تھے خوش مزاج۔ وہ بھی موقع دیکھ کر ہم سے کچھ نہ کچھ فرمائش کر جاتے۔ ہم بھی موقع محل دیکھ کر جوابی کارروائی کرتے۔ مگر نہ ملی تو نشست۔ قریب تھا کہ ہم لڑکھڑا کر گر جائیں کہ حواسِ خمسہ نے ہمیں سہارا دیا۔ "کیوں نہ گھر سے ایک عدد کرسی ہی لے آئیں"۔

بھاگے بھاگے گھر پہنچے۔ مشورہ ہوا کہ کرسی تو زیادہ جگہ گھیرے گی اس لیے ایک اسٹول ہی کافی ہے۔ بس جناب اسٹول حاضر اور ہم اس پر ایک شانِ خسروانہ سے براجمان۔

ہمارا مریض تو اللہ جھوٹ نہ بلوائے صبر و ضبط کا نمونہ تھا لیکن ہم اپنی بے قراری کو کیا کرتے۔ کبھی کسی مریض کو تسلی دی جا رہی ہے۔ کبھی کسی تیماردار سے گپیں لڑ رہی ہیں۔ کسی کو دیکھ کر خود ہمارا بلڈ پریشر بڑھ گیا اور کسی کا ہمیں دیکھ کر گھٹنے لگا۔

انچارج ڈاکٹر کو ہمارے شوہر صاحب کے ساتھ ساتھ ہم بھی مریض نظر آنے لگے۔ لگے پریشر کم کرنے کے لیے

گولیاں دیتے۔ ہم نے ہنس ہنس کر انھیں یقین دلایا کہ ہمیں خدا نخواستہ کوئی مرض نہیں ہے، لیکن انھوں نے ہماری شب بیداریوں کو (جو مریض کی بے چینی کے باعث تھیں) بلڈ پریشر کا یقینی عارضہ سمجھا اور فیصلہ صادر کر دیا کہ چالیس کے بعد یہ مرض (اس حساب سے ہم ابھی تک چالیس پار نہیں کر سکے) ضرور ہو جاتا ہے۔ ہم تو خیر ان کی باتوں میں نہیں آئے۔ ہمارے مریض کو جلدی اچھا ہونے کا شوق تھا (کسے نہیں ہوتا) اس لیے ڈاکٹر صاحب اپنے مبارک ہاتھوں سے انھیں صبح شام نارمل ہونے کی دوائیں دیتے رہے۔ اس خلوص سے انکار مریض کے بس میں نہ تھا۔

چناں چہ جس وقت آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا، مریض کا بلڈ پریشر بہت کم ہو چکا تھا، جسے اپنی خفت مٹانے کو ڈاکٹر نے ڈر کا نام دینا چاہا۔

فی الحال تو آپریشن ٹل گیا، لیکن آپریشن تھیٹر سے واپسی کے بعد ہمارا اسٹول بھی غائب۔ سرکاری چیز ہوتی، حق سے مانگ کر لے آتے۔ گھر سے لایا گیا تھا، مروت غالب آئی۔ پھر ہنوز روزِ اول۔

اب کے ہم نے ایک کرسی مہیا کی۔ اسپتال کے قریب اسکول تھا۔ جس میں طلبا کے لیے تو ٹاٹ پٹیاں تھیں البتہ ہیڈ ماسٹر صاحب کی کرسی ہمیں مل گئی کیوں کہ اسکول کل دو ہی ماسٹران پر رکھا تھا۔ یہ ہیڈ ماسٹر صاحب ہمارے پرانے کرم فرما تھے۔ فولڈنگ چیئر جس کا ٹن اتنا ہی پرانا تھا، جتنی خود ٹین کی ایجاد۔ زنگ نے اس کے رنگ کو تو چھپا ہی لیا تھا لیکن اس ایجادِ فرنگ نے اسے ہمارے دل میں چھپا دیا کہ فولڈنگ چیئر ہے جس کا وجود عدم وجود برابر۔

جب ہمیں وارڈ کے اندر یا باہر گشت کرنے کا خیال آتا فوراً اسے پلنگ کے نیچے سرکا دیتے باقی وقت میں خدمت گزاری کر کے ثوابِ دارین حاصل کرتے۔ نیز اپنے "ان" کی خوشنودی کو فرضِ اولین جانتے۔

مگر برا ہو، میڈیکل وارڈ سپروائزر کا۔ ہمیں کیا پتہ کہ یہ کون صاحب ہیں۔ نہایت مختصر، منحنی، کلین شیو، کریب شرٹ پر سفید کوٹ ہونے کے باوجود ان کا رعب کسی پر نہ پڑ سکا۔ نہایت اچھل اچھل کر بات کرتے اور اپنی تمام تر طاقت کو اپنی آواز میں رعب پیدا کرنے کے لیے خرچ کیا کرتے۔ چوں کہ مریضوں کو دیکھنا ان کے فرائض میں نہ تھا، اس لیے تیمارداروں کو دیکھتے۔

سب سے پہلے بیڈ نمبروں کا اکثر سامان ضبط ہوا، پھر ہمارے مریض پر طائرانہ اور ہم پر ایک ظالمانہ نگاہ ڈالی۔ ارشاد ہوا ——— "یہ سامان باہر پھینکیے۔"

واضح رہے کہ اس پھینکے جانے والے سامان میں اگالدان بھی شامل تھا۔

ہم نہایت خوش کہ کرسی انھیں نظر نہ آئی۔ چناں چہ ان کے جاتے ہی ہم نے کرسی برآمد کی اور خود اس میں درآمد ہو گئے مگر ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو تشکیبا کر دیا۔ مگر توبہ صاحب!! دل نے بے اختیار دھڑکنا اور نگاہوں نے کھٹکنا شروع کر دیا کیوں کہ وہی سریلی دعا ہمیں سنائی دی۔ ہم نے پھر کرسی تہہ کی۔ ایسا لگتا تھا کہ انھیں

کچھ شبہ ہوگیا تھا۔ چور کا دل ہی کتنا۔ سپروائیزر قریب آئے۔ ہم نے سلیقے سے پان بنا کر پیش کیا۔ انھوں نے سلیقے سے ہاتھ بڑھا کے تو لیا اور تاحکم ثانی اگال دان اندر تھا' نیز ہماری پیاری کرسی جسے ہم ہیڈ ماسٹر صاحب کی کرسی کہہ کر اس کی عزت افزائی کیا کرتے تھے باہر تھی اور جب تک ہم کمرہ سے برآمد ہوتے' پتہ چلا کہ فالتو سامان کے ساتھ اسے اسٹور روم میں پہنچا دیا گیا جو ممکن ہے آج تک وہاں ہماری فریادی بنی ہوئی ہو ــــ ●●

رؤف رحیم (حیدرآباد)

کیا ہوا ہے فرق بدلی گر حکومت اے رحیمؔ ؛ سانپ تو باقی وہی ہے صرف بدلی کینچلی

غزل

تمیز احمد پروازؔ (عادل آباد)

گھر کو توڑ کو منڈوا بنا نا میرے بس کی بات نہیں ہے
اونٹ پو بیٹھ کو بکریاں چرانا میرے بس کی بات نہیں ہے

شاپنگ، پکنک، پکچر میں تم کرریں خالی جیب ہماری
راشن سبزی اور کرانہ میرے بس کی بات نہیں ہے

آدھی روٹی ٹھیک ہے اپنی سکھ کی جان کیوں کھیں ڈالو
دو بٹی جا کو پھترے اٹھانا میرے بس کی بات نہیں ہے

پانچوں وقت نمازاں پڑھ کو نئیں کرنے کے کاماں کرنا
اللہ معاف کرے مولانا میرے بس کی بات نہیں ہے

شعراں سنا رئیں ترمی کے سارے پھرتی انوں نیر آتے ہیں
چوری کے اشعار سنانا میرے بس کی بات نہیں ہے

مرغی بکری پڑوس کی پروازؔ آئی تو بھیجا نہیں سکتی
گھر آئے مہمان کو بھگانا میرے بس کی بات نہیں ہے

صابر بہاری
(راپچی بہار)

ماجرا اک کھڑی دعوت کا

اک کھڑی دعوت کا سُنئے آنکھوں دیکھا ماجرا
ساتھ دعوت نامے کے میں بھی وہاں موجود تھا

شہر میں جب منعقد اک مجلسِ شعری ہوئی
شاعروں کو منتری جی نے دعوتِ ظہرانہ دی

شہر سے کچھ دُور عالیشان ہوٹل میں جناب
شاعروں کو کار سے لایا گیا با آب و تاب

خوب صورت ہال میں شاعر اکٹھے ہوگئے
سب کے معدے فاعلاتن فاعلن میں کھو گئے

ایک گھنٹہ بعد دسترخوان چنوایا گیا
مختلف اقسام کا کھانا وہاں لایا گیا

میہمانوں کو جو تھا اب میزبان کا انتظار
جانب در ٹکٹکی باندھے تھے ہوکے بے قرار

دفعتاً اک شور اٹھا لو منسٹر آگئے
ہر طرف موصوف کے چمچے وہاں پر چھا گئے

پھر کہا موصوف نے دستِ مبارک جوڑ کر
کیجئے بھوجن مہاشئے سب تکلف چھوڑ کر

سُنتے ہی چمچوں نے ہر جانب سے ہلہ بول کر
شاعروں کے بدلے قبضہ کرلیا خود میز پر

ایک ہی حملے میں کھانا ختم سارا ہوگیا
اور میں اپنے "انویٹیشن کارڈ" کو تکتا رہا

غزل

مجھے بتاؤ تمھیں کون سا ہے غم دادا
کہ ہنستے ہنستے یوں آنکھیں ہوئی ہیں نم دادا

یہ کس کی یاد میں دن رات گھلتے رہتے ہو
ضرور ہوگا کوئی بے وفا صنم دادا

دُعائیں کردو ذرا تم کہ خیر ہوجائے
لگا ہے کرفیو اور پھٹ رہا ہے بم دادا

وہ جس نے سب کو بچایا تھا کل کے دنگے میں
اُسی کا ہوگیا اس بار سر قلم دادا

نصیحتوں پہ تمھاری عمل کروں گا میں
تمھارے سامنے کھاتا ہوں یہ قسم دادا

★

مرزا کھونچ
نیا ٹولہ، بیتیا

دوستوں کی ہوگی بارش آگے پیچھے ہر گھڑی
باپ کی دولت ذرا اُن پر لٹا کر دیکھئے

محفلِ شعر و سخن کے چیمپین بن جائیں گے
شاعر مرحوم کی غزلیں اُڑا کر دیکھئے

اپنا بیٹا بھی بغاوت پر اُتر آئے گا یار
بس کسی غلطی پہ اک چانٹا لگا کر دیکھئے

کام جو پینڈنگ پڑا ہے آپ کا ہوجائے گا
کھونچ صاحب کو فقط مُرغا کھلا کر دیکھئے

★

امجد علی فیض
(گلبرگہ)

کفایت شعاری زندہ باد

ہماری بیگم بڑی ہی کفایت شعار واقع ہوئی ہیں، ہمیں فضول خرچی سے باز رکھنے کے لیے وہ اونٹ سے لے کر چیونٹی تک کی مثالیں پیش کرتی ہیں اور ہمارے پڑوسی کے حوالے سے فرماتی ہیں کہ اُس بے چارہ نے کفایت شعاری سے کام لے کر بیوی بچوں کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے اپنی خواہشات کو قربان کردیا۔ سگریٹ نوشی ترک کردی۔ شراب نوشی سے توبہ کرلی اور پان سپاری تک کھانی چھوڑدی۔ بس اب صرف انگوٹھا چوس چوس کر وقت گزارتا ہے خدا کرے ایسا کفایت شعار شوہر ہر عورت کو نصیب ہو۔ آمین - اور ایک تم ہو کہ فضول خرچی سے باز نہیں آتے۔ ساری تنخواہ سگریٹ اور پٹرول کے دھوئیں میں اڑاتے ہو۔ جتنا خرچ تمھاری اسکوٹر رانی اور سگریٹ نوشی پر آتا ہے اس میں بچوں کی ٹیوشن فیس، والدین کی دوائیں اور ساس سالیوں کی دعائیں لی جاسکتی ہیں۔

ایک روز ہم نے سنجیدگی سے اپنی فضول خرچی پر غور فرمایا اور یہ تہیہ کرلیا کہ آئندہ کفایت شعاری سے کام لیں گے

آج کفایت شعاری کا پہلا دن ———— ! اسکوٹر گھر پر چھوڑ دی اور پیدل ہی دفتر کے لیے نکل پڑے اتفاقاً ایک دوست نے ہمیں اپنی اسکوٹر پر لفٹ دی اور دفتر پہنچا کر ثواب کمالیا۔

تنخواہ کا دن ———— ۔

بس تو کجا بس اسٹاپ کا بھی دور دور تک پتہ نہ تھا۔ تلاش بسیار کے بعد ایک کوڑے کے ڈبہ کے پاس نظر آیا۔ بس ہماری نظروں سے کوسوں دور تھی۔

وقت گزاری کے لیے ٹہلنے لگے اچانک ہماری نظریں پھل فروش پر پڑیں جو ہمیں للچائی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے پھلوں پر کپڑا اور ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا یہ دیکھ کر ہمارے منہ میں ایک سیلاب تھا کہ امڈا جارہا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس سیلاب میں ہماری جیب بھی بہہ جاتے ہم نے فوراً نگاہیں پھیر لیں۔ اس بار ہماری گناہ گار آنکھوں نے ایک خوانچہ کو دیکھا جس میں رکھی ہوئی مونگ پھلیاں مسکرا، مسکرا کر ہماری تپسیا کو بھنگ کرنے کے درپے تھیں۔ ہم نے جھٹ سے "لاحول" پڑھا اور دل ہی دل میں خدا کے حضور دست بہ دعا ہوگئے۔ "اے رب عظیم اب ہماری عزت تیرے ہی ہاتھ ہے ہماری لاج رکھیو"! اس سے کچھ ہمت بندھی تو پھر ٹہلنے

۱

گے لیکن آنکھیں بند تھے۔ وہ تو بس کی آواز نے ہمیں چونکا دیا ورنہ پتہ نہیں کب تک یوں ہی کولھو کے بیل بنے چکر لگاتے رہتے، مسافروں سے لدی پھندی بس کے اندرونی حالات تو خدا ہی جانے بیرونی حالات تو ٹھیک نہیں تھی کیونکہ دروازے پر نصب آہنی ڈنڈے سے دو تربوز قسم کے آدمی جھول رہے تھے بالکل تربوز کی طرح گول اور چکنے ہم نے بھی ایک جست لگائی اور ڈنڈے کو تھام لیا۔ جوں ہی بس جھٹکے کے ساتھ چلی، ڈنڈا بس سے الگ اور ہم پکے ہوئے پھل کی طرح زمین بوس۔ اچھا ہوا کہ تربوز ہم پہ گرے نہ ہم تربوزوں پر ورنہ دونوں صورتوں میں ہمارا ہی نقصان ہوتا۔ بس اپنی منزل کی طرف گامزن اور ہم ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح واپس پویلین۔

کچھ دیر بعد جب دوسری بس آئی تو جان میں جان آئی اس بار ہم ہاتھ پیر مارتے ہوئے سیدھے بس کے اندر داخل ہوئے (سینگ ہوتے تو اور بھی آسانی ہوتی) اور سکون کی سانس لینی چاہی لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ کون کس کی سانس لے رہا ہے کیونکہ ہجوم میں ایک دوسرے کی ناکیں یوں بغل گیر ہو رہی تھیں گویا عید کی مبارکباد دے رہی ہوں ہم نے اپنی ناک کھڑکی کی جانب کر لی تاکہ کچھ آکسیجن بھی مہیا ہو سکے۔ کھڑکیوں کی حالت بھی تقریباً ہماری ہی طرح تھی، گرد سے اٹی ہوئی لیکن فرق اتنا تھا کہ اُن گرد سے اٹی کھڑکیوں کو اپنے کالج کے باتھ روم کی دیوار سمجھ کر کسی نوجوان نے اپنی محبوبہ کی خیالی تصویر اتار دی تھی جس میں ہونٹوں کے لیے بطورِ خاص چاند نے کی خدمات لی گئی تھیں جنہیں دیکھنے کے بعد بار بار ٹرافک کنٹرول کا وہ سگنل یاد آیا ⊖ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آگے راستہ بند ہے دوسری کھڑکی پر ایک قسمت کے مارے نے لکھا تھا "جیب کتروں سے ہوشیار رہیں"۔ ہمیں بھی اپنی جیب کی فکر لاحق ہو گئی۔ جیب تو سلامت تھی لیکن روپیہ ندارد، مارے گھبراہٹ کے برا حال، پریشانی میں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا حتیٰ کہ اس عبارت کو پھر سے پڑھنا چاہا تو بصارت نے بھی ساتھ چھوڑ دیا اور عبارت کچھ اس طرح پڑھی جانے لگی۔

"جیب کترے ہم سے ہوشیار رہیں" جسم کاٹو تو خون نہیں لیکن پسینہ اس قدر جاری تھا کہ ساری اُمیدوں پر پسینہ ہی پھر گیا۔ مہینے میں ایک بار ہی تو تنخواہ ملا کرتی ہے روزانہ ملا کرتی تو اور بات تھی اور جو تنخواہ ملی تھی وہ بھی جیب کتروں کی نذر ہو گئی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس منہ سے گھر جائیں اور آخر گھر نہ جائیں تو پھر کہاں جائیں؟ چنانچہ سب کچھ لٹا کر خود ہی اگلے بس اسٹاپ پر اتر گئے ورنہ کنڈکٹر اتار دیتا۔ بس سے اتر کر اطمینان سے اپنے سراپے کا جائزہ لیا، ہر چیز اپنی جگہ پر موجود تھی سوائے روپیوں کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی تو لاشعوری طور پر ہاتھ سینے کی طرف اٹھ گیا اور ہم سینہ سہلانے لگے، دریں اثنا اوپری جیب میں بھی کسی انجانی شئے کا احساس ہوا تو جیب میں ہاتھ ڈالا، دو کی کراری نوٹ اس تحریر کے ساتھ برآمد ہوئی "ہم خاندانی جیب کترے جب بھی کسی کی جیب پوری طرح صاف کرتے ہیں تو اُسے گھر جانے کا کرایہ اپنی جیب سے ادا کرتے ہیں" اس تحریر کو پڑھ کر ہماری ساری پریشانی جاتی رہی اور سر فخر سے اونچا ہو گیا کہ "چلو ہمارے دیش میں ایسے بھی صاحبِ دل جیب کترے پائے جاتے ہیں جو خاندانی ہونے کے علاوہ اپنے سینہ میں دردمند دل رکھتے ہیں،

صد روپے کی واحد نوٹ اب ہماری کل کائنات تھی چنانچہ ہم جیب تھامے چلنے لگے ، دودھ کے جلے تھے چھانچھ بھی پھونک پھونک کر پینے لگے ۔ ہمیں اس پوزیشن میں ایک ڈاکٹر صاحب نہ جانے کب سے دیکھ رہے تھے کہ ہمارے قریب آئے اور قریب ہی واقع اپنی کلینک لے گئے اور زبردستی ہمارا بلڈ پریشر چیک کرنے لگے ہم اپنی مدافعت میں کچھ کہنا ہی چاہ رہے تھے کہ موصوف نے ہمارے منہ پر ہاتھ رکھا اور کہا " میاں اب کچھ مت کہیئے میں بہت دیر سے آپ کو اس تکلیف میں مبتلا دیکھ رہا ہوں ۔ ظالم یہ مرض ہی ایسا ہوتا ہے ایسی حالت میں آپ کو باہر نہیں نکلنا چاہیئے اگر خدانخواستہ نکلے بھی جائیں تو کسی کو اپنے ساتھ رکھیں کم از کم لاش تو لاوارث نہیں کہلائے گی"۔ ہم ڈاکٹر صاحب کو کیسے سمجھائیں ؎

آخر اس مرض کی دوا کیا ہے ۔

جیسے تیسے دواخانے سے بھاگ نکلے ، دھوپ کی شدت اور بڑھ گئی تھی ، زبان خشک دریا کی مانند ہو چلی تھی ہوٹل ... پاس ہی تھی اور وہاں جاکر پانی پینے میں بھی کوئی قباحت نہیں تھی لیکن پانی پینے کے بعد ہونے والی کاروائیاں بڑی پریشان کن ہوتی ہیں جسے صرف جیب بھرے ہی برداشت کر سکتے ہیں یا سر پھرے لہذا کافی غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ کیوں نہ پاس ہی کھڑے آئس والے سے مبلغ ایک روپیہ کی آئس کریم کھائی جائے جس سے سانپ بھی مرے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی ہم آئس کریم سے اپنی پیاس بجھانے میں ہمہ تن معروف تھے کہ ایک مجرد گدھے سے یہ بھی دیکھا نہ گیا وہ ہماری اس حرکت پر طنزاً قہقہے لگا کر ہنسنے لگا ہم نے جھنجھلا کر آئس کریم اس کے منہ پر دے ماری کہ کمبخت اگر تجھے بھی کسی کفایت شعار بیوی سے سابقہ پڑے تو سمجھ میں آجائے کفایت شعاری کس چڑیا کا نام ہے ۔ گدھا یکلخت خاموش ہو گیا گویا وہ بھی خائف تھا کہ کہیں واقعی کفایت شعار بیوی سے سابقہ نہ پڑ جائے ۔

اگلا بس اسٹاپ چالیس چالیس قدم پر ہوگا ہم نے سڑک پر ایک شاعرانہ نظر ڈالی مختلف سواریاں کسی متشاعر کی زبان سے نکلے ہوئے اشعار کی طرح بھاگے جارہی تھیں ۔ ہمیں ان سواریوں میں آٹو رکشا ہی واحد ایسی سواری نظر آئی جس میں ہماری جان و مال محفوظ رہ سکتے تھے لہذا ہم نے ایک ایک کے آگے ہاتھ پھیلایا اور پکار پکار کر کہا " بھائیو ہمیں اپنی سواری میں تھوڑی سی جگہ دے دو ، غریب تمہارا نام لے لے کر جیتا رہے گا "۔ لیکن ہر ایک نے ہمیں پیشہ ور بھکاری یا ٹرافک کانسٹیبل سمجھ کر نظر انداز کیا ، ہمارے ہاتھ بھی آخر انسان کے تھے تھک گئے ، نوجوان پیڑ کی لچکدار شاخیں ہوتیں تو اور بات تھی ۔

ہم نے پھر سے اپنے دل میں بس کی آرزو کو بسایا اور اگلے بس اسٹاپ تک چل دیئے ۔ چاہتے تو راستے میں نیم کے درخت کے نیچے سوتے ہوئے رکشا راں کو جگاتے لیکن مناسب نہیں سمجھا ۔ کیونکہ پہلے ہم انہیں تھپک تھپک کر جگاتے تو وہ شعلہ بار نگاہوں سے کہتا " جو کچھ کہنا ہے جلدی کہو ہمیں خواب کی اگلی

قسط بھی دیکھنی ہے" ہم اپنا مدعا بیان کرتے اور وہ ہماری جیب سے اونچا کرایہ بتاتا ہم چوتھائی کرایہ پر راضی کرنا چاہتے، وہ مُڑ جاتے ہوئے جواب دیتا " اگر آپ رکشا چلائیں تو میں مقررہ اُجرت سے چار گنا زیادہ دینے کے لیے تیار ہوں کم ازکم نیند تو پوری ہوگی ۔

ہمارا جی تو بھی چاہ رہا تھا کہ ان سواریوں پر تھوکیں اور کسی چارٹیڈ پلین یا ہیلی کوپٹر کے ذریعہ گھر کی طرف اُڑان بھریں اور تھوڑی دیر تک گھر کے اُوپر محلے کے اطراف یوں ہی چکر لگانے کے بعد آسے اپنے گھر کی سل پوش چھت پر " LAND " کرکے اتر جائیں لیکن جیب میں صرف ایک روپیہ باقی تھا اس پر کفایت شعاری کا لزوم الگ سے ہماری پرواز میں حائل تھا خاموش بس کے انتظار میں اپنا خون جلاتے رہے، بس کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ البتہ دور سے ایک تانگہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ قریب آنے پر پتہ چلا کہ وہ بھی مرغیوں کی جھانپ سے لبریز ہے چونکہ تانگہ کی چھت پر بیٹھنے کا رواج ہمارے ہاں نہیں تھا اس لیے تانگہ میں کسی سزا یافتہ مجرم کی طرح پیر اوپر اور سر نیچے کیے SQUAREROOT بنے بیٹھے رہے ۔

" تانگہ کسی بڑھیا کی گردن کی طرح ہچکولے کھاتے ہوئے بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا جس کی وجہ سے ہمارے گھٹنے سر تک آکر یوں واپس لوٹ جاتے جیسے ہماری بلائیں لے رہے ہوں اب جوں ہی اسپیڈ بریکر آیا ہم اُچھل کر کچھ آگے آئے اور فوراً پیچھے کی جانب کوچ کیا دوسرے اسپیڈ بریکر نے بھی اسی کیفیت سے دوچار کیا اور تیسرے اسپیڈ بریکر نے کچھ اس طرح اُچھال دیا کہ ہم جھانپ پر جھانپ ہم پر سے ہوتے ہوئے نیچے آ رہے۔ ہم چاروں خانے چت سڑک پر پڑے تھے اور مرغیاں جھانپ سمیت ہمارے اوپر، اس پر مرغیوں نے بھی کافی احتجاج کیا اور ہم بھی مدد کے لیے چیخنا چاہ رہے تھے کہ پتہ نہیں کس بے صبر مرغی نے انڈا دیا جو سیدھے ہمارے منہ میں آکر پھنس گیا جب راہ گیروں کی مدد سے ہمیں نکالا گیا تو معلوم ہوا کہ ہمارے کپڑے بھی دیگر متفرقات سے آراستہ ہیں شرم اور خوف کے مارے حالت غیر ہوئی جارہی تھی لیکن لوگوں کو اٹھکھیلیاں سوجھ رہی تھیں۔ فقرے کسے جارہے تھے۔ اور کوئی ہماری کنجوسی پر ماتم کناں کہ دو روپے دے کر دوسری سواری میں بیٹھ گئے ہوتے اور ایک شخص نے جب ہمارے منہ سے انڈے کو نکلتے دیکھا تو کہنے لگا " بدشگون" آدمی کے منہ سے انڈا برآمد ہوا ہے دیکھنا شہر پر ضرور کوئی آفت آئے گی۔

ہم کس کس کی زبان پر تالا لگاتے چُپ چُپ اپنے گھر کی طرف چل دیئے۔ جب بیگم نے ہمیں اس حالت میں دیکھا تو وہ بھی دوڑی دوڑی ہمارے قریب آئیں اور فکر مند لہجے میں پوچھنے لگیں " آج صاحب کا قیلولہ کہیں پولٹری فارم میں تو نہیں ہوا؟ ہم جواب بھی کیا دیتے سیدھے باتھ روم میں داخل ہوگئے ۔

●●

قلمی معاونین

اپنی تخلیقات صاف اور خوش خط روشنائی سے صفحے کی ایک جانب لکھ کر ارسال فرمائیں۔ مسودات پر اپنا پتہ ضرور لکھیں ۔

انوار انصاری (رانچی)

الجھن

الجھن کانام سنتے ہی طبیعت مکدر ہو جاتی ہے، چہرے کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔ ذہن پریشان ہو جاتا ہے، دل میں طرح طرح کے وسوسے جنم لینے لگتے ہیں اور خواہش ہوتی ہے کہ کہیں دور چل کر اپنا آشیانہ بنایا جائے۔ اس بھاگ دوڑ کی زندگی میں کوئی بشر الجھن سے بچا نہیں ہے۔ کسی نہ کسی الجھن میں وہ ضرور گرفتا ہے۔ طالب علم، تاجر، دوکان دار، ڈاکٹر، وکیل، موکل، اڈیٹر، انجینیر، بے کار، باکار، غرض کہ سب ہی الجھن کا شکار ہیں، گویا الجھن نے اپنا مقام ہر گھر میں بنالیا ہے۔ دوست دشمن، سب ہی اس سے نالاں ہیں۔ عاشق و معشوق پریشان حال ہیں۔ استاد شاگرد بھی اس کی زد سے محفوظ نہیں۔

صبح کی سپیدی کے ساتھ ہی الجھن کی ناز برداریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ بیگم سے چائے کی فرمائش کرتا ہوں تو جواب ملتا ہے کہ چائے، چینی اور دودھ ندارد ہے، کوئلہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ چولھا بھی سرد پڑا ہے۔ سوچا تھا چائے پی کر تازہ دم ہو جاؤں گا۔ مگر یہاں تو لینے کے دینے پڑ گئے۔ چلیے اب چائے چینی، دودھ اور کوئلے کا انتظام کیجیے۔ بچے اسکول نہ جانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ دو ماہ کی فیس باقی ہے۔ اسی الجھن نے بیگم کی مسکراہٹ اور بچوں کی کلکاریوں کو نیست و نابود کر دیا ہے۔

طالب علم امتحان دے کر پریشان حال ہیں۔ یونیورسٹی کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ نتیجہ کب نکلے گا، کسی کو اس کی فکر نہیں۔ طالب علم کا مستقبل یونیورسٹی کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے برباد ہو رہا ہے مگر اس کی فکر کسی کو نہیں ستاتی ہے۔ ہر آدمی اپنی اپنی ڈگر پر رواں دواں ہے۔

دوکان دار ہول سیلر سے پریشان ہیں۔ قیمت آئے دن آسمان کو چھونے لگی ہے مگر ہول سیلر، ریٹیلر اور دوکان دار سب ہی کسی نہ کسی الجھن کے شکار ہیں اور غموں کے بوجھ تلے عوام مجبوراً زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ طرح طرح کی الجھن سے عوام کے دلوں پر ہیبت طاری ہے۔

سائنس کا دعویٰ ہے کہ دنیا آج ترقی کی طرف گامزن ہے، مگر جیسے جیسے دنیا ترقی کی طرف بڑھ رہی ہے نئی نئی ایجادیں عمل میں آ رہی ہیں، اسی طرح نئی نئی بیماریاں وجود میں آنے لگی ہیں۔ ڈاکٹر کو یہ الجھن ہے کہ کس طرح جلدی سے وہ

امیر وکبیر بن جائے۔ اس کو مریضوں کے علاج سے اتنی دل چسپی نہیں، جتنی دل چسپی اس کو اپنی فیس سے ہوتی ہے۔ مریض کو یہ الجھن ہے کہ کم پیسے میں کسی طرح بیماری سے چھٹکارا ملے، تاکہ گھر والوں کو قرض کا سہارا نہ لینا پڑے۔ مریض ڈاکٹر سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے مگر حالات کے تحت الجھن سے نجات نہیں ملتی ہے۔

ہر پڑوسی کو اپنے پڑوسی سے الجھن ہوتی ہے۔ پڑوسی یہ نہیں چاہتا ہے کہ ہمسائے کی الجھن ختم ہو بلکہ اس کی تو یہی خواہش ہوتی ہے کہ کس طرح کسی نہ کسی مسئلے کو لے کر اپنے پڑوسی کو تنگ کیا جائے۔ انسان اپنے گریباں میں منہ ڈال کر نہیں جھانکتا ہے، اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں پر نظر نہیں ڈالتا۔ اس کی نظریں دوسروں کی کمزوریوں کی جانب مرکوز ہوتی ہیں۔

ایک کہاوت مشہور ہے۔ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ۔" میرا خیال ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ یہ کہاوت بھی عام ہونی چاہیے۔ "مجھے الجھنوں سے بچاؤ۔" دوستوں سے بچنے کے معنی یہ ہیں کہ الجھنوں سے بھی نجات مل جائے گی۔ الجھن کا نہ کوئی وقت مقرر ہے اور نہ کوئی موقع۔ الجھن تو ہمہ وقت انسان کے ساتھ ہی چلتی ہے۔ آپ غور کریں گے تو پتہ چلے گا کہ الجھن کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی حیثیت سے ہر گھر میں ضرور موجود ہے۔ الجھن کے جراثیم ایسے ہیں جن کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہر زمانے میں پائی جاتی ہے۔ ہر قوم ہر ملک کا جزو ہے۔ ہر آب و ہوا میں پنپتی ہے۔ ہر رنگ و بو میں پروان چڑھتی ہے۔ وہ جیل خانے میں بھی ملے گی، مندر میں، مسجد میں گرجا میں، شبستانِ عیش میں، کلبۂ افلاس میں، شہر میں، دیار میں، صحرا میں، ویرانے میں۔ غرض کہ الجھن سے چھٹکارا پانا ناممکن ہے۔ کوئی کہاں تک الجھن سے اپنا دامن بچائے۔ الجھن تو زندگی کا ایک جزو بن چکی ہے۔ ہر نفس الجھن سے ہمکنار اور ہر بشر الجھن سے برسرِ پیکار ہے۔ غرض کہ زندگی الجھن سے بیزار ہے۔

ہڑتال، توڑ پھوڑ، تخریبی کارروائیاں، درہم برہم منتشر زندگی، سب الجھن کی وجہ سے ہے۔ الجھن کا خاتمہ گویا سکون کی زندگی کی آمد کا پیغام ہے۔ اضطراب اور پریشانیوں میں گھری ہوئی زندگی سے اگر انسان نجات پانا چاہے تو روزمرہ کی زندگی میں الجھنوں کو کم کرے کیوں کہ منزل دور ہے اور سکون سے زندگی کے سفر کو جاری رکھنا بھی کامیاب و کامران زندگی کے لیے ضروری ہے۔

الجھن پڑھ کر آپ بھی الجھن میں مبتلا ہو گئے ہوں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ اپنا قیمتی وقت الجھن کے نذر کریں۔ الجھن سے نجات حاصل کرنا بھی ایک نیک اور عمدہ کام ہے۔ اس نیک کام میں دیر نہ کریں۔ الجھن کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دیں۔ "الجھن مردہ باد" ہی ہمارا نعرہ ہے۔ اس نعرہ پر لبیک کہیں اور سکون کی زندگی گزاریں۔ ●●

بال کی کھال
(تبصرہ)

نعیم زبیری (حیدرآباد)

بیرونی مشاہیرِ اُدبا

مصنّف : ڈاکٹر داؤد اشرف

ناشر : روزنامہ سیاست جواہرلال نہرو روڈ، حیدرآباد

قیمت : بیس روپے

نفسیات میں پڑی ہوئی گرہیں اور چبھتے ہوئے کانٹے بھی عجیب ظالم چیز ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر میری طرح آپ کو بھی بچپن میں کیسٹر آئیل کی اس وحشیانہ شیشی سے ضرور پالا پڑا ہوگا جسے حکیم صاحب کی ہدایات کے مطابق بچوں کو پلانا ساری سلیقہ مند مائیں نہایت ضروری سمجھتی تھیں۔ آج اگر مجھے آپ امرت بھی ایسی شیشی میں پیش کریں جو اس شیشی سے ملتی جلتی ہو جس میں کیسٹر آئیل لایا جاتا تھا تو مجھے ابکائی آجاتی ہے اور اس وقت بھی میں جب سطور بالا لکھ رہا ہوں۔ اس کیسٹر آئیل کے تصوّر سے میرے رونگٹے کھڑے ہوئے ہیں ـــ اسنڈی کے تیل کے علاوہ ایک اور کانٹا جو میری نفسیات میں کھبا ہوا ہے وہ ہے کورس کی کتابیں۔ اب آپ اسے میری بدبختی ہی تصوّر کیجیے کہ میں بعض نہایت ضروری کتابیں صرف اس لیے نہیں پڑھ سکا کہ ان میں مجھے کورس کی کتابوں کی بو آتی تھی۔ میری میز پر اس وقت ایسی ہی ایک کتاب رکھی ہے جسے پڑھنے کے لیے میں نے خود کو عجیب عجیب قسم کی رشوتیں دی ہیں۔ اسے پڑھنا اس لیے ضروری ہوگیا تھا کہ تقریباً ہر شریف آدمی سے اس کا تذکرہ سنا تھا۔ چناں چہ اسے پڑھنے سے پہلے بھی وہی کیفیت میرے اعصاب پر طاری ہوگئی تھی جو امتحان سے کچھ پہلے "آموختہ" کرتے وقت راتوں میں طاری ہوتی تھی "بستر سے بیٹھ کے پڑھو" "لیٹ کے پڑھوگے تو زندگی بھر جاہل رہوگے" ـــ "ایک ایک جملے کو دو دو بار پڑھو اور سمجھ کے آگے بڑھو" ـــ وغیرہ وغیرہ ـــ والدہ کی وہ ساری آوازیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں جو "آموختہ" کے سیشن کے دوران سننی پڑتی تھیں اور یہ اس وقت ہوا جب میں نے داؤد اشرف کی کتاب کو پڑھنے کے لیے اٹھایا۔ ادارۂ سیاست کی ساری کتابیں میں نے نہایت خلوص سے خریدی ہیں اور انھیں پڑھا بھی ہے اور ان سب کے مطالعے سے پہلے یہی کیفیت مجھ پہ طاری ہوئی ہے۔

کیوں کہ ادارۂ سیاست سے شائع ہونے والی ساری
کتابیں اپنی جگہ ضروری اور دلچسپ ہوتی ہیں لیکن
ان سب کا ناک نقشہ کورس کی کتابوں کا سا رہا ہے،
اور یہاں تو غضب یہ ہوا کہ ہے کہ داؤد کی کتاب کا سائز
بھی نصاب کی ایک ایسی کتاب کا ہے جس سے میں ہمیشہ
خوف زدہ رہا۔ سیاست کے ادارے سے چھپنے والی
کتابیں بڑے سلیقے اور کافی منصوبہ بندی کے بعد نکلتی
ہیں لہذا یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ان کا موجودہ ڈھب معاشی
ضروریات کے نتیجے میں ہو۔ لیکن ایک بات ضرور محسوس
ہوتی ہے کہ ان کتابوں کے حلیے کے پیچھے ضرور کسی قابل۔
تجربہ کار۔ بارعب اور سخت گیر۔ سابقہ استاد کا
ذہن کارفرما ہے۔ درخواست یہی ہے کہ اگر ہو سکے تو آئندہ
شائع ہونے والی کتابوں کی پلاننگ سے پہلے۔ مجھ ایسے
غبی۔ بہانہ جو اور سہولت پسند طالب علموں کی نفسیات
کا بھی خیال رکھا جائے۔

بہر حال اس کتاب میں کوئی ایسی بات ضرور ہے
کہ جس نے مجھے اپنے آپ کو پڑھنے پر مجبور کر لیا۔ داؤد کے
وہ مضامین جو اس مجموعے میں شامل ہیں سب کے سب
شائع ہو چکے ہیں یا نشر ہو چکے ہیں اور نہ صرف اندرون
ملک بلکہ پاکستان میں بھی ان مضامین نے لوگوں کو اٹھ
بیٹھنے اور نوٹس لینے پر مجبور کیا ہے۔

جوش ملیح آبادی کی شاعرانہ عظمت سے کون
کم بخت انکار کر سکتا ہے۔ لیکن شاعرِ انقلاب ان
لوگوں میں سے تھے جنھیں اس بات کا شوق ہوتا ہے کہ
اگر ان کا قد چھ فیٹ پانچ انچ ہو تب بھی وہ اسے چھ
— فیٹ آٹھ انچ بتا کے مطمئن ہوتے ہیں — یہ کافی تھا
کہ جوش اپنی شخصیت اور شاعری ہمارے حوالے کر دیتے
اور ادب کے سائبان میں ایک طرف انکساری سے سر
جھکا کے بیٹھ جاتے۔ تھوڑی بہت شاعرانہ تعلّی تو جائز
روایت رہی ہے لیکن شاعرِ انقلاب کے لیے "یادوں کی برات"
جیسی ڈینگ کی پتہ نہیں کیوں ضرورت پڑ گئی تھی۔ ان
بے چارے کو کیا پتہ تھا کہ داؤد اشرف کبھی ان کی یادوں کی
پرانی الماری کھولیں گے اور پتہ نہیں کتنے ڈھانچے کڑکڑاتے
ہوئے باہر گر پڑیں گے۔ داؤد کے اندازِ تحقیق اور اندازِ
تحریر کی ایک خوبی یہ ہے کہ انھوں نے کہیں جوش جیسے عظیم
شاعر کے ساتھ بدتمیزی نہیں کی ہے اور ان بزرگوں کی
خطاؤں کو اس انداز میں نہیں پکڑا ہے کہ انھیں خطا وار
قرار دیا جا سکے۔

ان سارے مضامین کو پڑھ کے جو بات نہایت
وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہے وہ نظام دکن کا ادب
اور علم پرستی کا شدید اور پرخلوص رویہ ہے۔ بعض احکام
اور فرامین جو اس کتاب کا حصہ ہیں اس بات کی طرف
اشارہ کرتے ہیں کہ علم اور ادب کے تعلق سے نظام دکن
کا رویہ اشتہار بازی کا نہیں تھا۔

مولانا ظفر علی خاں پر عتاب کے باوجود ان کے کردار
کی اچھائی کا اعتراف مولانا سلیمان ندوی کے تعلق سے
برطانوی حکومت کی ناراضگی اور ریزیڈنٹ کے مشورے
کے خلاف مولانا کو سیرت النبیؐ کی تکمیل کی غرض سے
ادا کی جانے والی رقم کی مسدودی سے احتراز، مولانا عبدالماجد
دریا دریابادی کو دارالترجمہ میں صرف ایک سال تک

ملازمت کے بعد وظیفے کی ادائیگی اور ایسے ہی کئی واقعات اس ریاست کے حکمران کے رویّہ کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ حیدرآباد میں اربابِ علم کی قدرافزائی کی ایک مثال مہاراجہ کشن پرشاد کے رویہ سے بھی سامنے آتی ہے۔ جہاں مہاراجہ اپنی جیبِ خاص سے فانی کے لیے وظیفہ جاری کرتے ہیں۔

ایک اور بات جو داؤد اشرف کی اس کتاب کے ذریعے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ دانش وروں اور علما کے لیے رقمی امداد جاری کرتے ہوئے کسی بھی فرمان میں احسان جتانے کا رویّہ اختیار نہیں کیا گیا اور یہی محسوس ہوا جیسے متعلقہ عالم کو جو کچھ بھی دیا جا رہا ہے وہ اس کی علمی خدمات کا اعتراف ہے۔

ایک اور نہایت اہم بات کرنے کی اجازت دیجیے۔ کتابوں کی اشاعت اور خدمات کے صلے میں جو رقومات اس زمانے میں نظامِ حیدرآباد نے منظور کی تھیں ان کا تقابل آج کے معیار سے کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ جو سینکڑوں روپے دیئے جاتے تھے ان کی قدر آج لاکھوں میں ہے۔ اور پھر ان رقومات کا مقابلہ آج اردو اکیڈیمیوں کی طرف سے اس ہی عنوان سے دی جانے والی رقومات سے کیجیے۔

آخر میں اگر میں اس بات کا اعتراف کر دوں تو شاید بے ایمانی ہوگی کہ اتنی قابلِ قدر کتاب کو اتنی کم قیمت میں پیش کرنا ادارۂ سیاست ہی کے لیے ممکن تھا یہ اور بات ہے کہ ہم معزز اردو والے کتاب کے لیے اتنی قیمت دینا بھی عیاشی تصوّر کرتے ہیں۔

●

دے کے خط (مُراسلے)

محترم کمال صاحب!
مسلسل ۲۷ر اکتوبر سے آپ کو خط لکھنا چاہ رہا تھا مگر حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ ذہن خواہ مخواہ منتشر رہا۔ ہر طرف دنگا فساد، اخبار دیکھنے کو جی نہیں کرتا، ٹی وی کے قریب جاؤ تو عجیب وحشت سی ہونے لگی ہے....
اسی دوران شگوفہ ملا۔ باچھیں کھل گئیں۔ آپ گم سے انتخاب شائع کرکے آپ طنز و مزاح کا ستھرا ذوق رکھنے والے قارئین پر واقعی احسان فرما رہے ہیں۔ ادھر چھ، آٹھ شماروں میں جناب رؤف پاریکھ (کراچی) بڑے کامیاب جا رہے ہیں۔ جناب عباس متقی کا خاکہ بے حد پسند آیا اور جہاں تک پرویز بھائی کا کالم "یہ ہے بمبئی میری جان" ہے بڑا پھیکا جا رہا ہے۔
پتہ نہیں کیوں؟ "خامہ بگوش کے قلم سے" کا سلسلہ ٹوٹ گیا ہے اسے جاری رکھیں!   امجد علی فیض (گلبرگہ)

کافی عرصہ سے شگوفہ کا مطالعہ کر رہا ہوں مگر آپ کی بزم میں پہلی بار شامل ہو رہا ہوں۔ اکتوبر کا شمارہ پڑھا، مرزا کھونچ کی غزل قابلِ تعریف ہے۔ پرویز یداللہ مہدی کا مضمون اگر مجنوں میاں ہڑتال کرتے کافی عمدہ ہے کبھی کبھی دلاور فگار کی غزلیں شائع کیا کریں۔ اس بھاگ دوڑ کی زندگی میں شگوفہ ایک سکون دیتا ہے۔   سکندر جاوید (سنبھل)

شگوفہ پابندی سے مل رہا ہے۔ طنز و مزاح سے بھرپور تخلیقات پر ہماری جانب سے مبارکباد قبول فرمایئے۔ حصہ نثر اور حصہ نظم دونوں قابلِ داد ہیں لیکن مزا اس وقت کرکرا ہو جاتا ہے جب پرنٹنگ اٹکھیلیاں کرنے لگتی ہے۔ بعض الفاظ تو اپنا جلوہ دکھاتے ہی نہیں اور بعض اتنے رو سیاہ ہو جاتے ہیں کہ ان کا مطالعہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔ قوی امید ہے کہ آپ آئندہ شماروں میں اپنی توجہ پرنٹنگ کی طرف مبذول فرمائیں گے۔
خلیل احمد (بلگام)

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

(اداریہ)

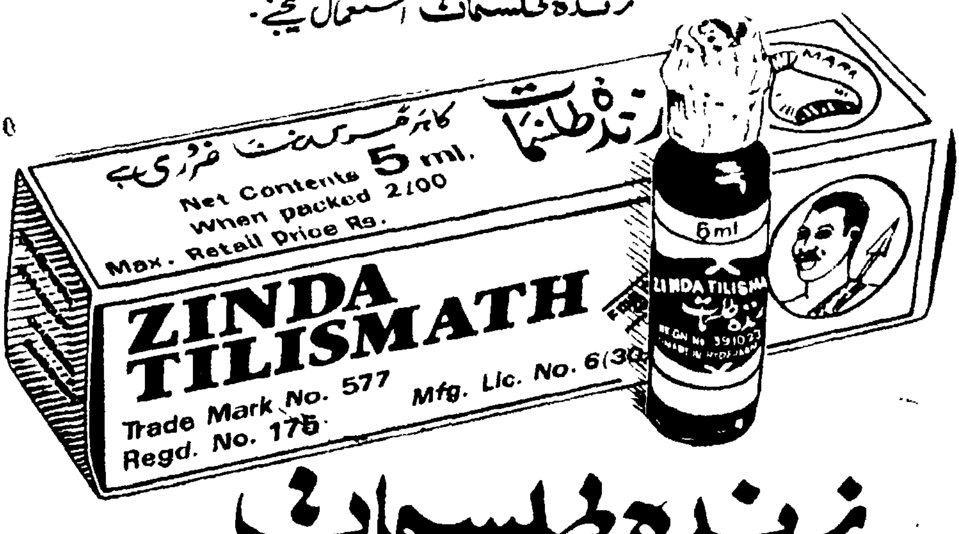
اس مہینے حیدرآباد شہر اپنی ۴۰۰ سالہ تاریخ کے بدترین فساد سے دوچار رہا۔ جس بے رحمانہ اور بہیمانہ طریقہ پر قتل و خون کی وارداتیں ہوئیں اس کی تفصیل سُن کر جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ معصوم بچوں اور عورتوں کو تک ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا کئی دن تک پُرامن شہری عدم تحفظ کا شکار دہشت زدہ اپنے گھروں میں بند رہے طویل کرفیو غذائی اشیا کی عدم دستیابی اور ان سب سے زیادہ امن و ضبط کی غیر یقینی صورتِ حال نے شہریوں کی صحت و زندگی اور اعتماد و بھائی چارگی کی فضاء پر جو اثر ڈالا، اس کا لفظوں میں اظہار مشکل ہے ——
دل و دماغ ساتھ نہ دینے پر بھی پرچے کی اشاعت ایک عجیب مصنوعی عمل ہے، جس سے بہرحال عہدہ برآ ہونا ضروری ہے۔ مزاح کا ماحول نہیں اور طنز کرنا چاہیں تو لہجہ پر تلخی غالب آ جائے جیسے تیسے یہ شمارہ تیار ہوا۔ نامساعد حالات اور غیر یقینی کیفیت کے باوجود ہم کوشش کریں گے کہ شگوفہ کا سالنامہ جنوری ۱۹۹۱ء کے تیسرے ہفتہ تک شائع ہو جائے۔
شگوفہ کے بعض قارئین طباعت کی خرابیوں کی طرف مسلسل توجہ دلا رہے تھے چنانچہ ہم نے پریس تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یقین ہے کہ ابتداءً ہم نفیس طباعت کا پچھلا معیار برقرار رکھ سکیں گے۔

l. No. 15822/68 SHUGOOFA, Hyderabad-1 Postal Regd. No. H./HI
Vol. 23 Copy 12 December '90 Phone : 557

یریا... لیکن آپ نہ گھبرائیں

علامات جاڑے کے ساتھ تیز بخار
اور پیاس پیٹ میں بائیں طرف دبانے پر درد ہوتا ہے

علاج آدھا گلاس پانی میں آٹھ قطرے زندہ طلسمات
ڈال کر دن بھر میں ۳ دفعہ استعمال کریں
مکمل آرام کے لئے سات ۷ دن تک اسی طرح
زندہ طلسمات استعمال کیجئے۔



زندہ طلسمات

(جیون کی دوا)



تیار کردہ: کارخانہ زندہ طلسمات۔
حیدرآباد ۱۳